

نیاز فتحپوری

قواعد رسالۂ نگار

۱ ـ رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شایع ہوتا ہے
۲ ـ رسالہ نہ پہونچنے کی صورت مین بیس تاریخ سے پہلے دفتر کو اطلاع ہونی چاہیئے ورنہ رسالہ مفت روانہ کیا جائیگا
۳ ـ خط و کتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھئے جسپر نمبر خریداری نہین ہوتا ایسے خطوط ضایع کردیے جاتے ہین
۴ ـ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ار کا ٹکٹ آنا ضروری ہے
۵ ـ مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہئین ـ
۶ ـ سالانہ قیمت پانچ روپیہ ششماہی تین روپیہ ـ بیرون ہند سات روپیہ سالانہ ـ

نرخنامہ اجرت اشتہارات

تعداد صفحہ	ایک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	۶۰ روپیہ	۴۰ روپیہ
چھہ مرتبہ	۶۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۵ روپیہ
تین مرتبہ	۳۵ روپیہ	۲۴ روپیہ	۱۴ روپیہ
ایک مرتبہ	بارہ روپیہ	۹ روپیہ	۶ روپیہ

(۱) اجرت ہر حال مین پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دین گے ان کو بیس فیصدی کمیشن دیا جائیگا (۳) میعاد اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

چوتھائی قیمت پیشگی آنی لازم ہے — جواب کیلئے ٹکٹ آنا ضروری ہے

مرزا غالب

- اردوے معلی ۱ع۸ر
- عود ہندی عہ ر
- دیوان غالب سے ر
- مکمل دیوان عہ ر

مولانا نذیر احمد

- حمائل مترجم ۸ر
- الحقوق والفرائض ے
- بنات النعش ۹ ر
- مراۃ العروس ۱۰ ر
- توبۃ النصوح ۱۲ ر
- موعظہ حسنہ ۴ر
- رویاے صادقہ ۴ر
- ایامیٰ ۴ر
- فسانہ مبتلا ۴ر
- ابن الوقت ۸ر
- مصائب غدر ۱۲ ر

مولانا شبلی

- سیرۃ النبی جلد اول ۸ر
- 〃 دوم ۸ر
- 〃 سوم ۸ر
- الفاروق ع ر
- سیرۃ النعمان ۸ر
- الغزالی ۸ر
- المامون ۸ر
- سوانح مولانا روم ع ر
- سفرنامہ مصر و شام ع ر
- علم الکلام ع ر
- الکلام ع ر
- رسائل شبلی ۸ر
- مقالات شبلی عہ ر
- شعر العجم جلد اول ے ر
- 〃 دوم ۸ر
- 〃 سوم ۸ر
- 〃 چہارم ے ر
- 〃 پنجم ع
- موازنہ انیس و دبیر ے ر
- مضامین عالمگیر ۸ ر
- آغاز اسلام ۸ ر
- کلیات فارسی ع ر
- کلام شبلی اردو ۸ ر

امیر مینائی

- امیر اللغات عــہ ر
- صنمخانۂ عشق ع ر
- مراۃ الغیب ۴ر
- محامد خاتم النبیین ۸ ر
- ضیاے سخن عہ ر
- مکاتیب امیر مینائی ۸ر

رتن ناتھ سرشار

- فسانہ آزاد ۸ر
- سیر کہسار ۸ر
- خدائی فوجدار ۸ر
- جام سرشار ع ر
- الف لیلی بطرز ناول صہ ر

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴
جلد ۱۴ - شمارہ ۱



لکھنؤ سے ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شایع ہوتا ہے قیمت سالانہ صہ ہندوستان سے باہر علاوہ محصول معہ مر

فہرست مضامین جولائی سنہ ۱۹۲۸ء

مضمون	مصنف	صفحہ
ملاحظات		۲
حیات قومی کے اجزا ترکیبی		۵
عید کی چاندرات (فسانہ)	ذوقی بی اے	۹
مراثی انیس کا حیدرآبادی اڈیشن	احسن لکھنوی	۱۸
ہندو مسلم اتحاد اور ہندی علم ادب کا مطالعہ	راج بہادر ایم اے لمگوڑا	۲۶
بلاد مغرب ایک مشرقی خاتون کی نگاہ سے		۳۷
ڈائری کا ایک ورق		۴۴
فلسفۂ مذہب	سید مقبول احمد بی اے	۴۹
من در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال (فسانہ)	مجنوں گورکھپوری	۵۰
فردوس محبت (نظم)	روش صدیقی	۷۸
موت (نظم)	امین حزیں	۸۰
غزلیات:-	باسط بسوانی	۸۱
"	جگر بریلوی	
"	حافظ غازی پوری	
"	اثر رامپوری	
"	ناطق گلاؤٹھی	۸۳
باب الاستفسار		۸۴
معلومات		۹۳
اشتہارات		۹۶



اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۱۴	جولائی ۱۹۲۸ء	شمارہ ۱

ملاحظات

اس مہینہ کی اشاعت سے چودھویں جلد کا آغاز ہوتا ہے اور جسوقت اپنی بے سروسامانی، کم مایگی، اور ناکسی پر نگاہ کرتا ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ وہ کیا قوت تھی جسنے باوجود اسباب کی ہر ممکن ناسازگاری کے مجھے اپنے عزم پر ثابت قدم رکھا اور نگار کو اس منزل تک پہونچا دیا کہ اب میں اپنے سے بہتر قاید کی ضرورت اس کے لئے محسوس کر رہا ہوں۔ سچ ہے

ہر رشحہ باندازۂ ہر حوصلہ ریزند
میخانۂ توفیق خم و جام ندارد

میں نگار کو جس سطح تک لانا چاہتا ہوں وہ اس سے بہت بلند ہے جو اسوقت نظر آرہی ہے اور میں معترف ہوں کہ حوادث و موانع کا مقابلہ کرنے میں اس حد تک کامیاب نہیں ہوں کہ آج عملاً اپنے نصب العین کو آپ کے سامنے پیش کر سکتا، لیکن اس کا ضرور قائل ہوں کہ انسان کی ہر تمنا اگر دل کی خلش ہو کر رہجائے تو اک "مستقل حاصل" ہے اور غالباً مبالغہ نہ ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ

برہمیں یک آرزو بربستہ ام تعمیر دل

بہرحال مجھے یقین ہے اور آپ بھی یقین کیجئے کہ ایک دن وہ ساعت آئے گی جب میں حقیقی منزل میں قدم رکھتے ہوئے کہہ سکونگا کہ

شگفتن گل امید را تماشہ کن

سنگین بت کے سامنے سرِعجز خم کر دینا، آفتاب کو دیکھکر اُس کے سامنے جھک جانا، آگ کے حضور میں اپنی بیچارگی کا اظہار کرنا، حرم کا طواف، سنگ اسود کا استلام، ان میں سے کوئی بات داخل شرک نہیں ہے کیونکہ ایسا کرنے والے سمجھتے ہیں کہ خدائی طاقت ان میں سے کسی کو حاصل نہیں ہے، بلکہ یہ ذرائع ہیں خیال میں مرکزیت اور تصور میں استمداد پیدا کرنے کے۔ شرک فی الحقیقت نام ہے انسان کے پوجنے کا انسان کو، سرِ نیاز جھکا دینے کا اُس تقدم شخصی کے سامنے جو دوسرے انسان سے اس کی خصوصیات انسانی تو چھین سکتا ہے لیکن عطا کچھ نہیں کرتا، پھر غور کرو کہ آج کتنے ہیں جو اس شرک عظیم میں مبتلا ہیں اور ہر جماعت نے انسانیت کی کتنی عظیم الشان قربانیوں کے بعد اپنے اپنے بت علیحدہ بنا رکھے ہیں عام معتقدات کے خلاف عیسیٰ کی تخلیق و ممات کو ایک معمولی انسان کی سی تخلیق و ممات کہتا ہوں، لیکن کسی زیدی وحسینی کے جوش ایمان میں حرکت پیدا نہیں ہوتی، میں یوسف کے غیر معمولی حُسن وجمال سے انکار کرتا ہوں، مگر کوئی میرزا منش کوئی خواجہ زادہ اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ میں بہشت ودوزخ کی مادی حیثیات کو نہیں مانتا، میں حشر اجساد کا قائل نہیں میں تمام مسائل شریعت کو وقت کے لحاظ سے قابل اصلاح وترمیم کہتا ہوں، لیکن کوئی اسلام پرست اور محب اسلاف مُومن ان باتوں کے خلاف احتجاج نہیں کرتا، لیکن محمد حسین آزاد کے خلاف، یعنی ایک ایسے شخص کے خلاف جو کسی طرح اکابر امت میں شمار نہیں کیا جا سکتا مختصر الفاظ میں اظہار رائے کرتا ہوں، تو یہاں سے لیکر وہاں تک آگ لگجاتی ہے، درسگاہوں کے حجروں سے لیکر صحافت گاہوں کے ایوانوں تک ماتم بپا ہو جاتا ہے۔

گویا کہ تازہ خون ز کفن بر چکیدن ست

یہ کیا تماشہ ہے! یہ کیسا عجیب وغریب منظر ہے!!

کیا بت پرستی کا مفہوم اس کے علاوہ کچھ اور ہے، کیا شرک و بدعت کی تعبیر میں اس سے زیادہ کسی اور روشن مظاہرہ کی ضرورت ہے؟

کس قدر حسرتناک ہے اس قوم کی تہی مایگی جو اپنے کسی فرد کے خلاف کوئی بات نہ سن سکے، صرف اس لئے کہ اس کو ناکارہ مان لینے کے بعد کوئی دوسرا اس کی جگہ پیش کرنے کے لئے موجود نہیں ہے۔

آزاد کی آبحیات کے متعلق جو مضمون شائع ہوا ہے اس کا جواب دینے میں جس وسعت ظرف ونظر سے کام لیا گیا ہے وہ یقیناً داد سے مستغنی ہے۔ کہنے والا کہتا ہے اور تذکرہ وتاریخ، روایت ودرایت سے ثابت کرتا ہے کہ آزاد نے فلاں فلاں جگہ تحریف واقعات کی صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح لکھنے میں اُنھوں نے اپنے پورے قصد وارادہ کو صرف کیا، لیکن جواب دینے والا ان باتوں کا ذکر ہی نہیں کرتا کیونکہ دلائل بالکل قطعی واذعانی ہیں، بلکہ وہ اپنا دل صرف مجھے گالیاں دیکر ٹھنڈا کرنا چاہتا ہے، حالانکہ اگر مجھے جاہل کہنے سے آزاد کے سر سے یہ تمام الزامات اُٹھ جاتے تو اس کی نوبت ہی نہ آتی، جب کہ میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو یکسر معائب ونقائص پایا اور ظاہر کیا ہے۔ کیا ایک کو گالیاں دیکر دوسرے کی برتری ثابت کرنا ایسا زبردست کلیہ ہے کہ نہیں

کوئی استثنا ہو ہی نہیں سکتا، یعنی میرے اور آزاد کے باب میں بھی نہیں ! ۔

بر تمناہائے عرفی خندہ می آید مرا

اس اشاعت کا پہلا مضمون ہر چند گمنام کا ہے لیکن ہے کام کا ۔ جناب ذوقی کا فسانہ "عید کی چاندرات" فن کے اس شعبہ سے متعلق ہے جسے حقیقیات نگاری کہتے ہیں ۔ تجربات و جذبات کا دقیق تجزیہ اور بیان کا وہ اسلوب جو پڑھنے والے کے سامنے تمام کیفیات و مناظر کو پیش کردے آسان کام نہیں، لیکن مجھے مسرت ہے کہ لکھنے والے نے اس میں کامیابی حاصل کی ہے جس کا بڑا سبب یہ ہے کہ وہ قدرتاً ممثل پیدا ہوئے ہیں ۔

مراثی انیس کے حیدر آبادی اڈیشن پر جناب احسن لکھنوی کا مضمون نہایت کارآمد ہے ۔ کاش زیادہ بسیط ہوتا ۔ ہندو مسلم اتحاد اور ہندی ادب کے مطالعہ پر جناب راج بہادر صاحب ام اے کا مقالہ خوب ہے ۔ یقیناً ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ ہندوؤں کے مذہبی، معاشرتی، تاریخی اور ادبی لٹریچر کا مطالعہ کرے جس طرح ایک ہندو کا فرض یہ ہے کہ وہ مسلمانوں سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے اُن کے لٹریچر کو دیکھے ۔

سیاحت قمر اس مہینے میں بھی ختم نہیں ہوئی جسکا مجھے افسوس ہے ۔ آئندہ ماہ میں اس کا ختم ہو جانا یقینی ہے ۔

جناب مجنوں گورکھپوری کا فسانہ بہت دنوں کے بعد شائع ہو رہا ہے لیکن "درست آید" کا پورا مصداق ہے ۔ مجنوں نے جس لطف و حُسن کے ساتھ ٹامس ہارڈی کے فلسفۂ "بندگی و بیچارگی" کو اپنی زبان میں منتقل کیا ہے، اس سے نہ صرف ان کی وسعت مطالعہ بلکہ حد درجہ دقت احساس و نزاکت تاثر بھی ثابت ہوتی ہے ۔ یہ فسانہ ستمبر میں ختم ہوگا ۔

باب الاستفسار میں معاد کے متعلق میں نے اپنے خیالات کسی نہ کسی طرح سمیٹ کر اس مرتبہ ختم کر دئے ہیں ۔ اگر مولوی غلام ربانی عزیز کو اب بھی کچھ شبہات ہوں تو وہ خط و کتابت کے ذریعہ سے طے کر سکتے ہیں ۔

فلسفۂ مذہب میں اس مرتبہ بعض خیالات جناب سید مقبول احمد صاحب نے ایسے ظاہر کئے ہیں جن سے مجھے اتفاق نہیں ہے ارادہ ہے کہ اس مضمون کے ختم ہونے کے بعد اس پر ایک محاکمہ کروں ۔

روش صدیقی کی نظم فردوس محبت بہت پاکیزہ و رنگین ہے ۔ غزلوں میں حافظ غازیپوری کے اکثر اشعار اور بعض بعض جگر، آثر، ناطق اور باسط کی بھی خوب ہیں ۔

عشرت حسین صاحب نقوی صاحبزادہ سید جالب دہلوی اڈیٹر ہمدم لکھنؤ نے ایک رسالہ کیمیا کے نام سے بڑی تقطیع پر یہاں سے جاری کیا ہے اور اسمیں شک نہیں کہ مضامین کے فراہمی اور ان کی ترتیب و تنوع میں کافی محنت و سلیقہ سے کام لیا گیا ہے اسوقت ملک کو ایسے رسالوں کی جو ہمارے اندر صنعت، حرفت و تجارت کا ذوق پیدا کریں اور صحیح مشورہ دے سکیں سخت ضرورت ہے، ہمیں اُمید ہے کہ جناب جالب ایسے تجربہ کار صحافی کی نگرانی میں یہ رسالہ بہت مفید خدمت ملک کی انجام دیگا ۔ منیجر رسالہ کیمیا لکھنؤ سے نمونہ طلب کیا جا سکتا ہے ۔

نیاز

حیات قومی کے اجزاء ترکیبی

اور

ہیئت اجتماعی کے اصول اساسی

تمہید جو چیز انسان کو کرۂ ارض کی اور تمام مخلوقات سے جدا و ممیز کرتی ہے، وہ اس کا ضرورت سے زیادہ محتاج و بیکس ہونا ہے۔ لیکن کس قدر عجیب و غریب بات ہے کہ جو مخلوق اپنی فطرت و خلقت کے اعتبار سے اس درجہ ضعیف، اس قدر حقیر اور اس حد تک کمزور ہے اسی کو اشرف مخلوقات اور غایت تخلیق بتایا جاتا ہے!

یقیناً یہ نہایت عجیب بات ہے، لیکن کیا اس کی حقیقت سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے؟ ایک طرف اس کی بیکسی و بیچارگی کا منظر تو یہ ہے کہ جس وقت وہ عالم وجود میں آتا ہے تو ایک ایسی لایعنی شے ہوتا ہے کہ عالم کا ایک ایک حادثہ طبعی دم زدن میں اسکو فنا کر دینے پر آمادہ ہوتا ہے۔ اور اس میں اتنی بھی قوت و صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ ادنیٰ سی حرکت اپنے تحفظ یا بقا کے لئے کر سکے برخلاف حیوانات و نباتات کے کہ شروع ہی سے ان کو اپنے بقا کے لئے اپنے اوپر اعتماد کرنا ہوتا ہے اور عطایائے قدرت سے فائدہ اُٹھانے کی اُن میں اہلیت ہوتی ہے۔

پھر اسی انسان کی قوت و جبروت کا دوسرا منظر یہ ہوتا ہے کہ نہ صرف وہی حیوانات، نباتات، جمادات جو ابتدا میں اس سے زیادہ مستقل و برتر نظر آتے تھے، اسکے زیر اقتدار ہوتے ہیں، بلکہ تمام فضا میں اس کی حکومت نظر آتی ہے اور نوامیس فطرت سے وہ اس طرح کام لینے لگتا ہے گویا ابد و ازل کا وجود اسی سے عبارت ہے

بہر حال یہ مناظر اس قدر عام ہیں کہ ان کے متعلق نہ کسی طویل بیان کی ضرورت ہے اور نہ کسی دلیل و برہان کی، لیکن اس سے کیا درس اخلاق پیدا ہوتا ہے؟ یہ سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔

انسان کی تخلیقی بیچارگی اور ارتقائی عظمت کا تقابل ہم کو بتاتا ہے کہ گو وہ پیدا ہوتا ہے تنہا ہی، لیکن اس کی انفرادیت ایک ایسی ناقابل توجہ چیز ہے جس کو کبھی کوئی اہمیت حاصل نہیں ہو سکتی اور اس کی خلقی کمزوری ہی دلیل ہے اس امر کی کہ وہ محتاج ہے نظام تمدن کا، ہیئت اجتماعی کا۔ تعاون باہمی کا اور ہر اس بات کا جو ایک کو دو، دو کو چار اور چار کو آٹھ بناتی ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ ایک انسان انفرادی حیثیت سے جن خصوصیات کا مالک ہوگا، وہی خصوصیات ہیئت اجتماعی کو بھی حاصل ہونگی اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ "بچہ انسان کا باپ ہے اور ایک" "انسان مستقل قوم ہے"۔ اگر ایک بچہ کی تربیت خراب ہو رہی ہے تو اسکے یہ معنے ہیں کہ قوم کی ترکیب میں ایک داغدار و معیوب عنصر شامل کیا جا رہا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ صرف ایک فرد کی خرابی سے

قوم کو کسی وقت کیا نقصان پہونچ سکتا ہے، کیونکہ کسی ایک فرد کی خرابی صرف اس کی ذات تک محدود نہیں ہوتی بلکہ اس سے ایک ایسا سلسلہ خرابیوں کا پیدا ہو جاتا ہے کہ صدیوں تک ختم نہیں ہوتا اگر آپ نے کبھی تالاب کے پانی میں کنارے کی طرف ایک کنکری پھینکی ہوگی تو معلوم ہوگا کہ اس سے لہریں پیدا ہو کر کس طرح انکا سلسلہ دوسرے ساحل تک پہونچ جاتا ہے اور کبھی صرف ایک اینٹ کی خرابی سے ساری عمارت کا گر جانا بھی آپ نے سنا ہوگا۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا کوئی جرم ایسا نہیں ہے جس کا نقصان محدود ہو اور صرف ایک ہی شخص کو اس سے نقصان پہونچتا ہو۔ اسی طرح دنیا کا کوئی اچھا فعل ایسا نہیں ہے جس سے جماعت کی جماعت فایدہ نہ اُٹھاتی ہو

چنگیز خاں ایک ہی شخص تھا لیکن اس کے نقصانات کے بارے دنیا چیخ اٹھی اور مسیح و محمد کا وجود بھی ایک ہی ——— تھا لیکن دنیا میں امن کا تخم انھیں کی وجہ سے بار آور ہوا۔ صرف ایک نیرو نے روما کی تباہی میں جتنا حصہ لیا کسی سے مخفی نہیں اور ایک مارکونی اور ایک اڈیسن کی ذات نے جو راہیں ترقی کی انسان کے لئے کھولدیں، وہ بھی سب کو معلوم ہیں۔ بہرحال فرد کی اصلاح خاندان کی اصلاح ہے۔ اور خاندان کی اصلاح قوم کی اصلاح ہے اور قوم کی اصلاح ملک کی فلاح ہے۔

جس طرح ایک درخت عبارت ہے تنہ، شاخ، پتی، پھول اور پھل سے اسی طرح ہئیت اجتماعی مرکب ہے مختلف افراد سے جنکی خدمت شاخ، پتی وغیرہ کی طرح بالکل علٰحدہ علٰحدہ ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جس سے ہر ایک شخص کی علٰحدہ علٰحدہ انفرادی حیثیت بھی ظاہر ہوتی ہے، اور من حیثیت المجموع اس کا تعلق بھی ہئیت اجتماعی سے ثابت ہوتا ہے الغرض فرد اور جماعت کے درمیان ایسا مضبوط تعلق، اتنا شدید ارتباط ہے کہ علمی طریقہ سے ایک کا بغیر دوسرے کے پایا جانا ناممکن ہے۔ آدم کے لئے حوا کا پیدا کیا جانا حقیقتاً استعارہ ہے اس رمز کی طرف اور تعلیم ہے اسی تعاون و اجتماع کی۔

تعاون سے مراد کیا ہے؟ مختلف افراد انسانی میں اعمال کی تقسیم ہر عمل کے طریق کار کی تعیُّن اور کسی غایت یا غرض مشترک کا وجود جس کے حصول کے لئے افراد تعاون سے کام لیں۔

یہ دونوں اساسی اصول ایسے ہیں کہ نہ صرف جماعت انسانی بلکہ عالم حیوانی میں بھی ان کا وجود پایا جاتا ہے اور خود مختلف اعضاء حیوانی کی ساخت اس امر کی شاہد ہے کہ فطرت بھی انہیں اصول کی کاربند ہے۔ اور اسی پر غور کرنے سے ہر شخص بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کا تنہا مالک نہیں ہے بلکہ ساری قوم اُس کی مالک ہے اور اس طرح نہ اپنے نتیجۂ عقل و عمل سے وہ تنہا فایدہ اُٹھا سکتا ہے یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر خود کشی کا اقدام قانونی جرم قرار دیا گیا اور اشتراکیت سرمایہ داری کی دشمن ہے۔

انسان جو اس وقت تمام عالم پر چھایا ہوا نظر آتا ہے اُس کا سبب سوائے قوت عمل کے اور کوئی چیز نہیں ہے اور اعمال ہی کی تفریق سے مدارج انسانی متعین کئے جاتے ہیں۔ پھر جب ہم اسباب عمل پر غور کرتے ہیں تو اس کی محرک تین چیزیں نظر آتی ہیں سب سے پہلی چیز تو اس کی طبعی و فطری قوت ہے جس میں بچہ، جوان، دیوانہ، عاقل، عالم و جاہل سب برابر کے شریک ہیں اس کو گویا موٹر یا انجن سمجھنا چاہیے، دوسری چیز جلب منفعت ہے اور تیسری ادائے فرض۔ یہ دونوں اگر زیادہ وسعت نظر اور بلند خیالی

کے ساتھ کام میں لائے جائیں تو تعاون کی وہی صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں جو مقصود آفرینش ہے اور جو ایک قوم و ملک کی ترقی کی ضامن ہیں۔

اگر آج ہم کوئی کام کرتے ہیں اور اس سے مقصود صرف یہ ہے کہ صرف اپنی زندگی آرام سے بسر کر لیجائیں، تو اُس کو نہ صرف خود غرضی کہیں گے بلکہ غیر فطری بھی اور ایک انسان کا بہ حیثیت انسان ہونے کے سب سے زیادہ ذلیل جذبہ یہی ہے۔ ایسے لوگ زیادہ تر وہ ہوتے ہیں جو تجرّد کی اور راہبانہ زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کا وجود قوم کے لئے مادۂ فاسد کا حکم رکھتا ہے جس کو جلد سے جلد نکل جانا چاہیئے۔ اس کے بعد دوسرا درجہ ان لوگوں کا ہے جو اپنے ساتھ اپنے متعلقین یا بیوی بچوں کی راحت و آسائش کا خیال کرتے ہیں۔ اور ان کی تعداد زیادہ ہے، ہر چند یہ قسم اول کے انسان سے بہتر ہیں، لیکن غایت آفرینش ان سے بھی پوری نہیں ہو سکتی، ایسے لوگ صرف اس حد تک کہ ان کے عایلہ کا تعلق ہے بہت اچھے، وسیع النظر، ایثار پسند ہوتے ہیں، لیکن گھر کی چار دیواری سے باہر وہ ساری دنیا کے لئے خود غرض سنگدل ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے بعد پھر وہ بلند مرتبہ والے انسان ہیں جو اپنی ذات، اپنی اغراض کو اپنی قوم کی فلاح کے لئے نظر انداز کر دیتے ہیں، اور ان کے ہر فعل، عمل کا نصب العین قوم کی خدمت ہوتی ہے، لیکن ایک درجہ اس سے بھی بلند ہے اور یہ کہ قوم و ملک کی تخصیص بھی باقی نہ رہے اور تمام ابنائے جنس بلکہ اس سے بھی زیادہ سارا عالم حیات پیش نظر رہے۔ یہ مرتبہ سوائے انبیاء و رسُل کے کسی اور کو حاصل نہیں ہوتا۔

بہر حال انسانی تفوق و برتری کے مدارج اس کے حسن ظاہری کے لحاظ سے قائم نہیں ہوتے بلکہ حسن فطرت کے اعتبار سے اُن کی تعیُّن ہوتی ہے اور ایک صحیح تعلیم و تربیت کا مقصود یہی ہونا چاہیئے۔

نٹشے کی یہ تعلیم کہ "قوی، کمزور کو جذب کر لیتا ہے، فنا کر دیتا ہے" ممکن ہے بہ لحاظ واقعات صحیح ہو، لیکن بہ لحاظ اخلاق نہایت مہلک قسم کی تعلیم ہے۔ یقیناً اس نے یہ نظریہ ڈارون کے اصول "تنازع للبقا" سے اخذ کیا ہے لیکن سخت غلط فہمی کے ساتھ۔ ہر چیز اپنی بقا و قیام کے لئے کوشش کرتی ہے، یہ بالکل صحیح بات ہے، قوی و ضعیف کے تصادم میں اکثر و بیشتر ضعیف ہلاک ہو جاتا ہے یہ بھی درست ہے، لیکن اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ قوی کو ضعیف کے ہلاک کر دینے کا فطری حق حاصل ہو کیا وجہ ہے کہ قوی اپنے ضعیف ابنائے قوم کے سنبھالنے اور ہلاکت سے بچانے کی تدبیر نہ کرے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب اصول تعلیم و تربیت نہایت مستحکم و صحیح ہوں، ہمارے ہاں سب سے زیادہ جس چیز کا فقدان ہے وہ صحیح تعلیم و تربیت ہے۔ تعلیم و تربیت کا ایک مقصود تو تکمیل فنون ہوتا ہے اور دوسرا صحت اخلاق اور بدقسمتی سے ہمارے ہاں ان دونوں میں کوئی مقصود حاصل نہیں ہوتا، چہ جائیکہ ان دونوں کا اجتماع کہ اس میں مغرب بھی ہنوز کامیاب نہیں ہوا۔

بچہ کی تعلیم و تربیت کی اولین جگہ ماں کی گود ہے، یہ تمام اقوام عالم کا مسلمہ مسئلہ ہے، لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ دنیا بچوں کی تعلیم کا تو درس دیتی ہے لیکن اس کی اصلاح کی طرف مطلق توجہ نہیں جو بچہ کی اولین درسگاہ ہے۔

اس وقت تعلیمی مسئلہ کا سب سے زیادہ توجہ طلب پہلو لڑکیوں کی تعلیم و تربیت ہے اور اسی کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ بحالت موجودہ جو مدارس یا کالج ان کے پائے جاتے ہیں وہ بالکل غلط اصول پر قائم ہیں اور ان کی تعلیم بجائے اس کے کہ لڑکیوں کو اچھی

ماں بننے کا اہل بنائے، سرے سے ماں ہی نہیں بنانا چاہتی، اس میں شک نہیں کہ ان مدارس میں لڑکیوں کو خوبصورت معاشرت کا درس ضرور دیا جاتا ہے اُن کو یقیناً وہ ادائیں بتا دی جاتی ہیں جن سے وہ اپنے شباب میں اک ساحرانہ کیفیت پیدا کر سکتی ہیں، اسی کے ساتھ اُن کو ظاہری نمود و آرائش کے بھی تمام طریقے سکھا دئے جاتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ ان باتوں کو ماں بننے سے کیا واسطہ ہے اور اخلاق کا تعلق اُن سے کس حد تک ہے۔

موجودہ تعلیم لڑکیوں کو خوشنما ضرور بناتی ہے، لیکن نہ خوشنما ہونا اچھا ہونا ہے اور نہ حسین بننا مفید بننا۔ پھر جب ہر حسین چیز مفید نہیں تو کلیہ قائم کرنے کی غرض سے اس حقیقت کو ماننا پڑیگا کہ حسین وہی ہے جو اچھا اور مفید ہو۔

انگریزی تعلیم، لڑکیوں کے لئے ہر چند بُری نہ ہو، لیکن غیر ضروری یقیناً ہے کیونکہ جہاں تک درستی اخلاق کا تعلق ہے وہ اس سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ میں تو یہ کہونگا کہ انگریزی تعلیم بڑی حد تک اخلاق سے بیگانہ بنا دیتی ہے

درستی اخلاق کا تعلق نہ قانون سے ہے اور نہ تخویف و تربیت سے، بلکہ وہ ایک کیفیت ہے جس کا تعلق صرف مذہبی روحانیت سے ہے اور انگریزی تعلیم سے مذہبیت کو جس قدر نقصان پہونچ رہا ہے ظاہر ہے۔

اس لئے غور طلب امر یہ ہے کہ لڑکیوں کی تعلیم کن اصول پر ہونی چاہئے اور اگر سب سے پہلے مذہبی تعلیم ان کے لئے ضروری ہے تو اسکی بہترین صورت کیا ہو سکتی ہے۔

اگر یہ صحیح ہے کہ مذہب نام کسی کتاب کا نہیں، بلکہ صرف افعال و اعمال کا ہے تو سب سے پہلے ہم کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ ایسی استانیوں کا فراہم کرنا ہے جو اپنے اوقات و مشاغل کے لحاظ سے مذہب کی پابند ہوں اور کوئی حرج نہیں اگر وہ ایک حد تک آزاد خیال نہ ہوں ہم کو ایسی استانیوں کی ضرورت نہیں جو ریشمی ملبوس میں ملفوف ہوں، زینت و آرائش کی تصویر ہوں، لیکن اخلاق کے لحاظ سے وہ نہایت درشت و مکروہ نظر آئیں، ستھراپن اور صفائی نام نہ خوش ادائی کا ہے، نہ لباس کی اچھی تراش خراش کا اور نہ ٹیڑھی مانگ اور بانکے جوڑے کا، بلکہ اس سے مراد ہے وہ پاکیزگی نفس جو انسان کے ظاہر و باطن دونوں کو پسندیدہ بنا دیتی ہے۔

مثال کے طور پر آپ ایک نہایت معمولی سی بات کو لے لیجئے کہ وہ عورتیں جو نماز کی پابند ہیں ہمیشہ صاف ستھری رہتی ہیں اور یہ عادت ان میں چونکہ مذہبی پابندی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اس لئے وہ اس قدر مستحکم و پایدار ہوتی ہے کہ معمولی اصول معاشرت کے ذریعہ سے استحکام پیدا نہیں ہو سکتا۔ پھر اسی کے ساتھ جب ان کی رفتار و گفتار پر نظر جاتی ہے تو وہاں بھی روحانی خلوص نظر آتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انکے منھ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ دل میں گھر کئے لیتا ہے۔ سب سے پہلی چیز جو ایک بچہ کے دل میں نقش کرنی چاہئے وہ خدا کا خوف اور اپنے ابنائے جنس کے ساتھ ہمدردی و راحت کا جذبہ ہے اور یہی دو چیزیں اخلاقیات کی جان ہیں، لیکن کیا موجودہ انگریزی مدارس میں اس تعلیم کی توقع کی جاتی ہے، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ۲۴ گھنٹے میں وہاں ایک لمحہ کے لئے بھی صحیح معنے میں خدا کی طرف توجہ کیجاتی ہے۔

پھر جب حالات یہ ہیں اور مدارس کی تعلیم اس درجہ ناقص ہے تو سوائے اسکے کہ کوئی چارہ نہیں کہ لڑکیوں کو مدارس بھیجنے سے باز رکھا جائے اور خود گھر پر انکی تعلیم کا انتظام کیا جائے اس کے لئے جو نصاب میں نے تجویز کیا ہے وہ عام ارتقاء ذہنی کے لحاظ سے باوجود غیر انگریزی ہونے کے اسی حد تک مکمل ہے اور بہ لحاظ اخلاقی تعلیم کے تو خیر اس کو ملبند ہونا ہی چاہئے کیونکہ اس کی بنیاد بالکل مذہب پر قائم کی گئی ہے۔

عید کی چاندرات

(فسانہ)

تانگہ نہایت تیزی کے ساتھ چلا جا رہا تھا اور چمڑے کا چھوٹا بکس جسے اسٹیشن پر جلدی کی وجہ سے میں نے تانگہ کے اندر بے ڈھنگے پن سے الٹا سیدھا رکھوا دیا تھا، پاؤں کے قریب تانگہ کے ہر جھٹکے کے ساتھ ہچکولے کھا رہا تھا۔ دونوں طرف کی دوکانیں اور مکانات سرعت کے ساتھ پیچھے سرکتے جاتے تھے۔ اس وقت مجھے اتنا ہوش نہ تھا کہ میں بازار کی کسی چیز کو اچھی طرح نگاہیں جما کر دیکھوں۔ صرف ایک خیال، ایک نشہ میرے دل و دماغ پر مسلط تھا۔ بازار میں کافی بھیڑ تھی اور بھیڑ کے ساتھ سودے والوں کی پکار، دوکانداروں کی آوازیں، راہ گیروں کی صدائیں سبھی کچھ شامل تھا لیکن جس طرح ایک شرابی کو اپنی ترنگ میں گرد و پیش کی تمام چیزیں دھندلی نظر آتی ہیں بالکل اسی طرح بازار کا تمام منظر میری نظروں میں ایک بے رنگ دھندلا سا خاکہ تھا جو جلدی جلدی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ مجمع کی چیخ پکار بھی میرے کانوں تک پہنچتے پہنچتے اس قدر کمزور ہو جاتی تھی جیسے کچی نیند میں کوئی شخص بہت دور کی آوازیں سن رہا ہو۔ بازار کے اس بے معنی ملے جلے شور میں صرف تانگے والے کی "ہٹو بچو" البتہ صاف سنائی دیتی تھی ورنہ اُس کے علاوہ مجمع کا تمام شور و غل میرے کانوں کے لئے شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے زیادہ نہ تھا۔

میں اپنے خیالات میں اس قدر کھویا ہوا تھا کہ مجھے یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ اسٹیشن سے مکان تک پہنچنے میں مجھے کتنی دیر لگی اتنا البتہ یاد ہے کہ جب تانگہ ایک مقام پر جھٹکے کے ساتھ رک گیا تو میرے سامنے وہ گلی تھی جہاں مجھے اترنا تھا۔ ایک جست کے ساتھ تانگہ سے کود پڑا۔ سوٹ کیس ہاتھ میں لٹکا لیا کمبل کو کاندھے پر ڈالا اور تانگے والے کو جلدی سے کرایہ دیتے ہوئے میں نے گلی کا رخ کیا۔

گلی کے موڑ پر میونسپلٹی کی لالٹین چاروں طرف اپنی زرد مدھم روشنی پھیلا رہی تھی۔ میں بے صبری کے لمبے لمبے قدم رکھتا ہوا گلی میں گھس گیا۔ میری رفتار کے ساتھ گلی کی دیوار پر میرے قدم کا سایہ بڑا ہوتا جاتا تھا اور میں اپنے قدموں میں ایسی چستی محسوس کر رہا تھا جیسے کسی نے جسم کی رگوں میں پارہ بھر دیا ہو۔ گلی کے مکانوں میں بات چیت اور قہقہوں کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ بعض کے دروازے بند تھے اور بعض کے ادھ کھلے دروازوں میں سے اندر کی روشنی نکل نکل کر گلی کی روشنی میں تحلیل ہو جاتی تھی آج اس محلے میں معمول سے زیادہ چہل پہل تھی۔ دو منزلہ مکانوں کی کھڑکیاں عموماً کھلی ہوئی تھیں اور ہر طرف سے حقے کی گڑگڑاہٹ اور برتنوں کی کھڑ بڑ کی آوازوں میں شوخ و شریر بچوں کی چیخ پکار کی صدائیں آ رہی تھیں۔ آج رمضان کی آخری تاریخ تھی اور یہ شام رونق و چہل پہل اس پرمسرت مبارک دن کا پیش خیمہ تھی جو سال بھر کی طول طویل انتظار کے بعد نصیب ہوتا ہے

محلے والوں کی یہ پُر انبساط مصروفیت اور بچوں کی خوشی سے بھری ہوئی آوازیں میرے لئے اسوقت خاص طور پر بہت پُر معنی تھیں

اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اس گلی کی در و دیوار تک کو خبر ہے کہ میں آج کیوں اس قدر خوش ہوں۔ مجھے گرد و پیش کی تمام فضا اپنے مسرور خیالات میں غرق نظر آتی تھی۔ میرے دلی جذبات اس وقت کیا تھے؟ تفصیل بالکل فضول ہے، اور ممکن ہے تفصیل سے اُن کی لطافت بھی ضائع ہو جائے۔ بس اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ میری رگ رگ میں مسرت و شادمانی کا وہ نقشہ چھایا ہوا تھا جو ایک ہندوستانی نوجوان کو نئی نئی شادی کے بعد پہلی مرتبہ اپنی سسرال میں عید کرنے کے خیال سے پیدا ہوتی ہے۔ میرا امتحان قریب تھا اس لئے اپنی پڑھائی کا ہرج کر کے اپنی بیوی سے ملنے کے لئے پورے ایک دن اور ایک رات کا سفر کر کے اس کے پاس پہنچنا کافی خطرناک جراءت تھی۔ لیکن وہم ہی کیا جس کے سرانجام میں خطرے سے مقابلہ نہ کرنا پڑے اور سچ تو یہ ہے کہ محض نقصان ہی کے خیال نے اس ملاقات کی مسرتوں کو وہ لذت آفریں بنا رکھا تھا

خدا خدا کر کے یہ مسافت بھی طے ہوئی اور میرے خسر کا مکان آ گیا۔ میں دبے پاؤں مردانہ مکان میں داخل ہوا اور سوٹ کیس کو زمین پر رکھ کر ماتھے پر سے پسینہ پونچھنے کے لئے شیروانی کی جیب میں سے رومال نکالا۔ توقع کے خلاف آج دیوان خانہ میں بالکل سناٹا تھا میرا خیال تھا کہ جس وقت میں یہاں پہنچوں گا حسب معمول میرے خسر صاحب گلوبند لپیٹے سیاہ کمانی کی عینک لگائے کمرے میں بیٹھے ہوئے حقہ پی رہے ہوں گے۔ وہ ایک بڑے گاؤ تکیہ سے سہارا دئے ہوئے ہوں گے، داہنی طرف ایک اونچا سا مراد آبادی اگالدان، بائیں طرف تازہ ہرے پانوں سے بھرا ہوا ایک منقش خاصدان رکھا ہوگا۔ قالین پر تھوڑے تھوڑے فاصلے سے اُن کے ادھیڑ عمر کے دوست بیٹھے ہوں گے ایک کونے پر بادامی کاغذ پر چھپی ہوئی چند پرانی مذہبی کتابوں کا ڈھیر ہوگا۔ ہوا میں حقہ کی نفیس تمباکو کی خوشگوار خوشبو پھیلی ہوئی ہوگی اور کھانس کھانس کر اپنے دوستوں سے کسی غیر دلچسپ موضوع پر باتیں کر رہے ہوں گے۔

لیکن یہاں کچھ بھی نہ تھا۔ صدر کمرہ بند تھا۔ برآمدے کے درمیانی در میں لوہے کی سلاخ سے ڈیز کی ایک لالٹین ٹنگی ہوئی تھی جسکی بتی نیچی تھی اور اس کی ہلکی کمزور روشنی نصف صحن تک پہنچ کر غائب ہو جاتی تھی۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ خیراتی کی کوٹھری میں بھی سناٹا تھا۔ اندر کے مکان سے بھی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی دیواروں پر ایک ناقابل بیان چپ مسلط تھی۔ البتہ باہر گلی میں کتوں کی مسلسل بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

میں نے سوچنا شروع کیا "یہ معاملہ کیا ہے؟ آج چاند رات ہے اور کل عید ہونے والی ہے۔ قاعدہ سے یہاں آج خوب چہل پہل ہونا چاہئے تھی۔ زنان خانہ سے بچوں کے لڑنے بھڑنے اور شور مچانے کی آوازیں آنا چاہئے تھیں۔ ہر طرف نقل و حرکت، مشغولیت و مصروفیت کی علامات ہونا چاہئے تھے۔ مگر یہاں تو قیامت کا سناٹا ہے . . میں زنانہ مکان کی طرف بڑھا اور آواز دینے کیلئے کھنکھار کر گلا صاف کرنے لگا۔ اندر سے میرے خسر کے چھوٹے بچے کی رونے کی آواز بلند ہوئی اور ساتھ ہی انا کی لوری اور جھنجھنے کی جھنکار ایک لمحہ میں بچہ خاموش ہو گیا اور فضا میں پھر وہی اگلی سی ڈراؤنی خاموشی پھیل گئی میرا دل بیٹھنے لگا ـــ

میں نے بہت ہمت کر کے کمزور آواز میں خادمہ کو پکارا جسے سن کر اس کا نو سال کا لڑکا باہر نکلا اور مجھے دیکھتے ہی بغیر کچھ کہے سے پھر مکان میں گھس گیا اس سے میری گھبراہٹ اور زیادہ بڑھنے لگی اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے میری سانس سینے میں اڑ رہی ہو۔ تھوڑی

دیر میں شاید اندر میرے آنے کی اطلاع کر کے وہ اچھلتا کودتا باہر آیا اور میرا سوٹ کیس اٹھا کر اور کمبل کاندھے پر سے گھسیٹ کر خوش خوش اندر بھاگنے لگا۔ میں نے اس کے سوکھے ہوئے زرد رنگ کے چہرے کو غور سے دیکھا کہ شاید اس غیر معمولی سناٹے کی کوئی تاویل مجھے اس کے بشرے سے حاصل ہو سکے بظاہر میرے آنے کی اُسے خوشی تھی اس لئے کہ وہ برابر مسکرا رہا تھا۔ میں نے ارادہ کیا کہ میں اس سے کچھ پوچھوں لیکن جب تک میں اس سے کوئی سوال کروں وہ "میاں اندر آئیے" کہتا ہوا چھلاوے کی طرح دروازے میں غائب ہو گیا۔

میرے قدم بھاری ہو رہے تھے اور دل میں ان تکلیف دہ خیالات کی بھیڑ تھی جو عموماً امید و بیم کی باہمی کشاکش سے پیدا ہوتے ہیں۔ میں آرزوؤں کا ایک طوفان لے کر اس مکان میں داخل ہوا تھا لیکن یہاں کی پراسرار خاموشی نے میرے دل کو مسوسنا شروع کر دیا۔ لڑکے کے مسکراتے ہوئے چہرے سے البتہ کچھ ڈھارس بندھی تھی لیکن اس کا اعتبار ہی کیا آخر بچہ ہی تو ہے۔ میں نے چپکے چپکے دل میں دعا مانگنا شروع کی کہ خدا کرے اس سناٹے کی وجہ کوئی غیر معمولی بات نہ ہو اور مجھے نا اُمیدی کا سامنا کرنا پڑے مجھے طرح طرح کے خیال آنے لگے اور ایک لمحہ میں جس میں میں نے بدقت مردانہ مکان کے صحن سے لے کر زنانخانہ کے چوکھٹ تک کا فاصلہ طے کیا میرے دماغ کی آنکھوں کے سامنے سیکڑوں تخیلی مناظر یکے بعد دیگرے گزر گئے ——— ایک مرتبہ مجھے معلوم ہوا کہ جیسے زنانہ مکان کے سامنے والے دالان میں تخت کی صاف ستھری چاندنی پر دھانی رنگ کا ڈوپٹہ اوڑھے میری بیوی اپنی نازک لانبی اُنگلیوں سے پان بنا رہی ہے۔ دوسرے لمحہ مجھے نظر آیا کہ تمام زنانخانہ خالی پڑا ہوا ہے۔ ہر طرف سناٹے اور خاموشی کا دور دورہ ہے۔ در و دیوار پر اداسی چھائی ہوئی ہے اور مکان کے کونے کونے سے بے رونقی اور تنہائی کے آثار برس رہے ہیں۔ پھر مجھے معلوم ہوا کہ نہیں یہ سب میری نگاہوں کا دھوکہ تھا۔ وہ کیا سامنے چبوترے پر میری خوشدامن کھڑی ہوئی کل کے انتظامات کے متعلق ہدایتیں کر رہی ہیں داہنے طرف والے کمرہ میں خوب تیز روشنی ہو رہی ہے۔ میری بیوی کا چھریرا جسم خوبصورت لچدار کمان کی طرح ایک بڑے سے ٹرنک پر جھکا ہوا ہے ——— اور وہ اس میں سے ایک ایک کر کے عید میں پہننے کے لئے کپڑے چھانٹ رہی ہے۔ زنانخانہ کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے یہ ہیولا بھی خواب کی طرح دھندلا ہوتے ہوتے آخر غائب ہو گیا اور میں گھبرائے ہوئے قدموں سے مکان کے اندر داخل ہوا۔

صدر دالان میں دھیمی روشنی ہو رہی تھی۔ انا بچے کو گود میں لئے ہوئے ایک پلنگ پر بیٹھی گھٹنا ہلا ہلا کر اُسے سلا رہی تھی۔ بازو والے دونوں کمروں میں اندھیرا پڑا تھا۔ سامنے والے کمرے کے دروازے بند تھے صرف ایک بیچ والا کسیقدر کھلا ہوا تھا۔ باورچی خانہ میں کھانا پکانے والی خادمہ چولھے کے پاس بیٹھی ہوئی اونگھ رہی تھی۔

میں ابھی نصف صحن تک بھی نہیں پہنچا تھا کہ کوٹھے پر سے میری خالہ کی آواز آئی۔ "میاں ادھر زینے پر چلے آؤ۔ اس طرف تمہارا سامان بھی یہیں منگوا لیا ہے"۔

بس اپنا رُخ بدل کر کھٹ کھٹ کرتا ہوا زینے پر چڑھنے لگا۔ یہ محنت کچھ زیادہ سخت نہ تھی لیکن اس وقت بدحواسی کی وجہ سے میری سانس پھولی ہوئی تھی۔ اوپر پہنچتے پہنچتے میں اچھا خاصہ ہانپ رہا تھا اور سر کے بالوں کی جڑیں پسینہ سے بھیگی ہوئی تھیں۔

"نو بجے والی گاڑی سے آئے ہو؟" میری خالہ نے سر سے پیر تک مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "جی ہاں آج گاڑی کسیقدر۔

دیر کر کے آئی"...... میری بے صبری ناقابل برداشت ہوتی جاتی تھی۔ مکان کی خاموشی دیکھ دیکھ کر میرا دم اٹھا جاتا تھا مجھ سے نہ رہا گیا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے سوال کیا "آج یہاں اس قدر سناٹا کیوں ہے۔ جیسے سارا گھر خالی پڑا ہوا ہو"۔ میری خالہ بولیں۔

"تمہارے خسر حکیم صاحب کے یہاں دعوت میں گئے ہوئے ہیں۔ تمہاری خوشدامن کا جی نہیں اچھا ہے۔ تمام بدن میں درد ہے کچھ حرارت بھی معلوم ہوتی ہے۔ وہ بیچاری اوڑھے لپیٹے نیچے کمرے میں پڑی ہیں۔ بچوں نے عید کی خوشی میں اس قدر ادھم مچا رکھا تھا۔ اس قدر آفت برپا کر رکھی تھی کہ خدا کی پناہ! تمام صحن میں کودتے پھرتے تھے چیخ پکار سے سارے مکان کو سر پر اٹھا لیا۔ وہ تو جب میں خوب بکی جھکی اور ایک ایک کو پکڑ کر زبردستی لٹایا ہے تب کہیں کوئی دس منٹ ہوئے سب کے سب سوئے ہیں۔ تمہاری ساس کی ماندگی کا خیال تھا۔ نہیں تو اللہ رکھے بچوں ہی کی ذات سے تو چاند رات میں چہل پہل رہتی ہے۔ نفیس بوا مغرب کی نماز ہی کے وقت سے اپنی بیٹی کے یہاں گئی ہوئی ہیں۔ کہتی تھیں کہ اسے عید کے لئے پان پتے کا خرچ دے آؤں"۔ ... اور میری بیوی؟ میری بیوی کا کوئی تذکرہ نہیں۔ گھر کے چھوٹے سے لیکر بڑے تک سب کا حال بتا گئیں لیکن نہ ذکر کیا تو اسی کا جس کے لئے میں نے ان سے یہ بات پوچھی تھی۔۔۔۔ خسر دعوت میں گئے ہوئے ہیں۔ خوشدامن کی طبیعت خراب ہے بچے سو گئے نصیبا اپنی بیٹی کے یہاں گئی ہوئی ہے۔ لیکن آخر میری بیوی کہاں ہے؟ اس کا کیا حال ہے؟ میں نے تو گھر میں سناٹے کا سبب اسی لئے دریافت کیا تھا کہ خالہ میری بیوی کا ذکر بھی اسی سلسلے میں کریں گی لیکن انھوں نے اشارتاً کنایتاً بھی ان کا نام نہ لیا۔ تو پھر کیا وہ ابھی تک فیض آباد سے واپس نہیں آئیں؟ لیکن انھوں نے تو لکھا تھا کہ وہ عید کے دو روز پہلے بنارس ضرور پہنچ جائیں گی پھر آخر یہ معاملہ کیا ہے؟

میری شادی ہوئے ابھی صرف دو ماہ کا عرصہ ہوا تھا۔ اپنی نئی شریک زندگی کے ساتھ شادمانی اور سرشاری کے دو مختصر ہفتہ گزارنے کے بعد کالج کھلا ہونے کی وجہ سے مجھے مجبوراً اپنی بیوی کو کچھ عرصے کے لئے الوداع کہنا پڑا تھا۔ میری بیوی کو میری والدہ اپنے ساتھ فیض آباد لیتی گئیں اور میں طالبعلمانہ زندگی کی بے تکی جکڑ بندیوں کو سینکڑوں کوسنے دیتا ہوا دہلی چلا آیا۔ یہاں پہنچکر تنہائی اور جدائی کی کوفت کو دور کرنے کا تنہا ذریعہ میری بیوی کے وہ محبت بھرے خطوط ہوتے تھے جن کے ایک ایک حرف سے شریفانہ نسوانی جذبات کی مہک آتی تھی۔ میں ان کے خطوط کے لئے دیوانوں کی طرح بے چین رہا کرتا تھا اور اس زمانہ میں کالج کے ڈاکئے کی وقعت میرے دل میں کسی جج سے کم نہ تھی جس کے ہاتھ میں میری قسمت کا فیصلہ دے دیا گیا ہے۔ میری بیوی نے اپنے آخری خط میں لکھا تھا کہ وہ عید کے دو روز پہلے فیض آباد سے بنارس چلی جائے گی اور دبے دبے بند بند لفظوں میں یہ خواہش بھی ظاہر کی تھی کہ میں بھی عید کی تعطیل میں بنارس آجاؤں — یہی وجہ تھی کہ اس وقت آرزوؤں اور امیدوں کا سمندر میرے سینہ میں ہچکولے کھا رہا تھا، اور میں یہ معلوم کرنے کے لئے تڑپ رہا تھا کہ میری بیوی وہاں موجود ہے یا نہیں! خالہ نے بھی کچھ نہیں بتایا۔ اب آخر کس طرح پوچھوں ان کے علاوہ وہاں کوئی دوسرا ابھی موجود نہیں جس سے کچھ پتہ چلے اور اپنی تمام آزادی اور روشن خیالی کے باوجود مجھ میں ہرگز اتنی ہمت نہ تھی کہ میں جی کڑا کر کے خالہ سے اپنی بیوی کے متعلق کوئی سوال کروں۔ ہندوستانی معاشرت کی بے ڈھنگی پابندیوں نے میرے لبوں پر ایسی

مہر لگا دی تھی ــــــ جسے میری بیباک جرأت بھی نہیں توڑ سکتی تھی۔

"کھانا کھاؤ گے۔ یا پہلے چائے منگاؤں؟" میری خالہ نے پوچھا۔

بھاڑ میں جائے چائے، اور جہنم میں کھانا! جب وہی یہاں موجود نہیں جس کے لئے اتنے دور دراز کے سفر کی صعوبتیں جھیلیں پڑھائی کا ہرج کیا تو پھر دنیا کی ساری راحتیں بیکار ہیں۔ میں یقیناً سفر کی وجہ سے بہت خستہ ہو رہا تھا اور اس تکان کو دور کرنے کے لئے گرم چائے کی ایک پیالی سے بہتر کوئی علاج نہیں تھا۔ لیکن خدا جانتا ہے کہ مجھے خالہ کا یہ سوال زہر معلوم ہوا۔ میری طبیعت بے اختیار چاہتی تھی کہ کسی طرح ہمت کر کے چلا نے لگوں کہ

"سنئے خالہ جان! نہ میں چائے پیوں گا نہ کھانے کی مجھے مطلق خواہش ہے آپ لوگوں کو دوسرے کے احساسات کا بالکل خیال نہیں ہوتا .... دنیا جہان کی باتیں آپ نے کر ڈالیں۔ محلے بھر کا حال بتا گئیں پھر چائے اور کھانے کی صلاح بھی کرنے لگیں لیکن یہ نہ ہوا کہ میری بیوی کا کچھ حال بتائیں۔ آخر اس قدر پریشان کرنے سے کیا فائدہ؟ سنتی ہیں آپ؟ .. .."

لیکن میں یہ کچھ نہ کہہ سکا۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ کسی طرح مجھ میں اس وقت جرأت پیدا ہو جائے، لیکن جیسے کسی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ مری ہوئی آواز میں بے دلی کے ساتھ میں بولا "چائے! ــــــ جی ہاں منگوا دیجئے۔ پی لوں گا"

"ہاں تھوڑی سی گرم گرم چائے پی لو تو ذرا جان میں جان آ جائے۔ تم تھک گئے ہو گے۔ اور دیکھو وہ سامنے کوٹھے میں تمہارا بکس رکھوا دیا ہے شیروانی اتار کر ٹانگ دو منہ ہاتھ دھو ڈالو" اور یہ کہتی ہوئی وہ زینہ پر سے اتر گئیں

اسوقت میری طبیعت اس قدر الجھ رہی تھی کہ جی چاہتا تھا اپنی بوٹیاں نوچ ڈالوں میری الجھن کی حالت کسی طرح اس مجرم سے کم نہیں تھی جو امید اور مایوسی کی درمیانی حالت میں سر لٹکائے حاکم کے سامنے اپنے فیصلہ کے سنائے جانیکا انتظار کر رہا ہو اور حاکم انتہائی لاپرواہی اور بے خیالی کے ساتھ دوسرے کاموں میں اس طرح مشغول ہو جیسے اُسے آج کسی مقدمہ کا فیصلہ سنانا ہی نہیں ہے۔ میں نے غصے اور جھنجھلاہٹ کی وحشیانہ نوچ کھسوٹ میں شیروانی اتاری۔ جوتا اور موزہ بھی کھینچ تان کر پیروں سے علٰحدہ کیا۔ شیروانی کو کھونٹی پر ٹانگنے کے بجائے اُسے ٹوپی کے ساتھ پلنگ پر دے مارا، اور ایک بدمزاج ہارے ہوئے جواری کی طرح حواس درست کرنے کے لئے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارنے لگا ــــــ اتنے میں بڑی خالہ اوپر آ گئیں۔ آگے آگے وہ اور ان کے پیچھے ہاتھ میں چائے کی کشتی لئے ہوئے لڑکا ــــــ

میری خالہ ہمیشہ سے بہت باتونی ہیں۔ اس قدر باتیں کرتی ہیں، اس قدر باتیں کرتی ہیں کہ جان عاجز آ جاتی ہے وہ مجھ سے اپنے بچوں کی طرح محبت کرتی ہیں۔ لیکن بعض اوقات انکی محبت آرام پہنچانے کے بجائے بے حد تکلیف دہ ثابت ہوتی ہے اخلاق و تواضع کی انکی مذہب میں اس قدر اہمیت ہے کہ چاہے آپ علالت کا عذر کیجئے چاہے شکم سیری کا اُن کے آگے ایک بھی نہ چلے گی اور وہ ہمیشہ آپ کے عذر کو تکلف و شرم پر محمول کر کے جہاں تک اُن کا بس چلے گا آپ کو ٹھنسا ٹھنسا کر کھلا دیں گی۔ پھر چاہے آپ کو بد ہضمی ہو جائے چاہے معدہ خراب ہو اس سے اُنھیں کوئی غرض نہیں، وہ اپنی مادرانہ شفقت کے فرائض سے عہدہ برآ ہو گئیں بس، یہ احساس اُن کے ضمیر کو مطمئن کرنے

کے لئے کافی ہے۔

میں نے چائے دانی میں سے گہرے سنہرے رنگ کی خوشبودار چائے پیالی میں انڈیلنا شروع کی اور خالہ نے حسب عادت اپنے بیٹھ کر ادھر ادھر کے قصے قضیئے چھیڑ دئے۔

"حکیم صاحب کو لڑکی کے جہیز کی بڑی فکر ہے کہتے تھے کہ میرے نہ کوئی لڑکا نہ بالا ——— بس لے دے کے یہی ایک لڑکی سارے گھر کا اجالا ہے مجھے اپنا روپیہ کوئی قبر میں تو لے جانا نہیں ہے کہ میں بیاہ میں ہاتھ روک روک کر پیسہ اٹھاؤں۔ اب اس موقع پر بھی ارمان نہ نکالوں گا تو یہ ساری جمع جتھا کس روز کام آئے گی۔ بس میاں اب تم یہ سمجھو کہ سارے کپڑے لتے گہنا پاتا تیار ہے فقط ایک چاندی کی مسہری تو البتہ کاریگر نے ابھی تک بنا کر نہیں دی باقی سب بیاہ کا سامان ——— اے میاں شکر اور ڈالو بھلا دو چمچوں میں کیا ہوتا ہے؟ پھیکی چائے پینے سے کیا فائدہ۔ آج کل کے لڑکوں نے عجب رواج نکالا ہے کہ ہر چیز میں موئے فرنگیوں کی طرح مٹھاس کم ہو ——— تو بھیا بس نکاح کی تاریخ ٹھہرنے کی کسر ہے۔ باقی تو دونوں طرف سے سب ٹھیک ٹھاک ہے"

مجھے خالہ کی باتوں سے سخت الجھن ہو رہی تھی۔ میرا جسم بالکل ٹھنڈا تھا اور جب گرم چائے کی بھاپ میرے ماتھے سے ٹکراتی تھی تو مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرا ماتھا برف کی ایک قاش کی طرح سرد ہے۔ میں جھنجھلا رہا تھا کہ عورتیں فضول باتیں کرنے کی کس قدر عادی ہوتی ہیں خصوصاً گھر کی بڑی بوڑھیاں۔ جن کے پاس خانگی جھگڑے رشتہ داروں کی آپس میں شکر رنجیاں، بال بچوں کی علالت شادی بیاہ کے قصے، مہمانوں کے کپڑوں اور زیور کی نکتہ چینیوں کے علاوہ بات کرنے کے لئے کوئی دوسرا تذکرہ ہی نہیں ہوتا ———

مجھے رہ رہ کر تاؤ آ رہا تھا کہ میری خالہ تمام بے کار تذکرے جن سے مجھے کوئی سروکار نہیں اڑاتی چلی جا رہی ہیں۔ لیکن یہ نہیں ہوتا کہ مجھ سے کوئی ایسا ذکر کریں جس میں میری بیوی کا نام آئے۔ میں نے کان لگا کر سننا شروع کیا نیچے صحن سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ نہ کسی کے باتیں کرنے کی نہ قدموں کی آہٹ کی۔ میں نے خیال کیا کہ اگر میری بیوی مکان میں موجود ہوتی تو ضرور کسی نہ کسی گوشے سے اُس کی ہلکی سریلی آواز میرے کانوں تک پہنچتی۔ یقیناً وہ فیض آباد سے نہیں آئی۔ اُف وہ مجھے اس وقت کس قدر صدمہ تھا!

میری خالہ نے پھر کہنا شروع کیا۔

"نواب صاحب کے نئے مکان میں کوئی لکھنؤ کے رہنے والے کرایہ دار اترے ہیں۔ ویسے ہیں تو حیثیت دار مگر ایسی دولت بھی کس کام کی جو مزاج بگاڑ دے۔ گھر کی عورتیں تو اس قدر بد دماغ ہیں کہ اللہ پناہ میں رکھے میں نے تو انہیں باتوں سے جل کر برسوں گھر کی اینٹوں سے چنوا دی۔ اے ہاں۔ کون ایسے سر پھروں سے میل جول رکھے ——— میاں واہ! تم تو خالی پیٹ میں چائے پئے چلے جا رہے ہو میں کہتی ہوں کہیں گرم گرم چائے خالی پیٹ میں نقصان نہ کر جائے پہلے کچھ کھا لو پھر چائے پینا" یہ کہتے ہوئے انھوں نے ہاتھ بڑھا کر نمکین سموسوں کی طشتری میری طرف سرکا دی۔ مجھے غصہ اور جھنجھلاہٹ کی وجہ سے چائے تک کڑوی معلوم ہو رہی تھی کسی اور چیز کا کیا ذکر ہے ویسے تو میں نے پوری پیالی کو چائے سے بھر لیا تھا لیکن ہر گھونٹ بے دلی کی وجہ سے آخری گھونٹ معلوم ہوتا تھا اور میری طبیعت چاہتی تھی کہ یونہی چائے ختم کئے بغیر یوں ہی اُٹھ کھڑا ہوں لیکن ساتھ ہی میں خالہ کی استبداد سے بھی واقف تھا اس لئے میں عجب

کشمکش میں بتلا تھا: مجھ سے چائے پی جاتی تھی، نہ باتیں کی جاتی تھیں نہ توجہ سے خالہ کی گفتگو سنی جاتی تھی۔ مجھے اس ایک لمحے میں اپنی خالہ سے انتہائی کوفت ہونے لگی دل چاہتا تھا کہ وہ فوراً وہاں سے اٹھ کر چلی جائیں ایک تو میں یوں ہی ان کی بیکار باتوں سے اکتا رہا تھا اس پر انکا اصرار اور بھی جلتے توے پر پانی کا کام دیتا تھا: "اے یہ مٹھائی تو تم نے کھائی ہی نہیں۔ لو یہ سنترے چکھ کر دیکھو تمہارے خسر نے ناگپور سے منگائے تھے۔" اجی تم تو بیٹھے چائے سے کھیل رہے ہو۔ آخر کچھ کھاتے پیتے کیوں نہیں۔" یا اللہ آخر کس گناہ کی پاداش میں مجھے یہ سزا مل رہی ہے۔ جب میں نے صاف صاف کہدیا کہ میری طبیعت نہیں چاہتی تو پھر آخر کیوں وہ کھلا کھلا کر مجھے مار ڈالنا چاہتی ہیں۔ میرے دل میں بچوں کی سی ایک مضحکہ خیز خواہش پیدا ہوئی۔ میرا دل چاہا کہ جس طرح انھوں نے مجھے یہ بتایا کہ سنترے تمہارے خسر نے ناگپور سے منگائے تھے اسی طرح وہ زعفرانی رنگ کے خوشنما حلوے کی طرف اشارہ کرکے مجھ سے کہنے لگیں "اور یہ حلوا تمہاری بیوی نے بنایا تھا" مگر میری بیوی سے تو انھیں جیسے چڑھ سی ہوگئی ہو کہ کسی سلسلے میں کسی طرح اس کا نام تک انکی زبان پر نہیں آتا .... مجھے ہر چیز سے اس وقت الجھن ہو رہی تھی چائے کا گھونٹ حلق میں اٹک اٹک کر جا رہا تھا۔ کشتی میں کھانے کی چیزیں دیکھ دیکھ کر میری طبیعت مالش کر رہی تھی۔

کسی طرح جلدی جلدی چائے کی پیالی الٹی سیدھی ختم کرکے میں نے کشتی اپنے سامنے سے سرکا دی اور اس خیال سے کہ کہیں اسی وقفہ میں خالہ جان لڑکے کو کھانا لانے کا نادری حکم نہ صادر فرما دیں، میں نے جلدی سے پیش بندی کے طور پر کہہ دیا۔

"راستہ میں ریل پر بھی کچھ ناشتہ کر لیا تھا۔ پھر یہاں آکر بھی اسوقت چائے پی لی۔ اب بھوک نہیں۔ اس وقت کھانا نہیں کھاؤنگا۔" اے واہ یہ بھی کوئی بات ہے۔ لو بھلا تم نے کھایا ہی کیا۔ ساری چیزیں تو ویسی کی ویسی ہی رکھی ہوئی ہیں۔ بیٹا تم نے تو کچھ چھوا تک نہیں۔ رات کو بے کھائے سونا اچھا نہیں۔ کچھ نہیں تو دو چار نوالے ہی کھا لو۔"

جھنجھلاہٹ کی وجہ سے میرے ماتھے پر بل پڑ گئے لیکن میں نے فوراً اپنے چہرے پر بناوٹی شگفتگی پیدا کرکے کہا "نہیں خالہ میں جھوٹ نہیں کہتا۔ سچ سچ اس وقت مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔"

اس کے بعد میری خالہ نے بڑا سا پاندان اپنے آگے گھسیٹ لیا اور پان کی گلوریاں بنانے لگیں۔ میں جانتا تھا کہ اگر جلدی مجھے کوئی ترکیب نہ سوجھی تو خالہ جان بغیر دس بارہ پانوں کی گلوریاں بنائے پاندان بند نہیں کریں گی اور اسمیں انھیں کسی طرح پندرہ منٹ سے کم نہیں لگیں گے۔ اس لئے کہ انھیں پان بناتے میں ادھر ادھر کی باتیں کرنیکا مرض ہے۔ میں نے پہلے ایک مصنوعی جماہی لیتے ہوئے منہ کھولا۔ پھر ہاتھ پھیلا کر انگڑائی لی اور آنکھوں کو بند کرکے ہلکے جھکولے کے ساتھ آگے کی طرف اس جھوم گیا جیسے مجھے بری طرح نیند آ رہی ہو۔

"لو۔ تم تو اونگھ رہے ہو۔ آج گیارہ ہی بجے سے نیند آگئی کیا؟"

"میں نے فوراً بات بنائی رات کو ریل پر سونے کو تھوڑی ملا۔ راستہ میں مسافروں کی وہ بھیڑ تھی کہ ایک پر ایک گرا پڑتا تھا۔ ایک منٹ کو بھی پلک سے نہیں جھپکی۔"

"اچھا تو اب میں جاتی ہوں عید کی نماز کے لئے تڑکے اٹھنا بھی ہے۔ پھر ماشا اللہ بال بچوں کا گھر۔ وہ اندھیرے منہ ہی غل مچانا شروع کر دیں گے۔ پھر بھلا کوئی سو تھوڑی سکتا ہے۔ اور ہاں بچوں کے ذکر پر خیال آیا جمیلہ تمہیں بہت یاد کرتی تھی۔ کہتی تھی اب کی دولھا بھائی آئیں گے تو میں اُن سے کتابوں کے لئے ننھی سی الماری منگواؤں گی۔ اس پر شاہد بولا میں کتابیں نکال کر پھینک دونگا اور اس میں اپنے کبوتر پالونگا۔ اس پر دونوں میں خوب لڑائی ہوئی۔ پہلے تو زبانی تو تو میں میں ہوتی رہی۔ پھر دھینگا مشتی ہونے ہی کو تھی کہ میں نے اُٹھکر بیچ بچاؤ کر دیا تب کہیں جاکر دونوں الگ ہوئے ہیں۔ جب تک تمہارے خسر گھر میں رہتے ہیں تب تک تو ذرا امن رہتا ہے۔ ادھر انھوں نے گھر سے قدم نکالا اور ادھر بچوں نے ادھم سے سارا گھر سر پر اٹھالیا۔ بعض وقت تو ایسا ناک میں دم آتا ہے کہ طبیعت چاہتی ہے سب کو پکڑ کر کوٹھری میں بند کر دوں اور باہر سے کنڈی لگا دوں۔ لیکن سچ پوچھو تو اللہ رکھے انہیں کے دم قدم سے گھر کی رونق ہے۔ یہ ادھم شور تو جی کے ساتھ ......" میرا پیمانۂ صبر بالکل لبریز ہو چکا تھا، گستاخی کا خیال کئے بغیر میں جلدی سے ان کی بات کاٹ کر چلا اٹھا۔

"بس خالہ۔ اب آپ کو بھی دیر ہو رہی ہے اور مجھے بھی نیند کی وجہ سے جھونکے پر جھونکے چلے آرہے ہیں۔ اس وقت مجھے سو رہنے دیجئے۔ اب انشاء اللہ کل اطمینان سے باتیں ہونگی۔"

خدا خدا کر کے میری خالہ لیمپ کی روشنی اور کمرے کے بند کرنے کے متعلق کوئی نصف درجن متفرق ہدایتیں کر کے نیچے چلی گئیں اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میرے سینے پر سے ایک وزنی بوجھ اتر گیا ہو۔

اسوقت میرا مزاج درجہ بدرجہ چڑچڑا ہو رہا تھا اور مجھے اپنے گرد و پیش کی ہر چیز پر خواہ مخواہ غصہ آرہا تھا میں اپنی نظروں کے سامنے تمام خوشنما ہوائی محل ایک ایک کر کے گرتے ہوئے دیکھ رہا تھا میرے تمام ولولوں، تمام پر لطف توقعات کی عمارت ایک کمزور پتے کی طرح کانپ رہی تھی اور مجھے ایسا معلوم ہونا تھا جیسے خواب میں بیشمار دولت ملنے کے بعد یکایک بیدار ہونے پر مجھے اس تلخ حقیقت کا احساس ہو کہ کسی عظیم الشان محل کی آراستہ خوابگاہ میں ریشمی پردوں کی شاہانہ مسہری پر سونے کے بجائے میں اپنے بستر ہی پر پڑا ہوا کروٹیں بدل رہا ہوں۔ کمرے کی دیوار پر ایک پرانی وضع کی بھدی گھڑی ٹک ٹک کر رہی تھی۔ سامنے والی صحنچی میں ایک سیاہ بلی کے خرخر کی آواز آرہی تھی میں اس قدر جھلا بھنا ہوا تھا کہ مجھے بالکل یہ معلوم ہوا گویا گھڑی اور بلی دونوں میرے منصوبوں کو خاک میں ملتا ہوا دیکھ کر میری ہنسی اڑا رہے ہیں۔

میں جھنجھلا کر بستر پر دراز ہو گیا اور مجھے باری باری اپنے اوپر، اپنی بیوی پر اور اپنی خالہ پر غصہ آنے لگا۔ میں دل ہی دل میں یہ سوچ کر اپنے کو لعن طعن کرنے لگا کہ ایسی بھی بے تابی کس کام کی کہ ساری پڑھائی چھوڑ چھاڑ بیوی کی محبت میں دیوانوں کی طرح اتنی دور سے دوڑے چلے آرہے ہیں۔ پھر مجھے اپنی بیوی پر غصہ آنے لگا کہ عجیب لڑکی ہے بے سوچے سمجھے خط میں لکھ مارا کہ میں عید سے دو روز پہلے پہنچ جاؤں گی۔

لیکن سب سے زیادہ برہمی تو مجھے اپنی خالہ سے تھی کہ اتنا سن آگیا۔ زمانہ کے سیکڑوں تجربے حاصل کئے، اتنی اٹکل نہیں

کو صریحاً جانتی ہیں کہ میں اپنی بیوی کا حال سننے کے لئے بے چینی سے منتظر ہوں لیکن وہ ہیں کہ ساری خدائی کے تذکرے کر کر کے مجھے ستا دیا مگر ایک جملہ ایک لفظ بھی میری بیوی کے متعلق نہیں کہا۔ پھر میں سوچنے لگا کہ یہ سارا نقص اس وجہ سے ہے کہ عورتیں تعلیم کی کمی کے سبب بالکل ناقص العقل ہوتی ہیں۔ ذرا سی عام سمجھ کی بات بھی ان کے دماغ میں نہیں آتی۔ اسی کے بعد میں ایک پرغور فلسفی کی طرح عورتوں کی ناقص تعلیم کے اسباب و علل پر نظر ڈالنے لگا۔ پھر میں نے اپنے دل میں کہا کہ اس میں بے چاری عورتوں کا کیا قصور ہے؟ ساری خطا تو ان تاریک خیال متعصب مردوں کی ہے جو اپنی عورتوں کو صحیح تعلیم و تربیت دلانے کے بجائے انھیں پالتو چڑیوں کی طرح گھر کے پنجروں میں بند کر کے رکھتے ہیں۔ کیا اندھیر ہے کہ جہالت کے ہاتھوں سیکڑوں بے تکے رواج روز بروز پیدا ہوتے جائیں لیکن کوئی کروٹ تک نہ لے اور ہمارے یہاں یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ گھر کی بڑی بوڑھی کے سامنے آپس میں باتیں کرنا تو درکنار شوہر و بیوی کسی تیسرے شخص سے ایک دوسرے کے متعلق کوئی بات بھی نہیں پوچھ سکتے —— تف ہے ایسی معاشرت پر اور لعنت ہے اس ملک پر جہاں ایسی رسمیں برتی جائیں ....!

میں یہی سوچتے سوچتے چھت کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگا جہاں کونے میں ایک چھوٹی سی مکڑی نے اپنا جالا بنایا تھا۔ ابھی میں دل میں مکڑی کے جالے کی حیرت انگیز صنعت کی داد بھی نہیں دے چکا تھا کہ مجھے زینہ پر پیروں کی آہٹ سنائی دی۔ میں فوراً کھٹکا کہ خالہ کوئی چیز بھول گئی ہیں اسے لینے کیلئے واپس آ رہی ہیں میں جانتا تھا کہ اگر انھوں نے مجھے جاگتا پایا تو تعظیماً مجھے اٹھ کر بیٹھ جانا پڑے گا اور وہ پھر کوئی نہ کوئی بے کار تذکرہ چھیڑ دیں گی۔ اور چاہے وہ ایک سوئی ہی لینے کیوں نہ آئی ہوں لیکن پھر باتوں میں لگ گئیں تو دس پندرہ منٹ سے پہلے ہلنے کا نام تک نہ لیں گی۔ میں نے بجلی کی سرعت کے ساتھ پائنتی سے چادر گھسیٹ کر اپنے اوپر تان لی اور زور زور خراٹے لینے لگا زینہ پر قدموں کی آہٹ بڑھتی جاتی تھی اور اس کے ساتھ میرے خراٹوں کی آواز بھی بلند ہوتی جاتی تھی۔ میں سمٹا سمٹایا پلنگ پر بنا ہوا پڑا تھا اور دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ کہیں خالہ کو مجھ ہی سے کوئی کام نہ نکل آئے کہ اور بھی غضب ہو۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر انھیں مجھ سے کوئی بات کہنا ہوگی تو پھر وہ بغیر اس کا خیال کئے ہوئے کہ میں سو رہا ہوں مجھے شانہ پکڑ کر جھنجھوڑنے لگیں گی لیکن اسوقت مجھے اس قدر غصہ تھا کہ میں نے ارادہ کر لیا کہ ادھر کی دنیا ادھر ہو جائے، شانہ پکڑ کر جھنجھوڑنا تو ایک طرف چاہے وہ میری ٹانگ گھسیٹ کر پلنگ کے نیچے ہی کیوں نہ پھینک دیں مگر میں ہرگز ہرگز نہ اٹھوں گا۔ اسی ناراضگی اور جھنجھلاہٹ میں میں نے یہ بھی عہد کر لیا کہ صبح عید کی نماز سے فارغ ہوتے ہی میں آٹھ بجے کی گاڑی سے دہلی واپس چلا جاؤں گا .... میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ رنگین کپڑوں کی ایک ہلکی پھلکی رنگین گٹھری دھم سے میری ٹانگوں پر آ گری میں چارپائی سے اچھل پڑا اور گھبرا کر منہ پر سے چادر ہٹا کر دیکھا۔ میری بیوی بانکی سجی ہوئی گھونگھٹ کی آڑ میں سے مسکرا رہی تھی اور کمرہ عطر کی خوشبو سے مہک رہا تھا!

ذوقی ۔ بی ۔ اے (علیگ)

مراثی انیس کا حیدرآبادی اڈیشن

اور

نظامی پریس بدایوں کا ایک اور عجیب کارنامہ

۱۹۰۵ء میں واقعات انیس (سوانح عمری میر انیس) لکھنے کے بعد برسوں یہ خیال دماغ میں گردش کرتا رہا کہ ایک بہترین اڈیشن تصنیفات انیس کا شائع کیا جائے جو بحیثیت ظاہر دیدہ فریب اور باعتبار صحت قابل اعتماد و اعتبار ہو کیونکہ مطبوعہ جلدوں میں کلام انیس پایۂ اعتبار سے ساقط ہے جس قدر جلدیں مراثی انیس کی چھپی ہیں ان میں صحت کلام کی جانب توجہ مبذول نہیں ہوئی یعنی نہ تو صحیح مرثیے حاصل کرنے کا کوئی معقول ذریعہ تلاش کیا گیا اور نہ ہنگام طبع کسی اہل شخص سے پروف صحیح کرنے کی استدعا کی گئی اس خود غرضی سے ایک نامور شاعر کی تصنیف کا خون کیا گیا اور ہزاروں اعتراض اس کم توجہی کی بدولت کلام انیس پر ایسے وارد ہو گئے جن کا جواب دینا آج مشکل ہے اس نقصان عظیم پر نظر کرتے ہوئے میرا قصد ہوا کہ میں اس خدمت کو انجام دوں جو باعتبار حقوق دیرینہ میرا فرض ہے اور میرے پاس کلام صحیح شائع کرنے کے بہترین ذرائع بھی موجود تھے۔ میرے والد کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مرثیے اور استاد معظم جناب نفیس اعلی اللہ مقامہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے مرثیے اب تک خاندان انیس میں اور خود میرے گھر میں محفوظ تھے لیکن بایں ہمہ انسان اپنے ارادوں پر قادر نہیں واقعات عالم نے یہ آرزو پوری نہ ہونے دی فرائض ملازمت سے اتنا وقت ممکن نہ ہوا کہ اس مقدس فرض کو ادا کرتا۔

۱۹۲۰ء میں زندگی نے ایک دوسرا پہلو بدلا اور آنریبل سر راجہ صاحب بہادر والی ریاست عالیہ محمود آباد نے عزت افزائی فرما کر خدمت رکاب سعادت سے سرفراز فرمایا۔ راجہ صاحب کا دربار چونکہ اپنے علمی چرچوں کی بنا پر خصوصیت خاصہ رکھتا ہے اس سلسلہ میں بارہا جناب انیس اللہ مقامہ کا بھی ذکر آیا اس لئے میرے لئے کافی موقع تھا کہ اس خیال کو قوت سے فعل میں لاتا، لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اس فرصت سے فائدہ نہ اٹھایا اور وقت گزرتا گیا۔

ایک زمانہ کے بعد ریاست حیدرآباد کا جدید اڈیشن مراثی انیس کا سرکار والا کی نظر سے گزرا تو ان کے اضطراب کی حد نہ رہی، ان کا رنج بیجا نہ تھا کیونکہ میر انیس مرحوم کا بہت زیادہ کلام ان کے حافظہ میں محفوظ ہے ہجوم اغلاط سے وہ پریشان ہو گئے۔ میں نے بھی اس مجموعہ کو دیکھا اس مجلد پر جناب نظامی بدایونی نے ایک مختصر سا مقدمہ بھی لکھا ہے مقدمہ نویس صاحب نے انیس مرحوم کے حالات زندگی پر اپنی معلومات کی روشنی ڈالی ہے اس کی نسبت میں کچھ نہیں چاہتا کیونکہ اس کے متعلق پہلے اک مستقل کتاب پیش کر چکا ہوں۔ حضرت نظامی بدایونی یہ بھی تحریر فرماتے ہیں کہ اس جلد کی تصحیح و ترتیب میں سید علی حیدر صاحب طباطبائی اور مسٹر ماس مسعود صاحب کو بہت دخل ہے اس صورت میں طبع جدید کی تمام تر ذمہ داریاں ان بزرگواروں سے منسوب کی جا سکتی ہیں

لیکن یہ امر مشکل سے قبول کیا جا سکتا ہے کہ ایسے ذی علم مشاہیر سے ایسی ناگوار فرد گذاشت ہوئی ہو اس میں شک نہیں کہ بعض بعض مقام پر ایسی فاش غلطیاں ہیں کہ معمولی لکھا پڑھا آدمی بھی اپنی نیک نیتی سے کاتب کی غلطی سمجھے گا لیکن کاتب کی غلطی منتظم کی غلطی کا نتیجہ سمجھی جائیگی ہم کاتب کا گناہ کاتب کے نامۂ اعمال میں نہیں لکھیں گے اور اس الزام کا رُخ اپنے مرکز اصلی کی جانب پھر جائیگا اور کلام انیس کی مجروحیت کا دعویٰ ارباب حل وعقد سے متعلق کیا جائیگا۔ سلطان دکن کے عطیۂ شاہانہ کا مصرف بیجا ثابت ہو اور اشاعت جدید کا صحیح مقصد کالعدم ہوگیا۔ حضرت بدایونی نے کلام انیس پر تنقید بھی کی ہے مگر لطف یہ ہے کہ جو کلام موقف تنقید رہے وہ بھی غلطی بلکہ تحریف وتدلیس سے پاک نہیں۔ ملاحظہ ہو (آمد حر کی تصویر)

زور بازو کا نمایاں تھا بھرے شانوں سے

برچھیوں اڑتا تھا دب دب کے فرس رانوں سے

تنقید میں جو کچھ مدح سرائی کی گئی ہے وہ پایۂ اعتبار سے اس لئے ساقط ہے کہ انیس مرحوم کا مصرعہ ثانی حالت تحریف میں ہے وہ یوں ہے "برچھیوں اوڑجاتا تھا دب دب کے فرس رانوں سے"

یہی تو سید محترم کی شاعری کا معجزہ ہے کہ ذرا تغیر وتبدل ہوا اور حسن بیان کے ساتھ حسن معنی بھی رخصت ہوگیا۔ برچھیوں اور برچھوں کا فرق محسوس کرنا ہر شخص کا کام نہیں۔ (پسران جناب زینب کی تصویر) پیش کی گئی ہے :-

انکھیں جو نرگسی ہیں تو رُخ بھولے بھالے ہیں

نذروں کے منتوں کے مرادوں کے پالے ہیں

نازوں کا پالا یا نازوں کے پالے میر انیس کا کلام ہو ہی نہیں سکتا۔ بجائے نذروں کے نازوں چاہئیے اگر صد جلد مراثی انیس سے آرائش صوری مقصود تھی تو یہ تمنا پوری ہوگئی اور اگر خدمت زبان اردو مطلوب تھی تو مدعا مفقود ہے۔ دنیا شہرت پسند ظاہر پرست ہے اس لئے بڑی بڑی ذمہ داریوں کے کام مشاہیر کے ہاتھ میں دے دئیے جاتے ہیں قناعت پیشہ اہل کمال کی طرف توجہ نہیں کی جاتی جن کو بدقسمتی نے گھر کی ٹوٹی چار دیواری میں زاویہ نشین کردیا وہ اپنی آنکھوں سے اپنے حقوق کی پامالی دیکھتے ہیں اور خاموش ہیں کمال اہل کمال کے جسم فانی کے ساتھ قبروں میں دفن ہو رہا ہے اس اجڑے ہوے لکھنؤ میں اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں کہ اگر یہ کام ان کے ہاتھ میں دیدیا جاتا تو میر انیس کے پیکر مردہ میں روح عود کر آتی۔

جناب سید علی حیدر صاحب طباطبائی ہمارے عہد کے مشاہیر اہل کمال سے ہیں اور ایک زمانہ دراز سے وہ ریاست حیدرآباد میں مناصب جلیلہ پر سرفراز ہیں میر انیس کے جاننے والے بلکہ پہچاننے والے ہیں تلاش کرنے سے بھی اب ایسے لوگ کم نکلیں گے جنہوں نے میر صاحب مرحوم کو بچشم خود دیکھا ہو یا ان کی صحبت میں شریک ہوئے ہوں، سید صاحب موصوف انھیں باقیات الصالحات میں ہیں اور جہاں تک مجھے علم ہے انیس وکلام انیس سے عقیدت بھی رکھتے ہیں، مگر باوجود ان خصوصیات کے سید صاحب کی کم توجہی وتغافل مقام افسوس ہے۔ سید صاحب یہ کہکر نہیں چھوٹ سکتے کہ مجھے اس اڈیشن سے کوئی تعلق نہیں۔

بڑا سخت سوال پیدا ہوگا کہ کیوں تعلق نہیں رہا تھا لیکن اگر آپ اس کام کے اہل تھے تو آپ نے اپنی ذات کو کیوں بے تعلق رکھا میر انیس کی روح اور ان کے کلام کو سید صاحب سے شکوہ یہ ہے ریاست کی نیکنامی اور میر انیس کی محبت کا مقتضا تھا کہ وہ اس کام میں دلچسپی لیتے ہمیں افسوس ہے کہ انھوں نے کمی کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب یہ جدید جلد مراثی انیس ظاہری چمک دمک دکھاتی ہوئی ارباب ذوق کے ہاتھوں میں پہونچ گئی تو مشتاقان کلام انیس کو بجائے مسرت کے ایک قسم کا انقباض ہوا اور جو بیدلی وابستۂ انتظار تھیں ان کا خون ہوگیا ہندوستان کے اہل قلم نے اردو اخباروں اور ادبی رسالوں میں صدائے استغاثہ بلند کی جناب میر خورشید حسن صاحب عروج عرف دولہا صاحب نے بھی افسوسناک اثر لیا یہاں تک کہ ایک روز مجھ سے ارشاد فرمایا کہ حضرت آپ کے دادا اوستاد کے کلام سے یہ بیرحمانہ سلوک کیا گیا تعجب ہے کہ آپ خاموش ہیں میں نے عرض کیا کہ میں کیا کروں اور کیا کرسکتا ہوں فرمایا کہ کم ازکم اس کے متعلق کوئی مضمون تو لکھیے تاکہ دنیا اس انقلاب عظیم سے واقف تو ہوجائے ایسا نہ ہو کہ وہ لوگ اس فروگذاشت کو کارنمایاں سمجھکر دوسری جلد شائع کرنے کی جسارت کر بیٹھیں۔ حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ میں زندہ موجود ہوں اور میرے مشورہ کی بغیر اس کام میں ہاتھ ڈالنے کی ہمت کیونکر کیگئی بہرکیف ہیچمدان نے ایک مختصر مضمون لکھکر بدرمعظم جناب دولہا صاحب کی خدمت میں حاضر کردیا اتفاقاً اسی زمانہ میں کوئی صاحب حیدرآباد سے لکھنؤ میں تشریف لائے ہوئے تھے جناب دولہا صاحب نے ان سے بھی اس مضمون کا تذکرہ کیا حیدرآبادی صاحب نے فرمایا کہ آپ اس کی اشاعت کو روکیں میں حیدرآباد جارہا ہوں وہاں پہونچکر کسی مناسب صورت میں ان غلطیوں کی اصلاح ہوجائیگی چنانچہ وہ بزرگوار حیدرآباد تشریف لیگئے اور پھر کوئی جواب نہ ملا۔

اس کے بعد واقعات و حالات نے مجھے بھی اس طرف سے خالی الذہن کردیا اور بات آئی گئی ہوئی اب نگار کے کسی گذشتہ رسالہ میں کلام دبیر کے نسخہ پر تنقید کے سلسلہ میں نظامی پریس کا نام دیکھکر پھر مجھے اس کا خیال آگیا اور پرانے کاغذات میں چند وہ اوراق مل گئے جنمیں ان اغلاط کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ فہرست صرف چند مرثیوں کے استقصا کا نتیجہ ہے لیکن کم ازکم اس سے یہ اندازہ ضرور ہوسکتا ہے کہ غلطیاں کس قدر عجیب وغریب ہیں اور نیز یہ کہ اگر سب جمع کی جائیں تو نہایت معقول دفتر اغلاط کا مرتب ہوسکتا ہے۔

ذیل کی فہرست سے زیادہ تفصیل کے ساتھ ان غلطیوں کی نوعیت معلوم ہوسکتی ہے۔

غلط	صحیح
واقف ہیں سبھی حیدر جعفر کے شرف سے	واقف ہیں سبھی حیدر و جعفر کے شرف سے
ہر روز یہ بھائی کی ثنا کرتا تھا بھائی	ہر دم یہ بھائی کے ثنا کرتا تھا بھائی
جیتے رہو اماں در خیمہ پہ کھڑی تھی بہن	جیتے رہو اماں در خیمہ پہ کھڑی تھی بہن

غلط	صحیح
وہ لوٹتے ہیں خاک پہ وہ عرش کے تارے	وہ لوٹتے ہیں خاک پہ وہ عرش کے تارے
جھک جھک کے جست کرتا ہو کوئی فرس کا تنگ	جھک جھک کے جست کرتا ہے کوئی فرس کا تنگ
خادم جوتر لئے ہیں مگس ران ادھر ادھر	خادم چنور لئے ہیں مگس ران ادھر ادھر
ولیں کہ اب نہ ہوش نہ مجھ میں حواس تھے	بولیں کہ اب نہ ہوش نہ مجھ میں حواس ہیں
پہلو میں قلب وہ جو ہمیشہ کھڑا رہا	پہلو میں قلب وہ جو ہمیشہ کھرا رہا
گرمی کے مارے دم ہیں سبھوں کے رکے ہوئے	گرمی کے مارے دم ہیں سبھوں کے گھٹے ہوئے
دونوں طرف آل تھمارا انجیر ہے	دونوں طرح آل تمہارا بخیر ہے
دو چار تیر آگے گرے جب قریب در	دو چار تیر آکے گرے جب قریب در
ایک دو لاکھ سواروں میں بہا دیکھا حرم	ایک دو لاکھ جوانوں میں بہادر تھا حر
حاکم شاہ ہے جابر وہ سزا دیگا ضرور	حاکم شام ہے جابر وہ سزا دیگا ضرور
غافر و راحم و تواب ہے رب عادل	غافر و راحم و تواب ہے رب عادل
گیسو میں کہ سایہ کیا ہے رات نے دن پر	گیسو ہیں کہ سایہ ہے کیا رات نے دن پر
وہ شیروں سے بچ کر ستم ایجاد کدھر جائے	دو شیروں سے بچ کر ستم ایجاد کدھر جائے
دکھلائے انداز وغا سے اب وحید سے	دکھلائے انداز وغا ئے اب وجد کے
حیرت میں تھے زمیں پہ پسر چرخ پر ملک	حیرت میں تھے زمین پہ بشر چرخ پر ملک
رو رو کے ادھر ہوتا تھا گیتی کو تزلزل ؟	رہ رہ کے ادھر ہوتا تھا گیتی کو تزلزل
ہیبت تھی کہ اژدر بھی نکل آئے تھے ڈر سے	ہیبت تھی کہ اژدر بھی نکل آئے تھے در سے
دیتے تھے جو داتوں کے تلے لعل گہر بار	دبتے تھے جو داتوں کے تلے لعل گہر بار
اس نے تو وہ کہا نیزہ پہ سر اپنے بھائی کا	اٹھی آہ کہا نیزہ پہ سر اپنے بھائی کا
خطبہ ہو ممبر و نیزہ شہیدوں کے نام کا	خطبہ ہو ممبر و نیزہ شہ دیں کے نام کا
زوجوں کا دست جیب کے بھی ممکن تھا شمار	فوجوں کا دست جیب سے بھی ممکن تھا شمار
نذروں کے منتوں کے مرادوں کے پالے ہیں	نازوں کے منتوں کے مرادوں کے پالے ہیں
وہ خاشنی سخن کی وہ شیرینی مقال	وہ چاشنی سخن کی وہ شیرینی مقال ــ

غلط	صحیح
غل پڑ گیا جہاد کو دو مہ جبیں چڑھے	غل پڑ گیا جہاد پہ دو مہ جبیں چڑھے
یکسر قدم سپاہ سے دریا کے اوٹھ گئے	یکسر قدم سپاہ کے دریا سے اوٹھ گئے
گیسو جو بنتِ فاطمہ نے ہاتھ سے بٹے	گیسو وہ بنت فاطمہ کے ہاتھ سے بٹے
آنکھیں وہ نرگسی تھیں کہ جن سے نظر ہٹے	آنکھیں وہ نرگسی کہ نہ جن سے نظر ہٹے
لکھے خدا نماز گزاروں میں اُس کا نام	لکھے خدا نماز گزاروں میں سب کے نام
فاقہ سے تین دن کے مگر زندگی سے سیر	فاقوں میں دل بھی چشم بھی اور نینیں بھی سیر
پستے لبوں کے وہ کہ نمک سے بھرے ہوے	پستے لبوں کے وہ جو نمک سے بھرے ہوے
پھولوں کے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے	پھولوں سے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے
کوکو کا شور نعرہ حق سرہو کی دہوم	کوکو کا شور نعرہ حق سرہ کی دہوم
بچو بہ سپہر نے جس کا سائباں	بچو بہ سپہر بریں جس کا سائباں
وہ خوش بیاں کہ جس کی فصاحت دلوں کو بھائے	وہ لوذعی کہ جس کی فصاحت دلوں کو بھائے
فرمایا مرکے چلتے ہیں اب بہر کردگار	فرمایا مرکے چلتے ہیں اب بہر کارزار
سنبل کی اصل کیا ہے یہ گیسو کے پیچ ہیں	سنبل پہ کیا کھلیں گے یہ گیسو کے پیچ ہیں
دیکھیں کسے علی کے لہو کی رد اسے ملے	دیکھیں کسے علی کی بہو کی ردا ملے
یا قبر پہ یا چشمہ کوثر پہ کھلے گا	یا قبر میں یا چشمہ کوثر پہ کھلے گا
اوڑکر زمین تلک کبھی گرد قدم گئی	اوڑکر نہ زمیں تلک کبھی گرد قدم گئی
فخر حمزہ سے نمودار تھا جعفر کا شرف	فخر حمزہ سے نمودار کا جعفر کا شرف
گو وہ دنیا میں نہیں عرش مقام اون کے ہیں	گو وہ دنیا میں نہیں عرش مقام اونکا ہے
تھا خوف کے عالم میں ہر اک بند کا آزاد	تھا خوف کے عالم میں ہر اک بندۂ آزاد
سب گھاٹ سے دنیا پے تلک خوں سے تر تھی	سب گھاٹ سے دنیالہ تلک خون سے تر تھی
گہہ ماں کو دیکھتے تھے گہہ جانب علم	گہہ ماں کو دیکھتے تھے کبھی جانب علم
کیوں آئے ہو یہاں علی اکبر کو چھوڑ کے	کیوں آئے تم یہاں علی اکبر کو چھوڑ کے
ان ننھے ہاتوں ہاتوں سے اُٹھے گا یہ علم	ان ننھے ننھے ہاتوں سے اوٹھے گا یہ علم

غلط	صحیح
ہمشکل سکڑوں میں ہزاروں میں ایک ہے	ہمشکل سیکڑوں میں ہزاروں میں ایک ہے
فرمایا آپ نے کہ نہیں ذکر کا مقام	فرمایا آپ نے کہ نہیں فکر کا مقام
مارا جو تین بھال کا اس بچیا نے تیر	مارا جو تیں بھال کا اس بچیا نے تیر
جلوہ دیا جری نے عروس مضاف کو	جلوہ دیا جری نے عروس مصاف کو
بے زین تھا نہ فرس تھا نہ اسواز زین پر	بے زیں تھا فرس پہ نہ اسوار زین پر
جیتے رہیں فرزند کہ سب سخت جگر ہیں	جیتے رہیں فرزند کہ سب لخت جگر ہیں
لو روؤ نہ اب صبر کرو باپ کی جانی	لو روؤ نہ اب صبر کرو باپ کو جانی
یکساں نہیں ہوتا کبھی اغاز کا انجام	یکساں نہیں ہوتا کسی آغاز کا انجام
قرآں نہ اوترا آتا تو قرات بھی نہ ہوتی	قرآن نہ اوترتا تو یہ قرأت بھی نہ ہوتی
مرجائے یہ غرت یہ بہادر کی ظفر ہے	مرجائے بعزت یہ بہادر کی ظفر ہے
کردیتی ہے دن دشمن ایماں کے دلوں کو	کردیتی ہے شب دشمن ایمان کے دلوں کو
قرآں کوئی پڑھتا ہے کہ بیکس تھا یہ بے پر	قرآن کو پڑھتا ہے کہ بیکس تھا یہ بلے پر
نہ وستے میں اک جزو کتاب شہ مرداں	نہ ورقہ ہے اک جزو کتاب شہ مرداں
جس فرقے کے چہرہ پہ نظر کی وہ جدا تھا	جس فرد کے چہرہ پہ نظر کی وہ کٹا تھا
دریا بھی دم تیغ کے دہارے سے نہ نکلا	دریائے دم تیغ کے دہارے سے نہ نکلا
بیٹوں سے جدا باپ سے فرزند جدا تھے	بیٹوں سے پدر باپ سے فرزند جدا تھے
تھیں کند سنانیں بھی جو نیزہ میں گڑی تھیں	تھیں کند سنانیں بھی جو تیزی میں لڑی تھیں
تلواروں کے نیچے سے نکل جاتا تھا آکر	تلواروں کے نیچے سے نکل جاتا تھا آکر
فوجوں کو پلٹ کر ادھر آیا اودھر آیا	فوجوں کو ڈپٹ کر ادھر آیا اودھر آیا
لال آنکھیں وہ ظالم کی وہ منہ قبر سے کالا	لال آنکھیں وہ ظالم کی وہ منہ قیر سا کالا
اب انکی جگہ آپ ہی یا شاہ زمن ہیں	اب انکی جگہ آپ ہیں یا شاہِ زمن ہیں
ہے لٹنے کی جا یہ زمیں فلک مقام	ہے لوٹنے کی جا یہ زمین فلک مقام ؟
نکلا ہر اک ولی کی زباں سے یہی سخن	نکلا ہر اک جری کی زباں سے یہی سخن
الفت نہ دلدہی نہ تعارف نہ رسم و راہ	الفت نہ دلدہی نہ تواضع نہ رسم و راہ

غلط	صحیح
دو چار تیر آ گے گرے جب قریب در	دو چار تیر آ کے گرے جب قریب در
ثابت ہو جس پہ زد کوئی ایسی کمان نہ تھی	ثابت ہو جس پہ زہ کوئی ایسی کماں نہ تھی
دہنی طرف اوڑا جو سمند فلک سریر	دہنی طرف اوڑا جو سمند فلک مسیر
نقروں کا ذوالفقار کے مطلب ادا نہ ہو	فقروں کا ذوالفقار کے مطلب عیاں نہ ہو
کٹ جائے ساری عمر تو اُسکی ثنا نہ ہو	کٹ جائے ساری عمر تو شمہ بیاں نہ ہو
تنہا نہ کوئی بھائی ہے جس کا نہ اب حبیب	تنہا نہ کوئی بھائی نہ ہمدرد نہ حبیب
بازو شکستہ چھید جگر میں کمر میں خم	بازو شکستہ درد جگر میں کمر میں خم
تو ہی پناہ مانگ کہ بیٹا علی کا ہے	تو بھی پناہ مانگ کہ بیٹا علی کا ہے
ڈھالوں کو روئیوں کی طرح چیر چیر کر	ڈھالوں کو ردیوں کی طرح چیر چیر کر
یہ سر عزیز ہے نہ سرک جا قدم نہ ٹیک	یہ سر عزیز ہے تو سرک جا قدم نہ ٹیک
فاقہ تھا پر کمی تگ و دو میں ذرا نہ تھی	فاقہ تھا پر کمی تگ و دو میں ذرا نہ تھی
چھٹنے کی شرم ہے نہ اسے بھاگنے کی قید	چھپنے کی شرم ہے نہ اُسے بھاگنے کی قید
کس سمت ابن سعد ہے اور شمر روسیاہ	کس سمت ابن سعد ہے او شمر روسیاہ
رستے کی مشقت سے کہاں ہیں ابھی آگاہ	رستے کی صعوبت سے کہاں ہیں ابھی آگاہ
رہ جاتی جو بہنیں بھی تو دم اُس کا بہلتا	رہ جاتیں جو بہنیں بھی تو دل اس کا بہلتا
اے نور بصر آنکھوں پہ لیکر تجھے چلتا	اے نور نظر آنکھوں پہ لیکر تجھے چلتا
افلاک امامت کا کبھی بدر نہ سمجھے	افلاک امامت کا تجھے بدر نہ سمجھے
باتیں تھیں بھی یاس کی اور درد کی تقریر	باتیں تھیں بھی یاس کی اور درد کی تقریر
پتھر پہ جوف نیزہ حیدر کو دیکھ سے	پتھر میں جوف نیزہ حیدر کو دیکھ سے
راہیں بھی سب تہیں قطع سناں بھی دوبارہ تھی	گرہیں بھی سب تھیں قطع سناں بھی دوپارہ تھی
ٹوٹی وہ تیغ ادہر یہ چمک کر ادھر گئی	آئی وہ تیغ ادہر یہ جھک کر ادھر گئی
بہر جہاں میں باعث امن و اماں ہیں آپ	بحر جہاں میں باعث امن و اماں ہیں آپ
آنچ اُس کی تیوروں کی شفق کو جلاتی تھی	آنچ اس کے جوہروں کی شفق کو جلاتی تھی
ہم اُس کی امانت اُسے پونہچا کے چلے ہیں	ہم اُسکی امانت اوسے پونہچا کے بھرے ہیں

غلط	صحیح
خالص رہے نیت کوئی تدبیر نہ گھیرے	خالص رہے نیت کوئی تشویش نہ گھیرے
بجھ بجھ گئیں صفیں وہ نمازی جدھر پھرے	بجھ بجھ گئیں صفیں وہ نمازی جدھر پھرے
دہشت سے ہوش اوڑ گئے تھے مگر دو وہم کے	دہشت سے ہوش اوڑ گئے تھے مرغ وہم کے
آہو شکار و تیر و کماندار و شیر گیر	آہو شکار و مست و کماندار و شیر گیر
خوں ریز و جاں فریب و دلاویز و بے نظیر	خوں ریز و جاں ستان و دل آویز و بے نظیر
ذرہ نواز و رند نما صاحب ا تنیاز	آہو فریب و عشوہ فروش و کرشمہ ساز
بیدار و داغ زادہ و خونبار و غم طراز	بیدار و داغ دیدہ و خونبار و غم طراز
لیتے ہوں بوسے جن کے رسول فلک حشم	لیتے ہوں بوسے جس کے رسول فلک حشم
وہ ہاتھ جن کے خیر و عطا کا ہوا رواج	وہ ہاتھ جن سے خیر و عطا کا ہوا رواج

ان میں بعض غلطیاں تو وہ ہیں جن کے اعتراف پر ناشر و طابع سب مجبور ہیں، لیکن بعض غلطیوں کے تسلیم کرنے میں اُن کو عذر ہو، کیونکہ اُن کا تعلق ذوق سلیم سے ہے اور وہ اس کے عطا کرنے میں فطرت سے زیادہ فیاض نہیں ہے۔

بہرحال سخت ضرورت ہے کہ مراثی انیس کا صحیح اڈیشن شائع کیا جائے اور جلد سے جلد اس کا انتظام کیا جائے ورنہ ایک وقت وہ بھی آنے والا ہے جب اس کی صحت کا امکان بھی نہ رہیگا۔ کیونکہ جو چند صورتیں اس بار عظیم کے اٹھانے کی لکھنؤ میں اہل نظر آرہی ہیں وہ بھی اب چراغ سحری ہیں۔ سنا ہے کہ لاہور میں بھی دفتر مرکز اردو سے کوئی اڈیشن شائع ہوا ہے یا ہونیوالا ہے لیکن جب حیدرآبادی سعی کا یہ نتیجہ ہوا تو لاہوری کوشش پر کیا اعتماد ہو سکتا ہے۔

احسن لکھنوی

ہندو مسلم اتحاد اور ہندی علم و ادب کا مطالعہ

(۱)

زمانہ کی عجیب روش ہے۔ بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہے، اور وہ بھی مذہب کے نام پر۔ کبھی کبھی تو یہ خیال ہوتا ہے کہ کیا اُنیسویں صدی کی مغربی تہذیب کا یہ مقولہ سچ ہے کہ مذہب ہی جنگ و جدل کی بنیاد ہے اور دنیا میں جتنی خونریزی مذہب کے نام پر ہوئی ہے اتنی کسی دوسری چیز کے لئے نہیں۔ مگر غور سے دیکھئے تو مذہب نے ہمیشہ فطرتی وحشیانہ جذبات کو دبانے کی کوشش کی ہے البتہ یہ اور بات ہے کہ وہ جذبات موقع پاکر اُبھر پڑیں اور مذہب کی آڑ میں ایک ہنگامہ برپا کردیں۔ کچھ عرصہ ہوا مسٹر حبیب صاحب پروفیسر علیگڈھ کالج کا ایک مضمون میری نظر سے گزرا تھا۔ انھوں نے اس میں نہایت خوبی سے یہ دکھلایا تھا کہ جو اسلام کے نام پر تلوار لیکر ہندوستان میں آئے دراصل وہی ہندوستان کے دشمن تھے اور اس لئے اُنھوں نے یہ بتلایا کہ ہندوستان میں اسلام کے سچے دوست اور اپنے پیغمبر خواجہ معین الدین چشتی اجمیری ہوئے ہیں۔ جنھوں نے اسلام کا روحانی پہلو ہندوستان کے سامنے رکھا۔ موصوف نے نہایت خوش اسلوبی سے ایک اور مسئلہ پر روشنی ڈالی تھی اور وہ یہ کہ آخر اسلام کی اشاعت اس قدر سرعت کے ساتھ ہندوستان میں کیوں نہ ہوئی جس قدر تیزی سے عرب، عراق، عجم اور فارس میں۔ موصوف نے البیرونی کا حوالہ دیتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ وہ مورخ بھی اس امر کا اعتراف کرتا ہے کہ گو ہندوستان میں تمدنی مساوات نہیں ہے مگر ہر شخص اپنی مقررہ جگہ پر قانع ہے اور کثرت میں وحدت موجود ہے، معدوم نہیں دیگر ممالک میں عدم مساوات کے ساتھ قناعت نہ تھی اور وحدت معدوم سی ہوگئی تھی۔

میرا خود ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ جنگ و جدل کی وجہ ناواقفیت ہوتی ہے۔ انگریزی ضرب المثل ہے کہ ڈھال کے دو رُخ ہوتے ہیں اور محض اس رُخ کو جو ہمیں دکھائی دیتا ہے، درست مانکر دوسرے سے اسباب پر لڑنا کہ جو رُخ تجھے دکھائی دیتا ہے وہ محض غلط ہے، عین خبط اور کم فہمی ہے۔ سوامی رام تیرتھ نے بھی ایک جگہ یہی فرمایا ہے کہ آخر محض اس بات پر کیوں جنگ و جدل ہو کہ کوئی تربوز کو "ہندونا" کہتا ہے اور کوئی "مسک ملن" مگر واقعی بات تو یہ ہے کہ ہندونا کہنے والا یہ نہیں جانتا اور نہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ تربوز اور مسک ملن بھی اُسی ایک سے کے مختلف نام ہیں۔ آج ۲۸ برس ہوئے کہ میرے بزرگ استاد مولوی نیاز محمد صاحب نے اول اول اس خیال کو ایک بیج کے دانہ کی شکل میں میرے دل میں بٹھا رکھا تھا جو برابر نشو و نما پاتا رہا وہ یہ کہ ہندوؤں مسلمانوں میں نااتفاقی کی وجہ یہ ہے کہ ایک دوسرے کے علمی، ادبی اور مذہبی کتب کا ہمدردی کے ساتھ مطالعہ نہیں کرتے۔

اس وقت میری عمر بارہ سال کی تھی۔ ایک صبح کو ضرورت سے زیادہ جلد منڈیاہوں ضلع جونپور کے تحصیلی اسکول میں پہونچ گیا مولوی صاحب موصوف نماز پڑھکر مسجد سے باہر نکلے اور اپنی بورڈنگ کے کوٹھری میں پہونچے۔ وہاں جاکر انھوں نے پہلے قرآن شریف پڑھا اس کے بعد سعدی کی گلستاں کا کچھ مطالعہ کیا اور پھر تیسری کتاب جو انھوں نے نکالی وہ تلسی داس کی رامائن تھی۔ ایک ہندو بچہ

قدرتاً متحیر ہو گیا۔ میں سوچنے لگا کہ مولوی صاحب آخر اس کتاب کو اپنی پرستش کے وقت کیوں پڑھتے ہیں۔ ایک خاص وجہ اور بھی سوال کے پیدا ہونے کی تھی، اور وہ یہ کہ مجھے میرے والد روزانہ شام کو رامائن پڑھنے کی تاکید کرتے اکثر جبراً پڑھاتے تھے۔ میری بیدلی کا ٹھکانا نہ تھا اور اکثر زد و کوب تک برداشت کر لیتا تھا۔ بلاشبہ میری حالت اس وقت بجنسہ ملٹن کی لڑکی کی سی ہوتی تھی۔ جب میں نے وہی کتاب مولوی صاحب کو پڑھتے دیکھی تو مجھے اور بھی حیرت ہوئی۔ میں نے دبتے دبتے سوال کیا کہ مولوی صاحب، مجھے تو اسی رامائن کے لئے روز مار کھانا پڑتی ہے اور آپ کافروں کی وہی کتاب کیوں پڑھتے ہیں؟ مولوی صاحب نے ہنسکر جواب دیا کہ کافر کے معنی ہیں خدا کی ہستی سے انکار کرنے والا اور رامائن یا ہندو مذہب اس ہستی سے منکر نہیں ہے، اس وجہ سے میں رامائن کو ہرگز کفر کی کتاب نہیں کہہ سکتا۔ تو ہندو ہو کر اس پیاری بھاشا سے کیوں بے بہرہ ہے جسمیں لطافت کی انتہا نہیں؟ بھائی عربی، فارسی، پر بھی میرے لئے غیر ملکی زبانیں ہیں اور جو مزہ ہندی میں ہے وہ مجھے اُن میں نہیں آسکتا۔ انھوں نے ہندی کی لطافت کی مثال بتلاتے ہوئے تان سین کے گائے ہوئے پد کی تفسیر کی تھی۔ جسودا بار بار یہ بھاکھے، ہے کوئی برج میں ہتو ہمارا چلت گوپال نہیں روکے انھوں نے یہ بھی بتلایا تھا کہ جب یہ پد اکبر کے دربار میں گایا گیا تو تان سین، بیربل، توڈرمل، فیضی اور نواب رحیم خانخاناں نے اس پد کے کس طرح جدا جدا معنے بیان کئے جسمیں ادبی شغف و مذاق، دونوں کی شمولیت تھی۔ کسی وقت ناظرین نگار کے سامنے اُسی تفسیر کو پیش کرونگا۔ یہاں صرف اس قدر کہدینا کافی ہے کہ اس دن سے میرے دل پر ایسا اثر پڑا کہ میں اب بھی اپنی پوجا کے وقت تقریباً کل مشہور مذاہب کی کسی نہ کسی کتاب کا کچھ نہ کچھ ضروری مطالعہ کرتا ہوں۔ مثلاً آج کل اپنی پیاری تلسی کرت رامائن کے ساتھ مثنوی مولانا روم، بدھ کا دھم پد، بائبل، تلک کا گیتا رہسیہ، سوامی داشانند کے اپنشدوں کی تفسیر، ڈھلگو بر کا ترجمہ کبیر، ٹیگور کی گیتانجلی، ان سب کو تھوڑا بہت پڑھتا ہوں۔ میرے اکثر دوست اسے "کھچڑی" کہتے ہیں مگر مجھے تو اس کھچڑی میں وہ مزہ ملتا ہے جو علیحدہ طریقہ پر دال میں ہے، نہ چاول میں اور نہ مسالوں میں۔ اگر ایک طرف تلسی داس جی لکھتے ہیں۔ جاں سکھ سوجا ہو نرگن سگن سروپ۔ مم ہردپنکج بھرنگ اوبسہو رام نر روپ۔" (جو شخص ایشور کے حقیقی یا صفاتی حیثیت کو سمجھ سکتا ہو، سمجھے میرے دل کے کنول کے اندر تو ہے رام، تم انسانی شکل میں بھونرے کی طرح قیام کرو) تو دوسری طرف علامہ اقبال بھی فرماتے ہیں ؎

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

پھر اگر ایک طرف سعدی رح فرماتے ہیں " ید علیا بہ ید سفلی کے مانند"، تو دوسری طرف تلسی داس جی کہتے ہیں :-

"تُلسی کر (ہاتھ) پر گر کرے، کر تر کر نہ کرے۔ جا دن کر تر کر کرے تا دن مرن کرے۔" اگر کہیں یہ پڑھا کہ "Sweet is the Bounty Mean..."

تو فوراً نسیم کا یہ شعر یاد آگیا کہ ؎

جو نکتہ لکھوں کہیں نہ حرف آئے مرکز پہ کشش حری پہونچ جائے

اس نقطۂ خیال سے ابھی حال میں صوبہ کی کونسل کے ایک سوال کے جواب سے یہ معلوم ہو کر مجھے سخت افسوس ہوا تھا کہ ایک امتحان میں جہاں ہندوؤں کے سینکڑوں لڑکے اردو لیکر شریک ہوئے تھے وہاں صرف ایک مسلمان لڑکے نے ہندی لی تھی۔ ۲۰۵ رحیم

ملک محمد جائسی، رسکھان، مبارک کے قائم مقام کیا اب نہ ہوں گے جنھوں نے ہندی میں ایک لطافت کا دریا بہا دیا؟ کیا وہ محققانہ جوش سرد ہو گیا جس نے ہندوستان سے علم ہندسہ کو ادھار لینا بیجا نہ سمجھا تھا اور جس نے بغداد میں چرک وسشرت نامی ویدک کتب کے ترجمے کرائے؟ فیضی کی رامائن و گیتا کے فارسی تراجم اب بھی یادگار ہیں۔ بھئی یہ خیال سراسر غلط ہے کہ دوسرے کی علمی کتاب پڑھی اور بس مذہب تبدیل ہوا۔ مذہب کیا ٹھہرا کوئی کچا گھڑا ہو۔ میں اب بھی ویسا ہی ہندو ہوں جیسا ۲۸ سال قبل تھا بلکہ شاید بہتر۔ میں نے مولوی صاحب موصوف کے سے سچے خدا ترس اور پاک انسان کم دیکھے ہیں۔ آہ، مجھے موصوف کا ایک اور واقعہ یاد آگیا جسے ہدیۂ ناظرین کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ مولوی صاحب کو معلوم ہوا کہ میرے ہم سبق بیجناتھ حلوائی کے مکان پر ایک قدیم قلمی رامائن معہ تفسیر کے موجود ہے۔ تحقیقات پسند دل بیتاب ہو گیا اور گو اس کے باپ نے بمشکل اس شرط پر رامائن کو دینا قبول کیا کہ روزانہ خود اس کا لڑکا رامائن لیجایا کرے گا اور مولوی صاحب کے سامنے دور (کیونکہ مولوی صاحب ملکش تھے نہ، کافر کا کیا مد مقابل انسانی نفرت نے گڑھا ہے!) اسٹول پر رکھدیگا اور وہی صفحات بھی پلٹتا جائیگا (آہ مولوی صاحب کے چھونے سے کہیں کتاب کی روحانیت نہ اڑ جائے) مگر پھر بھی مولوی صاحب ہنسکر کہتے تھے کہ اس شخص کے دل میں اس پاک کتاب کی کتنی عظمت ہے چنانچہ موصوف نے باوجود ان شرائط کے کل کتاب پڑھی۔

میری دلی خواہش تھی کہ میں ہندی کے پاک خیالات اور خصوصاً تلسی داس جی کی رامائن کے جذبات اپنے مسلمان بھائیوں کی خدمت میں پیش کروں۔ چنانچہ حال کی ملاقات میں حضرت نیاز فتحپوری نے براہ شفقت برادرانہ میری حوصلہ افزائی کی اور میرے سلسلہ مضامین کو اپنے رسالہ نگار میں شائع کرنا منظور فرمایا۔ مگر ناظرین نگار سے کچھ معذرت خواہی بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ اول یہ کہ "لیلیٰ را بچشم مجنوں باید دید" کا لحاظ رکھتے ہوئے میری تفسیر میں جہاں موازنہ کی غلطی ہو اُسے کوتاہ نظری سے منسوب نہ کرتے ہوئے مجھے ایک خاص پہلو کا شیدائی یا سودائی سمجھیں۔ دویم یہ کہ بوستان کی ذیل کی روائتیں ہمیشہ یاد رکھتے ہوئے اسے فراخدلی سے کام میں جو خدا میں ہے یا اُن کے پیغمبر علیہ السلام میں تھی۔ پہلی روایت یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک ہفتاد سالہ گرسنہ آتش پرست پر رحم کرکے اسے ایک اسلامی قافلہ اپنے ساتھ لے گیا۔ مگر جب شام کو سب لوگ معہ اُس آتش پرست کے دسترخوان پر بیٹھے اور اُس نے خدا کی پرستش میں حصہ نہ لیا تو اس بیچارے کو بھوکا ہی اُٹھا دیا گیا۔ فوراً غیب سے آواز آئی کہ اے مسلمو! تم نے یہ خیال نہ کیا کہ میں نے اس کی پرورش ستر برس تک کی باوجودیکہ وہ آتش پرست تھا۔ اور تم کو ایک وقت کا کھانا دینا بھی دشوار ہو گیا۔ دوسری روایت بھی عجیب سبق آموز ہے اور وہ یہ کہ حاتم طائی کے قبیلہ نے اسلام قبول نہ کیا تھا۔ چنانچہ حاتم کی وفات کے بعد محمد صاحب نے اُسکے ملک کو فتح کرکے اس کے قبیلے کے برگزیدہ اشخاص کو معہ حاتم کے لڑکے گرفتار کیا۔ اور قتل عام کا حکم صادر فرمایا، صرف لڑکی کو اُسکے باپ کے خیال سے چھوڑ دیا۔ مگر لڑکی آخر تھی حاتم کی اُس نے کہا کہ اگر آپ میری قوم کو تہ تیغ کرنا چاہتے ہیں تو میں حاتم کی لڑکی ہو کر اُسکے نام کو کلنک کا ٹیکہ نہیں لگانا چاہتی۔ مجھے آپ پہلے قتل کیجئے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ میں اپنی قوم کو اپنے سامنے اور جیتے جی تہ تیغ ہوتے ہوئے دیکھوں۔ محمد صاحب نے فوراً سب کو رہا کر دیا اور فرمایا کہ اصل وجوہر" سے خطا نہیں ہوتی جس کا صاف مقصد

یہ تھا کہ اصل "جوہر" کسی تنگ مذہبی دائرہ کے اندر محدود نہیں کیا جا سکتا۔ بحر سخن کی طرح بحر حقیقت بھی ایک غیر محدود چیز ہے اور اس کو ایک جگہ بند نہیں کر سکتے۔

اب دوسرے حصہ مضمون میں رامائن کے ایک نہایت برگزیدہ حصہ کی تفسیر پیش کرتا ہوں جسمیں تلسی داس کی رامائن اور ہمارا قومی معیار زیر بحث ہے۔

(۲)

تلسی داس کی رامائن اور ہمارا قومی معیار

مارچ ۱۹۲۵ء کے رسالہ زمانہ میں "تلسی داس کا شاعرانہ کمال" والے مضمون کے عنوان میں مہاتما گاندھی کا وہ قول میں ہدیۂ ناظرین کر چکا ہوں جسمیں مہاتما جی نے فرمایا تھا کہ میرے دلی جذبات کا ابھار جس قدر تلسی داس جی کی رامائن اور گیتا سے ہوتا ہے اوتنا اور کسی چیز سے نہیں ہوتا۔ آپ کے تھوڑے ہی دنوں بعد لالہ ہردیال جی کا ایک مضمون پربھا (کانپور) میں میری نظر سے گزرا جسمیں موصوف نے یہ فرمایا ہے کہ تلسی داس جی کی رامائن ہماری ایک خاص قومی تصنیف کا درجہ رکھتی ہے اور جس طرح ڈیوک آف ولنگٹن (مشہور و معروف انگریز سپہ سالار جس نے نپولین اعظم کو واٹرلو کے میدان جنگ میں شکست دی تھی) کہتا تھا کہ اُس کا تاریخی مطالعہ سیکسپیر کے ڈراموں ہی سے ہوا ہے اسی طرح ہم پرانی تہذیب کے اصولوں کا مطالعہ اس مقدس کتاب سے کر سکتے ہیں جو تاریخ کا اصل مقصد ہے۔ تلسی داس جی کے سہ صد سالہ یادگاری جشن کے موقع پر پنڈت مدن موہن مالوی نے فرمایا تھا کہ حصول آزادی کی پہلی منزل رہی ہے، جو تلسی داس کے خیال کی آزادی سے ظاہر ہوتی ہے کہ غیروں کی سلطنت کے اندر رہتے ہوئے بھی گویا رام راج میں ہیں ان خیالات کے ذریعہ رام راج کے اصولوں کو شاعرانہ دلکشی کے ساتھ تمام قوم کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ سوامی شردھانند جی مرحوم نے بھی اپنی شردھا (دلی عقیدت) اِس پاکیزہ خیال شاعر کے قدموں پر رکھتے ہوئے فرمایا تھا کہ اچھوت قوموں کے ساتھ وہی برتاؤ لازم ہے جو رام نے نشاد، سیوری، کول، کرات وغیرہ کے ساتھ کیا تھا اور جسے تلسی داس نے اپنی رامائن میں عجیب بھگتی اور پریم کے رنگ میں دکھلایا ہے۔ واچسپتی پنڈت دینا نال شرما نے وحدانیت کے فلسفہ پر بحث کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ تلسی داس جی کے اس استعارہ سے بڑھکر ایشور اور مادی دنیا کا تعلق ظاہر کرنے کے لئے کوئی استعارہ ملنا محال ہے کہ ایشور دنیا میں اس طرح بس رہا ہے جیسے حنا میں سرخی کہ نظر نہیں آتی مگر موجود ہے۔ پروفیسر گریرسن تو تلسی کے مقابلہ میں کسی اور مشرقی شاعر کو شاعر ہی نہیں تسلیم کرتے۔ المختصر تمام مختلف الخیال لوگوں کی نگاہیں اس وقت عجیب امید کے ساتھ تلسی داس کی رامائن پر پڑ رہی ہیں اور تلسی داس جی کا خود دعویٰ بھی یہی ہے کہ کلجگ کے لئے رام بھجن اور رامائن کے سوا کوئی تیسرا ذریعۂ نجات نہیں ہے۔ رحیم خانخاناں بھی تلسی داس جی کا اس قدر دلدادہ تھا کہ ایک مرتبہ ایک برہمن کی لڑکی کی شادی میں امداد کی سفارش کرتے ہوئے جب تلسی جی نے سفارشی خط میں یہ لکھا کہ "سُر (دیوتا) تیا (عورت) نر (آدمی) تھا ناگ تیا سب چاہیں اس ہوئے" تو رحیم خاں نے اسپر گرہ لگا دی کہ ہلسی (تلسی داس کی والدہ کا نام) ہوں ہلسی (خوش) پھرس تلسی سوں سُت (لڑکا) ہوے" میں بھی اس خزانہ سے ایک انمول موتیوں کا ہار ناظرین نگار کی

خدمت میں پیش کرنے کے لئے حاضر ہوتا ہوں۔ آہ! نہ یہ موقع ہے اور نہ میں ایسا جوہری ہوں کہ اس ہار کے ہر موتی کی آب و تاب کو پورے طور پر دکھلا سکوں مگر ہاں، ہار کے کچھ عام اوصاف بیان کرتے ہوئے نہایت ادب سے اپنی ناچیز نذر کو پیش کرتا ہوں۔

انیسویں صدی اپنی تمام مادی ایجادوں کے ساتھ اگر خدا کو بھول نہ گئی تھی تو اس کی ہستی پر شک ضرور کرنے لگی تھی اور مغربی دنیا میں نباتات و حیوانات کے طبقات میں محض طاقتور کی فتح کے اصول کو اپنی یکرخی نظر سے دیکھکر اُسی کو اپنا معیار مان بیٹھی تھی اور کمزور فرد یا قوم کے لئے موت یا زوال کی ہوت کے سوا اور کوئی تحفہ اس کے پاس نہ تھا۔ مساوات کا مسئلہ بھی انقلاب فرانس کے وقت سے خونی آزادی کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ مزدور مالک کے دشمن، رعایا حکمرانوں کے خون کی پیاسی، قوم قوم کے گلے میں طوق غلامی ڈالنے کو تیار، اور پھر لطف یہ کہ ہر شخص کی زبان زد وہی مساوات و آزادی کا راگ یہی نظارہ کم و بیش اس بیسویں صدی میں بھی نظر آتا ہے، ملک الشعرا ٹیگور اپنی کتاب نیشنلزم (nationalism) میں مغرب کے خیال قومیت کا ایک عجیب ہیبت ناک نظارہ پیش کرتے ہیں۔ جو حسب ذیل الفاظ میں ہے:۔

"اس قومی خیال والے بھوت کے خوف سے ساری زمین تھرا رہی ہے، دنیا کے گوشہ گوشہ میں بدگمانی اور خفیہ نقصان رسانی کا نظارہ دکھائی دیتا ہے .... اس قومی خیال کی حرکت کہیں گرد و نواح میں ذرا بھی ہوئی کہ فوراً لوگوں کے کان کھڑے ہوے اور ایک خوف کا احساس چاروں طرف پھیل گیا۔ خوف ہی انسانی طبائع کے جملہ بُرائیوں کی بنیاد ہے۔ ..... لوگ کذب و عیاری پر اپنے آپ کو مبارکباد دیتے ہیں، قرار ہائے صالح پر محض اُنکی صلاحیت کی وجہ سے مضحکہ زنی ہوتی ہے۔ اس قومی (خیال) کا خلاصہ منشا صرف یہ ہے کہ بقیہ دنیا کی کمزوری سے مستفید ہو سکے لئے استعارہ صرف ان کیڑوں سے لیا جاتا ہے جو مفلوج گوشت میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس وقت تک زندہ رہتے ہیں جب تک کہ اونکا مقتول صرف اس قدر زندگی قائم رکھے کہ ان کی زبان کے ذائقہ اور انکی شکم سیری کا سامان ملتا رہے"

اس لئے موصوف گزشتہ جنگ یورپ کو اسی گناہ کی سزا دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ جبتک شرقی اصولوں پر عملدرآمد نہ کیا جاویگا، اسوقت تک لیگ آف نیشنس (League of nations) محض طائفہ قزاقان بنی رہیگی۔ شاعر موصوف فرماتے ہیں کہ ہمیں اُمید ہے کہ یہ مادی طاقت اپنے خون آلود قدموں کے دہونے کی خواہش ضرور کریگی اور وہ ہندوستان سے استدعا کرتے ہیں کہ اپنی پاک تہذیب کے گنگاجل کا برتن تم بھی صاف کرکے تیار رکھو کیونکہ تمہاری ہی طرف دنیا کی نگاہ ہوگی۔

ایک طبقہ (اگرچہ اس کی تعداد بہت کم ہے) ہندوستان میں بھی ایسا ہے جو اسی مغربی خونین ناٹک کے تماشہ کو ہندوستان کے اسٹیج پر بھی دیکھنا اور دکھانا چاہتا ہے وہ بجائے اس کے کہ اپنی تہذیب کا گنگاجل مغرب کے گناہ کے کفارہ کے لئے پیش کرے خود اسی گناہ میں مغرب کا پیرو ہونا چاہتا ہے۔ ایک اور طبقہ مغربی تہذیب سے اس قدر بیزار ہے کہ اس کے معیار زندگی کے علاوہ اس کی علمی تحقیقات اور تنظیمی اصولوں پر بھی اسی قومی خودغرضی کا خونیں رنگ دیکھتا ہے اور فرط خوف سے اوسے چھونا ہی پسند نہیں کرتا۔ ایک گروہ [illegible] مغرب کے اصولی [illegible] کو بھی شرم آتی ہے اور دوسرا گروہ اپنے کھلونے کے



... کی طرح اپنے کھلونے کی تلوار سی کو کھڑکھڑاتا ہے اور یہ بھی مغربی اسلحۂ جنگ کے دیو کے سامنے ۔ ایک فرقہ
تمدن اور سیاست کو روحانیت کے رنگ میں رنگنے کی فکر میں ہے ۔ دوسری طرف مذہب کی آڑ میں وہ جوتی پیزار کی نوبت
آ رہی ہے کہ باید و شاید ۔ ان سے نرالا ایک تیسرا طبقہ ہے جو ان دونوں پر ناقدانہ نگاہ ڈالتے ہوئے کہتا ہے کہ تمدن اور
سیاست کے مسائل میں مذہب اور روحانیت کا کوئی دخل نہیں ہے، انہیں تو خانقاہ یا آشرم کے حوالہ کرنا چاہئے ۔ اور جائے غور یہ ہے کہ ہر
طبقہ میں ہندوستان کے برگزیدہ اور قابل احباب شامل ہیں جن کی حب الوطنی اور خلوص عقیدت پر شبہ کرنا بھی بیجا ہے ۔

مادی طاقت اور روحانی طاقت کے تضاد کا نظارہ ایک مرتبہ راون اور رام کی شکل میں آپ کے ملک میں پیشتر بھی دکھایا جا چکا ہے
راون کو کل سامان جنگ کے ساتھ رتھ پر سوار ایک طرف اور اُس کے مقابلہ کے لئے پیادہ پا رام کو دوسری طرف دیکھکر بھبھیکھن
جیسے راسخ الخیال اور وفادار بھگت کا دل بھی دہل گیا ۔ وہ مہاراج رامچندر سے سوال کرتا ہے کہ مہاراج! فتح کیسے ہوگی؟ ہائے
کیا روحانیت اور اخلاقی تہذیب بیرونی سے کچلی جانے ہی کے لئے بنی ہے؟ اس موقع پر میں مہاراج رام کے جواب کو بزرگان
قوم اور بالخصوص مہاتما گاندھی کی خدمت میں پیش کرتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ وہی نہ صرف ہمارا بلکہ کل دنیا کا معیار ہونا چاہئے
یہی گنگا جل ہے ۔ جسے آپ مغرب کے خونین گناہ کے کفارہ کے لئے پیش کر سکتے ہیں یا دوسرے استعارہ میں یہی وہ "نو لکھا ہار" ہے
جسے مادر گیتی کی پرستش کرتے وقت اُس کے گلے میں پہنا سکتے ہیں ۔ مہاراج رام فرماتے ہیں کہ فتح کے لئے جو رتھ ہے اس کے اجزا
کی تفصیل، اے بھبھیکھن سنو:۔

सौरज धीरज जाहि रथ चाका । सत्य शील दृढ़ ध्वजा पताका

بہادری اور استقلال جس رتھ کے پہیے ہیں، مضبوط سچائی اور محبت جسکے جھنڈے اور پھریرے ہیں۔

बल बिबेक दम परहित घोरे । छमा दया समता रजु जोरे

طاقت، تمیز، نفس کشی اور پر اُپکار ۔ یہ چار گھوڑے عفو، رحم و مساوات کے باگ ڈورے اس رتھ میں جتے ہوئے ہیں

ईश भजन सारथी सुजाना । बिरति चर्म सन्तोष कृपाना

ایشور کا بھجن اوس رتھ کا چلانے والا ہے اور جو ہوشیار سوار ہے اسکی ڈھال بیراگ اور اس کی تلوار قناعت ہے

दान परसु बुधि शक्ति प्रचण्डा । बर बिज्ञान कठिन कोदण्डा

فیاضی اس کا پھرسا اور عقل سلیم شکتی بان ہے اور افضل ترین علم اسکی مضبوط کمان ہے۔

अमल अचल मन त्रोन समाना । सम जम नियम सिलीमुख नाना

پاک اور مستقل طبیعت جس کا ترکش ہے اور سنجم (معنی اخلاق ذاتی) اور نیم (اصول اخلاق تمدنی) تیر ہیں۔

कवच अभेद बिप्रपद पूजा । एहि सम बिजय उपाय न दूजा

زرہ بکتر جیسے برہمن کی خلوص دل سے پرستش ہے ۔ اس کے مقابلہ میں کوئی دوسرا ذریعہ فتح کا نہیں ہے

सको धर्म मय अं रंथ जाके जीतन कहँन कतहुँ रिपु ताके

محب من، جسکے پاس اب دھرم کا رتھ ہے اس کی فتح کے لئے کہیں دشمن ہی نہیں ہے۔

یہ سات چوپائیاں ساری مشرقی تہذیب کا لب لباب ہیں۔ میری دلی منشا تو یہ تھی کہ بس انھیں کو پیش کر کے بلا کسی تفسیر کے محبان ہم کے سد میں سے ہٹ جاتا مگر چند وجوہ سے کچھ تفسیر لازمی ہے جس کو خاص اصول کے لحاظ سے نمبروار درج ذیل کرتا ہوں:۔

سچائی اور محبت بہادری اور طاقت پہلی چوپائی کا پہلا ہی لفظ بہادری ہے اور دوسری چوپائی کا بھی۔ پہلا ہی لفظ طاقت کا مترادف ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ اہنسا کے اوس خیال کی جو بزدل بناتا ہے، گنجائش کسی قومی یا دنیاوی معیار میں نہیں ہے۔

مگر بہادری کے ساتھ سچائی اور محبت پہلی ہی چوپائی میں موجود ہیں اور طاقت کے ساتھ تمیز اور نفس کشی توام ہیں کہ کبھی بہادری محبت اور سچائی کا خون کرتے ہوئے کمزور کے گردن میں طوقِ غلامی نہ پہنا دے اور دیو کی طاقت رکھتے ہوئے وہ کہیں واقعی دیو نہ بنجاوے۔ مہاراج رام کی زندگی میں برابر یہی اصول کام کرتا رہا کہ کبھی کسی سے لڑائی نہ مول لینا۔ مگر جسوقت کسی نے (مثلاً پرسولم جی نے) چیلنج دیا تو "موت سے بھی رگھو بنسی نہیں ڈرتے" اسی ایک صدا کا بلند ہونا۔ طاقت رکھتے ہوئے بھی اپنی طرف ہی سے مہاراج رام کا صلح کے لئے انگد کو راون کے پاس بھیجنا وغیرہ کتنے ہی ایسے نمونے موجود ہیں۔

تثلیث نفس۔ آہ مغربی دنیا کس فخر سے کہتی ہے کہ فرانس کی انقلابی تحریک کے یہی تین الفاظ نئی دنیا کے ترقی اور آزادی کا باعث ہوئے ہیں۔ وہ الفاظ کیا ہیں؟ آزادی، مساوات اور اخوت۔ مگر ذرا غور سے دیکھا جاوے تو مغربی آزادی کے ساتھ بیچارہ مساوات کی بھی مٹی پلید ہوئی ہے۔ مغربی آزادی کے اس خیال کے توام ہوتے ہوئے بھی کہ ہم ہر حالت میں کسی نہ کسی قید میں ہیں قید کے توڑنے کا خیال ہر وقت غالب رہتا ہے۔ مزدوروں کو مالداروں کے قید سے رہائی کا خیال، رعایا کو حکومت سے آزاد ہونیکا خیال، مذہب کو کتابی پابندیوں سے نجات پانے کا خیال، ایک قوم کو دوسری قوم کے تعلقات کے قید سے نکلنے کا خیال اس قدر دامنگیر رہتا ہے کہ ہر طرف توڑ پھوڑ اور کشت و خون برابر جاری ہے۔ غرضکہ اپنی زنجیر کو توڑ کر دوسرے کے پیروں میں جکڑنا ہی عملی اثر اس آزادی کے خیال نے مغرب میں ہر جگہ آشکارا کر رکھا ہے۔ مغربی اقوام کے خون آلودہ ہونے کی باعث یہی ہے۔

مساوات کا خیال نہایت اچھا تھا مگر وہ بھی اس معنی میں استعمال ہونے لگا کہ اپنے سے بہتر حیثیت میں کسی کو نہ دیکھ سکے۔ آہ، کب مغرب نے اس خیال سے کمزوروں کو اپنے برابر بنانے میں کام لیا؟ اور اخوت بیچاری تو تیسرے درجہ پر رہ گئی ہے اور بقول ٹیگور کے قومی خیال میں اُسے وہ جگہ ملی جو محافظہ قزاقاں میں برادرانہ اصول کو اپنا شیرازۂ تنظیم محض اس لئے مستحکم کرنے میں ملتی ہے کہ دوسروں پر زیادہ زور کے ساتھ حملہ ہو سکے، کیا کبھی سفید مغرب نے کسی رنگدار قوم کو اپنا بھائی سمجھا؟ کیا مغرب کی مختلف اقوام میں ایک دوسرے سے یگانگت قائم رکھنے کا خیال مستحکم ہے؟ کیا مزدور مالدار کو اور محکوم حاکم کو اپنا بھائی سمجھتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ تلسی داس جی کے وقت

بالا میں بھی مساوات ہے مگر اس کے ساتھ عفو اور رحم بھی شامل ہیں۔ عفو خود بتلاتا ہے کہ جس نے ہم پر ظلم کر کے مساوات سے باز رکھا اسے بھی مساوات کے حاصل ہو جانے پر معاف کیا جاوے تاکہ سینہ میں کینہ کی گنجائش نہ ہو سکے۔ مہاراج رام نے بالی کے مارنے کے بعد بھی عفو کا خیال رکھا اور ایسا ہی ہر وقت کرتے رہے۔ اس میں مساوات بھی مل جاتی ہے اور دوسرے کی مساوات بھی زائل نہیں ہوتی۔ مگر آج فرانس اپنے انقلاب کے خونیں نقشہ کو جسمیں انسانی سر مولی اور گاجر کی طرح بیرحمی سے بلا کسی عفو و امتیاز کے خیال کے کاٹے گئے، پھر بطور معیار پیش کرنا باعثِ شرم نہیں خیال کرتا ہے۔ اسیطرح عفو کے ساتھ سزا دینے والا بھی ہمیشہ یہ خیال رکھتا ہے کہ :-

Human power Then looks like God's when mercy Seasons justice

(انسانی طاقت اوسوقت خدائی طاقت کی شکل میں نمایاں ہوتی ہے جب انصاف کے ساتھ رحم ہو) دوسرا خیال جو تلسی داس جی مساوات کے ساتھ رکھتے ہیں وہ یہ ہے کہ "رحم بر حالِ دیگران" یعنی جو اپنے سے نیچے ہیں اُنھیں اُٹھانے۔ یعنی سیودی و نشاد، کوئی و کیرات پر رحم ([illegible]) کرنا کہ وہ بھی اگر تمھارے برابر نہیں تو کم از کم اپنی موجودہ حالت سے تمہاری امداد اور محبت کے سہارے اوپر اُٹھ سکیں۔

البتہ تلسی داس کے خیال میں "سب دہاں بائیں پنسیری" والی مساوات کبھی نہیں تھی۔ ہندوستانی نظامِ تمدن میں روحانیت کو پہلا، جسمانی قوت کو دوسرا، مال و تجارت کو تیسرا اور دیگر خدمات کو چوتھا درجہ دیا گیا تھا مگر یورپ میں بجز مال و دولت کے اور کسی چیز کی پرستش ہی نہیں ہے۔ روحانیت کو تو کوئی کوڑی کے مول بھی نہیں پوچھتا۔ انتخاب میں بھی صرف مالی حیثیت کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ مالوی جی نے بڑے لاٹ کی کونسل میں کہا تھا کہ آپ کے قاعدۂ انتخاب نے تو ہندوستانی تہذیب کا نقشہ ہی پلٹ دیا۔ لالہ بھگوان داس نے بھی کچھ کوشش کی تھی کہ بیچاری روحانیت کو بھی کوئی جگہ مل جاوے مگر ہنوز کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ جب تک مختلف طبائع موجود ہیں، یہ اندھا دھند کی مساوات چل نہیں سکتی یہ بات اور ہے کہ آپ حیوانی طاقت یا زبانی شور و غل (*Eloquence*) یا سرمایہ (*Capital*) یا غوغا کرنے والی جماعتوں کے اتحاد کو مقدم سمجھیں اور بیچاری روحانیت کو موخر سمجھکر ٹھکرا دیں میرا اپنا خیال تو یہ ہے کہ اب کل دنیا کو بجائے آزادی و مساوات و اخوت کی تثلیث لفظی کے تلسی جی کی تثلیث لفظی ([illegible]) عفو و رحم و مساوات کو قبول کر کے اپنے خون آلودہ ہاتھوں کو پاک و صاف کر ڈالنا چاہئے۔

قومی جھنڈا قومی جھنڈے کی پکار (کچھ عرصہ ہوا) ہر طرف بڑے زور سے تھی اور اس کے متعلق نئے نئے خیالات کا اظہار ہوا تھا مہاتما گاندھی کا یہ خیال تھا کہ اس میں قومی تنظیم کا شائبہ دکھلانے کی غرض سے مختلف فرقوں کے لئے مختلف رنگ دکھلائے جاویں اور قومی مساوات و ملی آزادی کا خیال دلانے کے لئے اسمیں چرخہ کا نقش ہو۔ مگر صاحبان، قومی جھنڈے کے الفاظ اور نشانات محض مغرب کی نقل ہیں جس کے لحاظ سے کسی بیرونی مادی شے کے تصویر ہونا ضروری ہے۔ کاش

کسی وقت ایک ہی مذہب رہگیا یا سب کے سب ہم مذہب ہوگئے یا جبرخہ سے قوم آگے بڑھ گئی تو یہ جھنڈا پھر بدلنا پڑے گا - دیکھئے تلسی جی قومی جھنڈے کے لئے کیا بتلاتے ہیں :-

جھنڈے پر [Devanagari] لکھا ہو - اگر کوئی تنظیم رنگوں کی رکھی جاوے تو ستیہ (سَتیہ) کا رنگ سفید اور شیل (شیل) کا سُرخ ہو اور کا لفظ ہردو پر بسیط ہے - اس طرح قومی دماغ کے لئے سچائی کا اصول اور قومی دل کے لئے محبت کا جذبہ معیار بنکر قومی روح کو پاک بنادیں گے اور دنیا کے سامنے ایک مرتبہ پھر ہم جان برائٹ (John Bright) کا قول پیش کریں گے کہ جو عظمت اخلاق پر قائم نہیں ہے وہ کبھی مستحکم نہیں ہوسکتی -

مساوات و آزادی و اخوت یہ تین کیا، دنیا کے کل اخلاق کے افرادی صفات انھیں دو الفاظ [Devanagari] اور [Devanagari] میں شامل ہوسکتے ہیں اور ہیں - مگر ہر دو کا مستحکم اور توام ہونا ضروری ہے کیونکہ راستی "فتنہ انگیز" ہوسکتی ہے اور ایسا انسان کو ناراستی کے مقابلہ میں بزدل بنا سکتی ہے - اسلئے معیار صرف ستیا گرہ نہ ہوکر [Devanagari] ہونا چاہئے ورنہ خونین ہنگامے اور چوری چورا کے واقعے ہونا ہر وقت ممکن ہے - آہ، دنیا ابھی تضحیک کی نظر ستیا گرہ پر ہی ڈال رہی ہے اور نہ معلوم کہ اس اصول کے مروج ہونے کے لئے ابھی کتنا زمانہ چاہئے - تلسی کا معیار ستیہ شیل آگرہ ([Devanagari]) تو بیشتر لوگوں کو اجتماع ضدین ہی معلوم ہوگا - مگر معیار ہمیشہ بلند ہی ہونا چاہئے - اگر کسی قومی جھنڈے پر یہ الفاظ ہوں ورنہ قوم ایمانداری کے ساتھ اس جھنڈے کے نیچے ہوکر آگے بڑھے تو بجائے اس خوف کے جو مغربی اقوام کیجانب سے مشرقی اقوام میں پھیلتا ہے ایسی قوموں کا استقبال ہی ہر جگہ ہو اور یہ مسئلہ کہ پہلے مذہب (پادری) پھر تجارت اور اس کے بعد قومی سلطنت کا جھنڈا چلتا ہے، دنیا سے مٹ جاوے اسی معیار کی وجہ سے رام کا استقبال بیپا پور میں ہوتا ہے اور (Annexation Policy) کا پتہ نہیں - بال کا راج سگریو کے اور فتح لنکا کے بعد لنکا کا راج بھبھکھن کے سپرد ہوتا ہے، نہ کہ دوسری قوم کے مال و متاع سے اپنی شکم سیری اور مزے اڑانے کے خیالات کا پیدا ہونا - کیا اچھا ہوتا اگر بغیر امتیاز کے مساوات کے بجائے سچائی کا برتاؤ ہوتا - مورخ البیرونی ہندوستان کے قومی شیرازہ کی تنظیم کو عدم مساوات مگر راستی کے اصول پر دیکھکر کہتا ہے کہ گو مساوات کی وجہ سے اسلام کی اشاعت دوسری جگہ بہت جلدی ہوئی مگر یہاں ہندوستان میں باوجود عدم مساوات کے ہر شخص اپنی جگہ پر خوش ہے اور کوئی خاص بیچینی نہیں پائی جاتی -

ایشور ایشور کا خیال تہذیب کا خاص جزو ہوتا ہے - دراصل وہی تہذیب کے رتھ کا چلانے والا رتھبان ہے - ابھی چند ہی روز ہوے کہ سر اولیور لاج (Sir Oliver Lodge) جیسے زبردست سائنس دان نے بھی یہ اعتراف کیا تھا کہ جس روحانیت کی چوٹی پر ایمان اپنے پروں کے اوڑان سے پہونچتا ہے اسی جگہ سائنس بھی اب پہونچ رہی ہے اور روحانیت و سائنس کا تضاد اب مٹتا جاتا ہے - اس میں شک نہیں کہ ہندوستان جیسے

جیسے مفلس ملک کے لئے سائنس کے ذریعہ بہت سی فلاحی تحقیقاتوں کی ضرورت ہے کیونکہ بقول تلسی "بھوکھے بھجن نہ ہوئے گوپالا" کوری روحانیت سے بھی کام نہیں چلتا۔ مگر کتنا ہی بڑا سائنسدان یا مدبر کیوں نہ ہو، دنیا اب سمجھتی جاتی ہے کہ بلاخدا کے تنہا اپنے برتے پر ناخدائی کا دعویٰ محض باطل ہے۔

کسی کی پرستش ہو؟

تلسی داس نے [illegible] विप्र पद [illegible] پر بہت زور دیا ہے اور بعض لوگ اس وجہ سے اُن کو بُرا کہتے ہیں۔ مگر विप्र کون ہیں؟ وہ لوگ جنھوں نے روحانیت کے لئے سب کچھ ترک کر دیا ہے اور ایثار کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ آج بھی کیا وجہ ہے کہ سوامی ودیکانند، سوامی رام تیرتھ، سوامی دیانند سرسوتی، راجہ رام موہن رائے، مہاتما گاندھی کو دیکھکر یورپ و امریکہ متحیر ہو رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اگر کوئی ملک ایسا ہے جہاں پیغمبر پیدا ہوتے ہیں تو وہ ملک ہندوستان ہے۔ ایسے افراد ہی تو دراصل विप्र ہیں اور روحانیت و ایثار کی پرستش ہی دنیا کی نجات کا وسیلہ ہو سکتی ہے۔ افلاطون بھی ایسے ہی لوگوں کی تیاری کا اپنے مکالمہ میں سبق دیتا ہے اور انھیں کو [illegible] کہتے ہوئے انکی سلطنت کو سب سے بڑھکر مانتا ہے۔ ہندوستانی نظام میں واضعان قانون ایسے ہی لوگ ہوا کرتے تھے اور سلطنت کا کام جسمانی اور دماغی قوت رکھنے والے چھتریوں کے سپرد تھا۔ بہرحال کسی نہ کسی چیز کی پرستش ضروری ہوتی ہے پارلیمنٹ کی حکومت میں زبان (لسانیت) اور مال و دولت کی پرستش ہوتی ہے یا اور طرح کی غیر مہذب حکومت میں مادی قوت کی علانیہ پرستش سر فریڈرک ہریسن صاحب مرتے مرتے اِس افسوس میں رہے کہ آٹھ سو برس کی ترتیب کے بعد بھی انگلستان میں کاروبار سلطنت کے لئے قابل افراد کا چناؤ ناممکن ہے۔ لالہ لاجپت رائے نے بھی اپنے انگریزی اخبار پیوپل میں لکھا تھا کہ ولایت میں بھی بے لوث اور بنی نوع انسان کو یکساں سمجھنے والے شخص کے لئے پارلیمنٹ کے چناؤ میں کوئی جگہ نہیں ہے اور اسی کی نقل مطابق اصل ہی نہیں بلکہ اس سے بھی خراب تر حالت ہندوستان میں ہے۔ بزرگان قوم کو نہایت غور و خوض سے کام لینا چاہئے اور بے نفس، بے لوث مگر بے مروت اصحاب کو اپنے نظام سلطنت میں خاص جگہوں پر مامور کرنے کا انتظام ابتدا ہی سے کرنا چاہئے۔

مغربی دنیا میں سوشلزم کی وہ لہر ہے کہ "کل مال کل قوم کا ہے" یہ مسئلہ کتنوں کو متوالا بنائے ہوئے ہے۔ مگر دیکھئے، روس میں لینن جیسا شہرہ آفاق مدبر بھی اس مسئلہ کو سال بھر تک بھی نہ چلا سکا، کیونکہ پھر بقول ایک دہقانی مقولہ کے کہ "ساجھے کی کھیتی کو گدہا بھی نہ کھائے" کوئی ترقی کی پرواہی نہیں کرتا۔ اور کاہلی کے سوا جد و جہد کا پتہ بھی نہیں لگتا۔ ہندوستانی یا مشرقی سوشلزم کیا تھا۔ دان یعنی سخاوت پر زور دینا۔ گو اس اصول کا استعمال فی زمانہ خراب کیا، نہایت ہی خراب طریقہ پر ہوتا ہے مگر پھر بھی ہر بیوہ ہر یتیم، ہر بوڑھے اور ہر لولے، لنگڑے اندھے کا سہارا ہمیشہ دان ہی رہا ہے۔ کسی غیر ملکی پادری نے اس کرشمہ کو کہ یہ کل کام بلا دد گورنمنٹ کے ہوتا ہے، نہایت استعجاب کی نظر سے دیکھا ہے۔ جو طبقے زیادہ کماتے ہیں اونہیں پر سخاوت ایک مذہبی فرض ہے اور اسی لئے غریب کے منہ سے بجائے بدعا کے ایسے نظام کے حق میں دعا ہی نکلتی ہے۔ ہاں سخاوت کا جائز انتظام کرنا اور اوسے قومی فرض بنانا، ایک ضروری ذریعہ اس کی درستی کا ہے۔ مگر یہ نہ ہو کہ کہیں مغرب کی نقل میں کشمکش شروع ہو جاوے اور سخاوت کے بجائے

نوچ کھسوٹ کا بازار گرم ہو۔ میں تو ہندو نظام کو Voluntary Socialism (طبعی سخاوت) کا نام دیتا ہوں جس میں جہاں دولت ضرورت سے زیادہ ہوئی کہ وہ ان میں تقسیم کر دی گئی۔ یہاں تک کہ راجہ ہرش جیسے سخی بادشاہ ہر تیسرے برس اپنا کل خزانہ تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ اس نظام کے ہوتے شخصی کوشش بھی تھیں مٹتی اور سوشلزم کا مفاد بھی حاصل ہو جاتا ہے۔

سر فریڈرک ہریسن صاحب نے جو نوے برس سے زائد عمر کے ہو کر ابھی حال میں راہی ملک عدم ہوئے ہیں، اپنی آخری کتاب میں تحریر فرماتے ہیں کہ انیسویں صدی کا غلط خیال کہ قدرت میں صرف "طاقت کی فتح" کا اصول کام کرتا ہے اب ٹوٹتا جاتا ہے اور یہ خیال مستحکم ہوتا جاتا ہے کہ قدرت میں بھی ایثار کا اصول بچوں کی پرورش وغیرہ وغیرہ لا محدود طریقوں پر کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ لہذا دنیا کا رجحان اب بجائے دوسری قوموں کو زیر کر کے ان سے اپنی شکم پوری کرنے کے، باہمی امداد و اتحاد کی طرف ہونا چاہئے۔ امریکہ کے اخباروں میں یہ پکار برابر سنائی دیتی ہے کہ مادی ترقی کی دیوانہ وار دوڑ میں اسکو دلی اطمینان اور سکون نہیں ملا۔ ایک شخص نے ابھی حال میں امریکہ سے لکھا تھا کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر ہمارے تیار کردہ مال کے خریدار کم ہو جاویں اور سادگی کی ترقی ہو تو ہمارے سب مادی ترقی کے سامان، خوشنما باغ، عالیشان مکان اور بڑے بڑے دعوتی جلسے کہاں ہوں گے؟

کچھ عرصہ ہوا کہ جرمنی اور امریکہ سے مہاتما گاندھی کو دعوت دی گئی تھی کہ مغرب لڑائیوں اور مشینوں کی حیوانی زیادتیوں سے تنگ آگیا ہے۔ پس آپ تشریف لا دیں اور اپنی پاک ہدایت سے ہماری مدد کریں۔ آہ کیا حسرتناک جواب مہاتما جی کو دینا پڑا کہ میرے ساتھ میرے ملک ہی کی تعلیمیافتہ جماعت نہیں ہے اور جب تک یہ جماعت میرے ساتھ ہو کر میرے ملک کی آزادی حاصل کر کے میرے اصولوں کو مضبوط نہ ثابت کر سکے، میں اپنی موجودہ کمزوری کی حالت میں باہر نہیں جانا چاہتا۔

میری یہ منشا نہیں ہے کہ جائز اختلافات بھی باقی نہ رہیں اور نہ اندھے کی سی تقلید ہو مگر کم از کم قومی معیار کیا ہو، اس پر ضرور اتفاق ہونا چاہئے۔ اور اس معیار کے قائم کرنے میں ملک اور قوم کو تلسی داس جی کی رامائن سے ضرور سبق لینا چاہئے۔

راج بہادر ملگوترا۔ ایم اے ال ال بی

بلادِ مغرب ایک مشرقی خاتون کی نگاہ

"آنسہ عنبرہ سلام" ایک مشرقی نا کتخدا خاتون نے حال ہی میں بلادِ انگلستان کی سیاحت کرکے اپنے جو عذبات بیروت کے عربی مجلہ کشاف میں شائع کئے ہیں وہ ناظرین نگار کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں، نہ اس لئے کہ ان میں بلادِ یورپ کی کوئی نئی داستان نہضت وارتقاء بیان ہے، بلکہ محض یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اب مشرقی خواتین کے زاویۂ نگاہ میں بھی کتنا فرق پیدا ہوگیا ہے۔ حالات بہت دلچسپ ہیں اور متاثر ہونے والے کے جذبات اس سے زیادہ دلکش ہم کہاں ہیں، اور دنیا کہاں جا رہی ہے۔ ہم کیا سوچ رہے ہیں اور دنیا کیا کر رہی ہے؟ یہ ہے اصل روح اس تاثر کی جس کے ماتحت "آنسہ عنبرہ" نے اپنے تجربات قلمبند کئے ہیں۔

نیاز



جس وقت میں نے بلادِ انگلستان میں قدم رکھا، تو سب سے پہلے جو کیفیت مجھ پر طاری ہوئی، اس کو صرف "ہیبت و حیرت" کے الفاظ سے تعبیر کرسکتی ہوں۔ چوڑی سڑکیں، بڑے بڑے مکانات، وسیع تجارتگاہیں، خاموش ہجوم، نظم و اہتمام، صفائی و پاکیزگی، اور اسیطرح کی اور بہت سی خصوصیات جو بیک وقت انسان کو متاثر کرتی ہیں، ان کا نام ہے بلادِ انگلستان اوّل اوّل تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی لیکن جب چند روز تک قیام کرنے کے بعد میں نے یہاں کی اسلوب زندگی اور اجتماعی روح کا مطالعہ کیا تو میری سمجھ میں آیا کہ کیوں ایک اجنبی اوّل اوّل یہاں کی فضا اور یہاں کے آسمان و زمین میں ہیبت ہی ہیبت محسوس کرتا ہے۔

حریتِ شخصی انگلستان کی سب سے زیادہ حیرت انگیز خصوصیت وہاں کی حریتِ شخصی ہے جو وہاں کے ذرہ ذرہ سے ظاہر ہوتی ہے اور جس سے ہر شخص اس کے نہایت وسیع معنے میں فائدہ اُٹھا سکتا ہے بشرطِ آنکہ وہاں کے نظام، وہاں کے آدابِ عامہ اور امنِ عام میں خلل نہ پیدا ہو۔ وہاں ہر شخص اپنی رائے اور اپنے قول و عمل میں آزاد ہے اور اس کا بیباکی سے اعلان کرسکتا ہے۔ جو چاہو کرو، جو جی میں آئے کہو کیونکہ حریت وہاں کی دیوی ہے اور اس نے اپنے ہر بندہ کو بالکل آزاد و مطلق العنان چھوڑ رکھا ہے۔ ہائیڈ پارک میں جاؤ تو تم دیکھوگے کہ اتوار کے دن ہمیشہ اور باقی ایام میں بھی کبھی کبھی خطیبوں کا ہجوم ہوتا ہے، کوئی یہاں کھڑا ہوا سیاسیاتِ انگلستان پر نکتہ چینی کر رہا ہے، کوئی وہاں اشتراکیت پر لکچر دے رہا ہے، کوئی فوضویت کی تعریفیں کر رہا ہے، کوئی ملوکیت کے خلاف زہر اگل رہا ہے، کوئی گلے میں صلیب ڈالے ہوئے تعلیمِ دینی کی طرف لوگوں کو بلا رہا ہے اور کوئی یہ کہہ رہا ہے کہ مذاہب دنیا کے لئے مصیبت ہیں اس لئے صرف عقل کے کہنے پر عمل کرو۔ پھر کوئی خطیب ایسا نہیں جس کی گرد سننے والوں کا ہجوم نہ ہو اور اس کے لکچر پر رائے زنی نہ ہو رہی ہو۔ پھر پولیس دیکھ رہی ہے، آجا رہی ہے، کھڑے ہوکر ان تمام مواعظ و خطبات کو سنتی ہے، لیکن کوئی مزاحمت نہیں کرتی۔ البتہ اگر اس کا اندیشہ پیدا ہو کہ پھر ادنیٰ سا اشارہ اُسکے

ہاتھ کا سارے خطرات کو دور کر دیتا ہے اور مجمع اس کی ایک سیٹی سے منتشر ہو جاتا ہے

تنظیم عمل اس سے زیادہ محبوب چیز اہل انگلستان کے لئے اور کوئی نہیں۔ گھر کی معیشت میں، گھر سے باہر کی زندگی میں مشاغل معاش میں اور دوسروں کے ساتھ ملنے جلنے میں الغرض ہر جگہ اور ہر وقت تم ان کے اندر ایک تنظیم عمل پاؤگے، ہر کام کے لئے ایک وقت اور ہر وقت پر کام کی پابندی یہ اُن کے نظام عمل کو روح ہے جس سے کبھی کوئی انگریز بیگانہ نظر نہیں آسکتا۔

ریلوے اسٹیشن پر ٹکٹ گھر کے قریب جہاں دو تین سے زیادہ آدمیوں کا ہجوم ہوا اور انھوں نے صف بنالی، پھر ہر نیا آنیوالا اسی صف کے آخر میں شامل ہوتا جائیگا اور کبھی وہ اس کی کوشش نہ کریگا کہ اچک کر یا گھس پل کر پہلے ٹکٹ حاصل کرے، اُن کی ذہن ہی میں یہ بات نہیں آتی کہ خلاف اصول کیونکر کوئی چل سکتا ہے۔

چوراہوں پر پولیس والے نے ہاتھ اٹھایا اور مسافروں، گاڑیوں اور موٹروں کا سیلاب دفعتہً رک گیا، اُس نے ہاتھ نیچے کیا اور پھر اسی نظام کے ساتھ آہستہ آہستہ سب چل پڑے اسا عجیب وغریب منظر ہوتا ہے کہ بے اختیار داد منہ سے نکل جاتی ہے۔ باوجود شدید ازدحام اور کثرت آمد ورفت کے وہاں نہ کوئی ہنگامہ نظر آتا ہے نہ کوئی شور وغل، ہر کام سکون کے ساتھ ہو رہا ہے، ہر شخص خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں منہمک ہے اور یہ سب نتیجہ ہے انتظام معیشت کا اور فرض شناسی کا، ایک مشرقی انسان کی طرح نہ اُن کے ہاں کاہلی کی دیر ہے نہ گھبراہٹ کی جلدی۔ تم اگر کسی ضرورت سے ڈاکخانہ میں جاؤگے تو وہاں کا ہجوم دیکھ کر حیران رہجاؤگے اور تم کو یقین ہوجائیگا کہ ضرورت پوری نہیں ہوسکتی، لیکن اگر تم صبر کے ساتھ صف میں شامل ہو گئے تو پھر دیکھوگے کہ چند منٹ کے اندر تم سے آگے کا ہجوم چھنٹ گیا ہے اور تمہارے بعد اس سے زیادہ لمبی قطار آدمیوں کی بن گئی ہے وہاں یہ رات دن کا مشغلہ ہے۔ اور ہر شخص اس مکانکی زندگی کا عادی ہے۔

تم کسی بڑے مخزن (اسٹور ہاؤس) یا تجارتی ذخیرہ کی دوکان میں پہونچ جاؤ اور وہاں کے انہماک کو دیکھو۔ تم یہ معلوم کرکے حیران رہجاؤگے کہ ایک دن میں وہاں ۳ لاکھ آدمی آتے جاتے ہیں۔ یہاں دروازہ سے داخل ہوتے ہی تم کو مختلف تختیاں لکھی ہوئی نظر آئینگی جو مختلف سمتوں کا حال بتاتی ہیں اور ہر سمت میں مختلف قسم کے مال کے ذخیروں کا پتہ بتاتی ہیں پھر تم ذرا آگے بڑھے کہ وہاں کے خوش سلیقہ ملازم (مرد عورت) شگفتہ روئی کے ساتھ آئے اور تمہاری ضروریات کے متعلق تمام آسانیاں بہم پہونچائیں۔

ٹیلیفون سڑک پر ہر ہر جگہ تم کو ملین گے اور فوراً تم کو اس مکان کے نمبر سے ملا دین گے جہان سے تم گفتگو کرنا چاہتے ہو۔ زمین کے اوپر نیچے یہاں ریل کا (ایسا ہی) جال ہے جیسے جسم انسان میں شرائین و ورید لیکن ہر گاڑی میں تمام تفصیلی نقشے متعدد اشارات و ہدایات موجود رہتی ہیں جس سے ایک شخص بہ آسانی منزل مقصود تک پہونچ جاتا ہے، پھر یوں بھی اُن نقشوں کے دیکھنے کی ضرورت کس کو ہوتی ہے۔ ریل کے ملازم خود تمہاری مدد کرنے کے لئے ہر وقت ہر جگہ غلاموں کی طرح موجود رہتے ہیں۔

انگلستان کا باشندہ اپنے قوا کو کبھی بیکار و معطل نہیں رہنے دیتا اور پوری ہمت کے ساتھ وہ ان سے کام لیتا ہے۔ اور یہی نظام عمل ہے کہ وہ حفظ نشاط کے لئے کافی آرام بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ تم دیکھوگے کہ ابتدائی مدارس سے لیکر بڑی بڑی

کالجوں تک یہ دستور ہے کہ ۹ بجے صبح سے قبل وہاں تعلیم شروع نہیں ہوتی - اور کارخانے والے مجبور ہیں کہ اتوار اور نصف دن سنیچر کا تعطیل کے لئے وقف کردیں - اسی طرح ہر طبقہ کے لوگ سالانہ تعطیل چند دن کی نہایت لطف سے مناتے ہیں جس میں "نک و مخدوم سب برابر ہیں ایک خاتون میری دوست ہیں جن کے ایک چھوٹا بچہ ہے اور خود ہی ان کو گھر کا سارا انتظام اور بچہ کی نگرانی کرنی پڑتی ہے، لیکن اتوار کے دن وہ خود بھی تعطیل مناتی ہیں اور ایک دن کے لئے کسی عورت کی خدمات حاصل کرلیتی ہیں اس راحت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تعطیل کے بعد لوگ نہایت نشاط اور تازہ قوت کے ساتھ کام پر جاتے ہیں اور ان کو کوئی تکان نہیں ہوتی -

ریاضت یہاں کی زندگی کا سب سے نمایاں منظر اُن کا شوق ریاضت ہے انگلستان کا ہر باشندہ مرد ہو یا عورت دیگر ضروریاتِ زندگی کے ساتھ ساتھ ریاضت کو بھی ضروری جانتا ہے اور کسی نہ کسی ریاضت کے کلب کا ممبر ہے - میں نے سانٹ پول کالج میں لڑکیوں کو ایسی ایسی ریاضت کرتے دیکھا کہ کبھی میں خیال بھی نہیں کرسکتی تھی، یہی وجہ ہے کہ یہاں کی لڑکیاں صحیح و توانا، خوبصورت، اور مستعد ہوتی ہیں - لندن اور اس کے قرب و جوار میں اس قدر کثرت سے اور اتنے بڑے بڑے میدان ہیں کہ ایک لاکھ سے زیادہ آدمی اُن میں آسکتے ہیں - اور روزانہ یہاں کھیل تماشے ہوتے رہتے ہیں لیکن کوئی میدان ایسا نہ ہوگا جہاں تمہیں لوگوں کا ہجوم نظر نہ آئے اور ایک خاص اہتمام کے ساتھ اس کا لطف نہ اُٹھائیں - چنانچہ جب کیمبرج اور آکسفورڈ کے درمیان کوئی مقابلۂ ریاضت ہوتا ہے تو کوئی آدمی ایسا نہیں ہوتا جو اپنے سینہ یا موٹر پر کیمبرج یا آکسفورڈ میں سے کسی کا نشان نہ لگائے ہوئے ہو - پھر یہ بھی کہ اس مقابلۂ ریاضت کا نتیجہ بد دلی یا رنج و ملال میں ظاہر ہوتا ہو، بلکہ وہ نہایت خوش دلی کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں اور ایک لمحہ کے لئے کوئی تنغص پیدا انہیں ہونے دیتے - پھر اسی کے ساتھ ایک بڑی جماعت بازی لگانے والوں کی ہوتی ہے اور اس کے یہاں اس قدر کثرت ہے کہ اگر کوئی شخص مر رہا ہے تو بھی آدمی بازی لگانے کے لئے تیار ہوجائیں گے - گھوڑ دوڑ یا دوسرے کھیل تماشوں کا کیا ذکر ہے -

تفریح چونکہ یہ قوم اس قدر نشاط طلب ہے اس لئے فطرت نے ان کے ملک کو بھی ویسا ہی خوشنما اور دلچسپ بنایا ہے یہاں باغوں اور تفریح گاہوں کی کوئی انتہا نہیں ہے اور ہر شخص نہایت آسانی سے ہر جگہ کارخانہ کی منہمک زندگی سے نکل کر ان میں پہونچ سکتا ہے - یہاں کا بڑا پارک ۴۰۰ ایکڑ زمین کو محیط ہے جس میں گھاس سے سرسبز تختے، شاداب درخت، فوارے، خوبصورت پھول اور ہر وہ چیز جو روح کو راحت پہونچا سکتی ہے یہاں اور تمام پارکوں میں پائی جاتی ہے، تالابوں کی بھی اتنی ہی کثرت ہے جس میں طیور آبی اور کشتیوں کی تعداد غالباً برابر ہی رہتی ہے یہاں کی چڑیاں اس قدر مانوس ہوگئی ہیں کہ وہ لوگوں کے ہاتھ سے اپنی غذا کرلیتی ہیں -

پھر اسی کے ساتھ یہ بھی دیکھوگے کہ اگر ایک طرف باغ یا پارک، سبزہ، تالاب آدمیوں سے بھرا ہوا ہے، تو دوسری طرف ریاضت گاہیں کھیل کود کے میدان اور سنیما تھیٹر وغیرہ بھی ویسے ہی کھچا کھچ بھرے ہوئے ہیں چنانچہ تم یہ سنکر غالباً حیرت کروگے کہ یہاں ہر ہفتہ ۵ ملین (ڈیڑھ کرور) آدمی سنیما میں جاتے ہیں اور یہی حال تھیٹروں کا ہے - بعض بعض تھیٹر ایسے ہیں جن کا ٹکٹ

تم کو آج درخواست کرتے پر ایک ہفتہ کے بعد ملیگا، گویا ایک ایک ہفتہ پہلے سے لوگ اپنی جگہ مخصوص کرا لیتے ہیں یہی حال رقص و نغمہ کے شوق کا ہے کہ وہاں کی تمام رقص گاہیں آدمیوں سے بھر جاتی ہیں اور روزانہ نئے نئے طریقے رقص کے ایجاد ہوتے رہتے ہیں، پھر یہاں ہر جگہ لاسلکی کا بھی انتظام ہے جس سے ہر شخص اپنے گھر بیٹھے گانا سن سکتا ہے۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ باوجود اس قدر کثیر مصرف کے وہ اتنا روپیہ بھی بچا لیتے ہیں کہ جا کر دوسرے ملکوں کی سیر کریں۔

انگریز جس طرح اپنی خانگی زندگی کو محبوب رکھتا ہے، اسی طرح وہ باہر کی زندگی کا بھی شیدا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ کوئی روشن دن گزر جائے اور اس سے لطف نہ حاصل کیا جائے۔ چنانچہ گزشتہ عید فصح کے دن مضافات لندن میں جانے والوں کی تعداد ۴ ملین تھی اور یہ بھی اُن کی جو گھوڑے گاڑیوں کے ذریعہ سے گئے، ریل، ٹراموے اور موٹر سے جانیوالے ان کے علاوہ تھے صرف واٹرلو اسٹیشن پر جہاں ۲۴ پلیٹ فارم ہیں، ہجوم کی یہ حالت تھی کہ دو میل کے طول میں انسانی صف قائم تھی، جتنا حصہ آگے کا ختم ہو جاتا تھا اخیر میں پھر اتنے ہی آدمی بڑھ جاتے تھے یہاں تک کہ کامل ۲۴ گھنٹے یہ دو میل کی صف قائم رہی

خاموش وطنیت انگلستان کے وطنی مظاہر اس قدر خاموش ہوتے ہیں کہ ان کو دیکھ کر حیرت ہو جاتی ہے۔ جس دن یہاں عام ہڑتال ہوتی ہے اور ہر کام کرنے والے نے اپنا کام ترک کر دیا تھا یہاں تک کہ ذرائع آمد و رفت بھی تمام بند ہو گئے تھے، وہ دن عجیب و غریب تھا کہ باوجود اتنی زبردست تحریک عمل کے شور و ہنگامہ کا کہیں نام نہ تھا، یہ معلوم ہوتا تھا کہ سارے لندن پر سوگ طاری ہے اور ہر جگہ خاموش ماتم بپا ہے۔

خانگی زندگی انگلستان کا عائلہ یا خاندان ہمارے یہاں کے عائلہ سے مختلف مفہوم رکھتا ہے۔ خاندان کے افراد یہاں باہم ربط تو رکھتے ہیں لیکن ایک نہیں ہو جاتے۔ میاں بیوی رشتہ ازدواج سے منسلک ہیں، خانگی زندگی کو دونوں ایک دوسرے کی مدد سے بسر کر رہے ہیں، لیکن ایک دوسرے کا پابند نہیں ہے جس طرح مرد کام کرنے کے بعد باہر کلب وغیرہ میں تفریح کا مجاز ہے، اسی طرح عورت بھی آزاد ہے اور مرد کو اس سے باز پرس کا کوئی حق حاصل نہیں ہے گھر کی سیادت مشرق کی طرح یہاں بھی ماں ہی کے سپرد ہے۔

جب تک بچہ چھوٹا رہتا ہے اس کی تعلیم و تربیت کی ذمہ دار ماں رہتی ہے اور جوان ہونے کے بعد اس کو اپنا گھر علیحدہ بنانا پڑتا ہے اور والدین سے کوئی تعلق نہیں رہتا۔

بچوں کی محبت انگلستان میں عید میلاد انتہائی مسرت کا دن ہوتا ہے۔ اور سارا لندن بالکل نئی چیز ہو جاتا ہے، زینت و آرائش کی کوئی حد نہیں رہتی اور اس دن ہر چہرہ متبسم نظر آتا ہے۔ یہ عید بچوں سے متعلق ہے۔ اس لئے ماں باپ کی ساری مسرتیں اس دن سے وابستہ ہو جاتی ہیں۔ بچوں کو تحفے دئے جاتے ہیں اور تمام دوکانیں لاکھوں قسم کے کھلونوں اور خوبصورت کتابوں سے بھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ تھیسٹر اور سنیما میں بھی مخصوص طور پر وہی کھیل ہوتے ہیں جن کا تعلق اس عید سے ہو۔ چونکہ یہاں بچوں کی حفاظت، تعلیم و تربیت کے لئے ایک بہت بڑی جماعت قائم ہے اس لئے غریبوں کے بچے بھی

ان نعمتوں سے محروم نہیں رہنے اور نہ ان پر کسی قسم کی سختی ہوتی ہے، چنانچہ ایک مرتبہ کسی باپ نے اپنے بچہ کو سخت جسمانی سزا دی تو اس کو چھ مہینے کی قید با مشقت اٹھانا پڑی۔

یہاں بچہ کی صحت و تربیت کا بہت خیال رکھا جاتا ہے گاڑیوں میں بٹھا کر باغوں میں لیجانا، کھیل کود کی جگہوں میں پہونچانا، روز کا مشغلہ ہے۔ بچوں کے لئے کتابیں، رسالے اور اخبار بھی خاص طور سے شائع ہوتے ہیں اور نہایت کثرت سے۔ بڑے بڑے اخباروں میں بھی بچوں کے صفحات جن میں عمدہ عمدہ تصویریں ہوتی ہیں بچوں کے لئے مخصوص ہوتے ہیں۔ روزانہ جو لاسلکی پروگرام موسیقی کا شائع ہوتا ہے اس میں ایک حصہ گانے یا قصہ کہانی وغیرہ کا بچوں کے لئے بھی مخصوص ہوتا ہے۔

پہلے سال کے بعد سے بچوں کے سامنے تصویر دار کتابیں ڈالدی جاتی ہیں، لڑکوں کے لئے علحدہ اور لڑکیوں کے لئے علحدہ اور ہر سال ان میں ترقی ہوتی جاتی ہے۔

بچوں کی صفائی ستھرائی کا ان کے ہاں بہت زیادہ خیال کیا جاتا ہے۔ غریب سے غریب شخص کے ہاں بھی روزانہ بچہ کو غسل دینا ان کی معاشرت میں داخل ہے۔ تربیت کے لحاظ سے دو چیزوں کا درس سب سے پہلے دیا جاتا ہے۔ استقلال شخصی اور احترام غیر اور اسی اصول پر اس کی تعلیم و تربیت میں تدریجی ترقی پیدا کی جاتی ہے پہلے بچہ کو چلنا سکھایا جاتا ہے، پھر کھیل کود، پھر اپنے لئے ضروری چیزوں کی خریداری، اور پھر مدرسہ اور وہاں کی کتابوں کی تعلیم ہوتی ہے اور اس کے بعد وہ دنیا میں اپنے ہاتھ پاؤں چلاکر عملی زندگی بسر کرنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہاں کثرت سے ایسی انجمنیں ہیں جو ماؤں کو بچوں کے طریق تعلیم و تربیت کا درس مفت دیتی ہیں۔ بچوں کے ساتھ اُن کو نہایت شدید محبت ہوتی ہے، راستہ میں، ریل میں، دوکان میں، باغ میں، الغرض کہیں کسی کا بچہ نظر آجائے وہ اس سے التفات کئے بغیر نہیں رہتے۔ ایک بار میں پکاڈلی کے قریب تھی۔ اور میری چھوٹی بہن بھی میرے ساتھ تھی، جہاں ہجوم و ازدحام کا وہ عالم کہ ایک انسان اس کو دیکھ کر آسانی سے حشر کا مفہوم جان سکتا ہے۔ لیکن باوجود اس ہنگامہ کے جو شخص میرے پاس سے گزرتا تھا، بچی (میری چھوٹی بہن) کو ضرور پیار کر لیتا تھا۔

عہدِ شباب سب سے پہلی وہ خصوصیت جو ایک انگلستان کی نوجوان لڑکی کو مرکز توجہ بنا دیتی ہے اس کا شاندار متناسب قد و قامت ہے اور اسی کے ساتھ اس کا ملبوس جو پنڈلیوں کو عریاں رکھ کر جمال قامت میں رعنائی کو بھی شامل کر دیتا ہے۔ ممکن ہے کہ ایک انگریز لڑکی کا حسن و جمال کسی کی توجہ کو مائل نہ کر سکے، لیکن اس کے چہرہ کی زندہ تازگی ممکن نہیں کہ نگاہ کو اپنی طرف نہ کھینچ لے یہ تو اس کا خارجی پہلو ہے معنوی یا عملی پہلو کے لحاظ سے وہ بہت زیادہ عجیب چیز ہے۔ صبح ہوئی اور اپنے کام میں تیزی سے لگ گئی۔ تم اسے کام کرتے ہوئے دیکھو گے تو اس قدر جلد اور سبک طریقہ سے کہ معلوم ہوگا کوئی تیتری ہے۔

انگلستان کی عورت درس و تدریس کی جگہ ایک بہترین مدرس ہوا دی ہے، تجارتی کارخانوں میں نہایت ماہر مہتمم ہے اسٹیج پر بہتل رقاصہ و مغنیہ ہے اور پارلیمنٹ میں زبردست خطیب ہے۔

میں نے ایک عورت کو دیکھا جو بڑا خاندان رکھتی ہے اور اپنے شوہر، اپنی اولاد اور مہمانوں کی تمام راحتوں کی کفیل ہے۔
لیکن اسی کو میں نے کھیل کود میں مردوں سے بازیاں جیتتے، گھوڑدوڑ میں گھوڑے دوڑاتے، دریا میں کشتی چلاتے، خشکی میں موٹر چلاتے، غباروں میں اڑتے، پانی میں تیرتے، ساحل پر ریت میں لوٹتے، رقص گاہوں میں بہترین لباس کے ساتھ رقص کرتے اور سیاسی مجالس میں فصیح ترین تقریر کرتے بھی سنا اور میں حیران رہ گئی کہ اس جامعیت کا کیا ٹھکانا ہے۔
یہاں عورت کی تعلیم بھی بالکل مردوں کی طرح مکمل ہوتی ہے اور دوسرے ممالک میں بھی مخصوص فنون حاصل کرنے کیلئے جاتی ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آخر کار انتخاب ان کو مل گیا اور اب اس وقت ۱۲۶۹۰۷۹۹ مردوں کے مقابلہ میں ۲۲۹۲۳۸۴ ہ! عورتوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہوگیا ہے۔

کریم النفسی اور تہذیب

انگلستان جانے کے بعد سب سے پہلے جو لفظ میں نے سنا وہ ([illegible]) تھا اس کا استعمال یہاں کے لوگ بار بار کرتے ہیں، جسے معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز کا جمالی پہلو ہی اُن کے سامنے رہتا ہے اور مشکل سے کبھی لفظ (nasty) اُن کے منہ سے سننے میں آئے گا جو اول الذکر لفظ کا بالکل ضد ہے۔
اس میں شک نہیں کہ اس قوم میں نقائص بھی ہیں اور بُرائیاں بھی لیکن کریم النفسی کی مثالیں ان میں زیادہ پائی جاتی ہیں۔ وطن پرستی، مفاد قومی، تعاون باہمی، یہ وہ خصوصیات ہیں جو ایک شخص کی کریم النفسی پر دلالت کرتی ہیں اور یہاں کی آبادی کا غالب حصہ (مرد عورت دونوں کا) ان صفات سے متصف نظر آتا ہے۔ یہاں کی تہذیب کا یہ حال ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ دوکان میں مال بیچنے والا، اسٹیشن پر ٹکٹ دینے والا پہلے شکریہ ادا کریگا اور پھر مال یا ٹکٹ دیگا۔ بلکہ اس سے زیادہ یہ کہ نوکر کا بھی شکریہ ادا کیا جاتا ہے اور ایک افسر اپنے ماتحت کی خدمت کا بھی اعتراف شکریہ سے کرتا ہے۔
دوسروں کی خدمت و امداد کے لئے یہاں کے لوگ ہر وقت طیار رہتے ہیں۔ میں ایک مرتبہ رشمونڈ پارک میں ٹہل رہی تھی اور میری چھوٹی بہن جو بیمار تھی میرے بھائی کی گود میں تھی جس کو وہ بہت دیر سے لئے ہوئے تھا۔ ہمارے ساتھ ہی ساتھ ایک اور مرد بزرگ بھی جس کی عمر ۷۰ سال کی ہوگی مع اپنی بیوی کے ٹہل رہا تھا۔ صورت و لباس سے یہ لوگ بہت معزز معلوم ہوتے تھے میرے بھائی نے تھک کر چاہا کہ بچی کو گود سے اتار دے، لیکن وہ اسے زمین تک نہ لایا ہوگا کہ اسی مرد ضعیف نے اپنی چھڑی اپنی بیوی کو دی اور بڑھکر آگے آیا اور بولا کہ "اب اس بچی کو گود میں لے کر چلنے کی باری میری ہے"۔ جانوروں کے ساتھ بھی یہاں اسی لطف و رحم کا سلوک کیا جاتا ہے۔ میں دو سال انگلستان میں رہی لیکن اس دوران میں کسی کے منہ سے ایک کلمہ بھی ایسا نہیں سنا جو دل کو بُرا لگتا۔
میں روزانہ صبح کو ریل میں بیٹھ کر ایک گھنٹہ کے لئے سیر کے لئے نکل جاتی، تاکہ میں یہاں کے لوگوں کا زیادہ قریب سے مطالعہ کروں۔
ریل میں ہجوم کا یہ عالم ہوتا کہ تل رکھنے کو جگہ نہ ملتی، لیکن میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ یہاں کے مرد عورت ریل میں بھی اپنا وقت ضائع کریں جسکو دیکھئے یا تو وہ کسی اخبار کا مطالعہ کرتا ہوا ملیگا یا کوئی کتاب پڑھ رہا ہوگا یہی حال عورتوں کا ہے۔
ایک دودھ بیچنے والا نکلتا ہے اور ہر دروازہ پر دودھ کی بوتلیں رکھتا ہوا چلا جاتا ہے۔ نہ وہ دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ اور نہ چوری

کا اندیشہ اُس کو ہوتا ہے۔ راستہ میں میز کے اوپر اخبار رکھے ہوئے ہیں، لوگ گزرتے ہیں قیمت وہیں رکھدیتے ہیں اور اخبار لیکر چلے جاتے ہیں پھر یہ دیانت و امانت پولیس یا قانون کے خوف سے نہیں ہے بلکہ حقیقتاً اُن کے ذہن ہی میں یہ بات نہیں آتی کہ کوئی انسان ایسی سخیف و ذلیل حرکت بھی کرسکتا ہے اور یہ نتیجہ ہے صرف ان کی اعلیٰ تربیت ذہنی کا۔ برنارڈ شاہ کہتا ہے کہ "مدنیت نام ہے اسکا کہ تم میرا اور میری خصوصیات کا احترام کرو، میں تمہارا اور تمہاری خصوصیات کا احترام کرونگا"۔ حقیقت یہ ہے کہ اہل انگلستان نے اس کو پوری طرح سمجھا اور نہایت تکمیل کے ساتھ اپنے ملک کے اندر اسپر عمل کر رہے ہیں۔

ادبی جواہر

تذکرہ حسینی (فارسی) یہ ایک تذکرہ ہے جسمیں ہندوستان و اہل ایران کے فارسی گو شعرا کا ذکر ہے مگر مصنف نے اس خوبی اور عمدہ ترتیب کے ساتھ لکھا ہے کہ بیساختہ منہ سے کلمات آفرین نکل جاتے ہیں درمیان درمیان جو حکایات درج ہیں انھوں نے دلچسپی میں اور بھی اضافہ کردیا ہے قیمت ۱۱ر

سراپائے سخن (اردو) یہ بھی ایک تذکرہ ہے جسمیں معشوق کے تمام اعضا کی تعریف میں اساتذہ معروف و مشہور کے اشعار دیئے گئے ہیں۔ عمر

زندگانی نظیر (اردو) یعنی سوانح عمری میاں نظیر اکبر آبادی۔ ہندوستان کے مشہور اور مقبول ہر دلعزیز شاعر نظیر کی سوانحعمری نہایت اعلیٰ عبارت میں درج کی گئی ہے از پروفیسر شہباز۔ قیمت عہ

سخن شعرا (اردو) ایک جامع اور دلچسپ تذکرہ شعرا مصنف مولوی عبدالغفور نساخ قیمت عہ

کلیات انوری (فارسی) محمود غزنوی کے دربار کے سب سے بڑے شاعر انوری کا کلام مع ہزلیات قیمت عہ

دیوان شمس تبریز (فارسی) صوفیانہ بادۂ تصوف میں ڈوبا ہوا کلام ہے نہایت عمدہ کاغذ پر صحت واہتمام کیساتھ حال ہی میں طبع ہوا ہے۔ ہر

دیوان نعمت خاں عالی (فارسی) نعمت خاں عالی وہ شاعر ہے جسکے کمال نے اُسے عالمگیر ایسے بادشاہ کے دربار میں ہر دلعزیز بنایا۔ عمر

دیوان ملا نور الدین ظہوری (فارسی) ظہوری وہ شاعر ہے جسکو غالب نے بھی مانا اور اس کا اتباع کیا ہے اسکا تمام و کمال کلام یہ ہے قیمت عہ

کلیات مرزا جلال اسیر (فارسی) جلال اسیر ان مشہور و مقبول شعرا میں سے ہے جو صاحب طرز گزرے ہیں قیمت عہ

کلیات ظفر چہار جلد (اردو) آخری تاجدار دہلی کا تمام و کمال کلام فصاحت زبان، روزمرہ، محاورہ میں ڈوبا ہوا ہے عہ

کلیات مومن۔ حضرت مومن کا پایہ شعرا میں اتنا زبردست ہے کہ دلی کے بڑے بڑے شعرا بھی اسکے سامنے نہیں ٹھہر سکتے قیمت عمر

دیوان ناسخ۔ اس کتاب کو نہایت صحت کیساتھ چھوٹی تقطیع پر چھاپا گیا ہے جس سے شان کلام بڑھ گئی ہے قیمت عہ

کلیات میر۔ ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر میر کے پورے کلام کا مجموعہ ہے عہ **کلیات سودا**۔ میر کے حریف ظریف سودا کا وہ کلام جس نے ان کے معاصرین پر انکی ڈھاک بٹھادی تھی ہر صنف شعر میں استاد کامل تھے قیمت عہ

المشتہر:— **منیجر نول کشور بک ڈپو لکھنؤ**

ڈائری کا ایک ورق

چاند کا سفر

(۲)

یہ میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ اب ہم حدود زمین سے دور ہو چکے تھے اور ہمارا سفر چاند کی فضا میں ہو رہا تھا، چاند کی فضا میں سفر ہونے کے یہ معنی ہیں کہ چاند کرۂ زمین کی گرد چکر لگا رہا تھا اور ہم بھی اس کے ساتھ ساتھ تھے یعنی اس طرح ہم اول اول اپنے کرۂ وطن کا طواف کر رہے تھے جو حب وطن رکھنے والوں کے لئے یقیناً حج اکبر سے کم نہیں ہو سکتا۔

جس طرح ہم زمین سے دوسرے ستاروں کو چمکتا ہوا دیکھا کرتے تھے آج ہم اپنی زمین کو بھی اسی طرح چمکتا ہوا دیکھ رہے تھے اور دوری کی وجہ سے وہ بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے جوہی کا پھول

جس وقت کپتان نے اپنی دوربین کے ذریعہ سے ہم لوگوں کو کرۂ زمین کی زیارت کرائی تو سب کو سخت حیرت ہوئی کیونکہ جس طرح ہم وہاں سے ہر ستارہ کو اپنے سے بلند دیکھا کرتے تھے اس وقت زمین بھی ہم کو اتنی ہی بلند نظر آ رہی تھی اور باوجود اس کے کہ کپتان نے نہایت وضاحت کے ساتھ سمجھایا کہ فضا میں بلندی و پستی کا کوئی مفہوم نہیں ہے لیکن میں کیا کسی کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ بھلا ایسا کیونکر ممکن ہے اور فوراً مجھے اپنے ایک دوست کا خیال آ گیا جو کہا کرتے تھے کہ اگر زمین گردش کرتی ہے تو اس کے سمندروں کا پانی کیوں نہیں بہ جاتا۔ واقعی حیرت کی بات تھی کہ زمین، جس کو ہم نیچے چھوڑ آئے تھے اس وقت ہم کو اوپر نظر آ رہی تھی اور اس کے سمندروں کا ایک قطرہ بھی ہم تک نہ پہونچتا تھا۔ عقل قبول نہیں کرتی کہ محض زمین کی گردش اور اس کی کشش اس قدر زبردست ہو کہ پانی ایسی سیال چیز کو روک لے اور بہنے سے باز رکھے میں نہیں کہتا کہ یہ مذاق تھا یا سنجیدگی لیکن آخر کار ایک خاتون مچل ہی گئیں کہ "مجھے تو تم جلدی سے چاند میں پہونچا دو یا زمین کی طرف واپس کر دو، کیونکہ واقعی اگر ہم اس محاذ میں ہیں جہاں —— زمین کے سمندر بہ کر نیچے کی طرف آ سکتے ہیں —— تو اس سیلاب سے بچنا محال ہے"

سب لوگ ہنسنے لگے لیکن اس کی تشویش کم نہ ہوئی اور جب اس نے کپتان سے کہا کہ جلد سے جلد پہونچنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے تو اس نے جواب دیا کہ "آپ جہاز کی کھڑکی سے کود جانے کی ہمت کریں تو بہت جلد پہونچ سکتی ہیں لیکن کس عالم میں اسکا حال صرف اسی وقت معلوم ہو سکتا ہے جب کوئی اس کا تجربہ کرے"

خاتون۔ "یہ کیونکر"

کپتان "وہ اس طرح کہ چاند کی کشش آپ کو بالکل اسی طرح کھینچ لے گی جس طرح آپ ایفل ٹاور سے کوئی ڈھیلہ نیچے کی طرف پھینکیں اور وہ چشم زدن میں زمین تک پہونچ جائے اس وقت ہمارا جہاز بھی بالکل ایک ڈھیلہ ہی طرح چاند کی طرف کھنچا جا رہا ہے لیکن اس کشش کا مقابلہ اس طرح کر رہے ہیں کہ ہم نے اپنے سفر کا رخ پھر زمین کی طرف کر دیا ہے اور کشش قمر کے بالکل خلاف انجن کی قوت صرف کر رہے ہیں اس لئے وہ جا تو رہا ہے چاند ہی کی طرف لیکن ایک ڈھیلہ کی طرح نہیں بلکہ ایک طایر کے مانند۔ اگر آپ جہاز سے باہر ہو جائیں گی تو یقیناً ہم سے بہت پہلے وہاں پہونچ جا دیں گی لیکن بالکل اسی طرح جیسے چینی کے گلدان کو فرش پر پوری قوت کے ساتھ پٹک دیا جائے"

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ دفعتہً جہاز کی رفتار ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی، اور وہ ایک جگہ معلق رہ کر قائم ہو گیا۔ اس جھٹکہ کو سب نے محسوس کیا اور ہر شخص اپنی جگہ سے گھبرا کر اٹھ بیٹھا، میں سمجھا کہ شاید چاند کے کسی پہاڑ سے ہمارا جہاز ٹکرا گیا ہے، لیکن بعد کو کپتان نے آکر اصل وجہ یہ بیان کی کہ چونکہ جہاز کا انجن کشش قمری کے بالکل خلاف اپنی قوت صرف کر رہا تھا اور یہ اندازہ اسی کشش پیما سے کیا تھا جو زمین کے لئے مستعمل ہے اس لئے انجن کی مخالف قوت اور چاند کی کشش دونوں برابر ہو گئیں اور جہاز رک کر رہ گیا۔ چونکہ چاند زمین سے بہت چھوٹا کرہ ہے اسی لئے اس کی کشش بھی اسی نسبت سے کم ہے۔ اب میں نے گیس کی قوت کو دو درجہ کم کر دیا ہے۔ اور اس قسم کا تجربہ شاید اب نہ ہو"

کپتان نے اس واقعہ پر اظہار افسوس و ندامت کیا اور کہا کہ اگر جھٹکہ سے کسی کو ایذا پہونچی ہو تو معاف کیا جائے۔ اب ہمارا جہاز نسبتاً زیادہ تیزی کے ساتھ بڑھ رہا تھا سمت کی تعیین چونکہ فضا ر بسیط میں نہیں ہو سکتی اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کدھر؟ مگر ہاں چونکہ پہلے روزانہ اور اب ہر ساعت میں چاند کا حجم بڑھتا جا رہا تھا اور درخشانی کم ہوتی جاتی تھی اس لئے ہم سمجھتے تھے کہ چاند سے قریب ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ بات غالباً ہر شخص کی سمجھ میں نہ آئے کہ قریب ہو جانے سے چاند کی چمک کیوں کم ہوتی جاتی تھی۔ میری سمجھ میں بھی یہ بات نہ آئی تھی لیکن میرے پاس ہی جب ایک امریکن نے اپنی بیوی کو سمجھایا تو مجھے بھی معلوم ہوا کہ چاند میں خود روشنی نہیں ہے بلکہ آفتاب سے حاصل ہوتی ہے۔ اور اسی وقت اس کا ظہور ہوتا ہے جب آفتاب کی کرنیں وہاں سے لوٹتی ہیں، پھر چونکہ شعاعوں کا پورا پھیلاؤ ہمیشہ زیادہ دور پر جا کر ہوتا ہے اس لئے قریب سے پوری چمک کسی چیز کی نمایاں نہیں ہو سکتی۔ بہر حال یہ سفر اسی طرح جاری تھا اور کوئی خاص بات قابل ذکر سوائے اس کے نہ تھی کہ غذا بہت بڑھ گئی تھی پہلے اگر ایک ڈبل روٹی کافی ہوتی تھی تو اب آٹھ درکار ہوتی تھیں۔ حالانکہ بھوک میں کوئی اضافہ نہ ہوا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کشش قمر کے ضعیف ہونے کی وجہ سے ہر چیز کا وزن بہت کم ہو گیا تھا اور ایک اونس زیادہ سے زیادہ ایک ڈرام رہ گیا تھا یعنی جو وزن پہلے ایک روٹی کا ہوتا تھا اس میں اب آٹھ روٹی چڑھتی تھیں۔ چونکہ اس کا تجربہ پہلے ہو چکا تھا اس لئے ذخیرہ کافی تھا تاہم احتیاط کے ساتھ صرف کیا جاتا تھا، یہی حال مشروبات کا تھا، اور شراب کے دو ساغر پوری بوتل کے معنی رکھتے تھے۔

اب سانس لینے کے لئے آکسیجن کی بھی ضرورت باقی نہ رہی تھی اور نلکیاں ناک سے علحدہ کر کے رکھدی گئی تھیں، پھیپھڑا

ساکن تھا اور قلب و نبض کے ضربات نہایت ہلکے ہوگئے تھے۔ کیونکہ کرۂ قمر کی فضا میں ہوا سے زیادہ ایک لطیف چیز ہوتی ہے جو مسامات انسانی سے نفوذ کرکے خون میں مل جاتی ہے اور فتار خون کو بہت دھیما کر دیتی ہے۔ اس لئے خون کو صاف رکھنے کے لئے پھیپھڑے کی ضرورت باقی نہیں رہی اور وہ ایک "اخری عضو" ہو کر رہ گیا۔

سردی ہر لحظہ بڑھتی جاتی تھی اور بجلی کی انگیٹھیاں دہک رہی تھیں۔ ہر شخص نے اپنے اپنے لبادے، سمور کے کپڑے پہن لئے تھے، لیکن تسکین نہ ہوتی تھی۔ میری حالت نسبتاً زیادہ مطمئن تھی کیونکہ میں روئی کے کپڑے بھی کافی ساتھ لایا تھا اور لحاف کے اندر سردی کا گزر مشکل سے ہوتا تھا۔ سب لوگ مجھے رشک کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے اور اگر میں چاہتا تھا تو اپنی ایک رضائی کی مرزئی کے عوض ان کے سارے قیمتی کمل لے سکتا تھا۔

سب سے زیادہ عجیب وغریب تغیر جو میں محسوس کر رہا تھا، وہ یہ تھا کہ جذبات محبت وہمدردی میں کمی پیدا ہوتی جارہی تھی اور وہ میری چھوٹی بچی بھی جسے میں دیوانگی کی حد تک چاہتا تھا، بہت کم یاد آتی تھی، یہاں تک کہ بعض مرتبہ اس کے موت کے خیال سے بھی میرے قلب کو کوئی جنبش نہ ہوئی۔ پھر یہ تغیر میرے ہی اندر نہ ہوا تھا بلکہ سب اس میں مبتلا معلوم ہوتے تھے۔ عورتوں کا احترام یورپین اقوام کی معاشرت کا نہایت نمایاں پہلو ہے، لیکن اب میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ صورت التفات باقی نہیں رہی ہے، نہ مرد عورت کے لئے اپنی جگہ خالی کرتا ہے۔ اگر وہ جہاز کی جنبش سے کبھی اس کے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں تو مرد اٹھکر اس کو سنبھالتا نہیں اور بے اعتنائی سے دیکھ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ پاس بیٹھنے کی حالت میں بھی باہم کوئی محبت آمیز اختلاط نہیں ہوتا۔ گفتگو کا تو خیر دروازہ ہی بند ہو گیا ہے، کیونکہ زبان تلفظ کے لئے جنبش تو کرتی ہے، لیکن ہوا نہ ہونے کی وجہ سے کوئی لفظ نہیں بنتا اور نہ کانوں تک پہونچتا ہے، اور ادائے مطلب اور اخذ مفہوم کی صورت صرف یہ ہے کہ جب لب بغیر کوئی صدا پیدا کئے ہوئے جنبش میں آتے ہیں تو سننے والا ایک غیر محسوس ذریعہ سے اس کا مفہوم اپنے دماغ میں بالکل اسی طرح مرتسم پاتا ہے جیسے سنکر کوئی بات سمجھی جاتی ہے اور مطلقاً اس کا احساس نہیں ہوتا کہ آواز پیدا ہوئی یا نہیں ہوئی۔ کامل ایک ہفتہ سے ہم چاندنی میں سفر کر رہے ہیں اور آفتاب نظر نہیں آیا، کیونکہ ہمارا جہاز چاند کی ایسی سمت میں آگیا تھا کہ اس کا وہی حصہ جو آفتاب کے مقابل رہتا تھا نظر آتا تھا اور اس کا دوسرا رخ ہمارے سامنے نہ تھا۔ یقیناً سفر کا یہ حصہ نہایت دلچسپ تھا کیونکہ ایک ہفتہ کی طویل رات اور وہ بھی روشن ومنور عجیب وغریب بات معلوم ہوتی تھی، سونے، کھانے وغیرہ کے اوقات صرف گھنٹوں کے حساب سے مقرر کئے جاتے تھے اور باوجود اس کے کہ نیند بہت آسودگی کے ساتھ آتی تھی، بیداری کی حالت میں بھی غنودگی سی طاری رہتی تھی۔ اور محض رات ہونے کا علم اعصاب ودماغ میں ایک قسم کا تعطل پیدا کئے رہتا تھا۔

بس ایک ہفتہ کی رات میں دو عجیب وغریب واقعے پیش آئے۔ ایک مرتبہ ہم لوگ غافل سو رہے تھے کہ دفعتہً نہایت سخت گرمی محسوس ہونے لگی اور سب پسینے پسینے ہوگئے۔ آنکھ کھلی تو دیکھا کہ جہاز کے چاروں طرف سیکڑوں

غبارے جو یکسر شعلۂ جوالہ نظر آتے تھے اڑ رہے ہیں اور یکے بعد دیگرے اس قدر تیزی سے گزر رہے ہیں کہ ان کا شمار مشکل ہے۔
کپتان گھبرایا ہوا آیا اور بولا کہ ہمارا جہاز اتفاق سے چاند کے نجیمات (چھوٹے چھوٹے ستاروں) کے ہجوم میں پہونچ گیا ہے جو ابھی تک گیسی حالت میں مشتعل ہیں اس کے چہرہ سے تشویش کے آثار پید اتھے۔ لیکن اس نے انجن کی مخالف سمت کی قوت کو دور کر کے جہاز کو پوری رفتار کے ساتھ چاند کی طرف چلانا شروع کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چاند کی کشش پورا کام کرنے لگی اور ہم توپ کے گولہ کی طرح حد درجہ سرعت کے ساتھ ان ستاروں کے ہجوم سے نکل گئے لیکن اس کے بعد بھی ایک گھنٹہ تک گرمی کا اثر باقی رہا اور بمشکل سے نیند آئی۔
دوسرا تجربہ اس سے زیادہ عجیب و غریب تھا اور یقیناً بہت زیادہ خطرناک۔ کھانا کھا کے ہم لوگ بیٹھے ہوئے مختلف مشاغل تفریح میں مصروف تھے کہ دفعتہً ہزاروں ہوائیاں سر ہونے لگیں جن کا رنگ سبزی مائل سفید تھا اور فضا میں بیشمار آڑے ترچھے خطوط بنا کر انھوں نے نور کا جال بنا دیا معلوم ہوا کہ یہ سب چاند کے شہاب ثاقب (Shooting Stars) تھے۔ نظارہ اس قدر دلفریب تھا کہ ان کے خطرہ کا خیال بھی محو ہو گیا اور ہر شخص کھڑکیوں کے شیشے سے اس منظر کو دیکھ رہا تھا کہ دفعتہً جہاز میں سخت جنبش پیدا ہوئی اور تین چٹانیں جن میں سے ہر ایک کرۂ ارض کے وزن کے لحاظ سے ہزار من سے کم نہ ہوگی، جہاز کے عرشہ پر آکر گریں اور کئی شیشے کھڑکیوں کے چور چور ہو گئے ان چٹانوں کا پتھر سیاہ رنگ کا تھا لیکن اس میں سپید نقطے اس قدر کثرت سے تھے جیسے گنی فول (مرغی) کے پر میں نظر آتے ہیں۔ اُن کے بہت سے ٹکڑے کر کے بطور یادگار کے مسافروں کو تقسیم کر دئے گئے اور کچھ اس لئے محفوظ رکھے گئے کہ کرۂ ارض کی کسی عجائب خانہ کو دیدئے جائیں گے۔
یہ دونوں واقعے نہایت عجیب و دلکش تھے لیکن میرے لئے تو سب سے زیادہ پر لطف وقت وہ تھا جب پورے ۷۸ گھنٹوں کے بعد آفتاب کی صورت نظر آئی یہ معلوم ہوتا تھا کہ قوت بصارت آج از سر نو پیدا ہوئی ہے سورج کے حجم میں کوئی فرق نہ تھا لیکن اس کی حرارت کم محسوس ہوتی تھی اور وہ ایسا ہی عزیز معلوم ہوتا تھا جیسے کرۂ ارض پر دسمبر جنوری میں محبوب ہو جاتا ہے۔
سب لوگ کمبل اتار اتار کر عرشہ پر آگئے اور بے اختیارانہ طور پر ایک دوسرے سے بغلگیر ہونے لگے۔ میں یہ کہنا بھول گیا کہ اس عرصہ میں ایک نوجوان خاتون سے جن کا نام مس جوزف تھا میرے مراسم زیادہ ہو گئے تھے۔ یہ اپنے ماموں کے ساتھ آئی تھیں اور اُن کا خیال تھا کہ جب سیاحت قمر سے واپس جائیں گے تو کوئی بہت بڑا انسان شوہر کی حیثیت سے انھیں مل جائیگا، چونکہ مس جوزف اپنے جسم کے لحاظ سے بہت نازک ہیں اور موسم کی سختی کی تکلیف وہ کم برداشت کر سکتی ہیں اس لئے جب ایک ہفتہ کی طویل اور نہایت سرورات کے بعد آفتاب نظر آیا تو وہ سب سے زیادہ مسرور اور کھیل کود کی طرف مائل تھیں، اسی سلسلۂ نشاط میں انھوں نے میرے ہاتھ سے میرا وزنی بید لیکر باہر پھینک دیا یہ دیکھنے کے لئے کہ نیچے کی طرف کس رفتار سے جاتا ہے، لیکن اُن کو اور میری

حیرت کی حد نہ رہی جب اِس بید کو بجائے نیچے گرنے کے جہاز کے ساتھ ہی ساتھ بلکہ کچھ زیادہ تیزی سے اڑتے ہوے دیکھا اور تھوڑی دیر میں وہ جہاز سے آگے نکل گیا۔ چاند کی کشش نے اُس کو ہم سے پہلے اپنے پاس بلا لیا تھا۔ یہ منظر اس قدر پر لطف تھا کہ مس جوزف نے اس کے بعد اپنی کئی چیزیں جو زیادہ ضروری نہ تھیں، باہر پھینکدیں اور اس تماشہ کا لطف اُٹھایا۔ جس وقت انھوں نے اپنی ٹوپی باہر پھینکی اور وہ ایک طائر کی طرح ساتھ ساتھ اڑنے لگی تو کپتان نے فوراً لمبے بانس میں بندھا ہوا ایک جال آگے کر کے ٹوپی تو پھر اندر کھینچ لیا۔ مس جوزف نے اس کو پھر فوراً باہر پھینکدیا اور کپتان نے پھر اُسی طرح اس کو لے لیا۔ دیر تک یہ مشغلہ جاری رہا اور غالباً جاری رہتا، اگر فوراً ہی آفتاب غروب ہو کر رات کا سماں نہ پیدا کرتا۔ دن نہایت مختصر صرف ۳ گھنٹے کا تھا اور اس خیال نے کہ اب خدا جانے کتنے گھنٹوں کی رات شروع ہو رہی ہے سب کو افسردہ خاطر کر دیا۔ بجلی کی روشنی ہوگئی کھڑکیوں کے پردے کھینچ لئے گئے، کمبل وغیرہ جسم پر ڈالے گئے اور بڑھتی ہوئی سردی کا مقابلہ کرنے کے لئے پھر ہر شخص طیار ہو گیا اس مرتبہ کوئی خاص بات ظاہر نہیں ہوئی اور کامل ایک ہفتہ اسی عالم میں گزر گیا ہم سب سو کر اُٹھے تھے کہ دفعتہً روشنی سی معلوم ہوئی اور ہر شخص یہ دیکھکر خوشی سے اچھل پڑا کہ نیچے کی طرف بالکل وہی آثار نظر آرہے ہیں۔ جو کرۂ زمین سے جدا ہونے کے بعد بلندی سے وہاں نظر آتے تھے۔ ہم میں سے بعض کو تو یہ خیال ہوا کہ شاید پھر اپنی مادر گیتی کے آغوش میں پہونچنے والے ہیں، کیونکہ اونچے اونچے پہاڑ بڑے بڑے دریا وسیع میدانوں اور دیواروں کا نظارہ بالکل وہیں کا سا تھا، لیکن جب کپتان سے معلوم ہوا کہ یہ تمام آثار کرۂ قمر کی آبادی کے ہیں تو ہم لوگوں کی مسرت کی انتہا نہ رہی۔

اب ہمکو معلوم ہو رہا تھا کہ گویا ہم نیچے کی طرف جا رہے ہیں ورنہ اس سے قبل تو بلندی و پستی کا کوئی مفہوم ہی باقی نہ رہا تھا۔ الغرض دو گھنٹے کے اندر ہمارا جہاز کرۂ قمر کے اس وسیع میدان میں آہستہ آہستہ اترا جسے وہاں کی زبان میں سوشان یعنی تختہ گل کہتے ہیں۔

باقی ——— باقی

نیاز

فلسفۂ مذہب

مذہب اور قومیت

(بسلسلۂ گزشتہ)

یہ خیالات مسلمانوں کو عجیب معلوم ہوں گے لیکن اصل واقعہ یہ ہے کہ بقول علامہ ابن خلدون عرب جب اپنے ملک سے نکلے تو ان کو ایک جماعت کعب احبار و عبد اللہ ابن سلام کے قوم کی ملی اور انھوں نے اسلام کو اس دانشمندی کے ساتھ یہودیت کا مماثل بنا دیا کہ بے اختیار جی چاہتا ہے کہ ان تعلیم یہود یا باطل فقہ و حدیث کے تار و پود کو یہاں کھول کر رکھ دیا جائے مگر اس کا یہ موقعہ نہیں۔ شائقین میری دوسری کتاب "تنزیل القرآن" کا انتظار کریں۔ البتہ "مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات" ایک سطحی نظر اسلام فقہ و حدیث و اسلام قرآن پر ڈالونگا۔ اور پھر ہر صاحب فکر و فہم سے پوچھونگا کہ وہ وقت کب آئیگا جب ہم فی الواقع یہ کہنے کے قابل ہوں گے۔ "وحسبنا کتاب اللہ" ایک زمانے میں مجھے بھی عمل حدیث و فقہ پر غلو تھا۔ مجھے لباس و دقت کی نامناسبت سے اکثر اور خصوصاً مغرب اور ظہر کی نمازیں قضا کر دینی پڑتی تھیں اور اس وجہ سے دل پر ایک قسم کا غبار ہو جاتا تھا کیونکہ مجھے خدا کی عبادت سے کبھی گریز نہ تھا۔ مگر جس دن سے میں نے قرآن کو اپنی ہدایت کے لئے کافی سمجھا اور نماز قرآن کو اپنا معمول بنا لیا میرے لئے نماز میں ایسی سہولت پیدا ہو گئی کہ میں خدا کی تسبیح و تقدیس اس سے بہتر زیادہ کرتا ہوں جتنا میں نے پہلے کبھی کیا تھا نہ مجھے طہر و مغرب کے خلاف معاشرت و تمدن و عادت (جو اوقات میری طرح اکثر صحاب کے لینچ و آرام ڈنر و ہوا خوری کلب کے ہوتے ہیں ،) اوقات نماز قرآن میں نظر آئے اور نہ مجھے اُن کے لئے افسوس کرنا پڑا اور جب میں چاہتا ہوں تو خدا کی قدرت سے متاثر ہو کر بے اختیار سجدے میں گر کر یا مودبانہ کھڑے ہو کر یا ہاتھ باندھ کر اس کی تسبیح و تقدیس پر نماز کو ختم کر دیتا ہوں اور کبھی علی الصباح صوفہ پر بیٹھکر با وضو کلام الہٰی کی تلاوت و معنی پر غور کرتا ہوں۔ اور اس کے ختم پر دعائیں مانگ لیتا ہوں اور کبھی جب مسلمانوں کی جماعت سے کام پڑتا ہے اور دل میں شوق و ولولہ جماعت کی طرح عبادت کا ہوتا ہے تو نماز کو فقہی ارکان و تعدیل سے کر لیتا ہوں، چونکہ مجھے عربی بھی انگریزی و فارسی کی طرح سمجھ میں آتی ہے کبھی جی چاہتا ہے۔ قرآنی دعائیں عربی میں پڑھ لیتا ہوں اور کبھی اپنی زبان اور اپنے خاص دل کی دعا۔

"میں نے اب سمجھا کہ واقعی اسلام و ترقی کا دشمن و مخالف تھا اس کی کیا حقیقت تھی وہ دراصل اسلام فقہ ہے نہ اسلام قرآن اور مجھے علی الرؤس دلاشہاد اس بات کا اقرار ہے کہ میں غالباً ہندوستان میں پہلا شخص ہوں جو عملاً اور اعتقاداً اپنے اور دنیا کی ہدایت کے لئے قرآن کو کافی سمجھتا ہوں"

"ولا تطرد الذین یدعون ربھم بالغدوۃ والعشی یریدون وجھہ ما علیک من حسابھم من شیٔ وما من حسابک علیھم من شیٔ فتطردھم فتکون من الظالمین"

اب قرآن وحدیث و فقہ کے مذہبی احکام کو بالمقابل رکھ کر دکھلاؤنگا کہ کون ہمارے لئے قابل عمل ہے اور کون نہیں - اور کیوں نہیں ہے

اعتقادات واحکامات فقہ و حدیث	احکام قرآن	ان احکامات کا ماخذ	اس کے اختیار کرنے میں عقل و مذہب کہاں تک مخالف ہے
۱- اللہ تعالیٰ ساتویں آسمان پر ہے صبح کے وقت پہلے آسمان پر اتر کر پکارتا ہے کہ کون بندہ ہے جو مجھ سے دعائیں مانگتا ہے - اور اس قسم کی دوسری خرافات	کوئی ذکر نہیں	یہود	آسمان خلا واتھر ہے - ۱۰ را یتھر کے پرت سات یا آٹھ طبقات سماوات قرآن میں ہیں اور آسمان ہر طرف محیط ہے، ضد الامکاں ہے
۲- پل صراط و میزان	کوئی ذکر نہیں	مجوس	چونکہ قرآن میں ذکر نہیں لغو خیال ہے
۳- حضرت عیسیٰ چوتھے آسمان پر زندہ ہیں. قیامت کے دن نازل ہوں گے اور دجال پیدا ہو گا دجال سے لڑیں گے	کوئی ذکر نہیں	نصاریٰ	چونکہ قرآن میں ذکر نہیں لغو خیال ہے
امام مہدی کا ظہور سادات بنی ہاشم کا شرف	کوئی ذکر نہیں	موضوعات بنی عباس علویین	چونکہ قرآن میں ذکر نہیں لغو خیال ہے
۵ حوض کوثر و آفتاب کا بروز حشر سوا نیزے سر پر ہونا	کوئی ذکر نہیں	توہمات عرب و واعظین	چونکہ قرآن میں کوئی ذکر نہیں لغو خیال ہے
	کوئی ذکر نہیں		ماننے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ بے سروپا
۶- معراج آسمانی	کوئی ذکر نہیں	خوش اعتقادی	ماننے میں کوئی حرج نہیں بشرطیکہ بے سروپا وقابل مضحکہ باتیں نہ مانی جائیں
۷- چار فرشتے بنام جبریل میکائیل اسرافیل عزرائیل وغیرہ اور ان کے کام	کوئی ذکر نہیں	یہود	ایضاً
۸ منکر نکیر کا سوال جواب و عذاب قبر	کوئی ذکر نہیں	یہود	ایضاً
۹- اللہ نے آدم سے پہلے نور محمدی پیدا کیا وغیرہ	کوئی ذکر نہیں	خوش اعتقادی	ایضاً
۱۰- بعض اتہامات متعلق معاشرت جہاد وسیاست بر آنحضرت وصحاب	کوئی ذکر نہیں	منافقین ومخالفین اسلام	

فاصلها لما قلنا من اهل التواره الذين يسكنون البادية ولا تحقيق عند [illegible] الا انهم بعد [illegible] اقدارهم لما كانوا عليه من المقامات في الدين والملة فتلقيت بالقبول من يومئذ - (مقدمہ ابن خلدون - طبع بیروت صفحہ ۴۰۲ [illegible])

اعتقادات و احکامات حدیث	قرآن	ماخذ	ریمارک
نماز پنجگانہ بہ تعدیل و بہ زبان عربی	تین وقت کی نماز بلا تعین ارکان و تعدیل	مجوس	خدا کی عبادت جس طرح اور جس قدر ہو سکے کرے وقت کی پابندی قرآن سے بھی ثابت ہے باقی پابندیاں چاہے کرے یا نہ کرے
وضو میں پیر کا دھونا اور اس پر سخت وعید	بلا تعین ارکان و تعدیل مسح پیر کا	عادات عرب	بعض اوقات اور بعض قومیں پیر کو نہیں دھو سکتیں ورنہ ان کو زکام ہو جاتا ہے قرآن سے ثابت نہیں۔ آدمی ننگے پھرتا ہو اور پیر میلا ہو تو حدیث پر عمل کرے
عشر و زکوۃ میں نصاب	کوئی ذکر نہیں	یہود	مجبوری نہیں جتنی ہو سکے ادا کرے
قربانی تمام دنیا کے مسلمانوں پر عید الاضحیٰ کے زمانے میں	حج میں مگر وہ بھی فرض نہیں	یہود و عادات جاہلیت عرب	سارا مسئلہ قربانی کا بت پرستی کا شاخسانہ ہے مسلمانوں کو بچنا چاہئے۔
عقیقہ	کوئی ذکر نہیں	عادات جاہلیت عرب	کوئی حرج نہیں
ختنہ	کوئی ذکر نہیں	عادات جاہلیت عرب	کوئی حرج نہیں
عیدین	کوئی ذکر نہیں	یہود	کرے یا نہ کرے کوئی حرج نہیں
ڈاڑھی منڈانا مونچھیں چھوٹی رکھنا	کوئی ذکر نہیں	یہود	کرے یا نہ کرے کوئی حرج نہیں
احکام لباس و طعام (مثلاً ریشم و چاندی	کوئی ذکر نہیں	یہود	کوئی پابندی نہیں
سونے کا استعمال یا ماکولات کے حرام و	″	″	″
حلال کی فہرست تصویر رکھنا یا کتے پالنا	″	″	″
فنون لطیفہ، موسیقی، تصویر نگاری وغیرہ) کی ممانعت	″	رہبانیت و بربریت	کوئی پابندی نہیں
رجم زانی و مرتد و ساحرہ	کوئی ذکر نہیں	یہود	قطعاً احکام قرآنی سے انحراف و مخالفت تمدن و تہذیب و اتہام بر اسلام
دار الحرب سے ہجرت کرنا وہاں سود کی اجازت دار الاسلام کا خاتمہ (یہ مسئلہ فقہ کا ہے۔ حدیث میں بھی اس کا ذکر نہیں)	کوئی ذکر نہیں	سیاست	قطعاً لغو ہے اس واسطے کہ اسلام یہود کی طرح کی قوم نہیں ہے

اعتقادات و احکامات حدیث	قرآن	ماخذ	ریمارک
مروجہ پردہ (حدیث سے بھی ثابت نہیں محض علماء کے اجتہاد و مظنونات)	کوئی ذکر نہیں	حماقت	لغو ہے قرآن کے احکام سے زیادہ تعمیل [illegible] حماقت ہے۔
متعہ و طلاق کی غیر پابندی و جواز ہر وقت و ہر حالت میں (جہاں تک میں نے حدیث پر غور کیا یہ دونوں مسائل حدیث سے جائز و ثابت معلوم ہوتے ہیں)	کوئی ذکر نہیں	نفسانیت و شہوت پرستی	قابل ترک ہے۔ خلاف معاشرت و تمدن
اتہامات بر اسلام (نعوذ باللہ)			
اسلام آخری زمانے میں جس طرح سانپ	کوئی ذکر نہیں	منافقین و زنادیق کی روایات	ترک کرنا چاہیئے
بل میں سمٹ کر سکڑ رہتا ہے مدینہ میں	"	"	"
سمٹ جائیگا۔	"	"	"
غلبۂ نصاریٰ سے فتح قسطنطنیہ بدست نصاریٰ	"	"	"
اسلام میں ۷۳ فرقے ہیں سب ناری	"	"	"
ایک ناجی۔	"	"	"
مرجیہ و قدریہ اہل جہنم ہیں خوارج	"	"	"
کے متعلق حدیثیں و مثل ہذا	"	"	"

مذہب اور الٰہیات | ہم نے کہا ہے کہ مذہب کی اصل خدا شناسی ہے لیکن بودھ، ورجین، مذہب یہ دعوی کرسکتے ہیں کہ یہ کلیہ بالکل غلط ہے کیونکہ ان دونوں مذاہب میں خدا کا کوئی ذکر نہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ مذہب کی بنیاد عالم مابعد الموت اور سزا و جزا کے اعتقاد پر ہے تو یہود کا مذہب یہ دعوی کر سکتا ہے کہ توریت اس کے ذکر سے خالی ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ مذہب کے لئے ضروری چیز حشر و نشر ہے تو مذہب یہود کا یہ دعوی ہے کہ [illegible] ان کا کوئی حشر نہیں وہ متعدد [illegible] دنیا پر رکھا جاتا ہے اگر اخلاق و عبادات پر مذہب کو موقوف نہیں تو صابی [illegible] دونوں پر [illegible] سے کے [illegible] اور اگر ہم مذہب کو ان کام اعتقاد پر محدود کریں تو اسلامی شریعت اس کو ناقص مذہب بتاتی ہے جب تک کہ معاشرت و معیشت و سیاسیات و معاملات کی فضا میں بھی داخل نہ ہوں یہ بھی واضح رہے کہ ہم صرف انہیں مذاہب سے بحث کر رہے ہیں جن کے بانی کتاب و علم ہے ورنہ وحشیوں کے حرکات و سکنات و خیالات بھی ہمارے ایک علیحدہ مذہب کی تعریف میں [illegible] جن کو ہم نے اپنی بحث میں چھوڑ دیا ہے۔

ایسی صورت میں لازم ہو کہ سب سے پہلے مذہب کی ایک جامع تعریف کیجائے یا مذہب کے لئے چند اصول متعارف بتائے جائیں اور اسپر مذاہب موجودہ کا معیار قائم کیا جائے۔ اور یہ اصول متعارفہ "مذہب فطرت" کے نام سے موسوم ہوں۔ مذہب فطرت کے اصول بتانے کے بعد ان اصول کو مختلف ابواب میں زیر بحث لاکر ان کی حقیقت پر غور کیا جائے۔ مذہب فطرت سے ہماری مراد یہ ہے کہ ہم خود اپنی فطرت سے مجبور ہوکر ان اصول کو قبول کریں گو کہ مذہب جیسا ہم پہلے دکھلا آئے ہیں فی الواقع فطری نہیں ہے اور مذہب کے اختیاری ہونے پر سب سے پہلا سوال یہ پڑتا ہے کہ کیا انسان کے لئے لامذہب ہونا ممکن ہے۔ یا دوسرے معنوں میں کیا انسان خود بخود بغیر کسی قسم کا مذہبی اعتقاد رکھتے ہوئے ایسی زندگی بسر کرسکتا ہے جو امن و سلامتی کی ضمانت خود اس کے اور نیز بنی نوع انسان کے لئے کرسکے۔

فرض کرو کہ مذہب محض وہم و لاشے ہے۔ خدا کا کوئی وجود نہیں۔ اشیائے عالم اور انسان کا وجود ایک ناقابل تشریح و فہم ذرات کی حرکت و امتزاج سے ظہور پذیر ہوا۔ اور حرکت مخالف یا انتشار سے ایک وقت معینہ کے بعد فنا ہوجاتا ہے۔ نہ جزا ہو نہ معاد۔ اور خود خدا کا وجود بھی کسی منطقی و فلسفی دلیل سے ثابت نہیں ہوتا کہ سبب اول یا محرک اول کو ماننے کے باوجود انسان کا ذہن فوراً ایک لاانتہائی سلسلہ کو شروع کردیتا ہے اور یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ پھر خدا کا سبب کون ہوا (جیسا ہماری بعض مستند حدیثوں میں ابوہریرہ کی طرف سے اس قسم کے سوال پر آنحضرت کا یہ جواب نقل ہو کہ اس وقت تم فقط یہ کہدو کہ میں ایک اللہ پر ایمان لایا) اب تم اپنی دماغی کیفیت پر غور کرو۔ دن بھر —— جاگنے کی حالت میں تم کائنات کے مختلف حوادث و اشیاء کا مشاہدہ کرتے ہو اور ان مشاہدات کے نقوش تمہارے لوح دماغ پر بنتے رہتے ہیں رات میں جب تم سو جاتے ہو تو دماغ کے اندر نقوش مشاہدات عارضی طور سے رک جاتے ہیں مگر جب تم صبح کو بیدار ہوتے ہو تو اپنے دماغ کو پچھلے مشاہدات سے خالی نہیں پاتے ہو اگر بالفرض دماغ کا شبانہ تعطل ان نقوش کو جو گزشتہ مشاہدات سے دماغ پر بنے ہیں مٹا دیتے اور دوسری صبح کو تم بالکل کسی گزشتہ واقعہ کو یاد نہ رکھو تو رات کی نیند عملاً موت کے مرادف ہوگی اور دوسرے روز تم نیا خیال لیکر اٹھوگے لیکن اگر مشاہدات کے پچھلے نقوش قائم رہتے ہیں تو جب دماغ گزشتہ مشاہدات کے نقوش سے خالی نہ ہوا تو لازم ہوا کہ اس نقوش دماغی کے ہونے پر سے تم اپنی ہستی کو گم نہ کرسکو نہ صرف یہ بلکہ تمہاری ہستی دماغ کے تصورات سے گزشتہ سے لیکر آیندہ تک قائم ہوجاتی ہے اور فطرت کا تقاضہ ہو کہ جب تمہاری ہستی دماغ کی ان نقوش سے قائم ہوگئی تو تم یہ خیال کرلو کہ کچھ دنوں کے بعد وہ فنا ہوجائے گی۔ نہیں بلکہ اس کو لازوال ماننے کے لئے تمہارا دل مجبور کریگا۔ اگر برخلاف اس کے تمہارے دماغ کے نقوش ہر صبح مٹ کر نیا تختۂ دماغ ہوجاتا تو درحقیقت مذہب کے اس دوسرے بڑے جز یعنی عالم مابعد الموت کا سوال بھی پیدا نہ ہوتا مگر تم مجبور ہو کہ تم اپنی ہستی کو ایک دن گم کرکے "کنت ترابا" ہوجاؤ۔ تمہاری فطری خواہش یہ ہوگی کہ تم اپنی زندگی کا تسلسل اپنی موت کے بعد بھی قائم رکھتے۔

اب دیکھو کہ انسانی زندگی موت تک مکمل زندگی کہی جاسکتی ہے یا نہیں۔ فرض کرو کہ ایک شخص ہے جسکو بلاسبب و قصور ایک جابر و قاہر انسان آگ میں زندہ جلانے کا حکم دیتا ہے تو کیا اس مظلوم کی حالت اور ظالم کی حالت میں جو تفاوت ہے وہ دونوں کی مکمل زندگی ہے۔ یقیناً نہیں ہو۔ اور اگر ہے تو مظلوم کو سوائے اس مذہبی امید کے کون چیز تسکین دے سکتی ہے کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جبکہ وہ

دونوں ایسی حالت میں ہوں گے کہ ایک پر اپنے اعمال کی سزا مستور ہوگی، اور دوسرے کو اپنے شدائد (؟) وعذاب کی جزا ملیگی یہی تفاوت زندگی ہم کو مجبوراً حشر ونشر کے ساتھ سزا وجزا کے خیالات کو ایسی راسخ کرتے ہیں اور سزا وجزا کی وہی صورت فطرت کی متقاضی ہوگی جبکہ ظالم ومظلوم دونوں بالمقابل بھی ہوں اور اپنے بُرائے اعمال سے باخبر بھی ہوں۔ ورنہ اگر دونوں نے اپنی پہلی ہستی کو نسیاً منسیا کردیا تو سزا وجزا کا خیال لغو ہوجاتا ہے۔ ہنود کے اداگون کے فلسفے میں جہاں تفاوت زندگی کی تشریح ایک حد تک قابل قبول ہے وہاں صرف یہی مسئلہ کہ انسان کا بقول ان کے دوسرا جنم پچھلے زندگی کے اعمال کا نتیجہ ہے پچھلی ہستی کے گم ہوجانے پر آکر خبط ہوجاتا ہے۔

اس کے بعد یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجائیگی کہ ان باتوں کا سررشتہ ایسی ذات واحد کے ہاتھ میں ہوگا جس کو ہم بجا طور سے اپنا معبود کہہ سکتے ہیں۔ تو مذہب فطرت کے اصول یہ ہوئے الہیات۔ حشر ونشر اور سزا یہی خیالات اخلاق وعادات وسیاسیات کے محرک ہیں جو مذہب کے باقی تہیں عملی اصول ہیں ہم نے اس کو مذہب فطرت کہا ہے۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ یہ اصول اسلام کے ہیں لہذا ہم اصول اسلام کو مد نظر رکھتے ہوئے انھیں اصول مذاہب کی تشریح کریں گے جن کا ماننا ہماری فطرت میں داخل ہے۔ گزشتہ عنوان میں ہم نے قومیت مذہب پر بحث کرتے ہوئے اور دونوں کے تعلقات دکھلاتے ہوئے مذہب کو امور دنیاوی اور سلطنت وشریعت سے علحدہ رکھنے کی کوشش کی تھی اور چونکہ ہمارا مدعا مذہب کی بحث میں اسلام کا معیار مقرر کرنا تھا۔ ہم اس غلط اصول کی تردید میں کہ مذہب اور قومیت لازم وملزوم ہیں اسلام کے ایک غلط اصول سے اُلجھ پڑے تھے ورنہ فلسفہ مذہب میں ہم کسی خاص مذہب پر معاندانہ یا مناظرانہ تنقید کرنا نہیں چاہتے۔ اب ہم مختلف عنوانوں میں اصول مذہب فطرت یعنی الہیات بنوت۔ تکوین معاد۔ تقدیر اخلاق عبادات پر بحث کریں گے اور آخر میں دنیا کے مذہبی افکار جدید وقدیم پر ایک مورخانہ تبصرہ کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ اصول مذہب فطرت یا دوسرے معنوں میں اصول اسلام کس طرح قوموں میں خود بخود جاگزین ہورہے ہیں اور کون سے اسباب موانع وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہے اور اب کس طرح سے رفتہ رفتہ مذہب کی دو بڑی تقسیمیں دنیا میں ہورہی ہیں ایک اوہامی دوسرا الہامی۔

لہذا الہیات مذہب فطرت کا اصل الاصول ہے جب تک انسان کا اعتقاد اپنے سے بالاتر ہستی پر نہ ہوگا دیگر اصولی کڑیاں نہ صرف ناتمام رہینگی بلکہ کوئی اصول اپنی جگہ پر قائم ہی نہیں رہ سکتا اور نہ بغیر الہیات کے مذہب کا سوال پیدا ہوسکتا ہے مگر الہیات ایسی چیز ہے کہ جس پر تاریخ ومشاہدات سے نتائج اخذ کرنے کے سوا اور کوئی فلسفیانہ منطقیانہ دلیل قائم نہیں ہوسکتی الہیات جس کا مرادف انگریزی زبان میں (Theism) "تھیزم" ہے اس کی تعریف الہیات فطری سے زیادہ نہیں لیکن خود الہیات فطرت کی ایک تاریخ ہے۔ اسٹوئکس (Stoics) فلاسفی نے ارسطو کی کتاب مابعد الطبیعات کے ایک جملے سے جو اس کے گیارہویں باب کے آٹھویں مادے میں پایا جاتا ہے۔ الہیات کی تین تقسیمیں کی ہیں الہیات اوہامی۔ الہیات فطری اور الہیات سیاسی ومعاشرتی الہیات اوہامی تو وہ خیالات اوہامی ہیں جنھوں نے دنیا میں ہزارہا قسم کے دیوتاؤں کا وجود پیدا کیا ہے

اور جس کی ایک مختصر تاریخ ہم پہلے عنوان بحث میں بیان کر چکے ہیں، الہیات سیاسی و معاشرتی وہ الہیات ہے جو الہیات فطری کو مان کر خدا پرستی کی صورت پیدا کرے - اس کو ہم انشاء اللہ اگلے عنوان موت میں بیان کریں گے صرف الہیات فطری باقی رہتی ہے اور اسی پر اس باب میں بحث ہے -

چونکہ اقوام عالم میں ایک الہیات اوہامی بھی پائی جاتی ہے - اس کے خلاف دوسری الہیات کو الہیات فطری کہنا ذرا غلطی سی معلوم ہوتی ہے کیونکہ الہیات فطری کی در اصل تعریف وہی ہے جسے انسان کی اولین فطرت قبول کر چکی ہو - اور ہم دکھلا آئے ہیں کہ انسان کی فطرت ہی نے الہیات اوہامی کو پیدا کیا تھا - لیکن فلاسفہ کا الہیات فطری کو الہیات اوہامی سے جدا سمجھنا ظاہر کرتا ہے کہ الہیات فطری کے معنی وہی لئے جائیں گے جس طرف فطرت یا عقل سلیم یا عقل فلاسفہ ہدایت کرے - ہم اسکو الہیات الہامی کہنا زیادہ موزوں سمجھتے ہیں مگر الہام ایک ما بہ النزاع لفظ ہے - اگرچہ ایک وقت میں ہماری طرح یورپ کا بھی اسپر اعتقاد تھا مگر جب سے علم کی روشنی میں بائبل کے بعض ہفوات کے پرزے اڑ گئے علمائے یورپ الہام سے منکر ہو گئے ہیں کاش یورپ کے سامنے قرآن ہوتا تو غالباً وہ الہام کو اصول مذہب کے لئے ہماری طرح ضروری جانتے - کیونکہ ظاہر ہے کہ عقل سلیم یا عقل فلاسفہ کا کوئی معیار نہیں - ممکن ہے کہ عقل فلاسفہ جس چیز کی طرف ہماری ہدایت کرے وہ اوہام سے زیادہ وقعت نہ رکھتے ہوں -

غرض کہ الہیات فطری ایک عام تعریف اس خدا شناسی کی ہے جو بقول فلاسفہ عقل کی امداد سے حاصل ہوجاتی ہے اب ہمکو یہ دیکھنا ہے کہ عقل فلاسفہ نے خدا شناسی تک سمجھنے میں کہاں تک کامیابی حاصل کی - یہ ضرور ہے کہ لاک (Locke) اور والف (Wolff) نے الہیات فطری کی وہی تعریف کی ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں مگر اس کے برخلاف بعض فلاسفہ مثل شلیرماشر (Scheler macher) اور رسل (Russell) نے بہ پیروی عقلائے سوکانیان (Socinians) الہیات فطری کے قائل نہیں ہیں اور اسی بنا پر کاتھلک عیسائیوں نے تمام ان خیالات کو جو خدا شناسی کے بارے میں فلاسفہ میں پائے جاتے ہیں بائبل اور الہامی خدا سے ایک جداگانہ اور معاندانہ خیال تصور کیا ہے فلاسفہ کے خیالات ان کے نزدیک ما بعد الطبیعیات کے مظنونات ہیں اور چونکہ الہیات مذہب کا اعلیٰ اصول ہے، اور بعض ارباب علم نے الہیات فطری کو ہی مذہب فطرت کا مرادف مانا ہے - اس لئے جب مذہب کے فطری اصول مسیحیت کے درجہ اوہام و تثلیث کی چیستاں کے ہمنوا نہ ہوئے تو پادریوں نے مذہب فطرت کو لا مذہبیت سے مطعون کرنا شروع کر دیا ورنہ فی الواقع یورپ کے کسی فلاسفر نے لا مذہبیت کو اپنا مسلک جان کر الہیات پر کلام نہیں کیا - الا شاذ و نادر چند ایسے مجانین و مخبوط الحواس لوگوں کے جن کے دلائل خود انکی بے عقلی پر دال ہیں یا وہ ریاکاری سے لا مذہبیت کو ایک قسم کا فیشن ایبل خیال جان کر دنیا پر ظاہر کرتے ہیں اور ان کا دل کبھی ان کے خود قول پر گواہی نہیں دیتا - پادریوں نے جو یورپ کے فلاسفر اور تھیسٹ (Theist) کو نیچری اور ملحد کے نام سے موسوم کیا ہے وہ محض ایک افترا ہے کیونکہ الہیات فطری کا درحقیقت ان خیالات سے کوئی تعلق نہیں جو قوانین فطرت کے نام سے عام طور پر مشہور ہیں چونکہ خود ہمارے ملک میں [illegible] مرحوم قوانین فطرت پر کلام کرنے کے سبب سے عوام میں نیچری کے نام سے مشہور ہوگئے

تھے اسلئے یہاں یہ بتادینا چاہئے کہ غالباً خود سرسید قوانین فطرت کے معنی سے انتہائی ناواقف تھے جتنا ان کو نیچری کہنے والے لوگ - کیونکہ اگر اُنھوں نے معجزات کا مافوق العادۃ ہونے کی وجہ سے قوانین فطرت کی بنا پر انکار کیا ہی تو وہ ان کے زیادہ تر ان خیالات سے لاعلمی کا سبب تھا جو قوانین فطرت کا دراصل منشا رہے - جیسا کہ اہل یورپ سمجھتے ہیں - اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ قوانین فطرت (جو لفظ درحقیقت سائنس کے انکشافات سے کوئی تعلق نہیں رکھتا بلکہ علمائے حقوق و قانون کا اپنا ایک مسکوکہ و فرضی جملہ ہی) کا ماننا وہی معنی رکھتا ہے کہ فطرت سے جدا کسی خدائے مشخص کا وجود نہیں - یعنی ازبسکہ خود فطرت خالق و مخلوق ہے تو جس طرح ایک مشین کے کل پرزے خود بخود چل نکلے ہیں اور ان کا چلانے والا موجود نہیں اس لئے ممکن نہیں کہ وہ مشین خلاف عادت کام کرسکے ممکن ہے کہ بعض علمائے یورپ خدائے مشخص کے قائل نہ ہونے کے سبب سے ملحد کہلائے گئے ہوں مگر سرسید کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ عام مسلمانوں کے خلاف ایک شخص قادر مطلق خدائے واحد کے قائل نہ تھے - کیونکہ فلاسفہ یورپ کے نزدیک جو شخص خدا کے وجود کو فطرت سے علحدہ ایک ہستی تسلیم کرتا ہے اس کے لئے قوانین قدرت یا فطرت ایک بے معنی الفاظ ہیں - ہم خود سرسید کے دلائل معجزات کے خلاف قوانین فطرت کی بنا پر سمجھنے سے عاجز تھے - فطرت کی حرکت کے پیچھے اگر کوئی دماغ کام نہیں کر رہا ہے تو حرکات کا خلاف واقعہ ہو جانا ضرور مشکل ہی - مگر جب سرسید اس کے پیچھے ایک دماغ یا عقل اول کو تسلیم کرتے ہیں تو پھر قوانین فطرت کوئی معنی نہیں رکھتے سرسید کو اگر عربی و انگریزی میں ویسی ہی استعداد یا مہارت ہوتی جیسی ان کو اپنی مادری زبان یا فارسی میں تھی تو وہ کم سے کم ہیوم (Hume) اور ہربرٹ اسپنسر (Herbert Spencer) کے مقالات کا خود مطالعہ کرکے بہت کچھ اپنی غلط رائے سے رجوع کر لیتے - کم سے کم وہ اپنے عجیب و غریب خیالات کو یہ نہ سمجھتے کہ یورپ کے فلاسفہ اُن کی تائید میں ہیں - اُنھوں نے قرآن میں کبھی دیکھ لیا کہ "ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا" آیا ہے اور بس فوراً اس کی تاویل کرکے اس کو قوانین قدرت کے معنے میں سمجھ لیا - ورنہ یورپ نے قوانین کا اب تک کوئی کلیہ قائم نہیں کیا - اور نہ انکا یہ قول ہی کہ خدا مشاہدات کے خلاف کوئی فعل نہیں کر سکتا - کیونکہ انسان کے خود ذاتی تجربات عالم اور خصوصاً اس زمانے میں جب کہ بہت سی معجز نما باتیں انسان سے ظہور میں آچکی ہیں اس کے خلاف شہادت دے رہی ہیں - ابھی حال کی اخباری دنیا کی خبر ہے کہ ایک لڑکی سترہ اٹھارہ برس کے بعد مرد ہو گئی بعض اوقات انسان کے بطن سے پیدائش کے وقت میں خلاف معمول باتیں ظاہر ہوتی ہیں جو ہمارے مفروضہ قوانین فطرت کو توڑ ڈالتی ہیں - آگ کا کام فطرتاً جلا دینا ہے ہم نے خود اپنی آنکھوں سے عراق و شام میں بعض رفاعی درویشوں کو دیکھا ہی کہ ان پر آگ کا مطلق اثر نہیں ہوتا - وہ بڑے بڑے شعلے اور انگارے اپنے منہ میں بھر لیتے ہیں - بعض نابینا اشخاص ایسے دیکھے گئے ہیں جو اپنے ہاتھ سے آنکھ کا کام لیتے ہیں تو یہ کہنا کہ حضرت مسیح کی پیدائش یا حضرت ابراہیم کا آگ سے بے ضرر رہنا خلاف قوانین قدرت ہی بالکل لغو ہے خدا کے لئے مافوق العادہ چیزیں ظاہر کرنا اس کی قدرت کی وسعت کے آگے اتنا ہی آسان ہی جتنا ایک قطرے سے انسان کو بنا دینا - پس معجزات کا ماننا یا نہ ماننا محض روایت پر مبنی ہے ، جس ذریعے سے ہم کو وہ اطلاع ملی ہے پھر بعض روایات ——— تو اس قدر لغو اور پوچ ہوتے ہیں (جیسے ہمارے امام بغوی کی تفسیر کے من گڑھت قصے) کہ انپر اس کی تحقیق کی ضرورت نہیں ہوتی کہ انکا مخرج

کیا ہے مگر بعض خبریں تواتر مشاہدات سے یا اس کتاب سے جس کو ہم الہامی تسلیم کرتے ہیں اور ایسا تسلیم کرنے کی مضبوط دلیل ہمارے پاس ہے۔ اس کے تردید کی سوائے اس کے اور کوئی دلیل ہمارے پاس نہیں کہ یا تو ہم اس کو سرے سے مستند نہ مانیں یا اس کی لغو و لا طائل تاویل کریں۔ قرآن کے لئے آخری صورت کا حق سوائے عرب کے کسی کو نہیں ہو سکتا اور راز یہ کہ مفسرین قرآن زیادہ تر عجمی ہیں۔ اُن کی یا سر سید کی تاویلات کوئی وقعت اہل زبان کے آگے نہیں رکھتی اور سب سے بڑے لطف کی بات یہ ہے کہ سر سید علیہ الرحمۃ کو جو رٹ قوانین ربانی کی تھی اُس کو یورپ کے فلاسفہ اتنی نفرت سے دیکھتے ہی نہیں۔ ان کے نزدیک قوانین ربانی احکام عشرہ توریت ہیں اگر وہ بائبل کے مافوق العادہ باتوں کو ناقابل قبول سمجھتے ہیں تو صرف اس لئے کہ اُنھوں نے بائبل کے بعض بے سروپا باتوں کی مورخانہ حیثیت سے تنقید کی ہے اور وہ بائبل کے متعلق اس نتیجہ پر پہونچے ہیں جو قرآن نے ۱۳ سو برس پہلے ظاہر کر دیا تھا۔

برخلاف اس کے قوانین فطرت کا ماننے والا لازماً وہی شخص ہوگا جو خدائے الہام کا منکر ہو کر خود فطرت کو خدا جانتا ہے۔ لیکن جب ایک خدا شناس قوانین فطرت سے بحث کریگا تو یا تو وہ خدا کی صفات و قدرت سے انکار کر کے اس کو معطل سمجھے گا یا اس کی مراد ان اصول مذاہب سے ہوگی جن کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں۔ کالون (Calvin) اور زونگلی (Zwingli) مجددین مذہب پروٹسٹنٹ نے درحقیقت قوانین فطرت اسی کو سمجھا ہے جو خدا نے توریت میں الہام کئے ہیں یعنی قوانین فطرت وہ ہیں جنھوں نے سب سے پہلے انسان کو نیک و بد کی تمیز سکھائی۔ قدیم رومیوں میں قوانین ربانی کے مرادف الفاظ جس نیچرلی (Jus Naturalis) یا جُس جنٹم (Jus Gentium) یعنی قوانین فطری یا قوانین جبلی ہیں، روسو (Rousseau) نے فطری حقوق کا مدعا جس کے توسط سے انقلاب فرانس گونج رہا تھا سوائے اس کے کچھ نہیں جانا کہ انسان فطرتاً آزاد ہے اور سلطنت و شریعت ایک غیر فطری پابندی ہے۔ اور لاک (Locke) نے قانون بین الاقوامی پر جو کلام کیا ہے اسمیں رومیوں کے جس جنٹیم یا قانون جبلی کا غلط مطلب لیکر قانون فطرت کا مطالبہ کیا ہے وہ قوانین معاشرت ہیں: قوانین فطرت الٰہیہ جیسا سر سید یا ان کے بعض متبعین سمجھتے ہیں۔

باقی ۔۔۔۔۔ آئی

سید مقبول احمد

من درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال

یہ افسانہ میں نے انگریزی کے مشہور ناول نویس ٹامس ہارڈی کے ایک ناول " ووڈلینڈرز" کو پڑھنے کے بعد لکھا ہے - بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ افسانہ کی ترکیب و بندش اسی کتاب کو پڑھکر سوجھی لیکن اس کو ترجمہ کسی طرح نہیں کہا جا سکتا اور نہ ترجمہ ممکن تھا جبکہ افسانہ کو ہندوستانی معاشرت کے مطابق بنانا میرے خیال میں سب سے زیادہ ضروری امر تھا لہذا آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ افسانہ " ووڈلینڈرز" کا چربہ یا نقش ثانی ہے - اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اصل سے کسی لحاظ سے "بہتر" ہے ٹامس ہارڈی ایک بالکل انوکھا افسانہ نویس ہے - وہ جو کچھ کہتا ہے اور جس پیرایہ میں کہتا ہے اسمیں ایک خاص جادو ہوتا ہے - یہ بات مجھ جیسے آشفتہ بیان و آشفتہ نگار کو کبھی نہیں نصیب ہو سکتی -

مجنوں

(۱)

میر قربان علی ضلع بستی کے باوقار اور متمول تعلقہ دار تھے - اُن کی کل جائداد کم و بیش پانچ ہزار کی تھی - گرد و نواح میں بجز ایک نوجوان بیوہ کے جسکا نام عائشہ تھا کوئی دوسرا زمیندار قربان علی کا ہمسر سمجھا جاتا تھا - یہ خاتون جس کی زندگی کے متعلق طرح طرح کی افواہیں مشہور تھیں موضع رسول آباد میں ایک نہایت عالیشان اور پرشکوہ عمارت میں رہتی تھی جو "نصیر کوٹ" کہلاتی تھی - رسول آباد کنک پور سے تقریباً ۴ میل کے فاصلہ پر تھا - کنک پور وہ گاؤں تھا جس میں خود میر قربان علی سکونت پذیر تھے اور جو رسول آباد سے دکھن اور پورب کی سمت تھا قربان علی کو اپنی دولت و ثروت کا صرف احساس نہ تھا بلکہ ایک حد تک زور تھا - لیکن اگر وہ خود کسی کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے تو وہ "بیگم" تھی (قرب و جوار میں عائشہ اسی لقب سے مشہور تھی) سنتے ہیں کہ قربان علی کی ساری جائداد سے جو آمدنی تھی وہ "بیگم" کے صرف دو تین باغوں سے وصول ہو جاتی تھی -

قربان علی نے خود پرانی روشنی میں تعلیم و تربیت پائی تھی - عربی و فارسی میں اُن کو پوری دستگاہ حاصل تھی مگر وہ زمانہ کے تیور دیکھ رہے تھے - ہندوستان کی معاشرت میں بتدریج جو انقلاب ہو گئے تھے وہ اُن کی آنکھوں کے سامنے تھے - اب وہ زمانہ تھا کہ جو انگریزی تعلیم سے بے بہرہ رہگیا اس کی نہ کہیں آؤ بھگت ہوتی اور نہ اس کو زندگی میں کامیاب ہونے کے لئے کافی موقع ملتا - جس صیغہ میں دیکھئے انگریزی دانوں کی مانگ تھی پرانے مکتب کے تعلیم پائے ہوئے بیچارے کہیں پوچھے بھی نہیں جاتے تھے خواہ وہ کیسے ہی فاضل اور متبحر کیوں نہ ہوں "کریما" اور "مامقیماں" کی جگہ "لیتھبرج ریڈر" نے لے لی تھی "گلستاں" "بوستاں" اور "انوار سہیلی" کی جگہ "حکایات ایسپ" اسمائل کی "سلف ہلپ" اور

راہن سن کروسو" کی دھوم تھی۔ ارسطو ارسٹاٹل افلاطون پلیٹو اور جالینوس گیلن ہو کر رہ گئے تھے۔ مختصر یہ کہ زمین آسمان نہیں تو مشرق مغرب ضرور ہو رہا تھا۔

میر قربان علی میں خدا کی دی ہوئی بہت سی خوبیاں تھیں۔ غریبوں اور مفلسوں کی مدد کرنے۔ اپنے سے کم درجہ کے آدمیوں سے برابری کا برتاؤ کرنے۔ اسامیوں کو اپنی طرح انسان سمجھنے میں ان کا بڑا نام تھا۔ پوشیدہ طور پر ان کی خیرات ضرب المثل تھی۔ آج تک اُن کو کسی نے غصہ سے مغلوب ہوتے نہیں دیکھا۔ وہ بڑے خدا ترس تھے۔ کسی کو دکھ یا مصیبت میں مبتلا دیکھتے تو کانپ جاتے۔ مگر ان سب محاسنِ اخلاق کے باوجود وہ پکے ابن الوقت تھے زمانہ کی متابعت کو وہ خدا کی متابعت سے کسی طرح کم فرض نہ سمجھتے تھے۔ یہی دنیا سازی اور مصلحت اندیشی تھی جو اُن کی تمام خوبیوں پر حاوی تھی۔ چنانچہ انگریزی تعلیم کو وہ نجات کا تنہا ذریعہ سمجھتے تھے۔ وہ اپنے کو "جاہل" کہا کرتے تھے صرف اس لئے کہ جب وہ بستی جاتے تو اُن کو کلکٹر صاحب کی باتیں اور کلکٹر صاحب کو اُن کی باتیں سمجھنے میں سخت دقت ہوتی تھی۔ وہ اُس آنے والے وقت کا خواب بھی نہ دیکھ سکتے تھے جبکہ یہی نظام تعلیم جسکو وہ فلاح و بہبود کے لئے اسقدر ضروری خیال کرتے تھے پورا عروج حاصل کرچکا ہوگا اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک وکیل کو دوسرے وکیل کی محرری بھی نہیں ملے گی اور بی اے ایم اے کالج سے فضیلت کی سند لیکر نکلنے کے بعد "شوفری" اور ٹکٹ کلکٹری کے لئے درخواستیں لئے پھریں گے اور حالی کا یہ شعر اُن کے حسب حال ہوگا۔

نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کما کر   وہ کھوئے گئے اور تعلیم پا کر

میر قربان علی خود اپنے میں جو کمی پا رہے تھے اس کو تو کسی طرح پوری نہ کرسکتے تھے۔ البتہ انھوں نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ اگر خدا نے اُن کو لڑکا دیا تو وہ جی کھول کر اس کو اپنے وقت کے معیار کے مطابق تعلیم دلائیں گے اور اگر ضرورت محسوس ہوگی تو انگلستان بھی بھیجینگے اُن کو بیٹے کا بڑا ارمان تھا۔ لیکن کسی نے سچ کہا ہے کہ آرزوؤں سے تقدیریں نہیں پھرا کرتیں قدرت کو ہماری آپ کی تمناؤں سے کوئی ہمدردی نہیں ہے اُس کی طبیعت میں جو آئے گا وہی آپ کو دے گی۔ اور عموماً جو کچھ وہ دیتی ہے وہ آپکی خواہش کے خلاف ہی ہوتا ہے۔ شادی کے بعد سات آٹھ برس تک تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ قربان علی کی نسل بس انھیں پر ختم ہوجائے گی۔ مدتوں کی دعا تعویذ کے بعد گھر آباد بھی ہوا تو بیٹی سے۔ پہلے تو قربان علی کا سارا حوصلہ پست ہوگیا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن کو کوئی زبردست دھکا لگ گیا۔ لیکن وہ اُن لوگوں میں سے تھے جو فطرتاً گھریلو زندگی کے لئے بنائے جاتے ہیں اور جن کو اپنے آل و عیال کے ساتھ محبت کیا گرویدگی ہوتی ہے۔ تھوڑے دنوں میں اُن کو بیٹی سے شدید محبت ہوگئی اور وہ اسی کو بیٹا تصور کرنے لگے۔ اگر اُن کا بس چلتا تو اپنا سارا ارمان اسی پر نکالتے۔ مگر دنیا نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی تھی اور قربان علی میں اتنی جرأت نہ تھی کہ دنیا کو کہنے سننے کی پروا نہ کرے اور بیٹی کو اسکول اور کالج کی فضا میں تربیت دلاتے۔

قربان علی اپنی خوبصورت بیٹی کو جس کا نام ذکیہ رکھا گیا تھا بدورا کہکر پکارا کرتے تھے اِن میں جہاں اور خوبیاں تھیں وہاں شاعرانہ صلاحیت اور جذبہ حسن پرستی کی بھی کمی نہ تھی۔ وہ "الف لیلہ" بڑے شوق کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ اسی کا یہ اثر تھا کہ ذکیہ کا نام بدورا پڑگیا اور دوسرے بھی اس کو اسی نام سے پکارنے لگے۔ جس کی ذکیہ واقعی مستحق بھی تھی۔ یہاں قربان علی کی شادی کے واقعات کو جان لینا ضروری ہے جو اُن کی سیرت پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ اُن کی بیوی رضیہ اُن کی پھوپھی کی لڑکی تھی جس کے ساتھ اُن کو بچپن سے عشق تھا۔ لیکن تنہا یہی رضیہ کے

عاشق نہ تھے۔ اِن کے چچازاد بھائی میر عنایت علی بھی اُس کو دل و جان سے چاہتے تھے۔ خود رضیہ کا میلان قربان علی کی طرف تھا لیکن رضیہ کی ماں عنایت علی کے ساتھ اپنی بیٹی کو بیاہنا چاہتی تھی۔ اس لئے کہ عنایت علی کے ساتھ اس کو زیادہ لگاؤ تھا۔ قربان علی رضیہ کی محبت میں اندھے ہو رہے تھے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ اُن کا اور کوئی زور نہیں چل سکتا تو ایک دن چپکے سے رضیہ کو لیکر بھاگ گئے اور جا کر کہیں کسی قاضی سے نکاح پڑھوا لیا۔ عنایت علی بیچارے سیدھی سادی طبیعت کے آدمی تھے۔ اُن کو جو صدمہ ہوا ہوگا اُس کا صحیح علم اُن کے دل کو ہوگا مگر اپنے منھ سے اس کا اظہار اُنھوں نے کبھی نہیں کیا اور نہ کبھی انھوں نے قربان علی سے کشیدگی اور بیگانگی کا برتاؤ کیا گویا انھوں نے یہ سوچ کر صبر کر لیا کہ آسمان تابع و معشوق بفرمان نہ شود۔ رضیہ کی ماں کو البتہ اس واقعہ سے ایسا رنج پہونچا کہ وہ کچھ عرصہ بعد اسی کوفت میں گھل کر تمام ہو گئیں۔

اس کے بعد قربان علی کا ضمیر ہمیشہ چٹکیاں لیتا رہا اور اُن کے سکون و اطمینان میں کافی رخنے پیدا کرتا رہا۔ کیونکہ میر عنایت علی کی یہ پہلی حق تلفی نہیں ہوئی تھی۔

قربان علی کے والد عرفان علی۔ عنایت علی کے والد احسان علی کا ایک طرح گلا ہی گھونٹ چکے تھے۔ میر ہدایت علی اپنی ساری جائداد اپنے دونوں بیٹوں یعنی عرفان علی اور احسان علی اور ایک بیٹی کے درمیان تقسیم کر کے مرے تھے۔ دونوں بھائیوں کی مالی حیثیت برابر تھی لیکن دونوں کی طبیعتوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ عرفان علی نہایت چالاک، دوراندیش شاطر اور کنجوسی کی حد تک کفایت شعار تھے۔ اُن کی قارونیت ہر جگہ مشہور تھی۔ اُن کو روپئے حاصل کرنے جمع کرنے کا خبط تھا اور وہ ہر وقت ننانوے کے پھیر میں پڑے رہا کرتے تھے۔ احسان علی اِن کی ضد مقابل تھے۔ اِن کی حاتمی کا شہرہ دور دور دیہاتوں میں تھا۔ اُن کی فیاضی اور سخاوت اصراف کی حد تک بڑھی ہوئی تھی۔ غریب پروری اور مہمان نوازی میں نہ جانے اُن کی کتنی دولت لٹ گئی۔ شائد ہی کوئی دن ایسا گزرتا ہو کہ اُن کے ہاں دو چار پردیسی یا دو چار دوست نہ پڑے رہتے ہوں۔ جتنے نادار اقربا تھے وہ سب انھیں کے طفیلی تھے۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ اُن کو اِن خوش پوش والوں کے ساتھ شغف تھا جو شاہ پیر یا مرشد کہے جاتے ہیں۔ سال میں دو تین بار اِن کا کل والی بلاؤں کا احسان علی کے وہاں دورہ ضرور ہو جاتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ زمینداری سے جو کچھ آمدنی تھی اُس پر اُن کی بسر اوقات نہ ہو سکتی تھی اور اُن کو برابر احسان علی سے قرض لینا پڑتا تھا۔ عرفان علی بھی پوری دریا دلی کے ساتھ پرونوٹ لکھا لکھا قرض دیتے چلے جاتے تھے۔ آخر کار جب احسان علی مر گئے تو تین چوتھائی سے زیادہ حصہ جائداد کا بعوض قرض عرفان علی کے قبضہ میں آگیا۔ عرفان علی اسی نیت سے قرض دیتے چلے گئے تھے وہ خوب جانتے تھے کہ قرض چکانا احسان علی کے احتیار سے باہر ہے۔ بہر حال عنایت علی کو جو ترکہ ملا وہ بمشکل تمام تیس پینتیس روپئے ماہوار آمدنی کا تھا۔ باپ کی شاہانہ زندگی دیکھنے کے بعد اس پر گزر کرنا انھیں کا کام تھا۔ رضیہ کی جدائی کا غم غلط کرنے کے لیئے انھوں نے شادی کی تھی جس سے ایک لڑکا بھی تھا جس کا نام احمد تھا۔ عنایت علی اسی تیس پینتیس روپئے ماہوار میں احمد کو انگریزی تعلیم بھی دلا رہے تھے۔ خیال تھا کہ ممکن ہے احمد ہونہار ثابت ہو اور مل کر جو کچھ تلف ہو چکا ہے اس کو از سر نو حاصل کرے۔ لیکن احمد نے جس سال مڈل پاس کیا اُسی سال باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اور غریب کو سلسلۂ تعلیم منقطع کر دینا پڑا

احمد اگر چاہتا تو اُسکو کوئی نہ کوئی سرکاری ملازمت ملجاتی۔ لیکن اُس نے اِس کو اپنے حق میں بہتر نہ سمجھا۔ ماں پہلے ہی مر چکی تھی باپ کی موت کے بعد اُسنے سوچا کہ اگر استقلال کے ساتھ بیٹھکر جو کچھ زمینداری غیروں کے دستبرد سے بچی ہے اُس کی دیکھ بھال نہ کی گئی تو وہ بھی مٹی میں ملجائے گی۔ اس کے علاوہ دیہات کی زندگی کچھ اس کی اپنی طبیعت کے موافق بھی تھی۔ وہ فطرتاً عزلت پسند تھا۔ اطراف و جوانب میں وہ سادھو سمجھا جاتا تھا۔ اس کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ وہ ہمیشہ موٹے سے موٹے کپڑے پہنتا تھا۔ ہاں اگر اس کو کسی چیز کا شوق تھا تو کتب بینی کا وہ فطرتاً شاعر تھا اگرچہ شعر کہنے کی زحمت شاید اس نے کبھی نہیں گوارا کی تھی۔ انگریزی شروع کرنے کے قبل اردو فارسی اور عربی میں وہ خاصی مہارت حاصل کر چکا تھا اور شعر و سخن کا رچا ہوا مذاق رکھتا تھا۔ اردو فارسی شعرا کے منتخب اشعار اس کو زبانی یاد تھے۔ وہ ان کو بہت عین دولت تصور کرتا تھا۔ اُس نے گھر بیٹھ کر غلہ کی تجارت شروع کر دی جس میں اُس کو روز افزوں منافع ہو رہا تھا۔ اتفاقات زمانہ نے اُس کی کچھ ایسی یاوری کی کہ دو تین سال کے اندر اُس کی ماہوار آمدنی تیس پینتیس[۳۵] روپئے ماہوار سے ڈیڑھ سو ہوگئی۔ قربان علی۔ رقیہ کے ساتھ شادی کر لینے کے بعد اپنے کو بہت بڑا مجرم سمجھنے لگے تھے۔ عنایت علی کے ضبط و تحمل نے اُن پر گہرا اثر کیا تھا۔ وہ اب نہ صرف اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتے تھے بلکہ اُن کے باپ نے احسان علی کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس کی بھی تلافی کرنا چاہتے تھے۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ کفارہ ادا کرنا تو ایک طرف گناہوں کا ارتکاب بھی انسان کے اپنے اختیار کی بات نہیں ہے۔ بہر حال وہ خلوص دل سے تلافی مافات کا ارادہ کر چکے تھے اور اس کی بہترین صورت وہ یہ سوچے ہوئے تھے کہ اپنی بدورا کے ساتھ احمد کی شادی کر دیں گے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ بچپن سے احمد اور بدورا میں بے انتہا محبت ہے اور جہاں تک موقع مل سکتا ہے دونوں لازم اور ملزوم کی طرح ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ اس طرح اُن کو پوری امید تھی کہ عنایت علی اور اُن کے باپ کے ساتھ جو ظلم ہوئے ہیں اُن سب کا کفارہ ہو جائیگا۔ اس لئے کہ قربان علی کے کوئی دوسری اولاد ہونے کی امید نہ تھی۔ ایسی حالت میں ظاہر تھا کہ بدورا کی وساطت سے اُن کی ساری جائداد احمد کو ملجائیگی۔

رضیہ بدورا کو چار برس کا چھوڑ کر مر گئی تھی اور وصیت کر گئی تھی کہ حتی المقدور بدورا احمد ہی کے ساتھ بیاہی جائے۔ اس سے قربان علی کا ارادہ اور بھی پختہ ہوگیا تھا۔ بدورا اُن کو اپنی جان سے زیادہ پیاری تھی۔ اُن کو رضیہ کی موت سے بڑا دکھ پہونچا تھا۔ انھوں نے عہد کر لیا تھا کہ اب کبھی شادی نہ کریں گے۔ لیکن واقعات کو کسی کا عہد توڑتے ہوئے دیر ہی کیا لگتی ہے۔ بدورا اپنی دائی سلمہ سے بے انتہا مانوس تھی۔ سلمہ قریب کے ایک گاؤں کی بیوہ تھی اور ذات کی پٹھان تھی۔ قربان علی نے اس کو بدورا کی خدمت کے لئے نوکر رکھ لیا تھا۔ بیوی کے مرنے کے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ سلمہ کا اُن کے گھر میں مستقلاً رہنا معیوب سمجھا جا رہا ہے۔ اِدھر بدورا دائی کی کچھ ایسی خوگر ہو چکی تھی کہ اگر اس سے جدا کی جاتی تو شاید اُس کی جان پر آبنتی۔ بادل ناخواستہ قربان علی کو بیوی کی یاد میں خون کے آنسو رو کر سلمہ کو اپنے نکاح میں لے لینا پڑا۔ اس وقت اُن کی عمر پینتالیس برس کے قریب تھی۔ اور اب اُن کی دلبستگی کا سامان لے دے کر بدورا رہگئی تھی جو اُن کی ساری توجہ کی مرکز بنی ہوئی تھی اُن کو اس کا رنج تھا کہ وہ اس کو بیٹے کی طرح تعلیم و تربیت نہیں دے سکتے تھے۔ لیکن پھر بھی وہ اس پر تل گئے تھے کہ ایک لڑکی کو جہاں تک آزادی کے ساتھ پڑھایا لکھایا جا سکتا ہے۔ وہاں تک بیٹی کو پڑھا لکھا دیں گے۔ اس خیال سے انھوں نے ایک مولوی مقرر کیا۔ جس سے بدورا دس سال کی عمر تک عربی فارسی پڑھتی رہی۔ اس کے بعد خود قربان علی نے اس کو دو سال پڑھایا۔ جس میں بدورا کو

ہندی میں بھی مہارت پیدا ہو گئی۔

اسی درمیان میں قربان علی کی بہن جو لکھنؤ بیاہی ہوئی تھیں بھائی کو دیکھنے آئیں۔ بدورا کو دیکھکر اُن کا جی باغ باغ ہو گیا۔ اُن کے کوئی اولاد نہ تھی۔ انھوں۔ نے قربان علی سے اصرار کیا کہ بدورا کو اُن کے ساتھ کر دیں۔ وہ لکھنؤ میں اُن کے ساتھ رہ کر اچھی صحبتوں میں بہت کچھ سیکھ لے گی۔ قربان علی کو بیٹی کی جدائی گوارا نہ تھی۔ لیکن کچھ تو اس خیال سے کہ اودھ کی فضا میں بدورا کی تربیت اُن کی امیدوں سے کہیں زیادہ بہتر ہو گی اور کچھ اس لئے کہ بہن اُن کے سر ہو گئی تھیں اُنھوں نے بدورا کو لکھنؤ بھیجدیا۔ بدورا لکھنؤ پھوپھی کے ساتھ رہنے لگی جس سے اُس کے مذاق میں روز بروز لطافت و پاکیزگی پیدا ہو رہی تھی۔ وہ سال میں ایک بار مہینہ دو مہینہ کے لئے آکر باپ کا جی بہلا جایا کرتی تھی اس کا سلیقہ اور اُس کی مہذب گفتگو دیکھکر باپ کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اب قربان علی کبھی کبھی) یہ سوچنے لگتے تھے کہ بدورا کی زندگی کو احمد کے سپرد کرنا کہاں تک مناسب ہو گا۔ اس لئے کہ اگرچہ احمد کی مالی حالت سدھر چکی تھی لیکن پھر بھی وہ اپنی طرز معاشرت کے لحاظ صرف ایک "دہقان" کہے جانیکا مستحق تھا۔ اور اُن کی بدورا اس قابل تھی کہ کسی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مدنی الطبع کی رفیق بنے یہ خیال قربان علی کو اب اکثر ستاتا رہتا۔ لیکن جب کبھی وہ اس پر غور کرتے تو اُن کو اپنا عہد یاد آجاتا۔ اُن کا ضمیر ملامت کرنے لگتا اور اُن کو اپنی ذات سے شرم آنے لگتی مختصر یہ کہ وہ ابھی تک اپنے ارادہ پر قائم تھے اور احمد کو اپنا داماد سمجھتے تھے اور ہر وقت اس کی خیر اندیشی میں رہتے تھے۔ جہاں تک ممکن تھا وہ اسکی مالی امداد بھی کرنے کو تیار رہتے تھے لیکن احمد غیور تھا۔ اُس نے اس کو پسند نہ کیا۔ اب وہ خود بھی خوشحال کہا جا سکتا تھا۔ پھر وہ کسی کا احسان مند کیوں ہوتا۔ قربان علی احمد کی اس غیرت و خودداری کی بڑی قدر کرتے تھے۔

(۲)

احمد موضع امیر نگر میں رہتا تھا جو کنک پور کی مشرقی سرحد واقع تھا۔ اس گاؤں میں تین حصہ دار تھے۔ سب سے زیادہ حصہ قربان علی کا تھا۔ اس سے کم بیگم کا تھا۔ سب سے کم حصہ احمد کا تھا۔ احمد اپنے باپ دادا کے مکان میں رہتا تھا۔ جو وسیع اور خوش منظر تھا مکان کے پورب طرف دور تک کھیتوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ دکھن کی طرف ڈھاک کا مختصر مگر نہایت گھنا جنگل تھا۔ جو بہار کے موسم میں احمد کے مکان کو دولھن بنا دیتا تھا۔ اوتر طرف ایک جھونپڑی تھی جس میں ایک بڈھا کمہار اپنی بیٹی مالتی کے ساتھ رہتا تھا۔ مالتی کی عمر ۱۶ سال کی ہو گی۔ باپ کے پاس اتنا روپیہ نہ تھا کہ اُس کی شادی کرتا۔ خود مالتی باپ سے کہہ چکی تھی کہ میں تمکو اس بڑھاپے میں چھوڑنا نہیں چاہتی اس لئے میری شادی کی فکر نہ کرو۔ لیکن باپ اسی فکر میں گھل رہا تھا۔ احمد کے مکان سے پورب جانب تھوڑے فاصلہ کے بعد سے ایک بڑا باغ شروع ہوتا تھا جس میں زیادہ تر آم اور مہوے کے درخت تھے اور جو کنک پور کی سرزمین میں تھا۔ یہ باغ احمد اور قربان علی کے درمیان تقسیم تھا لیکن اسمیں احمد کا حصہ زیادہ تھا۔ قربان علی صرف ۲ر کے حصہ دار تھے۔ احمد کو اس باغ سے سال میں بہت کچھ ملجاتا تھا۔

احمد اپنے مکان میں اکیلا رہتا تھا۔ نوکروں کو وہ سر شام چھٹی دیدیا کرتا تھا اس کو اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرنے میں زیادہ راحت ملتی تھی۔ کھانا پکانے اور جھاڑو دینے کے علاوہ جس قدر کام ہوتا تھا وہ خود کر لیتا تھا۔ ایک مسلمان عورت تھی جو صبح و شام معمولی کھانا

پکا کر چلی جاتی تھی۔ احمد اس کو نعمت سمجھکر کھا لیتا تھا۔ مالتی دونوں وقت آکر جھاڑو دے جایا کرتی تھی۔ مالتی کو احمد کے ساتھ قلبی لگاؤ تھا احمد کی نہ صرف معصومیت بلکہ صورت شکل بھی اس کے دل میں گھر کر چکی تھی۔ اور لوگ اگر احمد کو سادھو کہتے تھے تو مالتی اس کو دیوتا کہتی تھی۔ احمد کو مالتی کی محبت کا ایک حد تک علم بھی تھا لیکن وہ اس محبت کی صرف قدر کر سکتا تھا اور کسی طرح اس کا بدلہ نہ دے سکتا تھا۔ کیونکہ بچپن سے وہ بدورا کو چاہتا تھا اور اس چاہ نے اس کو ایسا اپنا بنا لیا تھا کہ کسی دوسرے کے خیال کے لئے بھی اب اس کے دل میں گنجائش نہ تھی۔ اس کے علاوہ وہ مالتی کی محبت کو شدید جذبۂ احترام سمجھ رہا تھا۔

احمد سوداوی المزاج تھا۔ وہ دنیا کو واقعی دار المحن سمجھتا تھا جہاں ہنس کھیل کر زندگی گزار دینا ایک ایسا گناہ ہے جو کبھی معاف نہیں ہو سکتا۔ وہ گرد و پیش مفلوک الحال کسانوں کی زندگی کو دیکھتا تھا اور پھر زمینداروں کو دیکھتا تھا تو یہ تفریق اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ اس کو یقین تھا کہ ان فاقہ مستوں میں بہتیرے ایسے ہیں جو روحانی اور اخلاقی حیثیت سے ان لوگوں پر راج کر سکتے ہیں جو آج ان کے آقا بنے بیٹھے ہیں۔ پھر آخر یہ کس جرم کی سزا ہے کہ ان کسانوں اور مزدوروں کو ایسی محنت اور جانفشانی کے بعد بھی سکھ نصیب نہیں ہوتا۔ اس کا کسی طرح یہ ماننے کو جی نہیں چاہتا تھا کہ یہ کسی رحیم و کریم یا منصف مزاج خدا کا کام ہے۔ زندگی کی تعریف اس کے ذہن میں یہ تھی کہ ہر چیز غلط جگہ ہو۔ اس لئے وہ اس نتیجہ پر پہونچا تھا کہ اگر کوئی فوق الادراک قوت ہے جو کائنات کی پیدا کرنے والی کہی جا سکتی ہے۔ تو وہ شیطانی قوت ہوگی۔ زندگی اس کے لئے عذاب نہ تھی تو سر تا سر کاتب ازل کی ایک بے معنی اور دل آزار ستم ظریفی ضرور تھی۔ اس سوداویت کے باوجود احمد اپنی زندگی میں کامیاب ہو رہا تھا اور زیادہ کامیاب ہونے کے لئے مسلسل کوشش کر رہا تھا۔ اس کی دو وجہیں تھیں۔ ایک تو اس کا مذہب یہ تھا کہ زندگی میں اس "شیطانی قوت" کے ساتھ جنگ آزمائی کرنا انسان کا سب سے پہلا فرض ہے۔ دوسرے وہ خوب جانتا تھا کہ بدورا کو اپنی رفیقۂ حیات بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ دنیا کے نقطۂ نظر سے بھی کامیاب ہو۔ اس معاملہ میں محض "[illegible]" ہونا کافی نہ تھا۔ دنیا میں اس کا صرف ایک مدعا تھا اور وہ بدورا کو اپنا بنا لینا تھا۔ احمد سب کچھ چھوڑ سکتا تھا۔ لیکن بدورا سے بے نیاز نہیں ہو سکتا تھا۔ جب سے بدورا لکھنؤ گئی اس وقت سے وہ اس کے "خواب کی پری" بنی ہوئی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے کھیتوں میں کام کرتے اور جستہ جستہ کتب بینی کرتے ہوئے بدورا کی شبیہ احمد کے پیش نظر رہتی تھی۔ اگر اس کو یہ معلوم نہ ہوتا کہ بدورا کی شادی اسی کے ساتھ ہوگی تو شاید اس کا جینا وبال ہو جاتا۔ چنانچہ جب کبھی اس کی سوداویت معمول سے زیادہ بڑھ جاتی تو اس کو اندیشہ ہونے لگتا کہ کہیں ایسا نہ ہو بدورا اس سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائے۔ اور اس کی حسرتیں خاک میں مل جائیں۔ ایسے اوقات میں احمد کو زندگی ایک ناقابل برداشت بوجھ محسوس ہونے لگتی تھی اور پھر اس کی بے چینی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

چیت کی شام تھی چہار سمت نمو کا عالم تھا ہر طرف نئی کونپلیں نکل رہی تھیں۔ گھاس سے ڈھکی ہوئی زمین ایک دریائے اخضر معلوم ہوتی تھی۔ ڈھاک کے درخت اپنے سرخ جوڑے میں بہت سجے تھے۔ کائنات از سر نو رنگ و بو سے معمور ہو چکی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فطرت انسان کی محرومیوں کی تقریب میں جشن کر رہی ہے اور مصیبت زدوں کو منہ چڑھا رہی ہے۔ احمد اپنے مکان کے پیچھے ڈھاک کے درختوں میں چھپا ہوا قدرت کے ان مناظر پر غور کر رہا تھا اور اس کو رہ رہ کر عمر خیام کی یہ رباعی یاد آ رہی تھی۔

ہر جا کہ گلے و لالہ زارے بودہ است	از سرخیٔ خون شہر یارے بودہ است
ہر شاخ بنفشہ کز زمیں می روید	خالے است کہ بر رخ نگارے بودہ است

آج وہ غیر معمولی طور پر متفکر اور پریشان نظر آرہا تھا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ مالتی کا باپ سات آٹھ ماہ سے بیمار تھا اور آج اُسکی حالت بہت خطرناک تھی۔ باپ کے سوا مالتی کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا جو اُسکا ہاتھ پکڑتا۔ احمد مالتی کی آنیوالی بیکسی کا خیال کر رہا تھا اور دل دکھ رہا تھا مصیبت یہ تھی کہ وہ خود مالتی کی زندگی میں کوئی حصہ نہ لے سکتا تھا۔ یکایک وہ کسی خیال سے چونکا۔ جیسے اُسنے کوئی مسئلہ حل کرلیا ہو اور اُس کو یک گونہ اطمینان ہوگیا ہو۔ احمد قربان علی سے سُن چکا تھا اور اس کا چرچا گاؤں والوں میں بھی تھا کہ ایک نہایت ہوشیار ڈاکٹر آجکل پڑوس میں آیا ہوا ہے جس کا نام ابوالخیر تھا اور جو دنیا کی سیر کرنے اور تجربات حاصل کرنے کے بعد اب یہ چاہتا تھا کہ اسی نواح میں گوشہ نشینی اختیار کرکے جہاں تک اس سے ممکن ہو خلق اللہ کو فیض پہونچائے۔ اس غرض سے اُس نے مادھو پور میں دریا کے کنارے کچھ زمین بھی خریدلی تھی اور وہاں ایک مختصر سا مکان تعمیر کرا رہا تھا جس میں وہ خود رہے گا اور اپنا دواخانہ رکھے گا۔ فی الحال وہ اسی گاؤں میں ایک جھونپڑی ڈالکر زندگی بسر کر رہا تھا۔ قربان علی نے یہ بھی کہا تھا کہ ڈاکٹر نے اس جوار کو خصوصیت کے ساتھ اس لئے منتخب کیا ہے کہ وہ اس سید خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو کسی زمانہ میں اسی گرد و نواح میں آٹھ کوس تک راج کرچکا تھا زمانہ کی گردش نے اب اس خاندان کا نام و نشان بھی مٹا کر رکھدیا تھا۔ قربان علی جس بات سے سب سے زیادہ مرعوب تھے وہ ڈاکٹر کی عالی نسبی تھی۔

احمد کو اس سے بحث نہ تھی کہ ڈاکٹر سیدوں کی نسل سے تھا یا واجد علی شاہ کی۔ اس کو اس وقت ابوالخیر کی بحیثیت ایک ماہر فن کے ضرورت تھی۔ ممکن ہے ڈاکٹر اکر مالتی کے باپ کو بچا سکے۔ یہ سوچ کر وہ اٹھا اور اگرچہ اندھیرا ہو چلا تھا اُسنے اپنا گھوڑا کسا اور مادھو پور کی سمت روانہ ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد مالتی کی تنگ و تاریک جھونپڑی میں احمد کے ساتھ ساتھ ایک بلند قامت متناسب الاعضا اچکن چوڑی مہری کا پائجامہ اور حیدرآبادی شیروانی زیب جسم کئے ہوئے داخل ہوا۔ اُس کی عمر تیس سال سے کسی طرح متجاوز نہ تھی۔ رنگ روپ دلکش اور نظر فریب تھا۔ چہرہ کی تراش میں کسی قدر نسائیت تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی تھیں جو ہر وقت متبسم معلوم ہوتی تھیں۔ آواز مترنم تھی۔ مختصر یہ کہ وہ بحیثیت مجموعی ایک ایسی چیز تھا جس کو دیکھتے رہ جانے کو جی چاہے۔

جس وقت ڈاکٹر جھونپڑی میں داخل ہوا گاؤں کے اکثر مرد و عورت بیمار پرسی کے لئے جمع تھے اور مریض کو گھیرے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے پہونچتے ہی حاکمانہ لہجے میں "بھیڑ نہ لگاؤ!" "کھلی ہوا آنے دو"! "بیمار کا دم گھٹ جائیگا!" کا نعرہ مارا۔ ایسے ڈاکٹر کا نام سُنتے ہی سب نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ آج اُن کو کسی دوسری دنیا کی مخلوق کا سامنا کرنا ہے۔ ڈاکٹر کی زبان سے یہ الفاظ سنتے ہی بہتیرے تو دبے پاؤں جھونپڑی سے باہر ہوگئے۔ جو باقی رہ گئے وہ سہم کر ایک طرف کو سمٹ گئے۔ ڈاکٹر نے کچھ دیر تک گرد و پیش کا جائزہ لیا اور احمد سے کچھ مختصر باتیں کیں۔ اس درمیان میں اس کی نگاہیں کئی بار مالتی پر جم جم کر رہ گئیں جو ایک چپ کے مارے بیٹھی پنکھا جھل رہی تھی۔ مالتی کو ڈاکٹر کی نگاہیں کانٹوں کی طرح چبھ رہی تھیں۔ حرکات و سکنات سے ڈاکٹر آدمی کم بندۂ نفس معلوم

ہو رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ جلد سے جلد یہ شخص اپنا کام کرکے اپنا راستہ لے۔ ڈاکٹر کے آنے سے مالتی کے سوا ہر شخص کو امیدیں بندھ گئی تھیں۔ مالتی کا یہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا کہ جو شخص ایک غریب بیکس لڑکی پر ایسی نگاہیں ڈالے وہ موت و زندگی پر کبھی قابو پاسکتا ہے۔ مریض پر بے انتہا ضعف طاری تھا۔ ڈاکٹر بڑی دیر تک اس کا معائنہ کرتا رہا۔ آخر کار اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور احمد کو مخاطب کرکے کہا "مرض یوں تو بہت پرانا ہے لیکن اگر آپ لوگ ایک مہینہ پہلے بھی اس کا معقول علاج شروع کردیتے تو بہت کچھ امید کی جاسکتی تھی۔ لیکن اب تو مرض نہ صرف جڑ پکڑ گیا ہے بلکہ زندگی پر بُری طرح حاوی ہوچکا ہے۔ میں آپ لوگوں کو دھوکا دینا نہیں چاہتا۔ مریض مشکل سے ایک دن کا مہمان ہے اس کا دل پھول گیا ہے جو نہایت مہلک بیماری ہے" اس فاش گوئی کا مالتی پر جو اثر ہوا ہوگا اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے لیکن اُس نے اپنے دل کی حالت کو دل ہی میں چھپا لیا اور اپنے صبر و استقلال کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ مگر احمد گھبرا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ مالتی دل کی گہری ہے اور ایک اجنبی کے سامنے جو ہوکیں اُس کے اندر اُٹھ رہی ہیں اُن سے مغلوب ہونا نہیں چاہتی۔ احمد نے جیب سے روپئے نکالے اور ڈاکٹر کو فیس دیکر رخصت کرنا چاہا۔ ڈاکٹر نے فیس سے انکار کردیا۔ مالتی اس کی تاب نہ لاسکی۔ اس نے احمد سے زر دیکر کہا "نہیں صاحب۔ فیس ان کو ضرور دیجئے مرنے والے کی روح کو اس سے راحت ملے گی"۔ آج مالتی احمد کے احسان کا بوجھ برداشت کرنے کے لئے تیار تھی۔ ابوالخیر کی خیرات اور مفلس نوازی اس کو گوارا نہ تھی ڈاکٹر نے حیرت زدہ ہوکر فیس لے لی اور چلا گیا۔

صبح ہوتے ہوتے مالتی کا باپ بیٹی کو حوادثِ چرخ کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔

(۳)

یہ تو معلوم ہوچکا ہے کہ ابوالخیر سیدوں کی پشت سے تھا۔ اب سیدوں کے بارے میں بھی کچھ جان لینا ضروری ہے۔ یہ ایک بہت پرانا خاندان تھا جو کم و بیش بلا شرکت غیرے قرب و جوار میں حکومت کرچکا تھا۔ کنک پور۔ امیر نگر۔ ماد معو پور۔ اور رسول آباد کے چاروں طرف جتنی زمین تھی وہ سیدوں کی ملکیت رہ چکی تھی۔ آج وہی جاگیر مختلف زمینداروں میں بٹ گئی تھی جو ہر وقت ایک دوسرے کے گلے پر چھری پھیرنے کے لئے تیار رہتے۔ زندگی کی بوقلمونی مشہور ہے۔ دنیا نام ہے متضاد حادثات کے ایک لامتناہی سلسلہ کا یہاں بہار و خزاں ہم آغوش ہے۔ کمال و زوال۔ عروج و ہبوط باوجود ایک دوسرے کے دشمن ہونے کے لازم و ملزوم ہیں اسی لئے جرمنی کا مشہور شاعر فلسفی ہیگل غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا کہ زندگی اضداد کا نہ صرف مجموعہ ہے بلکہ ہر چیز اپنی ضد ہی کی بنا پر قائم ہے۔ سیدوں کی آدھی سے زیادہ کی جائداد تو غدر کی بدعملیوں میں اُن کے قبضہ سے نکل چکی تھی۔ جو کچھ باقی رہ گئی تھی وہ تین پشت کے لئے "شراب و شاہد" فراہم کرتی رہی۔ ابوالخیر کے بزرگوں کی "شانِ ریاست" "پشتینی عیاشی" کے سے قارون کا خزانہ بھی کفایت نہ کرسکتا تھا۔ آہستہ آہستہ اُن کی ساری جاگیر اُن کے ہاتھ سے نکلتی رہی یہاں تک کہ "خرقہ و سجادہ" رہن رکھنے کی نوبت آگئی۔ ابوالخیر کے دادا نسبتاً دور اندیش تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ اُن کے پاس سوا رسول آباد کے مکان کے کچھ اور نہیں رہا ہے تو انھوں نے اس کو بھی نصیر خاں کے باپ اکبر خاں کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ یہ وہی مکان تھا جو بعد کو از سر نو تعمیر ہوکر

"نصیر کوٹ" کہلانے لگا۔ ابوالخیر کے دادا مع اپنے بیٹے نورالحسن (یعنی ابوالخیر کے باپ) کے یہاں سے ہجرت کر گئے اور جاکر حیدرآباد میں بس گئے جہاں وہ اور پھر اُن کے بعد نورالحسن سرکاری خدمات انجام دیتے رہے۔ ابوالخیر وہیں پیدا ہوا اور شروع شروع وہیں تعلیم پاتا رہا۔ نورالحسن نے اپنی ذات سے بڑی ترقی کی تھی اور اب اُن کی فراغت کے ساتھ بسر ہو رہی تھی۔ خوش نصیبی سے کثیر الاولاد بھی نہ تھے۔ ایک بیٹی اور ایک بیٹے کی پرورش اب اُن کے لئے کوئی مشکل بات نہ تھی۔ بیٹی کو تو انھوں نے حیدرآباد ہی میں ایک امیر گھرانے میں بیاہ دیا۔ ابوالخیر کی بھو دانھوں نے اس میں سمجھی کہ اس کو ڈاکٹری پڑھائیں۔ ابوالخیر نے بھی اپنے کو اس کا اہل ثابت کیا اور ۲۳ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہوکر برسرکار ہوگیا۔ لیکن باپ کے پلٹتے ہوئے دن نہ دیکھ سکا۔ ابوالخیر کو ملازمت کرتے ہوئے سال بھر ہوئے تھے کہ نورالحسن کو پیغام اجل پہونچا اور وہ بیٹے کو آخری دعائیں دیتے ہوئے چل بسے۔

ابوالخیر بچپن سے اپنے خاندان کے عروج و زوال کی داستانیں سنتا چلا آتا تھا۔ اس کا اس کے دماغ پر ایک خاص اثر ہوا کرتا تھا۔ اگر عبرت نام ہے کسی مجہول کیفیت کا تو یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ابوالخیر کو اپنے اسلاف کی سرگزشت سنکر مطلق عبرت نہ ہوتی تھی بلکہ اس کا خون جوش میں آجاتا تھا اور وہ اپنے دل میں کہا کرتا تھا "اگر خدا نے مجھکو استطاعت دی تو رفتہ رفتہ میں اپنے کھوئے ہوئے اقبال کو جہاں تک ممکن ہوگا پھر حاصل کروں گا۔ اور پھر اسی جگہ اپنا سکہ چلاؤں گا جہاں کبھی میرے مورث اعلیٰ چلا چکے ہیں"۔ یہ امنگ محض ایک طفلانہ جوش نہ تھی عمر کے ساتھ اس کی یہ دھن بھی بڑھتی گئی۔ خدا نے اس کو استطاعت بھی دی۔ اُس کو اپنے پیشہ میں امید سے کہیں زیادہ کامیابی ہوئی جس سے اُس کی دولت و ثروت پانی کی طرح بڑھتی رہی۔ اس کو سل اور دق اور معدہ کی بیماریوں کے علاج میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ جراحی میں بھی مشاق تھا۔ ٹھیک ٹھیک تو معلوم نہیں مگر سنا جاتا ہے کہ اُس نے اپنی سات سال کی ملازمت میں پچاس ساٹھ ہزار روپئے بینک میں جمع کر لئے۔ اُس نے دو رئیس زادوں کو مہلک امراض سے بچالیا تھا۔ اور پانچ پانچ ہزار روپئے یکمشت مل گئے تھے۔ اب اُن ریاستوں سے ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپئے ماہوار مل رہے تھے۔ جب کبھی وہاں کوئی بیمار ہوتا تھا تو ابوالخیر ہی بلایا جاتا تھا اور وہ جہاں کہیں بھی ہوتا تھا اُس کو اپنا ہرج کرکے جانا پڑتا تھا۔ ابوالخیر نے جب دیکھا کہ اس کے پاس کافی سرمایہ ہوگیا ہے تو اُسکو اپنے بچپن کا عہد پورا کرنے کی فکر ہوئی۔ اسی نیت سے اس نے ملازمت سے استعفا دیدیا اور مادھوپور میں کچھ زمین خرید کر مکان بنوانا شروع کیا۔ دنیا سمجھ رہی تھی کہ وہ تارک الدنیا ہو کر بندگانِ خدا کی خدمت کرنا چاہتا ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ابوالخیر یہ چاہتا بھی تھا اس کو تجربہ ہو چکا تھا کہ طبی امداد کی سب سے زیادہ ضرورت دیہاتوں میں ہے جہاں لوگ حفظانِ صحت کے اصول سے قطعاً ناآشنا ہیں اور جہاں وقت پر کسی کو طبی مدد نہیں پہونچ سکتی۔ لیکن اس کی اصل غرض اپنے شہر میں شہرت کی تھی اور اسی غرض نے اس کو اس کورده میں سکونت اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا جس کا صحیح علم کسی کو نہ تھا۔ یہاں سب سے پہلے جس بااقتدار شخص سے ابوالخیر کا تعارف ہوا وہ میر قربان علی تھے جو ایک دن کسی ضرورت سے قریب کی تحصیل میں کسی ضرورت سے تحصیلدار صاحب سے ملنے گئے تھے۔ ابوالخیر بھی وہاں کسی مریض کو دیکھنے گیا تھا۔ اس وقت اس کو مادھوپور میں رہتے ہوئے تین مہینے ہوئے تھے مگر اب تک اس نے قربان علی کی صورت بھی نہیں دیکھی تھی۔ تحصیلدار صاحب سے ابوالخیر کے نسب نامہ کا حال معلوم ہوا تو قربان علی پر ایک طرح کا رعب طاری ہوگیا اور وہ نہایت تپاک اور گرمجوشی کے ساتھ ڈاکٹر سے ملے مگر ڈاکٹر کی نگاہوں سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کو اپنی خاندانی فوقیت کا احساس ہے اور وہ میر قربان علی کے ساتھ خلوص محبت

سے نہیں پیش آسکتا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ میر قربان علی کا گھر اس کی خانماں بربادی کی بنیاد پر کھڑا کیا گیا تھا۔ ایسی حالت میں اس کو میر صاحب سے مقابلہ کرنا تھا نہ کہ دوستی کرنا۔ ابوالخیر سن چکا تھا کہ میر صاحب کے باپ، دادا سیدوں کے نوکر نہیں تو مصاحب اور ندیم کی حیثیت ضرور رکھتے تھے اور انھیں کی دی ہوئی روٹی پر جیتے تھے۔ سیدوں کے ادبار کے ساتھ ساتھ ان کا ستارہ چمکنا شروع ہوا تھا اور آج میر قربان علی ابوالخیر کے ہم رتبہ بنے بیٹھے تھے۔ ابوالخیر کو قدرت کا یہ مسخرہ پن کچھ تلخ سا معلوم ہوا۔ اس کے علاوہ وہ اپنی اعلیٰ تعلیم کی بنا پر بھی میر قربان علی کو ہیچ سمجھنے کا حق رکھتا تھا۔ وہ اُن سے اتنا کھل کر نہ ملا جتنا کہ امید کی جا سکتی تھی۔

ابوالخیر کی طبیعت کچھ عجیب معجون مرکب تھی۔ اس میں جتنی خصوصیتیں تھیں وہ سب آپس میں متضاد اور متخالف تھیں۔ وہ طبعاً رنگین مزاج تھا اور اس میں وہ عیاشی اور لذت پرستی بدرجہ تمام موجود تھی جو اس کے خاندان کا امتیازی تمغہ تھی۔ وہ ابتک نہ جانے کہاں کہاں "عشقبازی" کر چکا تھا اور اس کو سیری نہ ہوئی تھی۔ جہاں جہاں وہ بہ سلسلہ ملازمت رہا۔ اس کی بوالہوسی اور نفسانیت اپنی یادگاریں قائم کرتی رہی۔ ان میں سے سب سے بڑی یادگار دہلی میں تھی۔ ملازمت کے دوسرے سال میں وہ دہلی میں کام کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا یہاں وہ ایک شریف اور دولتمند تعلقہ دار کے پڑوس میں رہتا تھا۔ اور اُس کے وہاں آیا جایا کرتا تھا۔ تعلقہ دار کی بیٹی بڑی حسین تھی ابوالخیر نے اس کو دیکھ لیا تھا اور اس کے اندر ایک خروش پیدا ہو گیا تھا۔ اُس نے اس لڑکی پر اپنا جال پھینکا اور کچھ دنوں میں اُس کو اپنے قابو میں کر لیا۔ لڑکی خود ابوالخیر کی صورت پر فدا ہو چکی تھی اور آتش مالکش کا مقابلہ کرنا اُس کے اختیار کی بات نہ تھی۔ اُس نے انجام سے بے خبر ہو کر اپنے کو ابوالخیر کے سپرد کر دیا۔ ابوالخیر بھی عرصہ تک یقین دلاتا رہا کہ اُس کی محبت پائدار ہے لیکن جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ راز طشت از بام ہو گیا ہے اور لڑکی کے گھر والے بر سر انتقام ہیں تو ابوالخیر نے درخواست دیکر اپنا تبادلہ کرا لیا۔ اور پھر پلٹ کر یہ بھی نہیں دیکھا کہ اُس کے بسمل کا کیا حال ہے۔ بدنصیب لڑکی مدتوں اس رنج میں بیمار رہی اور آخر کار دپٹ کر صبر کر لیا۔ ابوالخیر کی نفس پرستی اب تک بدستور تھی۔ ادھر پور آئے ایک مہینہ ہوا تھا کہ اس کی نظر انتخاب رکمنی پر پڑی جو کنکٹ پور کے ایک اہیر کی بیوی تھی اور جو ابوالخیر کے وہاں دودھ بیچنے جایا کرتی تھی۔ ابوالخیر کے پاس سب سے بڑا فتنہ اس کی صورت تھی جو دل میں کھپ کر رہ جایا کرتی تھی۔ رکمنی اس فتنہ سے اپنے کو محفوظ نہ رکھ سکی۔ ڈاکٹر اور رکمنی میں جو تعلقات تھے اُن کا علم عرصہ تک کسی کو نہ ہوا۔

اِن بے عنوانیوں کے باوجود ابوالخیر اپنے صدہا ہم شہریوں کی طرح زندگی میں ناکام اور پریشان حال نہ تھا۔ وہ اقبال مند تھا اور دنیا میں دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔ وہ اپنے پیشہ میں ماہر تھا اگرچہ سائنس کے ساتھ اس کو جو دلچسپی تھی وہ فطری نہ تھی بلکہ اکتسابی تھی۔ اس سے اس کے ارادہ کی پختگی کا پتہ چلتا ہے۔ ابوالخیر اپنے بزرگوں کی طرح ناعاقبت اندیش نہ تھا۔ اس کو روپیہ کی قدر تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ وہ لالچی اور زر پرست تھا۔ صرف اتنا بچا کہ تو ذکر ہی بے کار آج تک اُس نے بیجا طور پر کبھی بلا دریغ سوچے سمجھے ایک پیسہ نہیں صرف کیا۔ اس کی کامیابی کا اصل راز یہی تھا۔ علاوہ بریں وہ جہاں کہیں رہتا اپنے خلق و مروت سے لوگوں کو اپنی طرف مائل کر لیتا وہ غریبوں کی مدد کرنے سے ہر وقت تیار رہتا اور ان کے ساتھ خلوص و ہمدردی کا برتاؤ کرتا اگرچہ اس خوبی کے پہلو بہ پہلو اس میں رعونت بھی بے انتہا تھی جس کی ایک مثال اس کا وہ خشک اور خود دارانہ برتاؤ بھی تھا۔ جو اس نے قربان علی کے ساتھ کیا تھا۔

بہرحال ابوالخیر کو زندگی میں پہنچنے کا فن معلوم تھا۔ تقدیر بھی کچھ موافق نظر آرہی تھی۔ اس کو پورا یقین تھا کہ جس ارادہ سے وہ مادھوپور میں آیا ہے وہ ضرور پورا ہوگا۔ اُس کو آئے ہوئے اور مکان کی بنیاد ڈالے ہوئے قریب قریب چھ ماہ ہوگئے تھے۔ جب وقت احمد اس کو ناتی کے باپ کے لئے بلانے آیا تھا اس وقت مکان کی تعمیر کا سلسلہ ختم ہونے والا تھا۔ صرف کچھ ادھر ادھر کا کام باقی رہ گیا تھا۔ یہ ابوالخیر کی فتح کا ایک باب تھا جو یقیناً امید افزا تھا، جس کے خیال سے ابوالخیر کی امنگیں بڑھ رہی تھیں۔

(۴)

بدورا لکھنؤ میں چھ برس رہ چکی تھی۔ اس کی عمر ۱۸ سال کی تھی۔ پرانے نظامِ تمدن کے لحاظ سے اس عمر تک لڑکی کو بٹھائے رہنا معیوب تھا۔ قربان علی نے بڑی جرأت سے کام لیا تھا۔ اب تک اس موضوع پر جو چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں ان کی طرف سے کان بند کر لئے تھے مگر اب وہ خود بھی بدورا کی شادی زیادہ دنوں تک ملتوی رکھنے کو برا سمجھ رہے تھے۔ بدورا کو اب لکھنؤ رہنے کی ان کی رائے میں مطلق ضرورت نہ تھی۔ اس لئے انھوں نے لڑکی کو پھوپھی کے پاس سے بلا لیا۔ گاؤں والوں میں اس کے تذکرے ہونے لگے تھے کہ اب بہت جلد احمد اور بدورا کی شادی رچائی جانے والی ہے۔ وہ احمد کا سہرا دیکھنے کے مشتاق تھے۔ احمد دیہاتوں میں بے حد ہر دلعزیز تھا۔ اس لئے کہ اس کو ان کے ساتھ خلوص تھا۔ وہ خود اپنے کو انھیں جہالت زدہ مگر پاک سرشت اور صاف باطن لوگوں میں سے سمجھتا تھا اور ان کے ساتھ اس طرح گھل مل کر رہتا تھا کہ گویا وہ اس کے اپنے ہیں۔ گاؤں میں ہر شخص کو معلوم تھا کہ احمد بدورا کی پرستش کرتا ہے۔ اور اب ہر شخص اس گھڑی کا انتظار کر رہا تھا جبکہ احمد کی دیوی اس کا گھر آباد کرے گی۔ بدورا کو کنک پور آئے ہوئے دو مہینے ہو گئے تھے۔ اور احمد بھی سمجھ رہا تھا کہ وہ دن دور نہیں جبکہ بدورا اسکی اپنی ہو جائیگی۔ اگرچہ قربان علی نے ابھی تک اس مسئلہ پر کوئی قطعی گفتگو نہیں کی تھی۔ جو کوئی ان سے پوچھتا کہ بیٹی بیاہنے کا ارادہ کب تک ہے تو وہ مختصر اور مبہم جواب دے دیتے کہ "بس پانچ چھ مہینوں میں"۔ احمد عجیب انتشار اور بے چینی میں مبتلا تھا اگرچہ بظاہر اس کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس کے دل پر ایک گھٹا سی چھا رہی تھی۔ وہ اطمینان سے محروم تھا۔ قربان علی کے سکوت سے اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اور پھر بدورا میں جو تبدیلیاں پیدا ہو گئی تھیں ان سے بھی اس کو اندیشہ تھا۔ ادھر اس نے دو تین بار بدورا کو دیکھا تھا اور یہ محسوس کیا تھا کہ بدورا کچھ اس سے اجنبی اور بیگانہ ہو گئی ہے۔ وہ اس کے بچپن کی بدورا نہ معلوم ہوتی تھی۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ احمد کے جذبات محبت میں کوئی فرق ہو گیا تھا وہ اسکو اسی طرح جی جان سے چاہ رہا تھا اور اس کی دلگرفتگی کا اصلی سبب بھی یہی تھا۔ بہرحال احمد اپنے دل کو سمجھا رہا تھا اور امید کا دامن پکڑے ہوئے اور تقدیر پر بھروسہ کئے ہوئے بیٹھا تھا۔

بدورا میں جو تغیر ہو گیا تھا وہ اتنا بڑا تھا کہ خواہ مخواہ لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرے۔ بدورا کی جگہ آج اگر کوئی دوسری لڑکی ہوتی تو شاید وہ اس گندی فضا میں اب سانس لینا بھی گوارا نہ کرتی۔ لیکن کنک پور بدورا کا مولد و موطن تھا اور اس لئے اسکی نظر میں سارے جہان پر فوقیت رکھتا تھا۔ اس کو کنک پور کے ساتھ کچھ ایسی شدید محبت تھی جس کو بدورا کی شہرت بھی کم نہ کر سکی۔ اس جذبۂ وطن پرستی نے اس کی ذہنیت کے ساتھ [illegible] کر رکھا تھا۔ وہ یہ ارادہ رکھتی تھی کہ اپنے گاؤں میں ایک مکتب کھولے جس میں وہ خود گاؤں کے

لڑکوں لڑکیوں کو پڑھائے لکھائے اور اس طرح اُن کو شہریوں کی طرح مہذب اور شائستہ بنائے۔ احمد کے ساتھ اس کو جو بچپن سے لگاؤ تھا اسمیں البتہ نمایاں فرق ہوگیا تھا۔ وہ یہ تو تسلیم نہ کرسکتی تھی کہ اب اس کو احمد سے اگلی سی شدید محبت نہیں رہی۔ اس کو یہ بھی یقین تھا کہ احمد پختہ مغز ہے اور اُسکی محبت میں سرمو فرق نہ ہوا ہوگا۔ بایں ہمہ اب وہ یہ سوچنے لگی تھی کہ آخر احمد کی بیوی بننا خود اسکے حق میں کہاں تک بہتر ہوگا اس لئے کہ دونوں کے مذاق معاشرت میں پھول اور خاشاک کی نسبت تھی۔ بدورا اب شوہر کا ایک بلند معیار اپنے ذہن میں قائم کر چکی تھی۔ قربان علی نے بھی بیٹی کے طور طریقہ میں جو تبدیلی ہوئی تھی اس کو محسوس کر لیا تھا اور اس نتیجے پر پہونچے تھے کہ اس کو اس کے سنجھ لائق شوہر ملنا چاہیئے۔ لہٰذا اب یہ مسئلہ اُن کے لئے اتنا آسان نہ تھا جتنا کہ پہلے وہ سمجھ رہے تھے۔ اب اُن کے ارادہ میں تزلزل شروع ہوگیا تھا۔ لیکن احمد کے ساتھ اگر بیٹی کی شادی نہ کریں تو پھر کس کے ساتھ کریں؟ اس سوال کا جواب اُن کے پاس کوئی نہ تھا اس لئے احمد کے خیال کو چھوڑ نہ سکتے تھے وہ فکر مند تھے اور ابھی کسی فیصلہ پر پہونچ نہ سکے تھے۔

بھادوں کا بے اعتبار موسم تھا۔ ساون اپنا کرتب دکھا چکا تھا تا حد نظر زمین زمردین چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ کسان بڑی سرگرمی کے ساتھ کھیتوں میں کام کر رہے تھے اس لئے کہ کھیتوں میں دھان کے ساتھ گھاس کا بھی پورا زور تھا جس کو کاشتکار اپنے اپنے کھیتوں سے کٹا کر علٰحدہ کرا رہے تھے۔ احمد امیر نگر کی پوربی سرحد پر پختہ سڑک کے کنارے اپنی سیاہ چھتری لئے ہوئے ایک کھیت کی منڈیر پر بیٹھا ہوا تھا۔ کھیت میں مزدور لگے ہوئے تھے۔ جن میں اکثر تعداد عورتوں اور لڑکیوں کی تھی۔ اِن بدقسمتوں پر موسم کا پورا اثر تھا عورتیں جھوم جھوم کر گا رہی تھیں۔ جس طرف نظر اٹھایئے یہی سماں تھا اِن کی لمبی تانوں سے فضا لرزاں تھی۔ احمد سوچ رہا تھا کہ دیکھئے خدا کی ایک یہ بھی مخلوق ہیں جو آسودگی اور مسرت کے راز سے واقف ہیں۔ اِن کو کبھی دو وقت پیٹ بھر کھانا نہیں نصیب ہوتا اسپر بھی وہ کسقدر خوش و خرم ہیں۔ اِن کے مقابلہ میں ایک وہ مخلوق ہیں جن کو ہر طرح کی نعمت اور آرائش میسر ہے مگر سکون و طمانیت کے خواب سے بھی وہ محروم ہیں۔ احمد برابر کہا کرتا تھا کہ اِن میں سے ایک ہابیل کی نسل ہے۔ دوسری قابیل کی۔ وہ اسی خیال میں گم تھا کہ فاختوں کا ایک جوڑا اڑ کر آیا اور اس کے سامنے ببول کے ایک چھوٹے سے درخت پر بیٹھ گیا۔ احمد کی نگاہ اوپر اٹھ گئی۔ دیکھا تو دونوں آپس میں راز و نیاز کا اظہار کر رہے تھے۔ احمد کے خیال کا مرکز بدل گیا۔ اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کیا اس کو کبھی زمانہ اس کا موقع دے گا کہ وہ بھی اسی طرح بدورا کی خدمت میں اپنا ہدیہ نیاز پیش کرے!

مطلع ابھی بالکل صاف تھا۔ دھوپ تیز تھی۔ ہر شخص پسینہ میں تر تھا۔ دفعتہً ہوا کے جھونکے چلے اور ان میں خنکی پیدا ہوئی دیکھتے دیکھتے بادل کے سیاہ منتشر ٹکڑے جو ابھی تک آسمان پرست آواروں کی طرح اِدھر اُدھر پھر رہے تھے ایک جگہ اکٹھا ہوگئے اور بوندیں گرنی شروع ہوگئیں۔ بات کی بات میں موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ احمد کود کر سڑک پر ہو رہا اور ایک سایہ دار درخت کے نیچے چھتری لگا کر بیٹھ گیا۔ مزدور بھیگ بھیگ کر اسی طرح اپنا کام کر رہے تھے بلکہ اُن کے ترانوں کا جوش کچھ اور بڑھ گیا تھا کچھ دیر یونہی گزری ہوگی کہ احمد نے دور سے ماتی کو آتے ہوئے دیکھا۔ احمد نے سمجھا کہ ماتی کہیں اپنے کسی کام سے جاتی ہوگی جب بدورا واپس آئی تھی اور گاؤں میں احمد کی شادی کے چرچے ہونے لگے تھے ماتی کا برتاؤ احمد کے ساتھ کچھ کھنچا ہوا سا تھا۔ اگرچہ وہ

اب بھی اُس کے گھر کا کام آکر کر جایا کرتی تھی۔ احمد اس کشیدگی کو محسوس کرتا تھا اور اس کے معنی سمجھتا تھا۔ عرصہ سے وہ دیکھ رہا تھا کہ مالتی اُس کی گرویدہ ہوتی چلی جاتی تھی۔ اس کے حال پر احمد کو رحم ضرور آتا تھا اور بعض اوقات وہ اس کے لئے اپنے اندر وہ جذبات بھی پاتا تھا جسکو محبت سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ لیکن وہ مجبور تھا۔ اس لئے نہیں کہ اسکو دُنیا کے رسوم و قیود کی پروا تھی بلکہ اس لئے کہ اس کے سر میں ہندورا کا سودا سمایا ہوا تھا۔

مالتی سیدھی آکر جہاں احمد بیٹھا ہوا تھا وہاں کھڑی ہوگئی اور چند منٹ تک احمد کو غور سے دیکھتی رہی۔ احمد نے حیرت سے پوچھا "کہو مالتی خیریت تو ہے؟ اس آندھی پانی میں یہاں آنے کی کون سی ضرورت تھی؟"

"ضرورت نہ ہوتی تو آتی کیوں؟" مالتی نے خشک لہجہ میں جواب دیا۔ پھر آہستہ سے کہا "مجھکو آپ سے کچھ کہنا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو سُنکر دُکھ ہوگا مگر میں بغیر کہے نہیں رہ سکتی"۔ احمد کا دل دھڑکنے لگا۔ اُس نے کہا جلد کہو کیا ہے؟" پانی کا زور بڑھ گیا تھا دن دوپہر شام معلوم ہوتی تھی۔ مالتی سامنے بیٹھ گئی اور کہنے لگی "اب آپ کیا کریں گے؟ میر صاحب اپنی بیٹی کی شادی ڈاکٹر صاحب کے ساتھ کرنے والے ہیں۔ وہی ڈاکٹر جو اُس دن ایسے نازک وقت میں بھی آپ کو گھور گھور کر دیکھ رہے تھے"۔ احمد کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ یکایک دنیا خلا میں تحلیل ہوکر رہ گئی ہے۔ اُس نے مالتی کو غور سے دیکھا۔ مالتی کی آنکھوں میں طنز تھا۔ احمد نے سر پکڑ لیا۔ مالتی گھبرا گئی اُس نے اپنے لہجہ کو بدل کر کہا "ذرا ضبط سے کام لیجئے۔ آخر آپ کسی ایسے کے لئے کیوں کڑھتے ہیں جس کو آپ کی پروا نہ ہو اور جو آپ کی نہ ہونا چاہے یا نہ ہو سکے؟" حالانکہ مالتی خود ایک ایسے ہی شخص کیلئے کڑھ رہی تھی۔ احمد نے اس سوال کی طرف بلا توجہ کئے ہوئے پوچھا "مگر یہ تو بتاؤ تم نے یہ خبر کس سے سنی؟ مجھے اس کا ابتک علم نہیں"۔ گویا احمد کو اس خبر کی صحت میں شبہ تھا۔ مالتی نے جواب دیا "رکمنی آپ کے لئے دودھ لیکر آئی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ آج صبح سے صرف میر صاحب کے گھر میں نہیں بلکہ سارے گاؤں میں اس کا ذکر ہو رہا ہے آج دس پندرہ دن ہوئے کہ ڈاکٹر صاحب نے میر صاحب کے پاس نکاح کا پیغام بھیجا تھا۔ میر صاحب نے کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا مگر کل شام کو انھوں نے سوچ سمجھکر ڈاکٹر صاحب کی درخواست منظور کرلی اور اُس کی اُن کو اطلاع بھی دیدی ہے"۔ اتنا کہکر مالتی رک گئی۔ وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی مگر پس و پیش کر رہی تھی کہ احمد سے کہے یا نہ کہے۔ احمد کھویا ہوا تھا اور اپنے کو اور اپنے گرد و پیش کو بھولا ہوا تھا۔ مالتی نے آخر کار یہ طے کر لیا کہ احمد سے وہ دوسری بات بھی کہدے۔ دیکھے اس کا احمد پر کیا اثر ہوتا ہے۔ اُس نے اپنی آواز کو اور بھی دھیمی کرکے کہا "آپ کو معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب رکمنی کو بہکا کر خراب کر چکے ہیں۔ اور اب اُس کی بات بھی نہیں پوچھتے۔ رکمنی کو اس کا بڑا رنج ہے۔ آج وہ زار زار رو رہی تھی معلوم ہوتا ہے کہ بیچاری بھی اسی حرام ڈاکٹر کی موہنی شکل پر ریجھ گئی ہے۔ کیسی بے وقوف ہے!" مالتی خود بھی رکمنی سے کچھ کم بے وقوف نہ تھی اگرچہ دونوں کی بیوقوفی کی نوعیت مختلف تھی۔

احمد اپنی محویت سے چونک پڑا۔ رکمنی گاؤں کی سیکڑوں سیدھی سادی عورتوں کی طرح بے حد معصوم تھی۔ اس کی یہ لغزش اور فرض فراموشی احمد کے لئے حیرت کی بات تھی۔ مالتی نے احمد کے چہرے کا مطالعہ کرتے ہوئے کہا "کہئے تو میں کسی طرح میر صاحب کو اس واقعہ سے خبردار کردوں۔ شاید اب بھی وہ اپنے ارادہ سے باز آئیں"۔

احمد نے مالتی کو ملامت کرتے ہوئے کہا "ایسی بات کا خیال بھی دل میں نہیں آنے دینا چاہیئے خیر ڈاکٹر کا پاس نہ سہی لیکن رکمنی کا خیال تو کرنا چاہیئے۔ اس کو رسوا کرنا کہاں کی شرافت ہے۔ اس کے علاوہ کسی کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا کرنے میں اپنی غرض پوری کرنا نہیں چاہتا۔ چپ رہو جو ہو رہا ہے ہونے دو مجھے بھی صبر آجائے گا" آخری جملہ حسرت میں ڈوبا ہوا تھا۔ مالتی پر اس کا بڑا اثر ہوا اور وہ مضمحل ہو گئی۔

مطلع پھر بنا دھو کر صاف و شفاف ہو گیا تھا۔ دھوپ نکل آئی تھی۔ احمد بدستور پیڑ کے نیچے بیٹھا رہا۔ مالتی وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ اور اس کے کھیت میں مزدوروں کے ساتھ کام کرنے لگی۔ حالانکہ عرصہ سے اس نے احمد کے یہاں مزدوری نہیں کی تھی۔ آج وہ بلا کسی کے کہے سنے اس کے مزدوروں میں شامل ہو گئی تھی اور شام تک کام کرتی رہی۔ جب اندھیرا ہونے لگا مزدور اپنے اپنے گھر جانے لگے اور احمد وہاں سے روانہ ہو گیا تو مالتی بھی اپنے گھر چلی آئی۔

(۵)

مالتی نے جو خبر احمد کو سنائی تھی اس کی تفصیل یہ ہے۔

ابوالخیر روزانہ شام کو سیر کرنے دور تک نکل جایا کرتا تھا۔ مادھوپور یوں تو کنک پور سے صرف ایک میل کے فاصلہ پر تھا لیکن درمیان میں ایک گھنا جنگل تھا۔ جس میں زیادہ تر ساکھو کے درخت تھے اور جس کا سلسلہ پورب میں دریا کے کنارے تک چلا گیا تھا۔ شام کو اس جنگل کے اندر سے کوئی راستہ نہ چلتا تھا۔ مادھوپور سے ایک کچا راستہ جنگل کے پچھم سے گھومتا ہوا پختہ سڑک سے آکر ملجاتا تھا شام کو عموماً راہ گیر اسی راستہ سے چلتے تھے۔ ابوالخیر بھی روز اسی راستہ سے نکلتا تھا۔ اس سے مادھوپور اور کنک پور کے درمیان پورے دو میل کا فاصلہ پڑ جاتا تھا۔ ابوالخیر کی عادت شام کو دور تک چہل قدمی کی تھی۔ وہ مادھوپور سے چلتا تھا اور پختہ سڑک پر رکمنی کے گھر کے سامنے نکلتا تھا جو سڑک ہی کے کنارے۔ میر قربان علی کے مکان سے کچھ دور ہٹ کر پچھم میں تھا۔ ابوالخیر رکمنی پر ایک نظر ڈالتا ہوا سیدھے پچھم کی طرف چلا جاتا تھا۔ وہ پورب کی طرف تفریح کرنے جاتا تھا نہیں۔ اس لئے کہ راستہ میں میر قربان علی کا مکان پڑتا تھا جس کو وہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک دن اس کے جی میں آئی کہ لاؤ قربان علی کے مکان پر آج ایک نظر ڈال لیں اس خیال سے آج وہ بجائے حسب دستور پچھم جانے کے پورب کی طرف مڑ گیا۔

میر قربان علی کا مکان ٹھیک سڑک کے کنارے تھا۔ عمارت دیکھنے میں مضبوط اور پرشوکت معلوم ہوتی تھی۔ سامنے مردانہ حصہ وسیع اور کشادہ تھا۔ پورب جانب ایک لمبا چوڑا احاطہ تھا جو پختہ اینٹوں کی چہار دیواری سے گھرا ہوا تھا اور جو عورتوں کے مصرف میں رہتا تھا۔ ابوالخیر مکان پر ایک سرسری نگاہ ڈالتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ احاطہ کے وسط میں دروازہ کے سامنے پہونچ چکا یکایک وہ ٹھٹھک گیا جیسے اُسکی آنکھیں چکا چوند ہو گئی ہوں۔ دروازہ کا ایک پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ اور بدورا بے شعوری کے عالم میں کھڑی قدرت کی نیرنگیوں کی سیر کر رہی تھی۔ دیہات میں شرفا بھی پردہ کی پابندی اس سختی کے ساتھ نہیں کرتے جیسا کہ شہروں میں رواج ہے۔ بدورا وغیرہ اکثر راتوں کو کھیتوں اور جھاڑیوں میں سیر کرنے نکل جایا کرتی تھیں۔ چنانچہ بدورا کا اس طرح کھلے سر دروازہ پر کھڑا رہنا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ شام کی گلابی روشنی اور ہلکی خاموشی میں بدورا جنگل کی کوئی پری معلوم ہوتی تھی۔ اُس کی آنکھیں دیکھکر بے اختیار یہ مان لینے کو

جی چاہتا تھا کہ جس شراب سے عراقی کا جام پہلی بار لبریز کیا گیا تھا وہ انھیں آنکھوں سے عاریتہً مانگی گئی ہوگی - ابوالخیر تھوڑی دیر کے لیئے مبہوت ہوگیا تھا اور اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے - بدورا نے ابوالخیر کو دیکھا تو دروازہ بند کرلیا - ابوالخیر چند منٹ وہاں دم بخود کھڑا رہا اور پھر "فغاں زپردہ نشیناں کہ پردہ دارانند" کہکر جدھر سے آیا تھا اسی طرف روانہ ہوگیا -

ابوالخیر سمجھ گیا تھا کہ یہ میر قربان علی کی لڑکی بدورا تھی - اُس نے اس کا نام اکثر سُنا تھا لیکن آج ساعت مساعد تھی - اُس نے بدورا کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ اُس نے ابتک کسی ایسے حسین پیکر کا خواب بھی نہ دیکھا تھا - اس دن ساری رات بدورا کی آنکھیں اس کو ستاتی رہیں - اور آرام سے سو نہ سکا دوسرے دن شام کو پھر وہ اسی جگہ پہونچا - جہاں اپنا صبر و سکون کھو آیا تھا - دروازہ پھر اسی طرح کھلا تھا مگر وہ ابھی اس کے سامنے پہونچا بھی نہ تھا کہ بند کرلیا گیا - آج بدورا کل کی طرح بے خبر نہ تھی - ابوالخیر مایوس ہوکر واپس جانا چاہتا تھا کہ اُس کے دل نے کہا "آج چلو قربان علی سے مل لو" - قربان علی نے اس کو اپنی عزت افزائی سمجھا اور ابوالخیر کی بڑی تعظیم و تکریم کی - ابوالخیر کے برتاؤ میں بھی اب وہ خشکی اور بے گانگی نہ تھی - مختلف مسئلوں پر باتیں ہوتی رہیں - قربان علی رہ رہ کر ابوالخیر کے ایثار اور نفس کشی کی داد دے رہے تھے - اُن کے خیال میں یہ کسی معمولی انسان کا کام نہ تھا کہ دنیا کی گوناگوں مسرتوں اور دلچسپیوں کی طرف سے منھ موڑ کر ایسے ویرانہ میں اپنے کو خدا کے بندوں کی خدمت کے لئے وقف کردے قربان علی دیکھ رہے تھے کہ ابوالخیر کی شہرت اتنی قلیل مدت میں دور دور تک پھیل گئی تھی ۲۵ کوس کے حلقہ میں کوئی زمیندار ایسا نہ تھا جو ضرورت کے وقت اس کو نہ بلاتا ہو - ذی مقدرت کاشتکاروں کے وہاں بھی وہ جایا کرتا تھا - اور جو مفلس اور نادار تھے وہ اُس کے وہاں آتے تھے اور وہ اُن کو مفت یا برائے نام قیمت پر دوائیں دیتا تھا - قربان علی کے لئے یہ کوئی عام بات نہ تھی - اسی اثنا میں قربان علی نے جس محنت و مشقت سے بدورا کی پرورش کی تھی اُس کا بھی تذکرہ چھڑ گیا -

قربان علی نے فخریہ لہجہ میں کہا " بدورا کا ارادہ ہے کہ گھر میں ایک مدرسہ کھولے اور جو کچھ فائدہ عوام کو پہنچا سکتی ہو پہونچائے دیہات میں جو گندگی اور جہالت پھیلی ہوئی ہے - اس سے اس کی روح کو تکلیف ہوتی ہے - اور وہ خلوص دل سے اس کو دور کرنے کی نیت رکھتی ہے" - قربان علی کو اس کا احساس ہوا کہ ابوالخیر نے بدورا کا تذکرہ بڑی دلچسپی سے سُنا اور اُن کا غرور بڑھ گیا -

دوسرے روز صبح کو قربان علی کو ابوالخیر کی ایک تحریر ملی - القاب و آداب اور ایک طویل تمہید کے بعد اس کا مضمون یہ تھا -

" میں نہ جانے کن ناموافق اتفاقات کی وجہ سے ابتک بھوکی زندگی بسر کرتا رہا ہوں جو مجھ جیسے آدمی کے لیے قطعاً نازیبا ہے - اس طرف اکثر یہ سوچتا رہا ہوں اور اس کی ضرورت بھی محسوس کرتا رہا ہوں کہ مجھکو شادی کرکے اپنا گھر بسانا چاہیئے - لیکن ابھی تک میں کوئی فیصلہ نہ کرسکا تھا - کل آپ سے ملنے کے بعد بڑی دیر تک غور کرتا رہا اور اگر آپ نے میری درخواست منظور کرلی تو میں اس مسئلہ کو حل شدہ سمجھوں گا - آپ نے اپنی صاحبزادی کی تعلیم و تربیت کا کل جو ذکر کیا تھا اس سے میں اس نتیجہ پر پہونچا کہ اُن سے بہتر مجھکو کوئی شریک زندگی نہیں مل سکتی - میرا شجرہ نسبی تو آپ کو معلوم ہے - میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں نے اپنی حلال کی کمائی سے اتنی دولت بھی پیدا کرلی ہے کہ عمر بھر آرام و آسائش سے گزار سکوں اور فکر میں ہوں کہ اگر مختصر سی زمینداری بھی خرید سکا تو خرید لوں -

آپ بھی اس مسئلہ پر غور کر لیجئے۔ امید ہے کہ آپ کو مجھے اپنی دامادی میں لینے میں کوئی عذر نہ ہوگا اور میں ہر طرح آپ کی توقعات کے مطابق ثابت ہوں گا۔

بندۂ احقر ابوالخیر

قربان علی خط پڑھکر عجیب شش و پنج میں پڑ گئے تھے اور اُن کی عقل کام نہ کرتی تھی کہ آخر اس گتھی کو کیونکر سلجھائیں۔ وہ ابوالخیر کو بدورا کے لئے بہترین شوہر خیال کرتے تھے۔ لیکن آخر احمد کو کیا کریں جس کا خیال اُن کے دل میں نشتر چبھو رہا تھا۔ پندرہ دن وہ اسی اُدھیڑ بن میں گرفتار رہے آخر کار بیٹی کی بہی خواہی اُن کے ہر جذبہ پر غالب آئی اور انھوں نے ابوالخیر کی درخواست منظور کر لی اور اس کو لکھ بھیجا کہ دسمبر کے مہینہ میں انشاء اللہ شادی ہو جائے گی۔

دوسرے دن رات کو آٹھ بجے انھوں نے احمد کو حسب ذیل عبارت کا ایک خط لکھ بھیجا:۔

"عزیزم۔ گزشتہ سال بھر غور و مطالعہ کرنے کے بعد میری سمجھ میں یہ آیا کہ تمھارا اور بدورا کا جوڑ باوجود اس قدر شدید محبت کے موزوں نہیں ہے۔ ابوالخیر کو ترجیح دینے کی یہی وجہ ہوئی۔ احمد میں تمھارا گنہگار ضرور ہوں لیکن بدورا کی محبت نے مجھکو اس گناہ کے ارتکاب پر مجبور کیا۔ امید ہے کہ تم مجھکو معاف کر دوگے۔ اور بدورا اور ابوالخیر کے ساتھ مخلصانہ برتاؤ رکھوگے۔

دعاگو قربان علی

احمد نے خط پڑھکر ایک تلخ تبسم کے ساتھ یہ شعر پڑھا۔

شد است سینہ ظہوری پر از محبت یار ۔۔۔۔ برائے کینۂ اغیار در دلم جا نیست

اُس کے تبسم سے ٹپکتا تھا کہ وہ اپنے کو ملامت کر رہا ہے۔ اس کے بعد وہ سوچنے لگا کہ آخر خط بھیجنے کے کیا معنے ہیں جبکہ وہ قربان علی سے چار قدم پر رہتا تھا۔ اور قربان علی خود آ کر یا اُس کو بلا کر اس سے بالمشافہ گفتگو کر سکتے تھے۔ انھوں نے ایسا کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ شائد مطلب یہ ہے کہ اب ہمارے درمیان معمولی دکھاوے کے بھی تعلقات قائم نہیں رہ سکتے۔ احمد نے یہ سوچکر دل میں کہا "خیر یونہی سہی"۔

رات بھیگ رہی تھی۔ششجہت پر ایک ڈراونی تاریکی مسلط تھی۔ چاند اور ستارے مارے ہیبت کے نہ جانے کس پردے میں روپوش تھے ساری دنیا ایک سیاہ کفن میں لپٹی ہوئی تھی۔ ہوا بھی تھک کر خاموش تھی۔ رات کی بے شمار آوازیں کانوں میں آ رہی تھیں جو سننے والوں کے دل میں عجیب عبرت پیدا کر رہی تھیں ہستی کا ہر نقش کسی کی "شوخیٔ تحریر" کا فریادی بنا ہوا تھا اور معلوم ہوتا تھا زمین و آسمان کی ایک ایک چیز کراہ رہی ہے۔ نیند جس کو موت کا قائم مقام سمجھنا چاہئے ہر طرف اپنا جادو چلا چکی تھی۔ لیکن احمد اپنے مکان کے سامنے کھلے میدان میں کروٹیں بدل رہا تھا۔ اس کے اندر ایک آگ سلگ رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے جو اُس کے رخسار کو جلائے ڈالتے تھے۔ اس کے اندر اس وقت جو شورش تھی اسکو وہ کسی طرح دبا نہ سکتا تھا۔ اتنے میں جنگل سے "پی کہاں"! "پی کہاں"! کی صدا بلند ہوئی اور فضا گونج اٹھی پہلے تو احمد نے ایسا محسوس کیا کہ یہ جانکاہ شور خود اُس کی روح کی گہرائیوں سے اٹھا ہے مگر پھر وہ ہوش میں آگیا اور کہنے لگا "کچھ اکیلا میں ہی

ستم زدہ نہیں ہوں کائنات کا ذرہ ذرہ کسی نامعلوم ظالم کا ستایا ہوا ہے"۔ اس خیال کے بعد احمد کا بستر پر پڑا رہنا بھی مشکل ہو گیا۔ وہ اٹھا اور جبکہ رات کی بھیانک تاریکی ہر شخص کو دھکا دھکا کر اپنی اپنی جائے پناہ میں بھیج رہی تھی وہ اپنا ڈنڈا لیکر اسی جنگل میں پہونچا جہاں سے کسی "پیاداسی" نے اپنے پیا کا پتہ پوچھا تھا۔ احمد ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر سنتا رہا۔ اس سے اُس کو اپنے درد کا احساس کچھ گھٹتا ہوا ضرور معلوم ہوا۔ کوئی پندرہ منٹ اسی عالم میں گزرے ہوں گے کہ احمد کو اپنے سے تھوڑے فاصلہ پر کچھ آہٹ معلوم ہوئی اور وہ اس خیال سے چونک پڑا کہ اس سنسان جنگل میں وہ اس وقت تنہا نہیں ہے بلکہ کوئی اور بھی ہے جو اس جگہ اسی کی طرح یا تو اپنی درد ناکیوں کے احساس کو کم کرنے آیا ہے یا اس کے حرکات و سکنات کا تماشا کرنے۔ اس کو ایک خلش سی پیدا ہو گئی اور وہ تفتیش کرنے کے لئے اٹھا۔ اٹھتے دیر نہ ہوئی تھی کہ سامنے ایک درخت کے آڑ سے نکل کر ایک عورت جلد جلد قدم بڑھاتی ہوئی گاؤں کی طرف چلی۔ احمد نے قد اور چال سے پہچان لیا اور پکارا "مالتی بھاگتی کیوں ہو؟ سنو" مالتی بے بس ہو کر رک گئی۔ احمد نے قریب آکر پوچھا "اس وقت تم کو یہاں کیا کرنا تھا؟ ایسی اندھیری رات میں اور ایسے خطرناک مقام پر تمکو ڈر نہیں معلوم ہوا؟ اور پھر مجھکو دیکھکر بھاگنے کے کیا معنی؟"

مالتی نے جواب دیا "آخر آپ بھی تو اسی جگہ ہیں جہاں میں ہوں۔ آپ یہاں کیا کرنے آئے تھے؟" مالتی کے لہجہ میں ترشی تھی مگر اُس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ احمد گھبرانے لگا۔ اس نے کہا "میرا حال ناحق پوچھتی ہو۔ جانتی ہو کہ میں زمانہ کا ستایا ہوا ہوں۔ قسمت کا مارا ہوا ہوں اور یہ قسمت آبائی ہے۔ باپ دادا کے وقت سے چلی آرہی ہے۔ زندگی کو پاپ سمجھتا ہوں پھر میرا کہیں ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں مگر مالتی تم کو کیا ہوا ہے؟ تمھاری آواز سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم روتی رہی ہو"۔ احمد نے پوچھنے کو تو پوچھ لیا مگر وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں اُس کو یہ اعتراف نہ کرنا پڑے کہ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ مالتی ابھی تک اپنے کو سنبھالے ہوئے تھی جیسا کہ اُس کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا لیکن احمد کے سوال سے جو اس کو تازہ ٹھیس لگی اُس کو برداشت نہ کر سکی اور زار زار رونے لگی۔ احمد کا دل پہلے سے تپک رہا تھا۔ ابھی اُسکی آنکھوں سے وہ آنسو خشک نہ ہونے پائے تھے جو چند منٹ پہلے اس کا تکیہ تر کر چلے تھے۔ مالتی کی یہ حالت دیکھکر اس کی طبیعت پھر اُمنڈ آئی اور آنسوؤں کا تار بندھ گیا۔ اس وقت وہ قطعی اپنے کو قابل نفرین سمجھ رہا تھا۔ اُس کو دل پر اختیار نہ رہا اُس نے وحشیوں کی طرح مالتی کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے اور پوچھنے لگا "کیوں؟ کیوں؟ یہ کیوں؟ مالتی خدا کے لئے کچھ بولو!"

مالتی نے احمد کی گرفت سے اپنے ہاتھ نہیں چھڑائے۔ اس کو اس سے راحت مل رہی تھی۔ اگرچہ احمد کے ہاتھ اس وقت سرد تھے اُس نے احمد کو اسی بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا "آپ کیوں بار بار مجھسے پوچھتے ہیں؟ آپ یا تو بڑے سنگ دل ہیں یا واقعی بڑے بھولے ہیں"۔ احمد نے طنز کے ساتھ کہا "ممکن ہے دونوں ہوں" اس کے بعد کسی سوچ میں پڑ گیا۔ اب تجاہل کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اور مالتی اس پر تلی ہوئی تھی کہ وہ احمد کا اعتراف اس کے منھ سے سن لے۔ آخر احمد نے بھی فیصلہ کر لیا کہ آج مالتی سے کھلے الفاظ میں گفتگو کرے۔ اُس نے مالتی کو اور قریب کھینچکر کہنا شروع کیا "مالتی تم سمجھتی ہوگی کہ میں تمھاری اصل حالت سے ناواقف ہوں یا اگر واقف ہوں تو تمھاری طرف دھیان دینا نہیں چاہتا۔ تم مجھکو سنگ دل کہتی ہو تمھارا کہنا ٹھیک ہے۔ جو ہمدردی رکھتے وہ تم خوب جانتی ہو۔ میں اپنے کو دھوکہ ضرور دینا چاہتا تھا اس لئے کہ بیدردی کی صورت بچپن سے میرے دل پر اس طرح نقش ہو چکی ہے کہ مٹائے نہیں مٹتی۔ آج میں ایسا محسوس

کر رہا ہوں کہ اس جنم میں مجھکو جو سزائیں بھگتنا تھیں ان کی حد ہو چکی ہے اور اب مجھکو کچھ کرنا دھرنا نہیں ہے" مالتی نے جلکر کہا "جسطرح کسی کی صورت آپ کے دل میں گھر کر چکی ہے اسی طرح آپ میرے دل میں - نہیں - میرے ریشہ ریشہ میں گھر کر چکے ہیں - اسکا جواب آپ کے پاس کیا ہے ؟ ہاں اسکا کوئی جواب نہ تھا - جاہل مگر ذہین اور ذکی الحس مالتی نے نہایت سادہ پیرایہ میں اُن جذبات کا اظہار کر دیا تھا جو کسی نازک خیال شاعر کے لئے بہت کچھ مواد فراہم کر سکتے تھے - احمد قائل ہو گیا تھا - وہ اسوقت مالتی کے چہرہ کا اور اُسکی ایک ایک شکن کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا مگر اُس کو بجز ایک دھندلے پیکر کے اور کچھ نظر نہ آرہا تھا - کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اُس نے ایک آہ کی اور کہا " مالتی اللہ مجھکو سمجھاؤ کہ مجھ میں کونسی ایسی خوبی ہے جس سے تم اس قدر محبت کرتی ہو - میں جو دنیا میں ایسا بدبخت ہوں جس کا دل ہر وقت دکھا کرتا ہے جس کو جینے سے نفرت ہے ؟ "

مالتی کے دل کا بوجھ ہلکا ہو رہا تھا - اُس نے جواب دیا " یہ مجھ سے نہ پوچھئے میں نہیں کہہ سکتی کہ میں کیوں آپ کی محبت کرتی ہوں اتنا جانتی ہوں کہ میں آپکو چاہتی ہوں - ہر گھڑی آپ کے خیال میں مگن رہتی ہوں - اگر آپ بدبخت ہیں تو مجھے آپ کی بدبختی کے ساتھ عشق ہے - آپکا دل دکھا کرتا ہے تو میں اس دکھتے ہوئے دل کو پوجتی ہوں - اگر آپ کو جینے سے نفرت ہے تو مجھکو آپ کی نفرت سے محبت ہے اور یہ محبت کچھ ایسا مجھ پر چھا گئی ہے کہ مجھے یہ بھی خیال نہیں رہا کہ میں ہندو ہوں - محبت میرا دھرم ہو کر رہ گئی ہے " مالتی کا جوش دھیرے دھیرے بڑھ گیا تھا اور احمد ششدر تھا - وہ اسوقت اپنے کو اور اپنی بدبختی کو بھول گیا تھا - اس نے بے اختیار ہو کر مالتی کو لپٹا لیا اور اس کے ماتھے پر بوسہ دیکر کہا " مالتی تم ہندوستان کی اُن عورتوں میں سے ہو جنکی ذات سے ستیا - ساوتری اور دمینتی کے نام ہمیشہ زندہ رہیں گے میں منحوس ہوں جو تمھاری قدر نہیں کرتا - آج سے تم مجھکو اپنا سمجھو اور اب میں بھلا اور کس کا ہو سکتا ہوں کوئی وجہ نہیں کہ اگر خود میری زندگی خراب و برباد ہو گئی ہے تو میں تمھاری تمناؤں کا بھی خون کر کے تمکو مٹا دوں - ہاں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ مجھکو دو تین دو سال تک آزاد رہنے دو اور اپنی ناکامیوں اور محرومیوں کا ماتم کر لینے دو - سمجھنا کہ بیوہ کا سوگ لئے ہوئے ہوں اس درمیان میں ہم ایک دوسرے کے اسی طرح رفیق رہینگے جس طرح ابتک رہے ہیں - اس کے بعد تم جو کہنا میں اُس کی تعمیل کرنے کے لئے تیار رہونگا اب میرا اُس دنیا میں تمھارے سوا کون ہے ؟ " اس عہد کو محکم بنانے کے لئے اس نے مالتی کو پھر پیار کیا - اب احمد پر ایک قسم کا عمل شروع ہو رہا تھا اور اس کا دل سرد ہونے لگا تھا - بدورا پھر یاد آرہی تھی -

مالتی نے اپنے کو اب علانیہ احمد کی خدمت اور نگہداشت کے لئے وقف کر دیا اور دن رات اس کے گھر کی دیکھ بھال میں مصروف رہنے لگی - اس کو یقین ہو گیا تھا کہ احمد اب اس کے سوا کسی اور کا نہیں ہو سکتا - احمد نے بھی بڑی بڑی کوششوں کے بعد مالتی کو اپنی دلچسپیوں کا مرکز بنا لیا تھا - گو کہ اب بھی کسی صورت سے اس کو شگفتہ نہیں کہا جا سکتا تھا - اُس کی آزردگی اور پژمردگی بدستور باقی تھی - ہر طرف یہ بات مشہور ہونے لگی تھی کہ مالتی احمد پر عاشق ہے اور اس سے جدا ہونا نہیں چاہتی - مالتی کی برادری والوں نے مالتی کی شادی کی بڑی کوشش کی مگر اس نے صاف انکار کر دیا اس سے لوگوں کا خیال اور بھی مستحکم ہو گیا - اگر احمد کے چال چلن کا سکہ نہ بیٹھ چکا ہوتا تو نہ جانے مالتی کی گرویدگی کا کیا اثر ہوتا لیکن چونکہ احمد کو لوگ فقیر منش سمجھ رہے تھے اس لئے اس کی طرف سے

نہ کوئی بدظنی ہوا اور نہ مالتی کے خلاف کوئی شورش پھیلی ۔

احمد نے خط پانے کے بعد سے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ اب نہ وہ بدورا سے ملیگا اور نہ اس کے گھر والوں سے ۔ چنانچہ اس نے کنک پور کی سرزمین قدم رکھنا بھی چھوڑ دیا تھا ۔ یہاں تک کہ وہ بدورا کی شادی میں بھی نہیں شریک ہوا اور ایک دفعہ جبکہ بدورا نے بچ کے طور پر بلا بھیجا تو اس نے جواب میں صرف اتنا لکھ دیا کہ "اب مجھکو اپنے حال پر چھوڑ دو" وہ بدورا سے بے نیاز ہو سکا تھا یا نہیں ؟ اس کا صحیح جواب نہیں دیا جا سکتا ۔ لیکن اب اسکی وہ حالت ضرور تھی جس کو شاعر کی اصطلاح میں بے دماغی" کہہ سکتے ہیں اور جس کی بنا پر عشق کا مرتبہ عموماً حسن سے بھی سبقت لیجاتا ہے ۔ دسمبر کا مہینہ آگیا اور بدورا کی شادی ابوالخیر سے ہوگئی جشن تقریب میں کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں ۔ سنا گیا ہے کہ عین اسوقت جبکہ بدورا حجلۂ عروسی میں داخل کیجا رہی تھی کہیں سے بلی کے رونے کی آواز آئی تھی ۔ ہر شخص کانپ گیا تھا ۔ دبی زبان سے ہر جگہ اس کا چرچا ہو رہا تھا مگر کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ اس واقعہ کا علانیہ ذکر کرے

بدورا کو احمد کے ساتھ کمسنی سے جو قلبی ارتباط تھا اس میں کوئی کمی ہوئی تھی یا نہیں اس جگہ اس سے بحث کرنا بے محل اور بیکار ہے ۔ اتنا بتا دینا کافی ہے کہ وہ اپنی شادی سے خوش تھی اور ابوالخیر کو اپنے معیار کا شوہر سمجھ رہی تھی جس سے اسکی بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں ۔

(باقی) مجنوں گورکھپوری

فردوس

اے کاش! کھلیں آنکھیں گہوارۂ عشرت میں
اے کاش! کہ ہوش آئے میخانۂ الفت میں
اے کاش!! پہونچ جاؤں کاشانۂ راحت میں

اے راہ نما لےچل

فردوس محبت میں

خوابیدۂ کاوش تھا بیدار ہوا ہوں میں
شورش گہ ہستی سے بیزار ہوا ہوں میں
دنیا سے نکلنے کو تیار ہوا ہوں میں

اے خضر وفا لےچل

فردوس محبت میں

ہے مشغلۂ دنیا توہین وفاداری
ہر ذرۂ ہستی ہے تصویر دلآزاری
انسان رہے کب تک محو غم خودداری

اے مرد خدا لےچل

فردوس محبت میں

ادبار کی آوازیں پستی کی صدائیں ہیں
غم ریز ہیں نظارے خوں بار خلائیں ہیں
اندھیر ہے دنیا میں تاریک فضائیں ہیں

اے شمع ہدی لےچل

فردوس محبت میں

اب شمع کلیسا میں تنویر نہیں ہوتی
بت خانے میں الفت کی تصویر نہیں باقی!

[illegible]

اے میری دعا لیجل

فردوسِ محبت میں

اس جنتِ زریں میں انوار کے چشمے ہیں
آرام کے دریا ہیں "ایکار" کے سینے ہیں
تقدیس کی نہریں ہیں ایثار کے چشمے ہیں

اے بحرِ عطا لیجل

فردوسِ محبت میں

اس بزم کا ہر گوشہ کاشانۂ راحت ہے
اس خلد کی ہر محفل میخانۂ راحت ہے
اس خاک کا ہر ذرہ افسانۂ راحت ہے

اے خلد نما آ جا

فردوسِ محبت میں

اس دامنِ زریں میں معصوم نظارے ہیں
اس وادیِ رنگیں میں معصوم نظارے ہیں
اس محفلِ تسکیں میں معصوم نظارے ہیں

معصوم وفا لیجل

فردوسِ محبت میں

ہر باغ میں الفت کی نہریں مترنم ہیں
ہر نہر میں عشرت کی موجیں مترنم ہیں
ہر موج میں راحت کی لہریں مترنم ہیں

اے نغمہ سرا لیجل

فردوسِ محبت میں

رنگینیِ الفت سے گلریز ہے ہر گوشہ
فیاضیِ فطرت سے زرخیز ہے ہر گوشہ

ارباب محبت سے لبریز ہے ہر گوشہ

اے شوخ ادا چنچل

فردوس محبت میں

اس "نور" کو راحت کی کرنوں نے بنایا ہے
اس "گیت" کو فطرت کے تاروں نے بنایا ہے
اس خلد کو الفت کے ذروں نے بنایا ہے

اے مست وفا چنچل

فردوس محبت میں

اس باغ کا ہر غنچہ تقدیس کا بوسہ ہے
اس ساز کا ہر نغمہ تسلیم کا سجدہ ہے
اس نور کا ہر شعلہ تسکین کی دنیا ہے

اے ہوش ربا چنچل

فردوس محبت میں

گلبار بہاروں سے شاداب ہے ہر کیاری
انوار کی نہروں سے سیراب ہے ہر کیاری
اک کیف ہے ہر غنچہ اک خواب ہے ہر کیاری

اے روح فزا چنچل

فردوس محبت میں

تغیر و تبدل سے آزاد ہے وہ دنیا
مسرور ہے وہ دنیا سرشار ہے وہ دنیا
آغوش محبت میں آباد ہے وہ دنیا

چل اے مہر چہرہ چنچل

فردوس محبت میں

روشن صدیقی

موت

فطرت کا التفات کہیں! یا جفا کہیں!
انجام بود ہے کہ یہ آغاز نیست ہے!

سنتے ہیں جب عوام کی آہ و بکا کا شور
لیکن ادھر ہے فلسفۂ حال کی پکار

خوابِ گراں سے کیوں اُسے تعبیر کیجیے؟
وابستۂ گہر نمود سے ہے بودِ زندگی

لیکن اگر "نمود" کرشمہ ہے بود کا
حیرت میں ہیں، کہ موت کے منظر کو کیا کہیں!

گوئے فنا کہیں! درِ دادِ بقا کہیں!
جی چاہتا ہے موت کو کوسیں برا کہیں

کیوں موت کو نہ خضرِ رہِ ارتقا کہیں؟
کیوں ہم نہ اس کو پنجۂ مشکل کشا کہیں؟

پھر تو بجا ہے موت کو آفت بلا کہیں
کیوں موت کو نہ زیست کا اک شعبدہ کہیں"

آنکس زندہ است و ندارد حیات را
در حیرتم چہ طور بداند ممات را

امین حزیں

غزلیات

باسط بسوانی

دونوں راہیں چھوڑ دی ہیں ہمنے مشکل دیکھکر — دیر و کعبہ کون جائے۔ وسعت دل دیکھکر

- - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - -

کچھ تو لازم تھا خیال اک ناتواں کا دوستو — ساتھ میرا چھوڑتے۔ دو چار منزل دیکھکر

- - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - -

غور سے دیکھا تو پایا اک جہانِ آرزو — مجھکو حیرت ہوگئی ہے۔ وسعت دل دیکھکر

قیس کو محمل سے لیلا دیکھکر ہنستی رہی — قیس کیوں روتا رہا لیلیٰ کا محمل دیکھکر

اشتیاقِ بزمِ عقبیٰ لیچلا سوے عدم — جب کوئی اکتا گیا۔ دنیا کی محفل دیکھکر

بے بلائے کیوں گئے ہم ان کی بزم ناز میں — بے اٹھائے کیوں اٹھے ہم رنگ محفل دیکھکر

حق بجانب تھا اگر صیاد کو ہوتی خوشی — پھول کیوں ہنسنے لگے خون عنادل دیکھکر

- - - - - - - - - - - - - - - -

باسطِ شوریدہ سر ہنستا رہا بیٹھا ہوا
اور سب روتے تھے اسکی وحشت دل دیکھکر

جگر بریلوی

کوئی برا کہے کچھ مجھکو ناگوار نہیں — کہ دل کے آگے کسی کا گناہگار نہیں

ابھی نہیں ہوئی تکمیل ضبطِ جوشِ جنوں — ٹھہر ٹھہر ابھی خلوت خیال یار نہیں

دعاے مرگ مفاجات ہے یہ دیدہ وہ — ہمیں زمانۂ راحت کا انتظار نہیں

وہ غم تھا داغ کلیجہ میں جس سے باقی ہے — یہ عیش تھا کہ کوئی جس کی یادگار نہیں

- - - - - - - - - - - - - - - -

نگاہ پھیر نہ مجھ سے کہ دل لرزتا ہے — بشر ہوں میں میری ہستی کا اعتبار نہیں

جو پھونک دی نہ کلیجہ نہیں وہ آتشِ گل   جو آگ بھڑکے نہ دل میں لگے بہار نہیں
چل اب خدا کے لئے خاک وقت پہ بلبل   چمن میں اے دلِ ناداں مجھے قرار نہیں

جہاں کا شور ہے کانوں میں نقش آنکھوں میں
نہیں جگر تم ابھی محوِ انتظار نہیں

حافظ غازی پوری

مرے گریہ میں شبِ تارِ غم وہی آہ بے اثر رہی   کہ وہ شمعِ کشتۂ درد ہوں جو نہ جل سکی تو دھری رہی
مجھے دوریوں سے گلہ نہیں کہ ہوں شیدۂ ستم آشنا   جو خیال ہے تو یہی ہے اب نہ وہ پہلی جلوہ گری رہی

- - - - - - - - - - - -

کوئی جلوہ بار جو ہو گیا مری کائنات حقیر پر   تو ازل سے تا بہ ابد مجھے وہی ایک بے خبری رہی
یہ تغیرات و حدوث کیا مرے رنگ بو کو مٹا سکیں   ہوں وہ شاخِ گلشنِ راز میں جو خزاں میں بھی ہری رہی
کہوں کیا وہ خاص تھی کیفیت جو ملی جبینِ نیاز کو   وہی رازدارِ سجود تھی وہی وجہِ بے خبری رہی
نہ وہ ذوق لطفِ سحر ہے اب نہ صبوحیوں میں اثر ہے اب   وہ بہار ایسی گذر گئی کہ کٹوری گل کی بھری رہی
ترے نورِ صاعقہ ریز نے مجھے محوِ حسن کیا مگر   مری چشمِ حرص پسند کو وہی فکرِ کم نظری رہی
کھلے خاک غنچۂ دل مرا کہ خزاں کا دور اب آ گیا   نہ فضا رہی نہ اگلی سی تازگی نہ گلوں میں [illegible] رہی
نہ قرار آیا کوئی گھڑی نہ ہوا نصیب مجھے سکوں   جو بہار آئی تھی باغ میں وہی وجہِ دربدری رہی

ترے دل کی شمع بھڑک اٹھی ہوا اصل میں خاک جگر ترا
تجھے حافظِ "تپشِ آشنا" کبھی فکرِ چارہ گری رہی!!

اثر رامپوری

نگاہوں سے ہوئے اوجھل جو وہ پیشِ نظر ہو کر   ہمارے دل کی دنیا رہ گئی زیر و زبر ہو کر
خدا رکھے تمہاری بزم بھی طرفہ تماشا ہے   جو آتا ہے وہ رہ جاتا ہے سرتاپا نظر ہو کر
زمانہ ہر طرح اہلِ جہاں کا ساتھ دیتا ہے   کسی کا راہزن ہو کر کسی کا راہبر ہو کر
حقیقت بیں نظر سے دیکھ دنیا کی ہر اک شے کو   وہ جب ہے نیست تو حق ہے مگر صورت نگر ہو کر
اثر سے بچ کے جانے کی کوئی حد ہو نہیں سکتی   رہے گا ایک دن نالہ یہ شایانِ اثر ہو کر
کمالِ جذبۂ الفت اگر ہو جائیگا پیدا   رہیگی ایک دل کی دوسرے دل کو خبر ہو کر
چھپے زیرِ نقاب اُنکا جمالِ روئے تاباں کیا   شعاعِ حسن پردہ میں رہے کیوں پردہ در ہو کر

بقدرِ حوصلہ دکھ درد کو بھی میں ترستا ہوں ۔۔۔ کہ رہ جاتا ہے اکثر دردِ دل دردِ جگر ہو کر

آخر جب تک حواسِ ظاہری ہیں پا نہیں سکتا
تلاشِ یار کو ہوش و خرد سے بے خبر ہو کر

ناطق گلاوٹھی

مری تدبیر الٹی ہے تو سیدھا امتحاں کرلوں ۔۔۔ سب بیتا فائدہ کرتے ہیں لاؤ میں یاں کرلوں

اجازت ہو تو اپنی بےبسی کا کچھ بیاں کرلوں ۔۔۔ اسی مُہرِ دہن کو بے زبانی کی زباں کرلوں

پلا ساقی کہ موجِ بےخودی سر سے گزر جائے ۔۔۔ خطِ ساغر کو عرقابی کا اپنی میں نشاں کرلوں

تمنا عیش کی دل کو نہیں دے فرصت ہستی ۔۔۔ اجازت ہو تو تھوڑی دیر میں آہ و فغاں کرلوں

تمہیں کچھ ہاتھ آتا ہو تو میرا کچھ نہیں جاتا ۔۔۔ جو ایسی رائے ہو تو زندگی کو رائیگاں کرلوں

جو ایسا ہو تو آئینِ وفا قانونِ عالم ہو ۔۔۔ جو میرا بس چلے تو میں بتوں کو مہرباں کرلوں

یہ کرنا ہے کہ اب دنیا میں کچھ کرنا نہیں مجھکو ۔۔۔ ہزاروں کام کرنے کے ہیں میں کیا کیا یہاں کرلوں

فنا ہونا تو ہے لیکن ذرا شوقِ فنا دم لے ۔۔۔ میں اپنی موت کو پہلے حیاتِ جاوداں کرلوں

تمہاری بات رد جائے جو تم دمساز ہو جاؤ ۔۔۔ مرا دل چاہتا ہے میں کسی کو رازداں کرلوں

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

مضامین ہائے نو پیدا بہت ہو جائیں گے ناطق
مجھے یہ فکر ہے پہلے کہ پیدا قدرداں کرلوں

باب الاستفسار

معاد

(بسلسلۂ ماہ گزشتہ)

خدا جانے کتنے بیشمار نظام شمسی اور کتنے سیارے اس کائنات میں پائے جاتے ہیں جن کے متعلق انسان کو اگر کوئی علم ہو سکا ہے تو صرف اس قدر کہ ان میں سے بعض اتنی دوری پر واقع ہیں کہ ان کی روشنی ہم تک سیکڑوں سال میں پہونچتی ہے۔ اور یہ کہ روزانہ خدا جانے کتنے سیارے فنا ہو کر نئے ظاہر ہوتے رہتے ہیں پھر جب فضا کی وسعت کا یہ عالم ہے اور اس کے اندر اجرام اور سیاروں کی کثرت کا یہ حال ہے تو یہ سارا نظام بے جان تو ہوگا نہیں، ان میں خدا جانے کس کس قسم کی مخلوق ہوگی، اور اس سے قبل اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کن کن سیاروں کی کس کس نوع کی مخلوق فنا ہو کر بالکل نئی مخلوق پیدا ہوئی ہوگی۔

پھر جب خدا یا قدرت کا یہ معمولی مشغلہ ہے کہ ہزاروں کرے یا سیارے روز بناتے اور بگاڑتے تو کوئی وجہ نہیں کہ زمین ایسے حقیر کرہ کے متعلق وہ کوئی علیحدہ نظام قائم کرے اور یہاں کی مخلوق کو فنا کرنے کے بعد دوبارہ از سر نو زندہ کرے۔ بلحاظ خلق ایک انسان اور حقیر سی چیونٹی دونوں خدا کے نزدیک ایک ہیں، اس لئے اگر وہ حشر و نشر کو انسان کیلئے گوارا کرتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اور دیگر حیوانات و حشرات کو اس سے مستثنیٰ کر دے جبکہ خلق محض کے لحاظ سے خدا کے نزدیک ایک انسان اور معمولی کیڑے کی اہمیت یکساں ہے۔ پھر یہی نہیں بلکہ جملہ کائنات کے تمام ان اجرام کے مخلوقات کا حشر و نشر بھی ماننا ہوگا جو ازل سے ابد تک پائے جائیں اور چونکہ صفت خلق خالق سے کبھی جدا نہیں ہو سکتی اس لئے ظاہر ہے کہ یہ مسلۂ تخلیق لانہایت تک چلا جائیگا۔ اور جملہ مخلوقات کائنات کا حشر و نشر مستلزم ہوگا اس امر کو کہ علاوہ اس کائنات کے ایک اور لانہایت کائنات تسلیم کی جائے جو عالم خلق سے جدا ہو اور اس کا خلاف عقل ہونا ظاہر ہے۔ خدا پیدا کرتا ہے اور فنا کر ڈالتا ہے فنا کر دیتا ہے اور پھر بناتا ہے۔ یہ سلسلہ ازل سے ابد تک چلا جائے گا۔ یہ ایک ایسا سیدھا سا عقیدہ ہے جس سے کسی کو انکار ہی نہیں ہو سکتا اور نہ اس کے ماننے میں کوئی استبعاد عقلی ہے اور نہ محالات کو ممکن ماننا پڑتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ جتنی مخلوقات کو اس نے پیدا کر کے فنا کر دیا ہے (واضح رہے کہ آپ اس میں تخصیص نوع انسان کی نہیں کر سکتے اور نہ اس کے لئے آپ عقلی دلیل پیش کر سکتے ہیں) انھیں کو وہ پھر پیدا کر دیگا اور صرف اس لئے کہ ان سے محاسبہ کرے۔ ان کی پہلی زندگی کے اعمال و افعال کا تو اس سے کوئی نتیجہ نہیں۔ نہیں ہوتا، کیونکہ خود خدا کو جزا و سزا تنبیہ و تادیب سے کوئی فائدہ نہیں اور جن کو جزا سزا دیجائے گی ان کو پھر پہلی زندگی میں واپس کرنا نہیں کہ آئندہ کے لئے اصول عذاب و ثواب کا لحاظ کر کے زندگی بسر کریں۔

خدا کی عظمت و تقدیس کا حقیقی خیال بالکل اس امر کے منافی ہے کہ وہ اپنی کسی مخلوق سے جو ہر لحاظ سے محتاج، بے نوا، مجبور اور خدا کی عظمت کو دیکھتے ہوئے لاشئے محض ہے، کسی نوع کا مطالبہ کرے یا اسپر کسی سختی کو روا رکھے۔ ظاہر ہے کہ جو ہدایات انبیاء کے ذریعہ سے انسان کو پہونچائی گئیں تھیں وہ صرف اسی کے فائدہ کے لئے تھیں، خدا کو ان سے کوئی غرض نہ تھی، اس لئے اگر کسی نے ان پر عمل کر کے فائدہ اٹھایا تو اپنے لئے اور نقصان کیا تو اپنا، لیکن اس نفع و نقصان کو عالم ما بعد الحیات سے متعلق کرنا اور اس میں دوام و خلود کی شان ثابت کرنا اور اسی سلسلہ میں ہزاروں پیچیدہ مسائل پیدا کر کے سادہ فطرت انسانی میں الجھاؤ ڈالنا کسی طرح عقل کے نزدیک قابل قبول نہیں ہے۔

اب اس کے بعد بحث کا پہلو یہ رہجاتا ہے کہ اگر یہ صورت معاد کی نہیں ہے تو پھر کوئی اور صورت ہو سکتی ہے یا نہیں اور جسم سے جدا ہونے کے بعد روح بھی فنا ہو جاتی ہے یا کیا۔

ہر چند علمی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر بحث کرنا مفید یقین نہیں ہو سکتا کیونکہ انسانی علم و استقصار جس درجہ ناقص و نامکمل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، تاہم چونکہ انسان باوجود اس علم کے بھی مجبور ہے کہ وہ اطمینان نفس کے لئے عقل ہی سے کام لے اس لئے اس کو اپنے گزشتہ تجربات پر اعتماد کر کے ہر امر کے متعلق کوئی نہ کوئی حکم لگانا پڑتا ہے کیونکہ بہر حال ریب و شک کی زندگی بسر کرنے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ کوئی ایک مقصود متعین کر لیا جائے خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔

حیات انسانی اور معاد کے مسئلہ کا تعلق عالم طبیعیات سے ہے کیونکہ انسان بھی اسی عالم طبیعی کا ایک مظہر ہے اور اگر مرنے کے بعد اس کا وجود کسی نہ کسی طرح قائم رہا تو اس کا تعلق بھی اسی عالم سے ہوگا اس لئے جب طبیعیات کے اصول سے اس مسئلہ پر غور کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد ہر چند انسان کی وہ شکل و صورت تو قائم نہیں رہتی جو دنیا میں پائی جاتی تھی۔ لیکن بہر حال اس کا وجود کسی ایک سے زیادہ مختلف صورتوں میں پایا جانا چاہئے۔ کیونکہ عالم طبیعی کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو "لاشئے" سے پیدا ہوتی ہو اور پھر معدوم ہو جاتی ہو۔ اس کی صورت کا بدل جانا اس کی صفات کا متغیر ہو جانا حواس سے اس کا شعور نہ ہونا، نگاہ سے اس کا نظر نہ آنا یہ سب ممکن ہے لیکن اس کا بالکل معدوم ہو جانا طبیعیات کے نزدیک محال ہے۔ جب آواز ایسی چیز جس کا بظاہر کہیں وجود نہیں معلوم ہوتا، فنا نہیں ہوتی اور ایتھر کے امواج میں ملی رہتی ہے تو پھر اور اشیاء مادی کا کیا ذکر ہے۔

الغرض ہمارے حواس کا کسی شے کو محسوس نہ کرنا دلیل اس کے عدم وجود کی نہیں ہو سکتی۔ مادہ و قوت کے ساتھ اثیر کا جو تعلق ہوتا ہے وہ مخفی نہیں، لیکن کیا اثیر کے وجود سے انکار ہو سکتا ہے۔ حالانکہ اسے محسوس نہیں کیا جا سکتا سیارات کا ارتباط یہاں تک کہ نظام شمسی کا وجود، تو دکہربائیت کے مظاہر اور جواہر مادی کا مرتبط ہو کر جسم اختیار کر لینا سب اثیر ہی کا کرشمہ ہے اس لئے جب مادہ و قوت جو حقیقتاً ایک ہی چیز ہیں اور صورتوں میں باقی رہتی ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ انسان کی حیات کے مسئلہ میں وہ فانی مان لئے جائیں اور مرنے کے بعد وہ قوت جس نے اسے زندگی بخشی تھی، باقی نہ رہے

لیکن چونکہ مادہ یا قوت تفاعل کے ماتحت ہمیشہ مختلف صورتیں اختیار کرتے رہتے ہیں اس لئے یہ ضروری نہیں کہ انسان مرنے کے بعد انسان ہی رہے اور وہ قوت جو اس میں کام کر رہی تھی کوئی دوسری صورت نہ اختیار کرے۔

یہ ہے رائے اکثر علماء طبیعیات کی، جس سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد انسانی حیات فنا نہیں ہو جاتی بلکہ وہ اور مختلف صورتیں اختیار کر لیتی ہے۔ گویا بالفاظ دیگر یوں سمجھنا چاہئے کہ طبیعیات والے بڑی حد تک تناسخ کے قایل ہیں اور ان کے نقطۂ نظر سے بقاء حیات کی بہترین صورت یہی ہے۔

اب آئیے کلام پاک سے اس معمہ کا حل چاہیں اور غور کریں کہ قیامت، حشر و نشر اور معاد کے متعلق اس نے کیا بتایا ہے۔

کلام مجید میں قیامت کا ذکر بہت کثرت سے آیا ہے لیکن ہم ان آیات کو یہاں نقل کرنا ضروری نہیں سمجھتے بلکہ صرف انکا ماعا و مفہوم مختصراً بیان کرتے ہیں۔ کلام مجید میں جن الفاظ کے ساتھ قیامت کا منظر کھینچا گیا ہے وہ اس میں شک نہیں کہ نہایت ہی ہولناک ہے اور بالکل صحیح ہے۔ کیونکہ جس طرح فضا کے اور بہت سے کرّے فنا ہو چکے ہیں اسی طرح کرۂ ارض بھی ایک نہ ایک دن فنا ہوگا۔ خواہ آفتاب اس کو اپنی طرف کھینچ کر خاک سیاہ کر دے خواہ کسی اور سیارہ سے ٹکرا کر تباہ ہو جائے اور ایسی صورت میں خدا کا یہ فرمانا کہ اس دن زمین ریزہ ریزہ ہو جائے گی، جو کچھ اس کے اندر ہے باہر اگل دیگی، اس کی حالت بالکل بدل جائے گی، وہ کپکپا اٹھیگی بالکل صحیح و درست ہے اسی طرح پہاڑوں کے متعلق یہ فرمانا کہ وہ دھنکی ہوئی اون کے مانند ہو جائیں گے ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ ریت کے ٹیلوں کی طرح نظر آئیں گے بالکل درست ہے اسی طرح خدا نے سمندر کے متعلق بتایا ہے کہ وہ آگ کی طرح بھڑک اٹھیگا اور یہ بھی بالکل یقینی ہے کیونکہ کرۂ ارض کی تباہی کے وقت ان تمام مناظر کا پیش آنا کھلی ہوئی بات ہے، لیکن خدائے پاک نے اس سلسلہ میں صرف کرۂ ارض ہی کی تباہی کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ ---- اذا الشمس کورت واذا النجوم انکدرت کہکر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ زمین کی طرح آفتاب اور دوسرے ستارے بھی تباہ ہو جائیں گے

الغرض کلام مجید میں جس قیامت کا ذکر اس نوع کے انداز بیان سے کیا گیا ہے اس سے مقصود تو وہ عام تباہی ہے جب ہمیشہ کے لئے یہ کرۂ ارض برباد ہو جائیگا اور اس سے مدعا انسان پر اپنی قوت و جبروت اور اس کی بیچارگی و بے بسی کا ظاہر کرنا ہے لیکن اس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ جب یہ ہوگا اس وقت اعمال کی جزا سزا ہوگی، دوزخ جنت کا قصہ شروع ہوگا۔

وہ قیامت جس کا تعلق انسان کی جزا سزا سے ہے اسی وقت سے شروع ہو جاتی ہے جب انسان مرتا ہے اور جس کا ذکر سورۂ قیامہ میں اسطرح کیا گیا ہے۔

یسئل ایان یوم القیامۃ الخ

یہ اعتقاد رکھنا کہ آغاز عالم سے عام تباہی یا قیامت کبریٰ کے وقت تک جتنے آدمی پیدا ہو چکے ہیں وہ سب کے سب عذاب و ثواب کے لئے قیامت کے قبروں سے اٹھائے جائیں گے صحیح نہیں کیونکہ اس کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اگر ایک شخص اپنے اعمال کے لحاظ سے جنت کا مستحق ہو سکتا ہے تو یہ کہاں کا انصاف ہے کہ اس کو اس نعمت سے قیامت کبریٰ کی وقوع تک محروم

رکھا جائے وہ اسی طرح ایک مجرم کو اتنی لمبی فرصت دیدیجائے جبکہ تباہی زمین کے لئے ارب در ارب سال کی مدت بھی بہت کم کہی جاتی ہے۔

کلام پاک میں بعث وحشر کا بھی ذکر متعدد مقامات پر آیا ہے، لیکن ان سے یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ انسان کا جسم بھی اُس کے ساتھ اُٹھایا جائے گا کیونکہ انسان سے مراد اس کا بدن نہیں ہے اور معاد کی حقیقت، بعث ونشر کا بیان، ان لوگوں کے سمجھانے کے لیے تھا جو نفاد روح کے قائل ہونے کی وجہ سے سمجھتے تھے کہ عذاب ثواب کا قصہ یونہی سا ہے اور اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

کلام مجید میں اس کا ذکر صراحتہً موجود ہے ارشاد ہوتا ہے:۔

وقالوا ما هي الا حياتنا الدنيا نموت ونحيي وما يهلكنا الا الدهر وما لهم بذلك من علم ان هم الا يظنون
واذا تتلى عليهم آياتنا بينات ما كان حجتهم الا ان قالوا ائتوا بآبائنا ان كنتم صادقين ○

(وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہے یہی دنیا کی زندگی ہے یہیں مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہم کو زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے۔ اسپر خدا فرماتا ہے کہ اُن کو حقیقت کا علم ہی نہیں یہ ان کا صرف وہم وگمان ہے اور جس وقت اُن کے سامنے ہماری کھلی ہوئی نشانیاں بیان کیجاتی ہیں تو ان کی حجت صرف یہ ہوتی ہے کہ اگر تم سچے ہو تو ہمارے باپ دادا کو جو مر چکے ہیں لے آؤ) یعنی جس وقت ان سے کہا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی ایک زندگی ہوگی جسمیں تمہارے اعمال کی باز پرس ہوگی تو وہ کہتے ہیں کہ اگر مرنے کے بعد جی اُٹھنا صحیح ہی تو ہمارے باپ دادا کو لے آؤ جو مر چکے ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

وقالوا ان هي الا حياتنا الدنيا وما نحن بمبعوثين ولو ترى اذ وقفوا على ربهم قال اليس هذا بالحق قالوا بلى وربنا

یعنی وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہے یہی دنیا کی زندگی ہے اور اس کے بعد ہم کیا اٹھائے جائیں گے لیکن جب تم اپنے خدا کے سامنے کھڑے ہوگے تو خدا تم سے پوچھے گا کہ کیا یہ سچ نہ تھا اور وہ کہیں گے کہ ہاں بیشک سچ تھا۔

تیسری جگہ اور منکرین کا اعتقاد اسی طرح بیان کیا گیا ہے کہ ائذا متنا وکنا ترابا وعظاما ائنا لمدینون ○
یعنی مرنے کے بعد جب مٹی اور ہڈی کے سوا کچھ نہ رہیں گے تو پھر کیا بدلا دئے جائیں گے۔

الغرض اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت لوگوں کا خیال تھا کہ بعث وحشر ناممکن ہے اور مرنے کے بعد سارا قصہ تمام ہوجائیگا نہ اچھے اعمال پر انعام ہوگا نہ بُرے اعمال کی سزا ملیگی۔ اسی اعتقاد کی تردید کلام مجید میں کی گئی ہے کہ مرنے کے بعد یقیناً عذاب وثواب ہوگا، لیکن اس کا ذکر کہیں نہیں ہے کہ حشر بالاجساد ہوگا وہ جسم جو دنیا میں پایا جاتا تھا پھر پیدا ہوگا، بالکل وہی صورت تعلق جسم وروح کے پائی جائے گی جو دنیا میں تھی۔

اللہ تعالیٰ نے حشر کے مفہوم کو مختلف صورتوں سے سمجھایا ہے کسی جگہ ارشاد ہوتا ہے:۔

واللہ انبتکم من الارض نباتا ثم یعید کم فیہا و یخرجکم اخراجاo
(خدا نے اگایا تم کو زمین سے ایک قسم کا اگانا، پھر تم کو اسی زمین میں لیجائے گا اور پھر اسی سے نکالیگا ایک قسم کا نکالنا)
اس آیت میں خدا نے فرمایا ہے کہ ہم نے تم کو زمین سے اگایا ہے حالانکہ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کو نطفہ سے پیدا کیا۔ یہ شبہ پیدا ہوتا ہے، لیکن خدا کا ارشاد بالکل صحیح ہے کیونکہ تمام ذی حیات چیزیں گو ارتقائی مدارج طے کرکے موجودہ حالت پر پہونچی ہیں، لیکن اس میں تو کلام ہو ہی نہیں سکتا کہ ان کی وجہ حیات اصل میں وہی زمین اور اس کے تغیرات ہیں۔ کلام مجید میں جہاں اور آیتوں سے مسئلہ ارتقا ثابت ہوتا ہے وہاں ایک آیت یہ بھی ہے۔
اسلئے جس معنی میں پہلے انسان کا زمین سے پیدا کیا جانا بتایا گیا ہے اسی معنی میں دوبارہ اس کا زمین سے نکلنا ظاہر کیا گیا ہے حقیقتاً نہ پہلے وہ کبھی زمین سے اُگا اور نہ بعد کو کبھی زمین سے پیدا ہوگا۔ اس آیت میں بناتا اور اخراجا کے الفاظ خاص طور پر قابل غور ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُگانے اور نکالنے معمولی صورت مقصود نہیں ہے بلکہ کسی خاص قسم کا اگانا اور نکالنا مقصود ہے اگر حشر میں انسان کی دوسری زندگی بالکل دنیا ہی کی سی زندگی ہوتی اور اسی جسم کیساتھ ہوتی جس سے روح کو پہلے تعلق رہ چکا ہے تو نباتا اور اخراجا کے الفاظ ہرگز استعمال نہ کئے جاتے۔
علاوہ اس کے سورۂ واقعہ کی بعض آیتوں سے یہ امر بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ انسان کے دوبارہ زندہ کئے جانے کی کیا حقیقت ہے اور حشر بالاجساد خدا کا مقصود نہیں ہے۔
سورۂ واقعہ میں پہلے منکرین حشر کا عقیدہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔
ائذا متنا وکنا ترابا و عظاما انا لمبعوثون o
(یعنی مرنے کے بعد جب مٹی اور ہڈی ہوجائیں گے تو پھر کیا اٹھیں گے) اس کے بعد دوبارہ پیدا کرنے کی حقیقت کو خدا اس طرح بیان کرتا ہے:-
نحن خلقناکم فلولا تصدقون افرأیتم ما تمنون - ء انتم تخلقونہ ام نحن الخالقون نحن قدرنا بینکم الموت وما نحن بمسبوقین علیٰ ان نبدل امثالکم وننشئکم فی ما لا تعلمون o
ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ جب ہم نے اول اول تم کو پیدا کیا تو پھر کیوں تصدیق اس کی نہیں کرتے کہ دوبارہ بھی پیدا کرسکتے ہیں، پھر جس طرح ہم نے تم کو پہلے پیدا کیا اور مار ڈالا اسی طرح ہم اس پر بھی قادر ہیں کہ مرنے کے بعد ہم تمہارے امثال و اوصاف کو بدل دیں اور ایسی صورت و حالت میں پیدا کریں جس کا تمہیں کوئی علم نہیں ہے۔
ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ مرنے کے بعد جو زندگی ہوگی وہ بالکل مختلف ہوگی اور بعث و حشر کی جو صورت ہوگی وہ کچھ اور ہی ہوگی جس کو ہم اس وقت نہیں سمجھ سکتے - نبدل امثالکم و ننشئکم فی ما لا تعلمون سے یہ حقیقت بالکل واضح ہوجاتی ہے - اگر حشر انھیں یا ویسے ہی جسموں کے ساتھ ہوتا جو دنیا میں پائے جاتے تھے تو پھر ما لا تعلمون کے الفاظ ارشاد نہ ہوتے۔

حشر اجساد کے قائل سب سے بڑی زبردست دلیل جو اپنے پاس رکھ سکتے ہیں وہ سورۂ قیامہ کی یہ آیات ہیں:-

ایحسب الانسان الن نجمع عظامہ بلیٰ قادرین علیٰ ان نسوی بنانہ

(کیا انسان گمان کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیوں کو اکٹھا نہ کریں گے۔ ہم تو اس پر قادر ہیں کہ انگلیوں کی پور تک درست کر دیں)

لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے حشر اجساد کیونکر ثابت ہو سکتا ہے۔ ان آیات میں خدا نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم ایسا کریں گے بلکہ صرف اپنی قدرت کا اظہار فرمایا ہے کہ ہم ایسا بھی کر سکتے ہیں۔ اصل مقصود یہ تھا کہ پہلے منکرین بعث وحشر کے دل و دماغ میں خدا کی قدرت وعظمت کا خیال قائم کر دیا جائے اور پھر ان کو بتایا جائے کہ حشر و نشر کے بعد عذاب وثواب کا طاری کیا جانا ناممکن نہیں ہے اور اس کے لئے خدا کو اختیار ہے۔ جس صورت وحالت میں چاہے تمہیں تبدیل کر دے۔ (جیسا کہ اس سے قبل کی آیت میں بتایا گیا ہے) سورۂ حج کی ابتدائی آیات بھی حشر اجساد کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہیں، جن میں "ان زلزلۃ الساعۃ شیٔ عظیم" کہکر قیامت کی پیشین گوئی کی گئی ہے اور پھر انسان کی پیدائش، عہد طفلی، جوانی، ضعیفی اور موت کا ذکر کرکے، دوسرے زمین اور پھر بارش کے بعد اس سے نباتات کے اگنے کا بیان کیا گیا ہے اور اس کے بعد مردہ کو زندہ کرنے کا دعویٰ کرکے ارشاد ہوتا ہے۔ وان الساعۃ لاریب فیھا وان اللہ یبعث من فی القبور (مخصوص ساعت بیشک آنے والی ہے اور اللہ اٹھائے گا ان کو جو قبروں میں ہیں)

بظاہر ان آیات سے بالکل کھلے طور پر انسان کا مع جسم کے قبروں سے اٹھنا ثابت ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان آیات میں کہیں قیامت کا ذکر نہیں ہے، بلکہ پیشین گوئی کی گئی ہے اس امر کی کہ رسول اللہ کے دشمن پامال ہوں گے اور آخر کار اسلام کی فتح ہوگی یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جن کی طرف سے ہدایت کی کوئی توقع نہیں ہے وہ بھی راہ راست پر آجائیں گے۔ من فی القبور سے وہ انسان مراد ہیں جو نہایت جہل وتاریکی میں مبتلا ہیں۔ کلام مجید میں اور جگہ بھی یہی مفہوم ان الفاظ سے لیا گیا ہے اور احیاء سے صاحب ایمان اور اموات سے کفار مراد لئے گئے ہیں، چنانچہ سورہ فاطر میں ارشاد ہوتا ہے۔

وما یستوی الاحیاء والاموات۔ ان اللہ یسمع من یشاء وما انت بمسمع من فی القبور۔ ان انت الا نذیر

یعنی زندہ اور مردے برابر نہیں ہو سکتے اللہ جس کو چاہے سنا سکتا ہے اور تم ان کو نہیں سنا سکتے جو قبروں میں ہیں۔ تم تو صرف اطلاع دیدینے والے ہو۔ نہ صرف اخیر کی آیت بلکہ ماقبل کی آیات سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہاں من فی القبور سے مراد کفار و فجار ہیں۔

کلام مجید میں یوم قیامت کے لئے اور بھی بہت سے لفظ استعمال کئے گئے ہیں، لیکن ان میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ بعث وحشر، نشر و قیامت، سے واقعی حشر اجساد مراد ہے۔ وہ لوگ جو معاد کے لئے حشر اجساد کو ضروری خیال کرتے ہیں ان میں زیادہ حصہ ان حضرات کا ہے جو صرف منقولات کو پیش نظر رکھتے ہیں اور بغیر کسی تاویل کے اس کو وہی سمجھنا چاہتے ہیں جو الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے، اور کمتر حصہ ان لوگوں کا ہے جو از روئے عقل بھی اس کو ضروری خیال

کرتے ہوں۔ لیکن انھوں نے اگر فلسفۂ لذت و الم پر غور کیا ہوتا تو وہ شاید حشر اجساد کو ضروری نہ قرار دیتے کیونکہ جسم انسانی صرف ایک آلہ ہے جس کے ذریعہ سے روح انسانی یا نفس انسانی تمام کام کرتا ہے اور آلہ کبھی مسؤل و ذمہ دار شے قرار نہیں دیا جا سکتا، زندگی میں اعمال نیک و بد کا صدور حقیقتاً جوارح سے نہیں ہوتا بلکہ نفس و روح کے ارادہ سے ہوتا ہے اور مسرت و الم، الطاف و تکالیف کا احساس بھی اسی کو ہوتا ہے، اس لئے اگر کوئی چیز مستوجب سزا یا جزا کی ہو سکتی ہے تو وہ روح انسانی ہے نہ کہ جسم انسانی۔ مرنے کے بعد جسم موجود رہتا ہو لیکن چونکہ نفس و روح کا تعلق اس سے باقی نہیں رہتا اس لئے وہ بالکل مثل جماد سمجھا جاتا ہے اور اسے کوئی حس نہیں ہوتی۔ اس لئے حشر اجساد کے قایل وہی لوگ ہیں، جو یہ سمجھتے ہیں کہ روح انسانی اپنے احساس کے لئے جسم کی محتاج ہے اور ادراک محض نام ہے جوارح کے متاثر ہونے کا۔ حالانکہ ہمارا روزانہ کا تجربہ اس کے منافی ہے۔ اگر حشر اجساد کو ضروری خیال کیا جائے اور اس کو صرف کرۂ ارض کے انسانوں ہی تک محدود رکھا جائے تو اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں، ایک تو یہ کہ مرنے کے بعد ہی اس کی قیامت کا آغاز مان کر یہ تسلیم کیا جائے کہ وہ مرنے کے بعد ہی پھر اپنے جسم کے ساتھ اُٹھ بیٹھتا ہے، لیکن اس کو حشر اجساد والے بھی تسلیم نہیں کرتے اس لئے لازم آیا کہ اس کے لئے اس قیامت کبریٰ کا انتظار کرنا پڑے گا جب یہ سارا کرہ تباہ ہو جائیگا اور کوئی متنفس زندہ نہ رہیگا۔ ایسا ماننے میں سب سے پہلا اعتراض یہ ہوگا کہ اس وقت تک کہ قیامت کبریٰ قائم ہو (جس کو ابھی اربوں سال کا زمانہ ہے) تمام وہ انسان جو آغاز عالم سے اس کی انتہا تک مر چکے ہوں گے، کہاں اور کس عالم میں رہیں گے۔ اگر یہ اس وقت تک روحانی عالم میں رہیں گے تو اپنے اپنے اعمال کے مطابق راحت و تکلیف میں رہیں گے یا نہیں، اس سے انکار نہیں ہو سکتا کیونکہ اتنا بڑا زمانہ بیکار عالم تعطل میں بغیر کسی احساس لذت و الم کے گزر جانا خلاف عقل ہے اور اگر اس کو تسلیم کیا جائے تو پھر یہ بھی ماننا پڑیگا کہ اس زمانہ میں جو عذاب و ثواب ہوا وہ بغیر جسم کے ہوا (کیونکہ حشر اجساد تو اسی قیامت کبریٰ کے وقت ہوگا۔) اس لئے جب اتنا زمانہ بغیر جسم کے قید کے عذاب و ثواب یا لذت و الم میں گزر گیا تو آئندہ بھی حشر اجساد کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

اس کے علاوہ اگر حشر اجساد کو ضروری قرار دیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ انسان کی شروع آبادی سے لیکر اس کے اختتام تک جتنے انسان پیدا ہو چکے ہیں سب کا حشر ہو اور وہ سب کے سب اپنے جسموں کے ساتھ اُٹھیں۔ پھر چونکہ جسم کے لئے مکان ضروری ہے اس لئے کھلی ہوئی بات ہے کہ جسم کے قیام کے لئے تمام اسی فضا کی ضرورت ہوگی جو دنیا میں پائی جاتی تھی اور اگر ایک ایک مرتبہ کے صرف کھڑے ہونے کے لئے ایک ایک فٹ زمین کی ضرورت ہو تو بھی جتنے آدمی پیدا ہو کر مر چکے ہیں اور آئندہ مرینگے کہ اگر لاکھوں کرۂ زمین ہوں تو بھی وہ کافی نہیں ہو سکتے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ حشر نشر کے لئے اور بہت سے کرے تیار کئے جائیں گے تو آیا وہ اسی نظام شمسی کے ماتحت ہوں گے یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ نظام شمسی یہ نہ ہوگا کیونکہ کلام مجید میں کرۂ شمس کی بھی تباہی کا بیان ہے۔ اب اگر کوئی دوسرا نظام شمسی ہوگا تو حشر و نشر کے لئے جو کرے بنائے جائیں گے وہ اسی شمس کے اجزا ہونگے جس سے وہ متعلق ہیں یا کسی اور کے۔ اگر وہ اسی کے اجزا ہوں گے تو ظاہر ہے کہ ان کے قابل آبادی بننے کے لئے اربوں سال

ان پر پہلے گزر چکے ہوں گے اور وہ اس وقت بھی موجود ہوں گے اور غالباً ایسی ہی حالت میں ہوں گے۔ بہرحال اگر ہم اس کو تسلیم کرلیں کہ لاکھوں بلکہ کروروں کُرے اور حشر ونشر کے لئے مہیا ہو سکتے ہیں تو ہم کو ماننا پڑے گا کہ جسوقت کرۂ زمین تباہ ہوگی تو اس کے سارے مُردے اور لاکھوں کُروں میں تقسیم کردئے جائیں گے جہاں وہ اپنا جسم لیکر اُٹھیں گے اور چونکہ ان کُروں میں یہ اہلیت ہوگی کہ انسانی جسمانی آبادی کو اپنے اندر قائم رکھ سکیں اس لئے ضرور ہے کہ ان میں بھی پہلے سے آثار حیات و آبادی پیدا ہو چکے ہوں گے، تو کیا زمین کے مُردوں کے لئے وہاں کی آبادیوں کو پہلے فنا کر دینا پڑے گا۔ اگر اس کا جواب اثبات میں ہوتا تو خلاف عقل و انصاف ہے اور اگر نفی میں ہو تو پھر مُردوں کی سمائی کیونکر ہوگی۔ اور اگر ہم اسے بھی مان لیں کہ خدا محض حشر ونشر انسان کے لئے بہت سے خالی کُرے پہلے سے طیار کر رکھیگا تو بھی اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ کُرے کسی نہ کسی دن فنا ہوں گے اور اُنہیں کے ساتھ جنت و دوزخ فنا ہو جائیں گی، کیونکہ بہرحال عذاب و ثواب کا قصہ بھی اُنھیں کُروں میں ہوگا اور وہیں تمام درجات بہشت و دوزخ کے قائم کئے جائیں گے۔

الغرض حشر اجساد کے ماننے کے بعد ایک سلسلہ بہت سی خلاف عقل باتوں کا قائم کرنا پڑیگا جن کی کوئی علمی توجیہ نہیں ہو سکتی اگر یہ کہا جائے کہ خدا ایسی قدرت ہے کہ زمین ہی کو اتنا وسیع کردے کہ سب مُردے اس میں سما جائیں، اور پھر اس کو غیر فانی بنادے تو کہنے والا یہ بھی کہہ سکتا ہو کہ کیا خدا میں یہ قدرت نہیں ہے کہ بغیر جسم پیدا کئے ہوئے محض روح انسانی پر عذاب و ثواب کی کیفیات طاری کردے۔ خدا کے تمام کام ایک خاص نظام کے ماتحت ہیں اور اس کی قدرت کا انتہائی منظر یہ ہے کہ وہ کبھی اس نظام میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا۔ اگر اس نے جسم کے لئے مکان کو ضروری قرار دیا ہے تو اُس کے یہ معنے ہیں کہ جسم جب اور جہاں کہیں ہوگا اُس کے لئے مکان کی ضرورت ہوگی اور یہ ناممکن ہے کہ حشر اجساد ہو اور مکان کی ضرورت نہ ہو۔ پھر مکان کے وجود کے لئے جو شرائط و اسباب خدا نے ضروری قرار دیئے ہیں وہ ہمیشہ ہر مکان کے لئے ضروری رہیں گے اور ان میں کبھی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ الغرض حشر اجساد ماننے کے بعد ایک لامتناہی سلسلہ خلاف عقل، خلاف اصول خلق ماننا پڑتا ہے اور روحانی عذاب و ثواب کے تسلیم کرنے میں یہ بات پیدا نہیں ہوتی۔ اگر اجساد کے ساتھ عذاب و ثواب کی کوئی صورت ممکن ہو سکتی ہے تو وہ صرف تناسخ ہے اور حشر اجساد کے تسلیم کرنے سے کہیں بہتر یہ ہے کہ تناسخ کو تسلیم کیا جائے۔

اس میں شک نہیں کہ کلام مجید میں دوزخ و جنت کا بیان اسی طرح کیا گیا ہے جیسے وہ کوئی مادی چیزیں ہوں، لیکن اس بیان کو حقیقت سمجھنا سخت غلطی ہے۔ ان میں اکثر جگہ تو مقصود دنیا ہی کی کامیابی و ناکامیابی کو ظاہر کرنا ہے اور یہیں کے نعائم و لذائذ اور شدائد و مصائب کو خاص انداز سے بیان کیا ہے اور کہیں کہیں اگر یہ بیانات حیات بعد الموت سے متعلق ہیں تو صرف بطریق مجاز ہیں اور لوگوں کو سمجھانے کے لئے۔

عرب کے لوگ عورت، شہد، دودھ سونا، چاندی، جواہرات پر جان دیتے تھے اور ان کے نزدیک ان اشیاء سے زیادہ کوئی چیز محبوب تھی ہی نہیں، اس لئے اگر ان کی ترغیب کے لئے صرف یہ کہدیا جاتا کہ اچھے کاموں کا بدلا ایک روحانی مسرت

کی صورت میں پایا جائیگا تو وہ بالکل اس کو نہ سمجھتے اور کبھی اچھے کاموں کی طرف مائل نہ ہوتے۔ اسی طرح چونکہ وہ نظرتاً بہت سخت مزاج واقع ہوئے تھے اور لوگوں کو سزا دینے کے لئے آگ سے جلا دینا۔ گرم پتھروں پر لٹا دینا اور اسی طرح کی اور صورتیں اختیار کرنا معمولی بات تھی اس لئے ان کے سامنے دوزخ کا بیان اس طرح کیا گیا کہ وہاں دہکتی ہوئی آگ ہوگی، اژدہے ہوں گے، انگارے کھانے پڑیں گے، خون پیپ پینا پڑیگا وغیرہ وغیرہ۔ اگر ان سے یہ کہدیا جاتا کہ بُرے کاموں کے عوض تم روحانی عذاب میں مبتلا کئے جاؤ گے تو ان پر کوئی اثر نہ ہوتا کیونکہ روح کے احساس شدید اور اس کے تاثر و تاذی کی حقیقت سے وہ بالکل ناواقف تھے۔ چاندی سونے، موتی اور ہیرے کی قدر تو دنیا میں ہے اور صرف اس لئے کہ ان سے ہم کو کثیر مادی نفع پہونچ سکتا ہے، لیکن مرنے کے بعد جب مادیات کا قصہ ہی ختم ہو جائیگا، یہ چیزیں کیا لطف دے سکتی ہیں، شہد، دودھ خدا کی کوئی اتنی بڑی نعمت نہیں ہے کہ ساری چیزوں کو چھوڑ کر انھیں کا انتخاب کیا جاتا لیکن چونکہ اہل عرب کے نزدیک وہی سب سے زیادہ محبوب تھیں اس لئے ان کو سمجھانے کے لئے ان کا ذکر کیا گیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اسلام صرف اہل عرب کے لئے تو نہیں تھا کہ ان کے ذوق کا خیال رکھا گیا تو اس کا جواب نہایت آسان ہے اور وہ یہ کہ جہاں خدا نے دوزخ جنت کی حقیقت کو امثال کی صورت میں بیان کیا ہے وہیں اُن کی فلسفیانہ حقیقت کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ بہشت کی ماہیت اس طرح بیان ہوتی ہے فلا تعلم نفس ما اخفی لھم من قرۃ اعین جزاء بما کانوا یعملون ہ یعنی خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اُن کے اعمال نیک کے عوض میں کونسی راحت مقرر کی گئی ہے۔ اسی طرح دوزخ کی آگ کی حقیقت کو یوں واضح فرمایا ہے :-

نار اللہ الموقدۃ التی تطلع علی الافئدۃ ہ یعنی دوزخ وہ خدائی آگ ہے جو قلوب انسانی کے اوپر مستولی ہوگی اگر دوزخ کی آگ سے مراد یہی ظاہری و معمولی آگ ہوتی تو کبھی ایسا ارشاد نہ ہوتا۔

اگر اسی کے ساتھ احادیث پر غور کیا جائے تو ہمیں ان سے بھی اسی حقیقت کا پتہ چلتا ہے چنانچہ رسول اللہ کا ارشاد ہے قال اللہ تعالیٰ اعددت لعبادی الصالحین ما لا عین رأت، ولا اذن سمعت ولا خطر علی قلب بشر۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے نیک بندوں کے لئے وہ چیز تیار کی ہے جسے نہ انسانی آنکھ نے دیکھا، نہ کان نے سُنا اور نہ کسی کے دل میں اس کا خیال گزرا۔ اگر جنت کی حوروں، شہد دودھ کی نہروں سے واقعی وہی چیزیں مراد ہوتیں جو الفاظ سے ظاہر ہوتی ہیں تو ان میں سے کونسی چیز وہ ہے جس کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ نہ آنکھوں نے دیکھا اور نہ کانوں نے سُنا اور لا خطر علی قلب بشر۔

ظاہر ہے کہ وہ مادی دنیا کی چیز ہی نہیں ہو اور جس کا احساس دنیا سے علحدہ ہونے ہی پر ہو سکتا ہے۔ چونکہ انسان اس دنیا کے تجربات لذت و الم سے آشنا ہو کر اس قدر تنگ خیال ہو گیا ہے کہ اس کی سمجھ ہی میں نہیں آسکتا کہ جسم سے مجرد ہونے کی حالت میں کیونکر راحت و تکلیف محسوس ہو سکتی ہے اس لئے کلام مجید نے بھی عموماً وہی انداز بیان اختیار کیا جس کو لوگ سمجھ سکتے لیکن چونکہ اسلام کو سارے عالم کا مذہب ہونا تھا اس لئے اہل فہم کے لئے کہیں کہیں وہ نکات بھی بیان کر دئے جو اہل عقل کے لئے باعث رشد و ہدایت ہو سکتے ہیں اور جو واقعی حقیقیات سے بحث کرتے ہیں۔

نیاز

معلومات

زلزلہ

خدا جانے کتنے نوامیس فطرت اور مظاہر قدرت ایسے ہیں جن کا صحیح علم انسان کو نہیں ہو سکا ہے اور انھیں میں سے ایک زلزلہ بھی ہے۔ زلزلہ کی حقیقت کا علم نہایت دشوار ہے کیونکہ جس وقت وہ آتا ہے تو ہر شخص اپنی جگہ بدحواس ہو جاتا ہے اور اس کو اتنا اطمینان کیسے نصیب ہو سکتا ہے کہ بیٹھ کر اس کے حدوث کی حقیقت پر غور کرے۔

حال ہی میں ایک پروفیسر نے ۱۸۴۳ء اور ۱۹۰۳ء کے درمیان ایک ہزار زلزلوں کا نقشہ مرتب کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ روزانہ دو زلزلوں کا اوسط پڑتا ہے۔ لیکن محسوس نہیں کیا جاتا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ انسان زلزلہ کی کیفیت کو اسوقت محسوس کرتا ہے جب ۱/۱۶ انچ کی مقدار یا زیادہ زمین میں حرکت پیدا ہو اور یہ حرکت ہر جگہ نہیں ہوتی۔

زلزلہ کی علامتیں کیا ہیں:-

(۱) آواز۔ اول اول زمین کے نیچے توپوں کے سر ہونے کی آواز آتی ہے اور کبھی ڈھول بجنے کی۔

(۲) اس آواز کے ساتھ ہی یا اس کے بعد زمین میں جنبش ہوتی ہے اور کبھی یہ جنبش اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ بڑے بڑے مکان گر جاتے ہیں۔

(۳) یہ حرکت یا تو عمودی ہوتی ہے اوپر کی طرف سے نیچے کی جانب یا افقی ہوتی ہے ایک طرف سے دوسری طرف اور کبھی چکر دار کھائی کی طرح ہوتی ہے۔

(۴) زمین میں ہر جگہ جنبش نہیں ہوتی بلکہ وہ کسی خاص مرکزی جگہ پر ہوتی ہے اور پھر چاروں طرف اس طرح پھیل جاتی ہے جیسے ساکن پانی میں ڈھیلا پھینکنے سے لہریں پیدا ہوں۔

زلزلہ کی موج کی رفتار مختلف ہوتی ہے۔ اگر کسی چٹانی یا پتھریلی زمین میں زلزلہ آئے گا اور زلزلہ کا مرکز عمیق ہوگا تو زلزلہ کی موج کی رفتار ۱۰ میل فی منٹ ہوگی کبھی کبھی ۱۸۰ میل تک بھی پہونچ جاتی ہے اور یہ رفتار موج کی طرح چاروں طرف یکساں پھیلتی ہے۔ زلزلہ کا مشہور سبب وہ تغیرات بیان کئے جاتے ہیں جو زمین کی سطح میں ہوتے رہتے ہیں۔ زمین کا چھلکا یا بالائی سطح بہت بڑی اور وزنی ہے جو مرکز زمین کی طرف کھینچی رہتی ہے اور زمین کا اندرونی حصہ خروج حرارت کی وجہ سے ہر وقت سکڑتا رہتا ہے اس لئے اس کیفیت سے زلزلہ پیدا ہوتا ہے اور چٹانیں پھٹ جاتی ہیں، چنانچہ جن مقامات میں پہاڑ نہیں ہیں اور زمین ریتلی ہے وہاں زلزلہ کا اثر بہت کم یا بالکل محسوس نہیں ہوتا۔

اس سے قبل یہ خیال کیا جاتا تھا کہ زلزلہ کا سبب کوہ آتش فشاں کا وجود ہے، لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ کوہ آتش فشاں کی آتش فشانی خود زلزلہ کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔ کبھی کبھی شاید آندھی بھی زلزلہ کا باعث ہوتی۔ چنانچہ امریکہ کے ماہر زلزلہ ٹنڈرف کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ بحر اوقیانوس میں سخت آندھی چلی جس سے سواحل امریکہ کو ایسی شدت کے جھٹکے لگیں کہ زلزلہ محسوس ہونے لگا، لیکن ایسی

مثالیں شاذونادر ہوتی ہیں۔

اگر زلزلہ کا مرکز سمندر کی گہرائی میں ساحل سے قریب ہوتا ہے تو نہایت بڑی بڑی لہریں اُٹھکر ساحل سے ٹکراتی ہیں اور تباہیاں پھیلادیتی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ قعرِ بحر مرکز زلزلہ کے قریب تموج میں آتا ہے اور یہ تموج اس قدر شدید ہوتا ہے کہ پچاس پچاس فٹ کی بلند اور سیکڑوں میل کی لمبی لہریں پیدا ہونے لگتی ہیں۔

۱۷۵۵ء میں پرتگال میں ساحل سے سو میل کے فاصلہ پر سمندر میں زلزلہ پیدا ہوا اور آدھے گھنٹے کے اندر ساٹھ ساٹھ فیٹ کی اونچی لہریں ساحل سے آکر ٹکرانے لگیں۔ جس سے ۶۴ ہزار جانوں کا نقصان ہوا۔ اسی طرح ۱۸۵۴ء میں جب جاپان میں زلزلہ آیا تو اس کا مرکز بھی سمندر ہی تھا جو ساحل سے ۰۰ ا میل کے فاصلہ پر تھا اور جس کا اثر یہ ہوا کہ آئرلینڈ کے ساحل پر بھی ۵ فٹ اونچی لہریں پیدا ہوگئیں۔

اسی طرح ۱۸۶۸ء میں پیرو کے ساحل پر زلزلہ آیا جس کا مرکز سمندر تھا اور پانچ منٹ کے اندر عام تباہیاں پھیلا گیا۔

ڈاک کے عجائب

لندن کا محکمۂ ڈاک ریل سے صدر ڈاک خانہ تک ڈاک کے تھیلے لیجانے کے لئے زیر زمین ریل کا استعمال کرتا ہے تاکہ لوگوں کا ہجوم حارج نہ ہو۔ یہ ریلیں بغیر ڈرائیور کے صرف میکانکی ذریعے سے چلتی ہیں اور روزانہ ۳۰ ہزار تھیلے پہونچاتی ہیں۔ ریل کی پٹری کی لمبائی ۶½ میل ہے اور ۷۰ فٹ زمین کے اندر سرنگ میں واقع ہے۔ یہ سرنگ گزشتہ جنگ کے دوران میں طیار کی گئی تھی تاکہ لندن کے عجائب خانہ کی تمام قیمتی چیزیں اس میں محفوظ کردی جائیں اور بم کے گولے ان پر اثر نہ کریں۔

چیونٹی اور آگ

فرانس کی ایک خاتون مرگریٹ نے دریافت کیا ہے کہ چیونٹیوں میں ایک خاص جماعت آگ بجھانے کے لئے بھی ہوتی ہے جہاں چیونٹیوں کے بھٹ ہوتے ہیں وہاں ایک لکڑی جلاکر خاتون مذکور نے ذرا بلند مقام پر رکھدی۔ تھوڑی دیر کے بعد دیکھا گیا کہ ایک جماعت چیونٹیوں کی نکلی اور کوئی رقیق سا مادہ چھڑک چھڑک کر اُسے ٹھنڈا کردیا۔ ان میں بعض جلکر مر بھی گئیں یہ بھی دیکھا گیا کہ جو چیونٹیاں آگ میں گر گئی تھیں ان میں سے بعض کو دوسری چیونٹیوں نے نکال لیا اور پھر آگ بجھانے میں مصروف ہوگئیں۔

بجلی کے اشتہار

برقی روشنی کے ذریعہ سے اعلانات و اشتہار کا رواج بڑھتا جاتا ہے۔ نیویارک کے ایک جزیرہ منتھان میں اندازہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہاں ۱۲ ہزار اشتہارات کیلئے تقریباً ۱۳ لاکھ برقی قمقمے استعمال کئے جاتے ہیں ایک کمپنی نے یہاں ایک ہوٹل صرف اس لئے خریدا کیا کہ اس کو صرف برقی اشتہارات کیلئے کام میں لائے۔ کیونکہ اس کے نزدیک ان اشتہارات کے ذریعہ سے جو آمدنی ہوگی وہ ہوٹل کی آمدنی سے زیادہ ہوگی۔

انیمیا کا علاج

انیمیا (خون کی کمی) ایک بیماری ہے جسمیں خون کی تولید کم ہوجاتی ہے اور انسان دُبلا ہوتا جاتا ہے۔ جرمنی کے ایک ڈاکٹر شلنگ نے اس کا ایک عجیب وغریب اور نہایت مجرب علاج دریافت کیا ہے۔

اور وہ یہ ہے کہ مریض کو گائے کی کچی کلیجی کھلائی جائے

ڈاکٹر موصوف کا بیان ہے کہ اُس نے اس طرح ۹۴ مریضوں کا علاج کیا جن میں سے ۹۰ بالکل صحتیاب ہو گئے۔ باقی چار اور بیماریوں میں مبتلا ہو کر مر گئے۔

قطب جنوبی کی برف جرمنی کے ایک پروفیسر مینارڈس کا بیان ہے کہ قطب جنوبی کے چاروں طرف جمی ہوئی برف کی مقدار اتنی زبردست ہے کہ اس سے سارے کرۂ ارض پر ۲۰۰ انٹ کی موٹی چادر بچھائی جا سکتی ہے اور اگر یہ پگھل جائے تو سمندروں کی سطح ۱۰۰ انٹ بلند ہو جائے۔ اُس کے خیال میں اس کا وزن .... ۲ ٹن ہے۔ اس کا بیان ہے کہ قطب شمالی کی طرف جو برف پوش پہاڑ نظر آتے ہیں، وہ پہاڑ نہیں ہیں بلکہ یہی منجمد برف ہے جس کی تہوں نے ایک دوسرے پر چڑھکر پہاڑوں کی صورت اختیار کر لی ہے۔

سب سے بڑا جہاز فرانس کی ایک کمپنی نے سال گزشتہ ایک دخانی جہاز ۷۳ ہزار ٹن وزن کا تیار کیا جو فرانس اور امریکہ کے درمیان چلتا ہے۔ ایک اور کمپنی نے ۷۴ ہزار ٹن کا جہاز بنایا جو جرمنی اور نیویارک کے درمیان سفر کرتا ہے، ہرچند یہ دونوں جہاز انگریزی جہاز مجسٹک اور برنگاریا کو نہیں پہونچتے جو ۵۶ ہزار اور ۵۲ ہزار ٹن کے ہیں لیکن یہ دونوں جہاز برطانیہ کے بنے ہوئے نہیں ہیں بلکہ جرمنی کے ہیں جن پر برطانیہ قابض ہو گیا ہے۔

کونارڈ کمپنی نے اب ایک اور جہاز بنانا شروع کیا ہے جس کا وزن ۷۰ ہزار ٹن کا ہوگا اور اس کی لمبائی ۱۰۰۰ انٹ ہوگی اس میں ۵ ہزار مسافر آ سکیں گے۔ ایک اور جہاز طیار ہو رہا ہے جو مجسٹک جہاز سے زیادہ شاندار اور تیز رفتار ہوگا۔ ان دونوں جہازوں کی لاگت کا اندازہ گیارہ ملین گنی (تقریباً پندرہ کروڑ روپیہ) کیا جاتا ہے۔

اعلیحضرت شاہ افغانستان کا دلچسپ سفرنامہ

یہ سفرنامہ ... اور ... کے ... ہندوستان ... مصر ... اٹلی فرانس جرمنی انگلستان روس اور بعض مشرقی ممالک ... سیاست ... حالات ... شاہ امان اللہ خان ... کتاب میں ... واقعات ... یورپ کے اندرونی حالات ... تمدن و معاشرت کی ... دلچسپ ... افغانستان کی ... کتاب کی ...

بعد سفر
سفر یورپ کی غرض
کابل سے ... کا نظارہ
ہندوستان میں ...
کراچی میں ...
کی پرجوش تقریر

... ملاقات
... تعلقات ...
... حالات مصر

... روم ...
فرانس ...
پیرس ...

... انکشاف حقیقت

... ترکی میں ...
... استقلال
... کار گزاری

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴　　جلد ۱۴ - شمارہ ۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نگار

لکھنؤ سے ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شایع ہوتا ہے قیمت سالانہ للعہ ہندوستان سے باہر علاوہ محصول للعہ

فہرست مضامین اگست ۱۹۲۸ء

مضمون	مصنف	صفحہ
ملاحظات	نیاز فتحپوری	۲
قایم چاندپوری	ابوالمنعم سعیدی بی اے	۵
فلسفۂ مذہب	سید مقبول احمد بی اے	۱۹
من درچہ خیالیم و فلک در چہ خیال (افسانہ)	مجنوں گورکھپوری	۲۹
شاہان بہمنیہ	تمکین کاظمی	۴۳
قابل رشک خودکشی (افسانہ)	فخر نظامی حیدرآبادی	۵۷
گزشتہ ماہ کا مضمون فلسفہ مذہب	نیاز فتحپوری	۶۵
مراثی انیس کا حیدرآبادی اڈیشن	نیاز فتحپوری	۷۰
باب الاستفسار	نیاز فتحپوری	۷۴
حصۂ نظم :-	نظامی بچھرایونی	۷۷
	آسی	
	روش صدیقی	۷۹
	حافظ غازیپوری	۸۱
	ابن حزیں ذوقی	۸۴
ڈائری کا ایک ورق	نیاز فتحپوری	۸۵
اقتباسات و معلومات	"	۸۹-۹۶



اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۱۴ | اگست ۱۹۲۸ء | شمار ۲

ملاحظات

آج مسئلہ نسائیات کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ "مدرسہ و خانقاہ" کے گوشوں سے بھی اس پر رائے زنی کی جا رہی ہے اور موج کا رخ یہ ہے کہ وہی کتب مذہبی جن سے پہلے عورتوں کے لئے "زنجیر سلاسل، قید و بند" کے احکام کا استخراج ہوتا تھا، اب انھیں سے یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ موجودہ پردہ کا استبداد ایک لعنت ہے اور یکسر تعلیمات اسلام کے منافی۔ اس سے قبل نگار میں بہ سلسلۂ استفسار میں نے عرض کیا تھا کہ کلام مجید سے پردہ کے متعلق جو احکام مستنبط ہو سکتے ہیں وہ یہ ہیں کہ:-

(۱) عورتیں چار دیواری کے اندر بند نہ کی جائیں۔

(۲) مناسب و ضروری پردہ کے ساتھ وہ باہر نکل سکتی ہیں۔

(۳) پردہ ایسا ہونا چاہئے جس سے آرائش ظاہر نہ ہو۔ اس لئے ہمارے یہاں کا موجودہ برقع عین اسی حکم کے مطابق ہے۔

(۴) اگر کوئی ایسا حصۂ جسم کھل جائے جس کا چلنے میں کھل جانا اور اس طرح اسکی زینت کا ظاہر ہو جانا ناگزیر ہے (جیسے ہاتھ پانوں) تو کوئی حرج نہیں۔

لیکن میری اسی معتدل تحریر پر ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ آج جناب عبدالماجد صاحب دریابادی پردہ کے متعلق ایک استفسار کا جواب دیتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں کہ عورت کا چہرہ چھپانے کی چیز نہیں اور اسلام نے اجازت دی ہے کہ وہ برافگندہ نقاب جہاں چاہے پھرے۔ لیجئے "قصہ ہی طے ہوا میں و تو کی نزاع کا"۔

اس کے آگے اب مطالبۂ "ہل من مزید" کے لئے صرف ایک ہی چیز رہجاتی ہے اور کیا عجب ہے کہ اگر کل کو ثریا بیگم (ملکۂ افغانستان) عریاں لباس رقص میں نمودار ہوجائیں، تو عبدالماجد صاحب یہ فتویٰ بھی صادر کردیں کہ جب چہرہ ہی کھل گیا، جب کوئی بے نقاب سامنے آہی گیا، جب کسی نے ہمکو اور ہم نے کسی کو یوں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ ہی لیا اور جب حسن انسانی کا وہی حصہ جو "سرفتنۂ عشق ومحبت" کہلاتا ہے چھپانے کی چیز نہ رہا تو پھر سینہ وشانہ کی عریانی میں کیا حرج ہے "سیم ساق" کے دیکھنے میں کیا نقصان ہے، اور کپڑے چڑھائے ہوئے پائنچے اٹھائے ہوئے "سر بازار آجانے میں کیا مضائقہ ہے۔ وائے گر در پس امروز بود فردائے

اللہ نے تو رسول کو سورۂ احزاب میں یہی ہدایت فرمائی تھی کہ:۔

یا ایہا النبی قل لازواجک وبناتک ونساء المومنین یدنین علیہن من جلابیبہن ہ

(اے رسول اپنی بیویوں بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں کو ہدایت کردو کہ وہ اپنے اوپر نقاب ڈال لیا کریں) لیکن یہ معمہ آج عبدالماجد صاحب کے قلم حسن رقم سے حل ہوتا ہے کہ یدنین علیہن من جلابیبہن کے معنے بے نقاب ہوجانے اور چہرہ کھولکر بازار میں بے نقاب آجانے کے ہیں۔ فریاد از تطاول مشکیں کمند تو!

مجھ پر وکیل ہوکر پیشۂ طبابت اختیار کرنے کا الزام تھا، آج دنیا اس طبیب حاذق کی حذاقت کا بھی مشاہدہ کرے دنیا کے اس قائد اعظم کائنات کے اس مصلح کبیر اور عالم اسلامی کے اس ماہر قرآن وحدیث کے فتاوائے دینی کو بھی دیکھے۔ تاکہ آئندہ وکیل وطبیب کے امتیاز میں کسی کو التباس واقع ہو اور خیر و برکت کا وہ دروازہ جو عورت کے چہرہ کو داخل ستر نہ کرنے سے عبدالماجد صاحب نے کھول دیا ہے اس کا طرۂ امتیاز کسی ملحد دہریہ کو نہ حاصل ہوجائے۔

حال ہی میں جناب عبدالماجد صاحب کا ایک افتتاحیہ "اخبار ہمدرد" میں شایع ہوا ہے۔ جس میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ انگریزی ذہنیت کسی طرح ہندوستانی ذہنیت سے بالا و برتر نہیں ہے اور اس کے ثبوت میں انھوں نے استدلال پیش کیا ہے کہ اس وقت تک ایک انگریز بھی ہندوستانی زبان میں وہ مہارت پیدا نہیں کرسکا جو ہندوستانیوں نے انگریزی زبان میں حاصل کی ہے اسی طرح علم وفضل کے سلسلہ میں انھوں نے چند نام اہل ہندوستان کے شمار کرائے ہیں لیکن کیا اچھا ہوتا کہ اگر فاضل افتتاحیہ نگار اسی سلسلہ میں یہ بھی بتادیتے کہ جب ایک قوم نہ اپنے ذہنی اکتسابات کے لحاظ سے قابل لحاظ ہے اور نہ اخلاقی حیثیت سے لایق ذکر تو پھر اس کی ترقی کا راز کیا ہے اور دوسری قوم جو علم وفضل میں بھی تفوق رکھتی ہے اور اخلاق وعادات میں بھی بلند مرتبہ والی ہے اس کے انحطاط وزوال کا کیا سبب ہے۔

کلام مجید میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنہم فی الارض کما استخلف الذین من قبلہم

(یعنی جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ وہ انھیں دنیا میں قیام عطا فرمائے گا جس طرح اس سے قبل کے لوگوں کو قیام عطا ہوا) پھر اگر استخلاف فی الارض سے مراد وہی "چہ خورد بامداد فرزندم" ہے تو یقیناً ہندوستانیوں سے زیادہ کوئی مستحق اس کا نہیں ہے اور یقیناً تمکن فی الارض انھیں کو حاصل ہے لیکن اگر استخلاف سے مراد حکومت وثروت، جاہ ودولت

فراغدستی و خوشحالی اور ہر وہ چیز ہے جس کو "جنت عدن" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے تو پھر یہ معمہ کیونکر حل ہو سکتا ہے کہ استخلاف اور عمل صالح میں باہم کیا نسبت ہے۔ اگر استخلاف بغیر عمل نیک کے بھی ممکن ہے تو وعدۂ الٰہی بیکار ہو جاتا ہے اور اگر یہ ناممکن ہے تو پھر وہی صورتیں ہیں یا تو استخلاف کا مفہوم دنیاوی نکبت و ذلت قرار دیا جائے یا انگریزی قوم کو تمکن فی الارض کے لئے اصلح تسلیم کیا جائے؟ تاریخ اجراء سے لیکر اس وقت تک سچ کے جتنے پرچے شائع ہوئے ہیں اگر ان کو دیکھا جائے تو سوائے اس کے کچھ نہ نظر آئے گا کہ یورپ کے فلاں ملک میں اتنے جرائم ہوئے فلاں مقام پر سال میں اتنی طلاقیں ہوئیں، فلاں لارڈ کی لڑکی عریاں رقص کرتی ہوئی پائی گئی وہاں شراب کا اتنا صرف ہے، قمار بازی میں اتنا روپیہ ضائع ہوتا ہے، وہ تو یہ ظلم توڑ رہے ہیں، لیکن اس کی توفیق نہ ہوئی کہ کبھی یہ بھی بتاتے کہ فلاں عالم نے یہ ایجاد کی، فلاں ڈاکٹر نے یہ اختراع پیش کی، وہاں علم و فضل کی کیا خدمت ہو رہی ہے، فلاح قومی کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں۔ ہمارے مظلوم ہونے کے کیا اسباب ہیں ہم میں کیا نقائص ہیں اور ہم ان کو کس طرح دور کر سکتے ہیں۔

کیا کلام مجید میں "استخلاف فی الارض" کے لئے جس عمل صالح کی شرط قرار دی گئی ہے وہ یہی ہے کہ دوسروں کی عیب چینی کی جائے اور اپنے معائب کو بھی محاسن کی صورت میں پیش کیا جائے کاش کہ مولانا عبد الماجد صاحب بجائے اس سطحی مقالہ کے اصل مسئلہ کی طرف توجہ فرماتے اور غور کرتے کہ کیا ہندوستانی دماغ کی برتری ان حالات کے ماتحت سراہے جانے کے قابل ہے اور کیا سورۂ احقاف میں خدا نے یہ کلیہ قائم کر کے کہ:-

فهل يهلك الا القوم الفاسقون

ہم کو یہ نہیں بتا دیا کہ ایک قوم کی دماغی و ذہنی بلندی کا ثبوت اگر ہو سکتا ہے تو وہ صرف اس کی ترقی ہے اور جو قوم ہلاک ہو رہی ہے وہ یقیناً فاسق ہے، نا قابل ہے اور اس کو کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے آپ کو بہتر کہہ سکے جناب عبد الماجد کی صحافت اور انشاء کا انحصار صرف اس پر ہے کہ اہل یورپ کے معایب کو نمایاں کیا جائے اور اس غلو کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان کا لٹریچر ہی حاسدانہ نکتہ چینی ہو کر رہ گیا حالانکہ حقیقت واضح ہے کہ "تیاگے عمل ہیں اس طرز تحریر کو صرف "کوسنا" کہتے ہیں اور اسی لئے اس کو صرف اس جنس کے لئے مخصوص سمجھ لیا گیا ہے جس کے لبوں کی جنبش اس زہر کو بھی شیریں بنا کے پیش کرتی ہے عبد الماجد صاحب سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ باوجود سعی بسیار کے بھی کبھی اس نوع کی جاذبیت اپنی جنبش لب میں پیدا کر سکیں گے۔

جولائی کا مہینہ تقریباً نصف سے زائد علالت میں بسر ہو گیا، اس لئے میں کاپیوں کی صحت کی نگرانی بالکل نہیں کر سکا۔ ہر چند حالت صحت میں جب میں اس کا اہتمام کرتا تھا اسی وقت کتابت غلطیاں پائی جاتی تھیں لیکن خیر کم از کم میرے دل کو تو اطمینان رہتا تھا کہ اپنے امکان میں جو کچھ تھا اس سے دریغ نہ کیا گیا۔ اس مرتبہ مجھے یہ کا دب اطمینان قلب بھی حاصل نہیں ہے

نیاز فتحپوری

قائم چاندپوری

شعرا کے حالات کی ترتیب میں بڑی مدد تذکروں ہی سے مل سکتی ہے لیکن ان تذکروں میں بڑا نقص یہ ہے کہ صحت اور شاعر کے ذاتی حالات کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے جس کی وجہ سے ہم صحت کیساتھ شاعر کی شخصیت اور اس کے کردار پر اچھی طرح بحث نہیں کر سکتے اور نہ ہمیں واضح طور پر یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ شاعر کس سنہ میں پیدا ہوا کن کن سے کسب سخن کیا، کہاں کہاں کی خاک چھانی اور بالآخر کب عالم جاودانی کی راہ لی، اسی وجہ سے ہم کو شاعر کے حالات ترتیب دینے میں زیادہ تر اشعار کی زبان سے مدد لینا پڑتا ہے، عام طور پر تذکروں میں پہلے تو صحیح نام ہی درج نہیں ہوتا ہے اور اگر ہوتا بھی ہے تو مختلف تذکروں میں اس قدر زبردست اختلاف ہوتا ہے کہ کسی خاص نام کو صحیح قرار دینا مشکل ہو جاتا ہے یہی حال تاریخ وفات کا بھی ہے، چنانچہ قائم کے نام کے متعلق بھی زبردست اختلاف ہے، "گارسان دی تاسی نے تذکروں کے انہیں نقائص و معایب پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔ اہل ایران اور ان کے تتبع میں ہندی مسلمان سوانح (اور خاصکر ہمعصر لوگوں کے سوانح) لکھنے کے بیحد شوقین تھے، اور جیساکہ ہمارے ہاں کا حال ہے ان میں صرف تاریخ وفات مفقود نظر آتی ہے لیکن یہ تذکرے بجائے تجارتی مفاد کے ادب کا اہم جز ہیں، ان تذکروں میں مولفین، مشہور اور ملاقاتی شاعروں کی مدح سرائی دل کھول کر کرتے ہیں اور حیلہ سے انہیں اپنی فصاحت و بلاغت اور انشا پردازی دکھانے کا خوب موقع ملتا ہے اور عمدہ عمدہ اشعار انتخاب کر کے اپنے ذوق سلیم کا اظہار کرتے ہیں، درحقیقت یہ تذکرے ایک قسم کے منتخبات ہیں جنہیں شعرا کی زندگی کے حالات پر شکوہ اور شاندار مدح سرائی تک محدود ہوتے ہیں، بعض اوقات کئی کئی صفحوں تک چلے جاتے ہیں اور اکثر ان میں سوائے شاعر کے نام کے اور کچھ بھی نہیں ہوتا، بعض اوقات مدح کے بعد دس، بیس، تیس صفحوں تک انتخابات ہوتے ہیں اور کبھی صرف دو تین شعر ہی نمونہ کے دیدئے جاتے ہیں اور کبھی صرف ایک ہی شعر ہوتا ہے، تذکرہ نویس ان تذکروں میں اپنی روشناسی اور شہرت کا پہلو نکال لیتے ہیں، بعض مصنفین یا شعرا کا ذکر کرتے کرتے اپنا نام بھی کہیں نہ کہیں لے آتے ہیں، یورپ میں سوانح عمری کے مولف کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو مصنفین یا شعرا کے ذاتی حالات تفصیل سے بیان کئے جائیں اس کے برخلاف ہندوستانی تذکروں میں ذاتی حالات کی تفصیل مطلق نہیں ہوتی صحت کا بھی بہت کم خیال کیا جاتا ہے ان شعرا کو قدیم کہا جاتا ہے جو کسی دوسرے سے پہلے گزرے ہوں اور مولف اپنے ہمعصروں کو شعرائے جدید لکھتا ہے، تاریخ اور سنہ اور خاصکر تاریخ پیدائش ان تذکروں میں شاذونادر ہی ہوتی ہے اسلئے اس کے اشعار کی زبان دیکھکر یہ قیاس کرنا پڑتا ہے کہ کس زمانہ یا کس صدی کا شخص ہے لیکن اس میں بھی دشواری واقع ہوتی ہے کیونکہ کتابوں کی نقل میں [illegible] اتنا کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں" (رسالہ اردو بابتہ جنوری سنہ ۱۹۲۸ء)

اس شاعر کے بیان میں سب سے پہلا مختلف فیہ مسئلہ اس کے نام کا ہے، مختلف تذکروں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ

اس کا نام شیخ محمد قیام الدین، شیخ محمد قایم اور قیام الدین علی تھا، تذکرۂ گلشن بیخار، گلستان بیخزاں، بزم سخن اور سخن شعرا اور تذکرۂ کریم الدین میں اس شاعر کا نام شیخ محمد قیام الدین مذکور ہے اور تذکرۂ میر حسن، شمع انجمن، گلشن ہند، نکات الشعرا اور طبقات الشعرا میں شیخ محمد قائم تحریر ہے۔ ان سب سے ہٹکر مولوی عبدالحیٔ صاحب مرحوم نے تذکرہ گل رعنا میں قیام الدین علی لکھا ہے ہماری رائے میں اس شاعر کا نام دراصل شیخ محمد قیام الدین اور تخلص قائم تھا، روزمرہ کی بول چال میں چونکہ کثرت کیساتھ قایم ہی کہا جاتا تھا۔ اس لئے بعض تذکرہ نویسوں نے تخلص کے ساتھ شیخ محمد کا اضافہ کرکے اس کا نام ہی شیخ محمد قایم لکھدیا، تخلص کی شہرت نے اصل نام کو گمنامی میں ڈالدیا، چنانچہ اصلی نام کی جگہ بھی تخلص ہی نے لے لی،

قایم کا وطن چاند پور متعلقہ سنبھل ضلع مرادآباد تھا، والد کا نام کسی فارسی یا اردو کے تذکروں میں نہیں ملا البتہ کتب خانہ انڈیا آفس کی فہرست مرتبہ ایتھے میں ان کے والد کا نام علی درج ہے ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ ڈاکٹر سپرنگر نے جو فہرست مرتب کی ہے اس میں "مخزن نکات" کے تحت یہ لکھا ہے کہ قایم کی خودنوشت مختصر سی سوانح عمری بھی اس کتاب کے ساتھ منسلک ہے، اسمیں قایم نے اپنے والد کا نام لکھا ہو، بہر حال یہ امر متفقہ ہے کہ قایم نے ابتدائی زندگی چاند پور میں بسر کی اور اوایل عمر میں تلاش روزگار میں وطن سے روانہ ہوا اور مردم خیز خطۂ دہلی جہاں کی علم پروری کی بہت شہرت سنی تھی پہونچا، شاہ عالم بادشاہ کے ہاں سلسلۂ ملازمت میں داخل ہوگیا۔ اور داروغہ اسلحہ خانہ بادشاہی مقرر ہوا، ملازمت کے تعلق سے عمر کا بیشتر حصہ دہلی میں بسر ہوا، تحصیل علم کا حال معلوم نہیں مگر اس قدر استعداد ضرور تھی کہ ان کی انشا پردازی میں خلل واقع نہ ہوا اور یہ جوہر اس زمانہ کے شریف خاندانوں کے لئے عام تھا، دلی اس زمانہ میں آج کی سی دلی نہ تھی خواجہ میر درد، سودا، میر و حکیم ہدایت اللہ وغیرہ جیسے ارباب کمال کا جمگھٹا تھا، اور شاعری کا ہنگامہ گرم، قایم نے طبع موزوں اور ذہن رسا پایا تھا، شاعری کی طرف فطری میلان تھا، صغر سنی ہی میں تصنیف نظم کا شوق پیدا ہوا، شعر و سخن کے ہنگاموں نے طبیعت میں ایک جوش پیدا کر دیا خواجہ میر درد کی خدمت میں آنے جانے لگے، چندروز ان سے فیضیاب ہوکر مرزا محمد رفیع سودا کے شاگرد ہوئے اور ایسی مشق بہم پہونچائی کہ ان کے طرز ادا کو دیکھکر سودا کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے،

آپ کی خوش بیانی و قادر الکلامی نے اس قدر شہرت حاصل کی کہ آپ ایک مسلم الثبوت استاد مانے گئے، تمام تذکرہ نویس آپ کے مداح ہیں، آپ کے پاکیزہ و شیرین کلام نے استادان فن سے خراج تحسین حاصل کیا،

میر حسن اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔

"نخل حدیقۂ فصاحت و غنچۂ بستان بلاغت، شمع بزم سخندانی، چراغ نکتہ رانی، ترقی فکرش دایم شیخ محمد قایم شاعریست خوش گو شاہین طبعش تیز بال و شہباز فکرش بہ اوج کمال، خوبی اشعارش چوں حسن محبوباں دلپذیر، رابطہ الفاظش مسلسل مانند زلف خوباں بے نظیر"

مصحفی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔

"پختگی کلام و چستگی مصراع غزل در قصیدہ و مثنوی وغیرہ موافق رواج زمانہ دوش بدوش استاد در راہ میرفت بلکہ در بعضے مقام رجحان می جست"

مولف طبقات الشعرا رقمطراز ہے۔

"بسیار آدم با مزہ و اہل درد، متواضع، خلیق، مہذب صورت، پاکیزہ سیرت، نہایت پرگو و خوش مقال و در فنون سخنوری باکمال، از خوشخیالان زمان و بلند نظران جہان فکر صائب دارد و نازک خیالی و معنی یابی داد سخنوری میدہد"

مرزا علی لطف "گلشن ہند" میں لکھتے ہیں۔

"نظم ریختہ میں استاد مسلم الثبوت تھے، ساتھ طبع بلند اور ذہن رسا کے موصوف، مضمون تراشی اور معنی بندی میں معروف، سچ تو یہ ہے کہ بعد سودا اور میر کے کسی ریختہ گو کی نظم کا نہیں یہ اسلوب ہے راقم آثم کو طور گویائی کا اس سخن آفریں کے نہایت مرغوب ہے"

شیفتہ تذکرہ گلشن بیخار میں تحریر فرماتے ہیں۔

"شاعریست خوش گفتار بلند پایہ موزونیست عالی مقدار گرا نمایہ و آنچہ بعض ناشناسان سخن بہ مکانت سودا می شمارند حرف در دیوانگی شان از جنون است بہر حال قایم در سخن دستگاہے بلند دارد گو بپایہ سودا نماسش، لاسیما در قطعات و رباعیات مضامینے کہ دلالت بر شوخی فکرش کند از طبعش تراویدہ"

شاعر کی حیثیت سے قایم اپنے عہد کے ممتاز شعرا میں خیال کئے جاتے تھے، قایم نے جیسا کہ مصحفی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے اگرچہ تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن بعض تذکرہ نویسوں کی رائے میں ان غزل اور مثنوی سے زیادہ مناسبت تھی، قطعات و رباعیات میں وہ یگانہ خیال کئے جاتے ہیں لیکن جس طرح ہم نے اوپر بیان کیا ہے شیفتہ کی رائے میں ان کی بہترین نظمیں قطعات و رباعیات ہیں، لیکن کمال (جس نے ایک تذکرہ بنام "مجموعہ انتخاب" قایم کے دس سال بعد لکھا ہے) لکھتا ہے کہ سودا کے سوا جو ہندی مسلمانوں کا مقبول شاعر ہے وہ سب سے بڑھا ہوا ہے، وہ قایم کا بیحد مداح ہے چنانچہ اس قول کی تائید میں وہ اپنے تذکرہ میں قائم کے دیوان سے اس کا بہت سا کلام نقل کرتا ہے جیسے بیانیہ، ہجویہ اور دوسری قسم کی نظمیں ہیں جو قومی خصائص کے نقطۂ نظر سے بہت دلچسپ ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ قایم ان شعرا میں سے ایک ہے جو مصلح اور رواج دینے والے اس زبان کے تھے اور جنھوں نے الفاظ کریہہ کا استعمال یک قلم زبان ریختہ سے موقوف کیا قایم کی تعریف و توصیف اور ستائش میں تذکرہ نویسوں نے بہت کچھ مدح سرائی کی ہے جناب منشی کریم الدین اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں۔

١

"عجب طرح کا شاعر خوش گفتار ہے۔ اس کی برابری اچھے اچھے شاعر نہیں کر سکتے کیونکہ وہ شخص اس رتبہ کا ہے کہ دیوان دیکھنے سے اُس کی قدر کھلتی ہے بعض بعض آدمی جو کہ اس کو سودا سے بہتر کہتے ہیں حق یہ ہے کہ سچے ہیں اور بعضے کم مایہ و بے استعداد جو اس کو برابر سودا کہنے میں خیال سودا اور دیوانگی کا کرتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ آگ رشک میں جلتے ہیں کیونکہ مثل اس کے شعر نہیں کہہ سکتے ہیں خصوصاً قطعات و رباعیات اس کی ایسی ہیں کہ باریک بیں آدمیوں کی آنکھیں کھل جاتی ہیں جب اس کو مطالعہ کرتے ہیں"

نکات الشعرا میں میر صاحب ارقام فرماتے ہیں۔

"جوانے است، خیرہ وطیرہ وحسن پرست، نوکر پیشہ، بالفقیر نیز آشنا است"

میر صاحب کا یہ لکھنا کہ حُسن پرست تھا کچھ تعجب خیز نہیں ہے اس لئے کہ اس وقت یہ روش عام تھی اور اس زمانہ کی آب وہوا ہی کچھ ایسی تھی، شاعر کے لئے حسن پرست ہونا ضروری تھا کہ اظہار جذبات و احساسات میں واقعیت کا رنگ آسکے چنانچہ دلی کے متعلق بھی امرد پرستی ثابت ہے، خود میر صاحب بھی نگاہ ناز کے گھائل تھے۔ اپنے حسن و عشق کی داستان کو پوشیدہ رکھنے کے لئے مشق سخن شروع کی بالآخر اسی فن میں ان کو ناموری حاصل ہوئی، امردوں پر بھی جان دیا کرتے تھے، مولانا عبدالسلام ندوی نے شعر الہند میں اس کے متعلق وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔

قایم نہایت متواضع اور خلیق و وضعدار تھے، طبیعت میں سوز و گداز تھا، اپنے خصائل پاکیزہ کی وجہ سے لوگوں کو گرویدہ کر لیا، سخن گوئی کی وجہ سے وہ قدر و منزلت اور شہرت حاصل کر لی کہ استادان وقت کے ہمسر خیال کئے جانے لگے، معاش کی بیفکری نے کسب سخن کا اچھا موقع دیا۔ دہلی میں جو مشاعرے ہوتے تھے ان میں شرکت کرتے تھے، سودا۔ درد اور میر سے اچھے تعلقات تھے ان کے ہاں آتے جاتے رہتے تھے،

دہلی کی تباہی کے بعد یہ بھی وطن چلے گئے چنانچہ خود نوشت سوانح عمری میں لکھتے ہیں۔

"سلطنت مغلیہ کی تباہی کے بعد جب کہ وہ رشتہ جسمیں تمام ملازمین منسلک تھے ٹوٹ گیا اور وہ مثل گہر آبدار ذلت وخواری کی زمین پر گر پڑے اور ہر شخص نے اس طرف کی راہ لی جہاں قدردانی کی اُمید ہو سکتی تھی تو میں مجبور ہو گیا کہ اپنی مرضی کے سلاف بجبر دیگر انتقال مقام کروں"

کچھ دنوں نواب محمد امیر کے ساتھ ٹانڈہ میں زندگی بسر کی، جب ان کا بھی کام بگڑا تو رامپور چلے گئے، وہاں احمد یار خاں پسر نواب فیض اللہ خاں نے ان کی تنخواہ مقرر کر دی، کچھ دنوں اسی پر قناعت کی جب تنگ حالی سے زیادہ پریشان ہوئے تو لکھنؤ آئے اور مہاراجہ ٹکیت رائے کا شقہ اپنے وطن کے عاملوں کے نام لے گئے روپیے اور ملکیتیں جو ضبط ہو چکی تھیں ان کو پھر بحال کرایا، اس کے بعد پھر رامپور چلے گئے۔

طبقۂ متوسطین کے دور اول کے شعرا میں سے ایک قایم ہیں، سب سے پہلا کارنامہ اس دور کے شعرا کا یہ ہے کہ زبان کی صفائی اور صحت میں پوری کوشش کی اور بہت سے الفاظ روابط جنھیں ولی اور اس کے ہمعصر بے تکلف کام میں لاتے تھے نکال ڈالے، تاہم کچھ ایسے الفاظ رہ گئے جو ان کے زمانہ میں فصیح خیال کئے جاتے تھے مگر آج ہم کو اجنبی اور نا مانوس معلوم ہوتے ہیں، اس عہد کے شعرا نے دلپذیر اور دلکش، پسندیدہ محاورات اور ترکیبیں جو فارسی میں دیکھیں انھیں کہیں ترجمہ کر کے اور کہیں بجنسہٖ لے لیا اور اُنھیں اردو میں ایسی بے تکلفی سے کھپایا ہے کہ کہیں سے جوڑ نہیں کھلتا اور دور جدید میں فارسی زبان کی ترکیبیں اردو غزلگوئی کا زیور سمجھی جاتی ہیں (تذکرۂ گل رعنا) فارسی زبان میں کسی چیز کی کثرت کا بیان الفاظ کی تکرار سے کرتے ہیں، چنانچہ قایم نے کہا ہے ؎

حب موج پہ اپنی آ گئیں چشم　　　دریا دریا بہا گئیں چشم

آنکھوں سے جب اشک گریں گل چمن چمن　　　منظور گریہ گر ہیں ترا رنگ بو کردں

متاخرین شعرا کی فارسی کی دلآویز ترکیبیں جو شعرائے دلی کے کلام کا زیور ہیں اسی دور کی یادگار ہیں، قایم نے یوں باندھا ہے۔

اے ابر اپنے گریہ میں جس وقت جوش تھا　　　جو قطرہ اشک کا تھا سو طوفاں بدوش تھا

کسکی نگاہِ کرم تھی گلشن پہ اے نسیم　　　شبنم سے برگ گل لب تبخالہ جوش تھا

ہر دم شرار و برق سے کیا ارض کیا سما　　　ہر ایک تیرے منہ پہ تبسم فروش تھا

اس حسن نیم رنگ کے صدقے کہ جسکے بیچ　　　ہلکی سی ایک شوخی کی تہ ہو حیا کے ساتھ

ویراں سرائے سینہ سے آتی ہے بوئے اُنس　　　گویا کبھو یہ خانہ ترا جلوہ گاہ تھا

قبولِ عذر تو واں ہو جہاں ملال بھی ہو　　　بجانِ پاک صفایاں جو کچھ خیال بھی ہو

ترکیبوں سے گزر کر اس دور کے شعرا نے خالص فارسی طرز ادا میں بھی بعض بعض اشعار کہے ہیں، قایم نے کہا ہے

ہے خواجہ آج نام کے پیچھے یہ سب شغب　　　غافل کہ کل نشان بھی پایا نہ جائے گا

اے وہ کہ تو کرے ہے ہر آزار کا علاج　　　جز مرگ کچھ بھی ہے ترے بیمار کا علاج

ہے اشک مجھے بنام ہر یک　　　کو تجھ سے کہے مری زبانی

کو نوحہ گر کہ خاک پہ میرے ہو گرم شور　　　تھا اک چراغ گور سو وہ بھی خموش تھا

فارسی محاوروں کے ترجمے اس عہد کے شعرا کے کلام میں نہایت کثرت سے پائے جاتے ہیں، چنانچہ قایم اس طرح طبع آزمائی کرتے ہیں ؎

دل کو کیا باندھے گلزار جہاں سے بلبل حسن اس باغ کا اک روز خزاں ہو دیگا

کچھ لکھوں سوز دل اپنے سوا سے ای قاصد جائے کاغذ ہوں اگر بال و پر پروانہ

تا کجا مستی میں ناخوش دل احباب کریں یک دو جام اور بھی ساقی کہ بس اب خواب کریں

ہر طرف ظرف وضو بھرتے ہیں اعفا ہوئی صبح ساقی ادھر ہم بھی صراحی میں مے ناب کریں

(شعر الہند جلد دوم)

اس دور کے شعرا نے یہ بھی بڑا کام کیا ہے کہ جو عاشقانہ مضامین غزلوں میں بہت پہلے سے بندھے چلے آتے ہیں ان کو بہ تبدیل الفاظ و بہ تغیر اسالیب معمولی بول چال اور روزمرہ میں اس خوبصورتی سے ادا کیا ہے کہ بار بار پڑھئے اور مزہ لیجئے، انکی بندشیں اگلی بندشوں سے زیادہ چست اور لطیف اور ان کے محاورے اگلے محاوروں سے زیادہ دلاویز اور دلکش ہیں، علاوہ اس کے قدیم جذبات و خیالات میں اپنے مبلغ فکر کے موافق جو نزاکتیں اور لطافتیں انھوں نے پیدا کی ہیں وہ پرانے روزمرہ اور محاوروں کے بولجانے پر بھی اب تک ایسی ہیں کہ لوگ ان کو پڑھتے اور سر دھنتے ہیں ملاحظہ ہو۔

قایم ضرور کیا ہے اب اس جنگجو سے صلح مدت ہوئی کہ جان سے میں ہاتھ دھو چکا

طوفان گریہ کی ہے مرے حد عمر نوح دریا نہیں کہ آج چڑھا کل اتر گیا (تذکرۂ گل رعنا)

ان بزرگوں نے تشبیہ اور استعارہ سے بھی کام لیا ہے مگر اعتدال کیساتھ، متاخرین کی طرح صفت در صفت اور استعارہ در استعارہ کر کے کلام میں پیچیدگی نہیں پیدا کی، تشبیہ و استعارہ کو محاوروں کی رنگینی سے اس طرح کھپایا ہے کہ شعر سنکر اس کی گرمی اور جوش و خروش میں انسان ایسا محو ہوجاتا ہے کہ تشبیہ اور استعارہ کی طرف فوراً ذہن منتقل نہیں ہوتا اور یہی بات اُن کی شاعری کی جان ہے قایم کہتا ہے ؎

ہے یوں تو زلف یار پہ اس قدر نہیں مجھسا جہاں میں کوئی بھی آشفتہ سر نہیں

دل ڈھونڈھنا سینہ میں مرے بوالعجبی ہے اک ڈھیر ہے یاں راکھ کا اور آگ دبی ہے (تذکرۂ گل رعنا)

تشبیہ و استعارہ کا موزوں و مناسب استعمال شعر کے حسن میں اضافہ کر دیتا ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ تشبیہ محسوس چیزوں سے دیجائے تاکہ اُن کے عوارض و اوصاف زیادہ نمایاں ہوکر نگاہ کے سامنے آئیں اور اس طرح ہر ایک چیز آنکھوں کے سامنے پھر جائے دیکھئے قایم نے سادگی کے ساتھ تشبیہ کے استعمال میں جدت و ندرت بھی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ملاحظہ ہو،

درد و غم داغ ہر اک کا ہے مجھے پاس مزاج جوں کوئی شخص نئے شہر کو آباد کرے

مرکب تشبیہیں بھی زیادہ نادر اور بدیع خیال کیجاتی ہیں کیونکہ دو چیزوں کے اوصاف کی مجموعی ہیئت سے ایک حالت کا نقشہ زیادہ

وضاحت اور رنگینی کے ساتھ نظروں کے سامنے آجاتا ہے،

موج نفس سے ناداں غافل نہ ہو کہ تیری　　یہ ہستی دو روزہ نخل کنار جو ہے

وہ گویا زخم ہے چہرہ کے اوپر　　جو بے لطف سخن کوئی دہن ہے　　(شعر الہند جلد دوم)

اس دور کے شعرا کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ تناسب لفظی اور صنائع و بدائع کی دوسری قسمیں خصوصاً ایہام اور ذومعنین جو قدما کی شاعری کا مایۂ ناز ہے ان کے دور کرنے میں انھوں نے بڑی کوشش کی ایہام گوئی کو ترک کر کے شعر کو بلند مضامین اور لطیف جذبات کے قابل بنانا اس دور کے شعرا کا بہترین کارنامہ ہے جو بھولنے کے قابل نہیں، مذکورۂ ذیل اشعار ملاحظہ کیجئے علو خیالی تاثرات قلبی، سادگی، نزاکت اور لطافت کی داد دیجئے،

لبریز شوق میرا از بسکہ مو بمو ہے　　سمجھا نہ میں یہ ابتک یہ میں ہوں یا کہ تو ہے

غنچے نے کس کے بوسہ کو یہ لب کئے ہیں جمع　　گل کیوں بنا ہے باغ میں صورت کنار کی

کچھ طرفہ مرض ہے زندگی بھی　　اس سے جو کوئی جیا سو مر کر

بہار عمر ہے قایم کوئی دن　　اسے جوں گل پیارے کاٹ ہنسکر

اس دور سے پہلے شعرائے ریختہ غزل، مثنوی، رباعی، قطعہ وغیرہ سب کچھ کہتے آئے ہیں اور قصیدے بھی بڑے نام لکھے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کو قصیدہ نہیں کہہ سکتے، دو چار شعر میں کسی کی مدح کر دینے یا تشبیب، گریز، مدح اور دعا جو قصیدہ کے لوازم قرار پا گئے ہیں ان سے تعرض نہ کرنے سے کوئی کلام قصیدہ نہیں بن سکتا، سب سے پہلے اسی دور کے شعرا نے قصاید دہوم دھام سے لکھے اور ان کو اعلیٰ درجۂ فصاحت و بلاغت پر پہونچایا، اس سلسلہ بیان میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اصناف سخن میں ہر چیز کو جس سلیقہ سے اس دور کے بزرگوں نے بیان کیا ہے وہ انہیں کا حصہ تھا، قصیدوں میں پرشوکت الفاظ، بلند مضامین، اور چست ترکیبیں استعمال کیں، غزلوں میں بے تکلف، زبان میں نرم نرم باتیں، عاشق و معشوق کے خیالات وصل کا ارمان، فراق کی المناک کیفیت اور جذبات انسانی کی صحیح ترجمانی جیسی انھوں نے کی اس کی نظیر قدما کے کلام میں نہیں مل سکتی، اور جوش و خروش کلام کی گرمی، اور دلاویز و دلچسپ و دلپسند بحروں میں جن میں سے اب تک بہت سی اردو میں نہیں آتی تھیں اور پھر سنگلاخ زمینوں اور مشکل مشکل ردیف و قافیوں میں شعر کی آب و تاب دیکھنا چاہو تو سودا و قایم کا کلام دیکھو اور انصاف کرو کہ اس کا دھندلا سا عکس بھی قدما کے کلام پر نہیں پڑتا، (گل رعنا) جس طرح ہم نے پہلے لکھا ہے اس عہد کے اساتذہ قصداً سنگلاخ زمینوں میں زور طبع دکھایا کرتے تھے اور اس کو باعث سرمایہ افتخار سمجھتے تھے ہم کو اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس قسم کی ردیفوں کا نباہنا انہیں بزرگوں کے

دل و دماغ کا کام تھا۔ ایسی ردیفوں کو بھی اس خوبی سے نبایا کہ سررشتہ مضمون کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا، چنانچہ قایم نے اس طرح طبع آزمائی کی ہے ؎

جی بھی ہے، دل لیا ہی تو چل یک نشد دو شد　　تا پھر وہ تازہ ہوئے مثل یک نشد دو شد

وعدہ جو کل کا آج پہ ٹھا سو ہوا اخلاف　　پھر آج آپ کہتی ہیں کل یک نشد دو شد

کل صبر و طاقت اسکی گلی میں ہو گئے گم　　خالی ہوا آج دل سے بغل یک نشد دو شد

مسابقت یا ایک کا دوسرے پر برتری حاصل کرنے کی جد و جہد کرنا، ان تمام صنعتوں میں اپنی جولانی طبع دکھانے کا موقع ملتا ہے محنت و کاوش، دماغ سوزی، استعداد فکر و غور و تدقیق، جستجو و تلاش اور معنی آفرینی کی کوشش کرنا پڑتی ہے، چنانچہ شعرا کی معاصرانہ چشمک سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ زبان ثقیل الفاظ اور فارسی الفاظ کے بیجا استعمال سے آزاد ہو کر نہایت صاف اور شستہ اور مقبول عام ہو گئی، زبان کی اسی شستگی و پاکیزگی نے اس دور میں مثنوی کو اعلیٰ پیمانہ پر پہونچا دیا، چنانچہ مصحفی میر حسن کے تذکرہ میں لکھتے ہیں

"و بعد ازان کہ دور مرزا رفیع سودا ستادہ زبان ریختہ چنانچہ بود زیادہ دریں دیار رواج یافت محکم قوت ممیزہ قدم بر جادۂ مستقیم رسانده مسلم الثبوت یعنی خواجہ میر درد و مرزا رفیع سودا و میر محمد تقی و میاں محمد قایم گراشتہ کلام خود را مرتبہ پاکیزگی و شستگی رسانیده دیوان ضخیم و سوی ہا ے متعدد در سلک نظم کشیده خصوصاً در مثنوی آخر کہ سحر البیان نام داد ید بیضا نموده الحق کہ کار کار اوست قطع نظر از بلاغت شاعری زبانش بسیار پر مزه و شیریں و عالم پسند افتاده"

اسلئے اردو شاعری نے جو اب تک فارسی شاعری کے مقابلہ میں کم درجہ اور اہل کمال کی شان کے خلاف سمجھی جاتی تھی ایک ممتاز حیثیت اختیار کر لی، اور اس دور کے شعرا اُسکو خود فارسی شاعری کا حریف مقابل سمجھنے لگے، چنانچہ قایم کہتے ہیں۔

قایم جو کہے ہیں فارسی یار　　اس سے تو ریختہ ہے بہتر

فارسی کہنے پر افتاد ہوئی قایم　　ریختہ، رفتہ جو ترے شعر سے مایان گئے

محمد شاہی دور تک اگرچہ دلی میں اردو شاعری کا عام رواج ہو چکا تھا تاہم شاعری کا جو انداز تھا وہ بہت کچھ ترمیم و اصلاح کا محتاج تھا، آبرو، حاتم اس طبقہ میں شامل ہیں جنھوں نے صنعت ایہام کو مستقل فن بنا لیا تھا مگر اس صنعت کی پابندی نے انکے کلام کو سبک بنا دیا تھا، اس لئے اس دور کے بعد شاہ عالم کا زمانہ آیا تو مرزا مظہر جانجاناں خواجہ میر درد، فقیر دہلوی، مرزا سودا، میر تقی میر، قایم اور میر حسن جیسے مصلحین فن پیدا ہوئے تو سب سے پہلے مرزا مظہر جانجاناں نے اس طرف توجہ کی، اور ایک مستقل دور جدید و اصلاح کی بنیاد ڈالی چنانچہ قدرت اللہ شوق، طبقات الشعرا میں لکھتے ہیں،

"می گویند کہ اول کسے کہ طرز ایہام گوئی ترک نمودہ ریختہ را در زبان اردوئے معلیٰ شاہجہاں آباد کہ الحال پسند خاطر عوام و خواص گردیدہ و مروج ساختہ زبدۃ العارفین، قدوۃ الواصلین، واقف رموز جناب اکبر، کاشف کنوز طریقہ پیغمبر مرزا جانجاناں متخلص بہ مظہر مرویست فرشتہ صفت"

چنانچہ اساتذہ نے غزل کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا اور اردو شاعری کے عیوب مٹا دیئے ان کو اپنی اس خدمت پر بڑا ناز تھا۔ قایم نے اس طرح تعلی کی ہے۔

قایم میں ریختہ کو دیا خلعت قبول		ورنہ یہ پیش اہل ہنر کیا کمال تھا

قایم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ		اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

قایم نے دوسرے شعر کے مصرعہ ثانی میں جو دعویٰ کیا ہے وہ صرف شاعرانہ تعلی ہے اُسے حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں، اردو زبان کا اصلی وطن دکن ہے جہاں تک تحقیقات بتاتی ہیں اردو زبان میں سب سے پہلے شمالی ہند کے شاعروں میں حاتم نے اس کی طرف توجہ کی اور اس طرز کو اپنی نظموں کے لئے اختیار کیا، اس سے قبل تک وہاں فارسی مستعمل تھی، اس کے برخلاف دکن میں ہم سولہویں صدی عیسوی و سترہویں عیسوی کی ابتدا میں بہت سے نامور شعرا کے نام پاتے ہیں، مثلاً شاہان گولکنڈہ، محمد قلی قطب شاہ و سید اللہ قطب شاہ ابوالحسن تانا شاہ، انوری، ابن نشاطی، افضل، غواصی، سیمی، نصرتی اور ولی وغیرہ، شمالی ہند کے شعرا نے کہیں اٹھارویں صدی عیسوی میں شہرت حاصل کی، چنانچہ گارساں دی تاسی لکھتا ہے "حاتم جو سترہویں صدی کے آخر میں ہوا۔ دہلی کا غالباً پہلا شاعر ہے جس نے اردو میں لکھنا شروع کیا، اور اس کا اقرار کرتا ہے کہ اس نے عام زبان (اردو) میں لکھنے کا اسوقت فیصلہ کیا جب کہ ولی کا دیوان دہلی پہونچا اور پھر (شمال کے) دیگر شعرا نے اس کی تقلید کی" مولوی سید امداد امام صاحب اثر کاشف الحقایق جلد دوم میں لکھتے ہیں "جب شاہان دکن کو اورنگ زیب نے زیروزبر کر ڈالا تب اردو نے اپنے مولد سے جلاوطنی اختیار کرکے دلی کو اپنا مسکن بنایا، ولی کا دیوان پہلے پہلے اس دار الخلافہ میں ۱۷۱۹ء میں پہونچا، یہ سنہ محمد شاہ کے جلوس کا دوسرا سال تھا، شاہ حاتم نے ولی کی تقلید شروع کی، شاہ حاتم ۱۶۹۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۷۹۲ء میں رحلت فرمائی اردو شاعری کے رواج دینے والے شاہ حاتم ہی گزرے ہیں"

یہ صحیح ہے کہ اس دور سے پہلے تک اردو زبان میں سنسکرت، بھاشا، اور قدیم دکنی زبان کے سیکڑوں الفاظ مستعمل تھے اور عربی و فارسی زبان کے الفاظ میں صحت کی بہت کم پروا کی جاتی تھی چنانچہ سب سے پہلے شاہ حاتم نے اس کی طرف توجہ کی اور بہت سے الفاظ کی اصلاح کرکے اردو زبان کو پاک وصاف اور شستہ بنانا چاہا اور اس کے بعد شعرائے مصلحین "نے اس ابتدائی اصلاح کی تکمیل میں بڑا حصہ لیا، لیکن اس کے یہ ہرگز یہ معنی نہیں ہوسکتے کہ جو زبان ان سے تقریباً سو دو سو سال بیشتر سے دکن میں مروج تھی "لچر" قرار دیجائے، عام قاعدہ ہے کہ ہر زبان کی ابتدائی حالت کسمپرسی کے عالم میں ہی زبانوں کی سرگزشت پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ جب تک کہ ارتقائی منازل طے کرکے مصلحین کی رہین منت نہ نہیں انھوں نے موجودہ اصلاح یافتہ زبان کی شکل نہ اختیار کی، انگریزی زبان ہی

غور کیجئے کیا چوسر، وکلف اور بن جانسن وغیرہ کے وقت کی زبان اب رائج ہے؟ نہیں ہرگز نہیں، بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ میرؔ سوداؔ و قائمؔ نے مصلح ہونے کا دعویٰ کیا اور اصلاح یافتہ زبان کا اپنے آپ کو موجد ثابت کیا ہے کیا ان کی اصلاح شدہ زبان اب زمانۂ حال میں رائج ہے؟ اس کا جواب بھی نفی میں ہے، بہت سے الفاظ اور محاورات جو اس وقت معنی خیز اور مناسب و موزوں سمجھے جاتے تھے اب متروک ہو چکے ہیں، ممکن ہے کہ ایک سو سال بعد زبان اور بھی ترقی کر جائے فنون کی اصطلاحات کا جو قحط الرجال تھا وہ اظہر من الشمس ہے، دارالترجمہ حیدرآباد نے زبان کو سائنٹفک اور فنی اصطلاحات سے مالامال کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے، جسطرح ہمنے پہلے لکھا ہے ایک سو سال بعد زبان کا اور ہی کچھ رنگ ہو جائیگا کیا اس وقت حیدرآبادی یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ میرو سودا و قایم کی اصلاح کردہ زبان بالکل "لچر" تھی اور دراصل زبان جدید کے موجد ہم ہیں؟

جسطرح ہمنے اوپر لکھا ہے محمد شاہی دور کی مشہور خصوصیت ایہام گوئی تھی جس کی مظہر وغیرہ نے سختی کیساتھ مخالفت کی اور اس دور کے تمام اساتذہ نے اس داغ سے اپنے کلام پاک کیا حتیٰ کہ شاہ حاتم نے بھی اس طرز کو ترک کیا، قایم اسی ایہام گوئی کے متعلق کہتے ہیں۔

ہو رم روم مرا کیوں نہ خوش کہ وہ بت چین ۔۔۔ یہ کہہ گیا ہے کہ آؤں گا آج میں سر شام
بطور ہزل ہے قائم یہ گفتگو ورنہ ۔۔۔ تلاش ہے یہ مجھے ہو نہ شعر میں ایہام

وہ شعراء جو پہلے اس رنگ میں کہتے تھے انھوں نے بھی اپنی روش بدلدی اور اسی جدید طرز میں لکھنے لگے ہم نے اوپر لکھا ہے کہ اس دور میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ اصلاح زبان کا تھا کیونکہ قدما کے پہلے دور تک سنسکرت، بھاشا اور قدیم دکنی زبان کے سیکڑوں الفاظ مستعمل تھے، اور فارسی و عربی زبان کے الفاظ میں صحت کی بہت کم پروا کی جاتی تھی، لیکن اس دور میں سب سے پہلے شاہ حاتم نے اس کی طرف توجہ کی اور بہت سے الفاظ کی اصلاح کر کے اردو زبان کو دہلی کے محاورے کے مطابق بنانا چاہا مگر اس اصلاح کی تکمیل میرؔ و مرزاؔ اور دردؔ و قایمؔ نے کی، ان بزرگوں نے قدیم محاورات و الفاظ میں تغیرات پیدا کئے، ان اصلاحات کے بعد اردو شاعری بالکل فارسی کے قالب میں ڈھل گئی، اور ہمارے شعراء نے بالکل ایرانی طرز میں کہنا شروع کیا، جن لوگوں کی طبیعت کو مضمون آفرینی سے مناسبت تھی انھوں نے ناصر علی، جلالؔ، اسیرؔ و کلیم و بیدلؔ کے رنگ میں کہنا شروع کیا لیکن خوش مذاق شعراء نے طالب آملی اور شفائی وغیرہ کی روش اختیار کی، چنانچہ میر حسن اپنے تذکرہ میں قایم کی نسبت کہتے ہیں۔

"طرزش بطرز طالب آملی ماند"

یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ہمارے شعراء نے فارسی کی طرز ہی کو نہ صرف اختیار کیا بلکہ ان کے کلام کو پیش نظر رکھکر شاعری شروع کی، چنانچہ بعض نے شعرائے فارسی کی غزلوں پر غزلیں لکھیں اور مقطع میں ان کا پورا مصرع نقل کر دیا، بعض نے انہیں ردیف و قافیہ میں غزلیں کہیں بعض نے اساتذۂ فارسی کے اشعار کا ترجمہ کیا اور یہ بات اس وقت نہایت عمدہ سمجھی جاتی تھی کہ اردو شاعری کو فارسی کی ناز کخیالی،

مضمون آفرینی اور لطیف جذبات سے مالا مال کر دیا جائے۔
نظیری کا ایک شعر ہے ؎

دیدہ ام دفتر پیمان وفا حرف بہ حرف نام خوباں ہمہ ثبت است ہمیں نام تو نیست

قایم نے اس کا بالکل لفظی ترجمہ کیا ہے ؎

فہرست میں خوبان وفادار کے پیارے دیکھا تو کہیں اس میں تیرا نام نہ پایا (شعر الہند جلد اول)

جدید تعلیم یافتہ گروہ کا یہ اصلاحی مطالبہ ہے کہ اردو زبان کی غزلوں میں عموماً بسیط خیالات ادا نہیں کئے جاتے ہیں یعنی ہر شعر کا مضمون جدا ہوتا ہے اور اس میں صرف ایک ہی خیال ادا کیا جاتا ہے اس لئے غزل کو قطعہ بند ہونا چاہیئے جسمیں اول سے آخر تک مسلسل طور پر اسی کیفیت یا جذبہ کا اظہار کیا جاسکے، قایم نے اس مطالبہ کو بھی بہت کچھ پورا کیا ہے، چنانچہ قایم کے قطعات و رباعیات کی تمام تذکرہ نویسوں نے داد دی ہے
شیفتہ تحریر فرماتے ہیں۔

"لاسیما در قطعات و رباعیات مضامینے کہ دلالت بر شوخی فکرش کند از طبعش تراویدہ"

قایم کے عاشقانہ قطعات ملاحظہ ہوں،

کان تک یار کے قایم مرے اس عالم سو مدعا رفتہ جو گزر جانے کا مذکور گیا
سن کے اتنا تو کہا حیف کہ اس دنیا سے ناز برداری معشوق کا دستور گیا

یار کیوں بکتے ہو بیفائدہ مجھسے جاؤ اتنی کہتے ہو مجھے اتنی اسے سمجھاؤ
وہ نہیں تو کہ تجھے غم ہو کسی عاشق کا یا کوئی جیو نصیبوں ستی یا مرجاؤ

میں کہاں خلق تمہاری جو کمر کہتے ہیں تم بھی کچھ اس کا کہیں ذکر و بیاں سنتی ہو
ہنس کے یوں کہنے لگا خیر اگر ہے یہ بات ہو دیگی ویسی ہی جیسی کہ وہاں سنتی ہو

خوب نکلے ہم اس کے کوچہ سے ورنہ آسے تھے اک عذاب میں رات
لیک خالی سی کچھ لگے ہے بغل دل گرا شاید اضطراب میں رات

رباعی کا نمونہ ملاحظہ ہو:-

دیکھ حال مرا اٹھا کے سو سو چیلے ساتھی بھاگے ہر اک طرف کو جی لے
کہتی تھی جو کفش میں نہ چھوڑوں گی قدم سو اُسکے بھی ہو چکے ہیں ٹانکے ڈھیلے

کیا پشم ہیں دنیا کے یہ سب اہل نعیم بیقدر کریں ہم کو جو دیکھ زر و سیم
مسجد میں خدا کو بھی نہ کیجئے سجدہ محراب جو خم نہ ہو برائے تعظیم

کسی متمدن قوم اور متمدن زبان کا دوسری قوموں اور دوسری زبانوں کے اثر سے محفوظ رہنا اصول تمدن کے خلاف ہے، اسلئے یہ بات عام طور پر مشاہدہ میں آتی ہے کہ اردو شاعری نے ایک طرف فارسی زبان کے سرمایہ سے مدد لی ہے، تو دوسری طرف سنسکرت اور بھاشا کی بھی خوشہ چینی کی ہے اور ملکی خصوصیات اور ملکی رسم و رواج نے بھی اپنا اثر ڈالا، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی ملکی اور مذہبی خصوصیات کا اثر ہر دور کے شعراء کے کلام میں نظر آتا ہے، چنانچہ قایم بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے،

دل میرا تم کو تو لنکا ہے دسہرہ کی تہاں فتح ہے سال بھر اُسکی جو اُسے لوٹے گا

بھری آتی ہیں قایم پے بہ پے آنسو سے کہے تو چشم کو میری کہیں یہ رہٹ کی گھڑیاں

یہ امر مسلم ہے کہ علم و ادب کو ہمیشہ شاہانہ سرپرستی و مربی گری کی ضرورت رہی، علوم و فنون نے اسیوقت ترقی کی جب کہ علم دوست سلاطین نے اپنی علم دوستی کا ثبوت کامادی صورت میں دیا یعنی علما و فضلا کو کسب معاش و فکر روزگار سے نجات دلائی جب تک کہ "بقائے حیات" کی جدوجہد سے ان کو اطمینان و یکسوئی حاصل نہ ہوئی وہ اپنی پوری توجہ علم و فن کی طرف مبذول نہ کر سکے، خلفائے عباسیہ کے عہد میں فنون نے جو ترقی کی وہ محتاج بیان نہیں، مغلیہ شاہنشاہوں کے سایۂ عاطفت میں جیسے باکمال اہل علم کا مجمع رہا تاریخ انکا ثبوت دیتی ہے، دکن کی اسلامی سلطنت بہمنیہ نے اپنی علم دوستی کے اظہار میں جامی و حافظ کو ایران سے مدعو کیا تھا، عادل شاہی اور قطب شاہی سلطنتوں کی علمی فیاضیاں زبان زد عام ہیں، مختصر یہ کہ اہل علم اپنے کمالات کا اظہار بخوبی اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک کہ ان کو اطمینان قلب حاصل نہ ہو، جب تک دہلی کی دولت و ثروت، علما کے اخراجات کی متحمل ہو سکی علما و فضلا و ادبا مثل پروانہ جمع رہے اور جب تباہی آئی تو ایک ایک کر کے دہلی سے رخصت ہوئے اور تلاش روزگار میں سفر اختیار کیا، کوئی کسی نواب کے دربار تک پہونچا اور کوئی کسی امیر کے محل تک، کسی کو وزیر اودھ کے دربار تک رسائی حاصل ہوئی، الغرض تمام شعرا اور اہل کمال نبات النعش کی طرح منتشر ہو گئے، چنانچہ قایم بھی دلی سے رخصت ہو کر وطن آئے اور کچھ دنوں یہیں رہے۔

اردو شاعری کی ترقی کا آغاز اس وقت ہوا جب کہ دکن کی اسلامی سلطنتیں کمال عروج کو پہونچ چکی تھیں، چنانچہ اردو شاعری نے انھیں سلطنتوں کے سایۂ عاطفت میں نشوونما حاصل کیا، سلطان ابراہیم عادل شاہ، سلطان محمد عادل شاہ، علی عادل شاہ ثانی اور قطب شاہ و محمد قلی قطب شاہ و عبداللہ قطب شاہ و ابوالحسن تانا شاہ کی سرپرستی و ادب نوازی نے شعر کو کسب معاش سے بے نیاز

کر دیا، اسی باعث ان کی دماغی قوتوں نے میدان تغزل کو رنگا رنگ کی چمن آرائی سے باغ و بہار بنا دیا اس کے بعد محمد شاہ رنگیلے کے عہد میں اُس کی سرپرستی کی گئی اور یہ سلسلہ بہادر شاہ کے عہد تک جاری رہا، دہلی کی تباہی کے بعد اکثر شعرا نے لکھنو کا رُخ کیا، خان آرزو حملہ نادری کے بعد ہی ۱۷۳۹ء میں لکھنو چلے آے، اسیطرح دیگر شعرا بھی وارد لکھنو ہوتے گئے اور لکھنو کو شاعرانہ حیثیت سے ایک قسم کی مرکزیت حاصل ہوگئی، اس لٹے ہوے قافلہ کی سرپرستی کا آغاز اگرچہ شجاع الدولہ ہی کے زمانہ سے شروع ہوگیا لیکن شعرا کی قدر دانی کا اصلی زمانہ آصف الدولہ کے عہد وزارت سے شروع ہوا اور غازی الدین حیدر کے زمانہ تک قایم رہا، وزراے اودھ کے ساتھ لکھنو اور لکھنو کے علاوہ دوسرے مقامات میں امرا و رؤسا کے درباروں میں شعرا کی قدر دانی ہوتی تھی، اُن میں مرزا سلیمان شکوہ نواب محبت خاں، نواب مہربان خاں رند اور نواب محمد یار خان کے درباروں سے اس دور کے اکثر اساتذہ کا تعلق تھا مصحفی مرزا سلیمان شکوہ کے دربار سے تعلق رکھتے تھے، جرات پہلے نواب محبت خان کے دربار میں تھے لیکن بعد کو وہ بھی مرزا سلیمان شکوہ کے سلسلۂ ملازمت میں داخل ہو گئے، مرزا رفیع سودا اور میر سوز نواب مہربان خاں سے تعلق رکھتے تھے، نواب محمد یار خاں امیر، نواب محمد خان مورث فرمانروایان رامپور کے چوتھے بیٹے اور نواب فیض اللہ خاں کے بھائی تھے، آنولہ کے قریب ٹانڈہ ایک بستی ہے وہاں کی بود و باش تھی، شعر و سخن اور سیر و شکار کا شوق تھا اول اول جب سخن گوئی کی طرف طبیعت مائل ہوئی تو اپنی استادی کے لئے میرزا رفیع سودا اور میر سوز کو بلایا، ان دونوں بزرگوں سے نواب مہربان خاں رند کے ہاں ملازم ہونے سے معذوری ظاہر کی تو بالآخر قرعۂ فال قایم چاند پوری کے نام پڑا، اور ان کو بلا کر سو روپیہ ماہانہ کر دئے، اور ان سے مشق سخن کی، جس سے قایم کو استادی کا شرف حاصل ہوا، چنانچہ وہ خود اس کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں،

جو قایم خوبی کو نین ہے قصد　　تو خدمت کر محمد یار خاں کی

قایم کے علاوہ اور بھی متعدد شعرا مثلاً قدسی لاہوری، میر محمد نعیم، میاں عشرت، حکیم اکبر علی سنبھلی اور پروانہ علی شاہ مراد آبادی اور مصحفی وغیرہ بھی مقربین بارگاہ تھے رات دن شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا اور نواب صاحب موصوف جو غزل طرح کرتے تھے یہ لوگ اس کو سرانجام دیتے تھے، چنانچہ قایم نے ایک شعر میں اس اجتماع کا ذکر کیا ہے ؎

تجھ کو قایم رکھے اللہ بہت سا امیر　　مجتمع سایہ میں ہیں جسکے سخنداں ایسے

نواب صاحب موصوف کے حکم سے اس زمانہ کے مشہور مصور عاقل خاں نے ایک مرقع تیار کیا تھا جس میں نواب اور ان کے حاشیہ نشین شاعروں کی تصویریں بنائی تھیں جو اگر اس زمانہ میں موجود ہوتا تو ایک یادگار چیز خیال کیا جاتا، (شعر الہند و تذکرہ گل رعنا) مرہٹہ گردی میں تمام لوگ بنات النعش کی طرح منتشر ہوگئے اور نواب کو فیض اللہ خاں آکر رامپور لیگئے اور پچاس ہزار روپے سالانہ ان کی جیب خاص کے لئے مقرر کر دیا، ۱۱۸۸ھ میں وفات پائی، دلی کی تباہی کے بعد کچھ دن وطن میں پریشان حال رہنے کے بعد قایم کو یہاں اطمینان حاصل ہوا تھا لیکن جب یہاں بھی بخت سیاہ نے چین لینے نہ دیا تو فلک کجرفتار کو شکوہ کرتے ہوئے یہ بھی رامپور چلے گئے ۔ احمد یار خان پسر نواب فیض اللہ خان نے ان کی تنخواہ مقرر کر دی، کچھ دنوں اسپر قناعت کی لیکن جب

تنگ حالی سے زیادہ پریشان ہوئے تو لکھنؤ آئے اور مہاراجہ ٹیک راے کا شقہ اپنے وطن کے عامل کے نام کے گئے، یہ لوگ اور ملکیتیں جو ضبط ہوچکی تھیں ان کو پھر بحال کرایا، اس کے بعد پھر رامپور چلے گئے، وفات تک وہیں مقیم رہے،

(تذکرۂ گل رعنا و شعرالہند جلد اول)

غرض اس دور میں شاعری ایک لازمۂ امارت بنگئی تھی اور تقریباً ہر ایک امیر کے دربار میں جیساکہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے شاعری کا ایک مخصوص صیغہ قائم ہوگیا تھا، جو شعرا کی معاش اور قدردانی کا اصلی ذریعہ تھا یہ قدردانی ایک حدتک شعرا کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی اس لئے کہ ان کو کسب معاش کے افکار سے نجات ملی، لیکن ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ شعرا کے کلام کی تمامتر کامیابی امرا و سلاطین کی پسندیدگی پر موقوف رہگئی چنانچہ قایم کہتے ہیں۔

سرسبز یہ غزل ہو جو نواب کے حضور　　مانوں گا، شاعری کو میں قایم تبھی تیری

بیپارے معاملت ہے سخن آشنا کے ساتھ　　قایم سمجھ کے بولیو نواب کے حضور

باقی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔باقی

فلسفۂ مذہب

(بہ سلسلۂ ماسبق)

مذہب اور نبوت نبی کا مفہوم تقریباً تمام سامی زبانوں میں وہی ہے جو عربی میں ہے۔ یعنی خبر دہندہ۔ مجھے اس میں شک ہے کہ آیا نبی مادہ "نبآ" (خبر دینا۔ بتانا۔ اطلاع دینا) سے بنا ہے۔ یا نبی خود ایک مستقل لفظ جامد ہے اور اس سے نبا کا فعل مشتق ہوا ہے۔ کیونکہ عبرانی لفظ نابی یا "تابہیم" اور اسوری لفظ "نابو" مرادف الفاظ ہیں اور ان کا کوئی مادہ نہیں۔ اہل بابل میں ایک دیوتا کا نام نبو (Nebo) تھا جو نبیو سے نکلا ہے۔ یہ دیوتا انسانی مقدرات کو ظاہر کرنے والا سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کے معنے سے وہی صفات پیدا ہوتے ہیں جو عبرانی لفظ "نابی" سے پیدا ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جس قوم نے سب سے پہلے انسان کی ایک جماعت کا نام نبی رکھا تھا وہ اہل کنعان فنیقیا تھے۔ جن کے ہاں بعل دیوتا کے بڑے پروہت کا لقب نبی ہوتا تھا اور اس کا منصب و مشغلہ دیوتاؤں کی طرف سے غیب کی خبریں دینا تھا پروہتوں کی جماعت دو درجوں میں منقسم تھی ایک ادنیٰ اور ایک اعلیٰ ادنیٰ جماعت روح کہلاتی تھی، مگر ان دونوں جماعت کے مشاغل وہی تھے جو کاہنوں اور رمالوں کے اکثر ہوا کرتے ہیں۔ عبرانیوں نے یا تو یہ لفظ اہل بابل کی اصطلاح سے لیا یا خود کنعانیوں سے جو اُن کے ہمسایہ تھے۔ کیونکہ عبرانی لفظ "بیہیم" کا کوئی مادہ نہیں ہے۔ بعضوں نے یہ خیال کیا ہے کہ یہ لفظ "منہبو" سے نکلا ہے جس کے معنی عبرانی میں شوریدہ سر کے ہیں۔ کیونکہ بنی اسرائیل کے نبی ظاہری حالت میں مسلمانوں کے درویش و مجاذیب سے مماثل ہوا کرتے تھے۔ مگر یہ ایک ناقابل اطمینان توجیہ ہے اور سب سے بڑی مخالف وجہ یہ ہے کہ یونانیوں نے جب کتب مقدسہ کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا تو نبی کا ترجمہ پرافیٹس (Prophiteus) کیا ہے اور جس سے انگریزی لفظ پرافٹ یعنی غیب کی خبر دینے والا نکلا ہے۔

مشہور یہودی فلسفی فیلو (Philo) نے سچے نبی کی تعریف یہ کی ہے کہ وہ صاحب جذب و حال ہو اور جو کچھ وہ کہے وہ اسکی طرف سے نہ ہو بلکہ وہ الہامی الفاظ ہوں جو اس کی خود عقل و حواس کو اپنے اندر جذب کرلیں، برخلاف ان جھوٹے نبیوں کے جو محض اپنی عقل سے کام لیکر بعض واقعات کا شگون لیتے ہیں۔

غیب دانی یا شگون کا اعتقاد تقریباً دنیا کے تمام اقوام میں پایا جاتا ہے۔ انسان چونکہ ایک پابند مخلوق ہے اور یہی وہ پابندیاں ہیں جو اس کو مذہبی اعتقاد کی طرف رجوع کرتی ہیں اور یہ پابندی انسان کے اس خاصہ سے پیدا ہوتی ہے جو ہراس موت کے نام سے مشہور ہے اِس فطری خاصہ نے اس کو ہر اس چیز کا پابند و محکوم بنا دیا۔ جس کو وہ حیات بخش یا مالک تصور کرتا تھا۔ اور جیوں جیوں انسان کی عقل نے اپنے مفروضہ حیات بخش یا مالک قوتوں کو اپنا سا مجبور پایا تیوں تیوں وہ مجبور کی

معبودیت سے گزر کر جابر کی معبودیت پر آ تا گیا۔ گویا شرک و بت پرستی اصل فطرت انسانی تقاضا ہے اور اس کے بعد تعلیم و ترقی سے انسان توحید کی طرف پہنچتا ہے۔ جب انسان کو اپنے سے بالاتر ہستی کے وجود کا یقین ہوا اور اس نے اُن کی قبضۂ قدرت میں انسانی حیات و ممات کو سمجھا تو یہ لازم تھا کہ ایسی ہستیاں گاہ بگاہ اپنے منشار اور ارادے سے انسان کو آگاہ کر دیا کریں افلاطون نے اسیواسطے کہانت یا فال زنی کو دیوتاؤں اور انسانوں کے درمیاں یگانگت کا ایک واسطہ و وسیلہ جانا ہے اور اسٹوئک فلاسفہ (Stoics) نے اس عام خیال و رواج کی تائید اسواسطے کی ہے کہ اسپر تمام قوموں کا عمل رہا ہے اور یہی خیالات ہیں جن سے مذہب کی نشو و نما ہوتی ہے۔ فال زنی یا غیب گوئی کی مختلف صورتیں ہوا کرتی تھیں اکثر یہ اس طرح ہوتی تھی کہ انسان حالت خواب یا بیخودی میں ان ارواح انسانی سے جو مر چکی ہیں ایک قسم کا تعلق پیدا کر کے ان ذریعہ سے بعض واقعات آیندہ کی اطلاعیں حاصل کیا کرتا تھا۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جیوں جیوں عقل انسانی نے ادنیٰ دیوتاؤں سے اعلیٰ دیوتاؤں کی طرف رجعت کی اسی کے ساتھ لازمی طور سے کاہنوں۔ رمالوں اور ساحروں کی جماعت نبوت کی صورت میں منتقل ہوتی گئی اور آخر میں خود نبی بھی دیوتاؤں کی فہرست میں شامل ہو گئے۔ جن کی پرستش یا تو محض صورت الہامی کی تمثالی صورت میں جیسا رومیوں نے ایس یوکیوٹیس (Avis Eucatius) کے فرضی نام پر ایک بتکدہ بنا لیا تھا یا مصریوں کی طرح "ہرمس" (Hermes) کو انسانی شکل میں جاکر دیوتاؤں کے پیغام بر ہونے کی حیثیت سے پرستش کی۔ یا اہل بابل کی طرح مردوک کو سب سے برتر غیب گو خدا اور اس کے بیٹے "نبو" اور اس کی زوجہ "تشمت" کو الہام و نبوت کی ظاہری صورت و ہیولیٰ میں پرستش کی۔ مصریوں میں نبوت کا یہی دیوتا "ٹوٹھہ" (Stotch) کے نام سے مشہور ہوا اور کہا جاتا ہے کہ وہ مصریوں کی ہدایت کے لئے بیالیس علوم کی کتابیں دنیا میں لایا۔ یونانیوں میں اپالو دیوتا کی نسبت بھی یہی اعتقاد تھا کہ اس نے اپنے پیدایش کے وقت یہ اعلان کیا تھا کہ وہ اپنے باپ خدائے "زیوس" (Zeus) کا پیغام انسانوں کو پہنچانے کے لئے بھیجا گیا ہے اگرچہ اپالو کا کلام ہم تک نہیں پہونچا ہے مگر اس اعلان کے بعد یونانیوں میں غیبی لٹریچر کا اضافہ ضرور ہو گیا تھا جو "ڈلفی" (Delphi) کی اوریکل کے نام سے مشہور ہے۔ رومیوں میں "سبلس" (Sybillus) کی کتابیں الہامی وقعت سے دیکھی جاتی تھیں۔ یہ کتابیں ایک مندر میں ایک مخصوص و مقدس جماعت کے زیر نگرانی محفوظ رہتی تھیں اور احکام مذہبی و معاشرتی کے لئے اس کتاب سے استفادہ کیا جاتا تھا تاریخ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ کتاب سے کس طرح سوال کیا جاتا تھا مگر اس واقعہ سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ ایک غیبی قانون کا اعتقاد تو یوں ہی ہمیشہ رہا ہے اور اسی کی طرف آخر میں وہ رجوع ہوتے تھے اور اس کے فال پر معاملات کے تصفیہ کو منحصر جانتے تھے۔ چنانچہ ہندوؤں۔ یہودیوں۔ مجوسیوں و مسیحیوں کے کتب مقدسہ کے الہامی دعاوی ہم سب کو معلوم ہیں اور وید زند و استا د توریت و انجیل کے متعلق اُن مذہب کا اعتقاد تقریباً وہی ہے جو ہم مسلمان قرآن کے لئے مانتے ہیں۔ صرف اہل چین کے مذہبی گروہ طاؤزم و کنفوشسزم میں طاؤ و کنفوسش کے اقوال کو الہامی نہیں جانتے مگر بات وہی ہے کہ

ان کے اعتقاد میں وہ خود خدا تھے۔

نبوت کی صرف دو صورتیں موجودہ مذاہب میں پائی جاتی ہیں۔ایک تو وہ جو نبی کو عین خدا اور اس کا اوتار جانتے ہیں۔ اور دوسرا جو ان کو انسان محض مگر گناہوں سے معصوم اور اخلاق میں ایک نمونہ اور خدا کا پیام بر جانتے ہیں۔مسیحیت ہنود و بودھ مذہب میں نبوت کی پہلی صورت ہے۔ اور مجوس۔ یہود اور اسلام دوسری صورت کو تسلیم کرتے ہیں مگر تقریباً تمام مذاہب اس بات پر متفق ہیں کہ نبوت کی خواہ کچھ ہی صفات ہوں وہ انسانی مجسمہ میں انسانوں کے معلم ہوکر دنیا میں آئے ہیں اور بقول علامہ شبلی " خدا نے جس طرح انسان کو اور مختلف قوتیں عطا کی ہیں جو بعض افراد میں بالکل نہیں پائی جاتی اور بعض میں یہ تفاوت درجات پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح ایک روحانی قوت عطا کی ہے جس کا نام قوت قدسیہ یا ملکۂ نبوت ہے یہ قوت تزکیہ نفس اور پاکیزگی اخلاق سے تعلق رکھتی ہے۔جس شخص میں یہ قوت موجود ہوتی ہے وہ اخلاق میں کامل ہوتا ہے اور اپنے اثر سے اور انسانوں کو کامل بنا دیتا ہے۔ یہ شخص کسی سے تعلیم و تربیت نہیں پاتا بلکہ بغیر تعلیم و تعلم کے اس پر حقایق اشیا منکشف ہوجاتی ہیں"

اب دیکھنا یہ ہے کہ نبوت کی کونسی صورت مذہب فطرت کے مطابق ہے بادی النظر میں دوسری صورت دل کو بہت لگتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں الہیات کی وہ شان پیدا ہوجاتی ہے جو توحید کا حصہ ہے اور توحید کا ماننا جیسا میں نے الہیات و مذہب میں دکھلا دیا ہے۔ انسانی ارتقاء عقلی کا مقتضا ہے۔برخلاف دوسری صورت کے کہ وہ محض شرک و بُت پرستی یا انسان پرستی ہے اور خدا کے اکثر صفات کے منافی ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ نبوت کی پہلی صورت کو سمجھنا اس سے زیادہ مشکل ہے جتنا کہ دوسری صورت ہے کیونکہ خود خدا کی تعریف سے انسانی عقل عاجز ہے اس لئے خدا کی تعریف عقل انسانی سے ممکن نہیں اور جب تک خدا کی ذات و صفات پوری طرح سمجھ میں نہ آئے نبوت اور الہیات کا تعلق سمجھنا ایک نہایت مشکل امر ہے پھر چونکہ ابتدائی عقل انسانی مجبور تھی کہ اپنے ابنائے جنس میں مافوق العادۃ باتیں پاکر اسی کا پرستار و بندہ ہوجائے اور اسی کو خدا کا اوتار اور مثیل سمجھنے لگے یہ خیال اس قدر فطری اور عام ہے کہ ہمارے جاہل صوفیہ میں وصل و عرس کی اصطلاحیں موجودہ اولیا اللہ کی وفات و برسی کے لئے استعمال کرتے ہیں وہ درحقیقت انہیں خیالات کا پرتو ہیں گویا کہ اکابر دین میں خدا کی روح حلول تھی اور ان کے جسم سے چھوٹکر وہ روح اپنی اصل روح سے مل کر ایک ہوگئی۔گو وہ اس بات کے علی الاعلان قائل نہیں ہیں کہ اولیاء اللہ کی ارواح خدا کا کل ہے یا جز کیونکہ انہیں سے ایک اقرار کے بعد وہ توحید اسلام سے بہت دور جا پڑتے ہیں لیکن اگر وصل کا لفظ کوئی معنی رکھتا ہے توکسی کے موت کو واصل بحق کہنا محض ویدانت کی تفسیر ہے۔نہ اسلام کی۔ اور جو لوگ کہنے کے عادی ہیں کہ فلاں بزرگ کا وصال ہوگیا وہ درحقیقت بے خبری سے ہندوؤں کی تقلید کرکے اُن کو ممنون بناتے ہیں اسیطرح گروہ پیرزادگان میں عرس کی اصطلاح سمجھ میں نہیں آتی کیا عجب کہ تخیلات شاعری نے وصل کو عروسی کا لازمی نتیجہ سمجھکر اللہ میاں اور مرنے والے بزرگ کے نکاح کی ٹھہرائی ہو۔ اور یہ بیہودہ خیالات اس درجہ پستی کو پہنچ گئے ہیں کہ بعض بدبخت "سدا سہاگن" کا مسخرہ پن کرکے وہ ناپاک مظاہرات قبور پر کیا کرتے ہیں۔ جو سیدنا عمرؓ کو قبر میں تڑپا دیں۔

کے لئے کافی ہیں۔

الغرض انسان نبوت کے اس خیال کو اس وقت ترک کرسکتا ہے جبکہ وہ خدا کو شخص مانے اور ـــــــ غیر مفہوم خدائی ہستی کو انسان کا ہم شبیہ و مثل بنایا جائے یعنی خدا کی صورت ایک جلیل القدر بادشاہ کی طرح ہو۔ اور جس طرح انسان اپنے قوا کی مدد سے غصہ کرتا۔ روتا۔ افسوس کرنا۔ ہنستا یا بات چیت کرتا ہے۔ اسیطرح وہ خدا بھی کرتا ہے اور جس طرح بادشاہ تخت پر متمکن ہوکر اپنے سفراء وزرا کو رعیت میں بھیج کر اپنے ارادے سے ان کو خبر کرتا ہے۔ اسی طرح یہ خدا بھی چند برگزیدہ لوگوں کو وقتاً فوقتاً اپنی طرف سے اپنے بندوں میں بھیجکر اپنے ارادۂ خداوندی سے آگاہ کرے بغیر اس تصور کے ثبوت کی دوسری صورت مشکل سے سمجھ میں آتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ بنی اسرائیل جو ثبوت کی دوسری صورت قبول کرتے ہیں۔ وہ بغیر خدا کو مجسم اور انسانی صفات کا مانے ہوئے نبوت کو اس حد پر قائم نہ رکھ سکتے تھے۔ چنانچہ کلام آلہی کی کیفیت ان کے ہاں ایسی طفلانہ ہے جسکو سنکر ہنسی آتی ہے، ہیکل کے پردے کے نیچے یا آگ کے شعلوں میں خدا اتر کر اپنے فرستادہ سے ہم کلام ہوتا ہے۔ اور جب اسکو کوئی تحریری حکم دینا ہوتا ہے تو پتھر کے ٹکڑوں کو منگواکر اسپر اپنی انگلیوں سے لکھ کر دیتا ہے۔ تکلم الناس علیٰ قدر عقولہم عربی کی ایک مشہور ضرب المثل ہے اور الہام کی یہ بھونڈی صورت جو یہود مانتے ہیں وہ درحقیقت ان کے سمجھ کے مطابق بتائی گئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ بنی اسرائیل کی توحید کے باوجود ان میں ایسے مراسم کا شدت سے پایا جانا جو عموماً بت پرست اپنے دیوتاؤں کے لئے کیا کرتے ہیں۔ مثلاً قربانی کرنا۔ یا بخور جلانا وغیرہ وہ محض اس بات کا پتہ دیتا ہی کہ ابتدائی زمانہ میں انسانی عقل جب تک معبود کو اپنا مثل نہ جانے وہ اس کو سمجھنے یا قبول کرنے کی قابلیت نہ رکھتا تھا اور بنی اسرائیل تاریخ میں وہ قوم ہے جس سے ہم یہ پتہ لگا سکتے ہیں کہ انبیاء کس طرح ایک عاقل و زمانہ شناس مدبر کی طرح قوموں کو الہیات و مذہب کی تعلیم دیتے تھے اور ان کو وہی باتیں سکھاتے تھے جو انکی سمجھ میں آسکیں یا انکا ماحول جس حالت کا ان کو عادی بنا رہا ہو اور ان کی ان طفلانہ فعلوں سے اسوقت تک تعرض نہ کرتے تھے جب تک ان کے ان اعمال سے اصل مقصد توحید کا فوت نہ ہوجائے۔ چنانچہ اسلام میں مناسک حج کی اجازت اسی مصلحت پر مبنی ہے۔ انبیاء بنی اسرائیل نے صرف اتنا کام کیا ہے کہ تمام مختلف معبودوں کی جگہ ایک معبود "یہود" کو قرار دیکر اس کی عبادت کی طرف اپنی قوم کو مائل کردیا اور طریقہ عبادت میں وہی باتیں رہنے دیں جو بت پرست اور مشرکین اپنے متعدد معبودوں کے لئے بجالاتے تھے مگر جب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تجدید اپنے دور میں کی تو وہ زمانہ ایسا تھا کہ انسانی عقول پستی سے بلندی کی طرف مائل ہوچکی تہیں اس لئے اسلام کا نظریہ الہیات اور نبوت کے متعلق وہی ہے جس کو تقریباً آج کل کے یوروپ کے فلاسفر بھی قبول کرنے کو تیار ہوسکتے ہیں۔ اسلام جہاں نبوت کو الہیات سے جدا مانتا ہے وہ اللہ کو نور السموٰت والارض بھی مانتا ہے۔ ایک طرف غیر مجسم منزہ۔ ازلی نور ہے اور دوسری طرف انسان کا کالبد خاکی و فانی۔ پس اسلامی نبوت کے لئے تنقیح طلب یہ مسایل ہوجاتے ہیں کہ یہ دو متضاد باتیں کیونکر باہمی تعلقات پیدا کرسکتی ہیں اور اگر خدا اپنی قدرت کے وسعت سے ایک بندے سے تعلق پیدا کرتا ہے یا کرنے پر قادر ہے تو پھر ایک

مخصوص جماعت نبیوں کی ضرورت ہی کیا ہے اس کا کلام ہر شخص کے دل پر القا ہو سکتا ہے اور ہر شخص کو فطرتاً برگزیدہ بنا سکتا ہے۔ پھر خدا کے کلام کے کیا معنے ہیں اور اس کی کیا کیفیت ہے۔ آیا وہ کلام خدا کی طرح خالق اور ازلی ہے یا مخلوق و فانی۔ اس کا کلام بندے تک کس طرح پہنچتا ہے اور کون سے معیار ہیں جن سے ہم ایک کلام کو الہامی کلام قرار دیں۔

اگر خدا غیر مجسم اور ایک لامکان نور ہے تو افلاطون اور فیلو کا یہ مقولہ ایک حد تک قابل اعتنا ہے کہ ایسی صورت میں خدا کی صفات پر کلام کرنا ممکن نہیں۔ کیونکہ صفات ازلیت ولامکانیت کے متناقض ہیں صفات سے ہم ایک چیز کو محدود کر دیتے ہیں اور خدا محدود نہیں ہے وہ ازلی غیر مبدل جوہر لامحدود کافی ہے اور ان صفات انسانی سے بالاتر ہے جو ہم اس کے لیے تصور کر سکتے ہیں۔ ہم صرف خدا کے بارے میں یہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ موجود ہے مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کیا ہے اور محض اس کی ذات کو صفات سے علحدہ رکھ کر ہم اس کو مخلوقات سے علحدہ اور بالاتر درجہ دے سکتے ہیں۔ صفات کے انکار کے ساتھ ہم صرف اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ وہ کامل ہے اور کمال کی تمام خوبیاں اس میں ہیں اس کا وجود تمام کائنات پر حاوی ہے۔ ان خیالات کو مانتے ہوئے خدا کے تعلقات عالم سے سمجھ میں نہیں آتے کیونکہ جب ایک ذات صفات سے منزہ و مبرہ ہے تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس کا تعلق کائنات کے کثیرالاضداد اشیاء سے اسیطرح تصور کیا جائے جسطرح ایک بادشاہ کا اپنی رعیت سے ہے خدا کا برتر مکمل اور منزہ ہونا اور مخلوقات کا اس کے برخلاف کمتر ادنیٰ اور ناقص ہونا اجتماع ضدین ہے اس لئے فلاسفہ یونان نے خدا اور کائنات کے تعلقات کے امکان کے لئے ایک نظریہ قایم کیا ہے۔ اور ان دونوں کے درمیان حکمت خداوندی کو ایک واسطہ ٹھیرایا ہے۔ یونانیوں میں اس حکمت خداوندی کو لوگس (Logos) کہتے ہیں جس کا لفظی و اصطلاحی ترجمہ ہمارے یہاں کلام ہے۔ خدا میں کوئی صفات نہیں۔ لیکن وہ غیر محدود اقسام کی حکمت خداوندی کا سبب ہے اور اسی کے وسیلے سے خدا اور کائنات میں تعلقات قایم ہوتے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ خدا اور لوگس یا کلام میں خود کیا تعلقات ہیں۔ اسٹوئک فلاسفہ کے نزدیک خود کلام خدا ہے اور اسی کی آواز بازگشت ہم کو انجیل یوحنا کے پہلے باب کی پہلی آیت میں ملتی ہے یعنی" ابتدا میں کلام تھا۔ اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خود خدا تھا" لیکن فیلو کے نزدیک یہ کلام وہی ہے جو بنی اسرائیل میں ملائکہ کے نام سے موسوم ہیں اور یونانیوں میں دیوتاؤں کے نام سے یعنی وہ بھی ایک قسم کی مخلوق ہیں جو بندے اور خدا کے درمیان واسطہ رکھتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فلاسفہ میں کلام کی ماہیت میں خود اختلاف ہے۔ ایک طرف تو یہ قول کہ وہ بذات خود کوئی چیز نہیں بلکہ مخلوقات کے لئے ایک حکمت خداوندی ہے جو خدا سے مصدر ہے اور اس لئے وہ خدا کے وجود کا محض انعکاس یا پرتو ہے۔ جس طرح روشنی سے اس کی شعاعیں نکلتی ہیں لیکن اس کا وجود خدا سے علحدہ بھی تصور کیا جاتا ہے جو بذات خود موجود ہے۔ مگر جیسا زیلر (Zeller) نے کہا ہے اختلاف لازمی نتیجہ اس نظریہ کا ہے جو فیلو نے بہ اثر مذہب یہود قایم کیا ہے۔ کیونکہ ایک طرف اس کا یہ قول ہے کہ خود خدا اپنے حکمت خداوندی سے کام کرتا ہے اور اس لئے یہ حکمت خدا اور خود خدا ایک ہی اصل ہے اور دوسری طرف اس کا یہ قول ہے

کہ مخلوق وخالق باہم مل نہیں سکتے کہ یہ اجتماع ضد دین ہے اور اس لئے جو حکمت اس سے صادر ہوتی ہے وہ لازمی طور سے دونوں کے بین میں ایک علٰحدہ چیز ہوگی فیلو کا خیال ہے کہ عقول دنیاوی عقل کامل کا پرتو ہیں جو لوگس یا حکمت خداوندی کہلاتا ہے اس لئے لوگس خدا اور بندے کے درمیان واسطہ ہے اور یہی وہ عظیم روح یا ملائکہ ہے جس کے تابع الہام ہیں اُسیکے ذریعہ عالم کی خلاقی ہوئی اور وہ خدا کے کلام کے ہم معنے ہے۔

اب اگر ہم مشاہدات وبدیہیات سے کام لیں تو انسانوں کے اندر ہم کو بعض ایسے ادراکات کا پتہ چلتا ہے جو طبائع کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے اور وہ باتیں ہر شخص میں نہیں پائی جاتیں۔ یہ مشاہدات اس کثرت سے ظہور میں آتے ہیں کہ انکی بنا پر اب تفتیش روحانیات (Psychical research) ایک خاص علمی مشغلہ ہوگیا ہے۔ ان مناظر کو جو قدیم الایام سے لیکر آج تک آسیب کے ناموں سے مشہور ہیں اور جن کی تائید میں انجیل کی متعدد روایتیں بھی موجود ہیں اس سے یہ قیاس بجا طور سے کیا جا سکتا ہے کہ انسان بعض اوقات کسی خارجی وغیر مرئی شے سے ایسا متاثر ہوجاتا ہے کہ اس کے افعال وسکنات واقوال ایک دوسری خارجی اور غیر مرئی ہستی میں جذب ہوجاتے ہیں اور جو کچھ انسان کہتا ہے یا کرتا ہے وہ خود اپنی طرف سے نہیں کہتا۔

میرا اگرچہ اپنا کوئی ذاتی مشاہدہ نہیں ہے مگر روایتیں ایسی معتبر اور متواتر ہیں کہ اس میں شبہ کی گنجایش نہیں رہی چنانچہ گورکھپور کے ضلع میں ایک دیہات ہے جس کا نام میرے ذہن سے اتر گیا وہاں ایک کمسن دیہاتی لڑکی پر یکایک ایک کیفیت طاری ہوئی اور اس نے نہایت قرارت وخوش الحانی سے قرآن کو زبانی پڑھنا شروع کیا اور یہ کیفیت کئی بار اسپر طاری ہوئی راوی نے جو ضلع بستی کے ایک معزز وکیل ہیں انھوں نے مجھ سے بیان کیا کہ لڑکی جس لہجے اور قرارت سے قرآن پڑھتی تھی وہ بالکل اس حافظ کی آواز سے مشابہت رکھتی تھی جو دس بارہ سال ہوئے مرچکا تھا اور اس کی تائید لڑکی کی زبان سے اس حافظ کی روح نے خود کی۔

اسی طرح بہار کے رہنے والے ایک نہایت ثقہ مسلمان نے جو عرصے تک خود میرے اجلاس کے پیشکار تھے مجھ سے اپنا ایک چشم دید واقعہ بیان کیا کہ ایک کانسٹبل جو رات کو گشت کو نکلا تھا جب اپنی چوکی پر واپس آیا تو یکایک انگریزی لہجے میں اس نے بولنا شروع کر دیا، اور وہ لہجہ ایک متوفی انگریز انسپکٹر پولیس کا تھا۔ جو چند سال قبل ایک تالاب میں مچھلی کا شکار کرتے ہوئے ڈوب گیا تھا۔ لوگوں نے اُس روح سے پوچھا کہ تم اس غریب سپاہی کو کیوں پریشان کر رہے ہو تو اُس نے کانسٹبل کی زبان سے جواب دیا کہ یہ شخص تالاب کے پاس سے گزرا اور ہم کو سلام نہیں کیا اس لئے ہم اسپر سوار ہوگئے۔

غرضکہ دنیا میں ایسی باتیں ہیں جن کے لئے کوئی تاویل مشکل ہے۔ اتنا تو کم سے کم ہر شخص تسلیم کر سکتا ہے کہ خود انسان میں ایک ایسی مقناطیسی قوت ہے جس کی طاقت سے وہ بغیر کسی ظاہری سلسلہ کے اپنے معمول پر اثر ڈال سکتا ہے بس جب ارواح دنیاوی انسان پر ایسا اثر ڈالنے کی قابلیت رکھتے ہیں تو کیا یہ ممکن نہیں کہ خدائی روح اس کی قوت ارادہ انسان پر اسیطرح

اثر ڈالے جس کو ہم اصطلاح میں القا یا الہام یا وحی کہتے ہیں۔ اس قوت کو خواہ لوگس کہا جائے یا ملائکہ یا روح مگر اس کے واقعہ ہونے میں کوئی بات خلاف قیاس نہیں معلوم ہوتی۔ اس لئے الہام وہ خاص قسم کی کیفیت ہے جو ایک مخصوص ظرف کے انسان میں القاء ہوتی ہے اور اس کے اثر سے خود اس کے اپنی طبعی احساسات اس وقت تک کے لئے معطل ہو جاتے ہیں۔ یہی نظریہ افلاطون کا کتاب تیماوس (Timaios) میں ہے اور چونکہ انسانی قوا و تخیلات میں بین فرق ہے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ عمل دنیا میں ہر انسان کی قابلیت پر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ ایک خاص قابلیت کا انسان ہو اور اس قابلیت کے انسان کو ہم نبی کہتے ہیں۔

اب صرف تنقیح طلب دو امور رہ گئے ہیں۔ انسان کیوں نبی ماننے کے لئے مکلف ہے اور نبی کے کلام یا الہام کا معیار کیا ہے۔ ہم اس فلسفی بحث کو اس عنوان میں اٹھانا نہیں چاہتے کہ الہام کی ماہیت کیا ہے۔ اور یہ کہ وہ مخلوق ہے یا ازلی مامون رشید کے زمانہ میں یہ مسئلہ علمائے اسلام میں ایک بڑا اہم بالشان مسئلہ تھا لیکن وہ حرفاً حرفاً یونانیوں کے فلسفیانہ افکار سے مسلمانوں میں آیا ہے۔ اور یونان کے قدماء اور مسیحیوں نے لوگس پر جو کچھ بحث ہے بجنسہ وہی بحث مسلمانوں نے قرآن کے لئے اختیار کی ہے۔ بلکہ ڈنکن بلمڈ ــــ کی رائے سے مجھے اتفاق ہے کہ علم کلام اسلام میں اول محض لوگس کے مباحث کا نام تھا اور بعد کو غلطی سے اور نمودی اشتباہ سے یہ لفظ تمام مذہبی مناظرات و مباحث کے لئے نامزد ہو گیا مسلمانوں نے لوگس کے بحث میں کوئی جدت نہیں کی۔ مختصراً انکی ساری بحث کا تجزیہ یہ ہے کہ قرآن خدا کی طرف سے ایک علم ہے۔ اس لئے وہ خدا کے صفت علم سے جدا نہیں۔ لیکن وہ ازلی اور غیر مخلوق ہے۔ لہذا قرآن بھی ایسا ہی ہے۔ خدا نے کن کا امر کیا اور دنیا پیدا ہوئی۔ لیکن یہ لفظ کن مخلوق نہیں ہے ورنہ مخلوق دنیا کا خالق ہوگا۔ قرآن شریف میں ہے "آیا مخلوق اور حکم اللہ کا نہیں"۔ یہاں پر امر مخلوق سے جدا ہے لہذا خدا کے امر نے کائنات کی خلقت کی اس لئے وہ مخلوق نہیں ہو سکتا اسی طرح خدا کا کلام جو نبی کو دیا جاتا ہے وہ غیر مخلوق اور ازلی ہے۔ معتزلہ نے اس خیال کی مخالفت کی اور انھوں نے قرآن کے لئے اس قدر کافی سمجھا کہ وہ اسکا کلام ہے جو ایک خاص اثر سے نبی اپنے زبان سے ادا کرتا ہے اور ان کا طرز استدلال قریب قریب اس سے ملتا ہے جو انیسویں صدی علماء مسیحیت ــــــــ کا لوگس کے بارے میں تھا۔ معتزلہ کو سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ وہ خدا کے صفات کے بارے میں فلاسفر فیلو کے مقلد تھے اور ایسی صورت میں قرآن کے غیر مخلوق اور ازلی ماننے میں اُن کے نزدیک عیسائیوں کی تثلیث اور اسلام کی توحید میں کوئی بین فرق نہیں رہ جاتا۔

حقیقت یہ ہے کہ بنی عباس کے زمانے میں کیا اعتقاد اور کیا شریعت سب پر یہودیت اور نصرانیت و مجوسیت کا اس قدر غلبہ تھا اور اس زمانے کے مسلمانوں کو انکی تقلید کا اس قدر شوق غالب تھا کہ اگر آج ہم اس زمانے کی جمع کردہ احادیث یا اس وقت کے لوگوں کی تفسیر کو غور سے پڑھیں تو اسلام قرآن کی ایک بالکل مسخ صورت اس میں ملتی ہے۔ اس شغف نے کلام الہی کے بعض آیات سے ان کو انکار کرایا۔ مثلاً رجم زانیہ کا مسئلہ اور بعض ایسی باتوں کی بجز تاویل کے

ان کو متوجہ کیا جس کی تائید وہ یہودیوں کے نوشتوں سے پاتے تھے جیسے دارالحرب میں سود کا جواز۔ مثال کے طور سے پھر ان محققین کی مبلغ علم و تحقیق کے لئے ایک واقعہ کو لیسلو قرآن شریف نے حضرت ابراہیم کے باپ کا نام آذر بتایا ہے یہودیوں نے ہمارے مفسرین کو سوجھایا کہ یہ صحیح نہیں بلکہ بقول توریت ابراہیم کے باپ کا نام تیراہ تھا۔ جھٹ انھوں نے باپ کی تاویل یوں کردی کہ عربی میں "اب" چچا کے معنی میں بھی آتا ہے۔ لیکن اگر ان کی تحقیق وسیع ہوتی تو وہ خود یوسبیس (Eusebius) کی تحریر میں تارہی کا نام پاتے۔ اور قرآن کی نسبت ان کو غیر صحیح کا گمان ہوتا جس کی وہ تاویل کرنے بیٹھتے۔ اسی طرح میں نے سارے قرآن کو چھان ڈالا —— اور مجھے تین وقت کی نماز کے علاوہ چوتھے وقت کی نماز کا کہیں کنایتہً بھی ذکر نہیں ملا سمجھ میں نہیں آتا کہ پانچ وقت کی نماز کہاں سے آئی۔ اس لاطایل قصے کو جبکہ نماز پچاس وقت سے پانچ وقت کی اللہ میاں کے سامنے متعدد عذر داریوں کے ساتھ گھٹائی جس میں جناب موسیٰ کے مشورہ کا بہت دخل تھا میرا دل کسی طرح قبول نہ کرتا تھا۔ مگر گولڈزیہر (Goldziher) کی جب تحقیق میرے سامنے آئی تو یہ راز کھلا کہ پنجگانہ وقت کی نماز کیونکر مجوس سے لی گئی —— خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ اصل بحث کی طرف رجوع ہوتا ہوں۔

انسان کیوں نبی ماننے کے لئے مکلف ہے۔ ہم پہلے باب میں دکھلا چکے ہیں کہ الٰہیات اور ایک حد تک اخلاق کا علم انسان کے معمولی سمجھ سے بالاتر ہے۔ ضرور ہے کہ ان باتوں کا کوئی ایسا معلم خدا کی طرف مامور ہو جو حکماً ہم کو اس کا معتقد اور پابند بنا دے اور اس کی ذات اتمام حجت کے لئے کافی ہو۔ مگر پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو علم نبی کو حاصل ہوتا ہے وہ کیوں ہر انسان کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ خلاصہ یہ کہ انسانی نطرت میں خدا نے یہ باتیں کیوں نہ پیدا کیں اور ہر شخص کیوں نہ برگزیدہ نبی ہوا۔ یہ مسئلہ خدا کے تقدیر کی ضمن میں آجاتا ہے جس کی ہم آگے چل کر بحث کریں گے۔ مختصراً یوں سمجھ لینا چاہئے کہ انسان کے اجتماعی نظام کے لئے اختلاف ادراک و قوائے تمیز لازمی امر ہے۔ اگر یہ اختلاف نہ ہوتو دنیا کا کام ایک منٹ نہیں چل سکتا۔ انگریزی کی مشہور کہاوت (When Adam delved and Eve span who was then a gentleman?) وہیں تک کام دیسکتی ہے جب تک انسان مدنی الطبع نہیں ہوا، لیکن مدنیت کے ساتھ ہم کو اپنے ملک کی پرانی کہاوت "میں بھی رانی تو بھی رانی کون بھریگا پانی" کی تصدیق کرنا پڑیگی۔ انہیں میں اختلاف طبائع کا بھی سبب ہے کہ ایک انسان حاکم ہوتا ہے دوسرا محکوم ایک معلم ہوتا ہے دوسرا متعلم۔ تو قوائے ذہنیہ و دماغیہ کا اختلاف جب ایک واقعی اور بدیہی امر ہے تو انسانیت کے لئے ایک درجہ نبوت کا ماننے کے لئے کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ مگر اس کے ساتھ روسو (Rousseau) کی طرح براہ راست خالق اکبر کو ماننے میں کیا قباحت ہے اگر نبوت کے بغیر خداشناسی ممکن نہیں تو ضرور ہوا کہ جنہوں نے خدا کو بغیر نبی کے مانا ہے جس میں ارسطو اور افلاطون بھی شامل ہیں وہ درحقیقت خدا کے وجود کو بھی تسلیم نہ کرتے تھے کیونکہ ایسا ان کے لئے ممکن نہیں مگر بہت سے موحدین دنیا میں ایسے گزرے ہیں جن کی تعلیم میں اور ایک نبی کی تعلیم میں بہت ہی باریک فرق الٰہیات کے بارے میں رہ جاتا ہے۔ نبوت کو ماننے میں خواہ ہم اسی فطرت کا تقاضا سمجھیں یہ ضرور ہے کہ نبی

کے آنے سے قومیت کی بنیاد پڑجاتی ہے اور ایک گروہ انسان دوسرے گروہ انسان سے نفرت کرنے لگتا ہے ان کے عادات ومعاشرت میں فرق پڑجاتا ہے اور اس اختلاف سے خانہ جنگی کی نوبت پہونچ جاتی ہے یہ استدلال اگرچہ بظاہر قرین عقل ہے مگر اس میں ایک بڑا دہوکا ہے۔ اور اس دہوکے میں آکر برہموسماج ہندوستان میں اور ڈائزم یوروپ میں کوئی ترقی نہ کرسکا وجہ یہ ہو کہ جہاں تک تخیلات وتصورات کا تعلق ہے وہاں تک تو خدا کو بغیر نبوت کے تسلیم کرنا اتنا مشکل امر ہے مگر عملاً خدا کو ماننا اتنا بڑا راز ہے جسپر کاربند ہونا انسان کے لئے مشکل ہے۔

محض یہ تصور کرلینا کہ اس دنیا کا خالق ایک غیر مفہوم ہستی ہے مذہب کے لئے کافی نہیں وہ خدا پرستی ہے جسپر مذہب کی بنیاد ہے۔ یہ ضرور ہے کہ خدا پرستی کے لئے خدا شناسی شرط ہے مگر فلاسفہ خدا شناسی کو خدا پرستی کی شرط نہیں جانتے اور نہ ان سے یہ ممکن ہوا چنانچہ ہم نے دیکھا ہے کہ باوجودیکہ بعض حکمائے یونان ومصر وبابل وہند کو الہیات میں خاصہ درک تھا انھوں نے خدا پرستی کا کوئی مسلک نہیں چھوڑا۔ بلکہ وہ اپنی قوم کے ہم مسلک رہے۔

یہی وہ خدا پرستی ہے جسے اسٹوئک فلاسفہ نے الہیات معاشرت سے تعبیر کیا ہے اور ہم اسکی حقیقت باوضاحت مذہب اور اخلاق اور مذہب اور عبادات میں انشاء اللہ بیان کریں گے۔ یہاں پر ہم صرف یہ دکھلانا چاہتے ہیں کہ نبی کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ انسان کے قلب کو اس خلجان سے مطمئن کردے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ کیونکہ یہ انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ اپنی ابتدا اور انتہا پر غور کرے۔ یعنی خدا کے اعتقاد کو انسانی اعمال میں داخل کرے۔ یقیناً اس خیال کو کہ خدا منزہ ازلی اور مکان نور ہے۔ انسان کو کسی نتیجہ پر نہیں پہنچاتا۔ الفاظ وخیالات نہایت ہی ارفع واعلیٰ ہیں۔ مگر عملی صورت میں سوائے خالی ہاتھ مارنے کے کوئی بات نہیں بنی اس حیثیت سے اس ازلی نور کا ایک فوکس ہے اور فوکس کے وجود کے بغیر جس طرح ہم سائنس کے علم نور کا پورا مطالعہ نہیں کرسکتے۔ اسی طرح نبی کے بغیر خدا کا ادراک ہمسے نہیں ہوسکتا۔ اب صرف سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ نبی کی شناخت کیا ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ یہ سوال سب سے بڑا اہم ہے اور اس کی اہمیت اس وقت اور بھی زیادہ ہوجاتی ہے جبکہ نبوت کا سرچشمہ عرصے سے ہمپر بند ہے۔ حتیٰ کہ اگر ایک شخص اس وقت دنیا میں ان تمام معیار پر پورا اترے جو ہم نبی کے لئے ضروری جانتے ہیں بلکہ معجزے پر بھی قدرت حاصل ہو تو ہم اس کو نبی ماننے کے لئے تیار نہ ہوں گے نہ کہ ایسا نبی جس کو ہم صرف روایت سے جانتے ہیں اور کبھی اُسکو دیکھا نہیں۔ اور روایت میں واقعیت اور استشباہ دونوں کی گنجائش ہے جو امتداد زمانہ سے بڑھتی ہی گئی ہیں۔ لامحالہ نبوت کے لئے کوئی اور صورت ہوگی جسکا ثبوت ہر زمانے میں ممکن ہوسکے اور یہ محض اس کا وہ کلام یا پیغام صاف ہوگا جو ہمارے پاس محفوظ ہو۔ ہم اس کتاب میں کسی خاص مذہب کی وکالت کرنا نہیں چاہتے لیکن اگر انسان میں قوت فیصلہ کوئی چیز ہے تو وہ خود اس کتاب پر غور کرنے سے جسکی نسبت، عوائی الہام ہو اس ایک نتیجہ پر ضرور پہنچیگا کہ وہ کس نبی کی کتاب ہے جس کی آواز انسان کو صداقت سے موثر کرسکتی ہے اور جس کا حامل نبی کہلانے کا واقعی مستحق ہے۔ ایسی ایک کتاب کم سے کم میرے نزدیک دنیا میں موجود ہے جس کی تعریف

خود میرا اپنا ایک مشن ہے اور اگر زندگی، صحت و فرصت نے موقع دیا تو اس کو شایقین کے سامنے تنزیل القرآن کے نام سے اسی سلسلہ میں پیش کرونگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ آخر میں ایک نظر نبوت کی اس صورت پر ڈالنا ضروری ہے جس کے رو سے جناب مسیح یا بودھ یا کرشن وراہم مجسم خدا قرار دئے گئے ہیں۔ ایسی صورت پیدا کرنا انسان کے اس خاص جذبات کا ایک فطری نتیجہ تھا جب اپنی ہستی کو کمزور ترین جانکر خود اپنی اعمال پر کوئی بھروسہ نہیں رکھتا اور ایک ایسی دستگیری کا محتاج ہے۔ جو اس کو لاچار و بیکس محض پاکر اس کی طرف رحم کا ہاتھ دراز کرے اور اس کو نجات دلائے۔ یا انسان سے ایک نجات دہندہ کی ضرورت اسی وقت محسوس کی ہوگی۔ جبکہ وہ اپنے اعمال دنیاوی کی سزا و جزا کا معترف ہوگا اور جزا کا مقرر ہونا کوئی فطری خیال نہیں ہے۔ بلکہ اس کی تعلیم مذہب ہی نے دی ہے۔ پس نجات دہندہ کی تلاش کا خیال اس کے بعد پیدا ہوا ہوگا جبکہ انسانوں کو نبیوں کی تعلیم مل چکی ہوگی اس میں شک نہیں کہ سزا و جزا کے خیال کے بعد انسان جب اپنے اعمال پر نظر ڈالیگا تو اس کو بہت کم بھروسہ اپنے خود اعمال پر رہ جائیگا کہ انسان نے بدی پر پوری طرح غلبہ اب تک نہیں پایا ہے۔ گو کہ نبوت کی تعلیم نے اس کے سامنے ایسے خدا کا نقشہ ضرور پیش کیا ہے جو رحیم و رحمٰن کی صفت سے موصوف ہے اور جو ہماری توبہ قبول کرتا ہے۔ تاہم اس کی تسلی کے لئے وہ کافی نہیں وہ اسکو ایسی مجسم صورت میں دیکھنا پسند کرتا ہو جس کے آگے وہ رحم کی درخواست بعینہ اسی طرح کرسکے جیسی وہ دنیاوی حاکم کے سامنے کرتا ہو۔ اسی خیال نے مسیح کو الوہیت کا درجہ دیا مگر اس خیال میں ایک بڑا خلل رہجاتا ہی اور وہ یہ کہ اگر ایسا شخص کوئی تاریخی حیثیت رکھتا ہو۔ تو اس کا وجود مقدم و موخر انسانوں کے بارے میں کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں کرسکتا۔ اور اگر وہ تاریخی حیثیت نہیں رکھتا تو حلول کو ماننا محض عبث و وہم ہے لہذا اگر خدا پرستی و نجات کسی صورت سے ممکن ہو تو وہی صورت باقی رہ جاتی ہو کہ ہم ایک برگزیدہ نبی کے کلام کو تسلیم اور اس پر ایمان لائیں۔ اور گناہوں سے بچنے کی سعی کریں باقی ہنود کے اوتار کا خیال وہ محض وہم و انسان پرستی ہے۔ کیونکہ وہاں نجات کا مسئلہ سرے سے موجود ہی نہیں

باقی ——— باقی

سید مقبول احمد بی اے

من در پۓ ایالیم و فلک درپۂ خیال

(بسلسلۂ ماسبق)

۶

بدر ا کی شادی کو تین ماہ ہو گئے تھے۔ پھاگن کے آخری دن تھے۔ ہر چیز سال گزشتہ کو الوداع کہہ رہی تھی اور ماضیات پر ایک غلط انداز نگاہ ڈال کر کسی خوبصورت اور پُرکیف مستقبل کے لئے اپنے کو آراستہ کرنا چاہتی تھی۔ لیکن احمد کا ماضی اس سے اسی طرح لپٹا ہوا تھا اس کے پاس اگر کوئی چیز تھی تو اس کی حسرتناک داستانِ پارینہ تھی۔ مستقبل اس کے لئے کوئی معنے نہ رکھتا تھا۔ گزشتہ حادثات نے صرف اس کی روح کو افسردہ نہیں کیا تھا۔ اس کا جسم بھی مرجھا چلا تھا جس کی بنا پر مالی کو تشویش تھی۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ چاند اپنی نرم اور صبیح شعاعوں کو سمیٹ کر روپوش ہو چکا تھا۔ چاروں طرف سکوت اور تاریکی کی مشترکہ حکومت تھی۔ آسمان پر بکھرے ہوئے ستارے زمین والوں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ احمد کی آنکھیں بھی نیند سے محروم تھیں وہ برآمدہ میں اپنے پلنگ پر بیٹھا ہوا اس رات کے سماں پر غور کر رہا تھا اور دل میں کہہ رہا تھا کہ وہ کوئی ایسی ہی رات ہوگی جس نے غالب سے یہ شعر کہلا لیا۔

کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول آج ادھر ہی کو رہیگا دیدۂ اختر کھلا۔

یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ احمد پر واقعی پے بہ پے بلائیں نازل ہو رہی تھیں اور ہر سمت سے اس کو گھیر رہی تھیں۔ پانچ چھ مہینوں سے اس کو تجارت میں بھی خسارہ ہو رہا تھا اور یہ نوبت تھی کہ مہاجن بازار کے کتوں کی طرح ہر طرف اسیر پورش کر رہے تھے اور وہ کسی کے تقاضہ کو پورا نہ کر سکتا تھا۔ کل قرض کی تعداد پر وہ غور کرتا تھا تو اس کا دم پھول نے لگتا تھا اور اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس طرح اپنے کو سبکدوش کرے۔ کل ایک ساہوکار اپنے روپئے طلب کرنے آنے والا تھا۔ احمد کو یکایک اس کا خیال آیا اور پلنگ سے اتر کر کبھی برآمدہ میں اور کبھی میدان میں ٹہلنے لگا۔ وہ جب سوچتا تھا تو قرض ادا کرنے کی صرف ایک تدبیر اُسکے ذہن میں آتی تھی اور وہ یہ تھی کہ جو زمینداری بہ طور باقیات الصالحات کے اس کے پاس ہے اس کو یا تو بیچ ڈالے یا کہیں رہن رکھ دے۔ لیکن کل کی فوری ضرورت کو کیونکر رفع کرے احمد عرصہ سے اس مہاجن کو وعدوں پر ٹال رہا تھا اور اب ٹالنا ممکن نہ تھا۔ اس کو یاد آیا کہ بیگم نے اپنے مویشی کے لئے اس سے مدت ہوئی کچھ بھوسا خرید اتھا جس کی قیمت پچاس روپیہ تھی۔ یہ پچاس روپئے بیگم کے ذمہ ابھی باقی تھے۔ احمد کو اس خیال سے اطمینان ہوا۔ وہ علی الصباح بیگم کے پاس جائیگا۔ اپنے پچاس روپیہ مانگیگا اور اگر موقع ہو تو دو سو اور بطور قرض لیگا تاکہ کل ساہوکار کا مطالبہ ادا کر سکے۔ بیگم اگر

گرد و نواح میں کسی کو مانتی تھی تو وہ احمد تھا۔ وہ احمد کے ساتھ مہربانی اور خلوص سے پیش آتی تھی اور اس سے پہلے بھی اکثر ضرورت کے وقت اس کی مالی امداد کر چکی تھی۔ احمد کو پوری اُمید تھی کہ بیگم کے پاس اگر روپئے ہوئے تو وہ اس کو دینے میں دریغ نہ کرے گی۔ صبح سویرے وہ رسول آباد روانہ ہوگیا۔

بیگم نے دروازہ پر احمد کو بٹھایا اور خود دروازہ کے آڑ سے اس سے باتیں کرنے لگی۔ اس کو احمد کے حال بد کی اطلاع مل چکی تھی اس نے پیار اور ہمدردی سے پوچھا "تمپر کل کتنا قرض ہوگا؟" احمد نے دل میں کہا "یہ اپنا راز ہے۔ کسی دوسرے پر کیوں ظاہر ہو" مگر بیگم کی مترنم آواز ہمدردی اور سچی غمخواری کے جذبات سے لبریز تھی۔ احمد سے یہ نہ ہوسکا کہ وہ اس سے اپنا بھید چھپائے اس نے سچ سچ کہدیا کہ اُس کے قرض کی تعداد معہ سود کے چھ ہزار تھی۔ بیگم کچھ دیر خاموش رہی اس کے بعد کہنے لگی "اچھا تو اسوقت تم ڈھائی سو روپئے لے جاؤ میں اس ماہ کے اندر کوشش کرونگی کہ تمہارا کل قرض ادا ہو جائے۔ اس وقت میرے پاس اتنی بڑی رقم موجود نہیں ہے۔ ورنہ فوراً حوالہ کر دیتی۔ لیکن قوی اُمید ہے کہ بہت جلد اس کا کوئی نہ کوئی انتظام ہو جائیگا"

احمد حیرت زدہ ہوگیا۔ اس کو معلوم تھا کہ "بیگم" اس کی وقت پر کام آنے والی ہمدرد ہے لیکن یکمشت اتنی بڑی رقم بلا کسی شدید تحریک کے اس کو دیدینے پر تیار ہو جائیگی ایسی حالت میں کہ وہ ادا کرنے کی مقدرت نہیں رکھتا! یہ بات احمد کی سمجھ میں نہ آتی تھی اس نے اسکی اہمیت پر غور کیا تو اس کی غیرت و خودداری کو ٹھیس لگی — اس نے احسانمندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "نہیں بیگم صاحبہ۔ اس کی ضرورت نہیں ہے فی الحال مجھکو یہ ڈھائی سو دیدیجئے پھر کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آئیگی" بیگم نے فوراً یہ کہکر احمد کی زبان بند کردی۔ "احمد آج تم نے مجھکو بڑا رنج پہنچایا ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں تم کو ہمیشہ اپنا چھوٹا بھائی سمجھتی رہی ہوں۔ دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے۔ اس لئے کسی کے ساتھ ایسی محبت ہونا کوئی بعید از قیاس بات نہیں ہے مجھے تمہیں سے محبت ہے اور میں اس محبت کی قائل نہیں جو وقت پر کسی کے کام نہ آئے بچوں کی طرح بیجا خودداری کو راہ نہ دو۔ آخر تم کو مجھ سے روپئے لینے میں شرم کیوں معلوم ہوتی ہے؟ جب کبھی خدا تم کو توفیق دے تو مجھکو واپس دیدینا۔ جاؤ ایک مہینہ کے اندر تم کو چھ ہزار روپئے مل جائیں گے" آج احمد نے محسوس کیا کہ بیگم کے لہجہ میں معمول سے زیادہ درد تھا۔ وہ خاموش ہوگیا۔ بیگم کی خواہش کو وہ رد نہ کرسکا۔ اس نے احمد کو ڈھائی سو روپئے لاکر دئے اور چلتے ہوئے کہا "احمد مجھے تم سے ایک ضروری بات کہنا تھی۔ سنا ہے کچھ دنوں سے یہاں کوئی ابوالخیر نامی ڈاکٹر آئے ہیں۔ میں ادھر کچھ دنوں سے بیمار سی رہا کرتی ہوں۔ نہ جانے کیا شکایت ہے۔ تم ذرا ان کو آج شام کو یہاں بھیجدو" "بیگم" کو معلوم تھا کہ ابوالخیر کی شادی حال میں بدورا سے ہوئی ہے لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس شادی سے احمد کے دل پر کیا گزری ہوگی اس لئے اس نے اس کا ذکر کرکے احمد کی دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑنا نہیں چاہا۔

ابوالخیر کے نام سے احمد کے خون میں ایک طوفان برپا ہوگیا۔ اس نے اپنی اصلی حالت کو چھپا کر "بیگم" سے کہا "ہاں دیکھئے فوراً جاکر میں ان سے کہدیتا ہوں"۔ یہ کہکر وہ رخصت ہوا۔ راستہ میں وہ سوچتا رہا کہ ابوالخیر کو "بیگم" کا پیغام کیسے پہونچائے۔ ابوالخیر سے ملنا اس کے لئے معمولی آزمائش کا کام نہ تھا۔ خصوصاً جبکہ ابوالخیر قربان علی کے مکان میں رہنے لگا تھا۔ شادی کے

بعد قربان علی کے اصرار سے وہ مع بدورا کے انہیں کے مکان کے مغربی حصہ میں رہنے لگا تھا۔ اور دواؤں کا مختصر سامان بھی وہیں رکھے ہوئے تھا۔ دوسرے تیسرے دن مادہو پور اپنے مکان کی دیکھ بھال کے لئے چلا جاتا تھا۔ احمد کا دل کسی طرح گوارا نہیں کرتا تھا کہ قربان علی کے گھر کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھے۔ اُس نے اس طرف سے گزرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ آج اسی لئے وہ رسول آباد بیچ جنگل سے ہو کر گیا تھا۔ اس نے یہ طے کیا تھا کہ کسی آدمی کے ذریعہ ابوالخیر سے "بیگم" کا پیغام کہلا بھیجیگا۔ جب وہ اپنے گاؤں کے قریب پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ابوالخیر سڑک پر ٹہل رہا ہے۔ احمد نے پہلے تو نظر بچا کر نکل جانا چاہا۔ لیکن پھر اپنے دل پر جبر کر کے ڈاکٹر کے قریب گیا اور کہا "رسول آباد میں بیگم کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔ آپ کو بلایا ہے۔ شام کو جا کر دیکھ آئیے" ابوالخیر بھی احمد کا مواجہ کرنے سے گھبراتا تھا۔ اس نے ایک مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "میں شام کو ضرور جاؤنگا" اور جلدی سے آگے بڑھ گیا۔

۷

قربان علی نے ابوالخیر کے لئے ہر آسائش کا انتظام کر رہا تھا۔ ان کے مکان کا نصف سے زیادہ حصہ ابوالخیر کے تصرف میں تھا جس کو بدورا نہایت خوش سلیقگی سے آراستہ کئے ہوئے تھی۔ ابوالخیر کی سواری کے لئے قربان علی نے اپنا ایک گھوڑا وقف کر دیا تھا۔ اور ابوالخیر کو خواب میں بھی اس کی امید نہ تھی کہ اتنا جلد اپنی آبائی سرزمین میں خاطر خواہ قدر و منزلت حاصل کر لیگا وہ اپنے کو ہر حیثیت سے خوش نصیب سمجھ رہا تھا۔ بدورا کے ساتھ اس کا انہماک دیکھکر قربان علی کی روح خوش ہو رہی تھی۔ ابوالخیر بدورا کی خوشنودی کی فکر میں ہر وقت رہتا تھا اس لئے کہ بدورا ہی کی بدولت اس کا نصیبہ پھر چمک رہا تھا۔ بدورا بھی شوہر کو اپنی آرزؤں کے مطابق پا رہی تھی۔ اس کو اگر کوئی شکایت تھی تو یہ کہ ابوالخیر شراب پیتا تھا اور بعض اوقات بدمست ہو جایا کرتا تھا۔ ابوالخیر کی شراب خواری کا علم کسی کو نہ تھا بدورا بھی کچھ دنوں تک اس دہوکہ میں تھی کہ ابوالخیر کوئی دوا روزانہ تیار کرتا ہے آخرکار اس کو اصلیت معلوم ہو گئی اور اس کو اس سے افسوس ہوا لیکن زمانہ نے اس کو ابوالخیر کی اس کمزوری سے مانوس کر دیا۔

احمد کی زبان سے "بیگم" کا نام ابوالخیر نے ایسا محسوس کیا کہ وہ کسی گہرے خواب سے چونک پڑا۔ ابوالخیر کو تعجب ہوا کہ اتنی مدت سے وہ یہاں ہے اور ابتک بیگم سے ملنے کی نوبت نہیں آئی، حالانکہ اس خطہ میں دولت و ثروت اور وقار و مرتبت کے لحاظ سے وہ اس قابل تھی کہ اس سے سب سے پہلے تعارف حاصل کیا جاتا۔ اسی کے ساتھ ساتھ ابوالخیر کو یاد آیا کہ "نصیر کوٹ" کسی زمانہ میں اس کی ہی ملکیت تھی۔ اس نے ابتک اس کو دیکھا بھی نہ تھا۔ ابوالخیر نے سارا دن ایک عجیب دماغی تلاطم میں گزارا شام ہوتے ہی بدورا سے اتنا کہکر کہ آج "بیگم" کچھ بیمار ہیں۔ مجھکو بلایا ہے میں جا رہا ہوں ممکن ہے آج رات کو زیادہ دیر ہو جائے۔ اپنا گھوڑا کسا اور "نصیر کوٹ" کا راستہ لیا۔ "بیگم" کا نام سنتے ہی بدورا کے دل میں ایک خلش سی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ "بیگم" کو اس کے باپ سے دشمنی تھی اور وہ نہ جانے کیوں ان کو ہر وقت نقصان پہنچانیکی

فکر میں رہتی تھی۔ بنائے مخاصمت کیا تھی؟ اس کا صحیح علم کسی کو نہ تھا۔ بڑے زمینداروں کی چشمک چونکہ عموماً ایسی ہی ہوا کرتی ہے۔ اس لئے یہ آپس کی دشمنی کوئی حیرت کی بات نہیں تھی لیکن بڑے تعجب کی بات تو یہ تھی کہ بیگم کو احمد کے ساتھ انتہائی خلوص تھا۔ خود قربان علی اس راز کو نہ سمجھ سکتے تھے۔ "بیگم" کہا کرتی تھی کہ احمد مجھکو فرشتوں کی طرح معصوم اور بے ضرر معلوم ہوتا ہے اس لئے اس کی میں دل سے قدر کرتی ہوں"۔

ابوالخیر راستہ بھر عجیب پیچ و تاب میں مبتلا تھا۔ "نصیر کوٹ" کی عمارت جب اس کی نگاہ کے سامنے آئی تو اس کی آنکھیں کھل گئیں اور اس کا خون کھولنے لگا۔ مگر اس کو پھر اس خیال سے یک گونہ اطمینان ہوا کہ یہ عورت اس کے موروثی اموال پر قابض ہونے کے باوجود جان کی خیر کے لئے اس کی ایک حد تک محتاج ہے۔ ابوالخیر کو اس کا غرور ہونے لگا اور اس نے گھوڑے پر اپنے سر کو بلند کر کے ایک خاص انداز سے جنبش دی۔

"نصیر کوٹ" ایک چھوٹا سا محل تھا جو چہار دیواری سے گھرا ہوا تھا۔ چہار دیواری کے اندر مکان کے اردگرد ہر قسم کے پھول اور درخت لگے تھے۔ بیگم اتنی بڑی عمارت میں صرف دو تین ماماؤں کے ساتھ رہتی تھی۔ پہرہ دار اور مرد خدمتگار جتنے تھے وہ چہار دیواری کے باہر اس قطعہ میں رہتے جو انھیں کے لئے اُتر جانب تعمیر کرایا گیا تھا۔

جسوقت ابوالخیر ایک ماما کی رہنمائی میں چہار دیواری کے اندر داخل ہوا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی ساحر کی قلمرو میں پہنچ گیا ہے۔ گو... رنگ و بو کی ایک دنیا بنا ہوا تھا۔ ابوالخیر کے حواس مسحور ہو رہے تھے تھوڑی دیر کے لئے وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ کس لئے یہاں آیا ہے۔ صحن میں ایک چبوترہ تھا۔ ماما نے ڈاکٹر کو وہیں بٹھایا اور خود بیگم کو اطلاع دینے گئی۔ برآمدہ میں ایک پردہ ڈالا گیا۔ ایک طرف بیگم بیٹھی اور دوسری طرف ابوالخیر کو بلا کر بٹھایا۔ بیگم نے ماما کو کسی کام سے رخصت کر دیا۔ ماما شبہہ کی نگاہیں ڈالتی ہوئی چلی گئی۔ بیگم نے پردہ سے اپنی سرخ و سفید گول کلائی نکال کر کہا "ڈاکٹر صاحب دیکھئے تو مجھے کیا ہوا۔ میرا دل ہر وقت دھڑکا کرتا ہے اور طبیعت سُست اور مضمحل رہا کرتی ہے دو ایک روز سے بخار بھی معلوم ہوتا ہے" ابوالخیر پہلے تو کلائی کی دلربائی میں کچھ ایسا محو ہوا کہ "بیگم" نے جو کچھ کہا اُس کو سُن بھی نہ سکا اس نے کہا "ہاں تو آپ کو کیا شکایت ہے؟" بیگم نے دوبارہ اپنا حال بیان کیا۔ ابوالخیر توجہ سے نبض دیکھنے لگا اور بڑی دیر تک دیکھتا رہا نبض سریع ضرور تھی مگر بخار کی نہ تھی اس نے مسکرا کر کہا "بیگم صاحبہ آپ کو بخار تو ہے نہیں۔ یہ صرف آپ کا وہم ہے اور وہم نہ جانے کتنی بیماریاں پیدا کر سکتا ہے۔ اچھا اب آپ ذرا لیٹ جائیے میں پردہ کے باہر سے آلہ لگا کر آپ کے پھیپھڑے وغیرہ دیکھنا چاہتا ہوں" بیگم نے اس کے کہنے پر عمل کیا۔ ابوالخیر نے دیکھا تو بیگم کا دل واقعی اچھل رہا تھا۔ ابوالخیر گھبرا کر پوچھنے لگا "کتنے دنوں سے آپ کا یہ حال ہے؟" بیگم نے جواب دیا کوئی سات برس سے ابوالخیر نے جواب دیا "خیر آپ کو میں دوائیں بھیج دونگا۔ حسب ہدایات استعمال کیجیگا۔ آپ کا مرض مہلک نہیں ہے۔ پریشان کرنے والا ضرور ہے۔ اس بیماری کو "ہسٹیریا" کہتے ہیں" "یہ کیا بلا ہے" بیگم نے دریافت کیا۔ اس کے لہجہ میں ایک تلخ تمسخر تھا ابوالخیر کو اب خیال ہوا کہ یہاں اس کی اصطلاحوں کا

سمجھنے والا کوئی نہیں ہے۔ اس نے فوراً جواب دیا یہ وہی چیز ہے جسکو عوام "باؤ گولہ" کہتے ہیں اور جسکو ایک قسم کا ہول دل سمجھنا چاہیئے" پردہ کی آڑ سے چند منٹ تک کوئی آواز نہیں آئی۔ اس کے بعد "بیگم" نے پوچھا "ہاں تو ڈاکٹر صاحب آپ کو اپنی تشخیص پر پورا اعتماد ہے؟" اس کی آواز میں وہی طنز تھا۔ ابوالخیر نے متحیر ہو کر کہا "بیگم صاحبہ میں آپ کے سوال کا مطلب نہیں سمجھا" بیگم نے جواب دیا "کچھ نہیں یونہی پوچھ لیا۔ اس کا علم تو آپ کو بھی ہے کہ میں وہمی ہوں جیسا کہ آپنے ابھی کہا تھا۔ ایک وہمی کی بات کا خیال نہ کیجئے اور اگر کوئی گستاخی ہوئی ہو تو معاف کیجیے" جملہ پورا ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ پردہ ایک زور کے جھٹکے کے ساتھ ہٹا اور ایک لطیف و نازک پیکر ابوالخیر کے سامنے تھا جو شمع کی مدہم روشنی میں صرف ایک خیالی تمثال معلوم ہوتا تھا ابوالخیر نے ایسا محسوس کیا کہ دفعتاً وہ کسی خواب کی دنیا میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ وہ نہ جانے کبتک اسی عالم میں رہتا اگر "بیگم" کے منہ سے الفاظ اس کے حواس بجا نہ کر دیتے "ہاں یہ تو سچ ہے کہ مجھکو ہول دل ہے مگر شاید آپ اسکی علت نہیں سمجھ سکے ہیں۔ کچھ یاد ہے ڈاکٹر صاحب۔ ہم نے ایک دوسرے کو کتنی مدت کے بعد دیکھا ہے؟"

ابوالخیر چونک پڑا اور اس کی زبان سے بیساختہ نکل گیا "کون؟ عائشہ؟" عائشہ کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ عائشہ نے کہا "ہاں خوب پہچان لیجئے۔ کہیں دھوکا نہ ہو" اتنا کہنے کے بعد اس کے اعصاب میں جو غیر معمولی تناؤ تھا وہ ڈھیلا پڑ گیا وہ تھرتھرا کر اس تخت پر بیٹھ گئی جس پر ابوالخیر بیٹھا ہوا تھا عائشہ نے سر تھام کر ابوالخیر پر نگاہیں جما کر کہنا شروع کیا۔

"یا اللہ میں تمہارے پیچھے کس طرح مٹی۔ اتنی مدت تک کیسی کیسی روحانی صعوبتوں میں مبتلا رہی۔ اور تم مجھے خراب و خستہ کر کے دنیا میں کامیاب بنے پھرتے ہو۔ آخر جزا و سزا کا مالک تم کو اس بیدردی کا اجر کیوں نہیں دیتا۔ میں معصوم تھی۔ بیگناہ تھی۔ دنیا کے بھلے برے کی مجھکو کچھ خبر نہ تھی۔ تم نے میری ناتجربہ کاری سے غلط فائدہ اٹھایا۔ ابلیس نے آدم کو بھی اس طرح نہیں بہکایا ہوگا جس طرح تم نے مجھکو بہکایا اور اس کا خمیازہ اٹھانے کے لئے مجھے تنہا چھوڑ دیا۔ تمہارے چلے جانے کے بعد رہی میرے لئے غم و درد کے پہاڑ سے کم نہ تھی۔ میرا خیال تھا کہ تم کو اس کا احساس ہوگا اور بہت ممکن ہے تم بھی میری جدائی میں گھل رہے ہو۔ مگر نہیں تم تو جیسے تھے ویسے ہو بلکہ اب زیادہ آسودہ اور خوش نصیب ہو۔ سچ ہے اپنے کو مٹا دینا عورت ہی کا کام ہے۔ میں افسانوں میں مرد کی بیوفائی کے کارنامے پڑھا کرتی تھی لیکن جب تک خود مجھکو تجربہ نہ ہوا تھا میں اُن کو صرف افسانہ پردازی سمجھتی رہی۔ ابوالخیر میں اپنی انتہائی بیزاری میں تم کو کوسنے دیتی رہی ہوں جسکے تم مستحق بھی تھے۔ مگر ذرا میری بدقسمتی دیکھنا کہ تم کو ایک لمحہ کے لئے بھی خاطر انداز نہیں کر سکی ہوں۔ تم مجھکو بھول گئے مگر میں تم کو نہ بھول سکی۔ تم کو مجھ سے معمولی لگاؤ بھی نہ تھا مگر مجھکو تم سے عشق تھا جو کسی کے مٹائے نہ مٹ سکا اور جس نے میری ساری زندگی کو دردناک بنا کر رکھ دیا۔ میں نے عہد کیا تھا کہ اگر خدا نے مجھکو تم پر قدرت دی تو اپنا انتقام ضرور لونگی۔ لیکن یہ صورت دیکھکر جسکے ساتھ ہاں مجھے اب بھی الفت کا دعویٰ ہے میں اپنے عہد پر قائم نہیں رہ سکتی۔

ابوالخیر مجھکو اپنی خامکاری کا صحیح اندازہ نہیں تھا۔ آج تم میرے سامنے ہو میں تم کو زندہ دفن کرا سکتی ہوں مجھے انجام کی مطلق پروا نہ تھی۔ پرسوں تم تحصیلدار صاحب کے ہاں گئے تھے۔ میں بھی ان کی بیوی سے ملنے گئی تھی۔ میں اکثر وہاں جایا کرتی ہوں۔ میں نے

تم کو وہیں جنگلے سے دیکھا اور مجھکو معلوم ہوا کہ جس ڈاکٹر کا ایسا شہرہ ہے وہ وہی شخص ہے جس نے مجھکو زندہ در گور کر رکھا ہے اسیوقت سے میری کمزوری نے پھر مجھ پر قابو پانا شروع کیا اور آج یہ حالت ہے کہ تم کو ملامت بھی نہیں کر سکتی۔ میں پھر تمہارے بس میں ہوں میری دبی ہوئی آرزوئیں پھر اُبھر رہی ہیں اور میں تم سے پھر قرب چاہتی ہوں یا خدا میں کیا کروں! اب تم اس قابل ہی نہیں رہے کہ اپنے ظلم کی تلافی کر سکوں اور پھر تم کو بدو امل گئی ہے تم کو اس کی ضرورت ہی کیا۔"

عائشہ اپنے منہ کو ہاتھوں سے ڈھانپ کر رونے لگی۔ ابو الخیر ابتک مجرم بنا ہوا سب کچھ سنتا رہا۔ عائشہ کے الفاظ کا طوفان فرو ہوا تو اُس نے اپنے کھوئے ہوئے حواس مجتمع کئے اور عائشہ کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگا" اس میں شک نہیں کہ میں ایک جہنمی گنہگار ہوں۔ میری ہمت نہیں کہ میں اپنی بریت میں کچھ کہوں مگر میں اتنا بیدرد اور جذبات لطیف سے بیگانہ نہیں ہوں جتنا کہ تم نے سمجھ لیا ہے۔ دہلی میں تمہارے عزیز و اقارب میرے جانی دشمن ہو گئے تھے۔ میرا وہاں کوئی اپنا نہ تھا۔ مجھ سے یہ کمزوری ضرور ہوئی کہ تم کو چھوڑ کر اور اپنی جان لیکر بھاگ کھڑا ہوا سو اس کی جو سزا چاہو دے لو مگر للٰہ یہ نہ سمجھو کہ تم سے مجھکو محبت نہ تھی یا میں تم کو محض فریب دینا چاہتا تھا۔ میں نے تمہاری فکر میں نہ جانے کتنی راتیں سفید کر ڈالی ہیں" یہ سب جھوٹ تھا۔ ابو الخیر کو عائشہ شاید یاد بھی نہ تھی۔

عائشہ نے پھر کہنا شروع کیا" خیر اس کا صحیح علم تم کو اور تمہارے خدا کو ہو گا۔ لیکن اب مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں۔ میں اب تم سے اس قدر نزدیک ہوتے ہوئے تم سے دوری گوارا نہیں کر سکتی یہ نہ سمجھنا کہ مجھکو از سر نو تمہارا سودا ہوا ہے یہ سودا آجتک میرے سر سے گیا ہی نہیں۔ اتنی دولت پانے کے بعد بھی میں نے جینے کا مزہ نہیں اٹھایا اور نہ اب اس کی اُمید ہے۔ تم مجھے دہلی میں رسوا کر کے چلے گئے تھے میں بد تماش مشہور ہو گئی تھی۔ کہیں سے میری نسبت نہیں آتی تھی۔ میرا شوہر (نصیر خاں) تجارت کے سلسلے سے سیاحت کیا کرتا تھا جب وہ دہلی جاتا تھا تو میرے باپ کے وہاں ٹھیرتا تھا۔ میرے باپ سے اُس سے دیرینہ راہ و رسم تھی۔ باپ نے اس سے میری سرگزشت بیان کر دی۔ اس کی عمر پچاس سال کی تھی۔ اس وقت جبکہ میں ۲۱ سال کی تھی۔ اس کی بیوی کو مرے عرصہ ہو گیا تھا۔ اس کے گھر کا کوئی دیکھنے والا نہ تھا۔ وہ مجھ سے شادی کرنے کے لئے طیار ہو گیا۔ باپ نے مجھے اس تسمہ پا کے سپرد کر دیا۔ اگر میں تمہاری محبت کا چور دل میں نہ بھی لئے ہوتی تو بھی مجھ میں اور میرے شوہر میں عمر کے لحاظ سے اتنا فرق تھا کہ کم از کم میرے مزاج و طبیعت کی عورت نباہ نہیں سکتی۔ نتیجہ جو ہونا چاہئے تھا وہ ہوا مجھے خفقان سا رہنے لگا۔ آج تم بھی ہول دل تشخیص کرتے ہو۔ ۴ برس ہوئے کہ میرا شوہر مر گیا اور میں تنہا رہ گئی۔ میرے ایک لڑکا بھی تھا جو سال بھر کا ہو کر مر گیا۔

عائشہ کی داستان عبرت انگیز تھی۔ ابو الخیر نے اس کے رخسارہ کو بوسہ دیکر کہا" میں نے تم کو برباد کر دیا۔ اب بتاؤ کیا کرنا چاہئے۔ تم جو کہو میں اس کے لئے حاضر ہوں"

عائشہ نے ایک ٹھنڈی سانس لیکر کہا" اب نہ زیادہ کچھ کہا جا سکتا ہے اور نہ کیا جا سکتا ہے تم کو ایک پری جمال پڑھی لکھی بیوی

ملی ہے۔ تم کو اب اس کا خیال رکھنا ہے۔ سنا ہے بدورا نے اعلیٰ معیار کی تعلیم و تربیت پائی ہے۔ آہ میرے باپ نے مجھکو بھی بڑے ارماں سے پڑھایا لکھایا تھا مگر میرا یہ حشر ہونا تھا۔ میں خدا گواہ ہے یہ ہرگز نہیں چاہتی کہ تم کو بدورا سے چھین کر اپنا کر لوں۔ میری زندگی تو خراب ہو ہی چکی۔ خوامخواہ کسی کی بنی بنائی زندگی کیوں بگاڑوں۔ مجھکو بدورا سے جلنے کی کوئی وجہ نہیں اگرچہ اس کے باپ سے مجھے پوری دشمنی ہے۔ وہ خاندانی خود غرضی ہے۔ بہر حال یہ ضرور چاہتی ہوں کہ تم کبھی کبھی آکر میری بات پوچھ لیا کرو۔ ابوالخیر تم نے مجھکو کہیں کا نہ رکھا۔ اب کم از کم میری یہ تمنا تو پوری کرو اور میرے دکھتے ہوئے دل پر ہاتھ دھر دو۔ اس سے زندگی کے باقی ماندہ دن سکون سے کٹ سکینگے۔ وعدہ کرو کہ مجھے پھر دہوکہ نہیں دوگے"۔ عائشہ کی رگوں میں ایک طوفان پھر برپا ہو چلا تھا۔

ابوالخیر نے کہا "یہی نہیں عائشہ بلکہ جہاں تک ممکن ہوگا میں تمہاری ہر خواہش کو پوری کرونگا اور جو ظلم تم پر ہوا ہے اس کی تلافی کرونگا"۔

نہیں بس مجھے اس سے زیادہ کی ہوس نہیں کہ تم میرے پاس آجایا کرو اور میرا جی بہلا جایا کرو۔ اچھا اب رات زیادہ ہو چکی ہے بدورا انتظار کرتی ہوگی۔ یہ روپئے لو اور اب جاؤ۔ روپئے میں اس لئے دیتی ہوں کہ گھر جاؤ تو ممکن ہے تمہاری فیس کے بارے تم سے سوال ہو"۔ عائشہ نے پچاس روپئے ابوالخیر کو دئے۔ ابوالخیر نے سوچ سمجھکر لے لیا اور رخصت ہوا۔ عائشہ بڑی حسرت سے اس کو دیکھتی رہی اور چلتے چلتے کہا "کل پھر اسی وقت آنا میں ابھی بیمار ہوں"۔ یہ کہکر وہ ہنس دی اور اسکی ہنسی میں درد تھا۔

اس دن رات کو ماماؤں میں بڑی دیر تک سرگوشیاں ہوتی رہیں۔

ابوالخیر تمام رات طرح طرح کے خیالات میں الجھا رہا "بیگم" نے ایک بالکل نئی دنیا اس کے پیش نظر کر دی تھی جو اس کی موجودہ دنیا سے کہیں بڑھکر پرشکوہ تھی مگر جسمیں وہ داخل نہ ہو سکتا تھا۔ گھر پہنچکر اُس نے بدورا سے بہت کم باتیں کی۔ بدورا نے تیور سے اس کو پریشان پایا اور خود فکر میں پڑگئی۔ رات بھر وہ بستر پر بےچین رہی۔ ابوالخیر کی پچھلے پہر آنکھ لگ گئی اور وہ خواب میں کہہ رہا تھا "میں نے شادی میں بڑی عجلت کی۔ کاش تین مہینہ اور مجرد رہتا"۔ بدورا نے سن لیا اور ایسا محسوس کیا کہ خلاف توقع کوئی وزنی چیز آکر اس کے دل سے ٹکرا گئی۔

۸

انسان کو عموماً اپنی طبیعت کا غلط اندازہ ہوتا ہے یہ بھی قدرت کا ایک غمزہ ہے کہ آپ سے ایک ارادہ کرا کے خود اسکے توڑنے کے درپے ہو جاتی ہے۔ عائشہ کی طبیعت پھر اس کو دہوکہ دے رہی تھی۔ اُس نے ابوالخیر سے بلا سوچے سمجھے یہ کہا تھا کہ "مجھے اس سے زیادہ کی ہوس نہیں کہ تم میرے پاس آجایا کرو"۔ اس کی ہوس ایک دل باختہ و جاں باختہ عورت کی ہوس تھی۔ اس سے انکار نہیں کہ وہ تہ دل سے چاہتی تھی کہ بدورا اس کے ہاتھوں خراب نہ ہو لیکن بقول حسرت "تجدید آرزو" محبت کی شورشوں کو ہمیشہ تیز کر دیتی ہے۔ ابوالخیر بلا ناغہ عائشہ سے ملنے لگا تھا۔ عائشہ اس کی غیبت میں برابر یہ تہیہ کرتی تھی کہ ابوالخیر کو بدورا سے چھیننے کی کوئی سست سے سست بھی کوشش نہیں کریگی۔ لیکن جب وقت ابوالخیر سامنے ہوتا اسوقت

عائشہ اپنے آپے میں نہیں رہتی تھی - آخر کار اس کے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا کہ اس کو ابو الخیر پر بدورا سے زیادہ حق ہے اور اگر وہ پھر ابو الخیر سے رسم و محبت بڑھا کر اس کو اپنا گرویدہ بنالے تو کوئی گناہ نہ ہوگا۔ اب عائشہ صرف ایک "حریف بادہ پیما" کی حیثیت سے رہنا نہیں چاہتی تھی بلکہ ابو الخیر کی "حبیب" بنکر ہر وقت اس کے ساتھ نشست و برخاست کا حق حاصل کرنا چاہتی تھی۔

ابو الخیر بدورا سے شادی کرنے پر پچھتانے لگا تھا۔ یہ خیال اسپر مستولی ہو رہا تھا کہ اگر آٹھ دس ماہ قبل عائشہ سے ملاقات ہوگئی ہوتی تو آج نہ صرف اپنی لٹی ہوئی دولت پر وہ از سر نو قابض ہوتا بلکہ اس کے ایک گناہ کا ازالہ بھی ہو جاتا۔ اُس کو عائشہ کے وہاں آتے جاتے چار مہینے ہو گئے تھے۔ بدورا سے اس کی بے اعتنائی بڑھ رہی تھی۔ بلکہ اب بات بات پر وہ بدورا سے لڑ بیٹھتا تھا۔ بدورا سب کچھ دیکھتی تھی اور سمجھتی تھی مگر منہ سے اُف نہ کرتی تھی وہ ان عورتوں میں سے نہ تھی جو اپنے رنج و ملال کو ظاہر کر کے اپنے کو کمزور ثابت کر دیتی ہیں۔ دھیرے دھیرے اس کو یقین ہو چلا تھا کہ اس کے باپ نے اور ایک حد تک خود اس نے بھی احمد کی جو دل آزاری کی ہے اس کی سزا قسمت میں لکھی ہوئی ہے۔ احمد کی گرتی ہوئی حالت سے وہ بے خبر نہ تھی اور اس کا ذمہ دار اپنے آپ کو سمجھتی تھی۔ اس کو اگر کسی خیال سے تسکین تھی بھی تو وہ احمد کے ساتھ ... کی شفتگی تھی۔ بدورا مالتی سے جلنے کا کوئی حق تو رکھتی نہ تھی۔ لہذا ضمیر کو صاف رکھنے کیلئے اپنے کو یہ دھوکہ دے رہی تھی کہ احمد بھی مالتی کے ساتھ منہمک ہوگا اور اپنی پچھلی محبت کو بھولنے کی کوشش کرتا ہوگا۔ اگر یہ نہ ہوتا تو اب جبکہ اتنا جلد اسکی متاہل زندگی بدمزگیاں شروع ہو گئی تھیں بدورا کی الماکیوں کی کوئی انتہا نہ ہوتی۔ اس کا یہ خیال کہ احمد مالتی کو چاہتا ہے اس وجہ سے اور بھی راسخ ہو گیا تھا کہ احمد نے حال میں اپنا قرض ادا کرنے کے بعد اپنی ساری جائداد مع مکان مالتی کے نام لکھدی تھی۔ لوگوں نے اس کی اس حرکت کو فتور عقل کا نتیجہ سمجھا تھا۔ اس لئے کہ احمد نے مالتی کے ساتھ نکاح نہیں کیا تھا۔ مالتی اس کے ساتھ رہتی ضرور تھی اور اس کی ہر خدمت بیوی کی طرح انجام دیتی تھی مگر احمد نے ابتک اس سے شادی کرنے کا نام ہی نہیں لیا تھا۔ اس کا سکوت و اضمحلال بڑھ رہا تھا اور وہ اپنے کو اس لائق نہ سمجھتا تھا کہ کسی کو اپنا پابند بنالے۔ لیکن بدورا یہی سمجھ رہی تھی یا سمجھنا چاہتی تھی کہ احمد مالتی کو اپنی بیوی بنانا چاہتا ہے۔ بہرصورت آج کل احمد اس کو بُری طرح یاد آ رہا تھا اور اس کی اپنی زندگی نے جو رنگ بدلنا شروع کیا تھا وہ بدورا کو احمد کی یاد دلائے بغیر رہ ہی نہ سکتا تھا۔

ابو الخیر اور عائشہ کا قصہ شہرہ ہو چکا تھا۔ قربان علی پہلے سے ابو الخیر سے مایوس ہو رہے تھے اس لئے کہ ابو الخیر اس وقت بھی جبکہ وہ بدورا پر اپنی تمامتر توجہ صرف کئے ہوئے تھا۔ قربان علی سے بیگانگی اور اجنبیت ہی کا برتاؤ کرتا رہا۔ وہ انکے پاس بہت کم اُٹھتا بیٹھتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ بدورا کے سوا کسی سے ربط و ضبط رکھنا نہیں چاہتا۔ ابو الخیر کی نئی رفتار نے قربان علی کو اس کی صورت سے بیزار کر دیا۔ اسی کے ساتھ وہ یہ سمجھنے لگے کہ بیٹی کی زندگی خود انھوں نے مٹی میں ملائی ہے جو کچھ ہو رہا ہے اُن کے اپنے اعمال کی سزا ہے۔ احمد کے ساتھ جو دغا بازی کی گئی ہے اس کا دل جس طرح توڑا گیا ہے اسی کا پھل ان کو مل رہا ہے زندگی کو بیدل نے "روز جزا" بتایا ہے۔ آج اگر قربان علی سے کوئی پوچھتا تو وہ کہدیتے "ہاں میرا بھی یہی

خیال ہے۔"

۹

مالتی بڑے صبر و استقلال کے ساتھ احمد کی خدمت کر رہی تھی اور اس گھڑی کا انتظار کر رہی تھی جبکہ وقت احمد کی غمناکی کو دور کر دے گا اور وہ دنیوی رسوم و قیود کی رو سے بھی اس کا اپنا ہو جائیگا۔ مالتی اسی اُمید کے سہارے جی رہی تھی۔ جی ہی نہیں رہی تھی بلکہ خوش آئند مستقبل کے خیال سے اس کی موجودہ زندگی بھی پرسرور تھی۔ احمد بیمار رہنے لگا تھا۔ کوئی مہینہ ایسا نہ گزرتا تھا جسمیں وہ پانچ چھ روز کے لیئے پابند بستر نہ ہو جاتا ہو۔ مالتی اس کو اپنا سرتاج سمجھکر اس کی تیمارداری کرتی تھی۔ احمد کو کبھی اس سے راحت نہ ملتی تھی۔ وہ دل میں چور لئے ہوئے تھا۔ مالتی کی جانفشانیاں وہ دیکھتا تھا۔ اس کی عاشقانہ خود فراموشی کا وہ معترف تھا۔ اسپر اسکا دل روتا تھا۔ لیکن آخر اس کا کیا علاج کہ مالتی کی صورت سے بھی اس کے اندر وہ جذبات برانگیختہ نہ ہوتے تھے جو بدورا کے نام سے اس کے دل میں ایک ہلچل مچا دیتے تھے۔ احمد کو امید تھی کہ وہ اپنی پچھلی زندگی اور اسکی محرومیوں کو بھول سکیگا۔ اسی بنا پر اس نے وقتی تاثرات سے مغلوب ہوکر مالتی سے ایسے وعدے کر لئے تھے جن کا پورا کرنا اس کے اختیار سے باہر تھا۔ لیکن وقت نے بہت جلد بتا دیا کہ اسکی یہ اُمید محض ایک فریب ہے جس کی اگر کوئی اصلیت ہوسکتی ہے تو وہ بس اسقدر ہے کہ اس کو مالتی پر رحم آ رہا ہے۔ مگر رحم اور محبت میں کوئی ربط نہیں۔ احمد پر رفتہ رفتہ یہ حقیقت کھل رہی تھی وہ بدورا سے ناامید ہو چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بدورا سے اب کوئی تمنا وابستہ رکھنا ایسا ہی بے معنے ہے جیسا کہ بڑھاپے میں کسی کا جوانی کے لئے بیقرار ہونا۔ مگر وہ محبت اور اس کے "رسم تقاضہ" سے مجبور تھا۔ دنیا اور دنیا کی ہر چیز سے اس کی طبیعت ہٹ گئی تھی جینے سے اس کا دل بیزار تھا۔ زندگی میں اس کا کوئی حوصلہ نہ تھا۔ لیکن بدورا اور بدورا کی محبت سے غفلت اور بیگانگی برتنے میں وہ کامیاب نہ ہوسکا۔ بڑے سے بڑے تیاگی اور تارک الدہر کو دیکھا گیا ہے کہ وہ کسی ایک چیز سے ان کو ایسی لاگ ہوجاتی ہے کہ سارا تیاگ بھول جاتے ہیں۔ احمد کو بھی اسی گروہ کا ایک فرد سمجھنا چاہیئے۔

احمد کو اپنی طبیعت پر اعتبار نہیں رہا تھا۔ وہ اب اس بلند آہنگی کے ساتھ مالتی سے یہ نہ کہہ سکتا تھا۔ "آج سے تم مجھکو اپنا سمجھو۔" یہ یہ تھا کہ مالتی کے سوا اب احمد کا دنیا میں کوئی نہ تھا مگر خود احمد کسی اور کا تھا۔ بظاہر گو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ کسی کا بھی نہیں۔

احمد کی دل ریشی اور شکستہ خاطری روز بروز نہیں لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی۔ وہ ہر وقت تڑپا کرتا تھا۔ مالتی دیکھ دیکھکر دل ہی دل میں کڑھتی تھی۔ وہ خوب سمجھتی تھی کہ یہ بدورا کا جنون ہے جو احمد کو دم بھر کے لئے چین نہیں لینے دیتا اور جو اس کی صحت جسمانی کو بھی غارت کرتا چلا جاتا ہے لیکن مالتی منہ سے کچھ کہتی نہ تھی اس لئے کہ احمد اپنی ناگفتہ بہ حالت کو اس سے چھپائے ہوئے تھا۔ احمد یہ جانتا تھا کہ اب مالتی کا اپنی برادری والوں میں جا ملنا بھی ممکن نہیں۔ اسی لئے اس نے اپنی زمینداری اس کے نام منتقل کر دی تھی اور مطمئن تھا کہ کم از کم اب مالتی کسی کی محتاج نہیں رہیگی۔

بدورا کی مصیبتوں کی خبر اس کو ملی تو احمد کی اندوہگینی کی انتہا نہ رہی اور اب اس کے دل میں ایک تازہ کھٹک پیدا ہوگئی تھی۔ سب سے زیادہ روح فرسا اس کے لئے یہ خیال تھا کہ قربان علی اور بدورا پشیمان ہوں گے اور ان کی پشیمانی کو چونکہ اس کی اپنی ذات سے بھی تعلق تھا اس لئے وہ اور بھی بیچین تھا۔ قربان علی اس درمیان میں ایک بار اس سے ملے تھے۔ اور اُس نے ایک ناقابلِ اظہار سراسیمگی محسوس کی تھی۔ قربان علی نے بغیر کسی قسم کی تمہید کے کہا تھا۔ احمد آج تقریباً اٹھ نو مہینہ کی مدت ہوگئی ہے کہ ہمنے ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھی۔ میں اس قابل ہرگز نہیں کہ تم سے شکایت کروں۔ تم جس قدر کشیدگی اور برگشتگی کا اظہار مجھ سے کرو بجا ہے۔ لیکن خدا کے لئے میرے بڑھاپے پر رحم کرو۔ میرے پاس یونہی رونے اور سر پیٹنے کے لئے ضرورت سے زیادہ سامان موجود ہے۔ تم نے اگر اپنی بیگانگی اور غیرت کا برتاؤ قائم رکھا تو میرا دل اور بھی بیٹھ جائیگا اگر میرے خیال سے نہیں تو بدورا کی محبت کا پاس کرو اور میری خطاؤں کو معاف کرکے اس کا دل ہاتھ میں لو۔ وہ روز بروز ابھر غم میں تحلیل ہورہی ہے"۔

احمد کے اعصاب میں قربان علی کے حسرت میں ڈوبے ہوئے الفاظ نے ایک تشنج پیدا کردیا تھا اس نے بڑے ضبط سے کام لیا اور جواب دیا "چچا آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ میرے زخموں پر نمک نہ چھڑکئے جو ہونا تھا وہ ہوا۔ اور جو ہوگیا اُس کا تدارک محال ہے۔ لیکن یہ صرف آپ کا وہم ہے کہ میں آپ لوگوں کی طرف سے کدورت دل میں لئے ہوں۔ بدورا میرے لئے اب بھی وہی ہے جو پہلے تھی البتہ میری زندگی میں کچھ ایسے ناہموار واقعات ہوتے رہے ہیں جنھوں نے مجھکو سرد دل بنا کر رکھ دیا ہے اور میری روپوشی کی یہی وجہ تھی"۔ احمد نے قربان علی کی مروت اور ہمدردی میں یہ غلط بیانی کی اور پھر پچھتانے لگا۔ قربان علی نے چلتے چلتے وعدہ لے لیا تھا کہ اب وہ روز ان کے گھر آیا کرے گا۔ احمد نے وعدہ کردیا تھا مگر بدورا کا سامنا کرنے میں وہ پس وپیش کررہا تھا۔ بدورا نے ادھر اس کو کئی خط بھیجے تھے اور اس نے کسی کا جواب نہیں دیا تھا۔ بدورا نے اس کو پہلی محبت کا واسطہ دلایا تھا اور ہاتھ جوڑ کر اس کو بلایا تھا مگر احمد جانے کی ہمت نہ کرسکا تھا۔

بدورا کا جو پہلا خط احمد کو ملا تھا مطالعہ کے قابل ہے اس لئے کہ وہ بدورا کے ہیجان و اضطراب کا آئینہ ہے۔ اس کی نقل یہ ہے

پیارے احمد۔

نہ جانے اب مجھکو تمہیں اس لقب سے یاد کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں اگر نہیں تو میری اس بے حیائی سے درگزر کردو۔ تم مجھ سے عمر میں پانچ برس بڑے ہو اور رسماً مجھے تم کو بھائی کہکر خط میں مخاطب کرنا چاہئے لیکن تم جانتے ہو کہ بچپن سے تم نے میری یہ عادت نہیں پڑنے دی۔ میں "احمد" "پیارے احمد" کہکر پکارتی رہی ہوں اور اب بھی پکارونگی چاہے تم مخاطب ہو یا نہ ہو۔ توجہ کرو یا نہ کرو۔ میں بدقسمت توجہ کی ہرگز سزاوار نہیں۔ تم کو مجھ سے نفرت ہوگئی ہوگی اور ہونا چاہئے۔ لیکن احمد کیا تم یقین کروگے کہ مجھے تم سے وہی لگاؤ ہے جو تھا میں اسوقت تمہیں سراپا طنز دیکھ رہی ہوں۔ تم اس کو پڑھ پڑھ کر ترشی

کے ساتھ مسکراتے ہوگے جیسا کہ تمہاری فطرت ہے مگر میں جھوٹ نہیں بکتی۔ میں اب بھی وہی بدورا ہوں۔ میری طبیعت اب بھی نہیں بدلی ہے۔ یہ حقیقت حال میں مجھ پر منکشف ہوئی ہے کچھ دن کے لئے مجھے دھوکہ ضرور ہوگیا تھا کہ میں بدل گئی ہوں میری آنکھوں پر پردے پڑگئے تھے۔ میں محبت کی حقیقت اور اہمیت سے منکر ہوگئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ محبت کوئی ایسی ضروری چیز نہیں۔ میں نے اپنے بچپن کا ایمان کھو دیا تھا۔ میں سمجھی تھی کہ تم میری زندگی کے کوئی لازمی عنصر نہیں ہو۔ اور۔ اب چھپانے سے کیا حاصل مجھے اُمید تھی کہ تم میری دنیا نہیں بنا سکتے۔ اگر مجھکو کوئی اور شوہر ملگیا تو شاید زندگی زیادہ خوشگوار اور پرکیف ہوسکے۔ دیکھتے ہو مجھے دنیا بنانیکی فکر تھی۔ دنیا تو یوں گئی۔ عاقبت کی خبر خدا جانے۔ مجھے اس ارتداد کی سزا مل رہی ہو۔ لیکن آخر میں سارا الزام اپنے سر کیوں لئے لیتی ہوں اس ملک میں تو شادی اور اس کے نتائج کے ذمہدار والدین ہوتے ہیں۔ میں نے اپنے خیالات سے تم کو آگاہ کر دیا تھا کہ دوبارہ فریب دینے کی مرتکب نہ ہوں۔ ورنہ میری شادی میرے باپ کی کی ہوئی ہے اور مجھکو اس میں کوئی دخل نہ تھا۔ بہرحال گنہگار جو کوئی بھی ہو۔ احمد تم مجھکو معاف کردو۔ زمانہ کے ہاتھوں میں بُری طرح ستائی جا رہی ہوں تم مجھکو نہ ستاؤ۔ میں اپنے جذبات کو عریاں کرکے خط میں نہیں پیش کرسکتی۔ زیادہ نہیں تو ایک بار مجھ سے ملجاؤ۔ میرا دل پھوڑا ہو رہا ہے۔ میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتی ہوں۔ میری کلفتونکو اب اگر کوئی مٹا سکتا ہے تو وہ تم ہو۔ آؤ ہم ایک دوسرے کی تلخکامیوں کو بھلانے کی کوشش کریں۔ بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم۔

تمہاری خطاوار

بدورا

احمد خط پڑھکر اسی ترشی کے ساتھ مسکرایا جس کا تصور بدورا نے پہلے ہی کرلیا تھا اور کہنے لگا "بیوقوف عورت تجھے اب بھی نہ معلوم ہوا کہ آسمان کا قاعدہ ایک جبار و قہار کا قاعدہ ہے جس کا مقابلہ کرنا ضعیف البیان انسان کا کام نہیں ہے"۔ اس کے بعد اور کئی خط آئے تھے۔ احمد اتبک یہ فیصلہ نہ کرسکا تھا کہ وہ بدورا کی بگڑی ہوئی حالت دیکھنے جائے یا نہ جائے۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ احمد کو تپ چڑھی ہوئی تھی۔ مالتی افسردہ اور دلگیر اس کی چارپائی سے چند گز کے فاصلہ پر ہمہ تن توجہ بنی بیٹھی ہوئی تھی۔ احمد کا چہرہ انگارہ کی طرح دہک رہا تھا اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اس کو کسی کروٹ آرام نہیں مل رہا تھا۔ وہ کبھی لیٹ جاتا تھا اور کبھی اُٹھکر بیٹھ جاتا تھا۔ مگر اس کی نگاہیں مالتی پر جمی ہوئی تھیں وہ ادہر دو ایک ماہ سے دیکھ رہا تھا کہ مالتی رنجیدہ اور فکرمند رہنے لگی تھی۔ وہ اب احمد سے اس شگفتگی کے ساتھ باتیں نہیں کرتی تھی بلکہ زیادہ تر خاموش رہا کرتی تھی۔ احمد اسکی وجہ جانتا تھا۔ وہ اس سے مایوس ہوچلی تھی۔ اس کو یقین ہوگیا تھا کہ احمد لاکھ بننے کی کوشش

کرے مگر وہ اس کی چیز نہیں بن سکتا۔ احمد نے اپنی زمینداری مالتی کے نام لکھ دی تھی۔ مالتی اس سے خوش نہ تھی۔ وہ اپنے دل پر ایک گرانی محسوس کر رہی تھی۔ اس پر بھی وہ احمد کے لئے اپنی جان ہلاک کر دینے کو تیار تھی۔ اس کی یہ روش احمد کو دل ہی دل میں رلا رہی تھی۔ آج وہ انہیں سب باتوں پر غور کر رہا تھا۔ کنپٹی کی رگیں تنی ہوئی تھیں۔ مالتی سمجھ رہی تھی کہ اس کا سر دکھ رہا ہے مگر احمد کچھ کہہ نہیں رہا تھا۔ اس لئے وہ بھی چپ تھی۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ احمد نے اپنے سر میں کس کر رومال باندھ لیا تو اس سے نہ رہا گیا اور اس نے دردناک آواز میں کہا "لائیے سر دبا دوں۔ کیا بہت دکھتا ہے؟"

احمد نے کہا "ہاں بہت دکھتا ہے۔ مگر مالتی میرا سر دکھنے کے لئے بنایا گیا ہے۔ کہاں تک کوئی دبائیگا" یہ کہکر ایک کراہ کھینچا وہ لیٹ گیا۔ مالتی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے احمد کی طرف سے منہ پھیر کر اپنی آنکھیں پونچھ ڈالیں اور اٹھکر اسکے سرہانے گئی۔ احمد نے کہا "نہیں میری اچھی مالتی۔ میری پیاری مالتی۔ رومال باندھنے سے مجھکو بڑا آرام مل رہا ہے سر دبانے کی ضرورت نہیں۔ شاید میرے طنز سے تمکو دکھ ہوا مگر میری عادت ہی ایسی ہے اس کا تم کو ملال نہ ہونا چاہئے۔ یہیں میرے پاس بیٹھ جاؤ میں تم سے کچھ باتیں کرکے اپنی طبیعت ہلکی کرنا چاہتا ہوں" مالتی احمد کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر بیٹھ گئی۔ احمد کا ہاتھ کانپنے لگا

احمد بڑی دیر تک مالتی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے خاموش پڑا رہا۔ پھر اُٹھکر بیٹھ گیا اور کہنے لگا "سمجھ میں نہیں آتا کہ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ کیسے کہوں۔ میرے دل کی جو کیفیت ہے وہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ لیکن تم کو اس سے آگاہ کر دینا ضروری ہے۔ ممکن ہے تم سوچو اور سمجھو۔ میں اپنے اندر ایک ایسی ہلچل محسوس کر رہا ہوں جو مجھے مٹا کر چھوڑیگی۔ ایسی حالت میں ابکہ ہرگز اس قابل نہیں پاتا کہ کسی اور کو اپنا پابند کروں۔ مجھے اندیشہ نہیں یقین ہے کہ تم میرے ساتھ شادی کرکے کوئی خاص لذت یا راحت نہ حاصل کر سکوگی۔ میری صحت کو گھن لگ چکا ہے۔ میرے دل و دماغ بیکار ہو گئے ہیں۔ یہ تو نہ جانے کس طرح میں کاشتکاری کے کاروبار میں سرگرم رہتا ہوں شاید اس لئے کہ جب تک سانس لے رہا ہوں اس وقت تک سانس لینے کے لئے کوئی بہانہ چاہئے۔ تاکہ زندگی کا بار تحمل کی حد سے زیادہ نہ ہو۔ ورنہ آج اگر میں دل لگا کر کوئی کام کر سکتا تو میں اپنی تجارت نہ چھوڑتا اور تھوڑے ہی دنوں میں جو نقصان مجھے ہوا ہے اسکو پورا کر لیتا اور پھر ترقی کر لیتا۔ مگر بیگم سے روپئے پانے کے بعد سارا قرض چکا کر میں اپاہج کی طرح بیٹھ کیوں رہا؟ صرف اس لئے کہ اب نہ کسی کام میں میرا جی لگتا ہے اور نہ مجھ میں دم ہے کیوں مالتی تمہیں یہ سب سنکر اگر تکلیف ہوتی ہو تو میں یہیں رک جاؤں"

مالتی نے کہا "نہیں نہیں کہئے" وہ سننا چاہتی رہی ہو یا نہ چاہتی رہی ہو مگر آج وہ دل آزار سے دل آزار بات سننے کے لئے تیار ضرور تھی۔

احمد نے پھر کہنا شروع کیا "ہاں تو کہنا یہ ہے کہ تم مجھ سے شادی کی اُمید نہ لگاؤ۔ شادی کے بغیر بھی محبت کی جا سکتی ہے۔ تم محبت کرو۔ میں اپنی روح کی گہرائیوں سے اس کی قدر کرونگا۔ لیکن اپنی زندگی کو میری زندگی سے وابستہ کرکے خواہ مخواہ خراب نہ کرو۔ میں اس کی تاب نہیں لا سکتا۔ میری زندگی کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ ابھی دس پندرہ دن ہوئے میرے منہ سے

خون آیا تھا۔ میں نے تم سے چھپا ڈالا تھا۔ لیکن چھپانا بیکار ہے۔ تو میری اچھی مالتی سوچو اور میرا کہا مانو۔ تم سمجھتی ہوگی کہ میں بدورا کی دھن میں تم سے بے توجہی برتتا ہوں۔ یہ تو میں مان لیتا ہوں کہ مجھے اس نوبت تک پہنچانے میں بدورا نے بڑی مدد کی۔ مگر یوں بھی میرا حشر یہی ہوتا۔ میں مقدر میں یہی لایا تھا۔ یہ ابھاگ دو پشت سے میرے ساتھ ہے اب بدورا کو بدنام کرنا غلطی ہے میں اپنی حالت سدھار سکتا تھا۔ تمہارے ساتھ عیش سے زندگی بسر کر سکتا تھا۔ تم جیسی وفا و محبت کی دیوی کی دلنوازی کر سکتا تھا لیکن مجھ سے کچھ نہ ہو سکا میں بے بس ہوں۔ یہ اگر مقدر کی خوبی نہیں ہے تو میری نرالی طبیعت کا کرشمہ ہے۔ بہر حال شامت اپنی ہے اس کا الزام کسی دوسرے کے سر نہیں ہے۔ ہاں مالتی یقین مانو میں تمہاری محبت کو ٹھکراتا نہیں۔ میں اگر کبھی اپنے کو اس قابل پاؤنگا کہ شادی کروں تو تمہیں چھوڑ کر کسی کی طرف رُخ نہیں کرونگا۔ مگر مجھ سے وعدہ نہ لو۔ مجھ کو زیر بار نہ کرو۔ میرے دماغ کو ہلکا رہنے دو۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کی بھی قسم کھاؤ کہ تم میری طرف سے کوئی غبار دل میں نہ رکھوگی" احمد کے اندر اس وقت جو طوفان تھا اس سے اس کا بخار اور بڑھ گیا اور اس کا جی سننانے لگا۔ وہ پھر ایک کراہ کے ساتھ لیٹ گیا۔ مالتی پر اسکا جو کچھ بھی اثر ہوا ہو۔ اس نے اپنے بشرہ سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وہ احمد کا ہاتھ اسی طرح اپنے ہاتھ میں لئے رہی احمد کی حالت نازک تھی۔ مالتی نے بڑے صبر و ضبط سے کام لیا اور پیار سے جواب دیا۔ "آپ آخر اتنے ہراساں کیوں ہوتے ہیں۔ خیر یونہی سہی شادی تو ایک دنیا کی رسم ہے۔ اس سے سچی محبت گھٹا بڑھا نہیں کرتی۔ شادی کا خیال آپ کے لئے ایسا سوہان ہے تو جانے دیجئے مجھے کوئی اس کا ملال نہ ہوگا مگر ہاں ایک کہنا میرا بھی مانئے۔ اور اس سے اپنے دل میں کوئی ملال نہ آنے دیجئے"

وہ کیا؟ کہو میں تمہاری ہر خواہش پوری کرنے کے لئے تیار ہوں" احمد نے سوال کیا۔

مالتی نے کہا "مجکو اجازت دیجئے کہ میں پھر اپنی جھونپڑی میں جاکر رہوں۔۔۔۔"

احمد پھر اٹھ بیٹھا اور بات کاٹ کر کہا "مالتی! تم جھوٹ کہتی ہو کہ میری باتوں سے تم کو کوئی دُکھ نہیں پہونچا ہے۔ تم تو آن کی آن میں مجھ سے بیزار ہوگئی ہو۔ ورنہ یہ جھونپڑی میں جاکر رہنے کے کیا معنے؟" احمد کا دم پھولنے لگا تھا۔

مالتی کا دل اُمڈا چلا آرہا تھا جس کا تقاضہ یہ تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر خوب روئے مگر احمد کی حالت اس کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ مالتی نے اپنی آواز پر قابو رکھتے ہوئے کہا "آپ مجھ سے قسم لے لیجئے کہ مجھکو کوئی دکھ نہیں پہنچا ہے اور نہ آپ نے کوئی دکھ پہنچانیکی بات کی ہے۔ میں اپنی جھونپڑی میں رہ کر بھی آپ کی اسی طرح خدمت کرتی رہونگی۔ اگر مجھے آپ سے کدورت ہوتی تو یہ جو آپنے اپنی ساری پونجی میرے حوالہ کر دی ہے میں اس کو ہرگز گوارا نہ کرتی۔ بس میری خواہش ہے کہ آپ اچھے ہو جائیں تو میں پھر اسی جھونپڑی میں جاکر رہنے لگوں اور بدستور آپ کی کنیز بنی رہوں۔ اس سے دونوں آزاد رہیں گے اور آپ کی طبیعت پر کوئی بوجھ نہیں رہیگا"

احمد نے مالتی کو شبہ کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا "مالتی تم اگر کہو تو تمہاری کہیں شادی کر دی جائے"

مالتی نے کسیقدر خشک لہجہ میں کہا "آپ البتہ آپنے میری روح کو صدمہ پہنچایا ہے۔ آخر یہ خیال آپ کے دل میں کیوں آیا؟"

احمد نے جلدی سے ندامت کا اظہار کر کے کہا "اچھا معاف کردو۔ ہاں بیشک میں نے تم کو رنج پہنچایا۔ میں بھی کیا بدبخت ہوں"
مگر احمد کی تشفی نہیں ہوئی۔ اس کا شبہ بدستور قایم رہا اور شبہ یہ تھا کہ شاید مالتی بھی اس سے تنگ اور عاجز ہو گئی ہے ورنہ اس سہولت سے شادی کے خیال کو ترک کر دینے پر کیوں آمادہ ہو گئی۔ اب تک تو یہی مالتی شادی کی امید ہی کے سہارے جی رہی تھی۔ احمد کو خود اپنی تندرستی مایوس کن نظر آ رہی تھی اس کو زیادہ دنوں تک جینے کی امید نہ تھی۔ اس کو بدگمانی ہونے لگی کہ مالتی بھی اب اس کی زندگی سے مایوس ہو گئی ہے اس لئے آزادی چاہتی ہے۔ احمد نے ایک گہری سانس لی اور دل میں کہا "آخر کوئی کسی کی سیہ بختی کا ساتھ کہاں تک دے۔ آخر میں اپنی قسمت اپنے ہی ساتھ ہے" اس نے مالتی کو اجازت دیدی کہ وہ جا کر اپنے باپ کی جھونپڑی میں رہے۔ اُسنے جھونپڑی کو از سرِ نو بنوا بھی دیا۔ مالتی کی اس حرکت سے احمد کو کوئی رنج تو ہوا نہیں بلکہ اس کے دل سے واقعی بوجھ ہلکا ہو گیا۔ ہاں اُس کو عبرت ضرور ہوئی۔

عورت کی نسائیت کا سارا راز اس کی خود فراموشی نفس کشی اور ایثار میں مضمر ہے۔ یہی اس کی زبردست قوتیں ہیں جو اس کی فتوحات کی ضامن ہیں اور جو حقیقتاً اس ضد کی کارفرمائیاں ہیں جس سے عورت کی سرشت ہوئی ہے۔ خود غرض سے خود غرض عورت بھی جب محبت کرنے لگتی ہے تو پھر وہ محبت کی ہو رہتی ہے اور انجام سے قطع نظر کر لیتی ہے۔ رنج و راحت سے بے نیاز ہو کر بے غرضی کے ساتھ محبت کرنا عورت کا امتیازی تمغہ ہے وہ جان بوجھ کر اپنے دل میں ایک کانٹا چبھو لیتی ہے اور جتنا ہی زیادہ یہ کانٹا پیوست ہوتا جاتا ہے اتنا ہی زیادہ اس کو لذت ملتی ہے۔ مرد کی محبت ایسی نہیں ہوتی۔ وہ اگر سوچ سمجھکر محبت نہیں کرتا تو محبت کے دوران میں ضرور سوچتا سمجھتا رہتا ہے۔ وہ اپنی محبت میں ایک خاص غرض و غایت پیش نظر رکھتا ہے۔ عورت محبت میں اندھی ہو جاتی ہے اور اسی وجہ سے اس کی محبت ایک ایسی قوت ہے جس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ فطرت کے مختلف شعبدہ بھی اس نے انسان کو غارت کرنے کے لئے جہاں اور اسباب مہیا کئے ہیں وہاں ایک سبب عورت بھی ہے۔ مالتی بھی اسی قسم کی عورت تھی۔ وہ احمد کو اپنی ہستی کے ایک ایک ذرہ سے چاہتی تھی اور اس کی محبت فی الحقیقت بے مدعا تھی۔ اس نے دیکھا کہ احمد سے شادی کی اُمید کرنا اس کی جانکاہیوں میں اضافہ کرنا ہے اور احمد کی حالت اسکی تاب نہیں لا سکتی اسلئے وہ نہایت خوشدلی کے ساتھ بغیر پیشانی پر بل لائے ہوئے احمد سے الگ ہو گئی۔ اُس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ آج سے محبت کے جانگسل خمیازے وہ یکہ و تنہا برداشت کریگی۔ احمد نے شروع میں مالتی کی اس ادا کو غلط سمجھا مگر رفتہ رفتہ حقیقت اس پر روشن ہو گئی مالتی کی شکست نے اپنی فتح حاصل کر لی۔ احمد مالتی کے خیال کو دل سے نکالنا چاہتا تھا لیکن کامیاب نہ ہوتا تھا۔ مالتی اسکی یکسوئی میں رخنے پیدا کر رہی تھی۔ چنانچہ آج اگر بدو اسکول بھی جاتی تو بھی شاید وہ سکون و اطمینان کی سانس نہ لے سکتا۔ اتفاقاتِ زمانہ نے کچھ ایسی صورت ہی پیدا کر دی تھی۔　(باقی)

مجنوں گورکھپوری

شاہانِ بہمنیہ

محمد بن قاسم کا حملہ مسلمانوں کے پہلے حلے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے مگر دکن میں ۹۰ھ ہی میں مسلمان آگئے اور یہی ان کی آمد کہی جا سکتی ہے، عبد الملک بن مروان کے سپہ سالار حجاج بن یوسف کے مظالم سے کون واقف نہیں وہ عبد الملک کی طرف سے عرب اور عجم کا صوبہ دار تھا، اس کے مظالم، بے باکیاں، سفاکیاں، خونریزیاں، نچلے طبقے تک ہی محدود نہ تھیں بلکہ اُسنے شرفاء عرب اور سادات بنی ہاشم کے قتل کا بیڑا اٹھایا تھا، سادات کو خانماں برباد اور شرفا کو تباہ و تاراج کرنا، اس کا نصب العین تھا اور اسکی ظلم و زیادتیاں عالمگیر تھیں، آلِ مصطفوی کو اس کے ہاتھوں ایسی تکالیف پہونچیں کہ یزید ہی کا زمانہ آنکھوں میں پھر گیا،

سادات و شرفاء عرب نے مجبوراً ہجرت کرنی شروع کی اور چند قبائل عرب نے بنا در دکن کا رخ کیا، باد مخالف کے جھونکوں نے کئی دن تک ان خانماں بربادوں کو پریشاں و سرگرداں پھرا کر ان کے ٹوٹے پھوٹے جہاز بندر مالابار، مچھلی بندر بھڑوچ، کھنبایٹ، چیول، دابول کے کنارے لگا دیئے۔

دکن کے ہندوؤں کے نزدیک یہ قوم ملیچھ اور نئی تھی، پہلے تو ان کو جہازوں سے اترتے ہی نہیں دیا گیا مگر جب ان لوگوں نے خوشامد درآمد شروع کی تو ایک اقرارنامہ لیکر ٹھہرنے کی اجازت دی، اقرارنامہ کا مضمون یہ تھا کہ:- "مسلمان ہنود کے مراسم اختیار کریں اور انہیں کا لباس استعمال کریں۔ ارکان اسلام علی الاعلان ادا نہ کریں" غریب مسلمانوں کو سر چھپانا منظور تھا سنگ آمد و سخت آمد کہکر یہ شرطیں منظور کر لیں اور ہنود میں مل جل کر گزر بسر شروع کی، شعائر اسلامی بہت احتیاط سے ادا کئے جاتے تھے اذان، قرأت گھر کی چار دیواری کے باہر سنائی نہ دیتی تھی، عورت اور مرد ہنود کا لباس استعمال کرتے تھے اور شادی و غمی میں ہنود ہی کے رسوم ادا کئے جاتے تھے رفتہ رفتہ تمام مسلمانوں نے اہل ہنود کے پورے طریقے اختیار کر لئے البتہ اس قدر لحاظ ضرور رکھا کہ نہ تو اپنی لڑکیاں ہندوؤں کو دیں اور نہ ان کی لڑکیاں اپنے خانداں میں لیں،

۲۸۰ھ سے دکن میں بزرگانِ دین کی آمد شروع ہوئی جو ایک طرح سے مبلغین کہلا سکتے تھے ان میں بعض تاجر تھے بعض درویش اور بعض سپاہ مگر سب کا نصب العین ایک ہی تھا اور مختلف طریقوں سے تبلیغ کیا کرتے تھے، ان لوگوں کے حسن و اخلاق کا اثر ہنود پر بہت گہرا پڑا اور منافرت جو پہلے مسلمانوں سے تھی اب نہ رہی اور بہ خندہ پیشانی مسلمانوں سے پیش آنے لگے ان بزرگوں کی کرامات اور خرق عادات سے ہنود نے انہیں اوتار مان لیا اور حالت رنج و غم، مصیبت و پریشانی میں طالب دواد دعا ہونے لگے، صرف عام ہنود ہی مسلمان مبلغین کے معتقد نہ تھے۔ بلکہ راجگانِ دکن کو بھی ارادت تھی، جب لوگوں نے حکومت کا میلان بھی اسلام کی طرف دیکھا تو ایک ایک کرکے مسلمان ہونے لگے، یہ صرف مسلمانوں کی تعلیمات

اور اخلاق تھے ورنہ ہنود اپنی حکومت میں کیوں اسلام کو جاری ہونے دیتے۔

راجگانِ دکن کی یہ بے تعصبی بھی لائق تحسین و تشکر ہے کہ انھوں نے جب ہندوؤں کا رجحان مذہب اسلام کی طرف دیکھا تو نہ تو ہندؤں کو مسلمان ہونے سے روکا اور نہ مبلغین اسلام سے باز پرس ہی کی۔

ادہر دکن میں اس طرح چپکے چپکے اسلام کی اشاعت ہو رہی تھی اور ادہر سلطان محمود غزنوی کی تیغ براں اپنے جوہر دکھا رہی تھی بہرحال چوتھی صدی کے آخر تک دکن میں شاید ہی کوئی قصبہ ایسا ہوگا جہاں آفتاب اسلام کی شعاعیں اپنی نورانی کرنوں سے روشنی نہ پیدا کر چکی ہوں، اس وقت دکن میں حسب ذیل چار سلطنتیں قایم تھیں،

(۱) راجہ رام چندر نے دیوگیری میں یادہری حکومت قایم کی تھی جو ۱۲۷۱ء سے ۱۳۱۰ء تک رہی،

(۲) رانی رودرا مہانے ورنگل میں کاکتیا حکومت قایم کی جو ۱۲۹۱ء سے ۱۳۲۸ء تک رہی

(۳) ہتنار اور نیلور کی ہائیسالہ حکومت،

(۴) پانڈیہ جو جنوبی حصہ پر قابض تھے،

جب غزنوی اور غوری خاندان کے بعد خاندانِ غلامان نے حکومت قایم کی اور پھر خلجی خاندان کو عروج ہوا تو علاء الدین خلجی نے جو جلال الدین خلجی کا بھتیجہ تھا، تسخیر دکن کا ارادہ کیا اس سے پہلے کسی نے اس طرف کا رُخ نہیں کیا تھا، یہ حملہ ۱۲۹۴ء میں اتفاقاً ہوا اور قسمت نے اس کو دکن کا پہلا فاتح بنا دیا، اس حملہ کی وجہ یہ تھی کہ علاء الدین گورنر کڑہ جب بھیلسان میں مقیم تھا تو اُس کو اطلاع ملی کہ دکن کے راجہ رام دیو کے پاس موروثی خزانہ محفوظ ہے اور وہ ایسا گرانمایہ خزانہ ہے کہ آج تک کسی بادشاہ کو میسر نہیں ہوا، یہ سنتے ہی وہ کڑہ پہونچا اور بقول ضیاء برنی آٹھ ہزار سوار ہمراہ لیکر دیوگیری کی طرف کوچ کیا اور دکن میں پہونچکر لاجور گھٹی میں ڈیرے ڈالدئے۔

اس علاقہ کے دہشت زدہ کسانوں نے یہ خبر راجہ رام دیو کو پہونچائی اور وہ نہایت ہی عجلت سے ایک غیر منتظم کثیر لشکر مقابلہ کے لئے فراہم کیا۔ مگر علاء الدین کے جوش وخروش کے آگے اس لشکر کے قدم نہ جمے اور علاء الدین دیوگیری پہونچ گیا، علاء الدین کے متواتر جانبازانہ حملوں نے راجہ کو اس قدر سراسیمہ کر دیا کہ اس نے فوراً صلح کی کوشش شروع کی اور چھ سو من طلا، سات من مروارید، دو من جواہر (لعل یاقوت وغیرہ) دیکر اور سالانہ خراج ادا کرنے کی شرط پر صلح کر لی۔

جب علاء الدین تخت نشین ہوا اور اندرونی الجھنوں سے نجات ملی تو ۱۳۰۶ء میں دیوگیری کو صوبہ بنانے کے خیال سے رام دیو کی سرکشی کا بہانہ کرکے ملک کافور ہزار دیناری کو ایک لاکھ سوار سائیاں وسراپردۂ شاہی کے ساتھ روانہ کیا، ملک نائب نے نہایت ہی سہولت سے دیوگیری پر قبضہ کر لیا اور رام دیو اور اس کے بیٹوں کو گرفتار کرکے خزانۂ شاہی کے ساتھ علاء الدین کے سامنے پیش کر دیا، علاء الدین نے نہایت دوراندیشی سے کام لیکر رام دیو کو "رائے رایاں" کے خطاب سے سرفراز کیا اور چتر سفید دیکر دوبارہ دیوگیری کی حکومت عطا کی،

۱۳۰۹ء میں ملک کافور نے ورنگل پر حملہ کیا اور راجۂ ورنگل نے بہ وعدۂ خراج صلح کر لی،

۱۳۱۲ء میں علاء الدین نے دکن پر آخری حملہ کیا اور راجۂ دیوگیری کی بغاوت کی وجہ سے ملک کافور کو روانہ کرکے دیوگیری کو تباہ و تاراج کرنے کے علاوہ، راجہ (سشنکر) کو بھی قتل کرا دیا۔

۱۳۱۵ء میں علاء الدین نے انتقال کیا اور راجگان دکن نے سرکشی کی۔ مگر ۱۳۲۰ء میں محمد تغلق نے پھر دکن کے علاقۂ تلنگانہ پر قبضہ کر لیا۔

۱۳۳۰ء میں دکن کے راجاؤں نے پھر سرکشی کی اور بغاوت کرکے شہر وجیانگر آباد کیا، دکن کے ممالک مفتوحہ تقریباً سب کے سب مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ البتہ صرف دیوگیری پر سلطان محمدؒ کا قبضہ رہا۔

ملکِ دکن کو کھو کر سلطان دو آبہ کی طرف متوجہ ہوا ہی تھا کہ بیدر میں نصرت خان اور گلبرگہ میں علی شاہ نے بغاوت کی جسکو فرو کرنے کے لئے قتلغ خاں حاکم دیوگیری روانہ کیا گیا، جس نے نصرت خاں کو سمجھا بجھا کر راضی کر لیا اور علی شاہ کو گرفتار کرکے سلطان کی خدمت میں روانہ کیا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ غلطی بھی کی کہ قتلغ خاں کو دکن سے طلب کرکے نظام الدین عالم الملک کو دکن روانہ کیا سلطان محمد نے امیرانِ صدہ کی بغاوتوں سے تنگ ہوکر ان کے قتل کا ارادہ کر لیا اور سپہ سالار دکن کے نام فرمان بھیجا کہ ایک ہزار پانسو سواروں اور امیران صدہ کو بھروچ روانہ کردے۔ عالم الملک نے نہایت ہی وقت سے امیران صدہ کو دولت آباد (دیوگیری) بلوایا اور سلطان کی خدمت میں روانہ کیا، مگر جب یہ لوگ مانک دون پہونچے تو سلطان کی متلون مزاجی اور خونین طبیعت سے خائف ہوکر آپس میں مشورے کرنے لگے اور واپسی کا ارادہ کر لیا، ملکِ لاچین کی شامت جو آئی تو اس نے روکنا چاہا مگر یہ کب ماننے والے تھے اس کو قتل کر دیا اور مال و اسباب لوٹ کر دولت آباد کی طرف چلے، دولت آباد پہونچ کر قلعہ کا سختی کے ساتھ محاصرہ کر لیا اور چند ہی روز میں فتح کرکے خزانہ بانٹ لیا۔ اور اسمٰعیل مغ کو بادشاہ تسلیم کرکے ناصر الدین کا خطاب دیا۔ چتر شاہی سے عزت افزائی کی، حسن خان کو ظفر خان خطاب دیا اور ہر ایک اپنی اپنی جاگیر میں جاکر باغی ہو گیا۔

حسن خان نے رائے بھیرن حاکم گلبرگہ کو قتل کرکے تسلط کیا اور اطراف کے امیرانِ صدہ کو بلا کر حکومت مستحکم کی، چند ہی مہینوں میں سارا دکن سلطان کے ہاتھ سے نکل گیا اور سلطان پریشان ہوکر دولت آباد پہونچا، اسمٰعیل مغ نے مقابلہ کیا مگر شکست نصیب ہوئی اور وہ دہار گیر میں جاکر قلعہ بند ہو گیا دوسرے امراء بھی اپنی اپنی جگہ قلعہ بند ہو گئے۔ سلطان نے دہارگیر کا رخ کیا ہی تھا کہ حاکم گجرات کے بغاوت کی خبر ملی اور وہ قوام الدین خداوند زادہ اور دیگر امراء کو محاصرہ پر چھوڑ کر خود گجرات روانہ ہو گیا۔

ادھر حسن خان نے بیدر پر حملہ کر دیا اور تلنگانہ کے راجہ کی مدد سے عماد الملک کے لشکر کو تہس نہس کرکے اور اس کو قتل کرکے اسمٰعیل مغ کی مدد کے لئے روانہ ہوا، حسن کا نام سنکر محاصرہ کنندہ امراء نے فرار پر قرار کیا، اور حسن نے اطمینان سے دولت آباد پر قبضہ کر لیا، اسمٰعیل مغ نے حسن کی ہر دلعزیزی اور شجاعت دیکھکر یہی مناسب خیال کیا کہ اسی کو بادشاہ بنا دے چنانچہ وہ سلطنت سے دست بردار ہو گیا اور حسن گانگو کو بادشاہ بنا دیا۔ ۱۳۴۷ء میں سلطان علاء الدین حسن گانگو بہمنی کو دولت آباد

کی مسجد میں سب نے بادشاہ تسلیم کرلیا اور سر پر تاج سلطانی اور چتر سیاہ قایم کیا گیا، اور ممالک دکن میں اسی کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا حسن نے گلبرگہ کو پسند کرکے دار السلطنت مقرر کیا اور حسن آباد نام رکھا۔

یہ تھی ابتدا سلطنت بہمنیہ کی، مگر علاء الدین حسن بہمنی کے ابتدائی حالات نہایت ہی تاریکی میں ہیں، مورخین نے سخت اختلاف کیا ہے۔ طاہری نے مجہول النسب لکھا ہے، زبدۃ التواریخ میں مفلوک الحال ترکی الاصل بتایا ہے فرشتہ نے گانگو پنڈت منجم کا ملازم ٹھیرایا ہے، تحفۃ الملوک میں شریف زادہ اور محمود شاہی افاغنہ سے لکھا ہے صوفی ملکاپوری نے مدت کی تلاش و جستجو کے بعد حسن کا امیر زادہ اور ملوک غوریہ سے ہونا ثابت کیا ہے "مرات الصفا" نے تو بہمن و شاہ عجم) کے خاندان سے ملا دیا ہے۔

ہمارے مورخین کا قاعدہ ہے کہ جب کسی بادشاہ سے دلچسپی ہو جاتی ہے تو اس کو خواہ مخواہ بڑا بنانے کی فکر کرتے ہیں یا تو اسکا شجرہ نسب ائمہ مطہرین یا سادات بنی ہاشم سے ملا دیتے ہیں یا تو شیروان و افراسیاب سے ورنہ کسی مشہور صاحب دل بزرگ، یا بادشاہ سے شجرہ ملا دینا معمولی بات ہے اسی طرح حسن بہمنی پر بھی مہربانی کی ہے۔

ظفر خاں علائی کے قتل کے بعد اسکا خاندان پریشان ہوگیا حسن شاہ اور علی شاہ اس کے دو بھانجے بھی انہیں پریشان حال لوگوں میں تھے، فاقہ کشی سے تنگ آکر حسن نے دہلی کا رُخ کیا اور کئی روز کی مسافت طے کرکے صبح صبح دہلی پہونچے۔ دریائے جمنا کا پانی اٹھکھیلیاں کر رہا تھا۔ حسن نے وضو کیا اور فریضۂ فجر کی نیت کی۔ فاقہ کشی اور مصائب سفر نے اس قدر پست کر دیا تھا کہ قدم قدم پر چکر آ رہا تھا۔ ٹھنڈے پانی سے وضو کرکے جمنا کی سرد ریت پر سر بسجود ہوا ہی تھا کہ نیند یا غشی نے غلبہ کیا اور وہ حالت سجدہ ہی میں بیہوش ہوگیا، منجم شاہی گانگو پنڈت حسب عادت غسل کے لئے آیا تو دیکھا کہ ایک جوان رعنا سجدہ میں پڑا ہوا ہے، چہرے سے آثار شرافت و شجاعت نمایاں ہیں گو خستگی سفر نے رنگت سیاہ کر دی ہے مگر آفتاب کی بھیگی بھیگی کرنیں زرد رخساروں کو چمکا رہی ہیں، برہمن نے حسن کو جگا کر حال دریافت کیا اور اشنان کے بعد اسکو اپنے گھر لے آیا کئی دن تک حسن، برہمن کا مہمان رہا مگر اس کی غیور طبیعت نے پڑے پڑے روٹیاں کھانا گوارا نہیں کیا اور اُس نے برہمن سے کہا کہ یا آپ مجھ سے کچھ کام لیا کیجئے یا کوئی کام دلوا دیجئے۔ برہمن نے دو بیل اور دو مزدور اور تھوڑی سی زمین اس کو دی اور حسن نے کھیتی باڑی شروع کی، ایک دن اس کے مزدور ہل چلا رہے تھے کہ یکایک ہل کا سرا زمین میں پھنس گیا اور باوجود کوشش کے نہ نکلا مزدوروں نے حسن کو اطلاع کی اور حسن نے زمین کھدوا کر دیکھا تو ہل کو ایک زنجیر میں اٹکا ہوا پایا زنجیر نکالنے کی کوشش کی تو اس کے ساتھ ایک دیگ برآمد ہوئی جسمیں اشرفیاں بھری ہوئی تھیں، حسن نے اُس دیگ کو بہ حفاظت برہمن کے حوالہ کر دیا برہمن کو حسن کی دیانت و راست بازی پر تعجب ہوا کہ باوجود فاقہ کشی اس میں اس قدر امانت و دیانت ہے اس نے یہ خبر شاہزادہ کو دی اور شاہزادے نے ایک دفعہ غیاث الدین سے حسن کا تذکرہ کیا، غیاث الدین نے حسن کو بلا کر اس کا حال پوچھا اور یہ معلوم کرکے کہ وہ ظفر خاں علائی کا ہمشیرزادہ ہے امیران صدہ میں داخل کر دیا چونکہ غیاث الدین تغلق ظفر خاں کا دوست رہ چکا تھا

اس لئے حسن پر بہت مہربان رہنے لگا۔

غریب اور مفلوک الحال حسن کو امیر صدہ ہوتے دیکھ کر گانگو منجم نے زائچہ بنایا تو دیکھا کہ حسن کے ستارے بادشاہت میں ہیں، اس نے حسن سے کہا کہ تم دکن کے بادشاہ ہوجاؤ گے اور یقین ہے کہ اس وقت مجھے یاد بھی نہ کروگے کہ کسی برہمن نے میری مدد کی تھی حسن نے کہا نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا اگر میں بادشاہ ہوگیا تو آپ کو وزیر بناؤنگا اور آپ کے نام کو اپنے جزو نام کرلونگا۔

یہ روایت کسی قدر قریب قیاس ہے اس کا امکان ہے کہ حسن ظفرخان علائی کے خاندان سے ہو اور فاقہ کشی کرتا ہوا دہلی پہونچا ہو، اس وقت ہندو مسلم اتحاد کا وقت تھا برہمن نے ممکن ہے کہ اس کی مدد کی ہو اور تھوڑی سی زمین کاشت کرنے کے لئے دی ہو، پہلے تو ہندو مسلمانوں سے اس قدر متنفر نہ تھے جتنے کہ اب ہیں اور نہ مسلمانوں نے اپنے آپ کو اس قدر غیر معتبر اور خوفناک بنا لیا تھا جیسی حالت کہ اب ہے، دلی ہزاروں دفعہ اجڑی اور آباد ہوئی اب بھی کروڑوں خزانے سیکڑوں دفینے ہوں گے۔ کیا عجب ہے کہ حسن کو بھی کوئی ایسا دفینہ ملا ہو اور اس نے برہمن کے حوالہ کردیا ہو جس کی شہرت غیاث الدین تک پہونچی ہو، ماہران نجوم جانتے ہیں کہ امارت و بادشاہت کی پیشین گوئی اجرام فلکی کی رفتار دیکھ کر بہ آسانی کی جاسکتی ہے اسیطرح یہ ناممکن نہیں کہ برہمن حسن کی بادشاہت کی پیشین گوئی کرسکے۔ اور برہمن سے اس کے نام کو جزو نام کرنے کا وعدہ کرے علاوہ ازیں آج تک نہ کوئی گانگوی خاندان تھا اور نہ بہمن شاہ عجم کے خاندان کے کسی فرد نے اپنے آپ کو بہمنی کہا ایسی حالت میں سوائے اس کے کہ ہم اس روایت کو قرین قیاس تصور کریں کوئی چارہ نہیں۔

حسن کو دکن پہونچنے کی بہت جلدی تھی جب بادشاہ نے قتلغ خان کو دولت آباد (دیوگیری) کا صوبہ دار مقرر کیا اور امیران صدہ سے دکن جانے کے متعلق دریافت کیا تو سب سے پہلے حسن نے آمادگی ظاہر کی اور بادشاہ نے ہگڑی، رائے باغ وغیرہ جاگیر دے کر حسن کو دکن روانہ کردیا اس نے اپنے ہمراہ اسمٰعیل مع اور ملک سیف الدین غوری کو بھی لے لیا اور دولت آباد کا رُخ کیا، یہاں پہونچکر حسن نے جو کچھ کیا اس کی تفصیل اوپر لکھی جاچکی ہے۔

۲۴ ربیع الاول ۷۴۸ھ کو دولت آباد کی قطب الدین خلجی کی مسجد میں حضرت شیخ سراج الدین جنیدی رحنے حسن کو تخت نشین فرمایا اپنے دستِ مبارک سے تلوار باندھی اور تاج زرین پہنا کر چتر سیاہ تبرکا لوازمۂ شاہی مقرر کیا، اس چتر کی وجہ سے لوگوں سے حسن کو شیعی خیال کرلیا ہے۔ مگر واقعہ یہ نہیں ہے حضرت شیخ جنیدی نے سیاہ چتر کو خلفائے عباسیہ کا نشان سمجھ کر پسند فرمایا تھا۔

حسن نے گلبرگہ کو دارالسلطنت قرار دیا اور دفتر حساب گانگو پنڈت کے سپرد کیا یہ طریقہ ۱۰۱۶ھ تک جاری رہا کہ شاہان دکن کی دفترداری اور محرری برہمنوں ہی کو ملتی رہی۔

حسن نے اپنی شمشیر اور تدبیر کے زور سے دکن کے ایک بڑے حصہ پر قبضہ کرلیا، ایک مہم کہ تانگ کی طرف بھیج کر اسیر بھی

کامیابی حاصل کی۔ اہل گجرات تغلق کے ہاتوں سے تنگ تھے انھوں نے حسن کو بلوایا مگر وہ خود نہ جا سکا اس لئے اپنے بیٹے محمد کو روانہ کر دیا شہزادۂ محمد گلبرگہ سے نکل کر نوساری پہونچا اور وہاں شکار کی کثرت دیکھ کر بے چین ہو گیا خود بھی وہیں ٹھہر گیا اور حسن کو بھی بلوا لیا۔ مگر حسن نوساری پہونچتے ہی ہیضہ کر گیا اور اس سے صحت پا کر اور امراض میں مبتلا ہو گیا جن کا سلسلہ چھ مہینے تک رہا اور ۵ ربیع الاول ۷۵۹ھ میں (۶۷) سال کی عمر پا کر گیارہ سال دو ماہ سات روز سلطنت کرنیکے بعد انتقال کیا۔

چون حسن رحلت ازین عالم نمود | وصل شد باحق بفضل ذوالمنن
شاہ جنت سال ترحیلش بگو | ہم مقرب محسنِ عالم حسن
۷۵۹ھ | ۷۵۹ھ

حسن کے انتقال کے وقت مرا ہٹواڑی، ملنگانہ، کرناٹک کے مختلف حصے سلطنتِ بہمنیہ میں شامل تھے، جن پر ہندو راجاؤں کا تسلط تھا، مشرق میں راجۂ تلنگانہ جنوب میں راجۂ بیجانگر، کرناٹک پر قابض تھے اور یہ ایسے بڑے حریف تھے کہ حسن کو ہمیشہ ان سے خدشہ لگا ہوا تھا، جس نے سلطنت کو بہت وسعت دی اور نہایت ہی بیدار مغزی کے ساتھ سلطنت کی دریائے پونا سے قلعۂ ادھونی تک اور چیول، دابل سے بیدر تک اسکا قبضہ تھا۔ اس نے نئی نئی اصلاحیں کیں اور سلطنت بہمنیہ کی جڑیں اس قدر مضبوط کر دیں کہ وہ دیر تک حوادثاتِ زمانہ کا مقابلہ کرتی رہی۔ انتظام مملکت، عدالت، سیاست وغیرہ سے اُسے خاص دلچسپی تھی اور وہ ہر کام نہایت ہی تجربہ کاری اور وسیع النظری سے کیا کرتا تھا، ذیل کے نقشے سے ظاہر ہوگا کہ اس نے کیسے عہدے قائم کئے تھے اور ان عہدوں پر کس قدر تجربہ کار۔ اور موزون اشخاص کا تقرر ہوا تھا

نام عہدہ دار	نام عہدہ	نام عہدہ دار	نام عہدہ
سید صدر الشریف سمرقندی	صدرِ عدالت	صفدر خاں سیستانی	شقدار صوبۂ برار
سید محمد بدخشی	قاضی عسکر	اعظم ہمایوں	,, ,, درنگل
ملک سمٰعیل منج	امیر الامراء	خان محمد بن علی شاہ	نائب صوبۂ دولت آباد
سید رضی الدین جگاجوت	معتمد و وکیل السلطنت	محمد اسحٰق سرہندی	صدر وقائع نگاراں
ملک سیف الدین غوری	وکیل السلطنت	بہادر خاں بن اسمٰعیل منج	سپہ سالار
گانگو پنڈت	صدر محاسب	کلیم اللہ ماژندرانی	سرخیل
سکندر خاں	بارک	بایزید خاں	میر بحری
قیصر خاں	کوتوال شہر	ملک جھجو	شحنہ فیل
بہرام خاں ماژندرانی	شقدار صوبۂ دولت آباد	ملک رشدو	جامدار

نام عہدہ دار	نام عہدہ	نام عہدہ دار	نام عہدہ
سید جمال الدین	خزانہ دار	سید نور الدین	محتسب (نرخی)
فولاد خاں	توزبیگی	سید نقی اصفہانی	صدر محفلین
سید احمد ہردی	مفتی	میر زین العابدین	تمغاچی کروڑ (کسٹم کمشنر)

اس کے علاوہ ملک ستم، پردہ دار، ملک قوام الدین غوری، افسر خاصہ خیل، شیخ مہاج الدین جنیدی قاضی گلبرگہ ملک لتنہ، شحنۂ بارگاہ اور آبدارخانہ، خدمت عرض مکرر، ڈاک چوکی، تعمیرات، وغیرہ وغیرہ کے لئے جا بکار دیں نام زد کی گئی تھیں، ہفتہ میں ایک بار چہارشنبہ کو صبح سے دوپہر تک " بارگاہ کل" (دربارِ عام) ہوا کرتا تھا، انتظام عدالت بالکل شرعی تھا، ایک صدر عدالت اور اس کی ماتحتی میں کئی مفتی، محتسب، قاضی، فوجدار، داروغہ، وغیرہ تھے، سلطنت چار صوبوں میں تقسیم کی گئی تھی اور ہر صوبہ کے متقر پر دس ہزار اور پیادہ فوج رہتی تھی اور پایہ تخت میں ایک لاکھ جمعیت، فوج کے لئے خاص وردی مقرر کی گئی تھی۔

(۱) سواروں کی وردی ۔ قبا، خود، شمشیر، نیزہ، دستارِ سُرخ،

(۲) پیادوں کی وردی ۔ پاجامہ (برچیز نما) الخالق بطور کپچے کلاہ مدور سیاہ،

(۳) کرناٹکی سواروں کی وردی ۔ پاجامہ زانو تک کچہ سیاہ پگڑی سرخ بلدار

(۴) نایک واڑی پیادوں کی وردی ۔ سواروں کی وردی کی مگر قیمتی اور خوشنما،

(۵) امرا و وزرا کا لباس ۔ قبا، دستار، منصب داری، بگلوس

(۶) مشائخ و علما کا لباس ۔ جبہ، کرتا، صدری، عمامہ،

اس کے علاوہ خدام و شاگرد پیشہ لوگوں کو قبا، کلاہ، بگلوس، اور نقبا و چوبداروں کو قبا، کلاہ عصا، بگلوس وغیرہ، ہر چھوٹے سے چھوٹے قصبے میں مساجد بنائے گئے تھے اور ہر ایک مسجد کے لئے امام موذن، مدرس، مقرر تھے جو لڑکوں کو تعلیم دیا کرتے تھے ۔ بڑی مساجد میں طلبا کے لحاظ سے مدرسین مقرر کئے جاتے تھے ۔

خود حسن کو علم و ادب سے گہری دلچسپی تھی ہمیشہ علما کی صحبت میں رہا کرتا تھا مولانا لطف اللہ سبزواری، ملا معین ہروی مفتی احمد ہروی، ملا اسحٰق شیرازی، ملا فضل اللہ انجو، ملا حکیم علیم الدین تبریزی، حکیم نصیر الدین شیرازی، صدر الشریف سمرقندی، ملک رکن الدین غوری ملک سیف الدین غوری، سید رضی الدین جگا جوت وغیرہ جیسے علما و حکما بہمنیہ اس کے ساتھ رہا کرتے تھے۔

شہزادوں کی تعلیم و تربیت کے لئے خاص اساتذہ مقرر تھے محمد، محمود، اور داؤد، تینوں شہزادوں کی تعلیم مولانا

فضل اللہ انجو کے تفویض تھی اور مولانا کے زیرِ نگرانی اساتذہ آکر پڑھایا کرتے تھے۔

مدارس کا اعلیٰ انتظام تھا، ایلچ پور (برار) میں ایک دارالعلوم کھولا گیا تھا جس کا ایک وسیع دارالاقامہ بھی تھا اس کے اخراجات کے لئے سالانہ تیس ہزار ہون آمدنی کی جاگیر وقف تھی (ہون شاہی ہے ۳½ روپیہ کلدار) اس کے علاوہ دولت آباد، گلبرگہ وغیرہ میں بہت سے مدارس قائم تھے۔ طلباء کو وظائف نہیں دئے جاتے تھے بلکہ اُن کے خورد نوش کپڑے لتے کا ذمہ دار مدرسہ ہوا کرتا تھا۔ مدرسین کی تنخواہیں معقول تھیں۔

حسن کو فنونِ سپہگری سے خاص شغف تھا اس نے ہر محلے میں ورزش خانے بنوا دئے تھے جہاں فنونِ سپہگری کی مشق کیجاتی اور تعلیم دیجاتی تھی، امراء کے لڑکوں کو تعلیم گاہوں میں جاکر کشتی، تلوار، بنوٹ وغیرہ سیکھنے کے لئے خاص تاکید تھی، شیر و شکار کا بھی بہت شوق تھا گلبرگہ کے اطراف صحرائے محصورہ اس کے شکار کے لئے مخصوص تھا، اکثر شکار کو جایا کرتا تھا آخر اسی شکار کا شکار ہوا اور ایسا شکار کرتے گیا کہ مرض الموت میں مبتلا ہو کر واپس آیا۔

امراء دربار کو جاگیریں اور منصبین دے رکھی تھیں اور ہر طرح امراء کی دلجوئی کیا کرتا تھا۔

پلٹن کا انتظام نہایت اعلیٰ پیمانے پر تھا، اور یہی انتظام اکبر کے زمانے میں بھی قایم رہا۔

شرحِ مالگزاری نہایت ہی خفیف مقرر [illegible] کیا جاتی تھی، ٹیکس بہت کم تھے اور بمقدار قلیل وصول کئے جاتے تھے زراعت کی حالت اچھی تھی تجارت بھی اعلیٰ پیمانہ پر تھی، صنعت و حرفت کو بہت عروج تھا، گلبرگہ میں پارچہ بافی کے کارخانے قایم تھے۔

سکہ۔ ہون، تنکہ، وغیرہ کے نام سے [illegible] سکے رائج [illegible] نے اپنے سکے پر [illegible] محمود سلطان اعظم علاء الدین والدنیا" جانب راست اور [illegible] المو[illegible] ناصر امیر المومنین [illegible] تھا۔ [illegible] متوسط قامت، قوی ہیکل، سرخ رنگ، جلال [illegible] خوش اخلاق [illegible] منکسر المزاج، ذہین، لطیف الطبع، امانت دار، مستقل مزاج تھا۔

بعض مورخین نے اس کی اولیات کی ایک [illegible] فہرست [illegible] سے [illegible] چند یہ ہیں،

دکن میں سب سے پہلے اسلامی سلطنت قائم کی، ہندوستان و دکن میں سب سے پہلے برہمن کانگو پنڈت کو ملازم رکھا سلاطین دکن میں صرف حسن ہی ایک ایسا بادشاہ تھا [illegible] کو کم کر کے [illegible] کی کوشش [illegible] وغیرہ [illegible] اور ان کے اخراجات [illegible]

[illegible] کے [illegible] سلطان محمد شاہ بہمنی [illegible] جلوس کیا

حضرت شیخ سراج الدین جنیدی نے اپنے دست مبارک سے تلوار باندھی اور امراء و وزراء نے نذریں دیں۔

محمد شاہ نے ممالک محروسہ بہمنیہ کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا۔ (۱) گلبرگہ، (۲) دولت آباد، (۳) تلنگانہ، (۴) برار اسوقت تک دکن میں سکوں کا رواج نہ تھا مگر اس نے طلائی سکے بنوائے جن کے ایک رخ پر کلمہ طیبہ اور صحابہ اربع کے اسمار گرامی اور دوسری طرف اپنا نام اور سنہ جلوس کندہ تھا۔

حسن نے جس نقرئی تخت پر جلوس کیا تھا اسی پر محمد شاہ نے بھی جلوس کیا، مگر ایک آبنوسی طلاکار تخت راے تلنگانہ نے شہنشاہ دہلی کے لئے بنوایا تھا جو محمد شاہ کو تحفتہً دیدیا محمد شاہ نے اس کا نام "تخت فیروزہ" رکھکر اسی پر بیٹھنا شروع کیا اور یہ تخت سو برس تک خاندان بہمنیہ میں رہا، اور حسن کا بنوائی با ہوائی نقرئی تخت فیروز شاہ کے عہد میں مدینہ منورہ روانہ کر دیا گیا۔ محمد شاہ کی والدہ ملکۂ جہاں نے بیت اللہ کا ارادہ کیا تو محمد شاہ نے تمام خزانہ ساتھ کر دیا کہ سادات کو تقسیم کر دیا جائے امراء و وزراء نے بہت مخالفت کی کہ خزانہ میں کچھ تو رکھئے مگر محمد شاہ نے ایک نہ سنی اور خزانہ روانہ کر دیا ملکۂ جہاں نے حج سے فارغ ہو کر تمام خزانہ سادات کو بانٹ کر واپسی کا ارادہ کیا تو محمد شاہ نے بڑے کروفر سے استقبال کیا اور ایک بڑا بھاری جشن ترتیب دیا محمد شاہ نے اپنا باڈی گارڈ مقرر کیا اور اس کے چار حصے مقرر کر دئے (۱) سلحدار (۲) سرخیل (۳) جوانان یکہ (۴) باردار۔ روزانہ پچاس سوار دو ہزار خاصہ خیل، نوبت بہ نوبت حاضر در دولت رہا کرتے تھے، امراء و منصبداروں کے چوکی پہرے بھی مقرر کر دئے گئے تھے اور قدیم عہدہ داروں میں کچھ تغیر کرکے حسب ذیل خدمات قایم کی تھیں،

ملک سیف الدین غوری	وکیل سلطنت ملک نائب	بایزید خاں ساقی	افسر خاصہ خیل
بہادر خاں بن اسمٰعیل	امیر الامراء	کلیم اللہ خاں مازندرانی	افسر جوانان یکہ
مقرب خاں بن صفدر خاں	میر آتش	سید شریف سمرقندی	صدر
موسیٰ خاں افغان	افسر میمنہ	ملا محمد بن عین الدین	مفتی عسکر
عیسیٰ خاں	افسر میسرہ	محمود افغان	افسر سلحداران
محمد اسمٰعیل ناعطہ	داروغہ جواہر خانہ	سید جلال حمید	مصاحب
ملک محمود	خوان سالار	شاہ ملک غوری	مصاحب
ملا محمد مشہدی	میر ساماں	٭	٭

سب سے پہلے محمد شاہ نے در دولت پر نوبت مقرر کی اور پانچ وقت نوبت نوازی ہونے لگی جس کا رواج اب تک دکن میں ہے ہر جمعہ کو صبح سے دو پہر تک دربار عام کیا کرتا تھا، اور ہر ایک شخص کی شکایات سنتا تھا۔

تمام مشائخینِ دکن نے محمد شاہ کے ہاتھ پر بیعت کی مگر شیخ زین الدین دولت آبادی نے صاف انکار کر دیا کہ "بادشاہ شراب خوار ہے اور دارالسلطنت میں شراب فروخت ہوتی ہے میں ایسے شخص کی بیعت نہ کرونگا" محمد شاہ کو بہت ناگوار گزرا اور اس نے شیخ کو شہر سے نکل جانے کا حکم دیا، شیخ زین الدین مصلے کندھے پر ڈال کر شہر سے نکلے اور برہان الدین عزیزؒ کے روضۂ منورہ پر جاکر ٹھیرے اور فرمایا "دیکھیں یہاں سے ہمیں کون اٹھاتا ہے" شیخ کی ثابت قدمی دیکھکر محمد شاہ کے خیالات بدل گئے صدر الشریف کو روانہ کر کے معافی مانگی۔ شیخ نے فرمایا اگر بادشاہ شریعت محمدی کا لحاظ کرے اور توبہ کرے اور شراب خانہ اٹھوا دے تو پھر بادشاہ کا کوئی دوست ہم سے زیادہ نہ ہوگا ورنہ کچھ نہیں۔ ہمارا تو یہ نصب العین ہے۔

تا من بزیم بجز نکوئی نکنم — جز نیک دلی و نیک خوئی نکنم
آنہا کہ بجائے ما بدیہا کردند — تا دست رسد بجز نکوئی نکنم

یہ سنکر محمد شاہ نے توبہ کر لی اور ممالک محروسہ سے دوکانیں اٹھوا دیں اور بالکل پابند شریعت ہوگیا۔

ابھی محمد شاہ انتظامات سلطنت سے فارغ ہی نہیں ہوا تھا کہ رایاں بیجانگر و تلنگانہ نے قلعہ جات رائچور، مدگل وغیرہ مطالبہ شروع کیا اور قلعہ کولاس کی واپسی کا مطالبہ بھی ہونے لگا۔ ادھر صرافانِ دکن نے بہمنیہ طلائی اور نقرئی سکوں کو گلانا شروع کر دیا سلطنت بیجانگر اور تلنگانہ کے ایلچی مطالبات لیکر گلبرگہ آگئے، محمد شاہ نے انہیں کوئی جواب نہیں دیا اور انہیں ٹھیرا لیا۔ گلبرگہ میں ایک خفیہ پارٹی بادشاہ کے خلاف ہوگئی، یہ ایسی افتاد تھی کہ اگر محمد شاہ کے بجائے کوئی اور ہوتا تو پریشان ہو کر بھاگ کھڑا ہوتا مگر محمد شاہ نے نہایت ہی اطمینان سے پہلے تو اپنی مخالف پارٹی توڑ دیا اور پھر تمام صرافوں کو نہایت ہی سختی سے قتل کر دیا جب ان چیزوں سے فرصت ہوئی تو دربارِ عام کر کے ایلچیوں کو طلب کیا اور کہا کہ "رایوں نے اب تک پیشکش و نذرانہ نہیں دیا ہے یہ رقم فوراً داخل خزانہ کر دیجائے" ایلچیوں نے بادشاہ کا حکم رایاں بیجانگر اور تلنگانہ کو پہونچا دیا اور انہوں نے ایک زبردست لشکر سپہ سالار ناگ دیو اور نانک رام کی سرکردگی میں کولاس روانہ کر دیا۔ محمد شاہ نے یہ اطلاع پاکر بہادر خاں بن اسمٰعیل مخ کو ایک مختصر سا لشکر دیکر مقابلہ کے لئے روانہ کیا۔ جس نے پہونچکر نہایت ہی جی داری سے مقابلہ کیا اور راجۂ ورنگل سے خراج و تحائف لیکر واپس ہوا۔

۷۶۳ھ میں چند سوداگر گھوڑے لارہے تھے جو محمد شاہ نے منگوائے تھے جب وہ ورنگل پہونچے تو ناگ دیو نے چھین لئے اور سوداگروں نے اس کی اطلاع بادشاہ کو دی، اطلاع پاتے ہی محمد شاہ ایک ہزار سوار لیکر بجلی کی طرح ورنگل پہنچ گیا اور قلعہ پر قبضہ کر لیا، ناگ دیو قلعہ سے باہر ایک باغ میں شراب پی کر مست پڑا ہوا تھا۔ محمد شاہی فوج نے اسے گرفتار کر لیا اور قلعہ کے سامنے آگ جلا کر پھونک دیا محمد شاہ نے پندرہ روز تک وہیں ٹھہر کر جشن منایا جب رایانِ تلنگانہ کو اس کی اطلاع ملی تو انھوں نے تعاقب کیا۔ محمد شاہ لڑتے بھڑتے ہوئے واپس ہونے لگا مگر بہت نقصان اٹھانا پڑا بازو پر گولی کا شدید زخم لگا اور صرف پندرہ سو آدمی گلبرگہ تک پہونچ سکے۔

سنہ ۷۶۳ھ میں رائے تلنگانہ نے فیروز شاہ دہلی کو لکھا کہ ہم ایکا کرکے آپ کی مدد کرتے ہیں آپ حکام مالوہ اور گجرات کو دکن پر چڑہائی کا حکم دیں مگر فیروز شاہ کو اپنے کاموں سے فرصت نہ تھی وہ دکن پر کیا چڑہائی کرتا اس نے جواب نہ دیا مگر جب یہ خبر محمد شاہ کو ملی تو وہ آگ ہو گیا اور اپنے لشکر کے دو حصے کرکے ایک ورنگل اور ایک گولکنڈہ روانہ کر دیا اور دونوں طرف لشکر کامیاب رہا۔ راجۂ ورنگل نے ایک بیش بہا مرصع تخت اندازاً چالیس لاکھ قیمت کا اور بے شمار زر و جواہر دیکر پیچھا چھڑایا اور گولکنڈہ بھی محمد شاہ کے ہاتھ آیا۔ سنہ ۱۳۶۲ء میں ورنگل پر بھی محمد شاہ کا قبضہ ہو گیا اور دریائے کرشنا کا تقریباً کل حصہ سلطنت بہمنیہ میں داخل ہو گیا

سنہ ۷۶۵ھ میں محمد شاہ اور رائے بیجانگر میں ایک باقاعدہ لڑائی ہوئی جسمیں نہ تو مصالح ملکی مدنظر تھے اور نہ کوئی مذہبی خیال تھا صرف محمد شاہ کو اپنے حکم کی تعمیل کرانی منظور تھی، ملا داؤد بیدری جو محمد شاہ کا مہردار تھا اس جنگ کی تفصیل اس طرح بیان کرتا ہے،

"ایک روز محمد شاہ بہمنی جلیۂ رقص و سرود میں بیٹھا ہوا تھا کہ قوالوں نے امیر خسرو کے دو شعر گائے جسے محمد شاہ نے بہت پسند کیا اور ملک سیف الدین غوری کو حکم دیا کہ ان تین سو قوالوں کو انعام دینے کے لئے ایک براءت راجہ بیجانگر کے نام لکھدی جائے۔ ملک سیف الدین نے اسیوقت براءت لکھ دی مگر اس خیال سے کہ بادشاہ نے نشہ میں ایسا حکم دیدیا ہے ممکن ہے کہ بعد کو خیالات بدل جائیں براءت روانہ نہیں کی، دوسرے روز بادشاہ نے دریافت کیا براءت روانہ کر دی گئی" تو سیف الدین نے جواب دیا نہیں" یہ امر محمد شاہ کو بہت ناگوار گزرا کہا "کیا تو خیال کرتا ہے کہ کوئی لغو اور مہمل حکم ما بدولت کی زبان سے نکل سکتا ہے ہم نے نشہ میں حکم نہیں دیا بلکہ جو کچھ کہا گیا سمجھ بوجھ کر کہا گیا ہے" غوری نے فوراً براءت پر مہر کی اور ایک معتبر شخص کے ہاتھ براءت بیجانگر روانہ کر دی گئی۔

رائے بیجانگر نشۂ حکومت میں چور تھا وہ کسی کو اپنے مقابلہ کا خیال ہی نہیں کرتا تھا حکم کی تعمیل تو اور بات ہے اس نے قاصد سے براءت لیکر اس کی تشہیر کی اور گدھے پر بٹھلاکر تمام شہر میں پھرایا اور ذلیل کرکے نکلوا دیا۔ اور تمام فوج ساتھ لیکر بیجانگر سے چل پڑا تیس ہزار سوار، تین ہزار ہاتھی، نو لاکھ پیدل سے قلعہ ادہوتی پر یورش کی اور تمام علاقہ لوٹ لیا۔ اور مدگل پہونچکر قلعہ پر بھی حملہ کر دیا۔ یہاں کا داروغہ ملک سیف الدین غوری کا ایک عزیز اور نہایت ہی سخت آدمی تھا، قلعہ پر آٹھ سو جوان محافظت کے لئے تھے مگر داروغہ کی سختی کی وجہ سے بد دل تھے، اسی بددلی کی وجہ وہ لوگ مقابلہ نہ کرسکے اور راجہ نے مدگل پر قبضہ کر لیا، تمام باشندے قتل کر دئے گئے حتیٰ کہ زن و مرد میں کوئی باقی نہ رہا صرف ایک مسلمان نہ جانے کہاں چھپ رہا تھا کہ راجہ کے سپاہیوں کی وردی پہن کر مدگل سے نکلا اور گلبرگہ پہونچکر سارا حال کہہ سنایا بادشاہ یہ خبر سنکر آگ ہو گیا اس خبر لانے والے کو یہ کہکر قتل کرا دیا کہ "میں ایسے منحوس کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا جو تمام بہادروں کو کٹتے مرتے دیکھ کر اپنی جان بچا کر بھاگ آئے" اسی دن جمادی الاول سنہ ۷۶۷ھ کو قسم کھائی کہ جب تک آٹھ سو مسلمانوں کے خون کے عوض ایک لاکھ ہندوؤں کو قتل نہ کرونگا تلوار نیام نہ کرونگا۔ اور کشت و خون سے ہاتھ نہ روکوں گا" اسی دن گلبرگہ سے روانہ ہو گیا اور جب رود کرشنا پر پہونچا تو مغلظہ قسم کھائی کہ جب تک خداوند کریم کے فضل و کرم سے دریا عبور کرکے لشکر کفار کو نیست و نابود نہ کرونگا اور مسلمانان مدگل کے خون کا بدلہ لیکر دل نہ ٹھنڈا کروں خواب و خور حرام ہے،" اپنے بیٹے کو جانشین بنا کر وصیت تک کر دی اور ملک میں سیف الدین

غوری کو نائب السلطنت مقرر کرکے گلبرگہ روانہ کر دیا اور صرف خاصہ کے بیس ہاتھی اور نو ہزار سوار ساتھ لیکر کرشنا کے پار جا اترا۔

بادشاہ کا حال سنکر رائے بیجانگر کو بہت پریشانی ہوئی اس نے خزانہ وغیرہ روانہ کرکے خود بھی قرار برقرار کیا، مگر رات میں بارش ہوچکی تھی راستہ خراب تھا بمشکل چار میل ہی گیا ہوگا کہ محمد شاہ لئے ہوئے آ پہونچا اور پہلے ہی حملے میں ستر ہزار زن و مرد اور بچے قتل کر دئے۔ دو ہزار ہاتھی تین ہزار توپیں اور بندوقیں، سات سو عربی النسل گھوڑے ایک منزل سنگاسن (پالکی) مرصع داخل خزانہ ہوئی اور بقیہ لوٹ امراء اور فوج کو ملی، محمد شاہ نے موسم برسات مدگل ہی میں بسر کیا جب خان محمد دار السلطنت سے فوج لیکر آیا تو اُسے ادہونی روانہ کر دیا اور ہر دیو راے نے اپنے بھانجے کو سپہ سالار بناکر قلعہ میں چھوڑا۔ اور خود بیجانگر سے فوج ہاتھی اور لوازم شاہی منگواکر قلعہ کے باہر ٹھہر گیا۔ بادشاہ نے بھی توپیں اور بندوقیں زیادہ تعداد میں منگوائیں اور ایک آتش باری کا نیا کارخانہ قایم کیا جس کا رواج اب تک نہ تھا یہ اسی کی ایجاد تھی مقرب خان سیستانی کو اس کا افسر مقرر کیا اور رومی اور فرنگی سپاہی کا کام کرنے کے لئے مقرر کئے گئے۔

ریاست بیجانگر پر چڑہائی کا یہ بالکل پہلا موقع تھا اس لئے محمد شاہ کو پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑا، مگر اسپر بھی محمد شاہ نے تنگ بھدرا کو عبور کرکے تخمیناً پچیس میل آگے بڑھ کر یا کل کوتال پر بیجانگر کی فوج سے مقابل ہوا، کیونکہ محمد شاہ کے دریا پار اُترنے کی اطلاع جب "بکا رائے بیجانگر کو ملی تو اس نے امراء کے مشورے سے بھوج مل کو سپہ سالار مقرر کرکے چالیس ہزار سوار اور پانچ لاکھ پیدل دیکر محمد شاہ کے مقابلہ کے لئے روانہ کر دیا۔ بھوج مل کو سپہ سالاری کا عہدہ پاکر ایسی مسرت ہوئی کہ اپنے آپ کو بھول گیا اور راجہ سے پوچھنے لگا "مہاراج کا کیا حکم ہوتا ہے آیا بادشاہ کو زندہ قید کرکے حاضر کروں یا اس کا سر کاٹ کر لاؤں"، راجہ نے کہا۔ زندہ دشمن تو ہر حال میں خطرناک ہے بہتر تو یہ ہے کہ تم اس کو بوقت گرفتار کرو فوراً "مار ڈالو" بھوج مل خوشی خوشی روانہ ہوا اور اس نے یہ ایک اور ترکیب سوچ لی کہ چند برہمنوں کو اس واسطے مقرر کر دیا کہ لشکر میں مسلمانوں کے مظالم بیان کرکے سپاہیوں کو جوش میں لائیں۔ برہمن تو مسلمانوں پر خار کھائے بیٹھے تھے۔ انھوں نے دل کھول کر مسلمانوں کے مظالم بیان کرنے شروع کئے اور ایسے وعظ کئے کہ مسلمانوں کی طرف سے ہندؤں کے دل میں جذبات منافرت کی طغیانی ہونے لگی اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ محمد شاہ کو جب بھوج مل کے آنے کی اطلاع ملی تو اس نے پندرہ ہزار سوار اور پچاس ہزار پیدل خود رکھکر اور دس ہزار سوار اور تیس ہزار پیدل اور توپخانہ دیکر خان محمد کو مقابلہ کے لئے روانہ کر دیا

پنجشنبہ ۱۴ ذیقعدہ ۷۶۷ھ کی صبح سے مقابلہ شروع ہوا شام تک دونوں فوجیں آپس میں گتھی رہیں عیسیٰ خاں اور موسیٰ خاں میمنہ اور میسرہ پر لڑتے ہوئے شہید ہوئے اور انکی فوجیں منتشر ہونے لگیں قریب تھا کہ فوج کے قدم اکھڑنے لگیں کہ بادشاہ خود تین ہزار سوار لیکر پہونچ گیا۔ محمد شاہ کو دیکھتے ہی خان محمد کی ہمت بندھی اور منتشر شدہ فوج لیکر حملہ کر دیا، مقرب خاں بھی توپ خانہ لیکر آگے بڑھا، تمام افسران فوج نے اکٹھا ہوکر پادا کیا ہندو روک نہ سکے اور آپس میں گتھ گئے

دست بدست لڑائی ہونے لگی، اتفاق سے محمد خاں کا ہاتھی "شیر شکار" بدل گیا اور مہاوت کے قبضہ سے نکل کر سیدھے قلب لشکر میں جا گھسا، بھوج مل کے ہاتھیوں نے روکنا چاہا مگر وہ کب رکتا تھا اسی گڑبڑ میں مہاوت بھی مارا گیا اور شیر شکار مطلق العناں ہو کر روندنے لگا خان محمد نے بھی پانچ ہزار سوار لیکر قلب پر حملہ کر دیا، شیر شکار بھی اپنے مالک کو دیکھکر اس کی طرف آیا اور دشمنوں کو پامال کرنے لگا۔ بھوج مل زخمی ہو کر بھاگا اور اس کو بھاگتے دیکھکر لشکر کے قدم بھی اُکھڑ گئے، محمد شاہ نے قتل عام بول دیا۔ اب کیا تھا مرد تو مرد عورتیں اور بچے بھی تہ تیغ کئے گئے، کامل فتح ہوئی اور محمد شاہ نے اسی میدان میں ڈیرے ڈال دیئے اور ایک ہفتہ قیام کر کے آگے بڑھا رائے بیجانگر باوجود فراوانی لشکر کے ایسا گھبرایا کہ پہاڑوں اور جنگلوں میں چھپ گیا محمد شاہ بھی اپنی بات کا دھنی تھا تین مہینہ تک وہ صحرا میں پیچھا کرتا رہا، اور راجہ کو گھیر کر قلعہ کی طرف لایا۔ ایک مہینہ تک راجہ قلعہ بند اور بادشاہ محاصرہ کئے رہا مگر بیٹھے بیٹھے محمد شاہ کو ایک نئی چال سوجھی کہ ایک بستر علالت پر دراز ہو گیا اور اپنی شدید علالت کی خبر مشہور کرا دی، یہ ایک راز تھا جس سے خان محمد اور مقرب خاں کے سوائے کوئی واقف نہ تھا۔ رائے بیجانگر کو اس خبر سے بڑی مسرت ہوئی اور وہ قلعہ کے باہر نکل پڑا، بادشاہ پیچھے ہٹنے لگا اور راجہ تعاقب کناں ساتھ ہو گیا، بادشاہ سنگھاسن میں لیٹا ہوا سفر کرتا تھا تمام لشکر پریشان ساتھ ساتھ تھا اسیطرح دریائے تنگبھدرا کو عبور کر کے ایک میدان میں قیام کیا۔ دو تین کوس کے فاصلہ پر راجہ نے بھی ڈیرے ڈال دیئے، راجہ بالکل بے سرو سامانی کے ساتھ شاہی لشکر کو دیا تا ہوا آگیا تھا جب محمد شاہ نے دیکھا کہ موقع اچھا ہے تو ایک دن دربار عام کیا اور دس پندرہ منٹ بیٹھ کر دربار برخواست کر دیا، اس سے فوج میں ہمت آگئی اور رات کے بارہ بجے لشکر کو تیار رہنے کا حکم دیا اور خود بھی تیار ہو کر راجہ کے لشکر پر شبخون مارا تمام ہندو بے خبر پڑے سو رہے تھے جب مسلمانوں نے سر پر پہونچکر قتل عام شروع کیا تو یہ بیدار ہوئے مگر مسلمانوں کی تلوار سے پناہ پانی مشکل تھی۔ رائے بیجانگر تو اپنی جان مٹھی میں لیکر چلتا بنا مگر دس ہزار آدمی کام آئے، اسپر بھی محمد شاہ کا تیش کم نہ ہوا، بیجانگر کے اطراف چالیس چالیس کوس تک قتل عام کر دیا، دس ہزار برہمن قتل ہوئے اور قلعہ کے اطراف رعایا کا پتہ نہ رہا اور فوج تو نام کو بھی باقی نہ تھی۔

ادہر ہندو بے انتہا پریشان تھے تمام امرا و وزرا نے اس قتل عام کو رائے بیجانگر کے سر تھوپا کہ محض تیری وجہ اور تیری ہی خودسری اور شعلہ مزاجی کے کارن یہ دن دیکھنا نصیب ہوا ہم نے علاؤالدین سے صلح کر لی تھی تو نے ذرا سی بات کے واسطے لڑائی مول لی، اب نہ تو تو رہیگا، ورنہ سلطنت کا نام و نشاں ہی باقی رہیگا اب بھی مصالحت کر لے تو اچھا ہے، اسیوقت راجہ نے ایک ایلچی روانہ کیا اور معذرت سے عفو تقصیر چاہی مگر بادشاہ نے صاف انکار کر دیا۔ امرا بہمنیہ بھی لڑائی سے تنگ آگئے تھے ایک پنڈت رفتہ من چلے امیرے عرض کی کہ حضرت نے آٹھ سو مسلمانوں کے بدلے میں ایک لاکھ ہندوؤں کو قتل کرنے کی قسم کھائی تھی وہ پوری ہی ہوگئی، مگر یہ قسم نہ تھی کہ روئے زمین پر کے تمام ہندو قتل کئے جائیں گے۔ یہ سنکر محمد شاہ ہنس پڑا اور کہنے لگا تم سچ کہتے ہو مگر مجھے اپنی بات کی لاج ہے۔ جب تک رائے بیجانگر میرے حکم کی تعمیل نہ کریگا

اور قوالوں کو رقم نہ دیگا میں مصالحت نہ کرونگا، ایلچی نے فوراً قوالوں کو رقم ادا کر دی اور جب محمد شاہ نے قوالوں کو رقم دیجاتی ہوئی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو کہنے لگا "میں نہیں چاہتا کہ کوئی حکم میری زبان سے ایسا لغو نکلے جس کی تعمیل نہ ہو سکے۔ اور آگے چل کر میری سبکی ہو الحمدللہ میرا حکم پورا ہوا"

محمد شاہ کی اس عدیم النظیر سخن پروری کو ہم بھی وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں مگر اتنی سی بات کو افسانہ کر دینا اور ایسا کشت و خون ذرا رکیک ضرور ہے

ایلچیوں کے معروضہ پر بادشاہ نے عہد کیا کہ آئندہ کسی جنگ میں فتح کے بعد کسی ہندو کو قتل نہ کیا جائے گا مگر اس کی پابندی نہ تو خود محمد شاہ نے کی اور نہ اس کے جانشینوں نے چند ہی روز کے بعد یہ عہد بھلا دیا گیا۔

مصالحت کے بعد محمد شاہ گلبرگہ آگیا مگر اس وقت بیجانگر کی حالت بڑی تھی پانچ لاکھ ہندو تہ تیغ ہو چکے تھے، اور کوسوں تک ویرانا ہی ویرانا نظر آتا تھا مدت تک بیجانگر سنبھل نہ سکا۔

محمد شاہ نے جس وقت اپنی علالت کی خبر اڑائی تو بہرام خاں مازندرانی نے بغاوت کر دی گلبرگہ پہونچکر بادشاہ کو اطلاع ملی تو اس کی سرکوبی کے لئے تیار ہونے لگا، مگر وہ گجرات بھاگ گیا جس کی وجہ ایک فتنۂ عظیم فرو ہو گیا۔

۱۹ ذیقعدہ ۷۷۶ھ کو سترہ سال نو مہینے سات دن حکومت کر کے ۴۵ سال کی عمر میں محمد شاہ نے انتقال کیا۔

چون محمد شہِ زمین و زماں | جست زیں دار دوں بہ جنت راہ
شاہِ ملت بگو بسال نیز | اہل دیں مرد دیں محمد شاہ
۷۷۶ھ | ۷۷۶ھ

محمد شاہ دشمنوں کے لئے نہایت ہی سخت گیر اور اپنی رعایا اور فوج کے لئے نہایت ہی ذی خلق تھا نہایت ہی عقیل شجیع فہیم، اولوالعزم، اور عالی حوصلہ تھا۔ ٹھگوں اور ڈاکوں کا قلع و قمع کر دیا اس کے زمانہ میں آٹھ ہزار ڈاکو گرفتار کرکے جا کر قتل کئے گئے تھے ایک دفعہ سارا خزانہ بیت اللہ کو روانہ کر دیا مگر بعد میں اس کے ہاں اس قدر خزانہ جمع ہوا کہ دوسرے کسی بادشاہ کو اتنی دولت میسر نہ آسکی۔ اُس کی اولاد سے ایک بیٹا مجاہد شاہ اور ایک بیٹی روح پرور آغا تھی۔ باقی

تمکین کاظمی

قابل رشک خودکشی

(فسانہ)

عورت کی فطرت کے متعلق لوگ کہتے ہیں کہ "عقدۂ لاینحل ہے"۔ باوجود اس کے ان کی کوشش ہمیشہ یہ جاری رہی ہے کہ اس معمہ کا حل اس بحر بے پایاں کا کنارہ دریافت کریں۔ مگر انھیں نہیں معلوم کہ ایک مرد کے لئے عورت کی خواہش اس کی محبت کا پُرکیف خیال، اور اس کو مقصود زندگی سمجھنا اسیوقت تک ہے جب تک کہ وہ اس کی فطرت سے ناواقف و ناآشنا ہے۔ عورت کی فطرت کو سمجھ لینا تباہ و برباد ہوجانے کے مترادف ہے۔ پھر کیوں اک عالم اپنی موت کی پیچھے پڑا ہوا ہے اسی قسم کی ایک بربادی کا واقعہ سنئے :-

میں مصور پیشہ تھا سب کا خیال تھا کہ میں دنیا کا بہترین مصور ہوں ..... مصوری میرے ایسے شخص ہی کی محتاج تھی جو اُس کو اس کی اصلی شکل میں دنیا کے آگے پیش کر سکتا تھا۔ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ مصور حقیقی اپنے بنائے ہوئے قانون کے تحت اسباب پر مجبور رہے کہ کسی تصویر کو "جذبۂ رنج" دے، تو "جذبۂ خوشی" بھی دے۔ اضطراب دے تو سکون بھی دے۔ مگر مصور مجازی کی (یعنے میری) بنائی ہوئی تصویریں اس قید و بندش سے آزاد صرف ایک ہی قسم کے جذبات کی حامل ہوتی ہیں اور وہ جذبات کامل سوز، یکسر گداز، محوکن محویت، مسرت بخش استغراق کے سوا کچھ نہ تھے۔ جب یہ خیالات مجھکو..... معلوم ہوتے تو ایک طرف اپنی ذات کے متعلق تعجب ہوتا اور دوسری طرف ان کلمات کی صداقت کا یقین۔ غرض میری مصوری کا ستارہ ایسے عروج پر تھا جس کے بعد زوال کا ہونا لازمی ہے۔ ایک روز میں کام کرنے کے بڑے کمرہ میں بیٹھا ہوا شہر کے ایک بڑے نواب کی تصویر پر نکتہ چین نگاہ ڈال رہا تھا جو میں نے کافی معاوضے اور مناسب التجا پر تیار کی تھی گھنٹی بجی۔ میرا مددگار ٹیلیفون کی طرف بڑھا، واپس آکر کہنے لگا مس لیلیٰ صاحبہ نے کہا ہے کہ وہ پرسوں شام اپنی تصویر کھچوانے کے متعلق بات چیت کرنے آئیں گی — میں اچھل پڑا ...... بیشک میں ہمیشہ کسی دولتمند کی خواہش تصویر کشی پر مسرت سے اچھل پڑتا تھا، کیونکہ مجھے ایسی صورت میں ہمیشہ قیاس سے کہیں زیادہ مالی فائدہ ہوچکتا ہے۔ مگر میرا اسوقت چونک پڑنا خوشی سے نہیں بلکہ آنے والے .... "حادثۂ عظیم" کے خیال سے تھا دنیا جانتی ہے کہ لیلیٰ حسین عورت ہے اور کنواری، زہریلی ناگن ہے اور آزاد آگ کا شعلہ ہے اور کھلی ہوا ہیں۔ بیسیوں ہستیاں اس کی لپیٹ میں تباہ ہوچکی ہیں اور بیسیوں ایک ملاقات کے معاوضہ میں زندگی دینے کے لئے تیار۔

میں نے اپنی طبیعت کے خلاف اپنے مددگار سے بگڑ کر کہا .. کیوں نہ کہدیا کہ مصروفیت زیادہ ہے، دو ماہ تک نیا آرڈر نہیں لیا جا سکتا" ساتھ ہی خیال آیا "اس غریب کو کیا معلوم کہ میں کسی خاص وجہ سے لیلیٰ کی تصویر بنانا پسند نہیں کرتا۔

مددگار نے کہا "معاف فرمائیے اب کہہ نہ دوں کہ مجبوری ہے"۔ میں "ہاں" کہنا چاہتا تھا مگر چونکہ "ہاں" کہنا تقدیر کے خلاف تھا اس لئے نہ کہہ سکا میں نے مددگار سے جو آیا کہا کہ "ضرورت نہیں۔ اپنا کام کرو"۔ اس قیامت صغریٰ سے اس قیامت کبریٰ (لیلیٰ کے آنے والے مصیبت کے دن) تک میں جس قدر بےچین و بیتاب رہا اس کا اندازہ کرنا محال اور تمثیل پیش کرنا ناممکن ہے۔ اگرچہ میں مرد تھا اور مضبوط جسم و دل کا مالک — مگر سمجھ میں نہ آتا تھا کہ جب کبھی لیلیٰ سے ملنے کا خیال آتا تھا میرے ہاتھ پاؤں کیوں مرتعش ہو جاتے تھے۔ اور دل کی آواز کیوں صاف سنائی دیتی تھی۔ میں وقت کو روک لیتا اگر روک سکتا ... اس وقت تک کہ دنیا فنا ہو جاتی اور مجھے یہ "روزِ بد" دیکھنا نہ پڑتا۔ مگر ایسا ممکن ہونا ممکن نہ تھا۔ آخر وہ دن آ پہونچا۔

مجھے صفائی اور خوش پوشی زیادہ پسند تھی ... اس لئے ایک سولی پر چڑھنے والے شخص کی طرح اپنی ہر دو خواہشات کی تکمیل کر کے غسل سے فارغ ہو کر نیلے رنگ کے سرج کا سوٹ پہنا اور کام کرنے کے "ہال" میں ہر آنے والی مصیبت کے لئے تیار آ بیٹھا۔ جوں جوں وقت قریب آتا تھا بےچینی زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ مگر یہ بےچینی "آتشِ شوق" کی نہ تھی۔ گھڑیال نے ساڑھے چار کا گھنٹہ بجایا.... ساتھ ہی کمرہ کی "اطلاعی گھنٹی" بجی — مددگار نے قاعدہ کے موافق دوسرے کمرہ میں جاتے ہوئے لیلیٰ کو میرے کمرے میں بھیجدیا — میں عمداً سر جھکائے ہوئے ایک تصویر کے مطالعہ میں مشغول تھا، میں نے پہلے دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں سنیں، پھر میری طرف بڑھتے قدموں کی ہلکی چاپ سنائی دی، پھر بھی میں بیٹھا رہا۔ ایک سریلی آواز یہ کہتے ہوئے سنائی دی... معاف فرمائیے .... شاید آپ کو میرے آنے کی اطلاع نہیں ہوئی۔ میں چاہتا تھا کہ مصنوعی اضطراب ظاہر کر کے اٹھوں، مگر جوں ہی میں نے نظر اٹھائی اور دیکھا اضطراب طاری کرنے کی بجائے رفع کرنا مشکل ہو گیا، میں نے کہا خبر تو ہو گئی تھی مگر آپ کے واقعی تکلیف فرمانے کا یقین نہ تھا، میں اس بارہ میں ادب کے ساتھ معافی چاہتا ہوں۔ لیلیٰ نے کرسی پہ بیٹھتے ہوئے میرا فقرہ پورا کیا" باوجودیکہ میں نے وقت بھی مقرر کر دیا تھا، ساتھ ہی مجھے کچھ کہنے کا موقع نہ دیکر کہنے لگیں کہ میں نے آپ کی مصوری کی بہت کچھ تعریف سنی ہے — میں نے کسی قدر ترشی سے کہا .... یہ سب لوگوں کا حسنِ ظن ہے — ..... باوجود اس کے مجھے یقین ہے کہ آپ کی جگہ عام سطح سے بلند ہے، اور میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ اپنی ایک تصویر آپ سے کھچواؤں گی .. ساتھ ہی تحکمانہ کہا . میرے خیال میں کل سے کام شروع کر دینا چاہئیے۔ کہیے مجھکو روز کتنا وقت دینا پڑے گا اور کتنے دن میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا کہ آدھ گھنٹہ... تین دن — لیلیٰ نے مسکرا کر خاص ادا سے کہا کہ اچھا مجھے معاوضے میں کس قدر رقم پیش کرنی پڑیگی "جس قدر آپ چاہیں" لیلیٰ اٹھ کھڑی ہوئیں اور ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا کہ بات طے ہو گئی؛ میں نے جواب میں ہاتھ بڑھایا ایسا معلوم ہوا کہ میرا برف کے مانند سرد ہاتھ گویا آگ میں ڈال دیا گیا ہے ... تین سکنڈ کے بعد لیلیٰ کمرہ سے نکل گئیں اور میں مفلوج کی طرح کرسی پر گر پڑا۔

مجھے یقین تو نہ آتا تھا مگر واقعات کہتے تھے کہ تصویر تیار ہو گئی صرف گہری نظر ڈال کر باریک نقائص دور کر دینے باقی تھے

جس طرح پاگل یا نیند کی حالت میں چلنے پھرنے والے مریض ہوش میں آنے کے بعد اپنے اعمال کے نتائج دیکھکر مبہوت رہ جاتے ہیں بالکل یہی حالت میری حیرت اور استعجاب کی تھی۔ ہرچند غور کرتا تھا مگر سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ تین دن کس طرح گزرے، تصویر کیونکر تیار ہوئی۔ لیلیٰ سے کیسی ملاقاتیں ہوئیں ــــ مگر جس طرح میخوار کے دماغ میں واقعات سکر کا ایک دھندلا پن رہ جاتا ہے اسی طرح میرے ذہن میں بھی ایک کمزور اور خفیف سا خیال رہ گیا تھا۔ میں نے تصویر دیکھی اس سے اور بھی تعجب بڑھا۔ تصویر ہر قسم کے نقائص سے پاک بہترین تیار ہوئی تھی۔ اصل اور نقل میں "جاندار اور بے جان ہی کا فرق تھا۔ تصویر میں لیلیٰ کھڑی ہوئی تھیں بایاں ہاتھ خوشنما اسٹول پر رکھا ہوا تھا۔ بدن پر سیاہ ریشمی ساڑی تھی جس پر سپید پھول کڑھے ہوے تھے۔ گلے میں پیازی رنگ کی جاکٹ تھی۔ جاکٹ کے نیم آستین تھے جن کے کنارے لیس لگی ہوئی تھی۔ پاؤں میں کارچوبی پمپ تھا۔ زیور کی قسم سے ہاتوں میں ایک ایک طلائی چوڑی تھی اور بائیں ہاتھ کی انگلی میں انگشتری تھی۔ تصویر میرے روبرو تھی اور میں بے باکانہ طور پر دیکھ رہا تھا۔

اگرچہ میں نے اصل کو دیکھکر ہی نقل اتاری تھی اور اس سے پہلے بھی کبھی کبھی لیلیٰ کو وکٹوریہ گارڈن میں تفریح کرتے دیکھ چکا تھا مگر کچھ تو اجنبیت اور کچھ "رعب حسن" غور سے دیکھنا نہ ہوا تھا۔ اب جو موقع ملا تو تصویر کو سراپا، از جبۂ تا کل پوری طرح بہت دیر تک دیکھتا رہا۔ آخر اس نتیجہ پر پہونچا کہ "بیشک عورت قدرت کا ایک گہرا راز ہے جو حسن و شباب کے پردوں میں پوشیدہ ہے"۔ دیر تک سوچنے پر یاد آیا کہ اختتام کی اصلاح کے لئے میں نے ایک ہفتے کی مدت حاصل کرلی ہے۔ اس دن سے ایک ہفتے تک میرا کام دن میں تصویر درست کرنا اور شب میں ایک اور کاپی تیار کرنا رہا۔ دوسری کاپی تیار کرنے کی وجہ میں نہیں بتلا سکتا تھا۔ میری اپنی زندگی میں یہ پہلا کام تھا جو میں بلا ارادہ اور بلا مقصد کے کررہا تھا۔ کام ختم ہونے کے بعد مجھے ایک شخص کے ذریعہ سے (جو غالباً لیلیٰ کا نوکر تھا) ایک چٹھی ملی جس میں تحریر تھا:-

جناب عالی! حامل ہذا میرا معتمد ملازم ہے۔ تصویر جو غالباً تیار ہوگئی ہوگی اس کے ہاتھ روانہ کردیجئے۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ کا محنتانہ کیا مقرر ہے۔ پھر بھی میں نے فی الحال ایکہزار کے نوٹ امپیریل بنک　　ب کے کھاتے میں جمع کرا دئے ہیں۔ پورا محنتانہ معلوم ہونے پر بقیہ رقم بھی جمع کرادی جائیگی میں مشکور ہوں کہ آپ نے بڑی محنت اور دلچسپی سے تصویر تیار کی۔ لیلیٰ

عورت کا ہر کام عجیب و غریب ہے اور حکمت و مصلحت سے خالی نہیں، وہ ہنستی ہے تو سمجھئے کہ پروپگنڈا کرتی ہے، وہ روتی ہے تو سمجھئے کہ اس کے ہر آنسو میں جال بچھا ہوا ہے۔ اس کی ہمدردی بہت کم "ہمدردی" رہتی ہے۔ اس کا غصہ بھی دراصل غصہ نہیں ہوتا۔ بہرحال تصنع، بناوٹ، دہوکہ کا ہریت اس کے روزانہ شامل ہیں ــــ میں نے تصویر دیدی اور جواب لکھا کہ:-

تصویر حاضر ہے۔ محنتانہ محنت کے پہلے طے پاتا ہے۔ جب یہاں ایسا نہیں ہوا ہے تو اس کے صریح معنے یہ ہیں کہ میں دس ہزار روپیے بھی اجرت مقرر کرسکتا ہوں اور ایک پائی بھی نہیں۔ لیکن میں ان دو میں سے ایک طریقہ بھی اختیار نہ کرونگا کیونکہ مجھے آپ ایسی

مشہور ہستی کی تصویریں کھینچنے سے تصویر کشی کا صلہ مل گیا اگر آپ اس پر بھی مزید مہربانی کرنا چاہتی ہیں تو کوئی ایسی چیز عنایت فرمائیے جو آپ کی تصویر کھچوانے کی یادگار رہے —

چوتھے روز وہی آدمی جو تصویر لے گیا تھا جواب لایا لکھا تھا:۔

آپ کی خواہش عجیب و غریب ہے خیر چونکہ مجھ سے محنتانہ طے نہ کر لینے کی غلطی سر زد ہو گئی تھی اسلئے بہرحال آپ کی خواہش پوری کرنی پڑیگی — پرسوں میری اکیسویں سالگرہ کی تقریب ہے۔ اُمید کہ شام میں شریک "ایٹ ہوم" ہو کر ممنونیت کا موقع دیا جائیگا.... ساتھ ملازم نے ایک خوبصورت ڈبیا پیش کی۔ کھولکر دیکھنے پر میں متحیر اور خوش ہوا کہ ایک سہ نگی بہترین انگشتری تھی۔ میں ڈیڑھ دو منٹ تک محویت اور استعجاب سے دیکھتا رہا۔ آخر ملازم کی موجودگی کے خیال سے استعجاب پر غالب آنے کی کوشش کی..... تعجب میں اور بھی اضافہ ہوا جب ڈبیہ میں بھی ایک چھٹی رکھی ہوئی ملی —

مس لیلیٰ صاحبہ! مرسلہ انگشتری آگئی۔ میرے خیال میں درمیان کا نگینہ ایکہزار کا اور بازوں کے پانچ پانچ سو کے ہیں — اگر یہ بکاؤ ہے تو میں خوشی سے اس کا معاوضہ پیش کرنے کے لئے تیار ہوں"

سورج بلی جوہری

کیسی ذہین اور بے لاگ عورت ہے مجھ پر یہ ثابت کرنا چاہتی ہے کہ یہ نگینے جھوٹے اور کم دام کے نہیں اور اگرچہ میں نے انگشتری ہی روانہ کر کے احسان کیا ہے مگر یہ کچھ ایسی کم قیمت بھی نہیں کہ جو محنت کا معاوضہ ثابت نہ ہو....... یہ تھے میرے خیالات جو اس واقعے کے بعد ذہن میں آتے رہے۔ دوسرا روز بڑی بےچینی سے گزرا۔ ایٹ ہوم میں شریک نہ ہونا چاہتا تھا مگر جس طرح آدم نے عورت کے کہنے سے خدا کی نافرمانی کی تھی" اسیطرح ضمیر کے روکنے پر بھی مجھے سنیاتیں میں شریک ہونا پڑا۔ جب میں لیلیٰ کے عالیشان مکان میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک کثیر جماعت بڑے ہال میں لگی ہوئی تصویر کو دیکھ رہی ہے۔ لیلیٰ وہی ساڑی زیب بدن کئے ہوئے تھیں جس سے تصویر اتاری گئی تھی۔ انھوں نے سب حاضرین سے میرا تعارف کرایا۔ ساتھ ہی سب کی ملی ہوئی تعریف کی آوازیں میرے کانوں میں پہونچیں — مجھے یقین ہو گیا اور کامل یقین کہ در اصل میں مصوری کا دیوتا ہوں، کیونکہ جب میں لیلیٰ اور ان کی تصویر کو دیکھتا تھا تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ ایک مہمانوں کے آگے ان کے استقبال کے لئے کھڑی ہیں اور دوسری چل پھر رہی ہیں — لیلیٰ یوں تو سب مہمانوں کے ساتھ بہترین اخلاق سے پیش آرہی تھیں مگر میری طرف اُن کا التفات بہت خوفناک تھا۔

ضیافت بڑی شاندار ہوئی۔ لیلیٰ نے کچھ دیر پیانو بجا کر مہمانوں کو مسرور بھی کیا۔ اس کے بعد ایک ایک مہمان رخصت ہونے لگا۔ میں عمداً ٹھہر گیا کہ ذرا ہجوم کم ہو جائے تو رخصتی ملاقات ہو۔ کیونکہ دل کے منصوبے اور راز زباں پر آنا چاہتے تھے جب سب رخصت

ہوتے ہوئے ملا تو لیلیٰ نے بڑی گرم جوشی ظاہر کی اور تکلیف دینے پر رسماً معذرت کرنے لگیں .... میں نے کامل سنجیدگی اختیار کرکے کہا "آپ کے عطیہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور عرض ہے کہ اگر ...... لیلیٰ نے کہا کہئے کہئے۔ میں کہنے لگا...... اگر کبھی کبھی مزاج پرسی کے لئے حاضر ہونے کی اجازت دیجائے تو خوش قسمتی خیال کرونگا۔ لیلیٰ کے ہونٹوں پر عجیب قسم کی مسکراہٹ آگئی جیسے شکاری کے لبوں پر شکار پر قابو پاکر جوش فتح سے آتی ہے ــ اجازت ملگئی...... رخصتی مصافحہ ہوا...... میرا ہاتھ غیرارادی طور پر دیر تک لیلیٰ کے نرم ونازک ہاتھ کو پکڑے رہا اور چھوڑتے وقت میں نے اضطراری کیفیت میں...... گرفت سخت کرکے ڈھیلی کی۔ اس کے بعد ہم علٰحدہ ہوگئے ــ

میں اس قصے کو حتیٰ الامکان مختصر کرنے کی کوشش کرونگا۔ ان واقعات کے بعد وہی ہوا جو لوہے کے قریب مقناطیس کے پہونچنے سے ہوتا ہے ــ ملاقاتیں بڑھیں۔ بے تکلفی ہوگئی۔ ہفتے میں دو دن ہم ایک ساتھ تفریح کو جانے لگے۔ اس منزل پر پہونچکر میں نے...... تصویر کی دوسری کاپی جو بغیر اطلاع کے تیار کرلی تھی دکھائی۔ اور ساتھ ہی اصل کو بار بار دیکھکر نقل کی مدد سے دل کے پردوں پر جو غیر فانی تصویر کھینچی تھی پیش کردی ــ ان چیزوں کو دیکھکر لیلیٰ پر کوئی خاص کیفیت طاری نہیں ہوئی اور نہ پھر گفتگو کا موقع آیا۔ دنیا کے قاعدہ کے موافق میں نے خاموشی کو "رضامندی کے نسوانی طریقے پر محمول کیا ــ مگر آہ مجھے کیا معلوم تھا کہ دوستی کا انجام دشمنی اور اتفاق کا اختتام نفاق پر ہوگا۔ جس وقت بھی درد دل کے وضاحت سے بیان کرنے کا موقع آیا۔ لیلیٰ نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کردیں۔ جب کبھی مرد کی بیتابیاں بڑھتی ہیں۔ عورت ہمیشہ روکتی ہے یا روکنے کی کوشش کرتی ہے۔ عام لوگ سمجھتے ہیں کہ مرد کو گناہ سے باز رکھتی ہے یا پاکباز بنانا چاہتی ہے مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ اس کے روکنے کا مقصد "بڑھانا ہوتا ہے" جذبات کو ناصحانہ کلمات سے فرو کرنا بھڑکانا ہوتا ہے۔ وہ محبت کی شاخوں کو کاٹتی ہے کہ عشق کا درخت پوری طاقت سے بڑھے۔ اور اس سے وہ خود بھی ناواقف نہیں وہ خوب جانتی ہے اور عمداً کرتی ہے ـــــ دن گزرتے گئے اور میں من کے مندر میں سمائے ہوئے بت کو پورے شوق اور کامل دلچسپی سے پوجنے لگا۔ اسیطرح ایک سال کی طویل مدت ایک سکر کی حالت میں گزر گئی ــــ

ایک دفعہ روز مقررہ پر جبکہ میں لیلیٰ کے گھر جانے ہی والا تھا ٹیلیفون سے لیلیٰ نے کہا کہ "معاف فرمائیے۔ آج میں ایک خانگی مصروفیت کی وجہ سے آپ کے ساتھ تفریح کو نہیں جاسکتی...... قبل اس کے کہ میں کچھ کہتا یا مزاج پرسی کرتا ریسیور ہاتھ سے رکھدیکر تار منقطع کردیا گیا تھا ــــ اس کے بعد دوسرے روز مقررہ پر جب میں لیلیٰ کے گھر.... پہونچا تو خلاف معمول کسی قدر با تکلف پایا۔ حیرت ہوئی۔ طبیعت کا حال دریافت کیا۔ جواب بھی "غیر معمولی تھا"۔ میں نے کہا آج آپ کی طبیعت افسردہ معلوم ہوتی ہے۔ تفریح کو چلنا چاہئے .... چلئے موٹر حاضر ہے ــ لیلیٰ نے کسی قدر ترشروئی سے کہا... میں ایک صاحب کے انتظار میں ہوں۔ آج تفریح کو نہیں جاونگی مجبوری ہے ــ میرے قلب پر چوٹ سی لگی۔ زمانے کے انقلاب کا پوری طرح یقین ہوگیا۔ کل تک جو ہستی مجھ سے ہنس ہنس کر بات چیت کرتی تھی، آج غصے سے بھی پوری بات نہیں کرتی جو شخص اپنے آپ

کل تک ہفت اقلیم کے بادشاہ سے زیادہ خوش قسمت خیال کرتا تھا آج خود کو دنیا کا بدترین انسان سمجھ رہا ہے۔ موٹر میں سوار ہوا تو بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ دفعتاً اپنی پوزیشن اور شاہ راہ عام کا خیال آ گیا، جلدی آنکھیں صاف کر لیں۔ شوفر نے دریافت کیا "وکٹوریہ گارڈن" چلوں یا "طلسمی پل" میں نے سخت لہجہ میں کہا گھر چلو۔ موٹر چلنے لگا۔ بہ مشکل دو فرلانگ طے کئے گئے تھے کہ موٹر کی رفتار سست ہونے لگی۔ شوفر نے ندامت کے لہجہ میں کہا کہ۔ آج پٹرول ڈالنا بھول گیا، اب ضرورت ہے۔ میں نے کہا خرید لو۔ قریب کے پٹرول مشن سے پٹرول حاصل کرنے کے لئے شوفر نے موٹر روک لیا، چونکہ ایک اور موٹر پٹرول لے رہا تھا اس لئے ۱منٹ انتظار کرنا پڑا۔ میری پشت کی طرف سے ہارن کی آواز آئی دلدار کے گھر کے کنکر بھی پہچانے ہوئے ہوتے ہیں۔ پلٹ کر جو دیکھا تو موٹر قریب سے تیزی کے ساتھ نکل گئی۔ تاہم میں نے دیکھ لیا کہ لیلیٰ شہر کی مشہور اور کامیاب بیرسٹر احمد کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ دل کی جو حالت ہوئی اس کا ضبط تحریر میں آنا مشکل ہے۔ دل ڈوبنے لگا، قریب تھا کہ حرکت بند ہو جائے اپنی بربادی پر رونا آ رہا تھا۔۔۔۔ اور برباد کرنے والے پر غصہ۔ دل چاہتا تھا کہ موٹر کا تعاقب کروں مگر پھر حسن ظن غالب آتا تھا۔ ممکن ہے کہ کسی خاص قانونی مہم کے سر کرنے کے لئے دونوں کا ملنا ہوا ہو۔ گھر پہونچا۔ کہہ سکتا ہوں کہ شب میں سوتا رہا نہ جاگتا بلکہ ان دونوں حالتوں کی درمیانی کیفیت یعنے ایک غشی طاری رہی۔

صبح بستر سے اٹھا تو دوران سر تھا اور طبیعت انتہائی افسردہ تھی ہال میں ضروریات سے فارغ ہو کر اپنے پیشے کا کام کرنے بیٹھ گیا۔ گھنٹہ بھر کام کرنے کے بعد خیالات کی کثرت سے کام بند کر دینا پڑا۔ آدھ گھنٹے تک اپنی حالت پر غور کرتا رہا۔ میری نظروں میں پچھلے سارے پرکیف واقعات یکے بعد دیگرے پھر گئے حیرت تھی کہ کیا سے کیا ہو گیا اور پھر نہیں معلوم کیا سے کیا ہو جائیگا۔ خواہش ہوئی کہ لیلیٰ کی تصویر کو دیکھنا چاہیئے، اٹھا۔ "پرائیوٹ روم" میں آ کر تصویر سے پردہ ہٹا دیا۔۔۔۔ شوق اور حسرت بھری نظروں سے دیر تک دیکھتا رہا تصویر میں تو کسی قسم کا تغیر نہ ہوا تھا۔ وہی سپید پھول والی سیاہ ساڑی، وہی غرور حسن کی وجہ سے سیدھا کھڑا ہونا۔ وہی شکل کی انتہائی معصومیت اور بھولا پن جس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ ہستی دنیا کے کسی کام کے لئے پیدا نہیں کیگئی ہے۔ عالم دہر میں بھیجی گئی ہے تو صرف اس وجہ سے کہ دنیا کو عشق و محبت کی تعلیم اور پرستش حسن کی دعوت دے۔ یکایک خیال ایکروز قبل کے واقعے کی طرف گیا۔۔ قلب کی حرکت سست ہو گئی۔ دوران خون بند ہو گیا۔ نظروں کے آگے چنگاریاں اڑتی ہوئی نظر آئیں اور چکرا کر گر پڑا۔ جب ہوش آیا تو بڑے ہال میں پلنگ پر خود کو لیٹا ہوا پایا سر سے پٹی بندھی ہوئی تھی۔ جسم دہک رہا تھا، کوشش کی کہ اٹھ بیٹھوں مگر فوراً میرا مددگار آگے بڑھا ۔۔۔ ڈاکٹر نے کہا کہ آپ کو کامل طور پر آرام لینے کی ضرورت ہے کیونکہ خون زیادہ بہہ گیا ہے اور بخار پانچ ہے۔ اب کہیں مجھے سر سے بندھی ہوئی پٹی اور پیشانی میں ۔نت تکلیف ہونے کا سبب معلوم ہوا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ مددگار نے تھوڑی دیر بعد برانڈی کے کچھ قطرے لیمنیڈ میں شریک کر کے دئے حلق اور سینہ بار بار سوکھ رہا تھا اس لئے لیمنیڈ ملتے ہی پی گیا ذرا طبیعت ٹھکانے لگی ــــــ قاعدہ ہے کہ انسان مصیبت اور تکلیف میں دوست اور خیر خواہ کو ہی یاد کرتا ہے۔ اسی روز شام میں آہستہ اٹھا اور ٹیلیفون کے قریب گیا کہ لیلیٰ کو اپنی بیماری

کی اطلاع دوں ـــــ میری کیفیت سنکر لیلیٰ نے خشک لہجہ میں کہا۔ بہت افسوس ہے، خدا آپ کو جلد صحت دے ..... میں ایک ہفتہ کے لئے باہر جا رہی ہوں اور بہت جلدی میں ہوں، ورنہ مزاج پرسی کے لئے آتی۔ میں مبہوت رہگیا کچھ نہ کہہ سکا، رسیور دو تین منٹ ہاتھ کا ہاتھ میں رہا ایک ہفتہ گزرگیا مگر سخت تکلیف سے۔ ایک روز میں صبح اخبار دیکھ رہا تھا جب "لوکل کالم" پر نظر پڑی تو اخبار ہاتھ سے گر گیا اور میں کرسی سے ـــــ لکھا تھا:۔

"سنا گیا ہے کہ شہر کے کامیاب وکیل مسٹر احمد کی نسبت مس لیلیٰ صاحبہ سے قرار پائی ہے۔ دو ہفتے کے اندر اندر مراسم عقد بھی عمل میں آجائیں گے۔ ہم اس ہونے والے مناسب اور کامیاب جوڑے کو مبارکباد دیتے ہیں"۔

قریب تھا کہ میرا دل پھٹ جائے ـــ مگر افسوس میری قسمت میں تو کوئی اور ہی قسم کی موت لکھی ہوئی تھی ـــــ دل کو سنبھالا دل کی بے چینیوں کو اطمینان دلانے کی کوشش کی ـــ اس کے بعد کامل دو دن میں میں نے اپنی مصوری کی پوری قوت اور اپنے دل کا سارا درد خرچ کرکے ایک تصویر تیار کی ـــ نہ صرف یہ میری بہترین کھنچی ہوئی تصویر تھی بلکہ یہ میری مصوری کا آخری نمونہ بھی تھا۔ میں اس کے بعد کوئی تیار نہ کرسکا ـــــ تصویر ذیل کے منظر کو پیش کرتی تھی:۔

آسمان ابر آلود ہے۔ احمد بیرسٹر اور لیلیٰ ایک سرسبز باغ میں حوض کے کنارہ خوش خوش بیٹھے ہوئے تھے۔ فوارہ چل رہا تھا۔ آگے شراب سے بھری ہوئی صراحی رکھی ہوئی تھی۔ لیلیٰ جام بھر کے احمد کو دے رہی تھی ـــــ میں بسمل ان سے پانچ گز کے فاصلہ پر تڑپ رہا تھا گلے اور سینے سے خون کے فوارے جاری تھے۔ ایک بڑا سا خون کا دھبہ لیلیٰ کے دامن پر بھی دکھایا گیا تھا۔

یہ تصویر تیار کی اور ملازم کے ہاتھ غلاف میں رکھکر لیلیٰ کے پاس بھجدی۔ آہ میری خاموشی ہزار گویائی کے برابر تھی، تصویر وہ سب کچھ ظاہر کر رہی تھی جو میرے دل میں تھا اور شاید بالمشافہ زبان پر نہ آسکتا۔ مگر اس ظالم۔ بیوفا، بیدرد کو کیا کہئے ..... یہ کہکر واپس کردیا کہ "میں نے تو اس قسم کی تصویر کی کوئی فرمائش نہ کی تھی" ـــــ

آہ!! اس واقعہ کے ایک ہفتہ کے بعد وہ واقعہ ہوگا جس کا تصویر میں لیلیٰ کے دامن پر خوں کا دھبہ لگاکر اشارہ کیا گیا تھا اور جس کے ہوچکنے کے بعد ہی میرا یہ خط دنیا کے آگے پیش ہوگا۔

بدنصیب
ہمایوں مصوّر

ناظرین کل کے حیرت انگیز واقعات پڑھکر یقیناً انگشت بدنداں رہجائیں گے۔ مس لیلیٰ صاحبہ جن کے متعلق ایک ہفتہ سے قبل کی اشاعت میں لکھا گیا تھا کہ آپ کے کامیاب بیرسٹر مسٹر احمد کے ساتھ نسبت ہوگئی ہے اور عنقریب مراسم

شادی ادا ہو جائیں گے) کل شام حسب معمول "طلسمی پل" سے موٹر میں گزر رہی تھیں کہ ایک شخص کنارہ سے دوڑتا ہوا عین موٹر کی زد میں آگیا۔ قبل اس کے کہ ڈرائیور بریک کرے ٹکر ہوکر موٹر اس اجنبی کے سینے پر سے گزر گئی تھی ―― زخمی کو فوراً سیول ہاسپٹل لایا گیا جہاں وہ بمشکل گھنٹہ بھر زندہ رہا۔ سنا جاتا ہے کہ اس جوانمرگ کو چند آدمیوں نے مس لیلیٰ کی موٹر آنے کے ایک گھنٹہ قبل پل کے کنارے کسی کے انتظار میں ٹہلتا دیکھا تھا۔ جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ حسرت نصیب کوئی فاتر العقل نہ تھا ――

دنیا سمجھتی تھی کے سچے عاشق اب پیدا نہیں ہوتے مگر ناظرین کو یہ پڑھکر جس قدر بھی تعجب ہو کم ہے کہ مذکورۂ موٹر سے ٹکرا کر جان دینے والا شخص ہمارے شہر کا مشہور اور ذی عزت مصور "ہمایوں" تھا۔

بدنصیب ہمایوں نے یہ حرکت کیوں کی اس کا جواب خود انکا خط و بیگا جو ان کے مرنے کے بعد کوٹ کی جیب سے نکلا اور جس کو صفحہ ۶۳ پر شائع کر دیا گیا ہے۔ ناظرین اس کو فسانہ نہ سمجھیں ――

گزشتہ ماہ کا مضمون "فلسفہ مذہب"

اور

اس کے متعلق میری رائے

گزشتہ ماہ کے نگار میں "فلسفۂ مذہب" کا جو حصہ شائع ہوا ہے، اس سے مجھے اختلاف تھا، چنانچہ ملاحظات کے سلسلہ میں مختصراً میں نے اس کا ذکر بھی کر دیا تھا اور خیال تھا کہ جب یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا تو ایک محاکمہ اس پر کرونگا، لیکن بعض احباب کا تقاضا شدید ہوا کہ میں جلد سے جلد اپنی رائے شائع کر دوں مگر اتفاق سے یہ تقاضا اس زمانہ میں ہو رہا ہے جب میں علیل و صاحب فراش ہوں۔ اس لئے تعمیل ارشاد تو کرتا ہوں لیکن بسط و تفصیل کو کسی دوسرے وقت پر ملتوی کرتے ہوئے۔

جن حضرات نے شروع سے اس مضمون کا بہ غائر نگاہ مطالعہ کیا ہے۔ ان سے مخفی نہیں کہ سید مقبول احمد صاحب حد درجہ حریت فکر سے کام لیکر اپنے خیالات مذہب کے متعلق پیش کر رہے ہیں اور چونکہ اعتقادات بالکل انفرادی چیزیں ہیں اس لئے ایک شخص کو اختیار حاصل ہے کہ وہ جس تاویل کو اپنے حال کے مطابق پائے قبول کرے لیکن اعتقادات سے ہٹکر، عبادات و معاملات میں یہ اصول کارآمد نہیں۔

یعنی اگر مذہب نام ہو صرف توحید اور رسالت رسول کے اعتراف و یقین کا تو ایک شخص کو اختیار حاصل ہے کہ وہ خدا کو ایک ماننے اور رسول کو برحق سمجھنے کے لئے اپنے خیال کے مطابق جو چاہے تاویلیں کرے، لیکن اگر مذہب سے مقصود ہیئت اجتماعی کی تشکیل و تنظیم بھی ہے تو پھر عبادات و معاملات میں جو ہیئت اجتماعی کے شیرازہ بند ہیں تاویل و آزادی ممکن نہیں ورنہ اصل مقصود فوت ہو جائے گا۔

میری رائے میں سید مقبول احمد صاحب نے اس نکتہ کو نظر انداز کر دیا اور مذہب کو انھوں نے تمدن کے اصول سے نہیں دیکھا حالانکہ وہ اس کے مدعی ہیں۔

یہ حقیقت کسی صاحب فہم سے مخفی نہیں ہے کہ ایک رسول کا وجود اگر حقیقی معنے میں دنیا و اہل دنیا کے لئے باعث خیر و فلاح ہوا ہے تو صرف اس بنا پر کہ اس نے انسانوں کے منتشر افراد کو ایک رشتہ سے وابستہ کر دیا، ان میں ایک غرض مشترک پیدا کر دی۔ ان کے دماغ کے رجحانات ان کی ذہنیات اور ان کے امیال و عواطف میں یک رنگی پیدا کر کے اُن کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے آپ کو ایک ہی مقصد کا طالب سمجھیں، ایک ہی مدعا کے حصول میں تگ و دو کریں اور ایک ہی منزل

کا مسافر سمجھکر باہم ایک دوسرے کے مدد کریں جو نظام تمدن کی اصل روح ہے۔

اگر معاشرت و معیشت یا اصول زندگی کی یکرنگی کو علٰحدہ کر دیا جائے تو ایک قوم کا وجود قومی بالکل معدوم ہو جاتا ہے اور پھر کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہتی جو مختلف افراد کو ایک دوسرے سے وابستہ کر سکے، صرف مذہبی معتقدات کا خیال بظاہر صورت کوئی ایسا منظر پیش نہیں کر سکتا جس کا اثر دوسروں پر یا خود اپنی ہی جماعت کے افراد پر ایسا پڑے کہ تنظیم و تشکیل کا احساس ہو سکے۔ خود یورپ کو دیکھئے کہ معتقدات مذہبی کے لحاظ سے وہ منکر محض ہیں لیکن چونکہ اصول زندگی میں ان کے اتحاد تام ہے اس لئے ان کا ایک ایک فرد اپنے اندر پوری اجتماعی شان رکھتا ہے اور دوسروں پر اس کا خاص اثر ہوتا ہے۔

الغرض بانی اسلام نے جو خاص اصول عبادات کے اور مخصوص قواعد معاملات کے مقرر کر دئے تھے ان سے بھی مقصود یہی تھا کہ مسلمانوں میں یکرنگی و یک جہتی پیدا ہو جائے اور اس طرح ان میں قومی تعاون کی روح پیدا ہو جائے۔ اس لئے اگر آج ہم ان کو توڑ دیں گے تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ ہم قومیت کو صدمہ پہونچانے والے ہیں اور اپنی جماعت میں شکست و انتشار پیدا کرنے والے کہلائیں گے۔ اگر یہ کہا جائے کہ اب سے تیرہ سو سال قبل کے مقرر کردہ اصول زمانۂ حال کے لئے موزوں نہیں ہو سکتے، اور ان میں تغیر و تبدل ضروری ہے، تو اس کا نفاذ بعض بعض معاملات میں ممکن ہو سکتا ہے لیکن عبادات میں ممکن نہیں ہے کیونکہ اس سے رسول کی شانِ رسالت کو صدمہ پہونچتا ہے اور یہ ماننا ضروری ہو جاتا ہے کہ خود رسول نے قرآن کو اچھی طرح نہ سمجھا تھا۔

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قرآن سے بقول سید مقبول احمد صاحب نماز صرف تین وقت کی بلا تعیین ارکان و تعدیل ثابت ہوتی ہے یا یہ کہ وضو میں بھی کوئی خاص ترتیب مذکور نہیں ہے تو پھر یہ امر غور طلب ہوگا کہ رسول اللہ نے اپنی زندگی میں خود کیا کیا اور لوگوں کو کیا ہدایت کی اور قرآن کے اس مجمل حکم کی شرح خود انھوں نے کس طرح بیان کی اور اپنے عمل سے دکھائی۔

یہ تو غالباً سید مقبول احمد صاحب بھی مانتے ہوں گے کہ کلام مجید کا بہتر سمجھنے والا رسول اللہ سے زیادہ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا اس لئے ظاہر ہے کہ اس باب میں جو کچھ رسول اللہ کا ارشاد و عمل ہے وہ صحیح ہوگا اور وہی مقصود خداوندی ہوگا۔ پھر اگر رسول اللہ نے وضو میں کسی خاص ترتیب کو ملحوظ رکھا یا نماز میں تعدیل ارکان و تعیین اوقات پنجگانہ کی تاکید فرمائی تو کوئی وجہ نہیں کہ آج ہم اس کو مٹا دیں اور غیر ضروری سمجھیں، علی الخصوص اس وقت جبکہ ان پابندیوں میں کوئی حرج نہیں ہے صرف تین اور پانچ کے جھگڑے میں اتنے دیرینہ اصول کو جو نسلاً بعد نسلٍ سیکڑوں برس سے منتقل ہوتا چلا آیا ہے ترک کر دینا کس قدر لایعنی بات ہے علاوہ اس کے یوں بھی دیکھئے کہ ہر کام میں ترتیب و تسدیل ہی ایک خاص چیز ہے جو اجتماعی شان پیدا کرتی ہے، اگر ہم اس کو ترک کر دیں گے تو کوئی نتیجہ مرتب نہ ہوگا اور ہمارے مذہبی اعمال میں اس قدر اختلاف ہو جائیگا کہ دوسرا دیکھ کر فوراً حکم لگا دیگا کہ یہ سب ایک دوسرے سے جدا ہیں اور ایک مذہب یا مسلک کے پابند نہیں ہیں۔

فرض کیجئے مسجد میں دس آدمی بیٹھے ہوئے وضو کر رہے ہیں یا نماز پڑھ رہے ہیں تو لطف و کیفیت اس میں ہے کہ سب ایک ہی طرح

یکسانیت دیکھرنگی کے ساتھ ارکان کو ادا کر رہے ہیں، یا اس میں کہ کسی نے پہلے منہ دہویا، تو کسی نے پانوں کے مسح سے ابتدا کی کسی نے کلی سے آغاز کیا تو کسی نے کہنیوں کو پہلے دہونا پسند کیا - اس طرح نماز کی یہ حالت قابل التفات ہے کہ سب ایک ساتھ یکرنگی کے رکوع وسجود کر رہے ہیں یا یہ کہ کوئی کھڑا ہوا صرف ہات اٹھائے ہوئے ہے۔ دوسرا بیٹھا ہوا کچھ پڑھ رہا ہے، تیسرا سجدہ میں گرا ہوا۔ کسی کا منہ قبلہ کی طرف ہے کوئی قطب کی طرف رخ کئے ہوئے ہے اور کوئی جنوب کو دیکھ رہا ہے۔

اگر ترتیب و تعدیل کو حذف کر دیں تو عبادات میں کوئی صورت ہم آہنگی کے رہتی ہی نہیں اور اسلام کا یہ فخر کہ اس نے عبادات کے سلسلہ میں وہ درس دیا ہے جو دوسرے مذاہب کے معاملات میں بھی نہیں پایا جاتا اُس سے چھن جائیگا۔

اسی طرح زکوٰۃ کے متعلق سید مقبول احمد صاحب کا یہ کہنا کہ جس قدر ہوسکے ادا کیا جائے بالکل خلاف اصول ہے۔ زکوٰۃ کا مسئلہ قومی تنظیم کا نہایت اہم مسئلہ ہے اور اس کے لئے جب تک کسی نصاب یا رقم کے تعیین نہ ہو کوئی ضابطہ مقرر نہیں ہوسکتا ہے روزہ، قربانی، عیدین، اور ان سے اتر کر ختنہ، عقیقہ، وغیرہ کے مسائل ہیں کہ ان سب سے مقصود وہی تنظیم حیات ہے اور جبتک ان میں ضابطہ ویکسانیت نہ پیدا کی جائے کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ اس لئے میری رائے میں سید مقبول احمد صاحب کا ان مسایل سے بحث کرنا اور ان میں اتنی آزادی اختیار کرنا کہ جس کا جو جی چاہے کرے حد درجہ مضر ہے

بعض استدلالات تو انھوں نے مضحک حد تک پہونچا دئے ہیں مثلاً یہ کہ پانوں دہونے سے بعض اوقات اور بعض قوم کے لوگوں کو زکام ہوجاتا ہے اس لئے وضو میں پانوں دہونا ضروری نہیں، مسح کر لینا چاہئے، اول تو اصول طب کے لحاظ سے پانوں کا دہونا خود زکام کا دور کرنے والا ہے لیکن اگر کوئی شخص ایسا ہو تو بیشک مذہب بھی اُسے مجبور نہیں کرتا۔ لیکن اس کے یہ معنے تو نہیں ہیں کہ پانوں دہونے کو ارکان وضو ہی سے خارج کر دیا جائے۔ پانوں کا دہونا اصولاً جس طرح ان لوگوں کے لئے ضروری ہے جو ننگے پانوں پھرتے ہیں اور جن کے پانوں میلے ہوتے ہیں۔ اسی طرح بلکہ ان سے زیادہ ان لوگوں کے لئے ہے جو ہر وقت موزہ اور بوٹ سے جکڑے رہتے ہیں، کیونکہ پانوں میں گندگی صرف باہر ہی کی خاک سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ خود اس کے اندر سے پیدا ہوتی ہے اور وہ لوگ جو ہر وقت جوتا اور موزہ پہنے رہتے ہیں، اُن کے پانوں بہت زیادہ گندے رہتے ہیں اور ان کو پانوں کا دہونا بہت زیادہ ضروری اور طبّاً لازم ہے۔

مضرت کے اندیشہ کی صورت میں شرع نے خود اس کو غیر ضروری قرار دیدیا ہے یہاں تک کہ صرف موزہ اور جوتہ کے اوپر مسح کر لینا کافی خیال کیا جاتا ہے۔

نماز کے تعین اوقات کے سلسلہ میں کسی جگہ سید مقبول احمد صاحب نے شاید یہ بھی لکھا ہے کہ عصر و مغرب کی نماز ایک یوروپین سے ادا ہونی مشکل ہے کیونکہ یہ اس کی تفریح اور ٹینس وغیرہ کا وقت ہے۔ اس کے جواب میں سوائے اسکے کہ سپر ڈالدوں اور کیا عرض کر سکتا ہوں۔ عبادات پر تفریح کے مشاغل کو ترجیح دینا میں نہیں سمجھ سکتا کہ کیا ذہنیت ہے اسی طرح دوپہر کی نماز کے لئے کاروبار کی مصروفیت کا عذر کہ یہ بھی کسی طرح میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اہل یوروپ

اس میں شک نہیں کہ سخت کاروباری آدمی ہیں اور بے انتہا مصروف ہیں، اسی کے ساتھ کوئی سچا مذہب کبھی ایسی تعلیم نہیں دے سکتا جو کاروبار میں حرج ڈالنے والی ہو، لیکن کیا اس سے انکار ہو سکتا ہے کہ وہی یورپ والے جن کی رعایت میں سید مقبول احمد صاحب نماز کے اوقات و ارکان کو بدل دینا چاہتے ہیں، اپنی زندگی کے بدترین مشاغل کے لئے کتنا وقت نکال لیتے ہیں۔ پانچ وقت کی نمازوں کے لئے زیادہ سے زیادہ مع وضو وغیرہ کے گھنٹہ سوا گھنٹہ درکار ہوتا ہے، پھر ۲۴ گھنٹے کے اندر اتنا وقت عبادت کے لئے نکال لینا مشکل نہیں ہے جبکہ ہر یورپ کا باشندہ معصیت کے لئے کم از کم آٹھ گھنٹے روزانہ آسانی سے نکال سکتا ہے۔

علاوہ اس کے اگر آپ آسانی کے خیال کو اس قدر وسیع اور استدلال کے وزن کو اتنا ہلکا کریں گے تو پھر یورپ کیا معنی ہندوستان کے بھی کسی شخص پر نماز فرض نہیں رہتی کوئی آپ کے پاس آکر کہیگا کہ حضرت مجھے صبح اُٹھنے میں بہت کسل ہوتا ہے، آپ کہدیں گے کوئی حرج نہیں، صبح کی نماز ترک کر دو، دوسرا کہیگا کہ جناب دوپہر کو لیٹنا میرے لئے ضروری ہے اور جب میں لیٹ جاتا ہوں تو پھر چار بجے سے پہلے اٹھتا نہیں کیونکہ اگر ایسا نہ کروں تو تکلیف ہو جاتی ہے، آپ جواب دیں گے، کچھ پرواہ نہیں، ظہر کی نماز قضا کر دیا کرو۔ اسی طرح عصر و مغرب و عشا کے لئے بھی کسی نہ کسی کو کوئی بہانہ ہاتھ آجائے گا اور آپ ہر وقت کی نماز کو غائب کرتے جائیں گے تو یہ مذہب کیا ہوا بالکل تماشہ اور بچوں کا کھیل ہو گیا۔ کہ جو جس کے جی میں آئے اختیار کرے اور جو چاہے ترک کر دے۔

میں کہتا ہوں کہ جن تین اوقات میں نماز کا ثبوت آپ کو کلام مجید سے ملتا ہے کیا ان میں لوگوں کو کام نہیں ہوتا کیا ان اوقات میں کوئی سبب حاجج پیدا نہیں ہو سکتا۔ بہر حال اس نوع کے مباحث میرے نزدیک بالکل غیر مناسب ہیں البتہ خالص اعتقادات کے باب میں وہ اپنے نفس کے اطمینان کے لئے تاویلیں کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اس سے ہئیت اجتماعی کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا۔

پل صراط، دوزخ جنت، حشر و نشر، معراج اور اسی طرح کے اور بہت سے ان مسائل کے متعلق جن کو عبادات و معاملات سے کوئی واسطہ نہیں ہے کلام مجید پر غور کر کے کوئی ایسی صورت اختیار کر سکتے ہیں جو ان کے لئے مفید یقین ہو اور میں خود بھی اس پر عامل ہوں لیکن اُن مسایل میں جن سے اسوۂ نبوی متعلق ہے میں کسی انحراف کو سخت گمراہی خیال کرتا ہوں، وہ مسائل شرعی جن کا تعلق تمدن و معاشرت سے ہے ان میں البتہ زمانہ و وقت کے لحاظ سے تبدیلیاں ہو سکتی ہیں کیونکہ قانون کا ضروریات کے لحاظ سے بدل جانا ضروری ہے اور جس کی اجازت خود رسول اللہ نے دی ہے کہ "رعایت اصلح فی الشرع" کا ہمیشہ خیال رکھو لیکن وہ اعمال دینی جن سے مسلمانوں کے اجتماعی حالت وابستہ ہے ان میں کوئی تغیر نہیں ہو سکتا

اب اخیر میں مختصر سی عرض ان لوگوں سے بھی ہے، جو ان کے اس مضمون سے برہم ہیں اور وہ یہ کہ سید مقبول احمد صاحب جو کچھ لکھ رہے ہیں خلوص و نیک نیتی سے لکھ رہے ہیں، رسول کی پوری عظمت و عزت ان کے دل میں ہے اور وہ مدعی ہیں کہ اسلام سے بہتر مذہب دنیا میں کوئی نہیں ہو سکتا، اس لئے اگر ایسا شخص کسی بحث کے سلسلہ میں بعض باتیں ایسی بھی کہہ جائے جو نامناسب ہیں تو اُن کو سن کر گالیاں دینا کافر کہدینا، نہایت ہی نامناسب حرکت ہے۔ اگر آپ کے نزدیک وہ غلطی پر ہیں

تو ان کو متنبہ کیجئے، سمجھائیے، جواب دیجئے، نہ یہ کہ ایک مجبور حریف کی طرح صرف سب و شتم پر اکتفا کیجئے۔

گزشتہ مہینے میں جس وقت انکا مضمون لکھ چکا تو مجھے خیال ہوا کہ بعض حضرات اس سے برہم ہوں گے اور ہوئے لیکن اتنا وقت نہ نکال سکا کہ اپنے اختلاف کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کر سکتا، اور ملاحظات میں صرف اس قدر اشارہ کر دیا کہ:-

"سید مقبول احمد صاحب کے بعض خیالات سے مجھے اختلاف ہے"

میں ابھی اور انتظار کرتا، اگر بعض احباب کا اصرار شدید نہ ہوتا۔ افسوس ہے کہ اپنی علالت کی وجہ سے میں زیادہ وضاحت سے کام نہ لے سکا اور نہ پوری تنقید ان کے مضمون پر کر سکا، انشاء اللہ اس سلسلہ کے ختم ہونے پر اک نگاہ اس پر ڈالوں گا اور بتاؤں گا کہ میرے نزدیک سید صاحب سے کہاں کہاں کیا کیا لغزشیں ہوئی ہیں۔

نیاز فتحپوری

مراثی انیس کے حیدرآبادی اڈیشن کے حیدرآبادی نہ ہونے پر اصرار

گزشتہ ماہ کے رسالہ میں جناب احسن لکھنوی کا مضمون جو "مراثی انیس کے حیدرآبادی اڈیشن" کے عنوان سے شائع ہوا ہے اُس کو دیکھکر جناب سید محمد قادری بی اے حیدرآبادی نے ایک مکتوب ہمارے پاس بھیجا ہے جو ذیل میں درج ہے :-

محترمی - تسلیم

اس سے قبل ایک خط آپ کو لکھ چکا ہوں - اس کے جواب کا منتظر ہی تھا کہ کل نگار نظر افروز ہوا - رات کھانا کھانے کے بعد مطالعہ کرنے لگا تو "مراثی انیس کا حیدرآبادی اڈیشن" والے مضمون پر سب سے پہلے نظر پڑی - فاضل مضمون نگار مولانا احسن مارہروی صاحب نے واقعی نہایت کارآمد چیز کی طرف توجہ دلائی ہے - انیس جیسے شاعر کے ساتھ ہماری یہ بے پروائی یقیناً قابل ملامت ہے - اس سلسلہ میں مولانا سے ایک خفیف سی فروگزاشت ہوگئی ہے جو اندیشہ ہے کہ بڑی غلط فہمی پیدا کرانے کی موجب ہوگی - نظامی پریس بدایوں کا ظاہراً خوشنما نسخہ کسی طرح "حیدرآبادی اڈیشن" نہیں ہوسکتا - دارالمصنفین کی طرح نظامی پریس نے خواہ مخواہ سرکار عالی نظام خلد اللہ ملکہ کی مالی اعانت اور سرپرستی حاصل کرنے کے لئے اپنے سلسلۂ مطبوعات کو "سلسلۂ آصفیہ" کے نام سے موسوم کردیا ہے۔ اس اڈیشن سے حیدرآباد کا صرف یہ تعلق ہے کہ ہماری فیاض سرکار نے اردو کی دیگر تحریکات اور متعدد تالیفات کی طرح اس کی بھی معقول مالی امداد فرمائی ہے اتنا تعلق اس کو "حیدرآبادی اڈیشن" بنانے کے لئے کسی طرح کافی نہیں میرے سامنے اس وقت مراثی انیس جلد دوم موجود ہے - نظامی صاحب اپنی تمہید کے صفحہ "ب" پر واضح طور پر لکھتے ہیں "میر صاحب کے ان جواہر پاروں کو اس خوبصورتی اور اہتمام کے ساتھ اردو داں پبلک کے سامنے پیش کرنے کی ہمت افزائی اور سرپرستی اعلیٰ حضرت بندگان عالی حضور نظام ..... کی سرکار کی طرف سے ہوئی ہے"

اس اڈیشن کی بظاہر خوشنمائی سے قطع نظر معنوی حالت جو کچھ ہے وہ آپ سے پوشیدہ نہیں - میں اس پر کچھ عرض کرنا نہیں چاہتا - میر انیس مرحوم اور انکی اولاد اکثر حیدرآباد آتی رہی - اُن کے مراثی یہاں بھی بعض احباب کے پاس محفوظ ہیں - اگر مولانا احسن صاحب اس کام کو عام طور پر اعلانِ ارادہ کرکے شروع فرمائیں تو اُمید ہے کہ ضرور حیدرآبادی اصحاب انکی مدد کریں گے - بہرحال یہ اڈیشن کسی طرح حیدرآبادی اڈیشن نہیں کہلا سکتا - اگر آپ مبالغہ نہ خیال فرمائیں تو میں سمجھتا ہوں کہ اس سے حیدرآباد کی علمی نیک نامی پر مضر اثر پڑے گا - آپ کی

عنایات سے توقع ہے کہ اس بارہ میں "ملاحظات" کے تحت نوٹ دیکر اس غلط فہمی کا ازالہ فرمادیں گے۔

سید محمد قادری بی، اے

صاحب موصوف کی فرمایش ہے کہ میں ملاحظات کے تحت نوٹ دیکر اس غلط فہمی کا ازالہ کردوں۔ لیکن چونکہ ملاحظات میں اتنی گنجائش نہیں نکل سکتی تھی اس لئے اس مکتوب کو علیحدہ درج کرکے، غلط فہمی کا ازالہ تو نہیں البتہ اس امر کی توثیق کرنا چاہتا ہوں کہ اس نسخہ کو حیدرآبادی اڈیشن کے سوا کچھ اور کہہ ہی نہیں سکتے۔

آپ نے اول تو یہ بالکل غلط سمجھا کہ اس مضمون کے لکھنے والے احسن مارہروی ہیں۔ مضمون کے اخیر میں احسن لکھنوی کے الفاظ نہایت صاف صاف درج ہیں، علاوہ اس کے تمہید ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مضمون کا لکھنے والا وہی ہے جس نے "واقعات انیس" لکھے اور یہ دنیا کو معلوم ہے کہ "واقعات انیس" مارہرہ کی پیداوار نہیں بلکہ لکھنؤ کی چیز ہے۔ علاوہ اس کے یوں بھی سمجھنا چاہئے تھا کہ مراثی انیس پر ناقدانہ یا مصححانہ نگاہ ڈالنا مارہرہ، فتحپور یا حیدرآباد کے کسی فرزند کا کام نہیں بلکہ اس کو وہی شخص کرسکتا ہے جو لکھنؤ کی عہد انیس کی زبان و معاشرت سے واقف ہو اور یہ فخر لکھنؤ میں بھی اب صرف چند نفوس کو حاصل ہے جناب "نظامی عفی عنہ" نے اپنے مقدمہ یا تمہید میں جو مراثی انیس جلد اول کے اول میں شامل ہے نہایت کھلے الفاظ میں تحریر فرمایا ہے کہ:۔

> اساتذہ اردو میں میر ببر علی صاحب انیس کے کلام کا پڑھنا سمجھنا پرکھنا اس سے زبان و طرز بیان کا سیکھنا اُن کا تتبع کرنا ان کے نقش قدم پر چلنا ہر شاعر و ادیب جو واقعہ نگار ہو سرمایۂ افتخار سمجھتا ہے فارسی ترکیبوں میں اُن کے تصرفات ایک اوستاد زمانہ ہونے کی حیثیت سے اردو میں قابل اسناد ہیں اس اہمیت کو مد نظر رکھ کر جناب سید راس مسعود صاحب بی اے (آکسن) ناظم تعلیمات دولت آصفیہ نے اپنی اسکیم کی دوسری قسط کے طور پر اس کے شائع کرنے کی ضرورت محسوس فرمائی اور اعلیحضرت قدر قدرت ہزاگزالٹڈ ہائی نس آصف جاہ جہاں پناہ ظل اللہ سپہ سالار مظفر الملک نظام الملک محی الملتہ والدین نواب سر میر عثمان علی خاں بہادر نظام الدولہ فتح جنگ بالقابہ سلطان دکن خلد اللہ ملکہ کے شاہانہ عطیہ سے جو مستند شعرائے اردو کے کلام کی اشاعت کے لئے سید صاحب موصوف کی درخواست پر مرحمت ہوا تھا مراثی انیس کی پہلی جلد شائع ہونے کی نوبت آئی اس جلد میں میر صاحب کی آخر عمر کا کلام ہے اور اس میں بعض وہ مراثی ہیں جو اب تک طبع نہیں ہوئے درحقیقت یہ جلد میر صاحب کے اُس کلام کا مجموعہ ہے جس کی نسبت اُنھوں نے خود فرمایا ہے ؎
>
> گھٹا زور مشق سخن بڑھ گئی ضعیفی نے ہم کو جوان کردیا

سید علی حیدر صاحب نظم طباطبائی المخاطب بہ نواب حیدر یار جنگ نے اس جلد کی ترتیب و تصحیح کی خدمت کو انجام دے کر ملک پر بالعموم اور اردو دان پبلک پر بالخصوص احسان فرمایا ہے۔ آغا سید حسن صاحب بی اے صدر مہتمم تعلیمات بلدہ (حیدرآباد) بھی شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے میر صاحب کا اصلی فوٹو عنایت فرمایا جس کے بغیر یقیناً یہ مجموعہ نامکمل رہتا۔

اُمید تھی کہ اس جلد کے قابل مرتب مولانا طباطبائی صاحب اس کا مقدمہ لکھ کر اپنے کامل الفن ہونے کی حیثیت سے فن مرثیہ گوئی اور شاعری کے متعلق مفید معلومات کا ذخیرہ جمع کر دیں گے جس سے ناظرین کو میر انیس اور ان کی شاعری کے متعلق صحیح رائے قائم کرنے میں مدد ملیگی لیکن ہماری بدقسمتی سے مولانائے موصوف اپنی پیرانہ سالی اور مصروفیت کی وجہ سے ہماری خواہش کو پورا نہ کر سکے انھوں نے اپنے ایک نوازشنامہ کے چند فقروں میں اس جلد کی خصوصیات کا جو ذکر فرمایا ہے اس موقع پر اس کا نقل کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا وہ لکھتے ہیں۔

اس جلد میں میر صاحب مرحوم و مغفور کے یا تو وہ مرثیے ہیں جن میں مصنف نے خود صراحتاً یا اشارتاً یہ بات ظاہر کر دی ہے کہ اُن کی آخری عمر کا کلام ہے یا وہ مرثیے ہیں جو آخر عمر میں نواب ابو صاحب کی مجلسوں میں جناب مرحوم نے پڑھے اور یہی مرثیے مرحوم کے بستے میں تھے۔ جس دن جناب مرحوم نے منبر و مجلس کو الوداع کہی تینوں صاحبزادے سامنے حاضر تھے چھوٹے فرزند میر محمد صاحب سلیس کو اشارے سے پاس بلایا بستہ اپنے ہاتھ سے اُٹھا کر ان کے ہاتھ میں دیدیا سلیس مرحوم مٹیابرج وحیدرآباد کی مجلسوں میں زندگی بھر یہی مرثیے پڑھا کئے۔ یہ مرثیے منشی نولکشور کو نہ ہاتھ آسکے کہ ان کی مرتب کی ہوئی جلدوں میں شامل ہو جاتے اس کے علاوہ دو یا تین مرثیے ایسے بھی ہیں جن کا حال مجھے اپنے بزرگوں سے معلوم ہوا کہ یہ جناب مرحوم کے انتہائے مشق کا کلام ہے لوگوں کی خاطر سے مرحوم کو یہ مرثیے بستے سے جدا کرنے پڑے۔"

مولانا طباطبائی کی طرف سے دیباچہ یا مقدمہ لکھنے کے متعلق جب مایوسی ہوگئی تو میں نے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی — سو ہو ہذا۔

اس "ہو ہذا" کے بعد جو کچھ خامہ فرسائی کی گئی ہے اس سے ہمیں بحث نہیں کیونکہ اس کا تعلق صرف جناب "نظامی عفی عنہ" کے زور قلم و اجتہاد فکر سے ہے واقعات سے نہیں۔

کیا اس تحریر کے بعد کوئی شخص انکار کر سکتا ہے کہ مراثی انیس کا یہ اڈیشن، حیدرآبادی اڈیشن نہیں ہے۔ ریاست نظام کا ایک ایسا شخص جس کے ہاتھ میں وہاں کے علم و ادب کا نظم و نسق ہے، مراثی انیس کی اشاعت کے لئے ایک

ایک شاہانہ عطیہ کی سفارش کرتا ہے، اعلیحضرت جو فطرتاً علم دوست واقع ہوئے ہیں اس کی ضرورت کو محسوس کرکے اس سفارش کو منظور فرماتے ہیں اور متوسلین حیدرآباد میں سے نظم طباطبائی ایسا شخص جو لکھنؤ کے نہ صرف مخصوص فضلاء و ماہرین ادب میں شمار کیا جاتا ہے۔ بلکہ عہد انیس کے واقعات، حالات، زبان، محاورات اور معاشرت و تمدن سے پوری طرح واقف ہے اس کی ترتیب و تصحیح کی خدمت کو انجام دیتا ہے، اور پھر بھی اس پر اصرار ہے کہ اس نسخہ کو حیدرآبادی اڈیشن نہ کہا جائے کیونکہ وہ اغلاط سے لبریز ہے اور اس حقیقت کا اظہار حیدرآباد کی علمی نیک نامی کے لئے مضر ثابت ہوگا۔

کیا ایسی کتاب جس میں روپیہ، سفارش، تصحیح و ترتیب سب حیدرآباد کی ہو اس کو صرف اس بنا پر کہ وہ بدایوں میں طبع ہوئی ہے، حیدرآبادی ہونے سے خارج کر دیتا ہے، میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس سے زیادہ حیدرآبادی اڈیشن ہونے کے لئے اور کیا اسباب ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ کتاب حیدرآباد ہی میں شائع ہوتی تو بھی بہرحال مسعود یار جنگ اور مولانا طباطبائی ہی اس کے مہتمم و مصحح و مرتب ہوتے اور وہی اب بھی ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ محض بدایوں میں چھپنے کی وجہ سے کیوں اس کو حیدرآباد سے "خارج البلد" کیا جاتا ہے۔

میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ اس کتاب سے اعلیحضرت حضور نظام کی علم پروری یا حیدرآباد کی علمی خدمتوں پر مضر اثر پڑ سکتا ہے کیونکہ یہ دونوں باتیں تو اب حقایق مسلمہ میں داخل ہیں اور ان سے کسی کو انکار ہی نہیں ہو سکتا، لیکن یہ یقینی ہے کہ اعلیحضرت حضور نظام کے اس شاہانہ عطیہ کا مصرف بالکل غلط ہوا اور وہ مقصود پورا نہ ہو سکا، جس کو سامنے رکھ کر سفارش کی گئی تھی، اور جس پر اعتماد کرکے اعلیحضرت نے امداد منظور فرمائی تھی۔

میں بہت مسرور ہوا کہ آپ نے یہ خط بھیجکر مجھے موقعہ دیا کہ اس مسئلہ پر اصولی گفتگو کروں کیونکہ میرے نزدیک اس وقت تک حیدرآباد کا مراثیٔ انیس کی طرف سے غافل رہنا ایک ایسی فروگزاشت ہے جس کی طرف جلد سے جلد توجہ کرنے کی ضرورت ہے، میں نے حیدرآباد کی تخصیص اس لئے کی کہ اس وقت وہی مرکز ہمارے علوم و فنون کا ہے اور وہیں کی شاہانہ فیاضیاں ہمارے ضایعات کی تلافی کر سکتی ہیں۔

اگر آپ اور دیگر حیدرآبادی حضرات کچھ مدد کر سکتے ہوں تو کیجئے۔ میں شوق سے مستقلاً یہ سلسلہ قایم کرنے کے لئے طیار ہوں اور جناب احسن لکھنوی کو بھی آمادہ کرونگا کہ وہ اپنے خاندان کے تمام محفوظ بستوں کو نکال کر جس قدر کلام انیس شایع ہو چکا ہے اس کے ایک ایک نقطہ پر نگاہ ڈال کر صحت کی طرف متوجہ ہوں۔

نظامی پریس کی دوسری جلد مراثیٔ انیس کی ابھی تک میری نظر سے نہیں گزری۔ لیکن اگر یہ سلسلہ قائم ہو گیا تو پھر اس کا دیکھنا بھی ناگزیر ہوگا۔ بہرحال آپ کی طرف سے جو امداد اس باب میں ہو سکتی ہے اس سے مطلع فرمایئے تاکہ میں تمام آسانیوں اور دشواریوں پر نگاہ کرکے اس سلسلہ کو شروع کر دوں۔

نیاز فتحپوری۔

باب الاستفسار

(بعض سیاسی مسائل)

(جناب غلام علی خاں صاحب اٹک)

رسالہ نگار برابر دیکھتا رہتا ہوں اور دل ہی دل میں آپ کی محنت کی داد دیدیا کرتا ہوں۔ اگر ناگوار نہ ہو تو ایک رائے پیش کروں اور وہ یہ ہے کہ نگار میں کوئی حصہ سیاسیات کا نہیں ہوتا چونکہ مجھے اس سے بہت دلچسپی ہے اس لئے بہت جی چاہتا ہے کہ مختلف مسائل میں آپ کی رائے بھی معلوم کرتا ہوں کیا یہ ممکن نہیں کہ ہر مہینے اس میں چند صفحات اس کے لئے الگ کر دئے جائیں اور ان میں سیاسی مضامین درج ہوتے رہیں۔ بہرحال اس وقت میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ مہاتما گاندھی کو آپ کیسا سمجھتے ہیں، مسایل عدم تعاون، ستیاگرہ، کھدر پوشی اور مجالس خلافت، تبلیغ، مسلم لیگ اور کانگرس کے متعلق جناب کی کیا رائے ہے۔ مدعا یہ ہے کہ میں آپ کے سیاسی معتقدات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔

(نگار) ایک زمانہ سے یہ مسئلہ میرے سامنے ہے کہ نگار میں کم از کم دس صفحے سیاسی شذرات کے لئے مخصوص ہوں، لیکن ظاہر ہے کہ یہ حصہ بھی استفسارات، معلومات، ملاحظات وغیرہ کی طرح مستقلاً مجھی کو پورا کرنا پڑے گا، اس لئے اس ذمہ داری کو لیتے ہوئے گھبراتا ہوں، اس لئے نہیں کہ محنت سے جی چراتا ہوں، بلکہ محض اس بنا پر کہ وقت کہاں سے لاؤں آپ یقین کیجئے کہ اخبارات ورسایل پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے کی بھی فرصت مجھے حاصل نہیں ہے، بہرحال یہ امر یقینی ہے کہ کبھی نہ کبھی کوئی اہل شخص میرے مشاغل کا بار سنبھالنے کے لئے مل ہی جائے گا اور میں آپ کے اس نہایت مفید وضروری مشورہ پر عمل کرسکوں گا۔

مہاتما گاندھی کو میں اس زمانہ کا سب سے بڑا انسان سمجھتا ہوں یہاں تک کہ کوئی شخص کوشش وسعی کے باوجود بھی ان کے مرتبہ کو نہیں پہونچ سکتا۔ ان کی سیاسی تعلیم اس قدر زبردست ہے کہ اگر کوئی جماعت اس پر عمل کرسکے تو اپنے اندر ایک ایسی بے نیازانہ قوت پیدا کرسکتی ہے کہ اس کے سامنے سارے عالم کی مادی قوت سر ڈالنے پر مجبور ہو جائے لیکن اسی کے ساتھ میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ مہاتما گاندھی کی تقلید آسان کام نہیں اور ایک ملک صد درجہ سیاسی ابتلا سے گزرنے کے بعد ہی اس میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ مہاتما جی جس چیز کو اس وقت پیش کر رہے ہیں وہ غالباً پچاس برس کے بعد قابل عمل ہوگی اور ہر چند اس وقت وہ تو موجود نہ ہوں گے، لیکن ان کی تعلیمات زندہ ہونگی اور ملک انھیں پر کاربند ہوکر

منزل مقصود تک پہونچ سکیگا۔ عدم تعاون اور ستیاگرہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ایک دوسرے کو مستلزم ہے اور یہی اصل روح گاندھی جی کی تعلیم کی ہے۔ کھدر کے استعمال کی برکتیں ہر شخص پر روشن ہیں اور اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، لیکن میں نے جہاں تک غور کیا ہے اس سلسلہ میں "دوچار بہت سخت مقام آتے ہیں" چونکہ ہم لوگ نہایت سطحی تعلیم و تربیت رکھنے والے ہیں اس لئے بعض اوقات بعض نفوس بالکل غلط اثر قبول کرتے ہیں۔ کھدر کے استعمال کا جو اقتصادی فائدہ ہے وہ تو خیر ظاہر ہی ہے لیکن اس میں ایک نوع کی روحانی تعلیم بھی مضمر ہے اور وہ یہ کہ انسان اپنے آپ کو غریبوں کی سطح پر لے آئے اور انکے ساتھ ہمدردی کرے لیکن اس پہلو پر بہت کم لوگوں نے نگاہ کی اور کھدر پوشی حقیقتاً ایک ذریعہ اور عجب و غرور کا بن گیا۔ میرے سامنے ایسی مثالیں ہیں کہ بعض نوجوان اس کا استعمال صرف اس لئے کرتے ہیں کہ اس کی سفید ملاحت اُن کے گورے رنگ اور داڑھی موچھ منڈے ہوئے صاف و صبیح چہرہ پر ایک خاص کیفیت پیدا کر دیتی ہے اور اکابر قوم میں ایسے تو متعدد ہیں جو کھدر پہننے کے بعد بجائے اس کے کہ وہ اپنے اندر انکسار افتادگی پیدا کریں اپنے آپ کو ایسی عظیم و بلند ہستی سمجھنے لگتے ہیں کہ پھر مشکل ہی سے کوئی شخص قابل التفات ان کو نظر آتا ہے اور ان کی مسرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی جو اُن کو اس لباس میں دیکھکر کوئی ارادتمند "مولانا" کہکر ہاتھ چومنے کے لئے بڑھتا ہے اور یہ ایک ایسے عجز کے ساتھ جس میں فرعون کا غرور پنہاں ہوتا ہے اپنا ہاتھ بڑھا دیتے ہیں اور ایسے لب و لہجہ میں گفتگو شروع کرتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ کائنات کا نظام انھیں کی ذات پر منحصر ہے اور اگر آج یہ سیادت و قیادت چھوڑ دیں تو شاید نظم عالم درہم برہم ہو جائے۔

یہ لوگ کھدر کے لباس میں بھی قصداً بدترتیبی اور پھوہڑپن پیدا کرتے ہیں، ارادتاً پیوند لگے ہوئے بوسیدہ اور میلے کپڑے کھدر کے استعمال کرتے ہیں تاکہ عالم کی طرف سے بے نیازی، لوگوں کی جانب سے بے ہمگی، اور امور دنیا میں ایک خاص قسم کا الھڑپن ظاہر ہو اور اس طرح لوگ ان کی طرف زیادہ مایل ہوں

آپ اگر جستجو کریں گے تو معلوم ہوگا کہ کھدر پوشوں کی وہ جماعت جو ذرا بلند تعلیم یافتہ طبقہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے اکثر افراد اس عذاب میں مبتلا ہیں اور جس وقت وہ موٹر میں بیٹھکر باہر نکلتے ہیں تو ہر چند بظاہر ان کا ملبوس جس کو قصداً اُنھوں نے تارتار کر دیا ہے، حد درجہ انکسار کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن ان کے نفس میں اُس وقت اتنا سخت غرور بھرا ہوتا ہے کہ مشکل ہی سے کسی مستبد حکمراں میں پایا جا سکتا ہے۔ بہرحال کھدر پوشی کا یہ مکروہ و مبغوض پہلو یقیناً سخت لعنت ہے لیکن محض ایسے خودنما و خود فروش مکاروں کی وجہ سے اصولاً اُس کو نہ بُرا کہا جا سکتا ہے اور نہ اس کے ترک کی ترغیب دلائی جا سکتی ہے۔

(۳) مجلس خلافت اب بالکل لایعنی اور بیکار سی انجمن ہے، کیونکہ جب خلافت کا وجود ہی باقی نہیں رہا اور اس مصیبت سے عالم اسلامی آزاد ہو گیا تو پھر سانپ نکل جانے کے بعد لکیر کا پیٹنا کیا معنی رکھتا ہے اگر یہ کہا جائے کہ اب مجلس خلافت سے مقصود صرف ایک ایسی تنظیم کا قایم رکھنا ہے جو مسلمانوں کو ایک شیرازہ سے وابستہ رکھے تو اس کے لئے کوئی اور نام تجویز

کرنا چاہیئے موجودہ نام سراسر دھوکا ہے، اگر اس نام کے جواز کے لئے یہ تاویل پیش کی جائے کہ ہر چند مسئلہ خلافت اب باقی نہیں رہا ہے، لیکن حرمین تو موجود ہیں، وہاں کے مسایل سے تو مسلمانوں کو واسطہ ہے تو میں اس کو اصولی غلطی کہونگا۔ کیونکہ ہندوستان کے مسلمانوں کو عراق و حجاز، ترکی و ایران وغیرہ کی سیاسیات سے بحث کرنا یا محض سیاسیات خارجہ کے لئے ایک مستقل انجمن قائم کرکے اپنی ملکی سیاسیات کو پس پشت ڈالدینا بالکل خلاف عقل ہے۔ ہر ملک اپنے مصالح کو بہتر سمجھ سکتا ہے۔ اور ہماری چیخ پکار سے نہ صرف یہ کہ کوئی فائدہ اس کو نہیں پہونچتا بلکہ بعض اوقات بُرا نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ مسلمانوں کو سب سے پہلے اپنی ملکی حالت پر غور کرکے اپنے لئے کوئی طریق عمل پیدا کرنا چاہیئے اور جب اس سے فارغ ہو جائیں تو پھر گھر سے باہر کی آگ کو دیکھنا چاہیئے۔

مذہبی تنظیم کے لئے بیشک ہر ضلع اور صوبہ میں ایک صدر الاسلام یا شیخ الاسلام کا تقرر ضروری ہے جس کے ہاتھ میں تمام مسایل مذہبی اور خصوصیت کے ساتھ فراہمی و صرف زکوٰۃ کا انتظام ہو۔ سو اس کے لئے مجلس خلافت کے قیام کی ضرورت نہیں ہے بلکہ از سر نو ایک مذہبی انجمن قائم کرنا لازم ہے۔

مسلم لیگ اس سے زیادہ بے معنی چیز ہے، کیونکہ مذہبی نقطۂ نظر سے وہ بیکار محض ہے، اور سیاسیات کے لحاظ سے اس کا کانگرس سے علیحدہ رہنا، گویا مسلمان اور ہندو میں ایک دائمی تفریق کا سبب پیدا کرنا ہے، تبلیغ کے لئے جتنی انجمنیں جہاں قایم ہیں میں ان سب کا سخت مخالف ہوں اور ایسے اخبارات و رسائل کو میں ملک کا شدید ترین دشمن سمجھتا ہوں جو تبلیغ اسلام کا علم بلند کئے ہوئے نظر آتے ہیں۔

سب سے پہلے اصولی غلطی مسلمانوں سے یہی ہوئی کہ انھوں نے شدھی اور سنگھٹن کے مسئلہ کو اہمیت دی اُن کو صرف سکوت اختیار کرنا چاہیئے تھا۔ لیکن چونکہ ملک کے بعض افراد ایسے ہیں جو حصول زر اور جلب منفعت کے لئے ایسی فرصتوں کی جستجو میں رہتے ہیں، اس لئے وہ ایسے زریں موقعہ کو کیونکر ہاتھ سے جانے دیتے اُنھوں نے ایک ہنگامہ شدھی کے خلاف پیدا کرکے ہندوستان کی سیاسیات میں اس قدر نزاکت پیدا کردی کہ اب عرصہ تک اس کا سنبھالنا دشوار ہے۔ میں جانتا ہوں کہ شدھی کے مسئلہ کو چھیڑنا ہندوؤں کی زیادتی اور غلطی ہے، لیکن کسی زیادتی یا غلطی کا جواب ہمیشہ غلطی اور زیادتی ہی سے نہیں دیا جاتا۔

کانگرس ہی صحیح معنے میں ایک سیاسی انجمن ایسی ہے جس میں مسلمانوں کو حصہ لینا چاہیئے اور پوری قوت کے ساتھ یہ عذر کہ اس میں ہندو زیادہ ہیں اور ان کی اکثریت مسلمانوں کے بہت سے جائز حقوق کو پامال کردیتی ہے ناقابل قبول ہے کیونکہ اگر آپ چاہیں تو اپنی قوت و کثرت عزم و انہماک سے اپنے آپ کو برابر کا حصہ دار بنا سکتے ہیں، لیکن مسلمانوں کو خلافت، تبلیغ وغیرہ کے مہمل قصوں جھگڑوں سے کہاں فرصت ہے کہ وہ کوئی صحیح فیصلہ کر سکیں، رہ گئے ہمارے رہنما اور ہادی، سو ان کے متعلق سکوت ہی بہتر ہے کیونکہ اگر آج وہی کسی کام کے ہوتے تو یہ بے راہ روی اور مسلمانوں کے انحطاط کی یہ "روز افزونی" کیوں پیدا ہوتی۔

نیاز فتحپوری

قطرۂ اشک

ابر بہار خیمہ زن وادیٔ کوہسار میں!   حسن ازل تھا جلوہ گر منظر سبزہ زار میں
غنچۂ دل مہک اٹھا زلفِ سحر کے عطر سے   گلشن ناز تھا نہاں بادِ صبا کے پیار میں!
جلوۂ حسن مضطرب موج صبا کے عکس میں!   وحشتِ عشق بے نقاب دامن گل کے تار میں
شوق کا کارواں تھا گم دشتِ سکوتِ صبح میں   تا زنگہ گندھا ہوا مہر کے سرخ ہار میں
جنبش چشم ملتفت منظر عام کی طرف !   مقصد دل چھپا ہوا جلوۂ روئے یار میں
دیکھا اٹھا کے جب نقاب بیخودیٔ خروش کا   اور ہی کچھ نظر پڑا انجمنِ بہار میں

زلفِ دوتا کھلی ہوئی، عارضِ حسن جلوہ ریز   ایک پری کھڑی ہوئی مست کسی خمار میں
چہرہ تھا کچھ اداس سا، آنکھوں میں تھا نشانِ غم   دامن اشک تر بتر گریۂ بے قرار میں!
دیکھ کے ہوش اڑ گئے یاس کے اس ہجوم کو!   اک گل تر، اور اس طرح صورتِ دلفگار میں!
شوق کی بے حجابیاں، ناز کی بے نیازیاں!   ایک ادا تھی پیار کی شرم ستم شعار میں!
چاک کیا حجاب شرم جرأت انکشاف نے!   میں نے بڑھایا اک قدم وادیٔ کوہسار میں
عرض کیا کہ "اے پری! کون ہے تو یہ کیا ہے حال   کام ہے تیرا کیا بھلا دامن کوہسار میں؟"
اشک امید ابل پڑے چشم الم نواز سے   موجِ حیات آگئی بحرِ امیدوار میں

بولی بصد ادا کہ "میں قطرہ ہوں ایک اشک کا   سیکڑوں حسرتیں ہیں دفن ایک مرے مزار میں
میں ہوں وہ بارشِ کرم، سبز مرے ہی دم سے ہیں   جتنے بھی نونہال ہیں گلشنِ قلبِ زار میں
مجھ سے ہی فیضیاب ہیں تشنہ لبانِ بزمِ غم!   میری ہی مے کا ہے اثر چشم خمار دار میں

حیف! کہ تیری آنکھ کا ایک بھی قطرہ نم نہیں!   سوز نہیں رہا ہے کیا آتشِ روزگار میں
کچھ بھی تجھے ہے پاسِ دل، کچھ بھی تجھے خیال ہے   سیکڑوں آبلے ہیں خشک پائے دلِ فگار میں

سیکھ کہیں سے طرزِ غم، ڈھونڈھ کے لا کہیں سے اشک — لطف نظارہ کچھ نہیں ورنہ حریم یار میں

اتنا کہا اور اڑ گئی، دیکھتے دیکھتے پری — کچھ بھی نہ تھا پھر اس کے بعد دامن کوہسار میں
سکتہ سا مجھکو ہوگیا، رہ گیا دل کو تھام کر — قوتِ ضبط پھر کہاں دیدۂ بیقرار میں
فرط الم سے گر پڑا، مار کے چیخ خاک پر — شعلۂ روح چھپ گیا برق شرارہ بار میں

نظامی بچھرایونی

بصایر

کسی نے ارسطو سے اکروز پوچھا — کہ ہو دوست جاہل تو کیا ہے نتیجا
کہا اس نے جاہل ہے خود اپنا دشمن — وہ کیا دوست ہوگا جہاں میں کسیکا

چلا جاتا تھا افلاطوں سر راہ — ہوا اک شخص سائل آکے ناگاہ
کہ زیبا کب تلک ہے کسب حکمت — کہا جب تک ہے نا زیبا جہالت

اک معلم کو یہ بقراط نے دیکھا اکروز — کہ لیاقت پہ ہے اپنی اسے دعوائے عظیم
جب پڑھاتا ہے تو کرتا ہے سلف پر ایرد — ان کے دعوے نہیں کرتا کسی صورت تسلیم
بولا بقراط کہ کیوں کا پڑھاتا ہے عبث — جب یہ حالت ہے تو مردوں کو نہ دیجئے تعلیم

جب ملے یوسف صدیق سے یعقوب حزیں — پھر بھی رہتے تھے اسیطرح ملول و غمگیں
پوچھا لوگوں نے کہ اب رونے کا باعث کیا ہے — اب تو پہلی سی وہ یوسف کی جدائی بھی نہیں
بولے یعقوب بچھڑنے کا تھا رونا پہلے — اب یہ رونا ہے کہ مل کر نہ بچھڑ جائیں کہیں

آسی

طلسمِ خیال

(۱)

نہ فریب خوردۂ آرزو   نہ خرابِ کیفِ نیاز ہوں
نہ ہلاکِ زہرِ وفا ہوں میں   نہ شہیدِ خنجرِ ناز ہوں
مجھے حسن و عشق سے کیا غرض   کہ بعیدِ ذوقِ مجاز ہوں
نہ محبتوں کے لئے ہوں میں   نہ عقیدتوں کے لئے ہوں میں
مگر آجتک یہ کھل سکا
کہ مجھے خیال ہے کیوں ترا

(۲)

مرا عزم وہم سے دور ہے   ہے بلند راہ گزر مری
مرا گھر ہے عرش سے بھی پرے   ہو کسی کو خاک خبر مری
جسے قدسیوں نے سنا نہ تھا   اسے دیکھتی ہے نظر مری
میں تجلیوں میں مقیم ہوں   مجھے ہوش ہے وہ کلیم ہوں
مگر آجتک یہ کھل سکا
کہ مجھے خیال ہے کیوں ترا

(۳)

کہیں فلسفی کہیں منطقی   کہیں اک طبیب لبیب ہوں
مرا لفظ لفظ ہے جادو داں   میں وہ لازوال ادیب ہوں
یہ جہاں ہے جس سے بعید تر   میں بہت ہی اس سے قریب ہوں
میں نگارِ عرش کا رازداں   میں خدائے فرش کا رازداں
مگر آجتک یہ کھل سکا
کہ مجھے خیال ہے کیوں ترا

(۴)

یہ قلمرو سحر خوابگوں مرے جاگنے کا مقام ہے
یہ طلوع مہر ضیا فشاں مری عظمتوں کا پیام ہے
یہ ستارے اور یہ کائنات مری زندگی کا نظام ہے
مرے دل میں عرش کی عظمتیں ہیں رفیع تر مری وسعتیں
مگر آجتک نہ یہ کھل سکا
کہ مجھے خیال ہے کیوں ترا

(۵)

میں تہ زمیں سے ہوں آشنا سر آسماں کی خبر مجھے
میں ہر ایک بزم کا رازداں ہے ہر ایک سماں کی خبر مجھے
تری خلوتوں کا شریک ہوں ترے آستاں کی خبر مجھے
تری محفلوں میں گیا ہوں میں
تری منزلوں میں رہا ہوں میں
مگر آج تک نہ یہ کھل سکا کہ مجھے خیال ہے کیوں ترا

روش صدیقی

عروسِ برشگال

موسمِ گرما سے لب پر جان تھی آئی ہوئی | روئے عالم پر تھی بیڈھب مُردنی چھائی ہوئی
روحِ انسانی پر آفت اسکی تھی لائی ہوئی | آسماں پر ہر نظر پڑتی تھی للچائی ہوئی

اضطراب انگیز دنیا کی ہر اک تصویر تھی
ذرے ذرے میں جہاں کے خواہشِ تفسیر تھی

ناگہاں دیکھا گیا ابرِ سیہ آتا ہوا | اس طرح دوشِ صبا پر پیچ و خم کھاتا ہوا
جس طرح اُٹھے کوئی بالوں کو بکھراتا ہوا | آمدِ فصلِ بہاری کی کھرج گاتا ہوا

گوہرِ ابرِ کرم ہر سمت بکھرانے لگا
موتیوں سے دامنِ امید بھر جانے لگا

چمکِ برقِ جہندہ باعثِ فرحت ہوئی | لرزشِ موجِ نسیمِ صبح سے ہمت ہوئی
تشنگی کی شدتوں سے حلق کو فرصت ہوئی | پھر شگفتہ پیکرِ عالم کی ہر صورت ہوئی

آ، بلائیں تیری لیوں اے عروسِ برشگال
اپنی آنکھوں میں جگہ دوں اے عروسِ برشگال

مرحبا اے نازنیں ناظورۂ سحر آفریں | اُف تری شوخی ترے نقش و نگار دلنشیں!!
یہ نگاہِ مست تیری اور چشمِ سرمگیں | دوشِ نازک پر ترے بکھری ہوئی زلفِ عنبریں

ہے ترے دامن میں پنہاں ایک لیلائے بہار
صورتِ مجنوں نہ کیوں عالم ہو شیدائے بہار

پھر نسیمِ صبح کے دامن کو اک جنبش ہوئی | شاخسارِ یاسمیں کو پھر ذرا لرزش ہوئی
لالۂ مے نوش کے قدموں کو بھی لغزش ہوئی | پھول ہنسے کھل گئیں کلیاں عجب بخشش ہوئی

چشمِ نرگس وا ہوئی تیرے ہی جلووں کے لئے
کھل گئی منقارِ بلبل تیرے نغموں کے لئے

آسماں پر اب نظر آتے ہیں بادل دل کے دل | ہیں نشاط آسودہ سارے دشت و کہسار و جبل
کھل گئے افسردہ دل بھی اس طرح جیسے کنول | میکدے میں ہو گئے میکش صراحی در بغل

پھر پپیہوں کی ہر طرف سے صدا آنے لگی
"پی کہاں" کے بھیس میں بانگِ درا آنے لگی

اودی اودی سی گھٹاؤں کا جو ہے آنچل کہیں — تو کہیں بکھرا رہی ہے زلف کوئی نازنیں ہو
ابر میں بجلی چمکتی ہے سرِ چرخِ بریں — آ رہی ہے جھینگروں کی بھی صدائے دلنشیں

ساری دریا ہو چکے سرمستِ ریعانِ شباب
یعنی ہے سیلِ رواں میں جوشِ طوفانِ شباب

آبشاروں کے کناروں پر ہے بگلوں کی قطار — مرغ آبی کی چہل پر جانِ آہو ہے نثار
نغمۂ فطرت سے ہیں لبریز سارے کوہسار — جس طرف دیکھو پڑے ہیں سیکڑوں پھولوں کے ہار

حسن کی نیرنگیاں اب عشق کے دامن میں ہیں
وصل کی سرشاریاں "ابر" امن گلشن میں ہیں

جاذبِ نظارہ ہے کیا قوس کی رنگیں کماں — سرخوشِ کیف ترنم ہیں طیور خوش بیاں
پھول سے معشوق ہیں زینت دہِ باغ جہاں — اپنے جامے میں سماتا ہی نہیں ہے باغباں

باصرہ افروز ہیں نیرنگیاں برسات کی
سلسبیلِ گوش ہیں موسیقیاں برسات کی

پھر لبِ غنچہ پہ لرزاں ہے شمیمِ جانفزا — باندھتا پھرتا ہے رنگِ گل چمن میں اب ہوا
نغمۂ آبی سے ہے گونجی ہوئی ساری فضا — آ رہی ہے آبشاروں سے ترنم کی صدا

بادۂ خوش کیف سے لبریز ہے جامِ بہار
مردہ دل بھی جی اٹھے سن سن کے پیغامِ بہار

رات کو جگنو کی تابش، جیسے آوارہ کرن — ہائے یہ افشاں کا عالم، اف یہ زلفِ پُرشکن
ہے بپا پُرنور تاروں کی فلک پر انجمن — کر چکی لیلائے شب زریں قبا پھر زیبِ تن

چرخِ نیلی کی جبیں پھر نور افشاں ہو گئی
سیلِ انجم میں شبِ دیجور پنہاں ہو گئی

چشمہ و دریا کے ہاتھوں میں چھلکتا جام ہے — تشنہ کامانِ ارادت کے لئے پیغام ہے
پینے والے خوش ہیں جاری آج فیضِ عام ہے — انتظارِ روزِ فردا اک خیالِ خام ہے

ابتدائے رنگ و بو کی انتہا ہونے کو ہے
لمحہ لمحہ میری ہستی کا فنا ہونے کو ہے

حافظِ خستہ جگر "ماضی" پہ رکھ اپنی نظر حال کی رنگینیوں کو رہن مستقبل نہ کر
آنے والا رنگ ہے اک حرفِ مشروط "اگر" نقطۂ موہوم پر ہوگا ترا کبتک گزر

کل شیٔ ہالک اک آخری پیغام ہے
عالمِ ایجاد کا انجام کیا انجام ہے

حافظ غازیپوری

نگہ اپنی اپنی

حیات فخر سے جس کو جناب کہتے ہیں ہم اسکو ایک نمودِ حباب کہتے ہیں
علاجِ تشنہ لبی جسکو آپ سمجھے ہیں ہم اس طلسم کو موجِ سراب کہتے ہیں
نگہ میں آپکی جو برگِ سبز ہے قبلہ ہمارے حلقہ میں اسکو کتاب کہتے ہیں
رموزِ میکدۂ دل جناب کیا جانیں جہانِ خیال کو جامِ شراب کہتے ہیں
جنھیں حضور کہے جا رہے ہیں خانہ خراب انھیں کو ہم تو جلالت مآب کہتے ہیں
ہے خلق جسکے تصور سے لرزہ براندام ہم اُسکو خلدِ حقیقت کا باب کہتے ہیں
عوام چشمۂ فطرت نما کہا کریں لیکن امینؔ زمان و مکاں کو حجاب کہتے ہیں

نگہ بلند و دل ہوشمند میداریم
حقیقتیم و حقیقت پسند میداریم

امین حزیں

غزل

بار ہا ہجر میں یوں ہم نے انھیں یاد کیا — جسم کو روح کیا روح کو فریاد کیا
اس لگاوٹ سے نگاہوں نے کچھ ارشاد کیا — روح کو کشمکش یاس سے آزاد کیا
اس نے اس حسن تبسم سے نگاہیں ڈالیں — سب یہ سمجھے کہ سر بزم کچھ ارشاد کیا
میں نے کس دن قفس غم سے رہائی چاہی — میں نے کب شکوۂ بے مہری صیاد کیا
اُس سے پوچھے کوئی آغاز محبت کے مزے — جس کے دل کو غم انجام نے برباد کیا

بعد مدت کے خط آیا ہے کسی کا ذوقی
خیر اتنا بھی غنیمت ہے کہ اب یاد کیا

ذوقی

ڈائری کا ایک ورق

(بہ سلسلۂ ماسبق)

اس سے قبل سطح قمر تک پہونچنے کا حال درج ہو چکا ہے۔ اب میں کچھ واقعات وتجربات وہاں کے بیان کرتا ہوں
کرۂ ارض میں سنا کرتا تھا کہ وزن نام ہے صرف کشش زمین کا اس لئے اگر کوئی کرہ، زمین سے چھوٹا ہو تو وہاں کشش کی کمی کی وجہ سے ہر چیز کا وزن بھی کم ہو جائے گا، یعنی اگر کوئی چیز کرۂ ارض میں ایک من کی ہے تو چاند میں پہونچنے کے بعد وہ صرف چند سیر کی رہجائیگی۔

جہاز پر بھی اس کا کچھ علم ہو گیا تھا جیسا کہ بیان ہو چکا ہے لیکن پوری حقیقت یہاں پہونچنے پر معلوم ہوئی جس وقت ہمارا جہاز، سوشان کے میدان میں اترا تو اس کی خفت وزن کا یہ عالم ہو گیا تھا کہ سلنڈروں کی تمام قوت صرف کرنے پر بھی وہ اس طرح اترتا ہوا معلوم ہوتا تھا جیسے بلندی سے کوئی پتنگ ٹوٹ کر جھپ کھاتی ہوئی نیچے اترتی ہے۔

جب ہم سطح قمر پر اترے تو خیال تھا کہ یہاں انسانی آبادی نظر آئے گی اور کچھ اسی قسم کے آثار حیات دکھائی دیں گے جیسے زمین پر نظر آتے ہیں، لیکن ہم لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب بجائے انسانی آبادی کے وہاں ہمنے ایک خاص قسم کے جانور دیکھے جو شکل وصورت میں تو انسان سے بہت مشابہ تھے لیکن اعضا میں بہت فرق تھا، مثلاً یہ کہ بجائے دو ٹانگوں کی اُن کے صرف ایک ٹانگ تھی اور اس کا سبب یہ تھا کہ خفت وزن کی وجہ سے انھیں اپنا جسم سنبھالنے کے لئے ایک ہی ٹانگ کافی ہوتی ہے۔
جب یہ مخلوق چلتی ہے وہ اپنی ٹانگ کو آگے نہیں بڑھاتی، بلکہ سارا جسم ایک ستون کی طرح اوپر کی طرف بلند ہوتا ہے پھر جس طرف جی چاہتا ہے وہ اوپر ہی اوپر تیرتا ہوا چلا جاتا ہے، لیکن سو دو سو قدم چلنے کے بعد وہ پھر اسی ایک ٹانگ پر اس طرح قائم ہو جاتا ہے جیسے کوئی اوپر سے زقند بھر کر نیچے آیا ہو۔ اس لئے یہ مخلوق بالکل چھلاوہ کی حیثیت رکھتی ہے۔
ان کی ٹانگ گاؤدم نہیں ہوتی بلکہ صرف ایک لکڑی کی طرح برابر ہوتی ہے جس میں کوئی جوڑ بھی نہیں ہوتا اور اسے جسم سے علٰحدہ بھی کر سکتے ہیں۔

یہ ٹانگ کمر سے ملی ہوئی ہوتی ہے اور کمر نام ہے صرف ایک باریک سی ہڈی کا۔ چونکہ یہاں کی زندگی کے لئے ہوا کی ضرورت نہیں ہے اس لئے پھیپھڑا بھی نہیں ہوتا اور غذا کے لئے معدہ بھی نہایت مختصر سا ہے، کیونکہ صرف رقیق چیزوں پر گزر ہے جن کا فضلہ پسینہ کی راہ سے نکل جاتا ہے اور اسی لئے امعاء وغیرہ بھی نہیں ہے۔ ہوا نہ ہونے کی وجہ سے ناک بھی نہیں ہے اور سخت چیزوں کی غذا نہ بننے کی وجہ سے دانت بھی نہیں ہیں۔ کانوں کے بجائے صرف ایک سوراخ پیشانی پر ہے اور دہن نام ہے ایک مختصر سے شگاف کا جس میں نہ زبان ہے نہ دانت۔ آنکھیں البتہ بجائے دو کے چار ہیں دو رخساروں پر اور دو

پشت پر، ہاتھ انسانوں ہی کی طرح ہوتے ہیں لیکن نہایت کمزور جنس کا فرق بھی اُن میں نظر نہیں آتا اور باوجود کوشش کے یہ نہ معلوم ہوسکا کہ سلسلۂ تناسل ان کے ہاں کس طرح قایم ہوتا ہے۔ یہ ان کے ہاں کا رازا ہے جو کسی پر ظاہر نہیں کرتے۔ ان کے تمام گفتگو سیٹیوں یا اشارات سے ہوتی ہے اور اُن کے جسم کے سنہرے بال جو جابجا کثرت سے پائے جاتے ہیں یہ گفتگو کے وقت کھڑے ہوجاتے ہیں اور دیکھنے والے پر سخت ہیبت طاری ہوتی ہے۔

جس وقت ہمارا جہاز پہونچا تو کثیر تعداد میں یہ جانور جو چاند کی اشرف المخلوقات ہونے کا فخر رکھتے ہیں چاروں طرف آگئے اور لگے اپنے گول گول دیدے پھرا کر دیکھنے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تھوڑی دیر میں یہ لوگ لپٹ جائیں گے اور نوچ کر کھا جائیں گے۔ کپتان نے جو یہاں کے حالات سے زیادہ واقف تھا، اُس نے کچھ اشارات کی مدد سے، کچھ سیٹیاں بجا بجا کر، کبھی بیٹھ کر، کبھی اُٹھ کر اور طرح طرح کا منھ بنا کر خدا جانے ان سے کیا کہا اور وہ کیا سمجھے لیکن ہمنے صرف اس قدر محسوس کیا کہ وہ دور ہٹ گئے۔ غالباً اس نے یہی کہا ہوگا کہ یہ لوگ ڈرتے ہیں، ذرا دور ہوجاؤ۔ ہماری ہمسفر خاتون کی حالت نہایت خراب تھی، انھوں نے اپنے چہرہ چھپا لئے تھے اور مردوں سے لپٹی جاتی تھیں۔ میں بھی جہاز کے اندر چلا گیا اور دروازے بند کرکے سوچنے لگا کہ کتنی بڑی غلطی یہاں آنے میں کی ہے اور اب بظاہر واپسی کی بھی کوئی امید نہیں ہے۔

یہاں کی زمین بالکل کرۂ ارض کی طرح ہے لیکن فرق یہ ہے کہ سبزہ اور درخت کا پتہ نہیں جابجا اونچی اونچی چٹانیں ضرور ہیں جن سے ہر وقت پانی بہتا رہتا ہے اور پانی کے اندر، پتھروں پر، چٹانوں کی چوٹیوں پر، نشیب و فراز میں ہر جگہ برف کے بلورات (Crystals) مختلف ہندسی شکلوں میں نظر آتے ہیں، جو دور سے ہزاروں کھلے ہوئے سفید پھولوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ اسی لئے وہ میدان جہاں ہمارا جہاز اترا تھا، تختۂ گل کے نام سے موسوم تھا۔ حشرات کا یہاں پتہ نہیں ہے اور نہ چوپائے کہیں نظر آتے ہیں، طیور میں صرف ایک چیز بکثرت پائی جاتی ہے اور اس کو ہم ہندوستان کے چمگادڑ سے تشبیہ دے سکتے ہیں، لیکن فرق یہ ہے کہ چاند کا یہ جانور جسم و قامت میں بہت بڑا ہے اور اس کی پرو بازو بھی بہت وسیع ہوتے ہیں۔

سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز معنوی حیثیت سے تو یہاں کی جنبیت تھی اور ظاہری اعتبار سے یہاں کی بڑھی ہوئی سردی، آفتاب چمک رہا تھا، لیکن بجائے گرمی کے او خنکی برساتا ہوا معلوم ہوتا تھا، ہاتھ پاؤں کی ٹھٹھرن کسی طرح نہ جاتی تھی اور ایک ایک منٹ تک مسلسل آگ کے اندر ہاتھ ڈالنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔

یہاں نہ کوئی بازار ہے نہ کوئی شہر، یہاں کی مخلوق غاروں میں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر، جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتی ہے۔ آپس میں نہ کوئی خاص اختلاط ہے اور نہ ایسی معاشرت۔ ایک ایک غار میں چار چار پانچ کی جگہ ہوتی ہے اور شب و روز میں مشکل سے چند گھنٹوں کے لئے باہر نکل کر چشموں پر جاکر پانی پی لیتے ہیں اور پھر وہیں جا کر پڑ رہتے ہیں۔

یہاں کا سب سے زیادہ دلکش مقام ایک وہ وسیع حصہ زمین ہے جو بالکل خشک ہوگیا ہے اور جس میں اتنے بڑے بڑے

غار پائے جاتے ہیں کہ آج تک ان کی تھاہ نہیں ملی اور نہ یہ پتہ چلا کہ ان کے اندر کیا ہے، دوسری تفریح کی جگہ سمندر کا وہ لبریز حصہ ہے جہاں برف کی ہزاروں چادریں تیرتی پھرتی ہیں اور یہاں کی مخلوق سوار ہو کر ان سے جہازوں کا سا کام لیتی ہے اس کے اندر ایک خاص قسم کی مچھلی بالکل چاندی کی سی پائی جاتی ہے اس کا شکار کھانے کی غرض سے نہیں کیا جاتا بلکہ اس کی چربی نکال کر جلاتے ہیں اور اس کی کھال کو اوڑھتے ہیں۔

سہ پہر کو جب ہم لوگوں نے باہر جانے کا ارادہ کیا، اور اس خیال سے خیموں سے باہر نکلے تو ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ ہر شخص کے لئے ایک چھوٹی سی گاڑی چھینکے کی طرح تیار تھی جس میں چار چار وہی چمگادڑ جتے ہوئے تھے اور ایک چلانے والا اسی عجیب الخلقت قسم کا سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

میں یہ دیکھکر سخت وحشت زدہ ہوا اور میں نے اس پر بیٹھنے سے انکار کیا لیکن پیچھے مڑ کر دیکھا ہی تھا کہ تین چار آدمی ایک ایک ٹانگ سے کودتے ہوئے آئے اور انھوں نے اپنے اشاروں سیٹیوں آنکھ کی گردشوں اور ڈراؤنی شکلوں سے ایسا ڈرایا کہ میں بے اختیارانہ اس چھینکے کے اندر گر پڑا اور چمگادڑ اس کو لیکر اڑ گئے میں چیخ رہا تھا، چلا رہا تھا لیکن اس جانور پر کوئی اثر نہ تھا، اور میں لٹکا ہوا اوپر فضا میں چلا جا رہا تھا، اگر اطمینان تھا تو صرف اس قدر کہ میرے اور ساتھی بھی اسی طرح آگے پیچھے چھینکوں میں لٹکے ہوئے چلے آ رہے تھے۔

اندازاً دو گھنٹے کے بعد ہماری سواری پھر نیچے کی طرف مائل ہوئی اور رفتہ رفتہ ایک پہاڑی کی چوٹی پر جا کر ٹھہر گئی، میرے ساتھی بھی تھوڑی دیر میں وہیں آ گئے، یہاں پہلے سے ایک جماعت　　　سروں پر اسی مچھلی کے کھال کی لمبی لمبی ٹوپیاں پہنے ہوئے ہاتھوں میں پتھر کے نوکدار ٹکڑے لئے موجود تھی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ہم لوگ یہاں کے فرمانروا کے پاس جا رہے تھے اور یہ سب اس کے سپاہی تھے جو ہمارے استقبال کے لئے پہلے سے موجود تھے۔

انھوں نے چاروں طرف سے ہمارا محاصرہ کر لیا اور ہم لوگ ململوں، سموروں کے ٹکڑوں میں اپنے ہاتھ منہ لپیٹے ہوئے آگے بڑھے۔ اب شام ہو گئی تھی اور آفتاب کی شعاعیں پہاڑوں کی سفید چوٹیوں، میدانوں کی برفانی بلورات اور وادیوں کی شفاف چشموں پر پڑ پڑ کر بیشمار قوس قزح پیدا کر رہی تھیں، یہ منظر یقیناً اس قدر دلکش تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے میں اپنے تمام مصائب بھول گیا اور میرے ساتھیوں میں سے بھی ہر شخص محو ہو کر رہ گیا۔

چار فرلانگ کے بعد دفعۃً ہم کو ٹھہر جانا پڑا، کیونکہ یہاں سے اب شاہی محلات کی حدود شروع ہوتے تھے۔ میں نے خدا جانے دل میں کیا جغرافیہ ان محلات کا قایم کر رکھا تھا، لیکن یہاں پہونچکر معلوم ہوا کہ شاہی محلات عبارت ہیں صرف ان وسیع غاروں سے جو کھود کھود کر پہاڑوں کے اندر بنائے گئے ہیں۔

ان غاروں کا سلسلہ اس قدر وسیع و پیچیدہ ہے کہ اچھی خاصی بھول بھلیاں ہو گیا ہے اور اگر کوئی واقف حال نہ ہو تو پھر ایک مرتبہ جانے کے بعد باہر نہیں نکل سکتا۔ ایک غار کے دہانہ پر پہونچکر ہم لوگ ٹھہر گئے اور اندر سے کئی آدمی مشعلیں لئے ہوئے

نمودار ہوئے، جو سپاہی ہمارے ساتھ آئے تھے وہ باہر ہی رہ گئے۔ اب ہم ایک سرنگ کے اندر جارہے تھے جس کی چھت سے سرد پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے اور سردی کا یہ عالم تھا کہ ہڈی تک میں درد محسوس ہونے لگا تھا۔ یہ سرنگ ایک فرلانگ کی تھی اس سے نکل کر پھر ہم روشنی میں آئے لیکن اب چٹانوں کا نا ختم ہونے والا سلسلہ سامنے تھا، اس کے بعد پھر دوسری سرنگ ملی۔ الغرض اسی طرح یکے بعد دیگرے پیچ در پیچ سرنگوں اور چٹانوں سے گزرتے ہوئے ایک گھنٹہ کے اندر ہم خاص قصر شاہی تک پہونچے جہاں بہت سی مشعلیں روشن تھیں۔ یہ قصر شاہی صرف ایک وسیع دالان سا تھا جو پہاڑ کو کھود کر بنایا گیا تھا۔ ایک سنگین تخت پر بادشاہ بیٹھا ہوا تھا، جس کے جسم پر بہت سی سیپیاں چپکی ہوئی تھیں اور سر کے تاج میں جو اسی مچھلی کی کھال کا تھا بہت سے رنگین پتھر جڑے ہوئے تھے، اس کی صورت بھی ویسی ہی بھیانک تھی یہ اس وقت اپنی ٹانگ الگ کئے ہوئے ایک مضغۂ گوشت کی طرح تخت پر پڑا ہوا تھا۔ ہم لوگ قریب ہو کر کھڑے ہوگئے اور اس نے مخصوص اشارات سے ہمارا خیر مقدم ادا کیا تھوڑی دیر کے بعد سنگین پیالوں میں شربت کے قسم سے ایک چیز آئی جس کو ہم لوگوں نے پیا اس کے پینے سے ہم لوگوں کی ساری تھکن دور ہوگئی اور سردی کی شدت بھی کم محسوس ہونے لگی۔ معلوم ہوا کہ یہ خاص چشمۂ شاہی کا پانی تھا جس میں عجیب و غریب اثرات پنہاں ہیں۔

اس بادشاہ کے درباری بھی سب ایک ہی وضع و صورت کے تھے اور اس وقت ان سب کی سیٹیوں اور اشارات نے ایک خاص قسم کا ہنگامہ پیدا کر دیا تھا۔

رات کو ہم لوگ یہیں رہے اور ایک غار کے اندر رہکر صبح کرنی پڑی جب دوسرے دن آفتاب بلند ہوا تو پھر بادشاہ کا سلام ہوا اور انھیں سرنگوں سے گزر کر جھینکوں میں بیٹھے اب کی یہ جھینکے زیادہ بلند نہیں گئے بلکہ پہاڑوں کی سطح کے قریب قریب روانہ ہوئے، مقصود یہ تھا کہ ہم لوگ سیر کرتے ہوئے جائیں۔ جب اپنے خیموں کے محاذ میں پہونچے تو یہ جھینکے دفعۃً بہت بلند ہوگئے اور ڈرائیور نے آہستہ سے میرے بازوؤں میں چمڑے کے دو پر جو لپٹے ہوئے تھے کسی چیز سے چپکا کر نیچے ڈھکیل دیا۔ اس کے بعد صرف مجھے اتنا ہوش ہے کہ جھینکے سے گرنے کے بعد وہ دفعۃً کھلنے شروع ہوئے اور میں طائر کی طرح آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا، لیکن دل اس قدر زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ میں اس کی برداشت نہ کرسکا اور سر چکراتے چکراتے دفعۃً میں نے ایسا محسوس کیا کہ کسی چٹان سے جاکر ٹکرا گیا ہوں۔

آفتاب بہت بلند ہوچکا تھا اور میری چھوٹی بچی جھنجوڑ جھنجوڑ کر مجھے اٹھا رہی تھی، اور سامنے کرسی پر بیوی بیٹھی ہوئی مسکرا رہی تھیں وہ پوچھ رہی تھیں کہ آج سوتے میں تم نے چیخ کیوں ماری۔ میں ان کو دیکھ کر سہما جا رہا تھا کہ یہ بھی کہیں انھیں چاند والوں میں سے کوئی نہ ہوں لیکن جب ان کی دونوں آنکھیں، دونوں کان اپنی اپنی جگہ پر ثابت و سالم نظر آئے تو میں نے اطمینان کی سانس لی اور بولا کہ جا رہی ہوں تو بتاؤں کہ کتنی بڑی مہم سر کرکے آیا ہوں۔

نیاز فتحپوری

اقتباسات و معلومات

قوت فکر و اجتہاد کی اعجوبہ نمائیاں

۱۸۶۹ء میں ایک دن صبح کو، اک نوجوان خستہ حال، پریشان صورت، نیویارک کے پاول اسٹریٹ میں جو سرمایہ داروں اور دولتمندوں کا مشہور بازار ہے، نمودار ہوتا ہے اور ٹیلیگراف کمپنی کے دفتر میں داخل ہوتا ہے۔ اس کمپنی نے خاص اشارات کہربائی مقرر کر رکھے تھے جن کے ذریعہ سے وہ شہر کے بڑے بڑے تاجروں کو گھڑی گھڑی مختلف کمپنیوں کے حصوں اور اوراق مالی کے بھاؤ کی اطلاع دیا کرتی تھی۔

یہ نوجوان اندر ایک کونہ میں بیٹھا ہوا منیجر کمپنی سے ملاقات کا انتظار کر رہا تھا کہ دفعۃً "وہ آلہ جس کے ذریعہ سے خبریں پہونچائی جاتی تھیں بیکار ہو گیا۔ دو منٹ نہیں گزرے تھے کہ تاجروں کے سیکڑوں خادم گھبرا کر آ گئے اور منیجر بھی پریشان ہو کر اپنے کمرہ سے باہر ہو گیا۔ لیکن اتنی ہی دیر میں یہ نوجوان اس آلہ کے پاس ہو کر اس کے سقم کو معلوم کر چکا تھا۔

جب منیجر اندر داخل ہوا تو اس نے بڑھ کر کہا کہ میں اس کی خرابی کو دور کر سکتا ہوں۔ منیجر نے خوش ہو کر کہا کہ "درست کرو" اور اس نے فوراً پوری مہارت کے ساتھ اسے کھولا اور جو نقص اس میں پیدا ہو گیا تھا اس کو اسی وقت دور کر دیا۔

منیجر بہت خوش ہوا اور اس کو اندر بلا کر بہت سے سوال کئے۔ جوابات سے وہ بہت خوش ہوا اور ۶۰ گنی ماہوار کے مشاہرہ پر اس کو ملازم رکھ لیا۔

آپ کو معلوم ہے یہ نوجوان کون تھا؟ یہ ٹامس اڈیسن تھا جس نے بعد کو برقی قمقمے، فونوگراف، صور متحرکہ کا آلہ اور خدا جانے کیا کیا چیزیں ایجاد کیں۔

اڈیسن کو کبھی توقع نہ تھی کہ اسے ایسی جگہ ملجائیگی، وہ بہت خوش ہوا اور اپنے اوقات کا اکثر حصہ تحقیق و تفتیش میں صرف کرنے لگا یہاں تک کہ اس نے اشارات تلغرافی کے چھاپنے کا طریقہ ایجاد کیا۔ اڈیسن اس قدر سادہ مزاج تھا کہ جس وقت کمپنی کے پریسیڈنٹ نے اس کو بلایا اور کہا کہ تم کس قیمت میں اپنی ایجادات کو بیچنا چاہتے ہو تو اس نے اپنے جی میں کہا کہ ایک ہزار گنی کہونگا اور ۶۰۰ گنی تک دیدونگا، لیکن پھر یہ خیال کر کے کہ کہیں یہ رقم بھی زیادہ نہ ہو اس نے جواب دیا کہ "مجھے معلوم ہونا چاہئے کہ کمپنی کیا دینا چاہتی ہے تاکہ میں اس پر غور کر دوں" پریسیڈنٹ نے کہا کہ "کمپنی آٹھ ہزار گنی دینے کے لئے تیار ہے"

اڈیسن یہ سنکر سخت متحیر ہوا اور سمجھا کہ شاید اس کے کان دھوکا دے رہے ہیں لیکن جب اس کو اس رقم کا چک مل گیا تو اسے یقین ہوا اور اس رقم سے اس نے اور بہت سے آلات خرید کئے اور دوسری ایجادات میں مصروف ہو گیا۔

اڈیسن کے حالات طفلی بھی بہت دلچسپ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فطرتاً نہایت جستجو پسند واقع ہوا تھا۔ جب اس کی عمر ۱۲ سال کی تھی تو کسی نے کان پکڑ کر اس کو اٹھایا جس سے اسے ثقل سماعت ہوگیا۔ اڈیسن کا بیان ہے کہ اس نے قصداً اسکا علاج نہیں کیا کیونکہ وہ اس طرح زیادہ انہماک کے ساتھ اپنے کام میں مصروف رہتا ہے اور گرد و پیش کا ہنگامہ اس کی فکر کو اپنی طرف

متوجہ نہیں کرتا۔

اڈیسن کا بیان ہے کہ پونے سات بجے میں اپنا کام شروع کرتا ہوں۔ پہلے صبح کے اخبار دیکھتا ہوں اور پھر ناشتہ کرکے ٹھیک آٹھ بجے کام میں مصروف ہوجاتا ہے۔ روزانہ ۸ سے لیکر ۱۰ تک ایسے کام ہوتے ہیں جنھیں مجھے ختم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ رات کو میں تمام ان مشاغل کی فہرست مرتب کرتا ہوں جو مجھے دوسرے دن انجام دینے ہوتے ہیں اور روزانہ مجھے پچاس تجربے علم کیمیا علم الکہربا، نو رو حرارت، آلات معاون وغیرہ کے کرنے پڑتے ہیں۔

پوچھنے والے نے سوال کیا کہ سب سے زیادہ مشکلات کس تجربہ میں اٹھانا پڑیں۔ تو اس نے جواب دیا کہ سب سے زیادہ زحمت مجھے برقی روشنی کے باب میں اٹھانا پڑی کیونکہ جب میں نے اس تجربہ کو شروع کیا تو مجھے کوئی علم نہ تھا کہ برقی روشنی ہو بھی سکتی ہے یا نہیں اس لئے جب میں نے اُس کے متعلق تجربات شروع کئے تو مجھے بڑی بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ مجھے یہ بھی دیکھنا تھا کہ تجارتی نقطۂ نظر سے بھی وہ اس قدر ارزاں ہوسکتی ہے یا نہیں کہ ہر شخص اس سے فایدہ اُٹھا سکے۔

اڈیسن کا بیان ہے کہ جب میں نے ارادہ کیا کہ برقی قمقمہ کے اندر کسی بہترین چیز کی بتی یا ڈورا استعمال کیا جائے تو میں نے ہر قسم کے کوئلہ پر تجربہ کرکے دیکھا اور جب اس سلسلہ میں مجھے بانس کے ریشہ کا خیال آیا تو میں نے جاپان، جنوبی امریکہ وغیرہ تمام مقامات میں جہاں جہاں بانس پایا جاتا ہے خاص آدمی روانہ کئے تاکہ وہاں سے ہر قسم کے بانس کا نمونہ روانہ کریں اور اس طرح ۶ ہزار نمونے میرے پاس جمع ہوگئے اور میں نے ان سب کا تجربہ کیا یہاں تک کہ ان میں سے ایک بہترین چیز مجھے مل گئی۔ ہر چند اس تجربہ میں بیس ہزار گنی صرف ہوئیں لیکن نتیجہ کے لحاظ سے یہ رقم کچھ بھی حقیقت نہیں رکھتی۔

اڈیسن کی کامیابی کا راز اس کی مواظبت عمل ہے، یعنی جب وہ کسی کام میں لگ جاتا ہے تو پھر اس کو ترک نہیں کرتا جب تک کامیاب نہ ہوجائے اور وہ اس کے پیچھے کھانا پینا اور سونا سب ترک کر دیتا ہے۔

اس کا قول ہے کہ تاریکی اور نیند انسان کی سب سے بڑی دشمن ہیں اور میرا برقی روشنی ایجاد کرنا اسی خیال کی بناء پر تھا کہ اگر اس طرح انسان روزانہ دو گھنٹے بھی زیادہ کام کرسکے گا تو سال بھر ۷۳ دن کام کے اور زیادہ ملجائیں گے۔

جب اڈیسن فونوگراف کی تکمیل میں مشغول تھا تو اس نے ایک گیت کو ۲۵۱۲ مرتبہ سنا یہاں تک کہ وہ اس کی مرضی کے مطابق ٹھیک ہوگیا۔ اس کا تجربہ جب بعد کو اس نے اپنے عمال کے سپرد کیا تو ان کی یہ حالت تھی کہ ایک ہی گیت سنتے سنتے ان کو اختلاج سا پیدا ہونے لگا تھا۔ لیکن ان کو ۵۰۰ مرتبہ سننا پڑا اور متواتر پندرہ دن اس میں صرف کرنے پڑے اور وہ بھی اس طرح کہ ۲۴ گھنٹے میں ایک گھنٹے سے زیادہ سونے کو نہ ملتا تھا۔

اڈیسن کی عمر اس وقت ۸۰ سال سے متجاوز ہوگئی ہے اور اب بھی وہ روزانہ ۹ گھنٹے تجربہ گاہ میں اور ۵ گھنٹے اپنے دار المطالعہ میں صرف کرتا ہے۔

اس وقت وہ ربڑ کے مسئلہ پر غور کر رہا ہے کیونکہ اگر آئندہ جنگ ہوئی جس کا اس کو یقین ہے تو امریکہ کی موجودہ ربڑ ایک

سال سے زیادہ نہ چلیگی اور دوران جنگ میں باہر سے خام ربڑ کا آنا بند ہو جائیگا پھر سالانہ ۴ لاکھ ٹن ربڑ (جو جنگ میں صرف ہوگی) کہاں سے آئے گی۔ چنانچہ اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے وہ ہنری فورڈ اور ہاروی ویرسٹون سے بھی ملا جو جو اس وقت امریکہ کا سب سے بڑا کاروبار کرنے والا ربڑ کا ہے۔ اڈیسن کا بیان ہے کہ امریکہ میں ربڑ کے درخت اس قدر نہیں ہیں کہ ان پر اعتماد کرکے مطمئن ہو سکیں اس لئے ضرورت ہے کہ کوئی اور درخت ایسا تلاش کیا جائے جس کے اندر ربڑ کا مادہ پایا جائے اور پھر اس کی کاشت کو وسیع کیا جائے۔

چین و انگلستان اس وقت ایشیا کے سیاسی مسائل میں چین کا مسئلہ خاص اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ مغرب کو مشرق کی طرف سے جب کسی چیز نے مضطرب رکھا وہ چین ہی کا "زرد خطرہ" تھا اور بحالت موجودہ چین کی بیداری بہت کچھ اس خطرہ کو زندہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

ہندوستان کا جغرافی تعلق چین سے اس قدر قریب ہے کہ اس سے زیادہ ہمسائگی مشکل سے نصیب ہو سکتی ہے، لیکن جہاں ہماری اور غفلتیں ہیں، وہیں ایک یہ بھی ہے کہ نہ ہم اپنے اس ہمسایہ ملک کے حالات سے واقف ہیں اور نہ وہاں کی سیاسیات سے آگاہی رکھتے ہیں۔

آج کی صحبت میں ہم بتانا چاہتے ہیں کہ چین کا تعلق انگلستان سے کب اور کیونکر ہوا اور اس نے رفتہ رفتہ کیا صورتیں اختیار کیں۔

چونکہ چین میں اجنبی لوگوں کی آمدورفت کبھی ممنوع نہ تھی، اس لئے غیر ملکوں کے ساتھ اس کے تعلقات قدیم تاریخوں میں بھی پائے جاتے ہیں چنانچہ ۱۳۴۲ء میں غیاث الدین تغلق شاہ ہندوستان کی طرف سے ابن بطوطہ کا وہاں جانا ثابت ہوتا ہے ابن بطوطہ لکھتا ہے:-

"سلطان غیاث الدین تغلق نے مجھے سفیر بنا کر چین روانہ کیا۔ شاہ چین نے اس سے قبل سلطان غیاث الدین کے پاس ۱۰۰ لونڈیاں اور غلام، ۵۰۰ تھان کمخواب کے، ۵ من مشک، پانچ خلعت مرصع بھیجکر سلطان سے اجازت چاہی تھی کہ کوہ قراجیل کے نواح میں ایک مندر بنانے کی اجازت دیجائے"

اس کے بعد ابن بطوطہ نے چین کے حالات لکھتے ہوئے بیان کیا ہے کہ "چین میں بہت امن ہے اور ایک شخص معہ قیمتی سامان کے تنہا سفر کر سکتا ہے اور اس کو کوئی اندیشہ نہیں ہو سکتا۔ ہر ہر منزل پر ایک کاروانسرائے ہے جہاں مسافروں اور انکی سواری کے جانوروں کے قیام کا انتظام ہوتا ہے۔ اگر کوئی مسافر بعد مغرب پہونچتا ہے تو یہاں کا حاکم آتا ہے اور مسافروں کے نام لکھ کر سرائے کے دروازہ میں قفل ڈال دیتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ صبح کو پھر آتا ہے اور ہر مسافر کو اسم وار پکارتا ہے اور حالات دریافت کرکے ایک محافظ دستہ قافلہ والوں کے ساتھ متعین کرتا ہے جو دوسری منزل تک پہونچاتا ہے اور وہاں کے حاکم کی رسید حاصل کرتا ہے کہ فلاں قافلہ خیریت سے پہونچ گیا اسی طرح اکثر حصۂ ملک میں

رواج ہے۔ کاروان سرایوں میں ضرورت کی ہر چیز مہیا ہوتی ہے، خاصکر مرغ اور بط تو کثرت سے ملتی ہیں"

الغرض چین میں غیر ملک والوں کی آمد و رفت زمانۂ قدیم سے پائی جاتی ہے البتہ انگلستان سے اس کا سفیرانہ ارتباط اخیر سولھویں صدی میں ملکۂ الزبتھ کے عہد سے پایا جاتا ہے۔

اس کے بعد ۱۶۳۳ء میں انگلستان نے چین سے تجارتی تعلقات قایم کرنا چاہے اور ایک بیڑہ کپتان وڈل کی قیادت میں روانہ کیا یہ بیڑہ جسوقت کنٹن کے بندرگاہ کے قریب پہونچا تو بوگیو کے قلعہ سے گولے سر کئے گئے، لیکن انگریزی بیڑہ کی توپوں نے ان کی توپوں کو خاموش کر دیا اور اس طرح یہ بیڑہ کنٹن پہونچا اور وہاں سے شکر اور سونٹھ لیکر واپس آیا۔ اس کے بعد انگلستان کے بیڑے برابر چین جانے لگے اور ہر مرتبہ یہی زحمت پیدا ہونے لگی آخر کار شاہ چین نے ۱۶۸۵ء میں انگلستان کو بحری تجارت کی اجازت دیدی اور ۱۶۸۹ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک جہاز روانہ کیا تاکہ کنٹن میں ایک کارخانۂ تجارت قایم کرے اس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کامیاب تو ہوگئی، لیکن اہل چین ان انگریزوں کے ساتھ جو کنٹن میں بسلسلۂ تجارت مقیم تھے اچھا سلوک نہ کرتے تھے آخر کار ۱۷۹۲ء میں، حکومت انگلستان نے لارڈ مکرٹنی کو شاہ چین کے پاس روانہ کیا تاکہ باہمی تعلقات کو خوشگوار بنایا جائے اور بلاد چین میں انگلستان کا ایک مستقل سفارتخانہ قایم کیا جائے۔

لارڈ مکرٹنی کو شاہ چین اپنے حضور میں باریاب تو کیا لیکن کسی سبب کی بنا پر یہ سفارت انگلستان کے کامیاب نہ ہوئی اس کے بعد ۱۸۱۶ء میں لارڈ امہرسٹ سفیر بناکر بھیجا گیا۔ جن کشتیوں میں یہ سفارت پایۂ تخت کو لیجائی گئی تھی ان کے جھنڈوں پر لکھا ہوا تھا کہ "یہ سفارت انگلستان کی طرف سے جزیہ لیکر آرہی ہے" اور جس وقت یہ لوگ پایۂ تخت میں پہونچے اسی وقت حاضری کا حکم ہوا، لیکن چونکہ یہ سفارت کے رسمی لباس میں نہ تھا اور اس کے پاس کاغذات بھی نہ تھے اس لئے اس نے انکار کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ناکام واپس آیا۔

اہل چین تجارتی تعلقات قایم کرنا تو پسند کرتے تھے لیکن وہ چاہتے یہ تھے کہ جو سفیر غیر ملکوں کے آئیں وہ اس طرح ملیں گویا بہت زیر دست ہیں اور کم از کم انگلستان اسے منظور نہ کرتا تھا۔

جب لارڈ نیپر چین گیا تو اس نے کنٹن کے حاکم سے ملنا چاہا تاکہ اب کوئی جھگڑا تفوق کا پیدا نہ ہو اور یہ ملاقات دو برابر مرتبہ والوں کی سی ملاقات ہو اس ملاقات میں بھی یہ جھگڑا پیدا ہوا کہ کس کی کرسی کس طرف رکھی جائے بالآخر ایک گول میز کے گرد کرسیاں بچھا دی گئیں تاکہ صدر اور بائیں کا قصہ ہی باقی نہ رہے۔ لیکن لارڈ نیپر مرگیا اور معاملات معلق رہے، یہاں تک کہ افیون کی مشہور جنگ وقوع میں آئی اور چین کا جہاز انگلستان کے جہاز نے غرق کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چین، برطانیہ کو اپنا مساوی سمجھنے لگا اور برطانوی تجار کو اب کوئی خاص شکایت نہ رہی۔ لیکن چونکہ قوت و جبروت سے حاصل کی ہوئی صلح نفرت و انتقام کے جذبہ کو اور ابھار دیتی ہے اس لئے چین کی یہ خاموشی بالکل عارضی و اجباری تھی اور اس کے اندر ہمیشہ سے یہ اہلیت موجود تھی کہ وہ کسی وقت اپنی اہمیت کو سمجھے اور اجنبی اثرات سے اپنے ملک کو آزاد کرائے۔ چنانچہ اس زمانہ میں جبکہ وہاں حصول آزادی کے لئے ایک ہنگامہ بپا ہے، ایک امریکن کا چشم دید بیان قابل توجہ ہے۔ وہ بیان کرتا ہے کہ:۔

اب جاکر دنیا کو معلوم ہوا ہے کہ چین بھی زندہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جدید چین، اپنے دماغ اپنے اعصاب کی وجہ سے بہت زیادہ قابل التفات ہے۔

وطنیت کی وہ روح جو اصلی مرکز کنٹن میں پیدا ہوئی تھی اس وقت چین کے دو ثلث حصہ پر قابض ہے اور جلد وہ زمانہ آنے والا ہے جب وہ اس مقام پر پہونچ جائیں گے جہاں ۰۰ہم چینی آبادی کو پہونچنا چاہئے۔

چین کی وطن پرست جماعت دوسری قوموں کے ساتھ سیاسی مساوات حاصل کرنا چاہتی ہے اور اس قدر قوت و عزم کے ساتھ کہ وہ سوائے اپنے کسی اور قوم یا ملک کی رائے سننا ہی نہیں چاہتی اور سارے عالم کا مقابلہ کرنے کیلئے طیار ہے۔ تنظیم میں وہ اس قدر ذوق سلیم کا ثبوت دے رہی ہے کہ اس سے قبل چین میں کہیں اس کا وجود بھی نہ تھا۔ یہ جماعت ملک کی انتہائی جنوب سے پیدا ہوئی اور شمالی ملک والوں سے ان کی معیشت و معاشرت بالکل علٰحدہ رہی ہے اور ان پر مغربی افکار اور مغربی تجارت کا بہت اثر ہوا ہے۔

اس تحریک کا اصل بانی سن یات سن تھا کینٹن کے قریب اس کا مکان تھا اور فطرتاً دمقراطی (Democrat) تھا، یہ چاہتا تھا کہ چین کی استبدادی حکومت جمہوریت میں تبدیل کیجائے، چنانچہ ۱۹۱۱ء میں ایک ہنگامہ اُس نے اس قسم کا پیدا کیا لیکن رشوت اور عسکری قوت سے اُسے دبا دیا گیا۔ اس کے بعد سن یات سن نے ۱۹۱۷ء میں بمقام کنٹن ایک مستقل حکومت اپنے نصب العین کے لحاظ سے قایم کی۔ اس کے بعد ۷ سال تک وہ اور زندہ رہا اس دوران میں اس قدر مصائب و تکالیف اس نے برداشت کیں کہ مشکل سے اُس کو کامیاب کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر کوئی کامیابی اس کو حاصل ہوئی تو یہ کہ اب اس کی موت کے بعد ہر شخص اس کی عزت کرتا ہے۔ اور اس کے بوئے ہوئے تخم کو بار آور دیکھنے کا آرزومند ہے۔ چنانچہ اس وقت کنٹن کی حالت اس امید کی کامیابی کا آئینہ ہے کہ وہاں حزب وطنی

نے جوسن یات سن کی نام لیوا ہے کیسا معقول انتظام کیا ہے اور چین کے دوسرے شہروں کے مقابلہ میں وہاں کا انتظام کیسا مکمل، کس قدر مہذب وترقی یافتہ نظر آتا ہے۔

اس جماعت میں وہی شخص شریک ہوسکتا ہے جو دمقراطیت، وطنیت اور جمہوریت کا حلف اُٹھائے اور پڑھنا لکھنا جانتا ہو اس وقت تک اس جماعت میں ایک لاکھ سے زاید افراد داخل ہو چکے ہیں۔ یہی جماعت برطانیہ کی سب سے بڑی دشمن تسلیم کی جاتی ہے۔ اور روس کے اثر سے بڑی حد تک متاثر ہے۔

ہرچند اس وقت تک تمام ملک چین میں ہم آہنگی پیدا نہیں ہوئی ہے اور نہ اتنے بڑے ملک میں اس قدر جلد اس کا امکان ہے۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ اب یہ تحریک وہاں کامیاب ہو کر رہیگی اور ہندوستان کی طرح اسپر وہ دور نہیں آئے گا جس کیلئے دوبارہ حشر کی ضرورت ہے۔

کائنات کی شعاعیں اور عناصر کی تخلیق

نور کتنا ہی تیز وشدید ہو لیکن ایک باریک سا ورق کاغذ کا بھی اس کے لئے حجاب ہوجاتا ہے۔ ۱۸۹۴ء تک یہ حقیقت مسلمہ عام تھی لیکن ۱۸۹۵ء میں ایک اور شعاع دریافت ہوئی جو نور آفتاب سے زیادہ قوی تھی اور جو گوشت اور لکڑی کے اندر سے بھی نفوذ کرجاتی ہے۔ اس کا نام شعاع رنتجنی ہے۔ یہ شعاع باوجود اس قدر قوی ہونے کے سونا، ہڈی اور سیسہ میں بالکل نفوذ نہیں کرسکتی۔

لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ فضا سے ایک اور شعاع اس قیامت کی پیدا ہوتی ہے جو سیسہ کی ۱۷۔ انچہ کی موٹی تختی سے سے بھی گزرجاتی ہے۔ یعنی یہ شعاع رنتجنی شعاع سے ۴۰۰ گنا زیادہ قوی ہے۔

اس شعاع کے دریافت میں ایک جرمنی، ایک امریکی اور دو سوئٹزرلینڈ کے دماغ مشترک تھے۔

یہ شعاعیں نہ صرف فضاء ارض سے باہر بلکہ کہکشاں سے بھی پرے جو فضاء ہے وہاں سے آتی ہیں۔ اور اس سے یہ امر ثابت ہوتا ہے کہ عمل تکوین اب بھی کائنات میں جاری ہے اور وہ دقیق ذرات جو مادہ کی تخلیق کا باعث ہوتے ہیں اب بھی اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں۔

پروفیسر ملکن کا بیان ہے کہ ماورا ءنجوم جواہر ہڈروجین اور ہلیوم کے چار عناصر بنتے ہیں۔ آکسیجن جو حیات کے لئے ضروری ہے، مگنیزیم جو روشن ہوجاتی ہے اور جس کی روشنی میں رات کو تصویریں لیجاتی ہیں سلکون جو ریت اور شیشہ کی ترکیب میں داخل ہے اور چوتھے لوہا۔

امریکہ کی آبادی

یکم جولائی کی مردم شماری سے ثابت ہوتا ہے کہ امریکہ میں اس وقت ۱۲۰ ملین (۱۲ کرور) آدمی پائے جاتے ہیں۔ ۱۹۲۰ء میں یہاں کی آبادی ساڑھے دس کرور تھی۔ گزشتہ ۸ سال میں ڈیڑھ کرور آبادی بڑھ گئی۔ جس کا بڑا سبب وہاں کا محکمہ حفظان صحت ہے جو شہروں کی صفائی اور امراض کے دور کرنے کی تدابیر میں پوری سعی کرتا ہے اور دوسرا سبب وہاں کی ماؤں کا تعلیم یافتہ ہونا ہے جو بچوں کی پرورش کے اصول کو

جاتی ہیں اور ان کی عمر طبعی تک پہونچنے میں معاون ہوتی ہیں۔

کتابیں فلم کی صورت میں ڈاکٹر ہونٹی نے جو برقی کمپنی کا مہتم ہے اس نے فلم بنانے کا ایک ایسا طریقہ ایجاد کیا ہے جس کی مدد سے تمام کتابیں بجائے کاغذ پر چھپنے کے فلم میں منقوش ہونگی اور جن کا مطالعہ بجائے آنکھ کے کان سے ہوا کرے گا۔ اس سے نہ صرف یہ فائدہ ہوگا کہ وقت کم صرف ہو گا بلکہ دماغ پر بھی زیادہ زور نہ پڑے گا۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ ان کتابی فلموں کی قیمت بھی معمولی کتابوں کی قیمت کی طرح ہوگی اور ہر لاسلکی دوکان سے بلسکیں گی۔

کپڑے کے ہوائی جہاز جرمنی کے ایک سائنس داں نے لکڑی اور کپڑے کو مختلف دہاتوں کے پانی میں غسل دیکر فولاد ہی کی طرح مضبوط بنا دینے کے کامیاب تجربات دکھائے تھے خیال کیا جاتا ہے کہ دھات کے پانی میں غسل دیئے ہوئے کپڑے کو اب ہوائی جہازوں کی تعمیر میں صرف کیا جائیگا اور اس طرح نہایت مضبوط مگر ہلکے ہوائی جہاز تیار ہونے لگیں گے۔ ان میں پیٹرول رکھنے کے خانوں کو ہر قسم کے خطرات سے محفوظ بنا دینے کا انتظام کر لیا گیا ہے۔

گرافون کے نئے ریکارڈ گرافون کے نئے ریکارڈ تیار ہوئے ہیں جو بہت باریک ہیں اور اس درجہ ملایم ہیں کہ اگر انہیں لپیٹ کر کسی نلکی میں رکھ لیا جائے تو انھیں کوئی نقصان نہیں ہوپختا یہ ریکارڈ فروخت کے لئے بازار میں آنے والے ہیں۔

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴　　　　جلد ۱۴ - شمارہ ۳



لکھنؤ سے ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے قیمت سالانہ صہ ہندوستان سے باہر علاوہ محصول سعہ

فہرست مضامین ستمبر ۱۹۲۸ء

مضمون	مصنف	صفحہ
ملاحظات		۲
قایم چاندپوری	ابوالنعم سعیدی بی اے	۹
فلسفۂ مذہب	سید مقبول احمد بی اے	۲۹
من درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال (فسانہ)	مجنوں گورکھپوری	۴۱
شاہان بہمنیہ	تمکین کاظمی	۵۹
باب المراسلۃ والمناظرۃ		۶۲
باب الاستفسار		۷۶
حصۂ نظم :-	اختر شیرانی	۸۵
"	دلی	۸۷
"	محو	
"	امین حزیں	۸۹
غزلیات :-	فراق گورکھپوری	۹۱
"	فرخ بنارسی	
معلومات و اقتباسات		۹۲-۹۶

خط و کتابت میں نمبر خریداری کا لکھنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا خط پر ٹکٹ لگانا، اسے یاد رکھئے۔ "منیجر"



اڈیٹر۔ نیاز فتحپوری

جلد ۱۴	ستمبر ۱۹۲۸ء	شمارہ ۳

ملاحظات

گزشتہ ماہ کے تمام ان واقعات میں جن کو سیاسیات ہند سے خاص تعلق ہو دو واقعے اس قدر اہم ہیں کہ اگر کبھی "تاریخ آزادی ہند" مرتب کی گئی تو شاید اُنھیں دونوں کو "استعماری سیاسیات" کا سنگ بنیاد قرار دیا جائے گا۔

صوبۂ بمبئی کی حکومت ایک آبادی میں جس کا نام بردولی ہو، لگان میں اضافہ کا اعلان کرتی ہو، غریب کسان جن کی تمام اُمیدوں کا مرکز ان کی کاشت ہوا کرتی ہو، اس ناجائز حکم کے خلاف بصد الحاح وزاری احتجاج کرتی ہو، لیکن حکومت و سلطنت جس کے ہاتھ ہمیشہ ہر ملک و زمانہ میں خون سے رنگین نظر آتے ہیں، فریاد وزاری کی کوئی پروا نہیں کرتی اور خانماں بربادی اور قید و بند کی سزائیں، جو بڑا ذریعہ مستبد حکمرانی کی کامیابی کا ہی ان غریب کاشتکاروں پر مسلط کر دی جاتی ہو، اور یہ خاموشی کے ساتھ اس کو برداشت تو کر لیتے ہیں۔ لیکن حکومت کے فیصلہ کو ناجائز مان کر خود اپنے ہاتھوں سے وہ چیز پیش نہیں کرنا چاہتے جو اُن سے بارہا اور ہمیشہ بجبر چھینی گئی۔ خدا کا ایک بندہ (مسٹر پٹیل) اس مظلوم جماعت کا قائد بنکر اس مقدس جذبہ کی حمایت میں اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور بغیر کسی ہنگامہ و فساد، شور و شر اور فریاد وزاری کے مصائب جھیلنے پر سب کو آمادہ کر دیتا ہو۔ پھر دنیا میں تھپڑ کا جواب گھونسے سے، خنجر کا جواب شمشیر سے تو دیا جا سکتا ہو، لیکن اگر کوئی ہماری ضرب کے

سامنے اپنا سر جھکا دے، تیغ و تفنگ کو دیکھکر اپنا سینہ عریاں کردے، جو خود اپنے ہاتھ سے دشمن کے تیر دستان اپنے دل میں پیوست کرلے، تو پھر اس کا جواب ہتیار ڈالنے کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور یہی وہ اصل تعلیم تھی جسے مہاتما گاندھی نے اول اول پیش کیا تھا اور جواب اسی مقام پر کامیاب ہوئی جہاں اب سے پہلے وہ ناکامیاب رہی تھی۔

بمبئی کی حکومت نے، ولایت کے ان خداوندان پارلیمنٹ نے جن کے ہاتھ میں ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہے صاف صاف کہدیا کہ کسانوں کا یہ خاموش مقابلہ ایک ایسی غیر آئینی جنگ ہے جس کو حکومت ہند کبھی برداشت نہیں کر سکتی کیونکہ اس سے اس کے شاہانہ اقتدار کو صدمہ پہونچتا ہے۔ لیکن اگر ادھر یہ عزم ملوکانہ تھا، تو اس طرف بھی یہ عاجزانہ اصرار تھا کہ:-

سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

ایک ہفتہ تک ہندوستان متحیرانہ نتیجہ کا انتظار کرتا رہا کہ دیکھئے حکومت کی قہرمانیت کونسا طریقۂ سزا اختیار کرتی ہے لیکن اس کے بعد ہی دفعتہً یہ خبریں آنے لگیں کہ صوبۂ بمبئی کی حکومت اور حکومت ہند باہم مشورت پر آمادہ ہیں اور آخر کار جب اس منظر کے سامنے سے پردہ اُٹھا تو حقیقت یہ نظر آئی کہ جسے دنیا غالب سمجھتی تھی وہ مغلوب ہے اور مغلوب غالب۔ قیدی آزاد ہوگئے، زمینیں واپس دیدی گئیں، اور اضافۂ لگان کے متعلق تحقیقات شروع کردی گئی کہ آیا وہ کسی حد تک جائز بھی ہے یا نہیں۔

اگر حق و صداقت کبھی مغلوب ہو جائیں تو کذب و باطل کے مقابلہ میں انکا سب سے بڑا حربہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ وہ ایک عزم استوار کے ساتھ اپنے مرکز پر اپنے اصول کی حمایت پر قایم رہیں، یہاں تک کہ کذب خود اپنی پردہ دری کرلے اور باطل خود شرماکر منھ پھیرلے۔

پھر بردولی کا یہ واقعہ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے جسکو نظر انداز کیا جاسکے بلکہ اس کے ساتھ ایسے اہم و عظیم الشان نتائج وابستہ ہیں کہ اگر ہماری موجودہ نسل نے اس کی پرواہ نہ کی تو آنے والی نسلیں جب اپنی آزادی کی داستان سنایا کرینگی تو اس کی ابتدا اسی بردولی کے واقعہ سے ہوا کریگی

دوسرا واقعہ جو اس سے کم اہم نہیں، وہ ہے جو ۲۸ اگست کو لکھنؤ میں رونما ہوا اور جسے آل پارٹیز کانفرنس کا اجتماع کہتے ہیں۔

نہرو کمیٹی نے جو رپورٹ "مستقبل ہند" کے متعلق مرتب کی ہے، خواہ اس میں کتنے ہی نقائص کیوں نہ ہوں، لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ تمام اقوام ہند کو کسی ایک مرکز پر لانے کے لئے اس سے بہتر کوئی تدبیر ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

ہندوستان کی سب سے بڑی بدبختی یہ ہے کہ یہاں اب تک سیاسیات و مذہب میں تفریق نہیں ہو سکی اور وہ ملکی آزادی کو مذہبی آزادی سمجھ رہے ہیں، اس زمانہ میں جو تفریق ہندو مسلمانوں کے درمیان بعض نہایت ہی معمولی مسائل مذہبی پر پیدا ہوگئی ہے، وہ ایسا بدنما داغ ناصیۂ انسانیت کے لئے ہے کہ اس کو لیکر منہ دکھانے کی جرأت ہم میں نہیں ہو سکتی۔ پھر اس کا بہترین علاج تو یہی ہو سکتا ہے کہ ہر قوم اپنی اپنی جگہ مذہبی رواداری کو زیادہ فراخ حوصلگی اور وسعت نظر سے دیکھے، لیکن چونکہ یہ فی الحال ممکن نہ تھا اس لئے دوسری تدبیر یہی ہو سکتی تھی کہ کم از کم سیاسیات میں ان کے لئے کوئی غرض

مشترک پیدا کر دیجائے

ولایت کے ارباب حل وعقد کا سب سے بڑا اعتراض یہی تھا کہ ہندوستان کا مطالبہ ہی آج تک متعین نہیں ہوسکا ہو کہ اس پر غور کیا جائے سو یہ اعتراض اس اجتماع نے دور کر دیا اور ہندوستان کی تمام جماعتوں نے متفق و ہم آہنگ ہو کر وہ اسکیم پیش کر دی جو آزادی ہند کی منزل سے قریب تر پہونچا دینے والی ہو۔ یقیناً ڈومینین ہوم رول اہل ہند کی خواہشات کا منتہائے نظر نہیں ہو، لیکن نہرو کمیٹی کے مطالبات بھی ہمارے لئے آخری نقطہ کا درجہ نہیں رکھتے۔ آج ہم ایک چیز کا مطالبہ کرتے ہیں تو اس کے معنے یہ نہیں کہ کل ہم کوئی اور مطالبہ نہیں کر سکتے۔ پھر اگر فی الحال ہندوستان کو وہی مرتبہ ملجائے، جو اسٹریلیا، آئرلینڈ وغیرہ کو حاصل ہے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ آزادی کا دوسرا قدم اُٹھانے کے لئے ہم کو اجازت لینے کی ضرورت نہ پڑے گی اور اگر راہ میں موانع حائل ہوئے تو اُن کے دور کرنے کے لئے ہم اپنے ہاتھوں سے بھی کام لے سکیں گے۔ نہرو کمیٹی کا سب سے زیادہ کمزور و نامناسب پہلو یہ ہو کہ تمام صوبوں کو مرکزی حکومت کا ماتحت قرار دیا گیا ہو۔ اور اس طرح گویا وہ چنگاری رہنے دی گئی ہو جو کسی وقت ہندو مسلمانوں میں پھر آتش جنگ مشتعل کر سکتی ہو، لیکن اُمید ہے کہ جب یہ اسکیم عملی صورت اختیار کریگی اس وقت یہ نقص بھی دور ہو جائیگا

یہ بھی عجیب بات ہو کہ جس تاریخ کو ہندوستان میں اتحاد و یکرنگی کا یہ منظر پیش تھا، اسی تاریخ میں دول مغرب، میثاق ۔کیلاگ پر دستخط کر رہی تھی تاکہ عفریت جنگ سے ہمیشہ کے لئے دنیا کو آزاد کر دیں، کیا یہ عہد میثاق حقیقتاً دنیاوی ہوس سے جدا ہو کر خلوص و صداقت کے ساتھ کیا گیا ہے، کیا برطانیہ کا اس میثاق پر دستخط کرنا واقعی سچائی پر مبنی ہو۔ یہ معلوم کرنے کے لئے ہم کو زیادہ انتظار کی ضرورت نہیں کیونکہ اہل ہند جو مشترک مطالبہ پیش کر رہے ہیں وہ اس کا بہترین معیار ہو۔ اور اگر حکومت برطانیہ نے واقعی میثاق کیلاگ پر خلوص کے ساتھ دستخط ثبت کئے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہمارے مطالبات کو رد کر دے۔ اور رمزے مکڈانلڈ کی اس پیشین گوئی کو غلط ثابت کر دے کہ "ہماری کامن ولتھ میں بہت جلد ایک ایسے ملک کا اضافہ ہونے والا ہے جس کا نام ہندوستان ہو"

شاہ افغانستان کا مع اپنی ملکہ کے آزادانہ سیاحت یورپ کرنا، تاریخ افغانستان کا بالکل پہلا واقعہ ہو، لیکن جس طرح کسی ایک غیر متوقع واقعہ کے ظہور پر پے در پے بہت سے عجیب و غریب واقعات کا ظہور ہونے لگتا ہو، اسی طرح امیر امان اللہ خان شاہ افغانستان اور ان کی ملکہ ثریا بیگم کے واقعہ سیاحت یورپ نے بہت سے ایسے واقعات پیش کر دیئے ہیں جن پر مغرب و مشرق دونوں کو حیرت ہونی چاہئے۔

افغانستان ایسے جاہل و غیر ترقی یافتہ ملک کا فرمانروا تمام ممالک یورپ کا سفر کرے اور کسی ایک جگہ بھی وہ کوئی ایسی غلطی نہ کرے جس سے اُس کے شاہانہ مرتبہ اور سیاسی اغراض کو صدمہ پہونچے، یقیناً بہت حیرت انگیز واقعہ ہو، برطانیہ قوت و ثروت، صنعت و تجارت، علم و دولت اور ہر اس چیز کی نمائش کرتا ہو جو ایک انسان کو مرعوب کر سکتی ہو لیکن کوہستانی

علاقہ کا وحشی فرمانروا سب کچھ دیکھتا ہے اور غیر متاثرانہ طور سے واپس آتا ہے، فرانس، جرمنی، روس، غرض ہر ملک اپنی انتہائی قوت صرف کر دیتا ہی کہ اس نوجوان فرمانروا کو اپنی طرف مائل کر لیا جائے لیکن آج تک کسی کو یہ علم حاصل نہ ہو سکا کہ وہ کس غرض سے گیا تھا اور کس حد تک کامیاب واپس آیا۔ یقیناً یہ ڈپلومیسی ایک افغانی دماغ سے بہت بعید معلوم ہوتی ہی، لیکن واقعہ کو کیونکر مٹایا جا سکتا ہی، حقیقت کو کیسے محو کیا جا سکتا ہے۔ ایسا ہوا اور سب نے دیکھا۔

پھر افغانستان واپس آتے ہی انکا جرگہ کی ترتیب دینا، یعنی پارلیمنٹری اسلوب حکومت کی بنیاد ڈالنا، تعلیم نسواں کی طرف خاص توجہ کرنا، تعدد ازدواج کو ممنوع قرار دینا، عورتوں سے پردہ ترک کرا دینا۔ ریل جاری کرنے کی تدابیر اختیار کرنا علوم و فنون کی تعلیم کے لئے فرزندان افغانستان کو باہر بھیجنا، تعلیم عامہ کی طرف سرگرمی سے قدم اٹھانا، ترتیب عسکری میں نئی روح پھونکنا کیا ان سے ہم اس آزاد خیال اور جواں بخت فرمانروا کے آئندہ عزایم کا پتہ نہیں چلا سکتے۔ اگر اسی کیساتھ اس خبر کو بھی صحیح مان لیا جائے کہ مصطفےٰ کمال صدر جمہوریۂ ترکی سے افغانستان ازدواجی رشتہ قایم کر رہا ہی اور ادہر ایران سے عصبیت مذہبی دور ہو کر زیادہ وسعت نظر سے کام لیا جا رہا ہی تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس کو ہم مشرق کے لئے فال نیک نہ خیال کریں اور ہندوستان بھی اس ماحول میں آزادی کے صحیح جذبات اپنے اندر نہ پیدا کرے۔

کہا جاتا ہی کہ ہندوستان کی مالی حالت بہ نسبت پہلے کے بہت بہتر ہو گئی ہی یعنی اگر سنہ ۱۸۷۱ء میں فی کس بیس روپیہ سالانہ کا اوسط تھا تو اب وہ ۷۴ تک پہونچگیا ہی، جیسا کہ ذیل کے نقشہ سے معلوم ہوگا:-

سنہ ۱۸۷۱ - ۲۰　　　سنہ ۱۸۸۱ - ۲۷
سنہ ۱۹۰۱ - ۳۰　　　سنہ ۱۹۱۱ - ۵۰
سنہ ۱۹۲۱ - ۷۴

لیکن اگر اسی کے ساتھ گرانی کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ حقیقت بھی اسی کے ساتھ نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہی کہ اگر آمدنی ۲۰ سے ۷۴ تک پہونچگئی ہی تو خرچ اس سے کہیں زائد ہو گیا ہے یعنی اگر پہلے اشیاء کی ارزانی کی وجہ سے ۹۳ خرچ ہوتا تھا تو اب بجائے اس کے ۳۷۸ ہو گیا۔ ذیل کے نقشہ سے مصارف کا تدریجی اضافہ معلوم ہو سکیگا:-

سنہ ۱۸۷۱ - ۹۳　　　سنہ ۱۸۸۱ - ۱۰۰
سنہ ۱۹۰۱ - ۱۲۰　　　سنہ ۱۹۱۱ - ۱۴۰
سنہ ۱۹۲۱ - ۳۷۸

کیا ایسی صورت میں بھی یہ حکم لگایا جائے گا کہ ہندوستان دولتمند ہو گیا ہی۔

مصر و برطانیہ کے تعلقات میں جو پیچیدگی پیدا ہوگئی ہے اس کا سلجھنا آسان نہیں ہے۔ جنگ سے پہلے مصر سلطنت ترکی سے متعلق تھا لیکن برائے نام۔ دوران جنگ میں برطانیہ نے اپنی حمایت میں لے لیا اور صلح کے بعد وہاں اعلان ملوکیت ہوگیا اور ایوان پارلیمنٹ قایم کیا گیا۔ ہنوز وہ کوئی قابل اطمینان صورت اختیار نہ کر سکا تھا کہ سوڈان کے قصہ نے اس کو ضرب لگائی اور اب برطانیہ کی نظر نیک نے اس کو پھر اب سے پچیس سال قبل اٹھا کر پھینک دینا چاہا ہے۔

ہندوستان کے قبضہ کے لئے جو وسیع جال برطانیہ نے پھیلایا ہے، اسی کا ایک زبردست پھندا نہر سویز کا اقتدار ہے جس کی بقا کی صورت صرف یہ ہے کہ مصر پر اثر قایم رکھا جائے۔ ادھر اہل مصر سمجھتے ہیں کہ مصر عبارت ہے صرف دریائے نیل سے کیونکہ ان کے ملک کی کاشت کا واحد ذریعہ وہی ہے۔ اس لئے اگر اسوقت تک کوئی وزارت وہاں کامیاب نہیں ہوئی تو جائے حیرت نہیں کیونکہ وہاں آزادی مفقود ہے اور ہنوز مصر اہل مصر کا نہیں ہوسکا۔

حال ہی میں امریکہ نے مصر کو ایک خود مختار سلطنت سمجھکر اس سے معاہدہ کرنا چاہا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا امریکہ سے مصر کا کوئی معاہدہ اس وقت تک قابل لحاظ سمجھا جا سکتا ہے جب تک خود مصر یہ نہ محسوس کرے کہ اس کے ہاتھ پاؤں واقعی آزاد ہیں اور وہ اپنے ملک کی ترقی کے لئے، اپنی قوم کی بقا و تحفظ کے لئے بالکل ذمہ دارانہ طور پر کوئی طرز عمل اختیار کر سکتا ہے۔

بہرحال مصر اگر کسی قربانی کے لئے طیار نہیں تو اس کو انتظار کرنا چاہئے، حتیٰ کہ خود برطانیہ کے اندر کا انقلاب کوئی صورت بہتری کی مصر کے لئے پیدا کرے۔

جو صورت مصر میں ہے تقریباً وہی عراق میں پیدا ہے، شاہ فیصل ایک برطانوی مشیر کے ہاتھ میں ہے اور ابن سعود کے ساتھ برطانیہ کے وہ تمام مواعید جنھوں نے اس کے اندر روح پھونک رکھی تھی بیکار ثابت ہورہے ہیں سرزمین عراق وہ جگہ ہے جہاں چھ ہزار سال سے صرف اہل عرب ہی کا تصرف اقتدار رہا ہے اور کسی دوسری قوم کو وہاں حکومت کرنے کا فخر حاصل نہیں ہوا۔ لیکن برطانیہ اب یہاں کی خصوصیت کو محو کرنا چاہتا ہے، کیونکہ سرزمین عراق کا میدانی علاقہ ہوائی جہازوں کا اسٹیشن بننے کے لئے بہت موزوں ہے اور اس سے بہتر مقام انگلستان و ہند کے مابین ہوائی عسکریت کا مرکز بننے کے لئے کوئی دوسرا نہیں ہے

الغرض ہندوستان کا سوال ایسا عجیب و غریب سوال ہے کہ ایشیا اور یورپ کے ہر حصہ پر اس کا اثر پڑ رہا ہے، اس لئے وہ دن بھی کیسا مبارک دن ہوگا جب ہندوستان کی آزادی کے ساتھ اور بھی بہت سے حصے کرۂ زمین کے الجھنوں سے پاک ہوجائیں گے۔

یورپ کی سرزمین بھی کسقدر مجموعۂ اضداد ہے، ایک طرف اندرونی بے چینی اور خلش کا یہ عالم ہے کہ سرمایہ اور عمل کی جنگ نے آبادی کے ایک معقول حصہ کو مضطرب بنا رکھا ہے، یہاں تک کہ شروع اگست تک صرف ایک ملک انگلستان میں بیکار مزدوروں کی تعداد

۹۰۰ ۲۸۳ تک پہونچ چکی تھی۔ لیکن دوسری طرف تعیش کا یہ عالم ہی کہ گویا وہ کسی تلخ احساس کے لئے پیدا نہیں ہوئی ہی۔ حال ہی میں پیرس کے گریون میوزیم میں ایک ایسا قصر طیار کیا گیا ہی جسے دار العجائب یا سحر کدہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا اس کے اندر پہونچتے ہی ایک شخص حیران رہجاتا ہی کہ وہ کہاں پہونچ گیا۔ راجہ اندر کا اکھاڑا، الف لیلہ کے عجائب، بوستان خیال کی طلسم بندیاں، سب دفعتہً اس کی نگاہوں سے گزر جاتی ہیں اور وہ مبہوت و متحیر ہوکر دیکھنے لگتا ہی کہ یہ کیا تماشہ ہی۔

کبھی اس کو یہ نظر آتا ہو کہ وہ کسی ہندو پرستشگاہ میں ہی جہاں سوائے مندروں کے کچھ نہیں ہی، کبھی وہ دیکھتا ہی کہ عہد اسلامی کے بیشمار محل اس کے سامنے ہیں کبھی وہ اپنے آپ کو لق و دق صحرا میں پاتا ہی، کبھی منظر باغ و بہار میں، کبھی وہ بارش نور کا لطف اُٹھاتا ہی اور کبھی ظلمات کا، اور یہ سب کرشمہ ہی روشنی کا جس کے ذریعہ سے ۵۴ مختلف منظر پیدا کئے جاتے ہیں۔ بیان کیا جاتا ہی کہ ۲۵۰۰ مختلف قسم کے کہربائی روشنیاں ان مناظر کے پیدا کرنے کیلئے استعمال کی جاتی ہیں۔

صوبۂ بہار میں ہند وخواتین کی ایک جماعت نے پردہ کے خلاف آواز بلند کی ہی۔ اور ایک باقاعدہ انجمن قایم کی گئی ہی تاکہ پردہ کی مخالفت میں تمام ہندوستان کی عورتوں کو ہم آہنگ بنایا جائے اور اس بلا سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کی جائے۔

غالباً یہ پہلا عملی اقدام ہی جو پردہ کے باب میں ظاہر کیا گیا ہی اور اُمید ہی کہ سرزمین ہند کی خواتین بلا تفریق قوم و مذہب اسمیں حصہ لیکر اس تحریک کو واقعی مفید بنانے میں پوری کوشش کریں گی۔

ہندوستان کے طبقۂ نسواں میں یہ تحریک آہستہ آہستہ اس قدر مقبول ہو چکی ہی کہ اب پردہ اُٹھا دینے کے برکات سمجھانے کے لئے دلائل و براہین پیش کرنے کی ضرورت نہیں رہی۔ اب تو صرف اس قدر کرنا ہی کہ جو لوگ اس کے مخالف ہیں وہ عمل سے اپنی مخالفت ثابت کریں اور جو عورتیں اس کو اپنے لئے مضرت رساں سمجھتی ہیں وہ سختی کے ساتھ اپنے مردوں سے مطالبہ کریں۔ اور اور اس وقت تک کہ یہ مطالبہ پورا نہ کرالیں چین سے نہ بیٹھیں، لیکن یہ صرف ان عورتوں کے لئے جائز ہوگا جو سمجھتی ہیں کہ پردہ سے کیا مضرتیں ہیں اور وہ پردہ اُٹھنے سے کیونکر دور ہو سکتی ہیں۔ لیکن جن کو اس کی خبر نہیں ہی ان کے لئے یہی مناسب ہی کہ وہ پہلے اپنی جگہ اس مسئلہ پر اچھی طرح غور کرلیں اور پھر جو کچھ وہ مناسب سمجھیں کریں۔

آج کل ایک اہم مسئلہ کمسنی کی شادی کا ہی جس کے متعلق کوشش ہو رہی ہی کہ قانون کے ذریعہ سے اُس کو روکا جائے اس میں شک نہیں کہ کمسنی کی شادی نہیں بلکہ مواصلت خواہ وہ مرد ہو یا عورت، دونوں کے لئے حد درجہ مضر صحت ہی اور اس کا سد باب ہونا چاہئے، لیکن اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ نابالغ کی شادی کے متعلق بھی ولی کے اختیارات کو ناجائز قرار دیا جائے اسلام میں جو طریق آج کل رائج ہی اس میں اگر تھوڑی سی تبدیلی کردی جائے تو پھر کسی قانون کے بنانے کی ضرورت نہیں رہتی نابالغہ کے نکاح کے متعلق یہ مسئلہ ہی کہ اگر بالغ ہونے پر وہ نکاح کو قایم رکھنا نہ چاہئے تو نکاح فسخ ہوجائیگا۔ (بشرطیکہ

یہ شادی باپ یا دادا نے نہیں کی ہو) میری رائے میں اس شرط کو مٹا دینا چاہئے، ہر کمسنی کی شادی، بالغ ہونے کے بعد محتاج ہونی چاہئے، تصدیق ثانی کی اور اگر مرد و عورت دونوں عہد طفلی کی شادی کو قایم رکھنا چاہیں تو قایم رکھی جائے ورنہ نہیں۔ قانون کے ذریعہ سے اس کے روکنے کا میں بھی مخالف ہوں، کیونکہ اس طرح خواہ مخواہ ہم اپنے معاشرتی مسائل میں غیر جماعت کو دخل دیدیں گے۔ اور یہ مسئلہ آئندہ کے لئے بہانہ ہو جائیگا۔ ہمارے اور بہت سے معاملات میں ان کو در خور حاصل کرنیکا۔ اگر آج قانونی صورت سے اس کو ممنوع قرار دیدیا جائے گا تو بہت سی ان صورتوں میں جب کہ خاندانی یا دیگر مصالح کی وجہ سے کمسنی میں شادی کرنا ضروری ہوتا ہے، ہم کچھ نہ کر سکیں گے۔

میری رائے میں اس مسئلہ میں کسی قانون بنانے سے پہلے، نکاح و مواصلت کے فرق کو پوری طرح محسوس کر لینا چاہئے اور اسی کے ساتھ یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ کیا ہمارا اپنے گھر کے معاملات میں دوسرے کو پنچ بنانا ہماری قومی خودداری کی اہانت تو نہیں ہے۔

جولائی کے مہینے میں دو موتیں بہت سخت ہوئیں، ایک مولوی وحید الدین سلیم کی جو حیدر آباد کے جامعۂ عثمانیہ میں پروفیسر اردو کی حیثیت سے مامور تھے اور دوسرے مولانا شاہ عزیز اللہ صفی پوری کی۔ وحید الدین سلیم کی علمی و ادبی خدمات ایسی نہیں ہیں کہ اُن کو آسانی سے فراموش کیا جا سکے۔ موصوف کی خدمات معارف کی اڈیٹری کی سر سید مرحوم کی سکریٹری ہونے کی، مسلم گزٹ کی ادارت کی، کافی نقوش لوگوں کے دلوں میں چھوڑ گئی ہیں اور اس لئے ہر حلقہ میں انکی موت پر اظہار افسوس کیا گیا ہے۔

میرا اور سلیم صاحب کا ساتھ لاہور میں کچھ عرصہ تک رہا ہے اور میں کہ سکتا ہوں کہ وہ انسان ہونے کی حیثیت سے بھی عجیب چیز تھے مرحوم سرطان کے مرض میں مبتلا ہو گئے تھے اور یہیں لکھنؤ کی سرزمین میں انکا انتقال ہوا۔

مولانا عزیز اللہ شاہ صفی پوری عہد آخر کے بہترین فارسی جاننے والوں میں تھے اور نظم و نثر دونوں میں استادانہ قدرت انشا رکھتے تھے مرحوم کی متعدد کتابیں شایع ہو چکی ہیں، جن کا مختصر ذکر نگار کے صفحات میں ہو چکا ہے۔ مولانا ایک گوشہ نشین اور صاحب دل بزرگ تھے جنہوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ وطن کے گوشۂ انزوا میں تزکیۂ نفس اور تصفیۂ اخلاق کیلئے بسر کر دیا، مولانا کا حلقۂ ارادت بھی بہت وسیع ہے لیکن عام پیروں کی طرح کبھی اُنھوں نے طلب دنیا کا جال نہیں پھیلایا اور اپنے اخلاق و عادات سے اہل صفہ کی یادگار قایم کر گئے مجھے معلوم ہوا ہے کہ مولانا کی بعض کتابیں یونیورسٹی کے نصاب میں داخل ہو گئی ہیں اگر یہ صحیح ہے تو خیر، ورنہ اب ارباب علم کو اس طرف توجہ کرنی چاہئے اور انکی تصانیف کے ساتھ پورا انصاف کر کے اُن سے طلبہ کو استفادہ کا موقع دینا چاہئے۔

میں عرصہ سے ارادہ کر رہا ہوں کہ ان کی تمام تصانیف پر ایک جامع تبصرہ کروں، لیکن اس وقت تک اس کی فرصت نصیب نہیں ہوئی۔ مولانا مرحوم کے تبحر فارسی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ غالب ایسے بد دماغ شخص کو بھی تعریف کرنی ہی پڑی۔

نیاز فتحپوری

قایم چاندپوری

(بہ سلسلۂ ماسبق)

حیات انسانی تفکرات سے معمور ہے، کون ہے جو فکر سے آزاد ہے، کسی کو زر کی فکر ہے تو کسی کو جاہ و منصب کی، کسی کو کسی اور شے کی بہر حال جو ہے وہ کسی نہ کسی فکر میں مبتلا ہے، انسان لاکھ چاہتا ہے کہ مصائب و تکالیف کے شجر خاردار سے اپنے دامن کو بچائے رکھے اور دنیا میں اطمینان قلب، فراغت، آرام اور آسودگی حاصل ہو لیکن اس کی تمنا پوری نہیں ہوتی، جوں جوں وہ بچنا چاہتا ہے اسیقدر وہ علایق دنیی میں پھنستا جاتا ہے، اور افکار روزگار اسے لمحہ کے لئے بھی آزاد ہونے نہیں دیتے غرض جہاں کہیں بھی رہا غم دنیا سے آسودہ نہ رہا گھر چھوڑ کر جنگل کو آباد کیا تو وہاں یہ رونا ہے ؎

کوہ اور دشت میں بھی ہم نہ رہے آسودہ　　ماتم قیس کیا یا غم فرہاد کیا

کمبخت دل کا معاملہ ہی نرالا ہے جہاں کسی حسین مہ جبین کا رُخ زیبا دیکھا کہ مچل گیا، قابو سے باہر ہو گیا۔ بیٹھے بٹھائے ایک آفت مول لی، اب ہر وقت اس کا خیال ہے اور اسی کا دھیان، حالت ناگفتہ بہ ہو جاتی ہے، طاقت شکیبائی رخصت ہو جاتی ہے، لاکھ کوشش کیجاتی ہے کہ کسی طرح دل کو تسکین دلاسا دیا جائے لیکن سعی لاحاصل ہے دیکھئے شاعر نے اس چھوٹی بحر میں کس عمدگی کیساتھ اپنی حالت کا نقشہ کھینچا ہے واقعہ تو یہ ہے کہ اس سادگی میں وہ جاذبیت اور معنی آفرینی ہے کہ چوٹ کھائے ہوئے دل ہی اس لذت کو اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں، ملاحظہ ہو ؎

درد دل کچھ کہا نہیں جاتا　　آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا

خودداری کا خیال بھی ایک پاکیزہ جذبہ ہے، وضعدار طبیعت آئین وادب کا بیحد لحاظ رکھتی ہے لیکن جب دیوانے بنے کسی کی نگاہ ناز کے کشتہ ہوئے اس وقت سے حالت بھی بدل گئی۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ہر روز کے آنے جانے سے عزت کم ہو جاتی لیکن اب دل کا معاملہ ایسا بیڈھب آپڑا ہے کہ ہر وقت کوئے جاناں کی چھاننے کی فکر ہے تاکہ رُخ زیبا کا درشن ہو جائے، اسی تمنا میں بار بار جاتے ہیں، چکر لگاتے ہیں، اب نہ وہ وضعدار طبیعت رہی نہ وہ خودداری کا خیال، البتہ جب غیرت اس حرکت کی طرف توجہ دلاتی ہے تو یہ جواب دیا جاتا ہے کیا کریں کمبخت دل جو کچھ دکھائے اُسے ناچار دیکھنا پڑتا ہے معلوم نہیں کہ یہ اور کس قدر ذلیل و رسوا کرے، اور جو اصول زندگی ——— ہم نے اپنے ذہن میں قائم کر لئے تھے ان کی شکست وخلاف ورزی پر آمادہ کرے ؎

ہر دم آتے ہیں بھی ہوں نادم　　کیا کروں پر رہا نہیں جاتا

انسان کی زندگی عارضی ہے اور کل نفس ذائقۃ الموت کے اصول کے تحت سب فانی ہیں لیکن نادان انسان اس سے غافل ہو کر اپنی اس دوروزہ زندگی میں بڑے بڑے منصوبے سوچتا ہے اور وسیع و پختہ و سنگین عمارات بنواتا ہے، وہ نہیں جانتا کہ ابھی

اس کی آرزو بھی پوری نہیں ہونے پاتی کہ پیغام اجل آپہونچتا ہے ہم تو کس شمار و قطار میں ہیں۔ بڑے بڑے بادشاہان عالیجاہ مثل جمشید و فریدوں کے بنائے ہوئے قصر ہائے فلک روز آج سونے پڑے ہوئے ہیں، در و دیوار شکستہ ہو چکے ہیں اور زبانِ حال سے درس عبرت دے رہے ہیں، ؎

بناوے کوئی عمارت سو کس توقع پر　　پڑا ہے قصر فریدوں بن آدمی سونا

نامراد عاشق کا محبوبۂ دلنواز کے زلف گرہ گیر کا اسیر ہونا اصول عشق سے مانا گیا ہے دیکھئے اس زلف شبگوں جیسے پامال مضمون کو قایم نے کس شان سے باندھا ہے ؎

دل پا کے اس کی زلف میں آرام رہ گیا　　جس جا ہوئی غریب کے تئیں شام رہ گیا

قیس و فرہاد، مجنوں و وامق۔ بہت سے عاشق دنیا سے نامراد اُٹھے جس کسی نے اس کوچہ میں قایم رکھا وہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا، اس کا سینہ حسرت و یاس کا مدفن بنا، آرزو و تمنا دل میں لئے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوا، یہ بجید پر خار وادی ہے جس کسی نے اس کی طرف رُخ کیا اپنے دامن کی دھجیاں بنالیں، محبت وہ بری بلا ہے کہ جان ہی لیکر چھوڑتی ہے، عشق کا کوچہ مردم کشی میں بہت بدنام ہے، جوانی دیوانی ورغلا اور بہکا کر اس کوچہ کی طرف لیجاتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زیست کی امید باقی نہیں رہتی ہے، شاعر نے اسی امر کو واضح کیا ہے ؎

قایم آتا ہے مجھے رحم جوانی پہ تری　　مر چکے ہیں اسی آزار میں بیمار بہت

زندگی میں کوئی نہ کوئی مشغلہ ضرور ہونا چاہیئے، ایک وارفتہ کیلئے تو اوقات گزاری کیلئے شغل کی اس سے زیادہ ضرورت لاحق ہوتی ہے، تازہ تازہ جب محبت کا آزار تھا اس وقت آنکھوں سے آنسو کی ندیاں بہا کرتی تھیں لیکن اب یہ خشک ہو چکی ہیں۔ اس لئے شاعر کہتا ہے ؎

بے شغل نہ زندگی بسر کر　　گر اشک نہیں تو آہ سر کر

ان ایسے بیوفاؤں کی حالت کس عمدہ پیرایہ میں بیان کی ہے جو مال و زر کے گرویدہ ہیں انھیں محبت اور کسی کے خلوص سے کوئی غرض نہیں ہے ؎

اے دل برنگ غنچہ نہ مل گلرخوں سے تو　　اپنی گرہ میں اون کے کھلانے کو زر نہیں

کس قدر پاکیزہ شعر ہے، جذبات کو کس عمدگی سے ظاہر کیا ہے ؎

مجھے اس اپنی مصیبت سے ہی فراغ کہاں　　کسی سے چاہوں کہ صحبت رکھوں دماغ کہاں

ہماری گفتگو میں وہ اثر ہے کہ اچھے اچھے وحشی رام ہو جائیں اور ہمارا کلمہ پڑھنے لگیں، جس کسی نے ہماری باتیں سنیں وہ گرویدہ ہو گیا یوں کہئے کہ تسخیر قلوب کا یہ بہت اچھا نسخہ موجود تھا لیکن ستم تو یہ ہے کہ اس نسخہ کو آزمانے کا کمبخت نے موقع ہی نہیں دیا ہماری طرف مخاطب ہی نہیں ہوا۔ بے اعتنائی کا یہ عالم ہے کہ ہماری بات سننا تک گوارا نہیں، ہم کو اپنی شومی قسمت ہی سے شکایت ہے ؎

سنگ کو آب کریں پل میں ہماری باتیں لیکن افسوس یہی ہے کہ کہاں سنتے ہو

یہ بھی طرفہ تماشا ہے کہ ہزاروں عشوۂ و انداز سے دل تو لے لیا لیکن اب دل لینے کے بعد تیور ہی بدل گئے، سیدھے منہ بات تک نہیں کیجاتی ہے بلکہ جب ذرا الجھ جاتے ہیں تو نہایت متانت سے کہتے ہیں کہ در عدالت کھلا ہوا ہے جاؤ اور فریاد کرو ؎

دل مرا چھین کے کہتا ہے وہ دلبر قایم جی جہاں چاہے تمہارا مری فریاد کرو

دل چھیننے اور اپنے عشاق کے دایرہ کو وسیع کرنے کی خواہش فطری طور پر مہ جبینوں میں موجود ہوتی ہے، اُن کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ جو کوئی ان کے رُخ زیبا کی طرف نظر کرے اُن کی نگاہ ناز کا گھائل ہوجائے، اُن کو اس میں بڑا مزہ آتا ہے کہ عشاق کیسا تھ اپنی تفریح طبع کے لئے چھیڑ چھاڑ جاری رہے۔ جب دیکھتی ہیں کہ کوئی حسن سے متاثر نہیں ہوتا تو ناز و ادا، عشوہ و کرشمہ اور کبھی عجز و نیاز اور کبھی خنجر ابرو اور تیر نظر سے کام لیتی ہیں، غرض مختلف حربوں سے آراستہ رہتی ہیں جو ایک حربہ سے کام نہ چلے تو دوسرے حربہ سے کام لیا جائے، ؎

ناز و ادا کہیں کہیں عجز و نیاز ہے کس کس طرح سے یار مرا جلوہ ساز ہے

عاشق کی زندگی رنج و غم سے بھری ہوئی ہے، درد و الم، اور حزن و ملال کا ساتھ ہے، کشتی حیات تلاطم میں ہے، ہر وقت خطرہ کا خدشہ لگا ہوا ہے، صبح ہوتی ہے تو ایک تازہ مصیبت پیش آتی ہے اور شام ہوتی ہے تو ایک نئی آفت کا سامنا ہوتا ہے ؎

شام ہوتی نہیں اک دل پہ بلا آتی ہے صبح ہوتی نہیں اک جی پہ غضب آتا ہے

وادیِ الفت کا ایک تجربہ کار سیاح اپنے ذاتی مشاہدات کی بنا پر گرفتاران بلا کو یوں نصیحت کرتا ہے۔

مر جایئے کسی سے پر الفت نہ کیجئے جی دیجئے تو دیجئے پر دل نہ دیجئے

ملاحظہ ہو کس بیساختہ پن کے ساتھ شکایت کی ہے، زبان کی سلاست، طرز بیان کی خوبی قابل داد ہے، شعر کیا ہے جذبات دلی کا مظہر ہے ؎

گو ہم سے تم ملے نہ تو کچھ ہم نہ مر گئے کہنے کو بات رہ گئی اور دن گزر گئے

دل وقف یاس و حرماں ہو چکا ہے، اور طبیعت رنج و غم سہتے سہتے مردہ ہو گئی ہے، عیش و عشرت کی ہوس ہے اور نہ محفل نشاط کی خواہش باقی ہے ؎

کسے گلگشت گلشن کی ہوس ہے اسیری کا جگر پر داغ بس ہے

ناحق لوگوں نے گلشن کا تذکرہ چھیڑ دیا، بیچارا عاشق تو اسی حالت قفس میں مست تھا ؎

نہ پوچھو مجھ سے گلشن کی حقیقت برس گزرے کہ میں ہوں اور قفس ہے

دنیاوی تعلقات انسان کو عقاید میں کمزور بنا دیتے ہیں جب تک کہ انسان کو ذات باری تعالیٰ پر پورا بھروسہ ہو اس کی نجات مشکل ہے، جب خالق مطلق اس کا مددگار و معاون ہو تو پھر اوروں کے ناراض ہونے سے اس کا کوئی نقصان نہیں ہوسکتا ؎

پھرے زمانہ جہاں تک ہی ہم سے یار نہ پھرے کسی کے پھرنے نہ پھرنے سے کیا خدا نہ پھرے

دنیا میں ہر شخص اپنے ذاتی اغراض کی حصول میں کوشاں ہے، دوسروں کی فکر بہت کم کرتا ہے، جو ہے وہ مطلب کا بندہ ہے، ؎

کیا جانے ہم کہاں ہیں اور دین و دل کدھر ہے عالم میں تفرقے کی کس کی کسے خبر ہے

خود تو تیر نگاہ کے گھائل ہو گئے لیکن ایسا سبق پایا کہ گھبرا اُٹھے، اب دعا کرتے ہیں کہ دوست، دشمن کو بھی اس سے سابقہ نہ پڑے ؎

یارب کوئی اس چشم کا بیمار نہ ہووے دشمن کے بھی دشمن کو یہ آزار نہ ہووے

آہ - دنیا میں کوئی مشفق و مساز اور رفیق غم گسار نہیں، اپنا حال زار کس سے سنایا جائے، یا تو درد سے دل ہی آشنا ہے یا پروردگار ہی کو اس کا علم ہے ؎

مرا کوئی احوال کیا جانتا ہے جو گزرے ہے مجھ پر خدا جانتا ہے

شاعر کو خوف ہے کہ اس کے ارادہ کی خبر پاکر لوگوں کو کہیں غلط فہمی نہ ہو، اس لئے وہ اپنی نیک نیتی کا اظہار کرتا ہے تاکہ اس سے واقف ہوکر ان کی بدگمانی دور ہو جائے ؎

بتوں کی دید کی جاتا ہوں دیر میں قایم مجھے کچھ اور ارادہ نہیں خدا نہ کرے

دنیا میں عدو انصاف کا وجود نہیں ہے، کرتا کوئی ہے اور خمیازہ بھگتتا ہے کوئی اور بقول کسی کے "کرے ڈاڑھی والا پکڑا جائے مونچھوں والا" جرم کا ارتکاب تو ایک شخص کرتا ہے لیکن سزا ایک ناکردہ گناہ کو دیجاتی ہے، یہی آئین جہاں ہے ؎

تجھ سو نگیں تھیں انکھیں ہنوز ساعت میں دل تقصیر تھی کسو کی گرفتار ہے کوئی

جور و الم سہتے سہتے دنیا سے طبیعت اکتا چکی ہے، دنیا سے خوش معاملگی مفقود ہو چکی ہے، دغا و فریب کی گرم بازاری ہے، دیدہ دلیری تو دیکھئے کہ ایک چیز لیتے ہیں لیکن پھر نہایت سادگی سے پردائی کیساتھ انکار کر جاتے ہیں ؎

جی بیچ چکا ہے جور فروشوں کے ہاتھ سے دل رکھنے کو دے کے جو ظالم مکر گئے

جو چیز مفت ملجائے اس کے قبول کرنے سے انکار نہیں ہوتا، گو میخواری سے توبہ کیجا چکی ہے لیکن ابتک ہونٹ اس لذت کا مزہ لے رہے ہیں، اس لئے شراب مفت ملجائے تو انکار نہیں ؎

مے کی توبہ کو تو مدت ہوئی قایم لیکن بے طلب بھی جو ملجائے تو انکار نہیں

چھپ چھپ کے غیر سے ملنے کی شکایت کی تو ایک ادا کے ساتھ پوچھا کیا تم نے خود دیکھا، ان کا خیال ہے کہ میں اس کا ثبوت دینے سے قاصر رہوں گا، لیکن بھلا کہیں عاشق سے محبت کی نظریں بھی چھپ سکتی ہیں، اس کا جواب یہی ہے کہ ذرا اپنی آنکھوں طرف دیکھو ؎

آگے مرے نہ غیر سے گو تم نے بات کی سرکار کی تو نظروں کو پہچانتا ہوں میں

پیدایش اور عطائے حیات سے انسان اعمال کی سزا و جزا کا ذمہ دار ٹھیرا، کاش کہ پیدا ہی نہ ہوا ہوتا اور ہمیشہ عدم ہی میں رہتا تو پھر یہ پرسش اور ثواب و عذاب کا مسئلہ ہی درپیش نہ ہوتا، عدم کی زندگی تفکرات اور خیر و شر کی پرسش سے پاک و مبرا تھی،

جب خلعت ہستی عطا ہوا اور کتم عدم سے دنیا میں اس کا ظہور ہوا تو پھر علایق دنیوی کی زنجیر پاؤں میں پڑ گئی ؎

تھا بد و نیک جہاں سے میں عدم میں آزاد   آہ کس خواب سے ہستی نے جگایا مجھکو

ہجر و فراق کی گھڑیاں کبھی تارے گن گن کروٹ بدلتے گزاریں، خیال یار کوئی وقت ہم سے جدا نہیں رہا، دل میں ایک ٹھیس لگتی ہے اور ہم باچشم پرنم محبوب کا تصور کرکے دل کو ڈھارس دیتے ہیں اور سمجھاتے ہیں کہ اے دل اس قدر مضطرب نہ ہو وہ بھی مجھ سے غافل نہیں ہے، تیری محبت میں وہ بھی بیقرار ہے، ایسی حالت میں جب ہچکی آجاتی ہے تو ہم کہکر دل خوش کرلیتے ہیں کہ اس نے یاد کیا ہے، محبت کے اثر سے اس کا جگر بھی پارہ پارہ ہے، ہندوستان عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ جب ہچکی آتی ہے اس وقت جسکا یاد کرنا قرین قیاس ہو اس کا نام لیا جائے تو ہچکی بند ہو جاتی ہے اسی کو شاعر نے اس طرح ظاہر کیا ہے، ؎

ہم نے ہر طرح ترے ہجر میں دل شاد کیا   ہچکی گر آئی تو سمجھے کہ کہیں یاد کیا

شباب کا پر کیف منظر ولولہ اور جوش و خروش سے مملو ہوتا ہے اُمنگ اور حوصلے بڑھے ہوئے ہوتے ہیں اس عہد کے اعمال خدائے پاک ——— نزدیک بھی زیادہ قابل قبول ہیں جوان صالح کی دعا کے استقبال کے لئے اجابت در حق سے پیشقدمی کرکے آتی ہے، تخم ریزی کا اصلی زمانہ یہی ہے، اس عہد میں جیسے اعمال کئے جائیں اس کا نتیجہ ہم کو بعد میں اٹھانا پڑتا ہے، شاعر اسی خیال کو ظاہر کرتے ہوئے نصیحت کرتا ہے کہ انسان اس زمانہ میں غافل نہ رہے ؎

نیک و بد جو تجھے کرنا ہو سو کرلے قایم   پھر یہ اُمید نہیں ہے کہ جواں ہوئے گا

معشوق کی بیوفائی اور عاشق سے بے اعتنائی و کج ادائی کوئی نئی بات نہیں ہے دل لیکے مکرجانا اور ستم زدہ کو جلانا اور اسکی دل آزاری کرنا یہ تو اس کا معمولی کام ہے بے رخی اور تغافل اسپر قیامت ہے، خصوصاً دل دکھانے کے اور عاشق کو جلانے کیلئے غیر سے ملنا اور ہنسکر باتیں اور اس سے محو اختلاط ہونا عاشق ناکام کے دل پر بجلیاں گراتا ہے مگر بے بس عاشق اپنی قسمت پر قانع ہوکر خاموش رہجاتا ہے اپنی حرماں نصیبی پر اشک غم بہاتا ہے، لیکن دیکھنے والے غیر لوگ کیسے خاموش رہتے انھوں نے چہ می گوئیاں شروع کیں، شاعر نے اسیطرف اشارہ کیا ہے ؎

غیر سے ملنا تمہارا سن کے گو ہم چپ رہے   پر سنا ہوگا کہ سنکر اک جہاں نے کیا کہا

عہد و پیماں مکمل ہو چکے، ملنے کا وقت بھی مقرر ہو گیا دل پر ارماں مسرور و شاداں ملاقات کے لئے چلا ہے، لیکن وائے قسمت برگشتہ کہ جب آرزوئے دیرینہ کی تکمیل کا وقت آیا تو ——— ہماری ازلی بدنصیبی رنگ لائی جب کہ ہم در جاناں کے بالکل قریب پہونچ چکے تھے کہ ہم کو بصد یاس و حسرت ناکام واپس ہونا پڑا اس دل خون شدہ کی کیفیت یقینی بیحد قابل تاسف ہے جو کامیابی سے ہم آغوش ہوتے ہوئے یوں ناکام رہگیا ہو ؎

قسمت کو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی جا کمند   دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

کسقدر حسرت و یاس کا مرقع ہے، دلگیر اور ستم زدہ عاشق کی دردناک حالت کا مظہر ہے، سادگی اور طرز بیان کی دلنشینی قابل داد ہے

ملاحظہ ہو ؎

لے گیا خاک بھی ہمراہ دل اپنے قائم شاید اس جنس کا یاں کوئی خریدار نہ تھا

کوشش اور سعی بہت کچھ کر دیکھی لیکن مطلب برآری نہ ہوئی، کبھی ناراض ہوئے، کبھی نہ ملنے کی قسم کھائی، کبھی یہ عہد کر لیا کہ پھر کبھی اس کی صورت نہ دیکھیں گے، لیکن اس قسم کے عہد پر بھی کہیں کوئی قایم رہ سکتا ہے۔ نظر سے دور ہوئے کہ پھر دیدار جاناں کا خیال دل میں چٹکیاں لینے لگا، ناچار اعتراف شکست کرتے ہوئے پھر در جاناں پر حاضر ہوئے بہتری کوشش کر دیکھی لیکن دل سے خیال یار کو جدا کرنے میں کامیابی نہ ہوئی، اور ادہر وہ ستمگر ہے کہ کسیطرح پسیجتا ہی نہیں، کسی ترکیب کا اسپر کوئی اثر نہیں ہوتا، اس کی بے اعتنائی میں کوئی فرق نہیں آیا، آخرکار، بدنصیب عاشق مجبور ہو کر اسی کو مخاطب کرکے کہتا ہے ؎

ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر روٹھا تھا آپ تجھ سے میں اور آپ من گیا

غرضکہ حسن وعشق تو ہمیشہ گرم رہتا ہے، تکرار اور جھگڑا تو امور روزانہ میں داخل ہوگئے ہیں، ادہر سے اصرار ہے اور ادہر سے شان استغنا، آخر دونوں کا نباہ کس طرح ہو تیز گفتگو اور ناراضگی پر اس کا خاتمہ ہوتا ہے وہ تند خو جلد بگڑ بیٹھتا ہے، محبت کی جنگ بھی عجیب منظر پیش کرتی ہے، آخرکار اس روزانہ کشمکش نے انتہائی صورت اختیار کی، اور ایک فیصلہ کن جنگ کے بعد صلح ہوگئی، ؎

قایم ضرور کیا ہے اب اس جنگجو سے صلح مدت ہوئی کہ جان سے میں ہاتھ دہو چکا

اردو شاعری کی ابتدا دکن سے ہوئی جو نہایت قدیم زمانہ سے فقر و تصوف کا مرکز ہے اس لئے ابتدا ہی سے اسمیں صوفیانہ خیالات کی آمیزش ہوگئی، رفتہ رفتہ صوفیانہ شاعری کو اور زیادہ ترقی ہوئی، لیکن جس زمانہ میں اردو شاعری ہوئی تو خواجہ میر درد نے سب سے پہلے اس زبان کو صوفیانہ خیالات سے آشنا کیا، چنانچہ خود فخر یہ کہتے ہیں، ؎

پھولیگی اس زبان میں گلزار معرفت یاں میں زمین شعر میں یہ تخم بو گیا۔

چنانچہ اس دور کے تمام شعرا مثلاً میر، سودا، آثر، میر حسن، قایم کے کلام بھی صوفیانہ خیالات سے لبریز ہیں، متوسطین نے جس وسعت اور دلاویزی کے ساتھ صوفیانہ خیالات کو ادا کیا ہے، اس کی نظیر کسی اور دور میں نہیں ملسکتی،

ہم ذیل میں قایم کے اشعار چند عنوانوں کے ماتحت درج کرتے ہیں[۱] :-

جزو و کل کے فرق پر مت جا لگ آتش کو دیکھ ہر جو تودہ میں وہی ذرہ سی چنگاری میں ہے

کیوں چھوڑتے ہو درد تہ جام میکشو ذرہ ہے یہ بھی آخر اوسی آفتاب کا

اوس سوے ہستی تک اپنی تفرقہ یک مو نہیں نقطہ و خط دو ہیں جو الا ہیں لیکن دو نہیں

---

[۱] یہ تمام عنوانات معہ اشعار مولانا عبد السلام ندوی کی شعر الہند حصۂ دوم سے نقل کئے گئے ہیں

عظمت انسان

پر فرشتے کے اس جگہ جل جائیں جسطرف ہم گزار کرتے ہیں

جس سے گردش میں ہیں خم افلاک اس مے تند کا ایاغ ہوں میں

گر فخر ہے تو مجھ سے دگر عار ہے مجھ سے ہر جنس کی یاں گرمی بازار ہے مجھ سے
احساس نہیں خلق کی نظروں میں وگرنہ جوں شمع یہ سب بزم نمودار ہے مجھ سے
جون رشتہ تو کمزور سامت دیکھیو مجھکو مضبوطی ہر سبحہ و زنار ہے مجھ سے
حیوان وگیا را کعبہ و ساجد ہیں نہ بیجا ہر بے خبر خلق خبردار ہے مجھ سے

انسان خدا کا پرتو ہے

ہوتے تھے محال ہو ہم درمیاں نہوں جبتک وجود شخص ہو سایہ نہ جائے گا

انسان کامل نایاب ہے

یوں آدمی کہلائے ہر گر بہ و سگ لیکن جس سے کہ عبارت ہی انسان وہ عنقا ہے

سیر عالم النفس

جز سیر دل اب اور کتابت نہ سبق ہو جی لگے ہو جہیں وہ یہی ایک ورق ہو

موج گرداب کی طرح ہم نے گھر سے باہر کبھو سفر نہ کیا

گیا نہیں ہوں میں یاں اس طریق سے قایم کہ جستجو سے کوئی پا سکے سراغ مرا
محاسبۂ نفس — محاسبہ سے وہ صبح جزا کے امین ہیں جو آپ روز و شب اپنا حساب لیتے ہیں
تحفظ نفس — دو س کیا دیجئے چو رکو قایم بند گھر کا میں آپ در نہ کیا
عظمت قلب — خدمت دیر و حرم کی جز میں یک عمر تو کیا درگہ دل میں تو اتبک شرف اندوز نہیں
انتشار قلب — آیا ہوں پارہ دوزی دل سے نپٹ بہ تنگ ایسے پھٹے ہوئے کو میں کبتک رفو کروں
مرشد کی ضرورت اور اسکا اثر — ہو نہ مجھ سے جدا کہ جادو صفت منزل عشق کا سراغ ہوں میں

اس کا وہ نمط جس سے باندھو کوئی گلدستہ گو ہیچ ہوں پر مجھ سے جمعیت دلہا ہے

راہ سلوک کی افسوسناک ناکامی:- قسمت تو دیکھئے کہ کہاں ٹوٹی ہے کمند — دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گئے

عشق حقیقی | ہمت عشق نہ ہو حسن خط و خال میں بند — صید ہر مور و مگس ہوتے ہیں شہباز کہیں

عشق حقیقی میں تمام مسائل چھوڑ دینے چاہئے:- تن آسودہ کم لیتے ہیں باز از محبت میں — جو واں چاہے تو ٹوٹا دل کوئی یا چشم تر لیجا

ترک خودی |- اپنے ہی ہوس کے یہ سب الجھاؤ ہیں — اس راہ میں ہم نے تو کہیں دام نہ پایا

ترک کر اپنا بھی کہ اس راہ میں — ہر کوئی شایاں رفاقت نہیں

دیدار الٰہی انسان کو خود گم کر دیتا ہے:- کھولی تھی چشم دید کو تیری یہ جوں حباب — اپنے تئیں میں آپ نہ آیا نظر کہیں

رضائے الٰہی | کیا ساغر ہلاہل و کیا جام آب خضر — آجائے بزم دوست میں جو کچھ سو پیجئے

کشاکش موج سے کرنا کوئی مقدور ہے خس کا — میاں تیری رضا پیارے جدھر چاہے ادھر لیجا

عالم مثال | کتنا ہے آئینہ کہ ہو تجھ سا ہی ایک اور — باور نہیں تو لا میں ترے روبرو کردوں

قیود مذہبی سے آزادی | قایم یہ جی میں ہے کہ نہ تقیید سے شیخ کے — اب کہ میں جو نماز کروں بے وضو کروں

ہمی بندے تو خدا کہتے ہیں پر اتنا ہے فرق — تو گرفتار تعین ہے ہم آزاد ہیں شیخ

اخلاقی شاعری | اس کے تحت قایم نے صرف ایک عنوان "علوئے ہمت" کے ماتحت کہا ہے ؎

علوئے ہمت | دو جہاں بھی ملیں تو بس ہے ہمیں — یاں کچھ اتنی تو احتیاج نہیں

فلک جو دی تو خدائی بھی لے نہ اب قایم — وہ دن گئے کہ ارادہ تھا بادشاہی کا

قایم کو ہم ایک فلسفی شاعر کی حیثیت سے پیش نہیں کر سکتے۔ ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اس کے کلام میں جابجا فلسفیانہ خیالات پائے جاتے ہیں چنانچہ ذیل میں چند اشعار درج کرتے ہیں۔

حقیقت عالم |- حقیقت عالم کے متعلق فلسفیوں میں سخت اختلاف ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ کوئی چیز اصلی نہیں جو کچھ ہم کو نظر آتا ہے وہ توہمات خیالات ہیں ہمارے شعرا نے زیادہ تر اسی خیال کو ظاہر کیا ہے۔ چنانچہ حضرت خواجہ میر درد فرماتے ہیں ؎

مت جا تر و تازگی پہ اس کے — عالم تو خیال کا چمن ہے

قایم کہتے ہیں ؎

[illegible] — جب تھا کچھ تو کیا تھا اور نہیں تو کیا ہو

اس سے ایک قدم اور آگے بڑھا کر قایم یہ کہتے ہیں کہ عالم ایک راز سربستہ ہے، ہم سے یہ معمہ حل نہیں ہو سکتا، چنانچہ اسی خیال کو ظاہر کیا ہے ؎

بہت سا غور کو مت دخل دے نسخے میں عالم کے   کہ حاصل دور ہے نظروں سے تیری اِس رسالے کا

بظاہر نظام عالم میں سخت ناہمواریاں اور بے ترتیبیاں پائی جاتی ہیں لیکن درحقیقت دنیا کا ایک ایک ذرہ ترتیب و تناسب کی زنجیر میں جکڑا ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے وہ دنیا کے ایک ذرہ کو بھی ٹھیس لگا کر اپنے مرکز سے ہٹانا نہیں چاہتے بلکہ ہر شخص کو یہ فلسفیانہ مشورہ دیتے ہیں ؎

غافل قدم کو اپنے رکھیو سنبھال کر یہاں   ہر سنگ رہگذر کا دوکان شیشہ گر ہے

قدم مادہ :- فلسفہ کا یہ مشہور مسئلہ ہے کہ مادہ عالم قدیم ہے تغیر و زوال جو کچھ ہوتا ہے صورت میں ہوتا ہے، مادہ کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ قایم نے اس خیال کو نہایت وضاحت کے ساتھ ظاہر کیا ہے ؎

وہی معنی ہیں گو دہو کا ہے صورت کے ازالہ کا   اگر ژالہ ہو پانی سے دگر پانی ہو ژالہ کا

گئی نہ ہم سے اضافت وجود کی کہ ہم اب   جو خود نہیں تو ہمارا غبار باقی ہے

فطرت بدل نہیں سکتی | بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ بعض اشخاص کی فطرت بدل جاتی ہے مثلاً نیک آدمی بد اور بد آدمی نیک ہو جاتے ہیں لیکن یہ فطرت کا تغیر نہیں بلکہ مناسب اوقات میں فطرت کا ہی ظہور ہے خود انسان کی فطرت میں نہ کبھی تغیر ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے، چنانچہ اسی خیال کو قایم نے زیادہ شاعرانہ پیرایہ میں ظاہر کیا ہے ؎

ہوس سے ہم کیا تھا عشق اول   وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

دنیا میں رنج ہی رنج ہے | دنیا میں اگرچہ خوشی کا حصہ رنج پر غالب نظر آتا ہے لیکن بعض فلسفیوں کو دنیا میں رنج نظر آتا ہے چنانچہ قایم کہتے ہیں ؎

غم یہ ہستی کی ہے بنا کہ حباب   دل کے کھلتے ہی یاں تمام ہوا

انسان کو صحیح علم حاصل نہیں ہو سکتا | انسان کو زیادہ تر علم حواس کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے لیکن حواس کی شہادت بعض فلسفیوں کے نزدیک معتبر نہیں اس لئے اُن کے نزدیک انسان کو صحیح علم حاصل نہیں ہو سکتا، قایم فرماتے ہیں ؎

اس کو نہ راست کہہ تو نہ اسکو بتا غلط   کیا جانے کیا صحیح ہے واقع میں کیا غلط

نیکی صرف مذہب میں محدود نہیں | اگرچہ انسان صرف مذہب ہی کو تمام خوبیوں کا سرچشمہ سمجھتا ہے لیکن خوبی صرف مذہب ہی میں محدود نہیں بلکہ اور چیزوں میں بھی پائی جاتی ہے اس لئے انسان کو ہر جگہ خوبی کی تلاش کرنی چاہئے ؎

صرف کفر و دیں پہ کیا ہے منحصر   ہاں دلا خذ ما صفا دع ما کدر

نیکی اور بدی فطرت کا نتیجہ ہیں۔ | دنیا میں نیکی اور بدی کا جو سلسلہ نظر آتا ہے اس کو دیکھکر بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ بدی کی کیا ضرورت تھی خدا خیر مجسم ہے، وہ صرف بھلائی ہی بھلائی کو پیدا کر سکتا تھا، لیکن درحقیقت نیکی کی طرح بدی بھی خدا کی قدرت کاملہ کی دلیل ہے اس لئے نیکی کی طرح وہ بھی ایک فطری چیز ہے، قایم کہتے ہیں ؎

بھلا ہم رند زاہد تجھ سے نیکو کار کیونکر ہوں ظہور مختلف کو چاہتی ہے شان خلاقی

برائی اور بھلائی فرضی ہیں | دیوجانس کلبی برائی اور بھلائی کو محض اعتباری اور فرضی چیز خیال کرتا ہے اس لئے وہ کسی رسم و رواج کا پابند نہ تھا، قایم نے اسی خیال کو اس شعر میں ظاہر کیا ہے ؎

فارق نیک و بد دہر ہے تیرا پندار ورنہ کچھ فرق نہیں شنبہ و آدینہ میں

خیر و شر اضافی ہیں | دنیا میں خیر و شر کا حقیقی وجود نہیں بلکہ جو چیز ایک شخص کے لئے مضر نظر آتی ہے وہ دوسرے کے لئے مفید ہو سکتی ہے اس فلسفہ کو اس طرح بیان کیا ہے:-

خیر و شر کو تو سمجھ نادان کہ آب خاک کو نافع ہے آتش کو مضر
دیکھ سرسری اوراق گل کہ یہاں قایم ہے شرح تنگیٔ غنچہ فراغ میں گل کے

برائی کے پیدا کرنیکی مصلحت | برائیوں کے پیدا کرنے کی مصلحت یہ ہے کہ اُن کے مقابل میں جو بھلائیاں ہیں وہ زیادہ روشن اور نمایاں ہو جائیں جب اندھیرا نہ ہو روشنی کا لطف حاصل نہیں ہوتا ؎

موقوف ضد ہی پر تو ہر شے کی معرفت کچھ کفر بھی ضرور ہے اسلام کے لئے

عبرت پذیری کے ذریعہ جو انسان کی اخلاقی اصلاح ہوتی ہے وہ بھی انہیں برائیوں کا نتیجہ ہے۔ مثلاً ایک آدمی برا کام کرتا ہے تو اس کے انجام بد سے واقف ہو کر سیکڑوں آدمی احتراز کرتے ہیں ؎

آوارہ کر چمن میں مرے بال و پر نسیم آیندہ تا نہ ہووے کوئی مبتلائے گل

تربیت کے لئے جلدی مضر ہے | دنیا کے لئے ہر چیز بتدریج ترقی کرتی ہے اس لئے تربیت میں جلدی نہیں کرنا چاہئے ورنہ لازمی طور پر خامی رہجائیگی، چنانچہ قایم کہتے ہیں ؎

ناپختگی کا اپنے سبب اس ثمر سے پوچھ جلدی سے باغبان کی جو خام رہ گیا

محقق مقلد نہیں ہو سکتا | تقلید صرف عوام کے لئے ضروری ہے، محققین کو تقلید نہیں کرنی چاہئے چنانچہ قایم فرماتے ہیں ؎

جنھیں کچھ سلسلہ میں عشق کی تحقیق حاصل ہے وہ کب مجنوں سے ہر گمراہ کی تقلید کرتے ہیں

گردش زمانہ کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہئے | زمانہ کے حوادث ایک بحر ذخار کی طرح موجیں مارتے ہوئے چلے آتے ہیں اور ان کو کوئی طاقت روک نہیں سکتی اُن کو اپنی روش میں کسی کے نفع و نقصان کی پروا نہیں ہوتی، اس لئے انسان کا فرض صرف یہ ہے کہ ؎

خس نمط ساتھ موج کے لگ لے بہتے بہتے کہیں تو جاے گا

تجربہ | انسان کو صرف تجربہ ہی تمام خطرات سے بچا سکتا ہے چنانچہ قایم کہتے ہیں ؎

ضائع نہ کر تو دام ہیں صیاد دانہ کو دیکھا ہے لاکھ رنگ سے ہیں نے زمانہ کو

خمریات | عربی شاعری میں اخطل، اور ابونواس اور ایرانی شعرا میں خیام اور حافظ نے اس صنف کو اپنے لئے مخصوص کرلیا ہے، اردو شاعری میں میر، سودا، نظیر و میرحسن نے بھی اس طرف توجہ کی لیکن دور تغزل کے بعد جب معاملہ بندی کے ساتھ رندی و ہوسناکی کا دور شروع ہوا تو آتش اور تلامذۂ آتش نے اس قسم کے خیالات کو زیادہ شوخ کیا، غالب عموماً شراب نوشی کیا کرتے تھے اس لئے انھوں نے بھی اس صنف میں نہایت مستانہ اور پرجوش اشعار کہے اور متاخرین میں داغ و ریاض نے بھی اس میں نمایاں شہرت حاصل کی شاعرانہ حیثیت سے اس صنف کے لئے صرف یہ شرط ہے کہ اشعار برجستہ، صاف، رواں اور مستانہ ہوں، اور طرز ادا میں جوش اور الفاظ میں طرب انگیزی اور رنگینی پائی جاتی ہے، قایم نے اس صنف میں بھی کہا ہے ؎

آج دل میں ہے کہ کھلکر مے پرستی کیجئے خوب مے پیجئے اور دیر مستی کیجئے

سحر ہوئی، رات بیتی مے کی شیشہ میں ہے باقی اور کاسا و ناولہا الا یا ایہا الساقی

قایم فارسی زبان میں بھی فکر سخن کیا کرتے تھے، اس وقت ملک کی عام زبان فارسی تھی، خط و کتابت، مراسلت، تصنیف و تالیف بھی اسی زبان میں ہوا کرتی تھی، اردو میں تصنیف کرنا معیوب سمجھتے تھے ابھی حاتم نے اردو کی عام ترویج کی طرف توجہ نہیں کی تھی، عام طور پر شعرا بھی اسی زبان میں اشعار کہا کرتے تھے، چنانچہ فارسی زبان میں بھی قایم کے چند اشعار موجود ہیں نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم نے اپنے تذکرہ "بزم سخن" میں قایم کے فارسی کے دو شعر نقل کئے ہیں، ؎

آنانکہ با حلاوت دردتو خو کنند زخمی بدل زنند و نمک آرزو کنند

شب کہ انداز ہم آغوشی او یاد کنم خویش را تنگ بہ برگیرم و فریاد کنم

اس وقت کے اکثر شعرا قایم کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں، اکابر شعرا نے جو بجائے خود استاد ان فن تھے نہایت بلند آہنگی کیساتھ قائم کی استادی اور قادر الکلامی کا اعتراف کیا ہے، کئی ایک نے اشعار میں اس جذبہ کو ظاہر کیا ہے اور سودا، درد و میر کے ہم رتبہ قرار دیا ہے، ظاہر ہے کہ ان تینوں استادان وقت کی استادی میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا، ان کے ساتھ قایم کو شریک کرکے انھوں نے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ قایم کو وہ کس درجہ اور مرتبہ کا شاعر خیال کرتے تھے، چنانچہ ان اشعار کے پڑھنے کے بعد قدیم کی علو مرتبت کے بارہ میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا ہے میر باقر حزیں۔ مرزا جان جاناں کے شاگرد اور صاحب دیوان تھے، سودا نے ان کا نام اکابر شعرا کے ساتھ لیا ہے، وہ اپنے احساسات اور جذبات قلبی کو یوں ظاہر کرتے ہیں ؎

داغ ہوں ان سے اب زمانے میں بزم شعرا کے جو ہیں صدر نشیں
یعنی سودا و میر و قایم و درد ہے ہدایت سے تا کلیم و حزیں

منشی قدرت اللہ شوق اسی عہد کے ایک قادر الکلام شاعر تھے جن کی تصنیفات سے ایک تذکرہ "طبقات الشعرا" یادگار ہے، وہ بھی اساتذۂ وقت کی مدح و شان میں یوں گہر افشانی کرتے ہیں ؎

اے شوق تیرے شعر کی ہو تو بڑی ہے دھوم سودا و میر و قایم و درد و الم تلک

تصنیفات قایم کی تصنیفات سے ایک کلیات اور ایک تذکرہ یادگار ہیں، کلیات کے قلمی نسخے ہندوستان میں بعض حضرات کے ہاں موجود ہیں لیکن افسوس ہے کہ ہمیں کوئی نسخہ دیکھنے کے لئے نہیں ملا ورنہ ہم تفصیل کیساتھ اس کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرتے اور مصحفی کے قول کی تائید میں ہم مختلف اصناف سخن کے نمونے پیش کرتے جس سے ناظرین کو قایم کی شاعرانہ شخصیت کے متعلق انداز کرنے میں بہت آسانی ہوتی، تاہم انڈیا آفس کی فہرست ہندوستانی کتب میں بلوم ہارٹ نے ایک کلیات کی موجودگی کا ذکر کیا ہے، چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ کلیات کا آغاز مذکورۂ ذیل اشعار حمد سے ہوا ہے ؎

ہرگز نہیں مقدور تیری حمد زباں کا برہان ہے دعوے کے مرے عجز بیاں کا
جب تک کہ ہے تو ہم میں تیرے ساتھ ہمیشہ جو موج کہ نت لازمہ ہے آب رواں کا
اے عشق میرے دوش پہ تو بوجھ رکھا اپنا ہر سر متحمل نہیں اس بار گراں کا

یہ کلیات مجموعہ ہے غزلیات، مخمس، واسوخت، رباعیات اور قصیدوں کا، اور اس میں بادشاہ دہلی، وزیر، میر بخشی، امیر الامرا نعمت خاں، سودا، نواب عنایت خاں، نواب محمد یار خاں، نواب ہزبر جنگ، نواب نصر اللہ خاں کی شان میں قصاید ہیں، مثنویاں خصوصاً ہجویہ اور مختصر حکایتیں ہیں، ایک مثنوی کا عنوان "رمز الصلات" ہے اور اس کلیات میں سب سے آخری مثنوی "حیرت افزا" ہے جس کے آخری شعر سے تاریخ تصنیف دیوان یعنی ۱۱۹۳ھ (م ۱۷۷۹ء) برآمد ہوتی ہے ؎

ہوا ہے جس سن میں یہ نامہ رقم ہے بارہ سو ہجری میاں سات کم

بلوم ہارٹ لکھتا ہے کہ اس نسخہ میں مثنوی "بشارت سرما" اور مثنوی "عشق درویش" شامل نہیں ہیں البتہ اس کا ذکر گارساں دی تاسی نے کیا ہے، "تذکرۂ مخزن نکات" یہ تاریخی نام ہے اسپر اکرم نے تاریخی قطعہ بھی لکھا ہے، اس کتاب کے عنوان سے تاریخ تصنیف یعنے ۱۱۶۸ء (۵۵-۱۷۵۴ء) برآمد ہوتے ہیں، اسپنگر لکھتا ہے کہ "ریختہ گو شاعران قدیم کا یہ ایک زبردست قابلقدر تذکرہ ہے، یہ تذکرہ فارسی میں لکھا گیا ہے، سب سے عجیب بات اس تذکرہ میں یہ ہے کہ قایم اس بات کا مدعی ہے کہ وہ سب سے پہلا شخص ہے جس نے ہندوستانی شعرا کا یہ تذکرہ لکھا، اس کے یہ معنی ہوئے کہ وہ میر کے نکات الشعرا، فتح علی حسینی گردیزی کے تذکرہ کے وجود سے لاعلم تھا، بلکہ وہ لکھتا ہے کہ اب تک ریختہ گو شاعروں کا کوئی تذکرہ ہی مرتب نہیں ہوا، چنانچہ وہ اس اولیت پر فخر کرتا ہے مگر ہمیں اس بیان کی صداقت پر شبہہ کرنے کا پورا حق حاصل ہے، مگر اس کتاب کی خوبی پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے، بقول ڈاکٹر اسپرنگر "بلا شک و شبہہ

اس تصنیف میں بہت کچھ ادرتخیل مواد ہے"

ایک بات جو اس کے قبل کے تذکروں میں نہیں پائی جاتی یہ ہے کہ قایم نے سعدی شیرازی کو ہندوستانی شعرا میں شمار کیا ہے واقعہ یہ ہے کہ سعدی کے متعلق اور تذکروں کی طرح قایم کو بھی مغالطہ ہوا، سعدی شیرازی نہیں بلکہ سعدی دکھنی ہیں یا بقول مولوی عبدالحق صاحب یہ سعدی شمال ہند کے باشندہ ہیں، اس بیان کی میر اور فتح علی گردیزی نے تردید کی ہے،

گارسان دی تاسی نے اپنی کتاب "ہندوستانی مصنفین اور ان کی تصانیف" میں جہاں پر ساتویں تذکرہ کا ذکر کیا ہے وہاں لکھتے ہیں کہ "قایم نے جو ایک مشہور شاعر ہوا ہے ایک تذکرہ لکھا ہے اس کا نام بھی نکات الشعرا ہے جو علاوہ اس کے طبقات الشعرا کے نام سے بھی معروف ہے اور اس کے بعد جہاں نویں تذکرہ کے متعلق لکھا ہے وہاں لکھتے ہیں" مخزن نکات، قایم کی تالیف ہے اُن کے بیان کے مطابق ہر دو تذکرے تین طبقوں پر منقسم ہیں ہم کو جہاں تک علم ہے، عام طور پر تمام تذکرہ نویسوں نے صرف قایم کے تذکرہ مخزن نکات" کا ذکر کیا ہے، ممکن ہے کہ یہ دونوں نام اصل میں ایک ہی تذکرہ کے ہوں، اور گارسان دی تاسی کو غلط فہمی ہوئی ہو"

اس تذکرہ کی ابتدا ان الفاظ سے ہوئی ہے۔

رنگینی کلمات و دلنشینی فقرات بحمد سخن پناہی است کہ بنائے الخ "

کل شاعر جن کی تعداد اس میں درج ہے ایک سو دس ہے، یہ تذکرہ تین طبقوں پر منقسم ہے،

طبقہ اول، در بیان اشعار متقدمین، ابتدا سعدی سے ہوئی ہے اور اختتام میر جعفر پر ہوا ہے

طبقہ دوم، در ذکر کلام سخنوران متوسطین، ابتدا شاہ مبارک آبرو سے ہوئی ہے اور اختتام افغان کمترین پر ہوا ہے،

طبقہ سوم، در بیان اشعار و احوال شعرائے متاخرین، ابتدا میر شمس الدین فقیر سے ہوئی ہے اور اختتام قایم پر ہوا ہے۔

ڈاکٹر سپرنگر اس تذکرہ کے متعلق یہ رائے دیتا ہے "تاریخ ادبیات اردو کے متعلق یہ ایک قدیم اور نہایت قابل قدر تصنیف ہے"

شاعر کی تاریخ وفات کے متعلق بھی بیحد اختلاف ہے، کوئی کہتا ہے کہ ۱۲۰۸ھ میں اور کوئی کہتا ہے کہ ۱۲۱۰ھ میں انتقال کیا بہر حال ۱۲۰۸ھ اور ۱۲۱۰ھ کے درمیاں سفر آخرت کیا، شعرا و سخن فہموں کو اس کی وفات کا بڑا صدمہ ہوا چنانچہ جرأت نے تاریخ وفات کہی ہے ؎

جرأت نے کہی رو کے تاریخ وفات یکتا ئی کیتا قایم بنیاد شعر ہندی رہی کیا کئے اب آہ

تلامذہ نواب محمد یار خاں امیر، فرزند نواب علی محمد خاں، اور نواب فیض اللہ خاں رئیس رام پور کے چھوٹے بھائی تھے، ٹانڈہ کی بود و باش تھی، شعر و سخن اور سیر و شکار کا شوق تھا، مرہٹہ گردی میں پریشان حال ہو گئے، فیض اللہ خاں رام پور سے گئے پچاس ہزار روپیہ جیب خرچ کے لئے مقرر کر دیا ۱۲۰۸ھ میں وفات پائی۔

مولف طبقات الشعرا لکھتا ہے۔

جوانے بود مرزا منش، نازک طبع صاحب فطرت اہل مروت، عالی حوصلہ خوش سلیقہ، حاتم زمانہ در سخاوت و جرات یگانہ،

مجمع مکارم اخلاق وتفیض رسانی و قدردانی شہرۂ آفاق و در فن موسیقی کہ بحریست ذخار و محیطے است ناپیدا کنار چناں دسترس تمام داشت کہ فیثاغورس باوجود استادی یکے از شاگردان ابجدخوانِ اوتان سین نایکان وکہن از مدح سرایان او بسیار سخن فہم نکتہ سنج، قدردان سخن استادان ایں فن در فرقہ اہل دل شخصے بود بے بدل، گاہے طبیب صفائی ذہن وجودتِ طبع برائے تفنن خاطر بفکر شعر ریختہ، می پرداخت و داد سخنوری وخوش تلاشی میداد و در اندک ایام مشقے او برتبہ عالی استاذاں رسیدہ بود فاما اجلش مہلت نداد"

حباب آسا نہ دیکھیں آنکھ اٹھا اسباب دنیا کو ایا ہے کاسۂ سر سے جنھوں نے کام افسر کا

یاد کرنا ہی مرا آپ کو منظور نہ تھا گو کہ شب غم تھی پہ ہیں اتنا بھی تو کچھ دور نہ تھا

(۲) عباس خاں، عباس،

مولف طبقات الشعرا لکھتا ہے:۔ برادر خورد آخونزادہ ارادت خاں کہ از مصاحبان نواب عنایت اللہ بود۔ جوانے است عالی حوصلہ خوبصورت، پاکیزہ سیرت،

باتمکنت و وقار بسیار جیہہ و بردبار و متین و نہایت خوش تلاش، خوش فکر و ذہین است، اگرچہ نومشق ست ذہن رسا و فکر بجا دارد"

جو عشق و سوز دیر و کعبہ سے کام ہے اس کو تو رام رام اور اس کو سلام ہے

تیرے بن اب جو دم ہے یا کہ ایک لحظہ ہے یا ساعت ہے بلائے جاں ہے، آفت ہے، اذیت ہے، مصیبت ہے

(۳) پروانہ علی، پروانہ مرادآبادی،

مولف طبقات الشعرا لکھتا ہے:۔ مردے ہست دیوانہ، جوانے ہست مرد آنہ مزاج آزادانہ، مشرب رندانہ، ذہنش مناسب و موزوں شاعرانہ، شعر را باواز بلند میخواند، شاگرد مراد علی حیرت حالا از قایم مرقوم اصلاح میگرفت، دریں ایام جوش جنوں برخاطرش طاری ہست ؎

جھوٹ کہتا ہے تو قاصد یہ زبانی پیغام مجھکو باور نہیں جب تک کہ نشانی آوے

(۴) قدرت، تخلص، مولوی قدرت اللہ نام، ساکن رام پور، عبدالغفور خاں نساخ لکھتے ہیں کہ ریختہ گویوں کا ایک تذکرہ اُن سے یادگار ہے ؎

لاکھوں جلائے مردہ صد سالہ آن میں فیضِ دم مسیح ہے اس کی زبان میں

انصاف بھی ضرور ہے یہ ظلم تا کجا کتنوں کے جی تو جلتے رہے امتحان میں

(۵) طرز تخلص گردھاری لعل نام، قوم کا کایستھ اور باشندہ شاہجہاں آباد کا تھا، مولف طبقات الشعرا نے اس کی ایک رباعی نقل کی ہے ؎

کہا زلف میں بل نہ گوسوارہ ٹوٹا کیا جانئے کس کا دل بیچارا ٹوٹا

دھڑکے ہی لگا ہی کہ اب خدا خیر کرے　　اسی رات میں بے طرح ستارا ٹوٹا

(۶) ہماری مل، قوم کا کایستھ، باشندہ شاہجہاں آباد کا تھا، ایک مدت تک امروہہ میں مقیم رہا، طبع رسا در فکر بجا رکھتا تھا،

آیا نظر ایک طفل فرنگی گورا، سنگین نگاہ　　پلٹن ہی مژہ کی قلب دل کو توڑا بجرم گناہ

میں نے کہا ظالم کہیں صاحب سے تو ڈر، اس پر یہیں　　شرماکے لگا کہنے ہو تھوڑا تھوڑا دے کیا پرواہ

(۷) بیتاب تخلص، اور ستو کھ رائے نام تھا، شاہجہاں آباد کا باشندہ، قوم کا کھتری، خلوت پسند تھا، عزلت نشینی کی طرف کا رجحان تھا، ایک عرصہ تک چاندپور میں گوشہ نشین رہا، کم کہتا تھا لیکن بہت خوشگو تھا، ایک مختصر سا دیوان بھی ترتیب دیا تھا،

غافل نہیں اعتبار پل کا　　کیوں فکر عبث کرے ہو کل کا

(۸) مائل تخلص، شاہ محمدی نام، دہلی کے رہنے والے تھے، شاہ عالم بادشاہ کے زمانہ میں مرشدآباد میں سکونت کی تھی، آج تمام اساتذہ میں شاعری کا سلسلہ سودا، درد اور مصحفی کی ذات سے قایم ہے کیونکہ غالب کے سوا دلی میں شاعری کے تمام سلسلے شاہ نصیر، ذوق اور مومن کی ذات سے قایم ہیں، مومن اور ذوق شاہ نصیر کے شاگرد تھے اور مایل کو قایم سے تلمذ حاصل تھا ؎

کیا کیا کہوں میں تجھ سے دل زار کی ہوس　　مشہور ہے جہان میں بیمار کی ہوس

(۹) ہادی تخلص، عبدالہادی نام، شاہجہاں آباد وطن تھا، گو سودا کے شاگرد تھے مگر مشورۂ سخن قایم ہی سے کیا کرتے تھے اس لئے ان کو بھی زمرۂ تلامذۂ قائم میں شمار کیا جاتا ہے، ؎

صدقے ترے ہو کے مر گئے ہم　　کرنا تھا جو کچھ سو کر گئے ہم

خنداں خنداں جدھر گئے ہم　　گریاں گریاں ادھر گئے ہم

(۱۰) کمال تخلص، کمال الدین حسین نام، باشندۂ کڑہ مانک پور شاگرد جرأت و قائم، لباس درویشی پہنکر سیر و سیاحت کرتے تھے دیوان و تذکرۂ شعرا نظر سے گزرا، (سخن شعرا) گارساں دی تاسی نے کمال کے تذکرۂ "مجموعہ انتخاب" کا ذکر کیا ہے اور لکھتا ہے کہ اس کا نام فقیر شاہ محمد یا شاہ کمال الدین حسین ہے، اس نے قایم کے تتبع میں قایم کے دس سال بعد ۱۲۰۰ھ میں اپنا تذکرہ لکھا جا بجا قایم کی تعریف و توصیف کرتا ہے۔ اکثر جگہ قایم کے تذکرہ سے مستفید ہوا ہے، چنانچہ اس نے بھی سعدی شیرازی کو پہلا شاعر قرار دیا ہے، کمال نے اپنے تذکرہ میں قایم کے دیوان سے بہت سا کلام نقل کیا ہے جسمیں بیانیہ، ہجو اور دوسری قسم کی نظمیں داخل ہیں ہماری رائے میں یہ کمال وہی ہے جو کہ جرأت اور قایم کا شاگرد تھا،

بگڑے نہ کہیں عاشق و معشوق کی صحبت　　یوں بن کے نہ نکلا کرو بازار میں صاحب

گارساں دی تاسی نے قدرت اللہ شوق کو بھی قایم کا شاگرد بتایا ہے، چنانچہ لکھتا ہے "تذکرۂ ہندی جو طبقات الشعرا کے نام سے بھی موسوم ہے، اس کا مولف شوق بہت پرگو شاعر ہے، قایم چاندپوری کا شاگرد ہے، اس کے گھر میں اکثر مشاعرہ ہوتے تھے"

(رسالہ اردو بابتہ جنوری ۱۹۲۸ء)

جس طرح صوفیا کے نزدیک شریعت کے ظاہری و باطنی دو رخ ہوتے ہیں اسی طرح محققین کے نزدیک شاعری بھی خارجی اور داخلی دو
موں میں منقسم ہے، خارجی شاعری میں اشیا رکے ظاہری خط و خال نمایاں کئے جاتے ہیں اس لئے اس سے صرف مناظر قدرت، وصف نگاری
احی اور واقعہ نگاری میں کام لیا جاسکتا ہے، کیونکہ ان تمام اصناف سخن میں شاعر صرف انہیں چیزوں کی تصویر کھینچتا ہے جو محسوس
ور پر نظر آتی ہیں خود اُس کو اپنے اندرونی جذبات کی آمیزش سے ان تمام چیزوں کو علحٰدہ رکھنا پڑتا ہے لیکن غزل میں تمام تر شاعر
، اندرونی جذبات وکیفیات کی تشریح ہوتی ہے اس لئے اس میں صرف شاعری کے داخلی پہلو سے کام لیا جاتا ہے اور قدما کے کلام کا
صلی امتیازی وصف یہی ہے کہ انھوں نے شاعری کے ان دونوں حصوں کو بالکل الگ الگ رکھا، یعنی قصاید وغیرہ میں خارجی
صہ سے کام لیا، اور غزل کو تمامتر جذبات وکیفیات سے لبریز کردیا، ذیل میں ہم قایم کے منتخب کلام کا ایک حصہ درج کرتے ہیں جس سے
سکا اندازہ ہوسکیگا،

رکھیں اپنے تییں پھر کس طرح دوست ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ہو تجھ سا تخص جب دشمن ہمارا

میں کن آنکھوں سے دیکھوں کہ سایہ ساتھ ہو تیری ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ مجھے چلنے دے تئے یا تک اسکو بیشتر سے جا

ادب سے آدمی آنکھوں میں خوب لگتا ہے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ گر یہ فرقہ خوباں ہو جسقدر گستاخ

جاتی ہے نسیم اس گلی کو ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ اوٹھ سکے تو قافلہ ہے بہتر

سو جائے منہ لپیٹ کے جو یاد میں تیری ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ سو جاگتے خفیف ہیں اس خواب کے حضور

آج آپ مرے حال پہ کرتے ہیں تاسف ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ اشفاق، عنایات، کرم، مہر، تلطف

دی عاشق کی تیرے حسرت دیدار سمجھو گا ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ کھلی رہجائیں بعد از ذبح جب نخچیر کی آنکھیں

ہے گو کہ جذب مرا تار عنکبوت سی سست ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ یہ شیر پھالسے ہیں اکثر اسی کمند سے میں

لبریز شوق میرا ازبسکہ مو بمو ہے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ سمجھا نہیں یہ ابتک یہ میں ہوں کہ وہ ہے

شبنم کے برگ گل پہ ڈہلنے پہ میں یہ سمجھا ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ جو دیدہ ور ہے اس کو شوق رخ نکو ہے

ہے رفو سے صرف سی جامہ کا سری تار و پود ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ بسکہ میں پھاڑا اُسے اور یار سلواتے رہے

قسمت کہ وہ چارہ گر ہے اپنا ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ جو زخم سے تار رفو نہ سمجھے

شایان چمن نہیں وہ بلبل ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ہر گل کا جو رنگ و بو نہ سمجھے

غنچہ نے کس کے بوسہ کو یہ لب کئے ہیں جمع ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ گل کیوں بنا ہے باغ میں صورت کنار کی

کلام کا انتخاب یہ ہے :—

عہدہ سے اس صنم کے برآیا نہ جائے گا ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ یہ ناز ہے تو ہم سے اُٹھایا نہ جائے گا

کعبہ اگر جو ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ
کچھ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

کہاں ہے شیشۂ مے محتسب خدا سے ڈر
مری بغل میں جھلکتا ہے آبلہ دل کا

لے گیا خاک میں ہمراہ دل اپنا قایم
شاید اس جنس کا یاں کوئی خریدار نہ تھا

ناصح تو کہے ہے یوں کہ گویا
ہے دل پہ کچھ اختیار میرا

اب تو نہ گل نہ گلستاں ہے یاد
اس کے مکھڑے کی ہر زماں ہے یاد

بھلا اے ابر مژگاں اب تو بس کر
ابھی تو کھل گیا تھا پھر برس کر

کیوں کیا مجھکو تو صیاد گرفتار قفس
نہ میں شایستہ بسمل نہ سزاوار قفس

جو سوز عشق کا چرچا وہاں نہیں قایم
تو کیا میں جاؤنگا دینے بہشت میں آتش

اے محنت آزمائے عاشق ہو
تب خوش ہو کہ مر ہی جائے عاشق

آوے خزاں چمن کی طرف گر میں رو کر دل
غنچہ کرے گلوں کو صبا گر میں بو کر دل

جز سپہر دورئے یاران و روئے غیر
جو کچھ نہ دیکھنا تھا سو اب دیکھتا ہوں میں

کسی بلا میں پھنسے، قید ہووے، جان سے جائے
پر آدمی کو خدا تجھ پہ مبتلا نہ کرے

شیخ جی آیا نہ مسجد میں وہ کافر ورنہ ہم
پوچھتے تم سے کہ اب وہ پارسائی کیا ہوئی

کیا پوچھتے ہو موجب آزردگی یار
دل لے چکے مدت ہوئی اب جاں طلبی ہے

مردن دشوار ہیں یہ حال بے تقصیر ہے
حسرت دل سو طرف سے اسکی دامنگیر ہے

قتل کرنے سے مرے تو بھی ہوا کچھ منفعل
غرق آب شرم میں اب تاک دم شمشیر ہے

نہ مرنے دیتے ہم قایم کو لیکن
خداوندی سے کچھ چارا نہیں ہے

دامن گل تلک ہے کہاں دسترس مجھے
تکلیف سیر باغ نہ کر اے ہوس مجھے

اپنے مذہب میں قرابت نہیں اجداد کی شرط
جس سے نسبت ہے مجھے اس سے ہمیں خویشی ہے

گو کہیں یار ہلا یا ہے وہ اب آتا ہے
پر اسے میں تو سمجھتا ہوں وہ کب آتا ہے

شب گریہ سے وابستہ مری دشنگی تھی
جو بوند تھی آنسو کی سو ہیرے کی کنی تھی

بس اس چمن سے اور یہ مجھ سے چمن گیا
لے دل میں اپنے حسرت سرو و سمن گیا

شیریں تو ساتھ خسرو کے کر ذوق سے معاش
پتھر تھا تیری چھاتی پہ سو کوہکن گیا

روؤں گا پر سایۂ دیوار بیٹھکر
جسدن تری گلی میں کسی داد بن گیا

ظالم تو مری سادہ دلی پر تو رحم کر
روٹھا تھا آپ ہی تجھ سے پھر آپ ہی من گیا

اب کے جو یہاں سے جائینگے ہم — پھر تجھکو نہ منھ دکھائیں گے ہم
ہاں کیوں نہ ملیں گے تجھ سے ظالم — جب گالیاں نت کی کھائیں گے ہم
آزردہ ہو غیر سے لڑ و یہاں — اس عہدے سے کب بر آئیں گے ہم
ایسا ہی جو دل نہ رہ سکے گا — ٹک دور سے دیکھ جائیں گے ہم
یوں چاہئے چاہ کا سر رشتہ — قایم ہیں تو کر دکھائیں گے ہم

خوش رہ اگر اے دل تو شاد نہیں — یاں کی شادی پہ اعتماد نہیں
تیرے دامن تلک ہی پہنچوں اور — خاک ہونے سے کچھ مراد نہیں
میں کہا عہد کیا کیا تھا رات — ہنسکے کہنے لگا کہ یاد نہیں

نہ دل میں آب ہے نہ نم رہا ہے آنکھوں میں — کبھی تھے روئے سو خوں جم رہا ہے آنکھوں میں
میں مرچکا ہوں پہ تیرے ہی دیکھنے کیلئے — حباب وار ذرا دم رہا ہے آنکھوں میں
موافقت کی بہت شہریوں سے میں لیکن — وہی غزال ابھی رم رہا ہے آنکھوں میں
وہ محو ہوں کہ مثال حباب آئینہ — جگر سے اشک نکل تھم رہا ہے آنکھوں میں

جو کہ چہلیں تھیں سو وہ ہائے گئیں یار کے ساتھ — سر ٹپکنا ہی پڑا اب در و دیوار کے ساتھ
ایک ہم خار تھے آنکھوں میں سبھی کے سو چلے — بلبلو خوش رہو تم اب گل و گلزار کے ساتھ
میں ہوں دیوانہ سدا کا مجھے مت قید کرو — جی نکل جائیگا زنجیر کی جھنکار کے ساتھ

یاس میں تجھ غم کے میں اپنی بھی غمخواری نہ کی — جان دے گزرا پہ ظاہر دل کی بیماری نہ کی
دمبدم اس بد تجش بیجا کو کیا کہتے ہیں شوخ — دل دیا تجھکو تو کچھ میں نے گنہگاری نہ کی
نے خطا آ نکلے اس سے تھا و فا کا احتمال — لیک داں تک عمر نے اپنے وفاداری نہ کی

زاہد در مسجد پہ خرابات کی تو نے — جی بھی یہی چاہے تھا کرامات کی تو نے
اے مہر تو میں نالاں ہوں دہر غیر نجانے — اب کس سے مری جان ملاقات کی تو نے
قایم رہ پر خوف ہے اور دور ہے منزل — کب پہنچے گا ظالم جو نہیں رات کی تو نے

دل مرا دیکھ دیکھ جلتا ہے — شمع کا کس پہ دل پگھلتا ہے
ہمنشیں ذکر یار کر کچھ آج — اس حکایت سے جی بہلتا ہے
گندمی رنگ جو ہے دنیا میں — میری چھاتی پہ مونگ دلتا ہے

ہر طرف وہ نگاہ لڑتی ہے — کبھی ادھر بھی آن پڑتی ہے
کیا ہی مکھڑا ہے یہ کہ جس کے حضور — آئینہ کی قلعی ادھڑتی ہے
قایم ایا ہے اب وہ بن ٹھن کر — دیکھیں کس کس کی یاں بگڑتی ہے

مثنوی در شدت سرما

سردی اب کی برس ہے اتنی شدید — صبح نکلے ہے کانپتا خورشید
اندنوں چرخ پر نہیں ہے مہر — گود میں کانگڑی رکھے ہے سپہر
پانی پر جس جگہ کہ کائی ہے — سبز وہ شال کی رضائی ہے
دیکھ گل پر صبا نسیب برد — بھرتی پھرتی ہے ہر طرف دم سرد
جسطرف اب نگاہ جاوے ہے — جو ہی جیوں بید تھرتھراوے ہے
بے حرارت ہیں سردی کے مارے — طرح یعقوب کے اب انگارے
ہے یہ آفت چراغ تک در پے — لوکو با کہربا ے شمع ہے
جاڑا لگنے کا یخ تلک ہے حرف — بیٹھی رہتی ہے نمدوں ہی میں برف
شب جو رخشندگی پر برق آوے — ابر میں یوں ٹھٹھر کے رہجاوے
کیا کروں اس کے حسن کی تقریر — جوں کسوٹی پہ سونے کی ہو لکیر
باد سے برگ کھڑکے ہیں اس بھانت — کہے تو بلجتے ہیں دانت سے دانت
آگ بھی ٹھنڈ سے ٹھٹھرتی ہے — گودوں کے بیچ چھپتی پھرتی ہے
دیں ہیں بر باد ٹھنڈ سے ایک دست — جو کوئی ہے سوآتناب پرست
گر کسی مہروش کو دیکھے ہے — شیخ بھی اپنی آنکھیں سینکے ہے
دن کو کٹتی ہے دھوپ میں اوقات — کالے کمبل میں رات کاٹی ہے رات

قایم آخر ہے سردی کا مذکور شعر بھی گرخنک ہوں رکھ معذور
آگے جاتا نہیں ہے اب بولا ہوگئی ہے زبان بھی ادلا

حکایت

حکایت یہ ایک زن سے ہے یادگار کہ تھی سخت اوباش اور ہرزہ کار
کیا اون نے آچاسے اپنے سوال کہ ہیں مرد پر چار عورت حلال
ہے کیا قہر چار عورت اور ایک مرد کہا اُن نے سن اس کو بھر آہ سرد
خدا اور پیغمبر جو تھا مرد تھا ہمارا وہاں کون ہمدرد تھا

مخمس

شیخ تو نابود ہووے یا ترا پندار نیست بتکدہ ویراں ہوا یا ہوں برہمن بکار نیست
کام کیا ہے مجھ کو گو ہوں اہلِ دیندار نیست کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست
ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست
عاشقوں کے رونے کی کچھ او ہی ہوتی ہے ٹہنا دیکھ ہم روتے ہیں لختِ دل جو تھا ہم تو جتن
ہم نہ کہتے تھے تجھے ظالم کہ آیا بات سن ابر را با دیدۂ گریان من نسبت مکن
نسبت بارید گی دارد دے خونبار نیست

سعیدی - بی اے (علیگ)
ایم - آر - اے - ایس (لندن)

فلسفۂ مذہب

(بہ سلسلۂ ماسبق)

مذہب اور تکوین

انسان کو عالم کی ابتدا یا انتہا کا کوئی علم نہیں ہے اور نہ ذہن ہی کی مدد سے کسی ایسے وقت کا تصور ہو سکتا ہے جس کے پہلے یا بعد کچھ نہو - پھر بھی ابتدا اور انتہا ماننے کے لئے ہم مجبور ہیں - گویا ہمارا ذہن اس معاملے میں دونوں حالتوں کی نفی کرتا رہتا ہے - یعنی جسوقت ہم کسی حالت کی ابتدا یا انتہا قرار دیتے ہیں تو اس سے پہلے اور اس سے بعد کی حالتوں کا تصوّر خود بخود پیدا ہو جاتا ہے اور جس وقت ہم اس سلسلے کو بغیر ابتدا اور بغیر انتہا کے یعنی لاتناہی قرار دیتے ہیں تو ذہن اس سلسلے کو ختم کرنے کا تقاضا کرتا ہے"

(کتاب "قیل و قال" مصنفہ مسٹر محمد فاروق - ایم - ایس سی)

بالکل یہی مشکلات الٰہیات کو فلسفہ کی مدد سے سمجھنے میں لاحق ہوتی ہیں' اور آخر میں ایک فلسفی کو اقرار کرنا پڑتا ہے کہ زمانہ، مادہ، خلا، سماوات، خدا - یہ سب ناگزیر مگر ناقابل فہم مسلمات ہیں - اور الہیات کی طرح آفرینش عالم کا مسئلہ بھی فلسفی موشگافیوں میں الجھ کر رہجاتا ہے - تا وقتیکہ ہم ایک قول محکم یا الہام کی طرف رجوع نہ کریں -

جب انسان نے اپنی ہستی اور کائنات کے نظام و ترتیب پر نظر ڈالی تو اس سوال کے ساتھ کہ اس عالم کا کون خالق ہے - یہ سوال لازمی طور سے پیدا ہوا کہ یہ عالم کیونکر پیدا ہوا - روزمرہ کے مشاہدات کے جو اثرات ہمارے دماغ میں محفوظ ہوتے رہتے ہیں - ان کی مدد سے ہم فوراً کسی چیز کے وجود کو اس سے پہلے ایک قطرہ یا بیج کی طرف منسوب کرتے ہیں جسکو ہم نے ملاحظہ کیا ہے اور ان پر قوت نمو اور چند اصول ارتقاء کے اثرات کو مانتے ہوئے کائنات کی درجہ بدرجہ تبدیلیِ ہیئت کو ایک مسلمہ واقعہ مان لیتے ہیں مگر جب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تخم کہاں سے پیدا ہوا تو اگرچہ بظاہر تخم خود اس چیز سے پیدا ہوا جس کا وہ تخم کہلاتا ہے مگر مخرج الحی من المیّت و مخرج المیت من الحی کے سوا ہم نہیں کہہ سکتے کہ پہلے بیج پیدا ہوا ہے یا وہ چیز جس سے بیج نکلا ہے - اگرچہ انسانی عقل گوناگوں مخلوقات کے سلسلۂ نسب کو پیچھے ہٹاتے ہوئے کم سے کم آخر میں ایک اولیں مادہ یا ذرہ یا نقطہ یا مرکز یا تخم (جو کچھ بھی کہو) پر جاکر ٹھہر جاتا ہے اور اس کو اس تمام کثرت میں وحدت کا نتیجہ ملتا ہے مگر پھر بھی عقل اس مادہ یا بیج کا اصل پانے سے عاجز ہے اور اسی جگہ سے مذہبیت اور لامذہبیت کے راستے پھوٹتے ہیں - چنانچہ اس حیثیت سے مسئلہ تکوین مذہبی اعتقاد کا جزو عظیم ہے - اس عنوان میں ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ سب سے پہلے انسان کی اولین فطرت نے اس کا کیا جواب دیا ہے پھر عقل سلیم یا عقل فلاسفہ کیا کہتی ہے - اور پھر اس مشکل کو الہام نے کیونکر حل کیا ہے -

انسان کے ابتدائی ذہن نے یہ کبھی فرض نہیں کیا تھا کہ جو کچھ آسمان و زمین میں ہے وہ بغیر کسی اصلی مادے کے بنا ہے محض عدم سے کسی چیز کا وجود میں آنا انسان کی ابتدائی عقل تسلیم کرنے سے عاری تھی زمین کی خلقت عام طور سے کسی مفروضہ جانور یا پرند کی طرف منسوب کی جاتی ہے کیونکہ جب تک انسان خود اپنی ہستی کا ابتدائی سر رشتہ نہیں پاتا اس سے بالاتر خالق کے وجود کو سمجھنا تقریباً ناممکنات سے ہے۔ اس لئے زمین کے بنانے والے دابۃ الارض کے لئے ضرور تھا کہ اس میں خلاقی کی مافوق العادۃ صفات تصور کی جائے جو اسکے عظیم الشان کاموں کا آلہ تھیں۔ انسان کا ابتدائی خیال یہ تھا کہ شروع میں ایک کیڑا ہوا۔ جو بڑھتے بڑھتے عظیم الجثہ انسانی ہیولیٰ میں منتقل ہوگیا اور وہی ترقی کرتے کرتے آخر میں خالق اکبر کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس عظیم الشان انسانی ہیولیٰ جسے یونان کی منتہا لوجی ڈیمیرج (DEMIURGE) کے نام سے معروف کرتی ہے اور وہ ادنیٰ کیڑا جس نے اس صورت میں ترقی کی ہے۔ ان دونوں کے درمیانی درجے میں انسان کا وجود ہے کائنات کی خلقت پر جو مختلف خیالات عام طور سے وحشی اور قدیم اقوام میں پائے جاتے ہیں ان کا مجمل ذکر یہاں بیجا نہ ہوگا۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھو انسائکلو پیڈیا برٹینیا کا مضمون

cosmogony

امریکہ کی وحشی قوموں کا خیال ہے کہ پہلے ایک کالے کوے نے انڈا دیا اور اس انڈے سے انسان پیدا ہوا اور یہ عجیب و غریب قسم کا کوا جو اُن کی زبان میں "ٹیل" یا "یلچ" کہلاتا ہے وہ ایک ڈبے سے چاند۔ سورج اور ستاروں کی گولیوں کو چرا لیجاتا ہے اور اس کے ذریعے سے دنیا کو روشن کرتا ہے۔ اس کوے کا ایک مخالف اور ضدی بھی تصور کیا گیا ہے۔ جو رشتہ میں اس کا ماموں یا چچا لگتا ہے۔

بعض دوسری امریکہ کی وحشی قوموں کا خیال ہے کہ زمین کا بنانے والا ایک بڑا خرگوش تھا جس کو وہ اپنی زبان میں "مسیکابو" کہتے ہیں۔ وہ چند دوسرے جانوروں کی سرداری میں ایک بحر ناپیدا کنار پر ایک تختہ کے اوپر پڑا ہوا ہے پھر یہ جانور اپنے ماتحت جانوروں کو سمندر میں غوطے لگانے کو بھیجتا ہے سمندر کے اندر سے وہ ریگ کا ایک ایک ذرہ لاتے ہیں اور اس سے وہ ایک جزیرہ بناتا ہے۔

بعض دوسری وحشی قوموں میں یہ خیال ہے کہ دنیا میں سوائے پانی کے کچھ نہ تھا اور پانی کے اوپر آسمان تھا۔ پھر آسمان میں ایک سوراخ ہوگیا اور اس سوراخ سے ایک شخص سمندر میں گرا۔ اس کو سمندر کے ایک کچھوے نے اپنی پیٹھ پر لے لیا۔ جس پر پہلے سے کسی دریائی جانور نے کچھ مٹی رکھدی تھی۔ یہاں اس کو حمل ہوگیا۔ جس سے ایک لڑکی پیدا ہوئی اور پھر اس سے دو توام لڑکے پیدا ہوئے ان لڑکوں میں سے ایک لڑکے نے اپنی ماں کو قتل کردیا۔ پھر اس مقتولہ کی لاش سے ایک درخت پیدا ہوا۔ دوسرا لڑکا مارے خوف کے مغرب کی طرف بھاگ گیا اور اب وہ مرے ہوئے لوگوں پر حکمراں ہے۔ پہلے لڑکے نے جانور اور انسان پیدا کئے اور جب وہ سب کچھ کرچکا تو مشرق کی طرف غائب ہوگیا۔ جہاں وہ اپنی نانی کے شوہر کی حیثیت سے زندگی بسر کر رہا ہے۔

اہل میکسکو کا اعتقاد تھا کہ دنیا کی خلقت پانچ ادوار یا زمانوں میں ہوتی ہے یا پانچ آفتابوں کے قیام میں۔ پہلا آفتاب یا زمانہ دنیا کا تھا۔ دوسرا آگ کا تیسرا پانی کا چوتھا ہوا کا اور پانچواں بے نام ہے۔ ہر ایک جگ یا زمانہ ایک آفت ارضی کے ساتھ ختم ہوگیا۔ مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ اہل میکسکو نے ان پانچ ادوار کے خلقت کے لئے کون سا نظریہ قائم کیا تھا۔ اہل پیرو (جنوبی امریکہ

میں مصریوں کی طرح آفتاب کے دیوتا کی پرستش ہوتی تھی۔ لیکن اس دیوتا کے اوپر اور بہت سے خالق تھے۔ انھیں میں سے ایک کا نام "دہری کوکا" تھا جس کو اہل سیرو نے اپنی مناجات میں دنیا کا بنانے والا اور دنیا کا انتظام کرنے والا مانا ہے۔ اس دیوتا کا تعلق پانی سے تھا۔ ایک دوسرا خالق دیوتا "ماتکو کاپک" کے نام سے مشہور تھا جس کے معنی عظیم الشان کے ہیں اور اس کی بہن جو اس کی زوجہ بھی ہے اس کا نام "ماما ایلو" تھا جسکے لفظی معنی "مادر بیضہ" ہے۔ یہ دونوں دیوتا بعد کو سورج اور چاند ہوگئے اور ان دونوں کی اولاد سے بادشاہانِ سیرو ہوئے ہیں۔ اہل سیرو میں خالق کے مخالف شیطان کے عقیدے کا بھی پتہ چلتا ہے اور ایک قصہ کے مطابق خالق دیوتا کا ایک شریر لڑکا تھا جو اپنے باپ کی بنائی ہوئی چیزوں کے بگاڑنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ باپ نے اس سے ناراض ہوکر اس کو سمندر میں پھینک دیا۔

جزائر اوقیانوس کے وحشی باشندوں میں پیدائش کے متعلق بہت دلچسپ فسانے ہیں۔ نیوزیلینڈ کی قوم "ماوری" ــــ کا عقیدہ ہے کہ آسمان و زمین پہلے ایک تھے۔ پھر ایک زمانے میں وہ ایک دوسرے سے جدا ہوگئے۔ یہ ہی خیال تقریباً اہل چین و یونان و ہند و بابل کا تھا "ماوری" کی اصطلاح میں آسمان کا نام رانگی اور زمین کا نام پاپا ہے اور ان دونوں کے اجتماع سے "تنگالو" پیدا ہوا جو سمندر کا دیوتا ہے اور پھر اس سے مچھلیاں اور رینگنے والے جانور پیدا ہوئے۔ بعض اوقیانوسی اقوام اسی کو آسمان کا دیوتا بھی کہتے ہیں۔ ان اقوام کا خیال ہے کہ آسمان بھی سمندر کی طرح ایک بحر محیط ہے اور بادل جو آسمان پر تیرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں وہ آسمان کی کشتیاں ہیں۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ یہ دیوتا انڈے کے چھلکے کے اندر رہتا ہے اور جیوں جیوں وہ دنیا کو بڑھاتا جاتا ہے اوپر کا چھلکا پھیلتا جاتا ہے اور چھلکوں کی شکست و ریزے سے سمندر میں جزیرے بنتے ہیں۔ بعض قوموں کا خیال ہے کہ وہ ایک چڑیا کی طرح سمندر کی فضا پر منڈلایا کرتی ہے۔ اور اس کے انڈے سے جو اس نے سمندر پر دیا ہے زمین پیدا ہوئی اور اسی کے محراب دار حصے سے آسمان یا سورج بنے۔ یہ ہی دیوتا تمام کائنات کا خالق ہے اور یہ ہی طوفان و سیلاب و باران کا خدا ہے۔ ان لوگوں میں یہ خیال بھی پیدا ہوا ہے کہ آخر اس دیوتا کو کس نے پیدا کیا اور آخر میں ایک فرضی شخص "پو" یعنی تاریکی پر تمام خلقت ختم ہوجاتی ہے۔

ہندوؤں میں تخلیق کے بارے میں جہاں رگوید کا یہ منتر ہے "تب نہ کچھ تھا نہ کیا تھا" منوجی نے اس کی تفسیر میں ایک بڑی لمبی چوڑی رام کہانی سنائی ہے (شائقین اسکی پوری صراحت کتاب الہند البیرونی میں پائینگے) مختصر یہ ہے کہ خدائے موجود نے اپنے امر سے پانی پیدا کیا۔ اور اس میں ایک تخم ڈالا جو بڑھکر ایک سنہرا انڈا ہوگیا۔ اور اسی انڈے سے وہ خود برہما کے اوتار میں پیدا ہوا۔ اور پھر برہما سے تمام عالم پیدا ہوا۔

قدیم مصریوں کا اعتقاد تھا کہ ذرات جس سے کائنات کی خلقت ہوئی ہے وہ ایک زمانۂ دراز تک تاریک طوفان میں بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔ اس طوفان کو مصری "نون" یا "نو" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ لیکن یہ ذرات اس طوفانِ تار سے کیسے برآمد ہوئے۔ وہ کئی صورت سے بیان کئے جاتے ہیں۔ بعض جگہ اس خالق دیوتا کا نام "نونون" ہے

جس نے ایک انڈا یا زمین بنائی اور اُس نے ہی آدمی کی خلقت بھی کی۔ بعض دوسرے مقامات پر "تاح" ایک صانع دیوتا اپنی کلہاڑی سے انڈے کا توڑنے والا خیال کیا جاتا تھا بعض اوقات "توطھ" چاند دیوتا جو عقل اول خیال کیا جاتا ہے۔ اس نے زمین کو اپنے کلام سے پیدا کیا "را" دیوتا کے متعلق یہ روایت مشہور ہے کہ وہ دنیا کا پہلا بادشاہ تھا۔ اس کی آخری عمر میں انسان نے اس کی کچھ حرمت نہ کی اور اسواسطے اس نے ناراض ہو کر چاہا کہ تمام انسانوں کا قتل عام کردے مگر بعد کو ایک آسمانی گائے پر سوار ہو کر دنیا سے چلا گیا اور وہاں جاکر ایک اور نئی دنیا اپنے رہنے کے لئے بنائی جو آسمان ہے۔

مجوسیوں کی کتاب "نبداہش" میں تخلیق کا ذکر یوں ہے کہ ابتدا میں نیکی و بدی کے دو مقابل و مخالف خدا نے روحوں نے اپنی اپنی علیحدہ مخلوق بنائی۔ کوئی تین ہزار برس تک دونوں کی مخلوق علیحدہ علیحدہ امن کے ساتھ پھیلتی گئی اس کے بعد نیک و بد روح میں جھگڑا ہوا اور چونکہ پہلے سے یہ قول ہو چکا تھا کہ نیک روح کی مخلوق نو ہزار برس سے زیادہ قائم نہ رہیگی۔ مگر نیک روح نے ایک منتر پڑھکر بری روح اور اسکی مخلوق میں گڑبڑ ڈالدی اور یہ گڑبڑ دوسرے تین ہزار برس تک رہی اور اس موقع سے فائدہ اٹھاکر نیک روح نے پھر ملائکہ۔ چاند۔ سورج۔ آسمان کو بنایا۔ تین ہزار سال کے بعد بُری روح اپنے شیاطین کی مدد سے جسکو اس نے پیدا کیا تھا پھر نیک روح کے مقابل آتی ہے اور ان شیاطین کی لڑائی نیک روح کی مخلوق سے شروع ہوتی ہے جو شمار میں چھ ہیں یعنی آسمان۔ پانی۔ زمین۔ نباتات۔ حیوانات۔ اور انسان۔ آخر الذکر کے اجداد اولین گائے اور کیامرث تھے۔

اہل کنعان و یونان میں بھی مصریوں کی طرح طوفان کے اندر سے ذرات کا نکلنا اور اُس کے بعد ایک انڈے کا پیدا ہونا اور پھر اس آسمان وزمین کا بننا وغیرہ اعتقادات تھے۔

پس انسان کے فطری قوائے ادراک نے تکوین کے بارے میں جو کچھ وہم وگمان کیا ہے اس سے دو نتیجے مستنبط ہوتے ہیں۔ اول تو یہ کہ انسانی شعور (Instinct) اس کو دنیا کے ابتدا اور انتہا کے سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ مشاہدات کے اثر سے وہ اس کہنے کے قابل نہیں ہوتا کہ کائنات بالکل نیستی سے ظہور میں آئی۔ بلکہ وہ خیال کرتا ہے کہ ایک اصلی مادہ ہے جس سے تمام چیزیں ظہور میں آئی ہیں۔ اس مادہ کو غیر حادث اور ازلیت کا درجہ دینے کی طرف اسکا ذہن فوراً مائل ہوتا ہے مگر جب عقل سلیم اس پر غور کرتی ہے کہ مادے کے اُن بے شمار اشکال میں جو مختلف خصوصیتیں پائی جاتی ہیں۔ ان سب کا منبع و مخرج کیونکر ایک مادہ ہوسکتا ہے جب تک کوئی غیبی ہاتھ ان مادوں کو مختلف شکل واصناع وخصوصیت کے ساتھ پیدا نہ کرے تو انسانی عقول الہیات کی طرف مائل ہوتی ہے اور اس حیثیت سے مجوسیوں کا عقیدہ کہ ارواح نیک وبد مخلوقات کو ہستی سے ہستی کی طرف لائی ایک حد تک الہامی مذہب سے قریب آجاتا ہے۔

ارسطو کا خیال تھا کہ خدا نے بالذات ایک چیز پیدا کی۔ پھر اس نے ایک اور چیز پیدا کی اور اسطرح واسطہ در واسطہ تمام عالم وجود میں آیا۔ چنانچہ مخلوقات کی ترتیب یہ ہے کہ خدا نے سب سے پہلے عقل اول کو پیدا کیا۔ اس نے نفس کو۔ نفس نے

افلاک کو اور افلاک نے تمام عالم کو۔ اس صورت میں خدا نے اگرچہ تمام عالم کو پیدا کیا ہے لیکن وہ تمام عالم کا بلا واسطہ خالق نہیں ہے۔ ایک شے سے جب متعدد اشیاء صادر ہوتی ہیں تو اس تعداد کے مختلف اسباب ہوتے ہیں۔ ان کے آلات مختلف ہوتے ہیں۔ اور مواد کے اختلاف کی وجہ سے مختلف اثر ظاہر ہوتے ہیں۔ خدا کی ذات میں ان تینوں میں سے کوئی طریقہ نہیں پایا جا سکتا مرکب القوے ہونا تو علانیہ باطل ہے۔ دوسرا احتمال اس لئے باطل ہے کہ ان آلات کا کوئی خالق ہوگا اور اگر کوئی اور عالق ہوگا تو خدا کا تعدد لازم آتا ہے۔ اور اگر خدا ہی انکا بھی خالق ہے تو اس کے بنانے میں اور آلات کی ضرورت پڑی ہوگی اور اس صورت میں آلات در آلات کا غیر متناہی سلسلہ ماننا پڑے گا۔ اب صرف تیسرا احتمال رہجاتا ہے۔ اس میں بھی صرف یہی سوال پیدا ہوگا کہ ان مختلف مادوں کو کس نے پیدا کیا۔ خود خدا تو مختلف چیزوں کو پیدا نہیں کر سکتا۔ اگر اور کسی نے پیدا کیا تو خدا کا تعدد لازم آتا ہے۔ اور یہ تینوں طریقے خدا کی نسبت ممکن نہیں۔ جالینوس کا خیال تھا کہ عدم محض سے کوئی چیز پیدا نہیں ہو سکتی۔ عالم میں جو کچھ وجود میں آتا ہے۔ اس کا مادہ پہلے سے موجود تھا اس لئے مادہ قدیم ہے، خدا نے مادے کو پیدا نہیں کیا، بلکہ مادہ جو صورت اختیار کرتا ہے وہی خدا کا فعل ہے۔ اس کے جواب میں اسکندر فردوسی کا قول ہے کہ عالم محض عدم سے پیدا ہوا۔ ابن مسکویہ نے اس قول کو لیکر اس کی وضاحت کی ہے جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔ (دیکھو تاریخ الکلام علامہ شبلی)

اس قدر سب کے نزدیک مسلم ہے کہ مادہ جب ایک صورت بدل کر دوسری صورت اختیار کرتا ہے تو پہلی صورت بالکل معدوم ہوجاتی ہے کیونکہ اگر معدوم نہ ہو تو صرف دو احتمال ہیں۔ یا یہ کہ وہ صورت منتقل ہوکر کسی اور جسم میں چلی جائے یا یہ کہ جہاں تھی وہیں موجود رہے۔ پہلی صورت بداہتہً غلط ہے۔ ہم اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں کہ مثلاً ہم جب موم کے ایک کرے کو مسطح شکل میں بدل دیتے ہیں تو کرویت کی شکل کسی دوسرے جسم میں منتقل نہیں ہوجاتی۔ دوسرا احتمال اس لئے باطل ہے کہ اگر دوسری صورت کے پیدا ہونے کے بعد پہلی صورت بھی قایم رہے تو اجتماع النقیضین لازم آئیگا یعنی ایک چیز ایک ہی وقت میں گول بھی ہو۔ لانبی بھی ہو۔ اسلئے ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ جب نئی صورت پیدا ہوئی ہے تو پہلی صورت بالکل معدوم ہوجاتی ہے اور جب یہ ثابت ہوا کہ پہلی صورت بالکل معدوم ہوجاتی ہے تو اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ نئی صورت عدم محض سے وجود میں آئی۔ اب صرف جوہر کی نسبت اس دعوے کا ثابت کرنا باقی رہجاتا ہے۔ اس کے لئے مقدمات ذیل کو ذہن نشین کرنا چاہئے

(۱) مرکبات کی تحلیل، اخیر میں بسائط تک منتہی ہوتی ہے اور آخر میں صرف ایک مادہ بسیط رہجاتا ہے۔

(۲) یہ بدیہی امر ہے کہ مادہ کسی حالت میں صورت سے جدا نہیں ہو سکتا مادہ میں ہزار طرح کا انقلاب پیدا کیا جائے۔ لیکن کوئی نہ کوئی صورت باقی رہیگی اس لئے مادہ اور صورت متلازم ہیں۔

(۳) پہلے یہ ثابت ہوچکا ہے کہ صورت قدیم نہیں ہے بلکہ عدم محض سے وجود میں آئی ہے۔ اس کے ساتھ جب یہ بھی ثابت ہوا کہ مادہ کسی حالت میں صورت سے جدا نہیں ہو سکتا تو ضرور ہے کہ مادہ بھی قدیم نہ ہو ورنہ صورت کا بھی قدیم ہونا لازم آئیگا

اور جب مادہ حادث ٹھہرا تو ضرور ہے کہ عدم محض سے وجود میں آیا ہو کیونکہ مادہ بسیط محض ہے اور اس سے پہلے کوئی چیز موجود نہ تھی جس سے مادہ پیدا ہوا ہو۔

اب اگر ہم انفرادی طور سے کسی انسان کی خلقت کی تحقیق کریں تو معلوم ہوگا کہ جمادات روزمرہ تحلیل ہو کر نباتات کی صورت میں منتقل ہوتے رہتے ہیں نباتات جانوروں کی غذا بنتی ہے۔ انسان نباتات اور حیوانات دونوں کو ہضم کرتا ہے جس سے اس کا خون بنتا ہے خون سے نطفہ کی پرورش اور پیدائش ہوتی ہے۔ نطفہ جب ماں کی رحم میں منتقل ہوتا ہے تو وہ ایک نہایت ادنیٰ قسم کا کیڑا ہوتا ہے۔ گویا حیوانیت کی پہلی منزل میں ہوتا ہے گویا ماں کے پیٹ میں نو مہینے کے اندر اسپر وہ تمام ارتقائی حالتیں گزرتی ہیں جو ظہور انسان سے پہلے غالباً لاکھوں صورتوں میں حیوانات پر گزری ہونگی" یہ ایک مختصر عالم کی کیفیت ہے جسپر ایک مختصر زمانے میں ارتقار کے تمام دور ختم ہو جاتے ہیں اس سے آگے بڑھکر ہم جب اپنے گرد کے عالم کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ہم کو اس نظریہ کے قایم کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی کہ خلقت عالم بھی اسیطرح ایک ارتقائی قانون کی پابند ہوگی جس کو ایک حد تک علمائے اثریات وطبقات الارض کی تحقیق نے زیادہ واضح کر دیا ہے۔ تو زمین و آسمان بقول جان اسٹوارٹ مل کے ایک بخار کے بادل سے شروع ہوئے۔ اس کا نام سائنس کی اصطلاح میں نیبولا (Nebula) ہے یہاں تک تو فلسفہ اور مذہب الہام متفق ہیں (ثم استوےٰ الی السماء وھی دخان") جہاں سے ان دونوں کے اختلافات شروع ہوتے ہیں وہ یہ ہے کہ نیبولا کے عقیدے کو مان کر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ نیبولا یا بخار کا بادل کیونکر پیدا ہوا اور اس کا آغاز کیونکر ہوا مگر یہاں پر سائنس سوال تو پیدا کرتی ہے مگر اس کا جواب نہیں دیسکتی اور یہی وہ حد خیال ہے جہاں سے مذہب کی حکومت شروع ہوتی ہے۔

اگر ہم یہ مانیں کہ مادہ کے اجزا بلا کسی علت کے خود بخود حرکت کرنے لگے اور حرکت سے تکاثف شروع ہو گیا تو ہم یہ فرض کرینگے کہ اُن کی حرکت دائمی ہوگی مگر پھر بھی مادہ کی ابتدائی شکل سے موجودہ صورت میں آنے تک خواہ کیسا ہی بڑا اور طویل زمانہ صرف ہوا ہو۔ تاہم وہ زمانہ محدود ہوگا۔ اور اس زمانے سے پہلے مادہ کا اپنی سادہ حالت میں موجود رہنے کا زمانہ غیر متناہی ہوگا۔ پس اس قدر عرصہ تک مادہ کا بے حس وحرکت اور بغیر اجتماع کے موجود رہنا اور آخر میں ایک وقت پر تکوین عالم کا سلسلہ شروع کر دینا ایسا فعل ہے جسکی کوئی علت مانی نہیں جاتی۔ اور سبب کا بغیر سبب کے موجود ہونا سمجھ میں نہیں آتا لہٰذا ہر چیز موجودہ عالم کے ایک محدود عرصہ کو ثابت کرتی ہے۔ کیونکہ اس کی جو شکل اب ہے وہ ایک وقت میں نہ تھی اور اس کی حالت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ اس لئے اس کا آغاز کہیں نہ کہیں سے فرض کرنا پڑتا ہے۔ ہم نے اصول موضوعہ کے طور پر اس دنیا کے آغاز میں بخار جیسی حالت کو فرض کر لیا ہے جس کے ذرات مع اپنے قوائے جاذبہ دافعہ کے ایک دوسرے سے الگ ہوں گے اور یکساں طور پر منقسم ہوں گے۔ کیونکہ ذرات اگر یکساں پھیلے ہوئے ہوتے تو قوت جاذبہ ان اجزا کو ایک غبار کی صورت میں جو ہمیشہ کروی شکل میں رہے کسی عام مرکز ثقل کی طرف کھینچ لاتی اور قوت دافعہ اجزا کی باہمی رگڑ سے متحرک

ہوکر اور حرارت بنکر بغیر کوئی نتیجہ پیدا کئے ہوئے ایتھر میں سے گزر جاتی ہے پس اس وقت میں ضرور ہے کہ ان اجزا کی وضع اور اطوار باہم دگر مختلف ہوں گے اور وہ اجزا خاص خاص مرکزوں کی طرف کھنچے جا رہے ہوں گے اور ان ـــــ کی مقدار اور ان کی حرکتوں کی مقدار میں بے انتہا تبدیلیاں ہوئی ہونگی اور اس طرح جمع کرنے والی قوتوں اور پھیلانے والی طاقتوں کی بساط سے بار بار ذرات کی حیثیت کے بدلنے پر دنیا کے یہ انقلاب واقع ہوتے رہے ہونگے جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ جو چیز یکساں تھی اس سے ترقی ہوکر وہ اجسام پیدا ہونے لگے جو حقیقت میں ایک دوسرے کے مشابہ نہیں ہیں اور جو چیز بے شکل تھی وہ شکل دار ہوگئی اور سادہ چیز مرکب در مرکب بنتی گئی۔ حتیٰ کہ یہ ترکیب جاندار مخلوق میں اعلیٰ سے اعلیٰ درجے تک پہونچ گئی۔ مگر اس تادیل سے بھی اگرچہ زمانہ کو اور زیادہ دراز ماننا پڑے گا۔ اس کا زمانہ بھی ضرور محدود ہوگا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تغیرات چاہے کیسے طویل در طویل ماننے جائیں اور خواہ اُن کی حرکت بھی بجائے انجماد کی جانب ہو یا کسی اور طرز پر وہ سب ایک محدود زمانہ چاہتے ہیں اور قدیم نہیں ہو سکتے۔ اس لئے اگر مادہ قدیم ہے۔ تب یہی ضرور ہے کہ وہ پہلے بالکل سادہ شکل میں ہو۔ پس اگر مادہ کے سوا کوئی اور حالت موجود نہیں تو لازم آتا ہے کہ وہ اپنے سادگی کے لامحدود زمانے کو ختم کرکے ایک وقت پر بغیر کسی علت کے وہ تشکلیں اختیار کرنے لگا ہے جس کا نتیجہ دنیا کی موجودہ حالت ہے غرض علمی مشاہدہ سے جس قدر ثبوت مہیا ہو سکتا ہے اس کا یہ نتیجہ یقینی ہے کہ محض مادہ واقعات عالم کو پیدا کرنے کے لئے بالکل ناکافی ہے اور ایسا خیال کرنا معلول کو بغیر علت کے ماننا ہے جو قابل تسلیم نہیں۔

یہاں تک جن احتمالات کا ذکر ہوا ہے وہ ان لوگوں کے دماغ کا نتیجہ ہیں جنھوں نے موجودات عالم کو دیکھا مگر انکی دلچسپیوں میں اس قدر محو ہوئے کہ اپنے خیال کو دنیا سے پرے تک نہ لیجا سکے اور اس لئے ابھی تک مذہبی عنصر یعنی نادیدہ ہستی کا اعتراف نہیں پایا گیا۔ لیکن آگے بڑھ کر جو خیالات پیدا کئے گئے ہیں وہ باختلاف مدارج اس غیر محسوس کا اعتراف کرتے ہیں۔ چنانچہ اُن میں سے ایک وہ احتمال ہے جس میں کائنات کو ایک بالاتر ہستی سے وابستہ کیا ہے لیکن موجودات عالم کی عظمت بھی دل میں جاگزیں رہی ہے اور خدا اور مخلوق دونوں کو قدیم مان کر خدا کو اس مملکت پر قابض تسلیم کیا گیا ہے اور اس طرح پر کبھی خدا اور مادہ کبھی خدا اور شیطان اور کبھی خدا۔ مادہ اور روح تینوں کو غیر مخلوق اور قدیم ہونے کی عزت دی گئی ہے۔"

(پروفیسر محمود علی فی الکتاب دین و دانش)

پس خدا اور مخلوقات کے تعلق سمجھنے کے لئے موجودات عالم کی نسبت تین احتمال پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) قدیم سے اسی طرح موجود ہوں گے۔

(۲) خود بخود پیدا ہو گئے ہوں گے۔

(۳) یا کسی خدا نے اُن کو پیدا کیا ہوگا

پہلے احتمال کی نسبت ہمیشہ سے موجود رہنے کے لئے غیر محدود زمانہ فرض کرنا پڑے گا۔ حالانکہ غیر محدود زمانۂ ماضی کا ان
سمجھنا ممکن ہے۔ دوسرے احتمال کی نسبت یہ اعتراض ہوتا ہے کہ پیدا ہونے کے لئے کسی علت کا ہونا ضروری ہے۔ ورنہ قانو
فاعلیت کا باطل ہونا لازم آئے گا اور تیسرے احتمال یعنی خدا کی قدرت سے پیدا ہونے کی نسبت تین اعتراض پیدا ہوتے ہیں
اول تو یہ کہ بغیر مادہ کے پیدا کرنے کی کوئی نظیر نہیں اور اگر مادے سے پیدا کیا ہے تو پھر اس مادے کی نسبت وہی تین احتمال
ہو سکتے ہیں اور ہر احتمال پر اعتراض وارد ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جس فضا میں یہ دنیا ہے وہ کہاں سے آئی۔ اگر دنیا کو بھی
خدا نے پیدا کیا تو مخلوقات سے پہلے فضا بھی ہوگی۔ حالانکہ ہم فضا کے نہ ہونے کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اور تیسرے یہ کہ
بنانے والا کہاں سے آیا۔ آیا وہ قدیم سے تھا یا خود بخود پیدا ہوا یا اس کو کسی اور خدا نے پیدا کیا اگرچہ یہ احتمالات ناقابل
حل ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ موجودات عالم کو ہم اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں کہ ان کی حالت یوماً فیوماً اور لحظہ بہ لحظہ بدلتی رہتی ہے
حتیٰ کہ ہماری عقل کی صحیح رفتار نے ثابت کر دیا ہے کہ تمام زمین و آسمان ایک وقت پر اس صورت میں نہ تھے بلکہ جب سے
موجود ہیں اپنی شکلوں کو بدلتے رہے ہیں۔ پس اگر یہ مخلوق ہمیشہ سے مانی جائے تو سمجھ نہ سکنے کے علاوہ یہ بھی لازم آتا ہے کہ
ان کے تغیرات بھی بغیر کسی علت کے خود بخود پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ اس احتمال پر بھی قانون
علیت کا باطل ہونا لازم آتا ہے اور اس وجہ سے اس احتمال پر جو اعتراض ہے وہ وزن میں دوسرے احتمال کے
اعتراض سے مشابہت رکھتا ہے اور قانون دائمی کو توڑنے کے سبب اس احتمال کو بھی قابل ترک قرار دینا چاہیے

اب ہم الہام کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ خدا نے کائنات کو چھ دور میں پیدا کیا۔ قرآن میں لفظ "ایام" ادوار
کے معنے میں آیا ہے۔ ایام سے ہمارا ذہن ایک محدود وقت کی طرف جاتا ہے جو طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک
ہے لیکن کوئی شخص یہ تصور نہیں کر سکتا کہ آفتاب و ماہتاب و زمین بنانے کے وقت دن سے مراد یہی ہمارا دن ہوگا ان ادوار
کا کوئی متعین زمانہ نہیں کیا جا سکتا ممکن ہے ہزارہا سال ہو یا لاکھوں سال یا کروڑوں سال، خود قرآن میں بعض جگہ دن کا
شمار ہزار سال کے برابر کیا گیا ہے

(۱) وان یوماً عند ربک کالف سنۃ مما تعدون

(۲) یدبر الامر من السماء الی الارض ثم یعرج الیہ فی یوم کان مقدارہ الف سنۃ مما تعدون۔

محققین کی رائے ہے کہ کسی زمانے میں جس کا شمار کروڑوں سال کی تعداد میں کیا جا سکتا ہے زمین ایک آتشین
گولا تھی اور اغلب ہے کہ اس سے پہلے کرۂ آفتاب کا ایک جز رہی ہو جس سے جدا ہو کر اس نے ایک علیحدہ کرہ کی صورت اختیار کر لی
(اولم یر الذین کفروا ان السموات والارض کانتا رتقا ففتقنٰہما)

اور شدید حرارت و رانت میں پائی تھی حیوانات اور نباتات تو الگ رہے جمادات کی بھی یہ صورت نہ تھی جو اب ہے
تمام مادی اجزاء ایک شعلہ جوالہ کی طرح تھے گویا نہایت لطیف ہوائی جسم رکھتے تھے اور اس لطیف مادے کی بھی صرف چند

قسمیں تھیں۔ رفتہ رفتہ حرارت کے زوال کے ساتھ بعض اجزا نے رقیق صورت اختیار کرلی اور بعض پھر بھی دخان اور ابخرات کی صورت میں اس کے گرد نہایت گرم ہوائی غلاف بنائے ہوئے تھے۔ یہ حالت کم سے کم کروروں سال میں پیدا ہوئی زیادہ عرصے تک ٹھنڈی ہونے کے بعد زمین پر انجماد شروع ہوا۔ جس طرح دودھ میں کھولنے کے بعد بالائی پیدا ہوجاتی ہے چونکہ اندرونی حصہ میں حرارت اور سیلان اب بھی زیادہ تھا اس لئے اس میں ہروقت ایک ہیجان اٹھتا رہتا تھا جس سے بالائی طبقہ ہر وقت متزلزل رہتا اور جلد صورت بدلتا رہتا تھا۔ کبھی کوئی حصہ زیادہ ابھر جاتا تو کوئی حصہ زیادہ دب جاتا کبھی کہیں کہیں سے کوئی حصہ پھٹ جاتا اور بڑے بڑے غار پیدا ہوجاتے جس میں سے بھڑکتے ہوئے شعلے نکلتے رہتے۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ بلندی اور پستی نے زیادہ پائدار صورت اختیار کی اور جابجا بہت اونچے پہاڑ اور انھیں کے مقابلے میں بڑی بڑی گھاٹیاں اور غار پیدا ہوگئے۔ اگرچہ زمین کا بالائی حصہ سخت ہوکر اب مثل پتھر کے تھا۔ پھر بھی حرارت کھولتے ہوئے پانی سے زیادہ تھی اور اس وجہ سے پانی کے اجزا اب بھی کثیف ابر کی صورت میں ہوائی غلاف کے ساتھ زمین کو محیط تھے لیکن کہیں بھی ایک قطرہ پانی کا نہ تھا (والقی فی الارض من رواسی ان تمید بکم الخ)

جب زمین اور زیادہ ٹھنڈی ہوئی تو بارش کا سلسلہ شروع ہوا لیکن جلتے ہوئے توے پر جو پانی گرتا تھا۔ پھر بھاپ بنکر اڑجاتا تھا۔ لاکھوں سال بارش ہونے کے باوجود دریا اور سمندر کا کہیں وجود نہ تھا۔ اس حالت سے گزر کر زمین کی وہ صورت پیدا ہوئی جو ان تمام تغیرات کے ساتھ اب ہمارے سامنے موجود ہے۔ یعنی پانی نے زمین پر قیام اختیار کیا اور بعض بڑی بڑی گھاٹیوں اور غاروں کو بھر دیا جو سمندر ہوگئے متواتر بارش اور ہوا کے اثر سے پہاڑوں کے بعض حصے گھس پس کر پانی کے ساتھ نشیب میں آکر تہ نشین ہوتے اور بعض جگہ غاروں کے بھر جانے سے سطح زمین کی صورت پیدا ہوگئی۔

زمین کی یہ آخری صورت بھی اگرچہ کروڑہا سال سے قایم ہے لیکن اس دوران میں بھی بڑی بڑی تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں جو ابتدائی حالت کے مقابلے میں پھر بھی ادنے خیال کیجاسکتی ہیں۔ بعض وہ مقامات جو پہلے سمندر تھے اب خشک ہوکر براعظموں میں تبدیل ہوگئے۔ جیسے افریقہ کا صحرائے اعظم یا ہندوستان کا شمالی حصہ جس سے ہوکر دریائے گنگا اور دریائے اندس اب بہتے ہیں۔ اسی طرح بعض حصے جو اب سمندر ہیں پہلے خشک تھے۔ مثلاً بحر ہند کا وہ حصہ جو برہما اور اسٹریلیا کے درمیان میں ہے اور جس میں گزشتہ زمانے کی ایک براعظم کی یادگار جزائر ملایا کی صورت میں اب موجود ہے یا یورپ میں وہ آبنائے جو فرانس اور برطانیہ کے درمیان واقع ہے۔ غرضکہ ابتدا میں زمین کو جلد جلد اور عظیم الشان حوادث کا سامنا ہوتا تھا رفتہ رفتہ سکون کی حالت پیدا ہوگئی اور حوارت کا اثر کم اور دیرپا ہونے لگا۔

اس طرح گویا جمادات نے سرد و گرم زمانہ کا مقابلہ کرکے روز بروز اپنی ایک زیادہ دیرپا صورت اختیار کرنا شروع کی نباتات اور حیوانات کا دور اس کے بہت بعد شروع ہوا لیکن تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ جس قسم کے درخت اور جانور پہلے

اس دنیا میں پائے جاتے تھے اب وہ بالکل مفقود ہیں اور ان کی جگہ دوسری قسم کے درختوں اور جانوروں نے لےلی ہے مختلف زمانے کے اجسام نامیہ یعنی نباتات اور حیوانات کو جب ہم سلسلہ وار رکھ کر مقابلہ کرتے ہیں تو چند باتیں اُنمیں پاتے ہیں۔

اول یہ کہ ہر زمانے کی مخلوق اپنے سے پہلے زمانے کی مخلوق سے ملتی جلتی ہے اور جو تبدیلیاں ان کی صورت اور شکل میں ہوئی ہیں وہ بہت آہستہ آہستہ ہوئی ہیں۔ دوسرے یہ کہ نئی صورتیں ایسی پیدا ہوتی گئی ہیں جو حوادثِ زمانہ کا مقابلہ زیادہ قوت کیساتھ کرسکتی ہیں۔ تیسرے یہ کہ زمین کے مختلف حصوں میں پھیل جانے کی وجہ سے نباتات اور حیوانات نے اپنی ضرورت کے مطابق چند نسلوں میں اپنی صورت اور شکل میں تبدیلیاں پیدا کرلی ہیں۔ اس طرح گویا تمام اجسام نامیہ جو اس وقت تک دنیا میں پائے جاتے ہیں ایک ہی اصل کی شاخ ہیں جو لاکھوں صدیوں کے تغیرات کے بعد اب اپنی موجودہ صورت پر بظاہر قائم ہیں۔ لیکن در اصل قانون قدرت یا اصول ارتقاء اب بھی ان کے اندر کام کر رہا ہے اور ماحول کی مناسبت سے اب بھی ان میں وہی خفیف تبدیلیاں برابر جاری ہیں۔

بنی نوع انسان کے وجود کے متعلق قیاس کیا جاتا ہے کہ کم و بیش ایک لاکھ سال سے اس دنیا میں موجود ہے لیکن دس ہزار پہلے کے جن انسانوں کی لاشیں دستیاب ہوئی ہیں۔ ان کی ساخت جسمانی۔ ان کی ہڈیاں اور خاصکر ان کی کھوپریاں موجودہ زمانے کے انسانوں سے کسی قدر مختلف ہیں انکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ گو ان کے جسم بمقابلہ ہمارے زیادہ مضبوط تھے، مگر ان کی دماغی حالت اور قوائے ذہنی کمزور تھے یہی حالت دوسرے حیوانات کی بھی معلوم ہوتی ہے۔ زمانہ سابق کے بعض جانور نہایت عظیم الجثہ اور جسم کی بناوٹ کے لحاظ سے عجیب الخلقت تھے۔ مگر دماغ بہت چھوٹا اور کمزور رکھتے تھے۔ اور اس وجہ سے وہ اپنی نوع کو قائم نہ رکھ سکے۔ بالآخر قدرت نے ان کو رفتہ رفتہ دوسرے انواع میں تبدیل کردیا۔ جن کے قوائے ذہنی کو بمقابلہ اعضائے جسمانی کے زیادہ ترقی ہوتی گئی اور وہ حوادث عالم کا زیادہ خوش اسلوبی کے ساتھ مقابلہ کرنے کے قابل ہوتے گئے۔

پچاس ہزار سال یا ایک لاکھ سال قبل کے جو انسان تھے ان میں اور موجودہ زمانے کے بعض بندروں کی قسموں میں بہ لحاظ جسمانی اور دماغی ساخت کے بہت تھوڑا فرق معلوم ہوتا ہے اس وجہ سے اکثر یہ قیاس کیا گیا ہے اور یہ قیاس قرین عقل بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ سلسلۂ ارتقاء میں سے گزرتے ہوئے انسانیت سے پہلے ایک دور میمونیت کا بھی حضرت انسان پر گزرا ہے یا بہ الفاظ دیگر ایک لاکھ سال یا اس سے پہلے کے بندر تھیں جو تبدیلیاں بہ تقاضائے ارتقاء ہوئی ہیں ان کا مجموعی نتیجہ انسان کا وجود ہے۔

یہیں پہونچکر ایک مذہبی آدمی کا پیمانۂ صبر لبریز ہوجاتا ہے اور وہ بے اختیار سوال کر بیٹھتا ہے کہ کیوں صاحب حضرت آدم کو خدا نے پیدا نہیں کیا۔ میرے پاس صرف اس کا ایک جواب ہے۔ یعنی اس تمام سلسلۂ تغیرات میں مجھے

تو سوائے ایک واحد موثر کل حکیم و دانا ہستی کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ پھر اگر حضرت آدم کو خدا نے پیدا نہیں کیا تو کیا میں نے یا آپ نے پیدا کیا۔ لیکن میں اس بات کے سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اگر حضرت آدم یا بہ الفاظ دیگر حضرت انسان کی خلقت بجائے اتفاقی کے ارتقائی تسلیم کی جائے تو خدا کی خدائی پر کیا حرف آتا ہے۔ انسان کی پیدائش کا قصہ جیسا کہ کتب مذہبی میں مذکور ہے میں عمداً اس وقت اس کی تفصیلی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ بلکہ اصول ارتقاء کی وسعت اور اس قانون کی ہمہ گیری کے متعلق چند الفاظ لکھ کر ختم کرنا چاہتا ہوں۔ البتہ اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ انسان نے کب اور کس وقت اپنا طریق حیوانیت چھوڑ کر جامۂ انسانیت اختیار کیا اور نیابت الٰہیہ کا استحقاق پیدا کیا تو میں کہونگا کہ جس وقت سے اس نے اپنے گرد و پیش کے چیزوں کے نام رکھنے شروع کئے جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے (وعلم آدم الاسماء کلھا یعنی آدم کو سب چیزوں کے نام بتائے اور اسی نطق کے ذریعہ سے جب وہ ان رموز قدرت کو فاش کرنے پر آمادہ ہوا جس کا مشاہدہ مختلف صورت و اشکال میں سے گزرتے ہوئے اُس نے کیا تھا تو بہشت کی غیر ذمہ دارانہ زندگی اس سے چھین لی گئی

اب اگر ہم کارخانۂ قدرت پر ایک نظر وسیع ڈالیں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ نہ صرف خاکدان عنصری میں جسکو زمین کہتے ہیں بلکہ عالم خلق کے ہر ہر جزو پر چھوٹے چھوٹے ذروں سے لیکر عظیم الشان ثوابت تک جس کی روشنی ایک لاکھ اسی ہزار میل فی سکنڈ چلنے کے باوجود ہم تک برسوں بلکہ صدیوں اور کبھی ہزاروں برس میں پہونچتی ہے اصول ارتقاء کی حکمرانی ہے اور ہر آن اور ہر لحظہ کے تغیرات اسی ایک قانون کے ماتحت ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ نبی نوع انسان کے حالات کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو اس کی زندگی کے ہر شعبہ میں خواہ اس کا تعلق سیاسیات، تمدن، معاشرت، اخلاق، مذہب غرضکہ کسی شئے سے ہو ایک نہ ایک تغیر ہر لحظہ رونما ہوتا رہتا ہے اور ہر تغیر کا میلان یہ ہوتا ہے کہ پچھلی صورت کو چھوڑ کر نئی اور بہتر اور زیادہ پائیدار حالت اختیار کی جائے۔ حتیٰ کہ انسانی ذہن اور انسانی تخیلات میں اصول ارتقاء کے مطابق ترقی جاری ہے۔ انسان کو ایک ما فوق الانسان نوع میں تبدیل ہونے کیلئے صرف دس بیس ہزار سال کا عرصہ چاہئے اور کون کہہ سکتا ہے کہ آگے بڑھکر کیا ہونے والا ہے۔ حضرت مولینا جلال الدین رومی نے اس عمل ارتقاء کو بیان کرتے ہوئے انسان کی انتہائی ترقی کی طرف نہایت دلکش اشارہ کیا ہے۔"

از جمادی مردم و نامی شدم — وز نما مردم بہ حیواں بر زدم
مردم از حیوانی و مردم شدم — پس چہ ترسم کہ ز مردن کم شدم
جملۂ دیگر بمیرم از بشر — تا بر آرم با ملائک پر و سر
بار دیگر از فلک قرباں شوم — آنچہ اندر وہم نا ید آں شوم
پس عدم گردم عدم چوں ارغنوں — گویدم انا الیہ راجعون

(منقول از کتاب نیل و قال۔ مسٹر محمد فاروق)

جوبات میں خود کہنا چاہتا تھا اس کو ہمارے قابل دوست نے اس خوبی سے اپنی کتاب میں ادا کیا ہے کہ میں نے ان کی پوری بحث انہیں کی پاکیزہ عبارت میں نقل کرنا کافی سمجھا اور اس طرح ارتقا کی تھیوری کو مذہب کے رنگ میں دکھانے سے جو مجھکو پس وپیش تھا۔ اس سے میں اب بخوبی عہدہ برآ ہو گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ انسان کی خلقت اتفاقی مانی جانے یا ارتقائی۔ اس کی وجہ سے مذہب پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا۔ بلکہ آخری صورت کا ماننا عقل کے لئے زیادہ آسان وبہتر ہے بہ نسبت پہلی صورت کے جبکہ ہماری علمی تحقیقات خود اس کی موئد ہے اور اس طرح مذہب اور سائنس کا اتحاد بخوبی ہوسکتا ہے تو صرف یہ سوال باقی رہتا ہے کہ الہام نے کیوں ان رموز کو واضح نہیں کیا۔ اور جب وہ ان باتوں سے خاموش ہے تو اس کاوش کی ضرورت ہی کیا۔ مذہب انسان سے صرف اس قدر چاہتا ہے کہ وہ یہ تسلیم کرے کہ انسان اور عالم کا وجود خدا کی قدرت کا نتیجہ ہے مگر یہ ہمارا فرض ہے کہ اس کی قدرت کے مختلف جلووں پر اپنی غائر نظر ڈالکر اس خالق یکتا کی عجیب وبے مثل دانائی کے زیادہ مقر ہوں اور اس حیثیت سے یہ جستجو ہمکو مذہب کی طرف سے زیادہ مطمئن کر دیتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر آدم کا ہبوط پانچ ہزار سال سے زیادہ نہیں ہوا جیسا بائبل کی روایت ہے (اور باوجودیکہ قرآن اس سے خاموش ہے مگر ہمارے یہود پرست علماء کی راہ ہدایت وہی بائبل کی روایت ہے) تو اس کی تائید میں ہمکو طبقات الارض اور جغرافیۂ عالم کے ان بدیہیات سے انکار کرنا پڑیگا جو ہمارے مذہب کو عقلاء کے نزدیک بازیچۂ اطفال بنادیں گے۔ یا پھر بائیبل کے آدم کو بنی اسرائیل کا قومی آدم ماننا پڑے گا۔ اس واسطے کہ ہزار یا ہزار سال میں موجودہ سمندروں اور آبناؤں اور خاکناؤں کی صورتیں پیدا ہوئی ہیں۔ ایک زمانہ ایسا تھا کہ زمین کو کوئی سمندر جدا نہ کرتا تھا۔ پس اگر حضرت آدم کی اولاد دنیا میں ایک مرکز سے پھیلی تو یقیناً پانچ ہزار یا چار ہزار سال قبل اس کو زمینوں کے درمیان ناقابل عبور سمندر ملے ہوں گے۔ ایسی صورت میں آدم کی اولاد اپنے ابتدائی زمانہ میں جبکہ اس نے عبور کرنے کا کوئی ذریعہ نہ پایا ہوگا۔ کیونکر جزائر اور ماوراے بحر خطوں میں پہونچی ہوگی۔ اس لئے اگر تمام انسان ایک ہی آدم کی اولاد ہیں تو ان کا زمانہ بہت ہی دور کا ماننا پڑے گا رہا یہ کہ آب وہوا اور ماحول کا اثر انسانی قواے جسمانی وذہنی پر ہوا ہے یا نہیں۔ وہ ایک صریحی وبدیہی بات ہے جو افریقہ کے ایک حبشی اور ایک مغولی ——— کے موازنہ سے فوراً مشاہدہ میں آسکتی ہے اور یہ تغیرات اسی اصول ارتقا اور ماحولی اثرات کے ماتحت ہیں جہاں پر ہم ڈارون سے اختلاف کر سکتے ہیں وہ صرف اس قدر ہے کہ ڈارون کو ارتقا وتکوین کے پیچھے خدائی ہاتھ نظر نہیں آتا اور ہم بلا تردید و بلا خوف ملامت سائنس ان مشاہدات قدرت کے پیچھے اس صانع بے ہمتا کے وجود کا اقرار کر سکتے ہیں۔

سید مقبول احمد

من درچہ خیالیم وفلک درچہ خیال

(بہ سلسلۂ ماسبق)

(۱۰)

اب البتہ مجھکو معلوم ہو رہا ہے کہ زندگی کس کو کہتے ہیں جینے کی لذت اتنی عمر کھو کر مجھکو ملی ہے۔ اب میرے دل میں سوا اس کے کوئی تمنا نہیں ہے کہ "ہمچو زلیخا بہ شبابم رساں"۔ لیکن یہ محض پیرانہ سری کی ایک ہوس ہے جو بالکل لغو ہے۔ ہماری زندگی سرتاسر عیش ہے اور اب ہم کو کسی موہوم تمنا سے اپنا دل نہ دکھانا چاہیے"۔ عائشہ اس وقت جذبات میں سرشار تھی۔

شام کا وقت تھا۔ ساون کا موسم تھا۔ ابو الخیر اور عائشہ دوش بدوش جوہی اور بیلے کی کیاریوں میں دنیا اور دنیا کے نشیب و فراز سے بے خبر ٹہل رہے تھے۔ عائشہ اپنی رگ رگ میں ایک مستی محسوس کر رہی تھی۔ ابو الخیر بھی اپنے اندر کچھ تو موسم کے اثر سے لیکن زیادہ تر عائشہ کے قرب سے ایک خاص سرور پا رہا تھا۔ عائشہ کی زبان سے یہ الفاظ سنکر اس نے اپنی آغوش میں کھینچ لیا اور مخمور آنکھوں سے اُسکو دیکھنے لگا۔ عائشہ کی رگیں پھڑکنے لگیں وہ ابو الخیر سے لپٹ گئی اور کہنے لگی "ہاں تم اسی طرح اپنی خواب آلودہ نگاہوں سے مجھکو دیکھتے رہو یہ نگاہیں میرے لئے سرمایۂ حیات ہیں"۔ ابو الخیر نے اس کے میگوں ہونٹھوں کا بوسہ لیا۔ عائشہ مدہوش ہوگئی اور کہنے لگی تمہارے بوسے میرے لئے اتنے جاں بخش کیوں ہوتے ہیں؟"۔ ابو الخیر نے دوسرا بوسہ لیا لیکن پھر نہ جانے کس خیال میں گم ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد عائشہ نے پوچھا "کیوں چپ کیوں ہوگئے؟"

"کچھ نہیں" ابو الخیر نے کہا "میں اس وقت یہ سوچ رہا تھا کہ کاش تمہارے یہاں موجود ہونیکا علم مجھے اور پہلے ہو جاتا تو آج مجھ سے وہ حماقت سرزد نہ ہوتی جس کے خیال سے میں کبھی کبھی بدمزہ ہو جاتا ہوں اور کف افسوس ملکر رہجاتا ہوں"۔

عائشہ چونک پڑی جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ اس نے کہا "ابو الخیر تم نے اسوقت اس کا ذکر کرکے میری مسرت کیوں چھین لی۔ دیکھو میرا دل پھر دھڑکنے لگا۔ تم کیسے بیدرد ہو میں اپنی محرومیوں کو بھول گئی تھی۔ تم نے یاد دلا دیا۔ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ تم میرے نہیں ہو۔ اور میری زندگی ہمیشہ تمہارے ساتھ نہیں گزر سکتی لیکن کم از کم اسوقت تو مجھے مسرور رہنے دیتے۔ اُف دنیا واقعی دار المحن ہے۔ کیا دوزخ ہے۔ سوا تلخیوں اور اندوہناکیوں کے انسان کے مقدر میں کچھ نہیں ہے یہاں اگر ایک لمحہ سرور و انبساط کا ہے تو ایک پوری عمر رنج و الم کی ہے۔ ہاں ہاں تم دوسرے کے ہو۔ تم چند دنیوی رسمیں ادا کرکے بد ر اسکے ہوگئے ہو جاؤ مجھے چھوڑ دو۔ میں پھر اپنی بدبختی سے مانوس ہو جاؤنگی۔ جب انسان کی قسمت میں آسودگی اور طمانیت نہیں ہے تو

اس کے دل میں جذبات اور تمناؤں کا ایسا ہنگامہ کیوں برپا کر دیا جاتا ہے؟ جب اس کی تشنگی بجھائی نہیں جا سکتی تو اس کو تشنگی دی کیوں جاتی ہے؟ مجھ کو دیکھو۔ میں تم کو چاہتی ہوں۔ تمہاری آرزو میں دن رات تڑپتی ہوں اور تم اتنی مدت کے بعد ملے بھی تو اب ہر وقت اس اندیشہ میں دل دھڑکا کرتا ہے کہ ایک نہ ایک دن تم مجھ سے قطع نظر کر لوگے"۔ عائشہ کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور ان میں آنسو ڈبڈبا آئے تھے۔

ابوالخیر نے دیکھا کہ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی تو اس نے جلدی سے عائشہ کو سینہ سے لگا کر کہا "بیکار بچوں کی سی باتیں نہ کرو۔ تم اگر مجھکو چاہتی ہو تو میں بھی تم کو چاہتا ہوں اس کا میں عملی ثبوت بھی دے رہا ہوں۔ مجھے تم سے کوئی جدا نہیں کر سکتا۔ کوئی نہ کوئی صورت نکالی جائیگی کہ اب ہم ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہیں۔ اس لئے کہ اب ہماری محبت اس حد تک پہنچ گئی ہے جہاں سے بازگشت ناممکن ہے۔ تم خواہ مخواہ دل نہ دکھاؤ"۔ اس کے بعد ابوالخیر نے کچھ ایسا جادو کیا کہ عائشہ پھر ماضی و مستقبل سے بے خبر ہو گئی۔ ابوالخیر کو اب کسی کے کہنے سننے کی پروا نہ تھی۔ وہ عائشہ کی رفاقت کو اپنے حق میں خداداد نعمت سمجھتا تھا۔ وہ علانیہ اور سب کے جانتے ہوئے عائشہ سے ملنے لگا تھا اور اکثر دن کا دن، اور رات کی رات "نصیر کوٹ" میں رہتا تھا۔ بدورا سے اس کو کوئی تعلق باقی نہ تھا۔ اگر کبھی رات کو نشہ میں چور آتا بھی تو یا تو بدورا سے کسی نہ کسی بات پر لڑنے لگتا یا پھر خاموش الگ اپنے بستر پر پڑ کر سو رہتا۔

بدورا کو بھی ابوالخیر سے کوئی انس باقی نہ تھا۔ وہ خون کے آنسو ضرور رو رہی تھی مگر ابوالخیر کے لئے نہیں بلکہ اپنی اور اپنے باپ کی غلطی پر۔ اب روز بروز اس کے سر میں احمد کا جنون جڑ پکڑ رہا تھا۔ بیٹی کی بدقسمتی پر قربان علی اتنا رو چکے تھے کہ اب ان کو رونیکی بھی تاب نہ تھی۔ ایک تو بڑھاپا۔ اس پر یہ صدمہ۔ بیچارے کی تندرستی دھیرے دھیرے جواب دے رہی تھی وہ سوچتے تھے اور ان کی عقل کام نہ کرتی تھی۔ کئی بار انھوں نے سوچا کہ ابوالخیر کو مجبور کر کے بدورا کو طلاق دلوادیں لیکن اس معاملہ میں زبردستی نہیں چل سکتی اور ابوالخیر کی ذات سے یہ امید نہ تھی کہ وہ آسانی سے طلاق دینے پر خود راضی ہو جائیگا۔ اس لئے قربان علی چپ تھے اور ضبط و تحمل کے ساتھ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

۱۱

جس دن ابوالخیر اور عائشہ کی "ہم آویزی" کا یہ عالم تھا کہ ستارے بھی دیکھکر اپنی آنکھیں پھیر لیں اس کے دو تین روز بعد شام کو بدورا اپنے کمرہ میں پچھم کے جھروکے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ دور تک کا منظر آنکھوں کے سامنے تھا۔ دور دور سے جھڑی لگی ہوئی تھی اور دم بھر کے لئے بارش کا تار نہ ٹوٹتا تھا۔ تاحد نظر پانی ہی پانی تھا۔ بدورا اس وقت ایک ایسی فوق الادراک قوت کو شش جہت پر مسلط دیکھ رہی تھی جسکے ہوتے ہوئے مجبور محض مٹی کے پتلے کے سامنے جمیلہ کا رائگاں ہو جانا کوئی غیر معمولی یا خلاف توقع بات نہیں۔ اس قدرت کاملہ کے اختیار میں یہ ہو کہ دیکھتے دیکھتے ریگستان کو سمندر، اور پھر بات کی بات میں سمندر کو ریگستان بنادے۔ جو چاہتی پربت کو رائی اور رائی کو پربت کر سکتی ہو۔ جس نے سامنے ایسا مہیب اور دہشت ناک جنگل

کھڑا کر دیا ہو۔ اس کے سامنے انسان کی حقیقت ہی کیا ہو سکتی ہے۔ بدورا سوچ رہی تھی کہ انسان بھی کیسا مجبور مطلق ہے ہلاکت و بربادی کے اسباب ہر طرف سے اس کو گھیرے ہوئے ہیں۔ قدم قدم پر اس کے لئے خطرات ہیں۔ ابھی جس مکان میں وہ ہے چھت بیٹھ سکتی ہے۔ کسی کونے سے ایک سانپ نکل کر اس کو ڈس سکتا ہے۔ ابھی ہوا کے ایک جھونکے میں اس کو زکام ہو سکتا ہے جو بڑھ کر "بڑی سردی" ہو سکتا ہے اور اس کا کام تمام کر سکتا ہے۔ ابھی وہ ٹھوکر کھا کر زمین پر اس طرح گر سکتی ہے کہ اس کے دماغ کو کوئی مہلک صدمہ پہنچ جائے اور وہ جانبر نہ ہو سکے۔ جب انسان کی زندگی ایسی بے اعتبار ہے تو زندگی کا لالچ کیوں ہو؟ — جیسے یہ لوگ اس طرح جان کیوں دیتے ہیں؟ — بدورا کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ احمد کی باتیں اس وقت بے طرح اس کو یاد آ رہی تھیں۔ وہی باتیں جن پر کسی زمانہ میں وہ ہنسا کرتی تھی اور جن کو احمد کے منہ پر "توہمات" یا "خرافات" کہہ دیا کرتی تھی۔

جنگل بھانت بھانت کی بے شمار آوازوں سے گونج رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ بلاؤں نے یہاں اپنی جولانگاہ بنا رکھی ہے۔ بدورا پر ایک ہیبت طاری تھی۔ اتنے میں جنگل کے اندر سے "پوت! پوت! پوت!" کی دلدوز صدا اٹھی اور ہوا کی موجوں میں منتشر ہو کر رہ گئی۔ بدورا کے جسم میں ایک سنسنی دوڑ گئی۔ وہ اس آواز سے مانوس تھی۔ یہ مہوک کی آواز تھی۔ جاہل اور اوہام پرست دہقانیوں میں یہ قصہ مشہور تھا کہ مہوک کسی زمانہ میں ایک بار ہماری آپ کی طرح انسان تھا۔ میاں بیوی افلاس و فلاکت میں صبر و قناعت سے بسر کر رہے تھے۔ شوہر مہوے جمع کر کے لایا۔ بیوی نے بیٹے سے اس کو سکھانے کے لئے کہہ دیا اور خود کسی کام سے باہر چلی گئی۔ شام کو جب واپس آئی تو دیکھا کہ مہوہ وزن اور مقدار میں اتنا نہیں بلکہ آدھا ہو کر رہ گیا ہے۔ سمجھی کہ یا تو بیٹا میٹھا میٹھا کھاتا رہا ہے یا کسی پڑوسی کو دے دیا ہے۔ یہ سمجھ کر بیٹے کو خوب مارا۔ دوسرے دن میاں بیوی دونوں مہوے جمع کر کے لائے اور بیٹے کو سکھانے کے لئے مامور کر کے اپنے اپنے کاموں پر چلے گئے۔ شام کو پھر مہوہ سوکھ کر آدھا ہو گیا۔ ماں نے لڑکے کو پھر مارنا شروع کر دیا۔ تیسرے دن پھر یہی اتفاق ہوا اور اب کی بیٹے پر اتنی مار پڑی کہ وہ مر گیا۔ اب ماں خود مہوے سکھانے بیٹھی۔ مہوہ حسب دستور سوکھ کر آدھا ہو گیا۔ ماں پر حقیقت ظاہر ہو گئی مہوے کی خاصیت یہی ہے۔ بیٹے کو مار ڈالنے کا اب ایسا رنج ہوا کہ وہ چڑیا بن کر "پوت پوت" کہتی ہوئی اڑ گئی۔ باپ بھی اس کے پیچھے پیچھے اڑ گیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب مادہ "پوت! پوت!" کا نعرہ مارتی ہے تو نر "چپ! چپ!" کہہ کر اس کو صبر دلاتا ہے۔

بدورا بچپن سے اس قسم کی روایتیں سنا کرتی تھی مگر ان "اساطیر الاولین" میں اس کے لئے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ برخلاف اس کے احمد ان روایتوں کو خاص وقعت و احترام کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ فطرتاً اس میں وہ مادہ زیادہ تھا جس کو "جاہلیت" یا "بیگانیت" کہہ سکتے ہیں۔ خدا پرستی سے زیادہ "عناصر پرستی" اس کی طبیعت سے مناسبت رکھتی تھی۔ بعض اس کو جاہل، بعض شاعر اور بعض کافر یا دہریہ کہتے تھے۔ بدورا کو یاد آ گیا کہ اب سے تقریباً آٹھ برس پہلے جبکہ ایک روز وہ احمد کے ہمراہ مکان کے پس پشت باغ میں ٹہل رہی تھی یہی آواز آئی تھی اور احمد نے کہا تھا۔ "بدورا دیکھو صرف انسان نہیں

بلکہ ہر چیز کی قسمت میں یہی لکھا ہے کہ وہ غلطیاں کرے اور پھر پچھتائے لیکن غلطی کرنا کسی کے اختیار کی بات نہیں ہے۔ غلطی کرائی جاتی ہے۔ پچھتانا اور اپنے کئے پر سر پیٹنا البتہ اپنا کام ہے۔ بدورا تم سمجھوگی کہ میں کفر بک رہا ہوں۔ لیکن یقین مانو جب کبھی قرآن کے اس ٹکڑے پر پہنچتا ہوں (اللہ یستھزء بھم و یمدھم فی طغیانھم یعمھون ٥) تو میرا دل بیساختہ کہہ اُٹھتا ہے کہ یہ صرف ان سفیھوں کی سزا نہیں ہے جو ایک طرف تو "امنا" اور دوسری طرف انما نحن مستھزؤن کہتے ہیں۔ بلکہ ساری مخلوقات کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے۔ عام اس سے کہ وہ گنہگار ہیں یا بیگناہ اور اس "طغیان" میں پھینکے جانے کے مستحق ہیں یا نہیں۔ مجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ زندگی سرتاسر "مالک قضا و قدر" کا ایک دل دکھانیوالا استھزاء ہے"۔ بدورا نے احمد کی باتوں کا اس دن بڑا مضحکہ اڑایا تھا اور اس کو ڈانٹا بھی تھا کہ توبہ کرو توبہ۔ کیسے فاسد خیالات کو اپنے دل میں جگہ دیتے ہو! یہ کفر نہیں تو اور کیا ہے؟" احمد چپ رہ گیا تھا۔ لیکن آج خود بدورا کے دل میں انھیں فاسد خیالات کا ہجوم تھا۔ وہ اپنی زندگی پر غور کرتی تھی تو بے تامل یہ ماننا پڑتا تھا کہ زندگی نام ہے غلطیوں پر پچھتانے کا۔ اس کا دل بھی آج یہی کہہ رہا تھا کہ کوئی ایسی ظالم اور سفاک قوت ضرور ہے جو ہمارے ساتھ ٹھٹھا کر رہی ہے۔

بدورا اپنے خیالات میں محو تھی کہ سامنے جنگل میں سے ایک شخص چند دیہاتیوں کے ساتھ نکلا اور سڑک پار کرکے ایک کھیت میں رک گیا۔ یہ احمد تھا جو جنگل میں اپنے آدمیوں کو لئے ہوئے کچھ لکڑیاں کٹوا رہا تھا اور اب اپنے کھیت کا معائنہ کر رہا تھا۔ سرتاپا وہ بھیگا ہوا تھا۔ اس کی دھوتی اسکے بدن پر چپکی تھی لیکن انداز سے مترشح تھا کہ وہ اپنی اس حالت سے بے خبر نہیں تو بے پروا ضرور ہے۔ بدورا نے ایک مدت کے بعد احمد کو دیکھا تھا۔ احمد اب احمد نہ تھا بلکہ احمد کا بھوت ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کے بدن میں اب ہڈی اور چمڑے کے سوا گوشت کا کہیں نام نہ تھا۔ کلے بیٹھ گئے تھے۔ آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے تھے۔ ہونٹ سوکھے ہوئے تھے۔ رنگ یرقانیوں کی طرح پیلا تھا چال میں سستی تھی معلوم ہوتا تھا کہ ہمیشہ کا بیمار ہے اور وہ بیمار تھا بھی۔ اس کو بخار کا دورہ ہوا کرتا تھا لیکن جب افاقہ ہو جاتا تھا تو وہ پھر اسی طرح کاروبار میں مصروف ہو جاتا تھا تاکہ زندگی کی تکان نہ محسوس ہو۔ بدورا نے احمد کو دیکھا تو اس کی ہستی کی گہرائیوں سے ایک آہ نکل گئی۔ وہ بیتاب ہو گئی اور کہنے لگی "احمد تم کو میں نے غارت کیا ہے!"۔ اور پھر کہا "لیکن میں نے اپنے کو بھی برباد کر ڈالا۔ آہ! ایک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد۔ اگر میں ضد کرتی تو باپ کو مجبور کر سکتی تھی کہ وہ میری شادی احمد ہی کے ساتھ کرے اس وقت شاید یہ خرابیاں نہ پیدا ہوتیں یہ سب اپنا ہی کیا دھرا ہے"۔ احمد کھیت سے باہر نکل آیا اور امیر نگر کی طرف جانے لگا۔ بدورا جنگلے پر سے اُٹھی اور ایک پرزہ پر یہ لکھا:-

"بیا کہ دست دولم می رود زکار بیا۔ اور یہ یاد رکھنا کہ اگر تم نہ آئے تو میں خود تمہارے پاس آؤنگی۔ بدورا"

پرزہ کو ایک لڑکے کے ہاتھ میں دیکر کہا "احمد باہر سڑک پر ہیں۔ یہ ان کو جا کر دے آؤ"۔ لڑکا چلا گیا اور بدورا انتظار کرنے لگی۔ لیکن احمد نہیں آیا۔

احمد خط پڑھ کر سیدھا اپنے مکان چلا گیا تھا اور ایک نئی ادھیڑ بن میں مبتلا ہو گیا تھا۔ آج بے طرح وہ بدورا سے ملنے کے لئے بیتاب ہو رہا ہے۔ بدورا کی تحریر کا ایک ایک حرف نشتر تھا جب اچھی طرح اندھیرا ہو گیا تو وہ اٹھا اور مالتی کے پاس جا کر کہا "مالتی آج بدورا نے مجھکو بلایا ہے۔ شاید وہ بیمار ہے اور مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ میں جاتا ہوں" مالتی نے کہا "ہاں جائیے" احمد چلا گیا۔ مالتی کو یہ تو علم تھا نہیں کہ بدورا محبت کی تجدید کرنے والی ہے تاہم اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اگر کچھ نئی پیچیدگیاں پیدا ہوں تو کوئی تعجب نہیں۔ مالتی کو پورا یقین تھا کہ احمد بدورا کا تباہ کیا ہوا ہے اگرچہ احمد اسکو ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ وہ سارا الزام مقدر کو دیتا تھا۔ اگر اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے مقدر میں بدورا کی محبت کو بہت بڑا دخل تھا۔

بدورا احاطہ کی دالان میں بیٹھی ہوئی تھی اور یہ سوچ رہی تھی کہ آج رات کو جب سب سو جائینگے تو وہ خود احمد کے پاس جائیگی۔ اتنے میں اُس کو مکان کے اندر قربان علی کی آواز سنائی دی اور ساتھ ہی ساتھ ایک اور تقیہ و کمرہ در آواز آئی۔ یہ احمد کی آواز تھی۔ بدورا دوڑ کر اس دروازہ پر آگئی جو مکان کے اندرونی حصہ میں کھلتا تھا۔ قربان علی کہہ رہے تھے "احمد تمہاری حالت کیا ہے! تم قبر کے مردوں سے بھی بدتر ہو گئے ہو۔ تمہاری صورت سے معلوم ہوتا ہے کہ موت سر پر کھیل رہی ہے"۔

احمد نے کہا "جی کچھ نہیں ادھر موسم کے اثر سے کئی روز تک بیمار رہا ہوں۔ اسی کی کمزوری باقی ہے" قربان علی نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا "نہیں احمد اس کا ذمہ دار میں ہوں۔ میں نے تمہاری اور بدورا دونوں کی زندگی خاک میں ملائی۔ میری بھی کیسی مت ماری گئی تھی۔ تم دونوں کی زندگی کیسی خوشگوار و خوش آئند ہوتی"۔

احمد اس کا جواب نہ دے سکا۔ اس نے بدورا کو دیکھ لیا اور اس کے دماغ میں ایک تلاطم برپا ہو گیا۔ اس نے قربان علی سے کہا "میں نے بدورا کو عرصہ سے نہیں دیکھا ہے۔ ذرا اس کو بھی دیکھ لوں" قربان علی نے کہا "جاؤ احاطہ میں ہے اپنی تقدیر کو رو رہی ہوگی۔ اب اس میں شگفتگی اور خرمی کا پتہ بھی نہیں ہے جو دوسروں کو شگفتہ کر دیا کرتی تھی"۔

احمد نے احاطہ میں بدورا کو تنہا پایا۔ جس بدورا کو احمد ایک پیکر رنگ و بو دیکھ چکا تھا آج وہ سراپا "ماتم دلبری" کی حدیث بنی ہوئی تھی۔ پھول سا چہرہ مرجھا گیا تھا۔ گالوں کی زردی آمیز سرخی کی وجہ سے چراغ کی روشنی میں بدورا ایک نئی چیز معلوم ہو رہی تھی۔ صورت سے ظاہر ہوتا تھا کہ مسلول ہے یہ منظر دیکھکر احمد کی روح اور بھی پژمردہ ہو گئی۔ وہ بڑی دیر تک بدورا کو سکتہ کے عالم میں کھڑا دیکھتا رہا۔ بدورا بھی بغیر ایک حرف کہے اس کو دیکھتی رہی۔ دو تصویروں کا سامنا تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ گفتگو کیونکر شروع کیجائے۔ آخر کار احمد نے کہا "کہو کیسی ہو؟ کچھ بیمار سی نظر آ رہی ہو کیا کوئی خاص شکایت رہتی ہے"۔ بدورا نے اپنی نگاہیں احمد پر جما دیں اور اس کا دل ٹٹولنے لگی۔ احمد اس وقت مجسم تکلف تھا۔ بدورا جانتی تھی کہ جب تک احمد سے طنزیہ لہجہ میں بات نہ کیجائے احمد پر جلدی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اُس نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا "خوب! آپ نے پوچھتے پوچھتے میری بات پوچھی بھی تو اس طرح کہ گویا ایک بوجھ تھا جسکو اُتار پھینکا۔ لیکن قبل اس کے کہ میں کچھ کہوں تم

اپنا حال تو بیان کرو اس لئے کہ دیکھنے میں تم مجھ سے زیادہ رحم کے قابل ہو تمہاری اس وقت تو وہ حالت ہے جو مرنے والے کی چالیس دن پہلے ہوتی ہے۔"

احمد نے کہا "کیوں بدورا آخر میرے کس جرم کی سزا میں ایسی کڑوی باتیں کر رہی ہو۔ میں تم سے اور کیا پوچھتا۔ تمہارے سب حالات تو جانتا ہی ہوں۔ رہ گیا اپنا حال سو وہ چنداں قابل تشویش نہیں، ادھر کچھ دنوں سے علالت کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ اسی کے یہ آثار ہیں۔" بدورا خاموش اس کی صورت دیکھتی رہی اسکی آنکھیں پر نم ہو چلی تھیں۔ اتنے میں اسکی نظر احمد کے کپڑوں پر پڑی جو تر تھے۔ اس نے کہا "احمد یہ کیا! تم تو شرابور ہو۔ کہیں اس ضعف میں کوئی خطرناک صورت نہ پیدا ہو جائے۔ میں جاتی ہوں اور ابا کا کرتا دھوتی لے آتی ہوں۔ ابھی کپڑے بدل ڈالو۔" احمد نے منع کیا مگر بدورا قربان علی کے کپڑے لے آئی اور اسکو اپنے بھیگے کپڑے اتارنے پڑے۔

بدورا نے احمد کو پان لگا کر دیا۔ اُس نے لینے میں عذر کیا۔ وہ پان نہ کھاتا تھا۔ اس نے کہا "اگر ہو سکے تو حقہ منگاؤ مجھے کچھ سردی معلوم ہو رہی ہے۔" بدورا نے حقہ منگوایا اور کہا "لیکن جب میں نے پان لگا کر دیا کرتی تھی تو تم کھا لیا کرتے تھے آج کیوں نہیں کھاتے۔" احمد نے بغیر کچھ کہے ہوئے پان لے لیا۔ بدورا نے پھر کہنا شروع کیا۔"

تم جانتے ہو کہ میں تم سے ملنے کے لئے کیوں بے چین تھی؟ میں نے تم سے کیسی خوشامدیں کیں مگر تم نہ آئے تم کو مجھ پر رحم نہ آیا میں جو کچھ تم سے کہنا چاہتی ہوں شاید اب تم اس کے سننے کے لئے تیار ہو گے۔ بہر حال میں کہہ دینا چاہتی ہوں۔ جو حادثات مجھ پر سے گزرتے رہے ہیں۔ انھوں نے مجھکو اس حقیقت سے آگاہ کر دیا ہے کہ زخمی دلوں پر اگر کوئی چیز مرہم کا کام کر سکتی ہے تو وہ محبت ہے۔ زندگی کے کانٹوں کو اگر کوئی چیز پھول بنا سکتی ہے تو وہ محبت ہے مختصر یہ کہ اگر مجھکو اب کوئی چیز سکون دے سکتی ہے تو وہ محبت ہے۔ میں محبت کی محتاج ہوں اور مجھکو اب پتہ چلا کہ میں وہ اصل تمہاری محبت کرتی رہی ہوں تم کہوگے کہ جب ایک طرف سے مایوس اور ناامید ہو گئی تو پھر تمہاری طرف جھک پڑی۔ نہیں احمد مجھکو دھوکا تھا۔ مجھے ڈاکٹر سے محبت کبھی نہیں ہوئی۔ مجھے اس کا دکھ نہیں ہے کہ میری شادی ناخوشگوار ثابت ہوئی۔ نہیں بلکہ رونا اس کا ہے کہ میں نے تم کو مدت العمر کے لئے کھو دیا اور محبت سے مجبور ہو گئی۔ آج ڈاکٹر سراپا نیاز و نیائش بنکر بھی آئیں تو میری تسکین نہیں ہو سکتی۔ اس لئے کہ مجھکو اُن سے کوئی لگاؤ نہیں ہے مجھے تم جو چاہو کہو۔ دنیا اس کی جو تاویل چاہے کرے۔ لیکن احمد مجھکو تم سے محبت ہے۔ یہ کوئی گناہ نہیں جس کے لئے میں نادم ہوں ؎

فاش میگویم و از گفتۂ خود دلشادم ‏ ‏ ‏ بندۂ عشقم و از ہر دو جہاں آزادم

میری عقل پر پتھر پڑ گئے تھے۔ میں اس حقیقت کو بھول گئی تھی میرے آئینہ پر زنگ آ گیا تھا جسکو زمانہ کی رگڑ نے پھر صاف کر دیا ہے احمد میرے قصور کو معاف کر دو اور کہہ دو کہ تم بھی ابتک مجھکو اسی طرح چاہتے ہو جیسے پہلے۔ میں اپنی زندگی میں کوئی کمی محسوس کروں گی اور نہ میرا دل دکھیگا۔" بدورا کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی اسمیں مبالغہ کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی

جو واقعی بغیر محبت کے زندگی کو مصیبت سمجھتی ہیں۔ اس کو اپنی طبیعت نے کچھ دنوں کے لئے فریب میں ڈال رکھا تھا۔ اور یہ فریب اُس وقت دور ہوا جبکہ تیر شست سے چھوٹ چکا تھا اور اپنے ہاتھ میں کچھ نہ تھا۔ احمد نہ جانے کیا کیا سوچ کر آیا تھا۔ بدورا کا یہ خروش دیکھکر سب بھول گیا اس کے اعصاب ڈھیلے ہوگئے اور اس نے بدورا کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "بدورا جھوٹ بولنا یا بات کو چھپاڈالنا میرا شیوہ نہیں۔ مجھے یہ اقرار کرلینے میں مطلق عار نہیں کہ (دل پر ہاتھ رکھکر) تم اب بھی اس ویرانہ کی سلطانہ ہو۔ مگر اب میری میری محبت تمہارے کس کام کی؟ یہ اجڑا ہوا دل تم کو کیا راحت یا سکون دے سکتا ہے۔ بدورا سچ تو یہ ہے کہ اب اگر اس پہلو میں دل بھی ہے تو دل میں وہ حوصلہ نہیں وہ تاب نہیں۔ میں اپنے دل کے خون میں آلودہ ہو کر اس منزل پر پہنچ چکا ہوں جہاں دنیا کی ہر چیز کی طرح محبت اور نفرت بھی بیگانۂ اصلیت ہے تم بھی محبت میں نو آموز ہو۔ یہ مجھ آزمودہ کار سے پوچھو تم کو جہاں سبز باغ نظر آرہے ہیں وہاں میں ایک بسیط خارزار دیکھ رہا ہوں۔ نہیں بدورا محبت کی تلخی اور الم انگی نسبتاً اس کے کیف و سرور سے کہیں زیادہ ہے۔ اور بلاؤں کی طرح محبت بھی ایک بلا ہے جو انسان کو ہلاک کرکے چھوڑتی ہے"

بدورا نے جواب دیا "اگر بلا ہے تو بلا ہی سہی۔ میں اب اگر جی سکتی ہوں تو محبت کے سہارے جی سکتی ہوں۔ میں تمہارے سہارے جی سکتی ہوں۔ میرے بیقرار دل کو تم آسودہ کر سکتے ہو۔ یہ وہ کام ہے جو کسی اور سے نہیں ہو سکتا۔ میں تم سے کچھ اور نہیں چاہتی۔ بس مجھے چاہو۔ اسی طرح جسطرح پہلے چاہتے تھے میرے دل کو ہاتھ میں لو اور مجھکو بچالو۔ احمد میرے احمد

روزم تو بر فروز و چشم را تو نور دہ　　این کار تست کار مہ و آفتاب نیست

بدورا کی یہ ہذیانی کیفیت دیکھکر احمد کا دل بے قابو ہوگیا اور اس کے منہ سے بیساختہ نکل گیا۔

تو اور حسرت ناز آہ کیا علاج کروں　　میں نیم جاں نہ رہا امتحان کے قابل

بدورا کو یکایک مالتی کا خیال آگیا اور دفعتاً اس کا لب و لہجہ بدل گیا۔ اس نے حسرت سے کہا "مگر اب تو نہ کوئی امید ہے اور نہ کوئی وجہ کہ تم میرا خیال کرو۔ تم کو مالتی جیسی جانباز عورت ملگئی ہے۔ تم اپنے کو اس کے سر کرچکے ہو تم سے دلدہی کی آرزو کرنا بیکار ہے۔ میں تم کو کھو چکی ہوں اور اب پھر پانا محال ہے"

احمد بدورا کا یہ طعن نہ برداشت کر سکا اور کسیقدر تند ہوکر کہا "عمر بھر میں مجھکو کبھی ایسا صدمہ نہیں پہنچا تھا جیسا آج تمہارے ان لفظوں سے پہنچا ہے۔ تم کس منہ سے یہ کہتی ہو"

"میرا منہ تو ہرگز اس قابل نہیں کہ کچھ کہہ سکوں مگر واقعہ سے انکار بھی تو نہیں کیا جا سکتا۔ مالتی تمہاری صرف بیدی نہیں ہے اور سب کچھ ہے" بدورا نے جواب دیا۔

احمد نے خشکی سے کہا "یہی ہوتا تو شاید میرے دل کو کچھ قرار میسر ہو جاتا۔ واقعہ یہ ضرور ہے کہ مالتی مجھے چاہتی ہے اور بری طرح چاہتی ہے۔ مگر میں اپنے دل میں کوئی ابھار نہیں پاتا۔ میں نے تم کو چاہا اور دل و جان سے چاہا۔ اب بھی چاہتا ہوں۔ اسکا پھل مجھکو مل گیا۔ اس سے انکار نہیں کہ میں نے مالتی سے شادی کا وعدہ کرلیا ہے۔ وہ اگر کبھی اپنے کو اس قابل پاؤنگا تو

ساتھی ہی کے ساتھ شادی کرونگا مگر بدورا محبت ایک بار کی جاتی ہے بار بار نہیں۔"

بدورا کو اس سے تسکین ہوئی اس نے کہا "خیر تمہارا جس سے جی چاہے شادی کرو۔ میں نہ اس پر کڑھنے کا حق رکھتی اور نہ اسکی مجھکو پرواہ ہے۔ شادی کا تجربہ میرے لئے کچھ حوصلہ افزا نہیں ثابت ہوا۔ میری اب اگر کوئی تمنا ہے تو یہ کہ تم میری محبت کرو اور مجھکو سنبھال لو۔"

احمد نے کہا "جیسا تمہارے لئے شادی کا تجربہ تھا ویسا ہی میرا محبت کا تجربہ تھا۔ شادی نے تمہیں برباد کیا۔ محبت نے مجھکو"

بدورا نے کہا "آہ اباجان نے میری اور تمہاری دونوں کی زندگی خراب کی"

احمد نے کہا "بیکار کسی کو الزام کیوں دو۔ جو ہونا تھا وہ ہوا۔ میں بارہا تم سے کہہ چکا ہوں کہ اس معمورۂ امروز و فردا میں اس دنیائے گرد و باد میں وہی ہوتا ہے جو بغیر ہوئے نہیں رہ سکتا۔ کسی کے لئے کچھ نہیں ہوتا۔ ہر وقت کف افسوس ملنا البتہ ہمارا کام ہے کسی نے سچ کہا ہے ؎

یاں کے سپید و سیہ میں ہمکو دخل جو ہے تو اتنا ہے — رات کو رو رو صبح کیا یا دنکو جوں توں شام کیا

اور کون جانے اتنا بھی دخل ہے یا نہیں۔" اس وقت احمد اپنے خاص رنگ کی باتیں کر رہا تھا۔ بدورا کو گزرا ہوا زمانہ یاد آگیا مگر اب نہ وہ ان باتوں پر ہنس سکتی تھی نہ ان سے اختلاف کر سکتی تھی۔ اس نے ایک گہری سانس لیکر کہا۔ میری اپنی زندگی کے تجربات نے بھی مجھے اسکو ماننے پر مجبور کر دیا ہے۔ احمد اب میں تمہاری ہم اعتقاد ہوں۔ پیرو ہوں۔ مرید ہوں۔ زندگی حقیقت میں عذاب ہے۔ یہ ساری غلطی آدم کی ہے۔ جس کی پاداش ہم اب تک بھگت رہے ہیں۔ آدم ہی نے فردوس کو چھوڑ کر یہ کانٹوں کی دنیا بسائی۔ وہی ہمکو اس "خراب آباد" میں لائے۔ نہ وہ "شجر ممنوع" کا پھل کھاتے نہ ہماری یہ گت ہوتی"۔

بدورا احمد کو اس وقت مجسم معصوم معلوم ہو رہی تھی۔ اس کو ہنسی آگئی لیکن اس کی ہنسی میں کوئی کیفیت نہ تھی۔ اس نے کہا "یہ تو میں تسلیم کر لیتا ہوں کہ آدم نے غلطی کی لیکن میرے خیال میں اب کسی دوسرے "شجر ممنوع" کے پھل کھانے کی ضرورت ہے جس سے اس غلطی کا ازالہ ہو سکے۔ انسان کو نجات دلانے کے لئے ابھی ایک اور آدم کی ضرورت ہے"۔

رات زیادہ گزر چکی تھی۔ بارش بند نہیں ہوئی تھی۔ احمد نے سائبان سے جھک کر آسمان کی طرف دیکھا اور کہا "اچھا بدورا اب میں جاتا ہوں بڑی دیر ہوگئی۔ کل پھر آؤنگا"

بدورا نے کہا "اور آج اگر یہیں رہجاؤ تو کیا حرج ہے؟ میں تمہارے لئے بچھونا باہر بچھوا دیتی ہوں۔"

نہیں میں ابوالخیر کا سامنا کرنا نہیں چاہتا" احمد نے کہا۔

"تو اس سے اطمینان رکھو۔ وہ آج دو روز سے گھر نہیں آئے ہیں اور نہ آج آنے کی کوئی اُمید ہے۔ میں تو چاہتی ہوں کہ وہ کبھی نہ آئیں مگر نہ جانے وہ کس مصلحت سے ایک کچے دھاگے کا تعلق قائم رکھے ہوئے ہیں"

"مگر مجھکو جانے دو" احمد نے سوچتے ہوئے کہا۔

اچھا جاؤ۔ مگر اس کا وعدہ کرتے جاؤ کہ یہاں سے جاتے جاتے مجھکو بھول نہیں جاؤ گے۔ میں تم سے بدگمان ہوگئی ہوں" بدورا پھر آنسو بہانے لگی۔

احمد نے گھبرا کر کہا "نہیں نہیں مجھ سے قسم لے لو میں آؤنگا۔ روز آؤنگا۔ دن میں دو بار آؤنگا یا جتنی بار کہو آؤنگا۔ میں تم کو نہ کبھی بھولا ہوں نہ بھولونگا۔ اگر یہی ممکن ہوتا تو میں اس حالت کو نہ پہنچ جاتا اور آج تم کو دیکھنے کے بعد تمہارے منہ سے "حرفِ آرزو" سننے کے بعد تمہارے خیال کو دل سے دور کرنا اور بھی غیر ممکن ہوگیا ہے" یہ کہکر اس نے بدورا کی پیشانی پر ہاتھ پھیرا اور پھر یہ شعر پڑھا ؎

یاد سب کچھ ہیں مجھے ہجر کے صدمے ظالم بھول جاتا ہوں مگر دیکھکے صورت تیری

بدورا بیتاب ہوگئی اور بیتابی میں احمد کا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں لیکر اس طرح چوما کہ اس کی پیشانی جلنے لگی۔ اس کے بعد اس نے کہا "جاؤ اب اگر تم انسان ہو تو مجھکو کبھی نہ بھولوگے یہ ایک بیاہی ہوئی عورت کے بوسے ہیں جو بوسہ کی اہمیت کو سمجھتی ہے"

بدورا نے سچ کہا تھا۔ احمد کا جنون تازہ ہوگیا اور وہ ان بوسوں کی لذت کو نہ بھول سکا۔

اس دن احمد نے تمام رات آنکھوں میں بسر کر دی وہ سوچتا تھا کہ اب کیا کرے اور اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ آسمان کی یہ ستم ظریفی اب حد سے بڑھ چلی تھی۔ احمد یاس و حرماں سے مانوس ہو چلا تھا۔ قدرت اس سے پھر برسرِ پیکار ہوگئی اور اس کے دل میں ازسرِ نو خلش تمنا پیدا کر اس کو کرب و اضطراب میں ڈالدیا۔ احمد صبح تک غور و تفکر میں پڑا رہا۔ آخر کار ایک فیصلہ پر پہنچ گیا۔ اُس نے قلم دوات منگا کر "بیگم" کے نام اس عبارت کا ایک خط لکھکر روانہ کیا۔

بیگم صاحبہ۔ میری عقل کام نہیں کرتی کہ میں آپ سے اپنا مطلب کھلے الفاظ میں کیونکر بیان کروں۔ آپ کچھ نہ کچھ تو سمجھ بھی گئی ہونگی۔ زیادہ تشریح کی حاجت نہیں۔ آپ کے جو الطاف و احسان مجھ پر ہیں اس کے بوجھ سے میری گردن ہمیشہ جھکی رہیگی۔ میری ایک استدعا آپ سے اور ہے اور غالباً یہ آخری استدعا ہے۔ آپ بدورا کی حالت پر رحم کیجئے اس کی حالت خراب ہے اور مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ آپ اگر اس پر رحم کریں گی تو یہ دراصل مجھ پر رحم ہوگا۔ میں ایسا ہی مجبور ہوگیا ہوں جو آپ کو یہ لکھنے کی جراءت کر رہا ہوں۔ آپ ابوالخیر کو اپنے جان و مال کے صدقے میں بھیک سمجھکر بدورا کو دیدیجئے۔ اس کی زندگی بچجائیگی۔ اور ممکن ہے آپ کے حق میں بھی یہ بہتر ثابت ہو۔ اس خط کا ذکر کسی سے نہ کیجئیگا۔

نیاز کیش

احمد

احمد نے خط کو گاؤں کی ایک عورت کے سپرد کیا اور تاکید کر دی کہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہ دینا۔

۱۲

عائشہ یوں تو جب کبھی ابوالخیر کی غیبت میں اپنے اور اس کے تعلقات پر ہوش و حواس اور سنجیدگی سے غور کرتی تھی تو اس کی روح مضمحل ہو جاتی تھی۔ وہ ایک عصبی عورت تھی مگر جب کبھی اس کو اپنے دل پر قابو ہوتا تھا تو اُس کو ندامت ہونے لگتی تھی۔ بدورا سے اس کو رقیبانہ جلن ہرگز نہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ابوالخیر پر اس کو کوئی حق نہیں ہے۔ اس کو پورا احساس تھا کہ وہ بدورا پر ظلم کر رہی ہے جس کا مواخذہ اُس کو دینا ہے۔ آج احمد کا خط اس کو ملا تو اسکو اپنی ذات سے شرم آنے لگی اور اس کی پیشانی نم آلود ہو گئی۔ اُس کو اپنی ذات سے نفرت معلوم ہونے لگی۔

ابوالخیر اُسدن علی الصباح بستی چلا گیا تھا اور دس بجے رات کی گاڑی سے پہنچنے والا تھا۔ عائشہ کو دیرتک سوچنے کا موقع مل گیا۔ اُس نے احمد کی بھیجی ہوئی عورت کو بلا جواب کے واپس کر دیا تھا۔ اور خود اس پیچیدہ مسئلہ کا حل سوچنے لگی تھی۔ بڑے غور و تامل کے بعد اس نے اپنے آدمی کے ہاتھ یہ خط احمد کے پاس لکھ بھیجا۔

پیارے احمد۔

میں صرف تم سے یا بدورا سے نہیں بلکہ دنیا کی ہر چیز سے شرمندہ ہوں۔ مجھے اپنی زندگی ہی شرمناک معلوم ہوتی ہے۔ تمہارا خط بڑا پیارا اور اثر کرنے والا تھا۔ اس نے میرے ساتھ وہ کام کیا جو "آسمانی جھڑکیاں" بھی نہ کر سکتی تھیں۔ لیکن قبل اس کے کہ میں یہ بتاؤں کہ آئندہ کیا کرنا چاہتی ہوں۔ ایک بار تمہاری بدورا سے مل کر دو دو باتیں کر لینا ضروری سمجھتی ہوں۔ مجھکو یقین ہے۔ کہ بدورا "نصیر کوٹ" میں مجھ سے ملنا پسند نہیں کریگی اور نہ قربان علی اس کی اجازت دینگے اُن کو یہ ڈر لگا رہیگا کہ میں ان کی بیٹی کو کہیں زہر نہ دیدوں۔ اور میں بھی ان کے مکان میں قدم رکھنا غیر مناسب سمجھتی ہوں۔ لہذا تم اگر کسی طرح اپنے مکان میں بدورا کو بلا لو تو میں غروب آفتاب سے تھوڑی دیر پہلے آکر مل لوں۔ اگر ملاقات ٹھہر جائے تو مجھکو اطلاع دیدینا۔

تمہاری مخلص

عائشہ

احمد خط کو پڑھکر سیدھا بدورا کے پاس گیا اور خط اس کو دے کر کہنے لگا "بدورا میں بھی اس ملاقات کو بہت ضروری سمجھتا ہوں"۔ بدورا نے پہلے تو صاف انکار کر دیا۔ قربان علی نے بھی اختلاف کیا مگر پھر احمد کے اصرار سے دونوں راضی ہو گئے۔ قربان علی نے کہا میں بھی چلونگا اور تمہارے پاس بیٹھا رہونگا۔ احمد قربان علی کے وہاں سے کچھ دری قالین لیکر چلا گیا اور مکان کو سیدھے سادے طور پر آراستہ کر دیا۔ قربان علی بدورا کو لیکر تیسرے پہر ہی کو احمد کے مکان میں پہنچ گئے۔ بدورا متفرق کاموں میں احمد کی مدد کرنے لگی۔ اس طرح اس کی طبیعت بہل گئی اور تھوڑی دیر کے لئے اپنی ناکامیوں کو بھول گئی۔ ایک طویل مدت کے بعد

وہ احمد سے اس قدر قریب ہوئی تھی۔ اور اب اس کو اس قرب میں ایک نئی لذت مل رہی تھی جسمیں وہ محو تھی۔ مالتی کو معلوم تھا کہ مکان میں آج بدورا آئی ہوئی ہے۔ اس لئے وہ پہلو بچا گئی اور اس دن قصداً احمد کے پاس نہیں آئی۔ احمد کو اس کا خیال بھی نہ آیا وہ بھی بدورا میں کچھ کم محو نہ تھا۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ ہر شخص چشم براہ و گوش برآواز تھا۔ اتنے میں کہاروں کی آہٹ ملی اور "بیگم" کی شاندار پالکی نظر آئی۔ احمد نے اندر جاکر بدورا کو اطلاع دی۔ بدورا گھبرانے لگی۔ قربان علی بھی سراسیمہ ہوگئے۔ بدورا کا خیال تھا کہ عائشہ لاکھ خوبصورت ہو مگر اس سے پھر بھی کم ہوگی۔ اس لئے کہ وہ سن چکی تھی کہ اس کی عمر ۲۸، ۲۹ برس کی ہے۔ اور اس کے ایک لڑکا بھی ہو چکا تھا۔ بدورا کی حیرت کی انتہا نہ تھی جب اس نے دیکھا کہ پالکی سے ایک چھریرے بدن کی میانہ قد پتلی دبلی سراپا حرکت و اضطراب عورت اتری اور تپاک سے اس کی طرف بڑھی۔ اس کا جسم نور کے سانچہ میں ڈھلا ہوا تھا اور کسی طرف سے بھی نہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بدورا سے سن میں بڑی ہے۔ بدورا کی حیرت کم ہوئی تو اس کے برتاؤ میں کشیدگی تھی۔ عائشہ نے بدورا کو گلے لگانے کے لئے اپنے ہاتھ بڑھائے تو بدورا جھجھک گئی۔ عائشہ نے اُس کا مطلق برا نہ مانا اور پرخلوص لہجہ میں کہا "ہاں تم کو مجھ سے عداوت ہے اور ہونی بھی چاہئے میں اس کی سزاوار ہوں۔ لیکن مجھکو تم سے عداوت نہیں ہے۔ نہیں مجھکو تم سے محبت ہے مجھے تمہارے ساتھ غائبانہ اُنس تھا۔ میں تمہاری صورت اپنے ذہن میں پھرایا کرتی تھی۔ میں نے تم کو اپنے قیاس سے کہیں زیادہ خوبصورت اور بھولا پایا۔ تم تو موم کی گڑیا ہو" اس کی آواز میں درد تھا۔ اس نے پھر ہاتھ پھیلا دئے۔ بدورا کی جھجھک دور ہوگئی تھی اُس نے بھی عائشہ کے گلے میں باہیں ڈالدیں۔ عائشہ کی آنکھیں پرنم ہوگئیں۔ بدورا حیران تھی کہ آخر یہ کس قسم کی عورت ہے۔

جب دونوں ایک دوسرے سے کسی قدر مانوس ہوگئیں تو عائشہ نے اطمینان سے بیٹھکر کہنا شروع کیا "اس محبت اور خلوص کے باوجود جانتی ہوں میں تم سے کیا کہنے آئی ہوں۔ میں ابوالخیر کو چھوڑ نہیں سکتی۔ وہ مجھکو کھو کر ملا ہے۔ میں اب اس کو تمہارے حوالہ نہیں کر سکتی" عائشہ یہ کہکر مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں شرارت تھی۔

بدورا سمجھی کہ اس کے ساتھ تمسخر کیا جا رہا ہے۔ اُس نے جواب دیا "تو یہ تو کوئی ایسی بات نہ تھی جس کے لئے آپ آنے کی زحمت گوارا کرتیں۔ یہ میرے لئے کوئی نئی خبر نہیں ہے۔ آپ نے ناحق تکلیف فرمائی"۔

"ایسی خشونت ٹھیک نہیں!" عائشہ نے افسردہ ہوکر کہا "میرے خلوص اور صدق نیت کا جواب تو یہ نہ تھا۔ میں تو تم کو آزماتی تھی۔ تم کمزوریوں کو معاف کرنے والی عورتوں میں نہیں ہو۔ خیر اس قدر برافروختہ نہ ہو مجھے بھی اپنی عزت نفس کا پاس ہے۔ میں بھی خوددار ہوں۔ در اصل مجھکو وہ کہنا نہ تھا جو میں نے کہا ہے۔ میں کچھ اور کہنے آئی تھی"۔

عائشہ مجسم پندار و حقارت بنگئی تھی۔ اس کو بدورا کے طنز سے سخت تکلیف پہنچی تھی۔ بدورا کو پھر شرمندہ ہونا پڑا۔ عائشہ بدورا کے لئے ایک چیستاں تھی۔ اس کی الٹی سیدھی باتوں سے وہ الجھ رہی تھی۔ بدورا اپنی ندامت دور کرنے کے لئے کچھ ناشتہ لے آئی اور عائشہ سے کہا "اچھا آیئے اس کے ساتھ کچھ شغل کیا جائے۔ اور اسی دوران میں آپ وہ بھی کہدیجئے گا جس کو ابھی تک چھپا رکھا ہے"۔

عائشہ نے کہا " اس کی ضرورت نہ تھی - اور میں اس کو اس وقت تک ہاتھ نہیں لگاؤنگی جبتک کہ تم میرے ساتھ کماحقہ ہمدردی کا وعدہ نہ کر لوگی - تم نے ابھی زمانہ کا نیچا اونچا نہیں دیکھا ہے اس لئے سختگیر ہو کسی کا دکھ درد نہیں سمجھ سکتی کسی کی غلطیوں کا احترام نہیں کر سکتی - زمانہ کو اگر موقع ملا تو وہ یہ سب تم کو سکھا دے گا " بدورا کی پشیمانی بڑھ رہی تھی عائشہ کی نرم جھڑکیاں اس کیلئے زہر میں بجھے ہوئے نشتر سے کم نہ تھیں لیکن وہ جانتی تھی کہ ایسی باتوں کا جواب کس پیرایہ میں دیا جائے - اُس نے سنجیدگی کیساتھ کہا " بیگم صاحبہ آپ کو جو کچھ کہنا ہے بے تامل کہدیجئے - میں سننے ہی کے لئے نہیں بلکہ آپ کے ایک ایک حرف سے ہم آہنگ ہونے کے لئے تیار ہوں - مجھے آپ سے ہرگز کوئی شکایت نہیں - آپ نے کوئی ایسی بات نہیں کی ہے جو عفو طلب ہو اور اگر کی ہے تو میں نے اُس کو معاف کیا "

عائشہ نے بدورا کو غائر نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا " تم معاف کرو یا نہ کرو - تم میری ہم آہنگ بنو یا نہ بنو - تم مجھکو جو جی چاہے سمجھو اب تو میں اپنی روداد سے تم کو آگاہ کر دینے کا ارادہ کر چکی ہوں اور وہ یہ ہے " اس نے اپنی پوری سرگزشت من وعن بیان کر دی - بدورا بے حس وحرکت سنتی رہی عائشہ نے سلسلہ کو قائم رکھتے ہوئے کہا :-

" بدورا ! ابو الخیر تم جیسی معصوم بھولی بھالی بچی کے لائق ہرگز نہیں ہے - وہ پرفن ہے - زمانہ ساز ہے محبت کی لذتوں سے اجنبی ہے - وقتی اور موسمی تاثیر و تاثر کا غلام ہے - اس کی کسی بات کو ثبات نہیں ہے - اس کا عشق ایک آنی و فانی جوش ہے جسکی کوئی اصلیت نہیں - یہ میں جانتی ہوں اور پھر بھی اس سے دست بردار ہونا میرے حق میں موت کا حکم رکھتا ہے - اور وہ میرے ہی منہ لائق ہے بھی - میں ایک کھوئی ہوئی عورت ہوں - مجھے اپنے اعصاب پر قابو نہیں ہے - ابو الخیر کو دیکھکر جو شورش میرے اندر اٹھ جاتی ہے میں اس کو دبا نہیں سکتی - اس کے مے آلود ہونٹوں اور فتنہ بار آنکھوں کے تصور سے میرے جسم کے ایک ایک ذرہ میں جو ہلچل مچ جاتی ہے اُس کو روک نہیں سکتی - ہاں میں اس کی صورت کی تباہ کردہ ہوں - دہلی میں اس کی صورت کے ہاتھوں مٹی اور ذرا تماشا دیکھنا اب بھی اس کی صورت کی پجاری ہوں - میں نے اس سے اپنا بدلہ لینے کی قسم کھائی تھی - اور دیکھتی ہوں بدورا میں اب بھی اپنے غارتگر کے پنجہ میں ہوں میں جھوٹ نہیں بولنا چاہتی - میں ابو الخیر کو نہیں چھوڑ سکتی " ترک آرزو " میرے لئے دشوار رہے - لیکن نہیں میں اس کو چھوڑ دوں گی - تمہارے لئے چھوڑ دونگی - بدکرداریوں کا یونہی بارگراں میرے سر پر ہے تم کو خراب کر کے - تم پر ظلم کر کے میں اپنے بوجھ کو اور بھاری نہ بناؤنگی - میں روپوش ہو جاؤنگی - ابو الخیر میرا پتہ نہیں پائیگا - کچھ دنوں میں خود بخود وہ راست پر آجائیگا " عائشہ اب رو رہی تھی -

بدورا کا دل دکھا ہوا تھا - اس کو رحم آگیا - وہ اپنا صدمہ بھول گئی - اس نے بیگم کو لپٹا کر کہا " میں اس کو نہیں دیکھ سکتی جس شخص کی مجھ سے زیادہ آپ کو ضرورت ہے اس کو آپ سے نہیں چھین سکتی - اگر دنیا کے رسوم کے مطابق مجھے آپ سے زیادہ حقوق حاصل ہیں تو ہونے دیجئے میں اُن سے غلط فائدہ نہیں اٹھانا چاہتی - مجھے ڈاکٹر کی ضرورت نہیں " عائشہ کا دل ٹھہر گیا - اُس نے اپنے کو بدورا کی آغوش میں رہنے دیا اور پھر کہا " مجھے ایک اور بات کہنی ہے جسکو میں نے ابتک چھپا رکھا ہے

اور جو مجھکو اندر ہی اندر سلگا رہی ہے" یہ کہکر وہ رک گئی جیسے پس و پیش کرتی ہو۔ اس کے بعد اس نے جھک کر بدورا کے کان میں کچھ کہا۔ بدورا چونک کر عائشہ سے الگ ہوگئی۔ عائشہ نے متوحش ہوکر پوچھا تو کیا مجھے تم پر اپنا راز افشا نہ کرنا چاہئے تھا؟ کیا میں نے دہوکہ میں تم پر اعتبار کرلیا؟ کیا تم مجھکو رسوا کردوگی اور رحم نہ کھاؤگی؟"

بدورا کو فوراً احساس ہوگیا کہ اس نے چونک کر ایک غلط فہمی پیدا کردی ہے۔ اُس نے اپنے حواس درست کرکے کہا۔ "آپ کو یہ مغالطہ ہوا۔ میں یہ خبر سننے کے لئے تیار نہ تھی۔ اس لئے حیرت میں چونک پڑی۔ مجھے آپ کے ساتھ ہمدردی ہے خلوص ہے۔ محبت ہے۔ مجھے اپنا رازدار و غمخوار سمجھئے"۔ عائشہ کو اطمینان ہوا۔ اس روگ کو میں چار مہینہ سے پال رہی ہوں۔ میرا آغاز و انجام یکساں ہے۔ مجھے ہر طرف تاریکی نظر آرہی۔ میں اب کہیں کی نہیں رہی"۔ عائشہ نے سلسلہ ختم کردیا اور بدورا کا منہ دیکھنے لگی۔

بدورا کی سمجھ میں کوئی بات نہ آتی تھی۔ بڑی مشکل سے اُس نے کہا "اب آپ کے لئے اس سے بہتر کوئی صورت نہیں کہ جسطرح اب تک آپ بسر کرتی رہی ہیں اب بھی بسر کیجئے۔ میں اپنی نامراد زندگی سے مانوس ہوگئی ہوں میرے دل میں آپ کی طرف سے کوئی کینہ نہیں ہے"۔

"خیر میں سوچونگی کہ میرے اور تمہارے حق میں بہترین صورت کیا ہوسکتی ہے"۔ عائشہ نے ایک سرد آہ کرکے جواب دیا۔

۱۳

ابوالخیر تین چار روز تک سرگرداں رہا۔ "بیگم" کا کہیں پتہ نہ تھا۔ "نصیر کوٹ" کے خدمتگاروں سے اُس نے دریافت کیا۔ انھوں نے ٹھیک نہیں بتایا۔ وہ ایک دن صرف دو روز کے لئے بستی گیا تھا اور اس قلیل عرصہ میں یہ انقلاب پیدا ہوگیا تھا۔ عائشہ اس کے نام ایک رقعہ چھوڑ گئی تھی۔ وہ یہ تھا۔

> تم میرا بیکار پیچھا نہ کرنا۔ مجھکو پا نہیں سکتے۔ میرے حق میں یہ بہتر ہو یا نہ ہو۔ بدورا کی بہبودی میں ہے۔ میں بدورا کی شادکامی کو مقدم سمجھتی ہوں۔ تم اس کے ہو۔ یہ میری زبردستی تھی کہ تم پر قبضہ کئے ہوئے بیٹھی تھی۔ اب تم اس کے ساتھ آرام و سکون سے رہو۔ تم کو اس کی قدر ہونی چاہئے۔ ایسی بیوی کسی کو قسمت سے ملتی ہے۔ میری فکر نہ کرو۔ خود مجھکو اپنی فکر نہیں رہی۔ سمجھو کہ مجھکو زمین کھا گئی۔ میری خاک کو آسمان اڑا لیگیا۔ مجھکو یقین ہے کہ تم مجھکو بہت جلد بھول جاؤ گے اس لئے کہ تم کو در اصل مجھ سے محبت نہیں ہے۔ محبت ہوتی تو پہلے ہی میری خبر لیتے اور اس طرح بے یار و مددگار چھوڑ کر دہلی سے بھاگ نہ جاتے۔ مجھکو البتہ تم سے محبت تھی۔ محبت کیا خاصا جنون تھا۔ اور اب بھی۔ مگر میں نے اپنی طبیعت پر جبر کرلیا ہے۔ اور تم کو بدورا کے سپرد کرکے صبر کے ساتھ اپنی زندگی کے دن گزار دینے کا تہیہ کرچکی ہوں۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ تم بھی

مجھکو اپنے حال پر نہ چھوڑ دو۔ للہ اب مجھکو زیادہ آزمائش میں نہ ڈالنا۔ میں نے ایک سیدھا راستہ اپنے لئے نکال لیا جسپر ثابت قدم رہنا چاہتی ہوں"۔

تمہاری ستائی ہوئی
عائشہ

مگر ابوالخیر عائشہ کو اس آسانی سے چھوڑنے والا نہ تھا۔ عائشہ ایک "سونے کی چڑیا" تھی جس کا تعاقب کرنا وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس نے ایک ملازم کو روپیوں کا لالچ دے کر عائشہ کا پتہ معلوم کر لیا۔ عائشہ اپنے مکان میں قفل دے کر اور مختصر سامان لیکر اپنے ایک دوسرے گاؤں میں چلی گئی تھی۔ جو شاہ آباد کہلاتا ہے اور جو کنک پور سے دکھن جانب بارہ تیرہ کوس کے فاصلہ پر گھاگھرا کے کنارے واقع تھا۔ عائشہ نوکروں سے تاکید کر گئی تھی کہ کسی کو اس کی بود و باش کی صحیح اطلاع نہ دی جائے۔ شاہ آباد ایک اجڑا دیار تھا اور اب مہذب انسان کا وہاں گزر مشکل سے ہوا کرتا تھا۔ شاذ و نادر ہی کبھی کوئی "سفید پوش" ادھر سے آنکلتا تھا۔ عائشہ کا خیال تھا کہ ابوالخیر اس دشوار گزار وادی کی صعوبتوں کو برداشت کرنے کی زحمت گوارا نہ کرے گا۔

ابوالخیر دو مہینہ تک انتظار کرتا رہا۔ اس کو توی امید تھی کہ عائشہ اس کے لئے بیتاب رہیگی اور آخر کار مجبور ہو کر پھر اس سے آملے گی۔ لیکن جب عائشہ کیا عائشہ کی گرد بھی نہیں آئی تو اس نے سوچا کہ اب جو کچھ ہو وہ خود جائیگا اور یا تو اس کو لے آئیگا یا وہیں اس کے ساتھ رہنے لگے گا۔ بدور اسے اس نے کہا "میں دو چار روز کے لئے باہر جا رہا ہوں۔ اور ممکن ہے اس سے زیادہ دن لگ جائیں"۔ بدور سمجھ گئی کہ ابوالخیر عائشہ کی تلاش میں جا رہا ہے

عائشہ نہ جانے کس طرح اپنے دل کو سنبھالے ہوئے ابوالخیر کی جدائی گوارا کئے ہوئے تھی اور دعا کر رہی تھی کہ "خدا مجھ کو اپنے ارادہ میں کامیاب رکھ اور ابوالخیر کی کافر آنکھیں پھر نہ دکھا"۔ لیکن منہ مانگی دعا قبول کب ہوتی ہے انہیں ہنکانیوالی آنکھوں کا پھر سامنا تھا۔ ابوالخیر کے شاہ آباد پہنچتے ہی عائشہ کے دل میں وہی ہیجان شروع ہو گیا تھا۔ اسپر ابوالخیر نے کچھ ایسا افسوں پھونکا کہ عائشہ پھر اس کے بس میں ہو گئی۔ اس نے کہا "عائشہ تمہاری یہ بدگمانی بے بنیاد ہے کہ مجھکو تم سے محبت نہیں ہے۔ تم میری زندگی میں ایک ضروری چیز ہو کر رہ گئی ہو۔ میں تم کو اب ہرگز نہیں جانے دونگا۔ میں دیکھتا ہوں کہ ہمارا اس جوار میں رہنا ٹھیک نہیں۔ خواہ مخواہ کی بدنامیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ خدا نے ہم کو کافی دولت دی ہے۔ آؤ ہم کچھ دنوں کے لئے کسی دوسرے شہر میں چلے چلیں جب یہاں کی شورش دب جائے تو پھر چلے آئیں گے۔ میں نے یہ بھی سوچ لیا ہے کہ بدور کو مناسب موقع دیکھکر وہیں سے طلاقنامہ بھیجدونگا۔ پھر اس کی زندگی کا بھی میں ذمہ دار نہ رہونگا اور تمہارے دل سے ایک بوجھ ہلکا ہو جائیگا۔ اور اب اگر تم میرے ساتھ شادی نہ کرو گی تو اور کیا کرو گی۔ دنیا کی مصلحت بھی اسی میں ہے کہ میں تم کو نہ چھوڑوں"۔

عائشہ کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی اور وہ راضی ہو گئی اگرچہ اس کا حزن و ملال دور نہ ہو سکا۔ ابوالخیر نے ایک ہفتہ شدید مصروفیت اور دوڑ دھوپ میں گزارا۔ ضروری سامان سفر درست کر کے وہ عائشہ کے ساتھ بمبئی چلا گیا۔ چلتے ہوئے اسنے

بدورا کو اطلاعی خط لکھدیا تھا جسمیں اس کا کوئی ذکر نہ تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ اس نے طلاق کا وعدہ ضرور کیا تھا جس سے بدورا اور قربان علی دونوں کو اطمینان ہوگیا تھا۔

ابوالخیر نے بمبئی میں بھی اپنا مطب کھول دیا تھا اور کمانے لگا تھا۔ عائشہ گزشتہ جھگڑوں کو بھول چکی تھی۔ اس کو اب اگر کوئی خلش تھی تو یہ تھی کہ ابوالخیر نے اب تک بدورا کو طلاقنامہ بھیجا تھا اور نہ اس سے باقاعدہ نکاح کیا تھا۔ وہ جب کبھی ابوالخیر سے اس کا ذکر کرتی تو ابوالخیر اس کا منہ چوم کر کہتا "سب کچھ ہوجائیگا۔ جلدی کا ہیکی ہے؟ کیا تم کو مجھ پر اعتماد نہیں ہے"۔ بیچاری خاموش ہوجاتی تھی۔ مگر اس کی خلش دور نہ ہوئی تھی۔ ابوالخیر عائشہ کے ساتھ اس طرح رہتا تھا کہ ہمسائے سمجھتے تھے عائشہ اُسکی بیوی ہے عائشہ کا برتاؤ بھی اس کے ساتھ وہی تھا جو ایک بیوی کا شوہر کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ عائشہ تین چار مہینہ میں اپنے بار سے سبکدوش ہونے والی تھی۔ محلہ والوں کو یہ معلوم ہوچکا تھا کہ ابوالخیر عنقریب باپ بننے والا ہے۔

۱۴

مالتی ایک ہندو عورت تھی اور محبت میں ستی ہوجانے کا جذبہ اس کی گھٹی میں نہیں اس کی رگوں کے خون میں ساری تھا۔ وہ اپنا دل دوسرے کے ہاتھ میں دے چکی تھی اور اب اس کی جو حالت تھی اُسکو صرف "حیرانی" یا انفعالیت کہہ سکتے ہیں۔ اُس نے اچھی طرح محسوس کرلیا تھا کہ احمد اس کی محبت سے گھبراتا ہے وہ احمد کی بار خاطر ہونا نہ چاہتی تھی۔ احمد وفا سے بیزار تھا۔ مالتی وفا کو بھی چھوڑ دینے کے لئے تیار تھی۔ اُس نے عزم کرلیا تھا کہ احمد کا جوگ لے لیگی۔ دنیا کو تج دیگی مگر احمد سے اپنی شکستگی کی داد نہ چاہیگی۔ مالتی کو معلوم تھا کہ لوگ بدورا کو طلاق دلانیکی فکر میں ہیں۔ ایسی حالت میں بدورا احمد کے ساتھ بیاہی جائیگی اور احمد اپنی لٹی ہوئی دولت پھر پالیگا۔ مالتی نے احمد کے وہاں آمد و رفت آہستہ آہستہ کم کردی تھی اور اب بہت کم اس کو اپنی صورت دکھاتی تھی تاکہ کوئی کمزور سے کمزور رکاوٹ اس کی ذات سے احمد اور بدورا کے راستہ میں نہ پیدا ہو۔ احمد اَب بھی اس سے مل لیا کرتا تھا اور اس کا حال پوچھ لیا کرتا تھا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کو مالتی کا اب بھی اسیطرح خیال ہے۔ مگر مالتی خوب سمجھتی تھی کہ یہ احمد کی وضعداری ہے اور اس دن جنگل میں اس نے جو اس کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے اسی کی لاج ہے۔

احمد کی عجیب حالت تھی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس گتھی کو کیونکر سلجھائے۔ مالتی سے اب تک وہ شادی کی نیت رکھتا تھا۔ لیکن گزشتہ چند دنوں میں جو نئی صورت پیدا ہوگئی تھی وہ اُس کو ایک کروٹ چین سے نہ رہنے دیتی تھی یہ سچ ہے کہ اَب اس کی محبت میں وہ جوش یا تلاطم نہ تھا۔ تاہم اس کو اگر کسی کا گرویدہ کہا جاسکتا تھا تو بدورا کا۔ یہ بدورا کی محبت تھی جس نے اس کے قلب میں ایسی چوٹ۔ ایسی گھلاوٹ ایسی خستگی و برشتگی پیدا کردی تھی۔ اور یہ بدورا کی محبت تھی جو آج بھی اسکی زندگی کی تنہا مرکز بنی ہوئی تھی۔ بدورا اس کے لئے اب بھی بدورا تھی وہ بدورا کے ہاں روزانہ نہیں تو دوسرے دن ضرور جانے لگا تھا۔ وہ بھی بدورا کے طلاق کا چرچا سن رہا تھا اور اُس سے اس کی الجھن بڑھ رہی تھی۔ وہ بدورا سے

منہ نہ موڑ سکتا تھا اسلئے کہ وہ بدورا کو پوجتا تھا۔ لیکن مالتی کو کیا کرے؟ اس سے کیسے آنکھیں پھیرلے؟ مالتی اپنی محبت کا نقش اس کے دل پر جما چکی تھی۔ غرضکہ احمد ایک ایسی کشمکش میں تھا کہ کسی طرف سے اپنا دامن چھڑا کر بھاگ نہ سکتا تھا۔ اس کی تندرستی روز بروز خراب ہوتی چلی جاتی تھی۔ اس کو اکثر اپنی موت کا خیال آجاتا تھا اور وہ کبھی تو اس خیال سے افسردہ ہو جاتا تھا کہ اس کو ہمیشہ کے لئے بدورا سے جدا ہونا پڑے گا اور کبھی یہ سوچکر خوش ہو جاتا تھا کہ چلو اس طرح ایک لاینحل مسئلہ حل ہو جائیگا

ابوالخیر نے طلاق کا جو وعدہ کیا تھا اس سے قربان علی کو بڑی ڈھارس بندھ گئی تھی اور بدورا تو گویا جی ہی اٹھی تھی۔ قربان علی تو یہ طے کر چکے تھے کہ اپنی بدورا کو احمد کی امانت سمجھ کر اس کے حوالہ کر دیں گے۔ انھوں نے اس ارادہ کا اظہار کسی سے نہیں کیا تھا مگر ہر شخص اُس کو سمجھے ہوئے تھا۔ خود احمد کو بھی معلوم تھا کہ قربان علی زبان سے کہیں یا نہ کہیں مگر ان کی نیت یہی ہے۔ بدورا نے اس دن احمد سے کہنے کو تو کہدیا تھا کہ تمہارا جس کے ساتھ جی چاہے شادی کرو۔ مجھکو اسکی پروا نہیں لیکن اب اسکو یقیناً اسکی پروا تھی۔ شاید اس دن بھی پروا تھی اور احساس نہ تھا اس نے اپنی بات واپس لینا مناسب نہ سمجھا۔ احمد سے اس نے اپنی خواہش کا اظہار الفاظ میں نہیں کیا بلکہ اپنی دلنوازیوں اور دلربائیوں سے اسکی کوشش کرنے لگی کہ احمد خود بخود بلا کسی سخت تحریک کے اس کی ذمہ داری اپنے سر لے لینے کے لئے تیار ہو جائے۔ اسکو کامل یقین تھا کہ اس کی یہ ادا کارگر ہو جائیگی۔ احمد بعض اوقات تو بدورا کی "پرکار سادگیوں" سے اس طرح مسحور ہو جاتا تھا کہ اب کبھی اس کے قابو سے باہر نہ نکل سکیگا لیکن اب اس کی یہ سپردگی پائدار نہ ہوتی تھی۔ وہ بہت جلد اپنے ہوش میں آجاتا تھا اور اس کی محزونیت اسپر پھر مستولی ہو جاتی تھی۔ بہرحال بدورا کو اُمید تھی کہ وہ اپنی مسلسل کوششوں سے احمد پر فتح پالیگی۔

ایک دن احمد کئی دن کے بعد بدورا سے ملنے گیا۔ بدورا نے شکایت کا دفتر کھول دیا۔ احمد کو بخار آگیا تھا اسی وجہ سے وہ اتنے دن تک بدورا سے نہ مل سکا تھا مگر اُس نے اپنی اصل حالت کو چھپا کر کہا۔ ادھر مجھکو کچھ نہایت ضروری کام تھے اور میں نہ آسکا۔ بدورا نے عذر قبول کر لیا اور احمد سے بے تکلف ہو کر ملنا چاہا۔ وہ اپنے کو احمد کا سمجھنے لگی تھی۔ احمد نے متفکرانہ لہجہ میں کہا ہم کو ایک دوسرے سے اتنا بے تکلف نہ ہونا چاہیے ہمکو اس کا کوئی حق نہیں حاصل ہے۔ تم ابھی ابوالخیر کی بیوی ہو بدورا کا دل سرد ہونے لگا۔ احمد کو جب کبھی بدورا خود اس کا پیار کر لیتی یا اُس سے محبت کی باتیں کرتی تو وہ کوئی مزاحمت تو نہ کرتا تھا مگر اس کے تیور سے پایا جاتا تھا کہ اب اس کو ان باتوں سے تکلف نہیں تو پریشانی ضرور ہوتی ہے۔ محبت کے اس نشاۃ الثانیہ میں احمد نے ایک بار بھی بدورا کو اگلی سی گرمجوشی کے ساتھ پیار نہیں کیا تھا اور نہ دل کھول کر اس سے باتیں کی تھیں۔ زیادہ سے زیادہ اگر محبت نے جوش کیا تو بدورا کے سر پر ہاتھ پھیر دیا جسوقت وہ ہاتھ پھیرتا تھا اس کی صورت دیکھنے کے قابل ہوتی تھی سراپا حسرت و حرماں ہو جاتا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ اس کی پچھلی ہستی اپنے پورے زور کے ساتھ ابھرنا چاہتی ہے اور ابھر نہیں پاتی۔ احمد آج خلاف معمول بدورا کے اظہار جذبات کو ناجائز سمجھ رہا تھا۔ بدورا کو اس کا ملال ہوا اس نے کبیدہ خاطری سے کہا۔ "احمد تم مجھکو اب چاہتے نہیں۔ خطاوار میں ضرور ہوں۔ لیکن تم نے تو معاف کر دیا تھا اب اس کشیدگی کے

کیا معنے؟ تم نے اس دن ایک طرح سے میری دعوت محبت قبول کر لی تھی۔ پھر یہ انحراف کیوں؟ احمد کیا تم نے درحقیقت مجھکو معاف نہیں کیا ہے؟ کیا میں تم سے امیدیں نہ لگاؤں؟ میں تو یہ سمجھنے لگی تھی کہ میری زندگی کی منحوس گھڑیاں گزر چکی ہیں اور اب مبارک ساعتیں آ رہی ہیں۔ کیا میرا یہ سمجھنا غلطی ہے؟ کیا میری امیدیں بے بنیاد طلسم کی طرح ٹوٹنے والی ہیں؟ کیا تم از سر نو میری زندگی کو پر کیف نہیں بنا سکتے؟"

بدورا نے پے بہ پے اتنے سوالات کر ڈالے تھے اور کچھ اس لہجہ میں کہ احمد بھی اپنے دل میں ایک آگ بھڑکتی ہوئی محسوس کرنے لگا۔ آخر کار اس سے نہ رہا گیا اور اس نے بدورا کا ہاتھ چوم کر کہا: "بدورا ایسی باتیں نہ کرو۔ میرے زخموں پر نمک نہ چھڑکو۔ میں اگر کسی کو چاہنے کا دعویٰ کر سکتا ہوں تو وہ تم ہو۔ یہ اور بات ہے کہ میرے معتقدات میں فرق آگیا ہے میں محبت کو انسان کی تباہی کا ایک بہانہ سمجھنے لگا ہوں۔ میں اب محبت کو یکسر لذت و انبساط نہیں سمجھتا۔ میری ساری ہستی جھلس گئی ہے۔ میں خاکستر ہو چکا ہوں اور یہ سب اسی ایک محبت کی بدولت۔ اس لئے اگر میرے اندر وہ ولولہ وہ اُمنگ نہیں تو جائے تعجب نہیں۔ لیکن میں تم کو چاہتا ہوں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ باوجود اپنی ہزار کوشش کے تم سے بے نیاز و بیگانہ نہ ہو سکا۔ تم مجھ سے کنارہ کش ہو کر بھی میری روح کی ملکہ بنی رہی ہو۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میں اس درمیان میں لہو کے آنسو اس طرح بہا چکا ہوں کہ اب نہ دل میں وہ طاقت ہے نہ جگر میں وہ حال۔ لیکن بدورا میری طرف سے اس بدگمانی کو نہ راہ دو کہ میں تم کو چاہتا نہیں۔ نہیں بدورا میں تم کو چاہتا ہوں۔ مگر میری اپنی زندگی اس درجہ تلخ ہو چکی ہے کہ میں اب نہ اپنی زندگی کو پر کیف بنا سکتا ہوں نہ کسی دوسرے کی۔ ایسی صورت میں نہیں کہہ سکتا کہ کسی کا مجھ سے امیدیں وابستہ کرنا کہاں تک درست ہے۔"

بدورا یہ سنکر بے قابو ہو گئی اور زار زار رونے لگی۔ ادھر کچھ دنوں سے اس کی یہی حالت تھی کہ دل کو ذرا سی ٹھیس لگی اور آنکھوں سے بےساختہ آنسو جاری ہو گئے۔ احمد کی روح تڑپ گئی۔ اُس نے بدورا کے گرم گرم آنسو پونچھتے ہوئے کہا یہ نہ کرو! بدورا یہ نہ کرو۔ میں تمہارے آنسو نہیں دیکھ سکتا رونا بڑی چیز ہے۔ اسی نے مجھکو جلا ڈالا ہے یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج میں جینے سے مایوس ہو کر ہر وقت سانسیں گنتا رہتا ہوں۔ بدورا میں تمہاری محبت کرتا ہوں قسم کھانے کی حاجت نہیں۔ کیا تم کو میری نگاہوں میں میری گفتگو کے ایک ایک حرف میں محبت کی علامت نہیں ملتی۔ آج اگر تمہاری چاہت میرے دل میں گھر نہ کر چکی ہوتی تو مالتی کے ساتھ ایسی بیدلی کا برتاؤ کر کے اس کو کھو نہ دیتا۔ کہو اب اور کیا چاہتی ہو؟"

بدورا نے کچھ نہ کہا۔ اس کی تسکین ہو گئی تھی۔ وہ یوں بھی جانتی تھی کہ احمد اس کے اختیار سے باہر نہیں ہے۔ احمد نے اب اقرار بھی کر لیا تھا۔ اس نے اس موضوع پر زیادہ واضح گفتگو کرنا بے محل سمجھا جب وقت آئیگا تو دیکھا جائیگا۔ اس خیال سے وہ خاموش رہی۔

احمد واقعی مالتی کو کھو چکا تھا۔ وہ بدورا کے مقابلہ میں اپنے سست ارادہ پر قائم نہ رہ سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بدورا طلاق پانے کے بعد اسی کی پناہ میں آئیگی اور اس سے یہ نہ ہو سکتا تھا کہ اس کو پناہ میں لینے سے انکار کرے۔ مجبوراً مالتی کے خیال کو

دل سے نکال رہا تھا۔ اس کو اگر کوئی سکون تھا تو یہ تھا کہ اُس نے اپنا تمام سرمایہ مالتی کو دیدیا ہے اور وہ کسی کی دست نگر نہیں رہیگی احمد نے اپنے کو آنے والے واقعات کے حوالہ کر دیا تھا۔ جو کچھ ہونے والا ہوگا وہ ہو رہیگا اور وہ جس طرح اب تک اتفاقاتِ زمانہ کے ہاتھوں مجبور رہا ہے اب بھی ہے۔ (باقی آئندہ)

مجنوں گورکھپوری

شاہانِ بہمنیہ

(بسلسلۂ ماسبق)

مجاہد شاہ بہمنی

محمد شاہ کے بعد اُس کا بیٹا مجاہد شاہ بہمنی انیس سال کی عمر میں تخت نشین ہوا، یہ ملک سیف الدین غوری کا نواسہ تھا، اور نہایت ہی تنومند اور قوی ہیکل، تخت نشینی چند ہی روز بعد راجہ بیجانگر کو لکھا کہ رودِ کرشنا اور تنگ بھدرا کے بعض حصص جو آپس میں مشترک ہیں ہمیشہ مایہ النزاع رہتے ہیں تم دریائے تنگبھدرا کو حد مقرر کر لو اور قلعہ بنکاپور وغیرہ ہمارے حوالے کر دو۔

بنکاپور چونکہ بیجانگر اور سمندر کے درمیان میں واقع تھا اگر یہ قلعہ مسلمانوں کے ہاتھ میں آجاتا تو ہندوؤں کی تجارت کو سخت صدمہ پہونچتا اور وہ مسلمانوں کے قابو میں آجاتی اس لئے راے بیجانگر نے بجاے اِن قلعوں کو دینے کے مطالبہ کیا کہ محمد شاہ نے جو جو علاقے چھین لئے ہیں وہ واپس کر دو اور دریاے کرشنا کو حد مقرر کر لو" یہ جواب سنکر مجاہد شاہ آپے سے باہر ہو گیا اور دولت آباد و بیدر سے لشکر بلوا کر اعلان جنگ کر دیا، اپنے نانا سیف الدین غوری کو گلبرگہ میں چھوڑ کر کثیر لشکر اور پانچسو کوہ پیکر ہاتھی لیکر دریاے کرشنا اور تنگبھدرا کو عبور کر کے ادہونی پہونچا مگر یہاں اطلاع ملی کہ راے بیجانگر گنگاوتی میں ہے تو صفدر خاں سیستانی کو براری لشکر دیکر گنگاوتی روانہ کر دیا اور امیر الامراء بہادر خاں اور اعظم ہمایوں کو ایک لشکر دیکر بیجانگر روانہ کر دیا اور خود آہستہ آہستہ روانہ ہوا۔

راستہ میں اطلاع ملی کہ ایک آدم خوار شیر نے اطراف و اکناف میں پریشانی پھیلا دی ہے چونکہ مجاہد شاہ نہایت ہی دلیر اور شکار کا حد درجہ شایق تھا اس لئے فوراً شیر کے شکار کے لئے تیار ہو گیا اور صرف سات پیادے ہمراہ لیکر جنگل میں گھس پڑا اور تیر سے شیر کو ہلاک کیا، ہندوؤں نے اس شگون کو اپنے لئے فال بد تصور کیا اور مسلمانوں کی فتح و نصرت کی پیشین گوئی سمجھ لیا، ادھر راے بیجانگر مقابلہ کی تیاریاں کر رہا تھا مگر شیر کے شکار کے شگون نے اسے ٹھہرنے نہ دیا اور وہ سنڈور کے جنگلوں میں جا چھپا، مجاہد شاہ نے بھی تعاقب کیا مگر راجہ بندر رامیشور کی طرف فرار ہو گیا، چھ مہینے تک راجہ بھاگتا پھرا اور مجاہد شاہ تعاقب کرتا رہا اس بے تکے تعاقب کی وجہ سے لشکر تباہ ہونے لگا، راجہ بیمار ہو کر خفیہ راستہ سے بیجانگر پہونچ گیا، اور مجاہد شاہ نے تھوڑی سی فوج راجہ کے تعاقب کے لئے چھوڑ کر بہادر خاں اور پانچ ہزار سواروں کو ساتھ لیکر بندر رامیشور کا رخ کیا مگر تھوڑی دور تک جا کر ایک نئے راستے سے بیجانگر کیطرف واپس ہوا راستہ میں ایک جھیل تھی جہاں سری رتنگ نامی ایک بڑا مندر بھی تھا جسے توڑ تاڑ کر مسمار کر دیا اور مندر کے بیشمار جواہر لوٹ لئے گئے، مندر کے لٹنے اور مسمار ہونے کی کیفیت سنکر برہمنوں نے راجہ پر لعنت و ملامت کی بوچھار کر دی اور وہ ایک عظیم الشان لشکر لیکر مقابلہ کے لئے نکلا۔

جسوقت راجہ کا لشکر پہونچا مجاہد شاہ وہیں جھیل پر کھڑا ہوا تھا دشمن کی فوج نظر آئی تو چتر اوتار ڈالا اور محمود نامی افغان

سلحدار کو ساتھ لیکر ہندوؤں کی نقل و حرکت دیکھتا ہوا آگے بڑھا، ایک ہندو سپاہی نے مجاہد شاہ کے گھوڑے (شبرنگ) کو پہچان کر ایک پہاڑی کی آڑ سے پیچھے آکر وار کر دیا، اتفاقاً مجاہد شاہ کی نظر اُس پر پڑ گئی اور محمود افغان کو اشارہ کیا محمود نے ہندو سپاہی پر حملہ کر دیا مگر اتفاق سے اُس کے گھوڑے نے ٹھوکر لی اور محمود چت گرا اس کو گرتے دیکھکر ہندو سپاہی نے ایک بھرپور ہاتھ چھوڑ دیا۔ مگر خود کی وجہ سے محمود محفوظ رہا اور مجاہد شاہ نے ایک ہی وار میں ہندو سپاہی کے دو ٹکڑے کر دیئے

۱۳۷۵ء میں اسی زمانہ میں راے بیجانگر اپنی فوج کو لئے ہوئے جھیل کو عبور کر رہا تھا کہ بادشاہ نے جنگ کا حکم دیدیا اور فوراً حملہ کر دیا امیر الامرا میمنہ پر اعظم خاں میسرہ پر تھے مقرب خاں اپنا آتش خانہ لئے ہوئے الگ تھا، شاہی فوج نہایت ہی جی داری سے لڑ رہی تھی اور ہندو لشکر مغلوب ہو رہا تھا کہ راے بیجانگر کا بھائی مدّیا آٹھ ہزار سوار اور چھ لاکھ پیدل لیکر مدد کیلئے پہونچ گیا، اس کمک سے ہندوؤں کے حوصلے بڑھ گئے اور وہ چمک چمک کر لڑنے لگے، روزانہ ایک آدھ جھڑپ ہونے لگی جس میں عموماً بادشاہی لشکر کو دبنا پڑتا تھا بے شمار فوج کام آگئی اور مقرب خاں شہید ہو گیا۔ ایک روز مقابلہ نے طول کھینچا اور نقشہ بدلنے لگا مجاہد شاہ نے اپنے چچا داؤد خاں کو سو درہ کی حفاظت کے لئے سات ہزار فوج دیکر مقرر کر دیا تھا، اس سے لشکر کی تباہی دیکھی نہ گئی درہ چھوڑ کر دوڑتا ہوا میدان میں پہونچ گیا اور اپنی سات ہزار فوج لیکر اس بے جگری سے مقابلہ کیا کہ ہندوؤں کے چھکے چھڑا دیئے اس جنگ میں اس کے تین گھوڑے کام آئے اور وہ پیدل لڑتا رہا اور محض اسی کی وجہ سے فتح نصیب ہوئی، بادشاہ نے داؤد خاں کو میدان میں دیکھکر اس وقت تو خاموشی اختیار کی مگر جب لڑائی ختم ہو گئی تو بڑا اُوپر آکر بہت خفا ہوا کہ تم نے بہت بری حرکت کی اگر ہندو درہ پر قابض ہو جاتے تو ایک مسلمان بھی زندہ بچکر نہ نکل سکتا تھا۔ اور اسی وقت چند امرا کو درہ کی حفاظت کے لئے روانہ کیا مگر اس پر ہندو قابض ہو چکے تھے، واقعی یہ درہ تھا بھی نہایت خطرناک اگر پہاڑی کی آڑ پکڑ کر درہ کو روک دیا جائے تو غنیم کے نکلنے کے لئے کوئی راستہ باقی نہیں رہتا تھا اور یہی وجہ مجاہد شاہ کے خفا ہونے کی تھی جب ہندوؤں کے قابض ہونے کی اطلاع ملی تو وہ خود درہ تک یلغار کرتا ہوا پہونچا، اُسکو آتا ہوا دیکھ کر ہندو فرار ہو گئے۔ مجاہد شاہ نے خود درہ پر ٹھہر کر تمام لشکر کو وہاں سے نکال دیا۔ مگر اسے معلوم ہو گیا کہ بیجانگر کو فتح کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے اس نے ستر ہزار اسیرانِ جنگ کو جنمیں عورتیں اور بچے بھی تھے ساتھ لیکر ادھونی کا رُخ کیا، وہاں شاہی فوج محاصرہ کئے پڑی تھی خود بھی جاکر شریک ہو گیا تو مہینے محاصرہ قائم رکھا گرما کا آغاز تھا اس لئے اس کا خیال تھا کہ محصورین پانی کی قلت کی وجہ سے خود کو حوالے کر دیں گے مگر اتفاق سے غیر معمولی بارش بھی ہو گئی اور شاہی لشکر میں وبا بھی پھیلی ملک سیف الدین کو اطلاع ملی تو خود آیا اور مجاہد شاہ کو سمجھایا کہ یہ معمولی قلعہ نہیں ہے جو اتنی جلدی فتح ہو جائے پہلے اطراف کے قلعہ بندر گوآ، ہلگاؤں، نبکاپور وغیرہ فتح کر لیجئے پھر اس قلعہ کو فتح کر لینا آسان ہے، مجاہد شاہ واپس ہوا اور تنگ بھدرا کو عبور کرکے مدگل پہونچا اور لشکر کو مدگل ہی میں چھوڑ کر شکار کرتا ہوا رائچور پہونچ گیا، صفدر خاں، اعظم ہمایوں، بادشاہ کی اس لاپروائی سے ڈر رہے تھے، داؤد خاں دشنام دہی کا بدلہ لینے تلا ہوا تھا، جب بادشاہ شکار سے واپس ہوا تو صفدر خان اور اعظم ہمایوں کو برار اور دولت آباد کو واپس

کردیا اور خود وہیں رہ پڑا۔ داؤد خاں نے مسعود خاں وغیرہ کو ملا کر بادشاہ کے قتل کی فکر شروع کی اتفاق سے مجاہد شاہ نے مدگل سے نکلکر کرشنا کو عبور کیا اور مچھلی کے شکار کے لئے ٹھہر گیا انہیں دنوں میں آشوب چشم میں بھی مبتلا ہو گیا جس کی وجہ سے مجبوراً سفر ملتوی کرنا پڑا۔

ایک روز رات میں بادشاہ آرام کر رہا تھا کہ داؤد خان اور مسعود خان پہرے کے بہانہ سے سرا پردے کے پاس بیٹھ گیا اور دو پہر رات کو خان محمد اور چند دوسرے آدمیوں کو باہر ٹھہرا کر اندر چلے گئے۔ ایک خواجہ سرا اور ایک حبشی غلام بادشاہ کے پاؤں دبا رہے تھے دونوں نے داؤد خاں کو برہنہ خنجر لئے ہوئے دیکھکر شور مچایا اور بادشاہ جاگ اٹھا، اور دیر تک آنکھیں ملتا رہا مگر آشوب کی وجہ سے کچھ نظر نہ آیا داؤد خان نے خواجہ سرا کے پیٹ میں خنجر بھونک دیا اور غریب کی آنتیں نکل پڑیں، بادشاہ نے باوجود آشوب کے داؤد خاں کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹ لیا، حبشی غلام کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا مگر وہ بھی مسعود خاں سے لپٹ پڑا مگر اس نے تلوار سے اس کا خاتمہ کر دیا اور بادشاہ کے سر پر ایسی شدید ضرب لگائی کہ فوراً کام تمام ہو گیا۔ شب جمعہ ۱۷ ذی الحجہ ۷۷۹ھ کو مجاہد شاہ نے ۲۲ برس کی عمر میں ۳ سال حکومت کرکے جام شہادت نوش کیا اور گلبرگہ میں مدفون ہوا۔

مجاہد شہ آں والئ تاج و تخت　　جو از دار دنیا بہ جنت رسید
ز سرور بتاریخ او شد ندا　　کہ اہل الصفا بادشاہِ شہید

مجاہد شاہ بڑا قوی ہیکل، خوش رو، سڈول، جوان تھا اور بڑا بہادر اور جری تھا، ترکی زبان خوب جانتا تھا ہمیشہ ترکی اور فارسی زباندانوں سے صحبت رہتی تھی، شمشیر، نیزہ، خنجر، تیر کمان، کا بے انتہا شوق تھا ایک دفعہ اپنے باپ کے خزانہ کو توڑ کر اشرفیوں کی چند تھیلیاں نکال کر دوستوں میں تقسیم کر دیں جب محمود شاہ کو اطلاع ملی اس نے مبارک تنبول دار خاصہ کو بھیج کر بلوایا اور خوب کوڑے لگوائے، مجاہد شاہ نے پٹ پٹا کر ماں سے شکایت کی کہ اگر تنبو دار مجھ سے بادشاہ کے غصہ کا حال کہدیتا تو میں تم سے سفارش کراتا اور غصہ فرد ہونے کے بعد سامنے جاتا مگر اس نے اطلاع نہیں دی، ماں نے کہا اسے کیا معلوم تھا کہ تم کو اس طرح کوڑے لگائے جائیں گے اور پھر وہ حکم سے مجبور تھا مجاہد شاہ نے چند روز تک خاموشی اختیار کی اور پھر مبارک سے میل جول بڑھا لیا اور ایک دن مبارک سے کہا کہ میں سنتا ہوں کہ تم پہلوان ہو اور خوب کشتی لڑتے ہو ذرا ہمیں بھی زور دو، مبارک کو کیا خبر تھی کہ شہزادے کا خیال کچھ اور ہے۔ مبارک نے اس خیال سے کہ شہزادہ چودہ سالہ لڑکا ہے اور میں تیس برس کا جوان ہوں کشتی بدلی اور زور شروع ہوا مگر شہزادے نے مبارک کو اٹھا کر ایسا پٹخا کہ بیچارے کی گردن ٹوٹ گئی اور فوراً ہی رخصت ہو گیا۔

مجاہد شاہ کو علماء و فضلاء سے خاص انس تھا ابتدا سے ایسے ہی لوگوں کی صحبت ملی تھی، اخلاق و عادات بھی نہایت ہی پسندیدہ اور عمدہ تھے افسوس ہے کہ مجاہد شاہ کو زیادہ موقع نظم و نسق کی درستی کا نہیں ملا، اپنی مختصر سی مدت سلطنت میں وہ لڑتا ہی رہا مگر نہ تو کسی علاقہ پر قبضہ کیا اور نہ کوئی بڑی فتح حاصل کی۔ (باقی آئندہ)

تمکین کاظمی

باب المراسلة والمناظرة

(از دار العلوم ندوۃ العلماء)

والا جناب، سلام و نیاز

اگست کا نگار دیکھا، "فلسفۂ مذہب"، اور "بعض سیاسی مسائل پر" آپ کے افکار عالیہ سے مستفید ہوا چاہتا ہوں کہ اس موضوع کے متعلق میں بھی کچھ عرض کروں

گزشتہ سال انجمن الاصلاح کے ایک کام سے ندوہ کے چند احباب کے ساتھ مجھے شرف نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا تھا، اس وقت بھی میں نے مذہبیات پر آپ کی فکر بدیع سے فائدہ حاصل کیا تھا، آج کی صحبت بھی کچھ اسی قسم کا استفادہ مقصود ہے۔

مجھے جب آپ سے شرف نیاز حاصل کرنے کا موقعہ ملا، میں ہمیشہ آپ کے لطف و عنایت کا شکر گزار رہا، کہ آپ نے بایں عدیم الفرصتی و کثرت کار ایک غیر معروف، اور ناقابل التفات دل و دماغ والے شخص سے گھنٹوں سلسلۂ کلام جاری رکھا، اب میں چاہتا ہوں کہ آپ کی اس فکر بدیع اور وجدان حسین کے متعلق کچھ عرض کروں، "مذہب پر" ارکان مذہب "پر" "آئین مذہب پر"، نواہیں مذہب پر، آپ نے جب گفتگو فرمائی، تو موجودہ طرق مذہبی کو ناقابل عمل، عقائد مذہبی کو یکسر ناقابل التفات، بتلایا، آپ نے ایک فلسفی کی حیثیت سے ان چیزوں کا تجزیہ فرمایا، اس کے بعد خندہ اڑایا، آپ نے نماز کو خلاف تہذیب، بتلایا "جف القلم" پر تمسخر فرمایا، داڑھی کو منہ بگاڑنے سے تعبیر فرمایا، اور اگر آپ اجازت دیں تو عرض کروں کہ پردہ کے متعلق جن خیالات کا اظہار آپ نے نگار میں فرمایا، انسے کہیں حریت لئے ہوئے خیالات کا اظہار آپ نے پرائیوٹ طور سے فرمایا، یعنی آپ نے فرمایا، اصول حفظان صحت کے خیال سے اخلاقی نقطۂ نظر سے پردہ ایک لغو اور مہمل چیز ہے، میں نے اسپر اظہار حیرت کیا، اور اس خطرہ کی طرف توجہ دلائی جو اس سے وقوع میں آنے والا تھا، میں نے عرض کیا تھا کہ مرد و عورت کے اتصال کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان میں بھی لد الزنا یورپ سے زیادہ پائے جائینگے۔ مرد کے جذبات میں التہاب ہوگا عورت اپنے جذبات کی پذیرائی چاہیگی، مرد خدع و فریب سے کام لیکر عورت کو دام تزویر میں پھانسے گا عورت کہ اس کی زندگی عبارت ہے محبت سے اس کے جال کا شکار ہو جائیگی، مرد اپنی رعنائی و زیبائی سے عورت کو مسحور کریگا عورت اُس کی ہو رہیگی، اس کے بعد مرد اپنی خلقی اور جبلی عادت کے

مطابق اسے سیہ کاری کے لئے چھوڑ دیگا، وہ بے بس ہوکر وہ کریگی جو آج "ہائڈپارک" میں علی الاعلان ہورہا ہے، اسپر آپ نے فرمایا کہ یہ چیزیں عارضی ہونگی، اور چند نسلوں کے بعد اس قسم کی بدکرداریوں کا خاتمہ ہوجائیگا۔ اس لئے کہ بدکرداری سے طبیعت سیر ہوجائیگی، میں اس فلسفۂ جدیدہ پر متحیر ضرور ہوا، لیکن اس کے بعد میں بھی خاموش ہورہا اور جناب نے بھی سکوت اختیار فرمایا۔ ارشاد ہو کہ خلوت وجلوت میں اس قدر بعد عظیم کیوں ہے؟ اگر حقیقی خیالات آپ کے وہ ہیں جن کا میں اوپر اعادہ کرچکا ہوں تو پھر نگار میں اس قدر نرمی سے خالص شرعی حیثیت سے آپ نے روشنی کیوں ڈالی، اخلاقی جرات کا فقدان آپ میں میرے لئے باعث حیرت ہے میں تو سمجھتا تھا کہ رسوائی اور بدنامی آپ کے لغت میں "ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ احسان نہ ہوا"

صائب الرائے، انسان رسوائی خلق کی کب پروا کرتا ہے، اس کا جو عقیدہ ہے وہ منظر عام پر نمودار ہوکر رہتا ہے، خلق کی چہ میگوئیاں اس کے عزم وارادہ کے لئے خس وخاشاک کی حیثیت بھی نہیں رکھتیں، پھر آپ کیوں مرعوب ہوگئے؟ آپ نے اپنے ان افکار نادرہ اور تحقیقات جدیدہ کو پبلک میں کیوں نہیں پیش فرمایا، اگر سر سید احمد خاں اپنے عقائد پبلک میں پیش کرسکتے تھے، اگر مسٹر ظریف اپنے تخیلات سے پبلک کو واقف کرسکتے تھے، اگر مسٹر عبدالماجد (اب مولینا) اپنی فلسفیانہ موشگافیوں کو منصۂ شہود پر جلوہ گر کرسکتے تھے تو آپ کو کیوں تامل ہے؟ اب تو وہ زمانہ ہے کہ

انا لحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

پھر آپ اپنے ان عقائد وخیالات کی تبلیغ وتلقین پرائیوٹ مجلسوں سے گزر کر محفل عام میں کیوں نہیں کرتے؟

دوسری بات جسپر میں آپ کی توجہ منعطف کرنے کی عزت حاصل کرنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ سیاسی مسائل کے سلسلہ میں آپ نے خلافت اور مسلم لیگ کو بیکار بتایا ہے۔ جب شریف حسین حالت احتضار میں تھا، اور ہماری سرکار ابد قرار اس کی ساعی تھی کہ ہندوستان سے حجاج حج کرنے نہ جانے پائیں۔ اور بعض شریفی اس کی تائید بھی کررہے تھے، اس وقت خلافت ہی کا تو وہ ضعیف العمر مگر جوان ہمت قائد تھا۔ جسنے حج کا راستہ صاف کرایا، اور گورنمنٹ کو بتلادیا کہ مسلمان مذہبی مراسم کے آگے کبھی بھی برطانیہ کی ہوا وہوس کے آگے سر نہیں جھکا سکتے، جامعہ ملیہ جیسی فقید المثال درسگاہ بھی اپنے وجود میں خلافت ہی کی رہین منت تو ہے، اور سب سے

بڑھکر یہ خلافت ہی نے تو اس طلسم سامری کو توڑا، آج آپ مسلمانوں کو کانگریس میں شرکت کی دعوت دے رہے ہیں، لیکن خلافت ہی تو ہے جسنے مسلمانوں میں صحیح جذبۂ حریت پیدا کیا، خلافت ہی تو ہے جو آج مدارس شبینہ، (نائٹ اسکول) اپنی حسب استطاعت قایم کر رہی ہے۔ پس بصد عجز و نیاز عرض ہے کہ ان واقعات و مشاہدات کے ہوتے ہوئے بھی خلافت کی ضرورت سے انکار کیا جا سکتا ہے، ؟ کیا مسلمانوں میں آپ صرف وطنیت پیدا کرانا چاہتے ہیں جب وطن لائق صد ستائش و مرحبا جذبہ ہے لیکن وطنیت وہ زہر ہے جس کا کوئی تریاق نہیں، تہذیب کے آذر نے جو نو بنو اصنام ترشوائے ہیں ان میں سب سے بڑا بت وطن ہے۔

جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

آپ فرماتے ہیں اگر وطنیت پیدا ہو جائے تو ہندوستان آزاد ہے، میں عرض کرتا ہوں اگر وطنیت پیدا ہو جائے، تو برطانیہ کو اس "ہوے" سے نجات ملجائے جو "پین اسلام ازم" کے نام سے اسپر مسلط ہے، اور پھر جی کھول کر وہ اپنے دندان حرص و آز صرف ہندوستان ہی پر نہیں بلکہ تمام عالم اسلامی پر تیز کرے، ترکوں نے یورپ کی استعماریت کا مقابلہ کیا، اس کی قیصریت کا مقابلہ کیا، اس کے استبداد و تشدد کا مقابلہ کیا لیکن اس کی تہذیب و تمدن سے مرعوب ہو گئے، وہ بلا ارادہ چوتھائی صدی کے بعد یورپ کے آگے اپنا سر نیاز جھکا دیں گے، یورپ کی سب سے خطرناک چیز تو یہی ہے، کہ وہ "بھس" میں چنگاری ڈالدیتا ہے اور "جمالو" بنکر تماشہ دیکھتا ہے، یہ جذبہ اگر فنا ہو گیا تو مسلمان کہاں رہے، ؟ آپ کی سمع خراشی کے خیال سے ان اشارات پر اکتفا کرتا ہوں، جو میرا ما فی الضمیر سمجھانے میں آپ کو مدد دینگے، ورنہ تفصیل سے اپنے ناچیز خیالات آپ کی خدمت میں پیش کرتا، مجھے امید ہے کہ آپ میرے ان معروضات کا جواب ضرور عنایت فرمائیں گے، خواہ نگار میں، خواہ پرائیوٹ طور سے خود مجھے۔

رئیس احمد جعفری

(نگار) آپ نے غضب کیا کہ خلوت کی ملاقاتوں کا ذکر یوں آزادی و بیباکی سے کر دیا اور پھر لطف یہ کہ آپ مجھ سے اسکی اشاعت بھی چاہتے ہیں۔

نازم بہ خواری کہ بہ زمین ہماں رسد

غالب ایک جگہ سکوت و تکلم کے عاشقانہ فلسفہ کو اس طرح بیان کرتا ہے ؎

چو لب زہرزہ نوایاں شوق نتواں شد
چو شمع خلوتیاں جانگداز باید بود

لیکن آپ نے نتواں شد کو اختیار کرنا پسند کیا اور باید بود کو ناقابل عمل سمجھکر نظرانداز کردیا۔ خیر،

گرہمین ست رضایت بہ لبم مہر خوش ست

مگر میں آپ کے خوش کرنے کے لئے اس تمہید کو زیادہ طویل نہیں بنانا چاہتا، کیونکہ جو کچھ آپ نے حد درجہ سنجیدگی و متانت کے ساتھ لکھاہے اس کے جواب میں آپ کے چھیڑنے کو تو ضرور جی چاہتاہے لیکن اس حد تک نہیں کہ الزام میرے سر آجائے اور آپ ہمیشہ کے لئے غلط فہمی میں مبتلا ہوجائیں۔

آپ نے اپنی تحریر میں تین باتوں کا مطالبہ مجھ سے کیاہے ایک یہ کہ پردہ کے متعلق عبدالماجد صاحب دریابادی کے خلاف جو خیال میں نے ظاہر کیاہے، وہ میری زبانی گفتگو (بلکہ میری پہلی تحریروں کے بھی) خلاف ہے۔ دوسرے یہ کہ فلسفۂ مذہب پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے مینے بعض ایسی باتیں لکھیں جو میری گفتگو کے منافی تھیں اور تیسرے یہ کہ خلافت کمیٹی کے تحلیل ہوجانے کی میں نے کیوں رائے دی جب کہ اس کی اہمیت مسلم ہے اور کانگرس کی شرکت کو کیوں ضروری قرار دیا جبکہ وہ مسلمانوں کے درد کی دوا نہیں اور جذبۂ وطنیت، پان اسلامزم کی طرف سے یوروپ کو مطمئن کردیگا

اب سلسلہ وار جواب ملاحظہ ہو:-

(۱) پردہ کے متعلق جو کچھ میں نے آپ سے زبانی گفتگو کی یا اس سے قبل تحریر کے ذریعہ سے اظہار خیال کیا وہ ہنوز اپنی جگہ اسی حال پر قایم ہے اور میں ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے آپ کو پردہ کا حامی نہیں بنا سکتا میرا مقصود صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ عبدالماجد صاحب دریابادی جو استدلال چہرہ کو داخل ستر نہ کرنے کے لئے پیش کررہے ہیں وہ غلط ہے اور یقیناً کلام مجید سے چہرہ کا چھپانا ثابت ہوتاہے، لیکن آپ نے اس سے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں خود بھی پردہ کا حامی ہوں۔ میں نے انھیں کے نقطۂ نظر، انھیں کے اصول استدلال سے اُن کی غلطی کو ظاہر کیا تھا۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ جب کلام مجید سے چہرہ کا چھپانا ضروری ثابت ہوتاہے تو پھر میں کیونکر پردہ کی مخالفت کرسکتا ہوں۔ اسپر میں اس سے قبل کافی بحث کرچکا ہوں۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ میں تمام معاشری و تمدنی مسائل کو وقت و زمانہ کے لحاظ سے قابل تغیر سمجھتاہوں، چنانچہ جولائی کے ملاحظات میں بھی اسکو ظاہر کرچکاہوں۔ اس لئے اگر اُس وقت کی ضرورت کے لحاظ سے منہ چھپانا ضروری تھا تو یہ لازم نہیں آتا کہ اب بھی اس پر عمل کیا جائے۔ لیکن اگر کوئی شخص عبدالماجد صاحب کی طرح اس کا قایل ہو کہ کلام مجید کے معاشری احکامات میں کبھی تبدیلی نہیں ہوسکتی، تو پھر یہ بتائے کہ ان کے پاس کیا دلیل پردہ کو اٹھا دینے کی ہوسکتی ہے۔ یہی وہ تعریض تھی جسے میں نے اگست کے ملاحظات میں عبدالماجد صاحب کے خلاف پیش کی لیکن بعض حضرات نے یہ سمجھ لیا کہ میں خود پردہ کا حامی ہوں۔

(۲) فلسفۂ مذہب کے متعلق جو رائے میں نے قایم کی وہ بھی میری اس گفتگو کی منافی نہیں ہے جو آپ کے سامنے کبھی

میں نے کی تھی۔ میرا یہ ایمان ویقین ہے کہ جس دور سے اس وقت مسلمان گزر رہے ہیں وہ اُن کے انحطاط وزوال کا انتہائی دور ہے، کیونکہ دین ودنیا دونوں کے لحاظ سے ان کی ذہنیت اس قدر ذلیل وپست ہوگئی ہے کہ اس کا علاج سوائے اس کے کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ اصول مذہب اور اعتقادات کو اپنی جگہہ رکھ کر تمام ان مسائل کو جن کا تعلق تمدن سے ہے یا جو تمدن پر موثر ہوتے ہیں بدل دیا جائے اگر بحالت موجودہ ان کی اصلاح ناممکن ہے۔ میں نے اگر ارکان مذہب، آئین مذہب اور نوامیس مذہب پر آپ کے قول کے مطابق مضحکہ اڑایا تھا تو اس سے مقصود صرف موجودہ عہد کے مسلمانوں کا آئین اور موجودہ اسلام کے نوامیس وآئین تھے کہ اب اُن میں سے کسی ایک کا بھی وہ مفہوم نہیں رہا جو واضع نے بتایا تھا۔

نماز سے مقصود صرف اُٹھنا بیٹھنا نہ تھا بلکہ ہئیت اجتماعی پیدا کرنا، رشتۂ اخوت وہمدردی کو استوار کرنا، باہم امداد وتعاون کے جذبات کو برانگیختہ کرنا تھا، لیکن آج چونکہ نماز سے یہ نتیجہ پیدا نہیں ہوتا اس لئے یقیناً وہ قابل مضحکہ چیز قرار دیجائیگی اسپر اور تمام مسائل وارکان کا قیاس کر لیجئے۔ داڑھی کے متعلق بھی چونکہ تجربہ شاہد ہے کہ باندازۂ درازی اُسکی معصیت بڑھتی جاتی ہے اس لئے یقیناً اب داڑھی رکھنا صرف صورت ہی بگاڑنا ہے۔

بہرحال میری رائے نہ صرف یہ ہے بلکہ میں تو یہ کہونگا کہ اصل چیز جسے توحید کہتے ہیں اس کے متعلق بھی مسلمانوں کا طرز عمل ایسا لغو وبہمل ہے کہ اس کا علاج اب سوائے اس کے کوئی نہیں کہ ایک مرتبہ خدا ہی کے وجود سے انکار کردیا جائے تاکہ اُس کے بعد صحیح توحید کا اعتقاد از سر نو ان میں پیدا ہو۔ یقین ہے کہ آپ نے میرے اصل مدعا کو سمجھ لیا ہوگا۔

(۳) خلافت کمیٹی سے مجھے اس لئے اختلاف نہیں کہ مسلمانوں کو اپنی کوئی جماعت ایسی نہ بنانا چاہئے جو سیاسیات مذہبی کو ہاتھ میں لے، بلکہ مدعا یہ ہے کہ جب خلافت کا وجود باقی نہیں رہا جب دنیائے اسلام اس عفریت کے اندیشہ سے پاک ہوگئی تو پھر کیوں اس کو یہ نام قایم رکھکر زندہ رکھا جاتا ہے۔ یہی میں نے پہلے بھی لکھا تھا اور اب بھی عرض کرتا ہوں۔ آپ نے جامعۂ ملیہ کے قیام کو خلافت کمیٹی کا کارنامہ بتاکر اس کے وجود کی اہمیت کو ثابت کرنا چاہا ہے، حالانکہ جامعہ ملیہ کی موجودہ مالی حالت ایک بین ثبوت خلافت کمیٹی کی نااہلی اور بیچارگی کا ہے۔ جب خلافت کمیٹی باہمہ شور وغوغا اتنی ساکھ بھی نہ پیدا کرسکی کہ ایک مدرسہ اس سے چل جاتا تو اور کیا توقعات اس سے قایم ہوسکتی ہیں۔ بہرحال یہ داستان بہت دردناک ہے اور ممکن ہے اس سلسلہ میں بعض ایسی باتیں زبان پر آجائیں۔ جن کے اظہار کا ابھی وقت نہیں آیا ہے اس لئے مجھے مجبور نہ کیجئے کہ زیادہ شرح وبسط سے کام لوں۔ اب رہا یہ امر کہ کانگرس میں شریک ہونے سے مذہبیت کمزور ہوکر طینت پیدا ہوجائے گی اور اس طرح پان اسلامزم کے خطرہ سے یورپ آزاد ہوکر اور زیادہ مضرت رسان ثابت ہوگا ——— سو معاف فرمائے اگر میں یہ کہوں کہ

درآں دیار کہ زادی ہنوز انجائی

اگر مذہبیت نام اسی تنگ نظری کا ہے جو تبلیغ وقربانی اذان اور باجہ کے مسایل میں ظاہر ہورہی ہے تو اس مذہبیت

کاختم ہوجاتاہی بہتر ہے لیکن اگر اسلام نام ہے اس وسعت نظر کا، اس آغوش لطف ومحبت کا جو تمام بنی نوع انسان کے لئے ہروقت کھلی ہوئی ہے تو پھر سب سے پہلے اس کا اثر یہی ہونا چاہئے کہ ہم میں نہ صرف وطنیت بلکہ ارضیت پیدا ہوتا کہ ہم کرۂ ارض کے تمام باشندوں کو صحیح طور پر دعوت اسلام دے سکیں۔

پان اسلامزم کے باب میں آپ کے اطمینان وسکون کو دیکھ کر مجھے بہت لطف آیا۔ یورپ کب کا آپ کے پان اسلامزم کی حقیقت کو سمجھکر مطمئن ہو بیٹھا ہے اور آپ ابھی تک یہی خواب دیکھ رہے ہیں کہ اس مصنوعی چہرہ سے طفل یورپ خائف ہے

آنچہ میگوئی ز لفظ بے حقیقت بیش نیست

شبیہ نیاز

آن یارکہ بے نظیر و بے مانند است عقل و دل وجاں بہ عشق او دربند است
در یک نظر از مقام عالی جاں را برخاک فشاندہ جاں بداں خرسند است

(سلماں ساوجی)

میرے سامنے مارچ ۱۹۲۸ء کا نگار رکھا ہوا ہے اس میں مضامین کے علاوہ جو ایک بے بہا تبرک ہے حضرت نیاز کی سحر آفرین صورت بھی ہے، جسے دیکھکر نگار کے مطالعہ کرنے والے بالخصوص اورارباب فہم وادراک بالعموم قلب میں ایک خاص کیفیت متہیج پاتے ہیں، جریدۂ نگار کی ادبی تبلیغ، اسکا محققانہ طرز انشا، اسکا دلفریب اسلوب بیان، اور سب سے بڑھکر مذہبی اصول کی کاوشیں ارباب مطالعہ پر مدیر کی بالکل مختلف ذہنی صورت پیش کرتی تھیں شغل دنگر کی ہمہ گیری، اور منصبی ذمہ داریوں کی پابندیاں نگار کے مسلسل مطالعہ سے باز رکھتی تھیں، لیکن جب کبھی موقعہ ملتا، مماثلت ذوق، و یکرنگی جذبہ واحساس کی بنا پر نگار، یا جادو نگار پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال لیتا، حضرت نیاز سے شرف نیاز کی تمنا تو ضرور تھی، لیکن فرصت کی قلت اور ایام کی نامساعدت کا گلہ کروں، یا جذبۂ لطیف کی نااستواری کا کہ آج تک محرومی رہی، نگار کے تخیلات اور اس کی علمی وادبی اصلاحات ایسی نہ تھیں کہ ناظرین نگار میں مدیر کی ذاتی ملاقات کا جذبہ نہ پیدا کردیں، خدا کا شکر کہ حضرت نیاز نے خود ہی ناظرین نگار کا یہ نصف شوق پورا کردیا۔

میں نے اس شبیہ کو دیکھنے سے قبل جناب نیاز کی بالکل مختلف شکل ذہن میں قایم کی تھی علمی خدمتیں، مطالعۂ کتب کی دیدہ ریزیاں دل وجگر پر جو اثر کرتی ہیں وہ مخفی نہیں، اس اعتبار سے جناب نیاز کو بالکل نحیف اور ضعیف الجثہ ہونا چاہیے تھا، لیکن اس کے برخلاف میں نے جب

تصویر دیکھی تو اسیطرح متاثر ہوا، جیسا چند سال قبل انگلستان کے مشہور فلسفی "ہیوم" کی شبیہ دیکھکر متاثر ہوا تھا، "ہیوم" کی شبیہ اس کی مشہور تصنیف "مبادی اخلاق" میں شائع ہوئی ہے
کیفیات عشق و محبت کے اظہار کے لئے تغزل سے استدلال زیادہ موزوں ہے، اور اسلئے مجھے اپنے جذبۂ لطیف کی ترجمانی کے لئے فارسی شعرا میں حافظ، عرفی اور خسرو کی طرف دست انتخاب بڑھانا چاہئے تھا لیکن قدرتی طور پر میرا ہاتھ حضرت سلمان ساوجی کے قلمی نسخہ کلیات پر پڑا، جو فطرت کی رہنمونی ہیں، اور زمانہ کی انقلابی رفتار سے غلطان پیچاں، لیکن اسی نفاست ظاہری اور اسی آب وتاب کے ساتھ میرے ہاتھوں لگ گیا ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ حضرت حافظ لسان الغیب تھے، تجارب انام ہے۔ انکار کی چنداں وجہ نہیں گو غیر مقلدانہ عقیدہ اس تسلیم کے منافی ہے۔ میں تو کہتا ہوں حضرت سلمان ساوجی بھی ایک باکمال بزرگ تھے، معلوم ہوتا ہے انھوں نے یہ رباعی میرے ہی لئے کہی تھی، رباعی میں مشہور تو زیادہ خیام، سعید ابن ابی الخیر، اور بابا طاہر عریاں ہیں جنکی رباعیاں مغرب کی علمی مجالس نے مختلف طریق طبع سے شائع کیں، ہاں کہنا یہ تھا کہ رباعی تو مختص ہے، اخلاقی اصلاح، عبرت آموز تلقین، اور مواعظانہ شعر انگیزیوں سے لیکن معلوم ہوتا ہے، جناب سلمان نے اس میں تغزل کا رنگ غالباً اسی "لسان الغیب" کہلانے کے صلہ میں، پیدا کیا تھا، واقعتہً "شبیہ نیاز" پہلی نظر میں ایک طوفاں خیز تاثر پیدا کر دیتی ہے، اور انسان ان سحر آفرین نگاہوں میں جن میں "اکحل العینین" کا لطف پایا جاتا ہے، ایک خاص جاذبانہ عمل پاتا ہے،

میرے سامنے اس وقت علم قیافہ کی ایک مستند کتاب ہے، ہمارے وطن کی جینی علم نواز مجلس کا یہ ایک عدیم النظیر کارنامہ ہے کہ اُس نے "جین سدھا نتہ بھاون" قایم کرکے علوم ومعارف کی بے شمار نایاب کتابیں جمع کردیں، علم قیافہ کا یہ انگریزی نسخہ اسی کتبخانہ کا فیضان ہے یہ کتاب جرمن کے مشہور "قیافہ شناس" علامہ جان کیسپر لاویٹر کی تصنیف ہے، پہلے یہ کتاب جرمنی زبان میں تھی، ایک انگلستانی عالم ٹامس ہالکرونٹ نے انگریزی زبان میں جرمنی زبان کے صحیح نسخوں سے ایک خلاصہ مرتب کیا۔ اس کے ابتدائی اوراق میں خود لاویٹر کی لکھی ہوئی ایک سند بھی ہے، جسمیں مصنف نے اقرار کیا ہے کہ یہ کتاب تلخیص صحیح، اور معتبر ہے۔

جناب نیاز کی شہر آشوب شبیہ نے لاویٹر کی کاوشوں کا بھی مجھے مرہون منت بنایا، میں نے یہ شبیہ سامنے رکھکر قیافہ کی اس کتاب کا نہایت عرق ریزی کے ساتھ مطالعہ کیا۔ علامہ

موصوف کی تحقیقات متعلقہ وجہ، جبین جبہ، عین، انف، لب وغیرہ شامل ہیں جداجدا دیکھی اس کتاب میں بڑی خوبی یہ ہے کہ تشریحات کے لئے صورتیں بھی بنائی گئی ہیں، ان صورتوں سے مجھے اپنی کاوش میں بڑی مدد ملی "شبیہ نیاز" کی طرح ایک مماثل صورت لکھکر لاویٹر نے اس کے متعلق فیاض، ارادہ کا راسخ، اور نیک دل لکھا ہے، اسی طرح کی دوسری شبیہ دیکر جس کی پیشانی جناب نیاز کی پیشانی سے بہت مماثل ہے، علامہ موصوف لکھتا ہے "ظرافت نواز"۔ گو مجھے اس آخری رائے کا پتہ نہ جناب نیاز کی شبیہ میں ملتا ہو نہ عمل میں لاویٹر نے اس کتاب میں "حسن صورت وخصائل باطنی" کے متعلق ایک باب لکھا ہے اور اس کے اندر ایک بڑی عالمانہ بحث کی ہے، گو علامہ موصوف "کراہت منظر اور عادت ناہموار" کے التزام کو تسلیم نہیں کرتے، لیکن انھوں نے نوع انسانی کے اس کلیہ کو تسلیم کر لیا کہ "حسن صوری اور حسن معنوی" متلازم ہیں، مولا جامی اُن حضرت یوسف کے متعلق، جن کے حسن بے مثال یا جمال غریب النوع کے بارہ میں آپ قرآنی استشہاد نہیں پاتے، اپنی مشہور مثنوی "یوسف زلیخا" میں جسکا انگریزی ترجمہ نظم میں گرلفیتھ نے شایع کیا، لکھتے ہیں۔

ولے خلقے زہر سو در تماشا	ہمی گفتند حاشا ثم حاشا
گر ایں روئے نکو بدکاری آید	وزیں دلدار دل آزاری آید
فرشتہ است ایں بصد پاکی سرشتہ	نیاید کار شیطان از فرشتہ
نکو روی کشد از خوئے بد پائے	چہ خوش گفت آن نکوروئے نکو رائے
کہ ہر کیں در جہاں نیکوست ویش	بے بہتر ز روئے اوست خویش

علامہ جامیؔ کا یہ نظریہ، لاویٹر کے اصول قیافہ کے بالکل مطابق ہے

اب دیکھنا یہ ہو کہ آیا جناب نیاز کی عقلی وعلمی حیرت انگیزیوں کیساتھ آپ کی صورت بھی حیرت انگیز ہو یا نہیں ایک عامی سے عامی بھی یہ اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ "شبیہ نیاز" کا یہ جدید الشیوع خاکہ اخلاقی اور نفسیاتی علوم تبت کا جولانگاہ ہو۔ بشرہ سے تقدس، متانت، نیکی نمایاں طور پر ظاہر ہے، دہن خموش اور دیدۂ حیراں میں جو دلفریبیاں ہیں، اگر کسی کو جناب نیاز سے ذاتی کشیدگی نہ ہو تو بلا تکیف بتائے نہیں رہ سکتیں یا تو اپنے محدود دائرۂ معلومات کی بنا پر کہہ سکتا ہوں، کہ ممدوح "بسے بہتر ز روئے اوست خویش" کے مصداق ہیں۔ نگار کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ استاد معنوی جناب علامہ عبدالماجد صاحب (فلسفی) ہی اور حضرت

سے کشیدگی ہے، خدا کرے یہ کشیدگی اختلافات فکر و احساس کی بنا پر ہو، ذاتی نہ ہو۔ عقائد اور
افکار میں تماثل، بعض اوقات ناممکن ہے۔ جناب نیاز کا تحقیقاتی طوفان، آپ کی پر جوش علمی
کاوشیں، آپ کا غیر جانبدارانہ طرز استقرا، کیونکر ممکن تھا کہ، فکر و عقیدہ میں تغیر اور تبدل
نہ پیدا کرتا۔ واصل ابن عطا اور حضرت حسن بصری دونوں امام جعفر صادق کے تلامیذ ارشد تھے
ایک پر یونانی فلسفہ اور علمائے اسکندریہ کے نظریات نے گہرا اثر ڈالا، "وہ مسلم رہا" اور ضرور رہا
دنیا چاہے جو کچھ کہے، لیکن اس نے یونانی علم و معرفت کے تاثر کے باوجود اسلام سے منہ نہیں
موڑا" ————— "دوسرے پر منقولات کی تحصیل، حدیث نبوی کے
شغف، اور ارباب عرفان کے جلیس و ندیم نے ایک دوسرا اثر ڈالا، ایک مذہبیت اعتزال کا پیشوا
بنا، دوسرا اہل تسنن کا مقتدیٰ۔ یوں تو تکفیری فتاوے کس کے خلاف نہیں صادر ہوئے، امام
فخر الدین رازی، جیسے علامہ اجل بھی اس تیر بلا کے ہدف ہو چکے ہیں، حال ہی میں مجھے علامہ
شیخ بہاؤ الدین احمد کی کتاب "کشکول" کا نہایت عمدہ قلمی نسخہ ملا، یہ کتاب عربی سے فارسی میں
ترجمہ ہوئی تھی، ملک العلی احمد شہید عاملی اس کے مترجم ہیں، قلمی نسخہ فارسی بارہویں صدی
کا لکھا ہوا ہے، اسمیں ایک نہایت عمدہ واقعہ حضرت ابو حنیفہ اور حضرت ابو العینا کی ملاقات
کے متعلق ہے۔ ایک دن حضرت امام اعظمؒ ابو العینا کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے، امام
موصوف نے دریافت فرمایا کہ اے ابو العینا! حدیث شریف میں ہے، کہ جب اللہ تعالیٰ بندہ
کو اندھا کر دیتا ہے تو بینائی کے بدلے کوئی دوسری چیز اسے عطا کر دیتا ہے، فرمائیے آپ کو
کیا چیز ملی، حضرت ابو العینا محدث تھے، اور جناب امام فقیہ محدثین اور فقہا کا مجادلہ
اسلامی تاریخ کا معروف ترین واقعہ ہے، ابو العینا نے جواب دیا "آنچہ بمن کرامت کردہ است
اینست کہ ترا و امثال ترا نمی بینم" جناب نیاز اور فلسفۂ نفس کے مشہور نباض (عبد الماجد صاحب)
کی مثالیں بھی یہی ہوں تو مضائقہ نہیں، ایک واصل ہے دوسرا حسن، ایک نعمان ہے، دوسرا
ابو العینا — فکر و عقیدہ کے تباین اور تخیل و احساس کے تضاد نے بہت سی ایسی صورتیں
پیدا کر دی ہیں جو اس وقت ہمارے وطن کے قابل فخر ادیبوں میں متداول ہیں، یعنی
نوک جھونک، بحث و تمحیص، رد و قدح لیکن خدا ذاتی اختلاف سے بچائے، خیر بہر کیف
میں تو "شبیہ نیاز" کے متعلق اپنے تاثرات ظاہر کرنا چاہتا تھا، لیکن سلسلۂ سخن چھڑ گیا تو دل مجروح
نے الجھن میں یہ نگار بھی دکھا دیا، خدا دونوں ارباب فکر کو ان ٹوٹے پھوٹے الفاظ سے متاثر کرے

امید ہے کہ جناب نیاز بذریعہ نگار اپنے خیالات سے آگاہ فرمائینگے

عبد المالک السیفی

(نگار) میں آپ کی اس تحریر کو شایع کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوتا اگر آپ اس سلسلہ میں بعض ایسی باتیں نہ لکھ جاتے جن کا جواب دینا ضروری ہے۔

آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ مجھ میں اور عبد الماجد صاحب دریابادی میں باہم کشیدگی ہے، حالانکہ کم از کم مجھے اپنے متعلق یہ یقین ہے کہ میں انکی ذات سے کوئی کشیدگی اپنے اندر نہیں پاتا اور نہ یہ میرا مسلک ہے۔ ممکن ہے وہ مجھ سے برہم رہے ہوں یا اب ہوگئے ہوں۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ میرے سامنے اُن کی کوئی خدمت ملک و قوم دین وعلم ایسی موجود نہیں ہے جس کی بنا پر وہ مجھ سے مطالبہ سرعجز جھکا دینے کا کریں یا میرے اوپر کوئی ایسی تعریض صرف فرمائیں جس سے یہ معلوم ہو کہ وہ اپنے کو بہت بلند چیز سمجھتے ہیں۔ علم وفضل کا جہاں تک تعلق ہے میں، وہ اور دنیا کا بڑے سے بڑا عالم فطرت کے مقابلہ میں طفل مکتب سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا اس لئے میرے نزدیک سب سے بڑا جاننے والا وہی ہے جو اپنے نہ جاننے کا اعتراف کرے اور بنابراں، اگر عبد الماجد صاحب یا کوئی اور مولوی منش یہ گمان کرے کہ وہ بڑا دانا اور صاحب بصیرت ہے تو کم از کم مجھ پر اس کا اثر نہیں ہوسکتا کیونکہ بحمد اللہ میں بھی اُنھیں کی طرح ناقص دیدۂ بینا اور نامکمل گوش شنوا رکھتا ہوں۔

پھر چونکہ اس جذبۂ تفوق کا اظہار سب سے پہلے انھیں کی طرف سے ہوا تھا اور وہ بھی اس تیور و انداز سے گویا وہ میرے مقابلہ میں فلاطون وارسطو کی حیثیت رکھتے ہیں حالانکہ اگر وہ فلاطون وارسطو ہوجائیں تو بھی انسان ہیں اور انسان کا علم ہی کیا۔ اس لئے میں نے ان کو بتا دیا کہ دیکھو "بزم میں اہل نظر بھی نہ کہیں بیٹھے ہوں"

میں جناب عبد الماجد صاحب دریابادی کو اچھا انشا پرداز اچھا نثر لکھنے والا سمجھتا ہوں میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کہ اگر وہ اپنی اس فطری ادبی اہلیت سے صحیح کام لیکر صرف ادب کی خدمت کرتے اور ادب میں بھی محض نثر کیونکہ نظم کے باب میں انکی صحت ذوق کا قائل نہیں ہوں اور سیاسیات و مذہبیات کو اپنے دماغ کا تختۂ مشق نہ بناتے جہاں الفاظ سے زیادہ قوت عمل اور حسن بیان سے زیادہ آزادی خیال کی ضرورت ہوتی ہے، تو وہ غالباً مفید تر فرد ثابت ہوتے، لیکن چونکہ ان کو لیڈر بننا تھا، رہبر و مصلح کی شاندار زندگی انکا نصب العین تھا، مولانا کہلائے جانے کی لذت ان کو بیقرار کئے ہوئے تھی، خداوندان خانقاہ کی شاہانہ معاشرت دیکھ دیکھ کر اس کے حصول کا ولولہ ان کے دل میں پیدا ہو رہا تھا اسلئے انھوں نے "مسٹر فلسفی" کی قربانی کو نہایت آسانی سے گوارا کرلیا اور چونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اس "ذبح عظیم" کی جزا بھی حد درجہ "جزیل" ہونی چاہئے اس لئے انھوں نے بیک وقت سیاست و مذہب، علم و تصوف، تاریخ وادب، سب پر قابض ہوکر

یا سے قیادت بلند کرنا چاہا اور وہ اس میں اس حد تک کامیاب بھی ہوئے کہ ادھر خلافت کمیٹی کے صدر ہوگئے جمعیۃ العلما کے ممبر بنا دئے گئے "تصوف اسلام" لکھ ڈالی "پیام امن" دنیا کو سنا دیا، "زود پشیماں" ڈراما تصنیف فرما دیا، ادبی تنقیدیں کرنے لگے، قرآن وحدیث کا حوالہ دینے میں آزاد ہوگئے، قوالی سننا شروع کیا، مزاروں پر جانے لگے اور اسی کے ساتھ ابن سعود کے بھی طرفداری کی اور ہدم مقابر کا بھی فتویٰ دیا وغیرہ وغیرہ پھر ان مختلف جہات اور متضاد سمتوں میں دوڑنے کا مقصد یہی تھا کہ وہ ہر گروہ وطبقہ میں شامل ہو جائیں۔ ہر جماعت وانجمن میں ان کی پرستش ہونے لگے، ممکن ہے کہ وہ اس مقصود میں اپنے نزدیک یا بعض کی نگاہوں میں کامیاب ہوئے ہوں، لیکن نظر حقیقت شناس سے یہ امر کبھی مخفی نہیں رہا کہ وہ کیا چیز بننے کے لئے پیدا ہوئے تھے، اور اس کو ترک کر دینے کے بعد وہ کچھ نہ رہے اور نہ کچھ بن سکے۔

میرے نزدیک انسان کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ انسان بنے اور علم ومذہب کی بھی غایت یہی ہے لیکن اگر کسی کا فضل وکمال عجب وغرور، برتری وتفوق کا جذبہ خلق کر کے دوسروں کی طرف سے جذبات تحقیر وخفت پیدا کرتا ہے تو سوائے اس کے کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ وہ شدید جہل میں مبتلا ہے، رعونت کا عذاب اس پر مسلط ہے اور ابنائے جنس کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ایک شخص کے انسان ہونے کے متعلق سب سے پہلے اس کے اخلاق کو دیکھا جائے اس کی خانگی زندگی پر غور کیا جائے، لواحق ومتعلقین، اعزہ واحباب کے ساتھ اس کے سلوک پر غور کیا جائے۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں نے عبد الماجد صاحب کا ان تمام باتوں کے لحاظ سے پورا مطالعہ کیا ہے لیکن جہاں تک مجھے موقعہ ملا ہے اس کے بنا پر یہی کہہ سکتا ہوں کہ وہ مجھ سے بلند انسان نہیں ہیں۔ اور اگر میں اپنے متعلق انکسار سے کام لوں تو زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ مجھ سے شاید کچھ ہی بہتر ہوں لیکن نہ اس قدر کہ وہ اپنے آپ کو "طبیب" سمجھیں اور مجھے "وکیل"

بہرحال میری جو رائے عبد الماجد صاحب کے متعلق ہے اس کو میں نے نہایت صراحت کے ساتھ ظاہر کر دیا کہ آئندہ آپ کو میرے اور ان کے متعلق اگر کشیدگی وبرہمی کا خیال پیدا ہو تو اس کا سررشتہ اُس جگہ نہ ڈھونڈھیں، جہاں جہل کا مفہوم علم نہیں ہے بلکہ وہاں جہاں علم کو جہل کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔

آپ نے میرے اور عبد الماجد صاحب کے درمیان امتیاز پیدا کرنے کے لئے جن اکابر علم وفن کے نام بصورت تشبیہ گنوائے ہیں، وہ آپ سب کے سب انھیں کے لئے مخصوص کیجئے۔ دراصل وحسن لغمان وابو العینا، شبلی ورازی، سے اگر مماثلت ہوگی تو جناب عبد الماجد صاحب کو مجھے تو اس حرف غلط کا بھی مرتبہ حاصل نہیں ہے جسے ان حضرات نے لکھ کر کبھی محو کر دیا ہو۔ بہرحال اس سے میرے اندر جو کیفیت پیدا ہوئی وہ اس سے زیادہ نہیں ہے کہ میرے عیوب اور زیادہ مجھ پر ظاہر ہونے لگے۔

تن کی پوشش سے بڑھی کچھ اور عریانی مری

تکفیر کے باب میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے، سو اس کے متعلق مجھ ایسے شخص کو کیا خوف ہو سکتا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ

جز سخن کفرے و ایمانے کجاست

خود سخن در کفر و ایماں می رود

اس بارہ میں آپ نے میری آزادیٔ خیال کو نگار میں ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ میرے نزدیک تو کافر اور کافر گر سب مسلمان ہیں اگر وہ انسان ہیں ورنہ غیر انسان مسلمان بھی کافر ہے۔

مکرمی و معظمی تسلیم

آپ کے حال کے پرچہ نے مجھکو جو صدمہ پہونچایا ہے وہ ناقابل تلافی ہے۔ آپ نے مولانا دریابادی کے مضمون بابتہ پردہ پر نکتہ چینی کرکے اپنے کو بھی انہی حضرات کے زمرہ میں شامل کرلیا۔ افسوس آپ کو یہ نہیں معلوم کہ آپ کے مداح جتنے اسکولوں اور کالجوں میں ملیں گے شائد اور کہیں نہ ملیں۔ قل اعوذی ملاؤں کے خلاف جو جہاد آپ نے کیا ہے وہ سب کو معلوم ہے اور ہمیشہ سے آپ کا رویہ ایسا رہا ہے کہ آپ نے مذہب میں جا و بیجا سختی کی مذمت کی ہر میری سمجھہ میں نہیں آتا کہ آپ کے گزشتہ مضامین کی ہم پیروی کریں یا اس مضمون کی جن خیالات کی آپ نے نشوونما کی اور جن پودھوں کو آپ نے لگاکر ان کی آبیاری کی کیا آپ انہی کو اب کاٹنا چاہتے ہیں۔ جن اصول کی آپ نے تبلیغ کی انہی کی اب آپ مخالفت کرتے ہیں۔ آپ کا میں اب سے نہیں بلکہ ایک مدت سے مداح ہوں جبکہ میں نویں جماعت میں تھا اور عقیدت کا یہ عالم تھا اور اب بھی ہے کہ یہ امر طے تھا کہ شاعری کیجائیگی اور اس بہانہ سے آپ سے اظہار عقیدت کیا جائیگا۔ پردہ کے خلاف ویسے تو آج کل بیسیوں ہیں مگر میں نے سب سے زیادہ اسکی مخالفت کی اور واقعہ یہ ہے کہ ملکۂ ثریا کے پردہ اٹھانے سے پیشتر سے مخالفت کر رہا ہوں اور اسی ایک مسئلہ کو حل کرنے کے لئے قرآن و فقہ و تفسیر و حدیث کی آپ کی تقلید کرکے اور آپ کے اصول کو مدنظر رکھکر باضابطہ اور بڑی محنت کے ساتھ تعلیم حاصل کی جس کا نتیجہ ایک ضخیم کتاب کی صورت میں پبلک کے سامنے پیش کرنے کا ارادہ کرکے اسکو پریس میں بھیجدیا جسکے بعد آپ کا مضمون پردہ کے خلاف نظر پڑا جس امام کی پیروی کی اور جس کی تقلید کی اور جس سے غائبانہ بیعت ایک مدت سے تھی اس سے ایک دم سے اس بیعت کو توڑ دیا۔ مگر طبیعت کا خلجان دور نہ ہوا تجدید ایمان کے لئے آپ کے گزشتہ مضون پڑھے اور تھوڑی ہی دیر میں پھر وہی پیشتر کی سی کیفیت ہوگئی۔ نہ وہی اعتقاد اور وہی پیروی

کا شوق۔ مگر پھر جو مضمون کو پڑھا تو عقل کام نہیں کرتی۔ لہذا یہ طے کیا اور دعا مانگی کہ یہ مضمون کسی دوسرے کا ہو۔ آپ میری عقیدت مندی سے بے نیاز ہیں اور میری ارادت سے مستغنی ہیں مگر براہ کرم میرے لئے کوئی نسخہ تجویز کیجئے کہ کیونکر آپ کی عقیدت مندی اور ارادت سے سبکدوشی حاصل کروں۔ اس معمہ کو حل کیجئے کہ کیونکر آپ پردہ کے مخالف ہوکر پھر موافق ہوگئے۔ اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ میں نے آپ کے خیالات کے سمجھنے میں غلطی کی تو یہ بھی میری سمجھ میں نہیں آتا ایسے موقعہ پر آپ ہماری قیادت سے سبکدوشی حاصل کررہے ہیں کہ جس کی تلافی ممکن نہیں ہے۔ ہر ذی ہوش اور سمجھدار آدمی کے لئے آپ کی رائے جمیعتہ العلما کے فتوی سے زیادہ وقعت رکھتی ہے کیونکہ یہ میرا مذہب ہے کہ جو فلسفۂ جدید سے ناواقف ہے وہ قرآن واسلام کو حشر تک نہ سمجھے گا اور لوگوں کو گمراہ کریگا جیسا کہ یہ حضرات کررہے ہیں۔ میرے لئے جمیعتہ العلما کی مخالفت ایک بے ہنگام شوغا سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی مگر آپ اگر مخالفت میں ایک سطر لکھدیں تو وہ مجھکو کہیں زیادہ ہے۔ کسی اور مولوی کے لکھنے پر میں التفات بھی نہیں کرتا اور بیسیوں مضمون جن میں مجھکو خوب دل کھول کر کوسا ہے میں نے کوڑے میں پھینک دئے اور محض یہ کہکر ٹال دیا کہ جاہل ہیں خرافات بکتے ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ جمیعتہ العلما کو مذہب سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا کہ ایک جاہل کو ہوسکتا ہے۔

میں نے جیسا کہ کہہ چکا ہوں آپ سے بیعت غائبانہ کو توڑ لیا اور پھر مجبوراً اسکی دوبارہ تجدید کرلی اور دل کو یوں اطمینان دلایا ہے کہ آئندہ کبھی آپ کا پردہ کے بارہ میں کوئی مضمون نہ دیکھونگا یعنی ان مضامین کو جو پردہ کی مخالفت میں ہیں پاہوں گے۔ چنانچہ اس خط کے لکھنے کا منشا یہ ہے کہ اس غائبانہ بیعت کی آپ سے پھر تجدید کرلی جسکو کہ توڑ چکا تھا لیکن یہ ہمیشہ کے لئے طے کرلیا کہ پردہ کے باب میں جو آپ کے خیالات اب ہوگئے ہیں ان کی کوئی خاص وجہ ہوگی جس سے ہمکو تعلق نہیں۔ لہذا آپ کا بہترین معتقد اور پیرو ہوتے ہوئے بھی پردہ کے مسئلہ کے بارہ میں آپ کی مخالفت کرونگا اور اگر آپ اپنے عقیدت مندوں کی فہرست میں سے اس بنا پر میرا نام خارج کرنا چاہئیں تو بیکار ہے کیونکہ میرا نام اس لسٹ میں ہے جسکی دوسری کاپی خود آپ کے پاس بھی نہیں ہے۔ اسی سلسلہ میں ایک مضمون ایک اخبار میں آپ ہی کے خلاف بھیج چکا ہوں۔ وہ تجدید بیعت سے پیشتر کا تھا

اور خدا کرے ڈاک میں کھو گیا ہو اور اگر شایع ہو بھی تو آپ کی نظر سے اور نیز میری نظر سے نہ گزرے

مجھکو انتظار ہے کہ دیکھوں آئندہ ماہ میں پردہ کے بارہ میں آپ کا مضمون میرے بڑھنے کا ہے یا نہیں خدا کرے آپ اس مسئلہ کا تذکرہ ہی نہ کریں۔

عظیم بیگ چغتائی بی اے (علیگڈھ)

(**نگار**) آپ نے جس خلوص و محبت کے ساتھ مجھے ملامت کی ہے، اس کا اقتضا تو یہی تھا کہ میں اس کی لذت سے بالکل خاموش لطف اُٹھاتا اور سوائے اپنے کسی دوسرے کو اس میں شریک نہ کرتا، لیکن چونکہ میرے گزشتہ ماہ کے نوٹ نے اور بھی بعض حضرات کو غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہے اس لئے میں آپ کی اس تحریر کو ان سب کی طرف سے شایع کر کے بتا دینا چاہتا ہوں کہ پردہ کے باب میں جو رائے میں ایک بار قایم کر چکا ہوں اس سے ہٹنے کی کوئی وجہ اس وقت تک میں نے نہیں پائی۔ جناب عبد الماجد صاحب دریابادی کی رائے کے خلاف میرا اظہار خیال اس بنا پر نہ تھا کہ میں پردہ کا حامی ہوں، بلکہ جناب دریابادی کی اس ذہنیت کو ظاہر کرنا تھا کہ جب اُن کو ضرورت ہوتی ہے تو وہ خود بھی کلام مجید کی تاویلیں کرنے میں کوئی دقیقہ کوشش کا اٹھا نہیں رکھتے، خواہ وہ کتنی ہی کمزور اور بودی کیوں نہ ہوں

میں اس سے قبل نہایت صفائی سے نگار کے صفحات میں لکھ چکا ہوں کہ یہ بتدر کلام مجید میں چہرہ چھپانے کا حکم ہے لیکن یہ صرف اس زمانہ اور وقت کے لئے مختص تھا اور دوامی پابندی کو ظاہر نہیں کرتا۔ میں چونکہ معاشرتی معاملات میں ضرورت کے لحاظ سے تبدیلی احکام کا قایل ہوں اس لئے باوجود اس کے کہ کلام مجید میں چہرہ چھپانے کی ہدایت کی گئی ہے، میں اپنے اس اصول کے مطابق اس کی تاویل کر سکتا ہوں، لیکن عبد الماجد صاحب تو اس باب میں مجبور ہیں اور سوائے اس کے کچھ نہیں کر سکتے کہ جب ضرورت ہو تو اسی قسم کی بیجا تاویلیں کریں۔ میرا مقصود پردہ کے متعلق گفتگو کرنا نہ تھا بلکہ صرف یہ بتانا تھا کہ

نہ از دستی ایں کو تہ آستیاں ہیں

آپ خدا کے لئے سلسلہ بیعت کو نہ توڑیئے خواہ وہ اسی صورت سے کیوں نہ ہو کہ مجھے آپ کے سامنے دست ادارت دراز کرنا پڑے

باب الاستفسار

تفکر فی القرآن

(مسٹر رؤف احمد بی اے وکیل لکھنؤ)

میں نے آپ کے نگار ماہ مئی ۲۸ء کو دیکھا اور اس میں آپ کا مضمون بہ جواب مضمون عبدالماجد صاحب دریابادی پڑھا جو متعلق وجود خضر کے تھا۔ عبدالماجد صاحب کے مضمون میں حصۂ تمہید سے آپ بہت ناراض ہوگئے اور اس کی تردید میں جو جو دلائل اور اصول بیان کئے ہیں ان کو بالکل خلاف امید پایا۔ جس طرح آپ نے ماجد صاحب کے نفس مضمون سے علیحدہ ہو کر اس کے صرف ایک حصہ سے بحث کی ہے اسی طرح میں بھی بقیہ تمام مسائل سے علیحدہ ہو کر صرف آپ کے دلائل پر انہیں کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں اور وہ اس واسطے کہ آپ نے جو اصول آزادخیالی وتنقید مسائل مذہب بیان کئے ہیں ان سے مجھکو اتفاق نہیں ہے

میں یہ تسلیم کرنے کو طیار ہوں کہ اجتہاد کا دروازہ بند نہیں ہوگیا اور یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ ہم متقدمین کے نظریہ اور ان کی تحقیقات کو نظر انداز کر سکتے ہیں، لیکن شرط یہ ہے کہ اس کے خلاف معقول اور زبردست دلائل پیش کر سکیں محض یہ کہکر اکتفا کرنا کہ وہ "دفتر بے پایاں ہے" نہ ان کے "پشتارونکی" اہمیت کو کم کرتا ہے اور نہ ان کی تردید

نیاز صاحب۔ معاف فرمائیے گا میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے جو غلو اور جوش اپنے اس مضمون میں ظاہر کیا ہے وہ صرف اس خیال سے جائز کہا جا سکتا ہے کہ آپ ایک ایسے اعتراض کا جواب دے رہے تھے جو خاص کر آپ کی ذات کے خلاف کہا گیا۔ ورنہ اگر میزان عقل میں اسکو رکھا جاوے تو نتیجہ مایوس کن ظاہر ہوگا۔ میں تسلیم کرلونگا کہ آپ سب سے بڑے مجتہد ہو سکتے ہیں اور میں یہ بھی تسلیم کرونگا کہ آپ کی "فکر وتدبر" بمقابلہ تمامی متقدمین کے بالکل جدید اور حیرت انگیز معلومات دنیا کے سامنے پیش کر سکتی ہے لیکن باایںہمہ میں یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوں کہ متقدمین کی کتابوں کا "پشتارہ" ایک دفتر بے معنی ہے اور نہ میں اتنا آزاد خیال ہوں کہ "ایک مسلمان کے نزدیک مندر کے ناقوس اور کلیسا کے گھنٹہ کو بھی ویسا ہی عزیز ہونا چاہئے جیسا کہ وہ اذان سنتا ہے"!

میں حیران ہوں کہ اس فتوے کی سند آپ کو کہاں سے ہاتھ آئی کہ "اگر ضرورت ہو تو خود (ایک مسلمان کو) ناقوس پھونکنے میں کوئی عذر نہ ہونا چاہیے"۔ غالباً آپ کلام مجید سے اس کی سند پیش کر سکینگے میری رائے میں تو یہ تعلیم بالکل وہی ہے کہ اگر ایک گال پر کوئی تمانچہ مارے تو دوسرا گال اسکے سامنے کر دینا چاہیئے جو بالکل فطرت انسانی کے خلاف عقل کے خلاف اور دنیا کے تجربہ کے خلاف ہے۔ پھر مسئلہ تو صاف ہے لیکن تعجب ہے کہ آپ جیسے محقق کی سمجھ میں کیوں نہیں آیا کہ "جب اذان و ناقوس کا مقصد بالکل ایک ہے جب ان دونوں سے مراد نمازیوں یا پجاریوں کو نماز یا پوجا کے لئے بلانا ہے تو پھر یہ نزاع و مجادلہ کیسا"۔ غرضکہ اسیطرح آپ نے بہت سے دعاوی ایسے پیش کئے ہیں جن کی نسبت میں بلاپس و پیش کہنے کو طیار ہوں کہ آپ کی "فکر و تدبر" نے قرآن پاک کے سمجھنے میں غلطی کی۔ اگر یہ دریافت کروں تو غالباً مضایقہ نہیں کہ اگر آپ کا کلیہ تسلیم کر لیا جاوے اور ہر مسلمان ناقوس بجانے کو طیار ہو جاوے اور وہ نزاع و مجادلہ جو آپ کی سمجھ میں نہیں آتا دور ہو جاوے تو پھر مذہب کیا چیز ہو گا اور پھر کونسا امتیازی ایک کو دوسرے مذہب سے علیحدہ کرے گا اور اگر ہو گا تو کیا اور اگر نہیں تو پھر قرآن پاک کی تعلیم اور دنیا کے کسی مذہب کی کتاب کو زیر بحث لانیکی کیا ضرورت، اگر تمام مذاہب صرف ایک منزل پر پہونچنے کے لئے متعدد راستہ ہیں تو پھر "اپنی منزل" کے کیا معنی۔ منزل تو عام ہے کوئی خاص نہیں

یہ صحیح ہے کہ موجودہ زمانہ میں معقول کے بغیر صرف منقول سے کام نہیں چلتا لیکن کیا آپنے یہ غور فرمایا کہ ایک ماہر فن کی رائے کو دوسرے غیر ماہر فن کی رائے پر خواہ آخر الذکر کتنی ہی زبردست "فکر و تدبر" کیوں نہ رکھتا ہو ہمیشہ ترجیح دیجاتی ہے اور عقل بھی اس کو قبول کرتی ہے کہ اگر ایک شخص نے اپنی عمر کسی ایک امر کی جستجو اور اس کی تحقیق میں صرف کی تو اسکی رائے بمقابلہ اس شخص کے جس نے محض تفریحاً جب قلم اٹھایا اپنی خداداد ذہانت کی امداد سے دس پانچ ورق کاغذ کے سیاہ کر دئے یقیناً مستحق زیادہ وزن اور اہمیت کی ہے، یہ تو آپ تسلیم کریں گے کہ دنیا کا مسلمہ مسئلہ ہے کہ کوئی قوم قائل عزت نہیں سمجھی جاتی اور نہ وہ قوم قوم کہے جانے کی مستحق سمجھی جاتی ہے اگر اس کے پاس کوئی اپنے اسلاف کے کارنامے موجود نہیں ہیں دنیا میں ہزاروں قومیں وجود میں آئیں اور نیست و نابود ہو گئیں آج سلاف کا نام تک کوئی نہیں جانتا۔ لیکن یونانیوں۔ رومیوں اور مسلمانوں کو کون بھلا سکتا ہے۔ یونانیوں کو اپنے متقدمین کے "پشتاروں پر" ناز ہے رومیوں کے "پشتارے" آج بھی دنیا کی رہبری کر رہے ہیں۔

انگریزوں کو اپنے "پشتاروں پر" فخر ہے۔ مسلمانوں کے "پشتاروں کی" آج بھی قدر شناس اور علم دوست دنیا قدر کرتی ہے۔ اگر ہم خود اُن کی تذلیل روا رکھیں تو افسوس کا مقام ہے۔ پھر اگر یہ سوال کیا جائے تو آپ معاف فرمائیں گے کہ جناب کی "فکر و تدبر" نے احادیث و قرآن پاک کے سمجھنے میں جو کچھ معلومات بہم پہونچائی۔ اس کا ذریعہ وہی دفتر بے پایاں تھا یا اس سے بے نیاز ہو کر کوئی جدید ذریعہ حاصل کیا تھا۔

میں مانتا ہوں کہ اسلام بالکل سیدھا سادھا مذہب ہے، اور قرآن ہندؤں کا وید نہیں ہے جس کا سمجھنا صرف پنڈتوں ہی کے لئے مخصوص ہو لیکن ساتھ ہی وہ قصہ الف لیلیٰ یا فسانۂ عجائب نہیں ہے جس پر ہر شخص بغیر سوچے سمجھے رائے زنی کرے (اس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ آپ جیسے محقق کو اس کا حق نہیں ہے) اگر آپ سیل کی تصانیف کو ملاحظہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اسے قابل فلسفی مصنف بھی تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن کی تعلیم ایک فلسفہ ہے۔ اور اس کے نکات دقیق ہیں۔ جو بغیر حقیقی فکر و تدبر کے حل نہیں ہو سکتے۔

آپ کے مضمون کو پڑھ کر میری رائے کم از کم یہ قائم ہوئی کہ مذاہب کا اختلاف بالکل لغو ہے اور کسی کو کوئی خاص مذہب اختیار کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص اپنے خیال و فکر کے مطابق اپنا مذہب رکھ سکتا ہے۔ اور اپنے لئے اصول وضع کر سکتا ہے۔ لیکن تھوڑی سی الجھن یہ باقی رہتی ہے کہ آپ خود شاید اس نظریہ کو تسلیم نہیں کرتے ہیں اور اسلام و نصرانیت و مشرک و منکر کے درمیان امتیاز قائم کرتے ہیں، جیسا کہ خود آپ کے مضمون سے مترشح ہوتا ہے۔ تو پھر یہ متضاد اصول کیوں "میں قطعاً عجز و انکسار پر بنائے رسم و رواج" سے کام نہیں لیتا بلکہ حقیقتاً عرض کرتا ہوں کہ میں نے عربی میں کوئی سند حاصل نہیں کی اور نہ قرآن پاک کے نکات کو سمجھنے میں "فکر و تدبر" سے آپ کے مثل وقت صرف کیا لہٰذا میں نہیں کہہ سکتا کہ صحیح "فکر و تدبر" کے دعوے دار آپ زیادہ ہو سکتے ہیں یا ماجد صاحب اور نہ یہ کہہ سکتا ہوں کہ مسلم و بخاری یا بیہقی و رازی کو آپ زیادہ آسانی سے نظر انداز کر سکتے ہیں یا ماجد صاحب لیکن میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ براہ عنایت دوبارہ ٹھنڈے دل سے ان مسائل پر غور فرما کر ہم لوگوں کو جو کم مائگی کے معترف ہیں ایک صحیح مشورہ دیجئے کہ در حقیقت قصہ کیا ہے لیکن گزارش یہ ہے کہ اس کے جواب میں غصہ سے کام نہ لیجئے گا جس طرح ماجد صاحب کے خلاف آپ نے تحریر فرمایا ہے۔

میں اس تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں۔ نگار میں آپ کے جواب کا انتظار کرونگا۔ اگر آپکو موقعہ و فرصت ہو۔

(نگار) آپکے ایراد و اعتراض یا استفسار و استصواب کو میں نے کئی بار پڑھا اور ہر مرتبہ میں نے غور کیا کہ آپ نے میرے جس مضمون کا حوالہ دیا ہے، اس میں واقعی کوئی "ذاتی" مناقشہ کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے اور کیا حقیقتاً میں ان اصول سے ہٹ گیا ہوں جن کی میں نے اس وقت تک استفسارات کا جواب دینے میں ہمیشہ پابندی کی ہے؟

قبل اس کے کہ میں بتاؤں کہ میرے اس غور کا نتیجہ کیا ہوا یہ ظاہر کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ "درک حقیقت" اور "رسائی کُنہ راز" تو خیر بڑی چیز ہے، علم و فضل کے کسی حقیر ترین شعبہ کے متعلق بھی میں علم و دقوف کا دعوےٰ نہیں کر سکتا چہ جائیکہ اس میں مہارت و عبور اور اسی طرح بالکل ایک حقیقت کی صورت میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ کسی شخص کے خلاف بغض و کینہ کی پرورش یا کسی کے طرز عمل سے متاثر ہوکر انتقام کی فکر کرنا بالکل میری فطرت کے خلاف ہے۔ اور اگر یہ صفت صفات انسانی میں محمود خیال کی جا سکتی ہے تو میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے اس کے عطا کرنے میں میرے ساتھ بہت زیادہ فیاضی سے کام لیا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جس طرح میں اپنے آپ کو "حقایق عالم" "نوامیس فطرت" اور "نکات قدرت" کے سمجھنے کا نااہل پاتا ہوں، اسی طرح یہ بھی پورا یقین رکھتا ہوں کہ اسوقت تک کوئی بھی ان کا عالم پیدا نہیں ہوا ہے اور انسانی علم کی انتہائی پرواز اس سے زیادہ نہیں کہ وہ اپنے جہل کا اعتراف کرے۔

اس لئے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ کوئی شخص میری تکذیب کرنا چاہتا ہے اس پندار کے ساتھ کہ جو کچھ اُس نے سمجھا ہے وہی صحیح ہے تو مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا اس خیال سے نہیں کہ اس نے مجھے کیوں نااہل مانا قابل، جاہل و عامی سمجھا بلکہ صرف اس بنا پر کہ وہ اپنے آپکو کیوں ماہر حقیقت سمجھتا ہے، جب کہ اس باب میں ہم اور وہ دونوں ایک ہیں۔ کسی انسان کا خواہ کتنا ہی بڑا محقق و فاضل کیوں نہ ہو ایک لمحہ کے لئے بھی یہ سمجھ لینا کہ اس کا علم صحیح ہے، میرے نزدیک اتنا بڑا شرک ہے کہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ علی الخصوص مذہب کے معاملہ میں کہ یہاں جبر و اکراہ کا کام ہی نہیں۔ میں نے قدماکے "پشتاروں" کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اب بھی اسی کا اعادہ کرتا ہوں اور میرے نزدیک اسلام نام اس بلندی نظر اس وسعت آغوش کا ہے جو ناقوس اذان، مسجد و کلیسا کی پابندی و امتیاز سے بہت زیادہ بلند چیز ہے۔

پھر میں تو یہ نہیں کہتا کہ آپ بھی اسکو تسلیم کریں، لیکن میرا مسلک یہی ہے اور میں اس باب میں کسی کا معتقد نہیں ہوں۔ مذہب اگر کوئی اختیار کرونگا تو خود سمجھ کر کسی کے سمجھانے سے نہیں، اپنی فہم کی بنا پر ابو حنیفہ یا شافعی کی تحقیق سے نہیں۔

اب رہا آپ کا یہ اعتراض کہ اگر مذہب میں اس قدر آزادی ہو تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ہر شخص اپنے فکر و خیال کے مطابق اپنا مذہب قایم کر سکتا ہے، لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ اگر ایسا ہو بھی تو کیا حرج ہے۔ آپ نے اس سلسلہ میں اس مضرت رساں پہلو کو واضح نہیں کیا ہے غالباً آپ کے پیش نظر تھا۔ یعنی یہ کہ اس صورت میں مسلمانوں کی اجتماعیت جاتی رہیگی اور شیرازۂ قومی منتشر ہو جائے گا۔ لیکن میں پوچھتا ہوں ———

کہ کیا مذہبیت اور قومیت کے شیرازہ سے انسانیت کا رابطہ زیادہ وسیع و مستحکم نہیں ہے۔ کیا وجہ ہے کہ آپ رشتۂ قوم و مذہب یا رابطۂ وطن کو ضروری سمجھتے ہیں اور اپنی نگاہ کو زیادہ وسیع کر کے اس تعلق کو کیوں نہیں پیدا کرتے جس میں تمام نوع انسان شامل ہو سکتی ہے اور جو حقیقی ذریعہ امن عام قایم کرنے کا ہے۔

میں نے جہاں تک اسلام کی تعلیم پر غور کیا ہے، اس میں کوئی تنگ نظری ایسی نہیں ہے جیسی آج کل مسلمانوں میں پائی جاتی ہے، کیونکہ اس نے عوایدو مراسم کی بیخ کنی کر کے صرف اخلاق کی تعلیم دی ہے اور بتایا ہے کہ حقیقتاً مسلمان وہی ہے جس کے اخلاق پاکیزہ ہوں۔
سب سے پہلی غلطی جو مذہب کے باب میں لوگوں سے ظاہر ہوتی ہے وہ کفر و اسلام شرک و توحید کے مفہوم کے امتیاز میں ہوتی ہے۔ اور چونکہ یہ غلطی صدیوں سے چلی آرہی ہے اسلئے اسکا دور کرنا آسان نہیں ہے تاہم چونکہ اس وقت بات آپڑی ہے اس لئے میں مجبور ہوں کہ مختصراً اس مسئلہ پر یہاں روشنی ڈالوں۔ انسان و خدا یا خالق و مخلوق کا جس حد تک یا جیسا تعلق ہے اس کو دیکھتے ہوئے کوئی شخص اس امر سے انکار نہیں کر سکتا کہ خالق یا خدا کی ذات بالکل بے نیاز ہے اور مخلوق یا انسان کی کوئی بدعنوانی، کوئی نامعقولیت، یہانتک کہ بتوں کو پوجنا بھی، اس کو کوئی مضرت نہیں پہونچا سکتا، نہ اس کی برہمی انسان کی سی برہمی ہے کہ اس کے جذبات کو ٹھیس پہونچتی ہے اور وہ خفا ہوجاتا ہے اور نہ اس کی مسرت ہماری مسرت ہے کہ کوئی امر مفید کسی سے ظاہر ہوا اور ہم اس سے خوش ہوگئے۔ چونکہ خدا کی ذات ہمارے فلسفۂ مسرت و الم سے بلند ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اس کی خوشنودی یا برہمی کا مفہوم بھی کچھ اور ہوگا۔ پھر اس مفہوم کی جب جستجو کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے جس امر کو اپنی خوشنودی سے تعبیر کیا ہے وہ حقیقتاً ہماری بہتری سے تعلق ہے اور جس امر کو وہ اپنی برہمی سے تعبیر کرتا ہے اس کا واسطہ ہماری مضرت سے ہے۔ اس لئے ظاہر ہوا کہ خدا کا منشا صرف یہ ہے کہ انسان اپنے فلاح و اصلاح کی تدابیر اختیار کرے جیسا کہ "ان اریدا الا الاصلاح" سے ثابت ہوتا ہے اور اُن مکارم اخلاق سے اپنے آپ کو آراستہ کرے جو تمام نوع انسانی کی ترقی کا باعث ہوتے ہیں۔ اب آپ اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر کفر و اسلام شرک و توحید کے مفہوم پر غور کریں گے تو آسانی سے یہ بات سمجھ میں آجائے گی، کہ اسلام و توحید نام ہے صرف "استقامۃ فی العمل" کا بلندی اخلاق کا، اخوت عامہ کا اور کفر و شرک کہتے ہیں نظم و نسق سے منحرف ہوجانے کو، ترک عمل کو، انحطاط اخلاق کو، تشتت و افتراق کو، فرقہ بندی کو تفریق جامعۂ انسانیت کو اور انسانی اجتماعیت کے خراب کرنے کو۔

کلام مجید کی یہی تعلیم ہے اور رسول چونکہ اسی مقصد کے پورا کرنے لئے آئے تھے اسی لئے اُن کو "کافۃ للناس" اور "رحمۃ للعلمین" کے لقب سے یاد کیا گیا۔

رسول نے فرقہ بندی کے خلاف اور تفریق مذاہب کے باوجود "اخوت عامہ" کے موافقت میں جو کچھ کیا یا کہا اس کا ثبوت خود کلام مجید سے ملتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

قل امنا باللہ وما انزل علینا وما انزل علی ابراھیم واسمٰعیل واسحاق ویعقوب والاسباط وما اوتی موسیٰ وعیسیٰ والنبیون من ربھم۔ لا نفرق بین احد منھم ونحن لہ مسلمون ؕ

پھر کیا نبیوں میں سب رام، کرشن، بودھ، کنفیوشس وغیرہ کو شامل نہیں کرتے، کیا ان کی نبوت سے کسی کو انکار ہو سکتا ہے "ولقد بعثنا فی کل امۃ رسولا" (ہم نے ہر قوم میں کوئی نہ کوئی نبی مبعوث کیا) ارشادِ خداوندی ہے - پھر اگر ایسا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ "ونحن له مسلمون" میں دنیا کے تمام ممالک و مذاہب کو شامل نہ کیا جائے۔

کلام پاک کے متعدد مقامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ منشاء خداوندی یہی ہے کہ ساری دنیا ایک جماعت، ایک امت ہو کر زندگی بسر کرے اور جو لوگ اپنے عمل سے اس کی مخالفت کرتے ہیں وہ حقیقتاً فطرت کی مخالفت کرتے ہیں۔

ولو شاء الله لجعلكم امة واحدة ولكن يضل من يشاء ويهدي من يشاء ولتسئلن عما كنتم تعملون ٥

یہاں "ولو شاء الله" کے معنے یہ نہیں ہیں کہ "اگر اللہ چاہتا" بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کے نزدیک پسندیدہ یہ ہے کہ تم سب کو ایک امت بنا دے لیکن وہ گمراہ کر دیتا ہے اس کو جو اپنی گمراہی چاہتا ہے - اور ہدایت دیتا ہے اس کو جو اپنی ہدایت چاہتا ہے لیکن اسے لوگو تم مطمئن نہ ہو خدا تم سے ضرور باز پرس کریگا۔ تمہارے افعال و اعمال پر اور تم سے پوچھیگا کہ کیوں تم نے ہدایت کے مقابلہ میں گمراہی کو اختیار کیا - اور کیوں تم نے اپنے عمل سے اپنی وسعت نظر سے اپنی رواداری سے اور اپنے اصول زندگی سے اس اخوت عامہ کو دنیا میں پیدا نہیں کیا جو خدا کے نزدیک محبوب ہے۔

"یضل من یشاء اور یهدی من یشاء" کے معنی بھی عام مفسرین اور مترجمین نے صحیح نہیں کئے ہیں، اس کا ترجمہ عام طور پر یہ کیا جاتا ہے کہ اللہ گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے یعنی انھوں نے "یشاء" کا فاعل اللہ کو قرار دیا ہے ۔ حالانکہ حقیقتاً "یشاء" کا فاعل "من" ہے اگر آپ یہ معنے مراد نہ لیں گے تو پھر "ولتسئلن عما کنتم تعملون" بالکل بیکار ہو جائیگا، کیونکہ جب ہدایت و گمراہی صرف خداداد بات ہوگئی تو باز پرس کیوں، اور کس سے؟

کلام پاک میں اسلام کے صحیح مفہوم کو ایک جگہ نہایت ہی پاکیزہ انداز میں بیان فرمایا ہے اور اس کی وسعت و ہمہ گیری کو ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے :-

صبغة الله، ومن احسن من الله صبغة ونحن له عابدون ٥

یعنی اے رسول لوگوں سے کہہ دو کہ ایمان و اسلام جس چیز کا نام ہے وہ تو وہی اتحاد و یکرنگی ہے جسے ہم خدائی رنگ کہتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس رنگ سے بہتر کون رنگ ہو سکتا ہے - اس لئے اسلام کی دعوت جن مختصر الفاظ میں کی گئی ہے اور جس آسانی کے ساتھ تمام افتراق و انتشار کو مٹانے کی کوشش کی گئی وہ یہ تھی کہ :-

قل يا اهل الكتاب تعالوا الى كلمة سواء بيننا وبينكم الا نعبد الا الله ولا نشرك به شيئا ولا يتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون الله فان تولوا فقولوا اشهدوا بانا مسلمون ٥

پس اسلام نام ہوا صرف اس کا کہ سوائے ذات خدا کے اور کسی کی عبادت نہ کی جائے اور نہ کسی اور شے کو اس کا مقابل سمجھا جائے - یہ تعلیم اس قدر سادہ، اس درجہ آسان اور ایسی قریب الفہم ہے کہ گمراہ سے گمراہ قوم بھی اس کی مخالفت نہیں

نہیں کر سکتی۔

ایک سوال اس جگہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ خدا کو اپنی عبادت کرانے کا کیوں اس قدر شوق ہے اور وہ شرک و کفر، جحود و انکار سے کیوں اس درجہ برہم ہوتا ہے اور میرے خیال میں اسی کے سمجھنے پر نہ صرف اسلام بلکہ تمام مذاہب کے سمجھنے کا انحصار ہے۔

یہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ خدا کی ذات اس تاثر سے بے نیاز ہے جو ایک انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور اس لئے اس کے برہمی یا خوشی کا مفہوم انسانی مضرت و منفعت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ انسان کا خواہ انفرادی حیثیت سے ہو یا اجتماعی لحاظ سے کسی ایسے امر کا مرتکب ہونا جو اخوت عامہ کو صدمہ پہونچانے والا ہو، جو اجتماعیت عالم کو برباد کرنے والا ہو، جو تمرکز انسانیت میں انحراف پیدا کرنے والا ہو جس سے اشتراک عمل تباہ ہوتا ہو اور جس سے رشتۂ تمدن اور شیرازۂ تعاون کمزور ہو جانے والا ہو، وہی شرک و کفر ہے، وہی جحود و انکار ہے، وہی بت پرستی ہے اور ہر وہ چیز ہے جس کو غیر خدا کی پرستش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، کیونکہ ایسا کرنا منشار خداوندی کے منافی ہے اور کسی کے منشار و حکم کے خلاف کرنا اُس کی اہمیت سے انکار کرنا ہے، اسی کے وجود کو نظر انداز کر دینا ہے اسکی مخالفت پر آمادہ ہونا ہے۔

اسی پر آپ اسلام و توحید کے مفہوم کا بھی قیاس کر سکتے ہیں، ورنہ ظاہر ہے کہ نہ اذان سے خدا کو فائدہ پہونچتا ہے نہ ناقوس سے کوئی نقصان، نہ مسجد سے خدا کو کوئی راحت ملتی ہے نہ کلیسا اور مندر سے کوئی تکلیف۔ اگر ایک شخص غیر مسلم (یعنی موجودہ جماعت اسلامی کا فرد نہ ہونے) کے باوجود تمام انہیں مکارم اخلاق اور محاسن فطرت سے آراستہ ہے جن کی محمدؐ نے تعلیم دی ہے تو کیا آپ اُسکو صرف اس لئے کہ وہ آپ کی جماعت میں شامل نہیں ہے، کافر و مشرک کہکر ناری اور جہنمی کہدیں گے اور دوسرا شخص جو آپ کی جماعت کا فرد ہے لیکن حد درجہ ظالم، بے رحم، مجرم اور شقی ہے، اس کو صرف اس بنا پر کہ اس کا نام بھی آپ ہی کی طرح ہے، آپ کے "۰۰۰" میں اس کا شمار ہوتا ہے، اس کو نجات و فردوس کا پروانہ دیدیں گے۔

ایک بے رحم قزاق جو قافلہ کو تباہ و برباد کر کے متعدد بے گناہ جانوں کے خون سے اپنے ہاتھ کو رنگین کر کے فارغ ہوتا ہے۔ کہ دفعتہً مغرب کی اذان ہوتی ہے، وہ فوراً اپنے ہاتھ اور دامن سے خون کے دھبے دور کر کے نماز میں مشغول ہو جاتا ہے۔ دوسرا شخص جو تمام تمام دن دھوپ میں محنت شاقہ برداشت کر کے اپنے متعلقین کے لئے حلال روزی فراہم کرتا ہے، گانوں کے بچوں بڈھوں، یتیموں، بیواؤں کی خدمت کے لئے اپنی محنت، دولت، زندگی سب کچھ وقف کئے ہوئے ہے، لیکن شام کو وہ نماز پڑھنے کے بجائے ناقوس پھونکتا ہے، مسجد میں جانے کے بجائے وہ مندر کا رُخ کرتا ہے۔

اب آپ ایک مسلمان مولوی سے ایک متعصب مدعی اسلام سے دریافت کیجئے، وہ نہایت آزادی سے بلا پس و پیش کہدیگا کہ بہرحال اس قزاق کو نجات ملتی ہے کیونکہ وہ مسلمان ہے اور اس دوسرے کو آخر کار دوزخ میں جانا ہے کیونکہ اس نے بت پرستی کی اور اسلام کو قبول نہیں کیا۔

پھر اگر اسلام نام اسی وسعت نظر و انصاف کا ہے، اگر "صراط مستقیم" اسی کو کہتے ہیں، اگر "واُمرھم بالقسط" کا یہی مفہوم ہے

اگر دین محمدی کا یہی مدعا ہے تو میں مشورہ دونگا کہ آئے آپ بھی میرے ساتھ کافر ہو جائے کیونکہ پھر تو خدا کفر ہی میں تلاش کرنے سے ملیگا۔

مسلمانوں کا یہ یقین کر لینا کہ خدا صرف انھیں کا ہے اور دوسری قوموں کو اُس نے صرف دوزخ کا ایندھن بنانے کے لئے پیدا کیا ہے ایک ایسا لغو وجاہل اعتقاد ہے جو کسی ذی فہم کے نزدیک قابل قبول نہیں ہو سکتا اور نہ اس تعلیم کے ساتھ ہم کسی کو اپنی طرف مائل کر سکتے ہیں۔ اسی لئے میں نے کہا کہ جہاں تک نفس تعلیم مذہب کا تعلق ہے مسجد و کلیسا، ناقوس و اذان میں کوئی فرق نہیں ہے، اگر دونوں جگہ مقصود خدا کی عبادت اور اصلاح اعمال ہے۔ یقیناً میں ناقوس پھونکنے کے لئے آمادہ ہوں اور ناقوس پھونکنے ہی کو اسلام سمجھونگا اگر اس سے میرے اخلاق پر کوئی اچھا اثر پڑیگا۔

آپ جب تک اس رواداری سے کام نہ لیں گے، جس وقت تک خیال میں یہ وسعت نہ پیدا ہوگی آپ کیونکر دوسروں سے توقع کر سکتے ہیں کہ وہ آپ کی جماعت میں شریک ہو جائیں گے۔ آپ تو ناقوس کی آواز سنکر لاحول پڑھنے لگیں لیکن دوسرا آپ کی اذان کو سنکر سر بسجود ہو جائے، باجہ بجانا چھوڑ دے۔ کیوں؟ آپ میں آخر وہ کون سی خصوصیت ہے جس نے آپ کو خدا کا بیٹا بنا دیا اور دوسرے کو گروہ شیطان و طاغوت میں داخل کر دیا آپ کیوں خدا کی ذات کو اپنے اندر محدود سمجھتے ہیں۔ اس کی صفت خلق و ربانیت کو اپنے لئے کیوں مخصوص جانتے تھیں، بحیثیت انسان ہونے کے ہر شخص خواہ وہ عیسائی ہو یا ہندو، جینی ہو یا بودھ معتزلہ ہو یا اشعریہ ناصبی ہو یا خارجی، شیعہ ہو یا سنی، خدا کے نزدیک ایک ہے اس کا وہی ایک مطالبہ سب سے ہے، پھر جو اسکو پورا کریگا خدا اسی کو ترقی و فلاح دیگا اور جو اس کو ترک کریگا خدا بھی اُس کو چھوڑ دیگا۔

بیشک یہ میرا ایمان ہے کہ مذہب اسلام یعنی وہ مذہب جسے محمدؐ نے پیش کیا، یقیناً بہترین ذریعہ تصفیۂ اخلاق و تزکیۂ نفس کا ہے اور اس لئے ہر انسان کا فطری فرض ہے کہ وہ اس مذہب کو اختیار کرے، لیکن میں اس کی تعلیم و اشاعت کو اس طرح پسند نہیں کرتا کہ دوسرے مذہب کو بُرا کہوں جب کہ مذہب ہونے کے لحاظ سے وہ بھی سب سچے ہیں۔

آپ اگر ایک ہندو کو تعلیم اسلام دینا چاہتے ہیں تو آپ کا فرض یہ نہ ہونا چاہئے کہ اس کے ارکان پر ناک بھوں چڑھائیں اس کی طریق عبادت پر نکتہ چینی کرنے لگیں، بلکہ طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ آپ اُس کو نفس مقصود مذہب سے آگاہ کرکے آمادہ کریں کہ وہ اپنے طریق مذہب کے ساتھ ہی ساتھ اسلام کو بھی دیکھے اور وہ خود فیصلہ کرے کہ منزل تک پہونچانے کا سب سے زیادہ آسان اور سیدھا راستہ کونسا ہے اور میری رائے میں "جادلھم بالتی ھی احسن" کا بھی یہی مفہوم ہے۔

آپ اگر اپنی حرمت چاہتے ہیں تو دوسروں کی حرمت کیجئے۔ یہ عام اصول اخلاق کا ہے۔ اس لئے اگر آپ اپنے مذہب کا وقار قایم کرنا چاہتے ہیں تو دوسرے مذاہب کی بھی عزت کیجئے۔ اسلام تلوار سے نہیں پھیلا اور نہ قوت و جبر سے کوئی مذہب اشاعت پذیر ہو سکتا ہے تلوار ایک آدمی کا نام تو بدل سکتی ہے، وضع و معاشرت میں تبدیلی پیدا کر سکتی ہے لیکن دل کو نہیں پھیر سکتی، دماغ کو مجبور نہیں کر سکتی اطمینان نفس طمانینت روح، لطف و رافت، محبت و شفقت ہی سے حاصل ہو سکتی ہے جس کے ثبوت میں اسوۂ نبوی آپ کے اور ہمارے

سب کے سامنے موجود ہے، اور یہ چیز مسلمانوں کے پاس ایسی عظیم المرتبت، ایسی جلیل القدر ہے کہ اس کے سامنے سوائے سر عجز جھکا دینے کے اور کوئی چارہ کار نہیں۔ پھر کتنی حیرت کی بات ہے کہ جو حقیقی دولت آپ کے پاس ہے اسے تو پیش نہیں کرتے، دکھاتے ہیں خزف ریزوں کو اور دنیا کو مجبور کرتے ہیں کہ انہیں کو جواہر ریزے سمجھو۔

پھر چونکہ یہ تنگ نظری نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ دنیا کے تمام مذاہب کے مقلدین میں پائی جاتی ہے اس لئے جو اعتراض میرا اہل اسلام پر ہے وہی ہندوؤں پر ہے اور وہی دوسرے مذہب والوں پر: نہ ہم میں رواداری، نہ ان میں انصاف، نہ ہم صراط مستقیم پر نہ وہ راہ راست پر، منزل سے بعید ہونے میں سب کا ایک درجہ ہے اور گمراہی میں مبتلا ہونے کے لئے سب یکساں طور پر حریص ہیں۔

یہ ہے میرا اعتقاد و یقین مذہب کے متعلق جسے میں نے صاف صاف الفاظ میں ظاہر کر دیا اور اگر متقدمین کی تعلیم اس کی منافی ہے تو میں اس کے ماننے کے لئے طیار نہیں، جس طرح میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتا کہ آپ میرے قول کو صحیح سمجھیں۔ لیکن اگر موجودہ حالت قائم رہی اور رہیگی تو یاد رکھیے کہ ایک زمانہ آئے گا جب تمام مذاہب محو ہو جائیں گے اور پھر وہ وقت تجدید اسلام و احیاء دین محمدی کا ہوگا"

ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں۔

نیاز

دوبارہ دیکھنے کی ہے ہوس نگاہوں کو!

اس نظم کا عنوان، "آرائشِ محفل" کے ایک غیر فانی فقرہ سے ماخوذ ہے، جس کی بلاغت ادا، دنیائے ذوق میں ہمیشہ یادگار رہیگی ——— "آرائشِ محفل" میں اس فقرے کی شانِ نزول یہ ہے کہ ایک مرتبہ حاتم طائی کا کسی سرسبز وادی میں گزر ہوتا ہے ——— دامن کوہسار میں، ایک دیوانۂ افکار، آوارۂ شباب، آنکھیں بند کئے، "کسی خیال" میں مست، انتہائی دلگرفتگی کے ساتھ اشکبار ہے اور زبان پر یہ نالۂ بے اختیار کہ ———
ایک بار دیکھا ہے دوبارہ دیکھنے کی ہوس ہے !!

حاتم، اس کی صدائے درد سنتا ہے اور بیتاب ہو کر پاس جاتا ہے ——— وہ اپنا افسانۂ غم دہراتا ہے اور بالآخر حاتم کی کوشش سے اپنی مراد کو پہونچ جاتا ہے ———

ہمیں یہاں صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ اس "آوارۂ نجد" کے ہمنواؤں سے دنیا اب بھی خالی نہیں ہے اور کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں سے، یہی فریادِ حزیں، گو نجتی، سنائی دے جاتی ہے ——— نظر بر ایں حالت اس فقرے کو موضوعِ شعر قرار دینا، امید ہے ہدفِ سرزنش نہیں بنایا جائیگا۔ کیونکہ اس نظم میں جو روح صرف ہوئی ہے، وہ ——— بہر کیف وہی ہے جو حاتم کے زمانے میں، عنوانِ نظم کی صورت میں بروئے کار آئی تھی۔ البتہ فرق یہ ہے کہ ——— پہلے آوارگانِ محبت کا بھٹکی ہوئی ٹھوکروں کو "حاتم و خضر" کی رہنمائی نصیب ہو جاتی تھی۔ مگر آج کل کے لذت چشیدگانِ غم کے آنسو پونچھنے کے لئے کوئی خدا کا بندہ آمادہ نہیں

اختر شیرانی

تمہیں ستاروں نے بے اختیار دیکھا ہے! شریر چاند نے بھی بار بار دیکھا ہے!
کبھی چمن میں گئی ہو تو مست پھولوں نے نگاہِ شوق سے آئینہ وار دیکھا ہے!
روپہلی چاندنی نے، رات کو کھلی چھت پر ادا سے سوتے ہوئے بار بار دیکھا ہے!
بہارِ صبح کی رنگینیوں میں کھوئے ہوئے! نسیم نے تمہیں مستانہ وار دیکھا ہے!
سنہری دھوپ کی کرنوں نے بام پر تم کو بکھیرے گیسوئے مشکیں بہار دیکھا ہے!

قریب شام تمہیں طائرانِ گلشن نے ہزار بار، سرِ لالہ زار دیکھا ہے!!

بہشتِ حسن کی ننھی کلی کے دھوکے میں! سحر نے بھی تمہیں دیوانہ وار دیکھا ہے!!

سنہرے پانی میں، چاندی سے پاؤں لٹکائے شفق نے تم کو سرِ جوئبار، دیکھا ہے!

ہمیشہ رات کو محوِ مطالعہ تمکو! نگاہِ شمع نے پروانہ وار دیکھا ہے!

کبھی، جو اٹھی ہو گیسو سنوارنے کیلئے تو آئینے نے تمہیں ہمکنار، دیکھا ہے!

گھٹا نے دامنِ کہسار میں تمہیں اکثر اسیرِ زمزمۂ آبشار، دیکھا ہے!

عروسِ برق نے اپنا نقاب الٹ کے تمہیں غریقِ مستیٔ ابرِ بہار، دیکھا ہے!

کسی خیال میں کھوئے تمہیں اکثر نگاہِ گل نے تہ شاخسار، دیکھا ہے!!

نسیم باغ نے زیب النسا سمجھ کے کبھی تمہیں بہ گلکدۂ شالامار دیکھا ہے!

غرض۔ مظاہرِ فطرت نے ہر طرح تمکو! ہزار بار، نہیں! لاکھ بار دیکھا ہے!

مگر مری نگہ شوق کو شکایت ہے! کہ اس نے تمکو فقط ایکبار دیکھا ہے!!!

دکھا دو! ایک جھلک اور ـــــ بس نگاہوں کو!!!

دوبارہ دیکھنے کی ہے ہوس نگاہوں کو!!!

اختر شیرانی

جلوۂ سحر

خاموش فضا میں، وقت سحر جذبات کا دریا جاری ہے　　اک کیف کا طوفاں امڈا ہے اک وجد کا عالم طاری ہے

وہ چاک ہوا دامان سحر وہ ظلمت شب کافور ہوئی　　عالم عالم پر نور ہوا دنیا دنیا مسرور ہوئی

وہ کرنیں نور کی نکلی ہیں خورشید کے زریں ساغر سے　　وہ بادۂ سرخ چھلکتا ہے ہر پھول کے رنگیں ساغر سے

وہ باد صبا مستانہ چلی وہ پتلی شاخیں ہلنے لگیں　　وہ پتے آگئے جنبش میں وہ نازک کلیاں کھلنے لگیں

خاموشیِ شب تحلیل ہوئی چڑیوں کی ترنم ریزی میں　　شبنم کی نظر افروزی میں پھولوں کی شمیم انگیزی میں

ہر شاخ میں رنگا رنگی ہے ہر پھول میں بوقلمونی ہے　　ہے ایک تناسب ہر شے میں ہر چیز میں اک موزونی ہے

ہے جنت گوش اک اک نغمہ ہر منظر ہے "فردوس نظر"　　پہلو میں ہو دل گھنٹوں رقصاں احساس کا ہو کچھ ذوق اگر

اسوقت عروس فطرت کی زیبائش دید کے قابل ہے　　ہر غمزہ اس کا ظالم ہے ہر عشوہ اس کا قاتل ہے

ہر سو ہے سعادت کی تابش ہر سمت ہے بارش رحمت کی　　تنویر سحر ہے ایک ضیا رخسار عروس فطرت کی

موسم نہیں خواب غفلت کا موقع نہیں سہل انگاری کا　　اٹھ اے غافل بیدار ہو اب ہے وقت یہی بیداری کا

کافر ہے وہ دل اسوقت بھی گر جس دل میں خدا کی یاد نہیں　　ملحد بھی اگر دیکھے یہ سماں سجدے میں جھکا دے اپنی جبیں

پیغام عمل پھر لائی سحر ہر دنیا اپنے کام میں ہے　　سرگرم ہے کوئی طاعت میں کوئی بادۂ و جام میں ہے

کچھ میری نہ پوچھو اے رندو اک گوشۂ باغ میں بیٹھا ہوں　　خمخانۂ فطرت میں ہر دم صہبائے مسرت پیتا ہوں

ہر سو ہیں شگفتہ لالہ و گل پر کیف ہوائے گلشن ہے
اک ہاتھ میں جام صہبا ہے اک ہاتھ میں انکا دامن ہے

سید شاہ ولی الرحمٰن ولی

جوشش بہار

جدھر نظر اُٹھائیے بہار ہی بہار ہے
ادھر بھی بدلیاں ہیں کچھ ادھر بھی بدلیاں ہیں کچھ — یہ لکھائے ابر ہیں کہ بکھر بکھر اس ہیں کچھ
جو غنچے راز داں ہیں کچھ تو خار گلستاں ہیں کچھ — جو کوئی مطمئن سا ہے تو کوئی بیقرار ہے
جدھر نظر اُٹھائیے بہار ہی بہار ہے

گرج سے بادلوں کی بجلیاں چمک چمک پڑیں — تو جنبش صبا سے ٹہنیاں لچک لچک پڑیں
نگاہ کیف جو سے مستیاں ٹپک ٹپک پڑیں — جہاں کے ذرہ ذرہ پر نکھار ہی نکھار ہے
جدھر نظر اٹھائیے بہار ہی بہار ہے

چمن کا پتہ پتہ آج گلستاں بدوش ہے — زمین کا ذرہ ذرہ وقف عیش و محو جوش ہے
ہر ایک رند میکدہ میں محو ناو نوش ہے — نہ کوئی سوگوار ہے نہ کوئی دل فگار ہے
جدھر نظر اُٹھائیے بہار ہی بہار ہے

یہ قطرے آ رہے ہیں بادلوں سے چھوٹ چھوٹ کر — یہ تارے آسماں سے گر رہے ٹوٹ ٹوٹ کر
فضا میں رنگ بھر دیا ہے کس نے کوٹ کوٹ کر — یہ منظر حسین بھی تو کتنا خوشگوار ہے!!
جدھر نظر اُٹھائیے بہار ہی بہار ہے!!

قاضی نعمان جلالی مجو

ترانۂ دل

۱

نور ہوں، نار ہوں، کہ میں گِل ہوں — تیرے پہلو میں ہوں ترا دل ہوں
قدر کر میری مشتِ خاک کہ میں — بزمِ ہستی کا میرِ محفل ہوں

۲

تو سمجھتا ہے نقشِ باطل ہوں؟ — اک نمودِ کرشمۂ گِل ہوں؟
جس کو جبریل نے کیا سجدہ — ارے کمبخت! میں وہی دل ہوں

۳

اس حقیقت کا میں بھی قائل ہوں — ایک مدت سے ساکنِ گِل ہوں
آشنائے سکوں نہیں لیکن — موجِ یم ہوں۔ حریفِ ساحل ہوں

۴

میں نہ لیلا ہوں اور نہ محمل ہوں — جوہرِ باشعور ہوں۔ دل ہوں
اے کفِ خاک! کام لے مجھ سے — میں حقیقت میں مصلحِ گِل ہوں

یٰسین حزیں

بصائر

اُڑتے سلیمان نے اک روز یہ پوچھا — کھیتوں میں تو کس واسطے دانہ نہیں کھاتا
اونے کہا ڈرتا ہوں الحضرت والا — جنت سے اسی دانے نے آدم کو نکالا
پوچھا کہ تو ویرانہ میں کیوں رہتا ہے دن رات — آبادیوں میں تجھکو بُری لگتی ہے کیا بات
بولا کہ یہ سب ایک ہیں دنیا کے مواطن — معمور یہ بھی ہوجائینگے ویرانے کسی دن
پوچھا کہ تو کیا کہتا ہے ویرانوں میں اکثر — جو کچھ ترا مفہوم ہے وہ مجھ سے بیاں کر
بولا مری تقریر میں یہ راز نہاں ہے — جو رہتا تھا کل محل نہیں وہ آج کہاں ہے
پوچھا کہ تو آبادیوں میں کیوں نہیں آتا — بولا ستم انسان کا دیکھا نہیں جاتا
پوچھا ہمیں سمجھا دے ذرا اسکو وہ کیا ہے — جو کچھ کہ نشیمن میں ترے تیری صدا ہے
بولا کہ نشیمن میں ہے یہ میرا ترنم — چلنا ہے تمہیں غافلو ہشیار رہو تم
توزادِ سفر ساتھ میں تم تا حدِ مقدور — بیفکر نہ ہو منزلِ مقصد ہے بہت دور

دیکھا فیثا غورث نے اک شخص کو — جس کی تھی پوشاک بیحد خوشنما
جب مگر کچھ گفتگو کرتا تھا وہ — تو غلط جملے بہت سے بولتا
دیکھکر یہ حال فیثا غورث نے — کان میں اس شخص کے جھک کر کہا
یا تو اپنی گفتگو کر لے درست — یا ابھی جا کر اُتار آ یہ قبا

لکھا حریف کو یہ اردشیر بہمن نے — جو مانو ہمکو تو ہم تم کو بخشدیں یوناں
اگر ہمیشہ ہمارے مطیع ہو کے رہو — تو فائدہ ہو تمہیں اور ہم کو اطمیناں
لکھا حریف نے اسکو جواب میں کہ جناب — حقیقی فائدہ سوچے اگر کہیں انساں
نہ دیکھے ملک کو غیروں کی آنکھ بھر کے کبھی — کسی طرح سے نہ پہونچائے غیر کو نقصاں
عدو کو فائدہ پہونچانے کے لئے بے خوف — خوشی کے ساتھ کرے اپنے فائدے قرباں
بجائے اسکے کہ مل جاؤں اپنے دشمن سے — میں جان دینا سمجھتا ہوں جنگ میں آساں
بجائے اسکے کہ حاکم ہوں قوم پر اپنی — زیادہ خوش ہوں میں آزاد ہو اگر یوناں

عبدالباری آسی

فراق گورکھپوری

عشق کی مایوسیوں میں سوزِ پنہاں کچھ نہیں
اس ہوا میں یہ چراغِ زیرِ داماں کچھ نہیں

کیا ہے دیکھو حسرتِ سیرِ گلستاں کچھ نہیں
کچھ نہیں اے ساکنانِ کنجِ زنداں کچھ نہیں

جینے والے جی رہی ہیں اور ہی عالم میں اب
دوستو طولِ غمِ شبہائے ہجراں کچھ نہیں

عشق کی ہے خود نمائی عشق کی آشفتگی
روئے تاباں کچھ نہیں زلفِ پریشاں کچھ نہیں

درد کے مارے ہوئے کل روتے روتے ہنس پڑے
پھر کہو گے عشق کی تاثیرِ پنہاں کچھ نہیں

آنکھ والے دیکھ لیں میرے سیہ خانے کی سیر
ماہِ تاباں کچھ نہیں مہرِ درخشاں کچھ نہیں

ایک ہو جائے نہ جبتک سرحدِ ہوش جنوں
ایک ہو کر چاکِ داماں و گریباں کچھ نہیں

یاد آ ہی جاتی ہے اکثر دلِ برباد کی
یوں تو سچ ہے چند ذراتِ پریشاں کچھ نہیں

کاش اپنے ہجر سے بیتاب ہوتے اے فراق
دوسرے کے واسطے حال پریشاں کچھ نہیں

فرخ بنارسی

پھر وہ نظر ہے سلسلہ جنبانِ اضطراب
پھر آرزو ہے دست و گریبانِ اضطراب

قایم تپش پہ دل کی نظامِ حیات ہے
یعنی ہے اضطراب ہی عنوانِ اضطراب

تڑپا گئے وہ اور محبت سے دیکھکر
ہر جنبشِ نظر میں تھا سامانِ اضطراب

وہ شوخیِ تبسمِ پنہاں وہ چشمِ ناز
اک جانِ اضطراب اک ایمانِ اضطراب

موجیں اٹھیں امید کی پھر حیات میں
پھر دل میں جوش زن ہوا طوفانِ اضطراب

تاثیرِ جذب سے کوئی خود کھنچ کے آ گیا
بھولوں گا حشر تک نہ یہ احسانِ اضطراب

بجلی تمام جسم میں پھرتی ہے کہہ نہ تی شو
چھیڑے نہ یوں بھی کوئی رگِ جانِ اضطراب

تیرا جمال رنگِ گلستانِ آرزو
تیرا خیال شمعِ شبستانِ اضطراب

فرخ کہیں نہ حسن کی ہوں بے حجابیاں
کیوں چاک کر رہے ہو گریبانِ اضطراب

معلومات و اقتباسات

بڑے بڑے معلق پل

اہل امریکہ کا شغف تعمیر کی طرف جس قدر شدت کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے اس کا ثبوت وہاں کی نہ صرف فلک پیما عمارتوں سے بلکہ اور تعمیروں سے بھی ملتا ہے جو فن انجنیری کے دلایل کمال میں شمار کی جاتی ہیں۔

اس وقت وہاں تین معلق پل خاص شہرت رکھتے ہیں، ایک کا نام بروکلن کا پل ہے یہ دنیا کا سب سے پہلا معلق پل ہے۔ (معلق پل کے معنے یہ ہیں کہ دریا کے اندر کوئی ستون قایم نہیں کیا جاتا بلکہ دونوں طرف ساحل پر ایک ایک ستون قایم کر کے پل بنایا جاتا ہے) اس کی تعمیر سنہ ۱۸۷۰ء میں شروع ہوئی اور سنہ ۱۸۸۳ء میں ختم ہوئی۔ اس پر ۳۰ لاکھ گنی صرف ہوئیں۔ اس کے بعد اسکی اصلاح و مرمت میں بھی ۱۲ لاکھ گنی صرف کی گئیں۔ یہ پل عجایب عالم میں شمار کیا جاتا ہے کیونکہ اس کے دونوں برجوں یا ستونوں کے درمیان ۱۹۵ فٹ کا فصل ہے اور پل کی لمبائی ۶۰۱۶ فٹ ہے۔ ستون کی لمبائی ۸۷۲ فٹ ہے اور چوڑائی ۸۵ فٹ۔

لیکن اب اہل امریکہ اس پل سے بھی زیادہ حیرت انگیز معلق پل طیار کر رہے ہیں، جن میں سے ایک کا نام ولیمز کا پل ہے۔ اس کی لمبائی ۷۲۰۰ فٹ اور چوڑائی ۱۱۸ فٹ ہے اس کے ستون ۳۳۵ فٹ بلند ہیں اور دونوں ستونوں کے درمیان ۱۶۰۰ فٹ کا فصل ہے۔ اس پر چار پٹریاں ٹراموے کی، دو راستے موٹروں کے لئے اور دو پیدل چلنے والوں کے لئے بنائے گئے ہیں۔ اس پل کی تعمیر میں ۲۴ لاکھ گنی صرف ہوئی ہیں۔

اس کے علاوہ ایک اور معلق پل دریائے ہڈسن پر بنایا جا رہا ہے اور جس کی تعمیر سنہ ۱۹۳۲ء میں ختم ہوگی۔ اس میں آٹھ سڑکیں موٹروں اور ٹراموے کے لئے ہونگی اور دو پیدل چلنے والوں کے لئے۔ اس کے دونوں ستونوں کے درمیان ۳۵۰۰ فٹ کا فصل ہوگا اور ستون کی بلندی ۶۵۰ فٹ ہوگی۔ اس پل کے دونوں جانب جو فولادی رسیاں پل کو سنبھالنے کے لئے ہونگی وہ چار ہونگی جنہیں سے ہر ایک کا محیط یا گولائی ۳۶ انچ ہوگی اور ہر رسی کا وزن سات ہزار ٹن ہوگا۔ ان رسیوں کی مضبوطی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ہر رسی ۲۶۴۴ باریک لڑوں سے بنائی گئی ہے جن میں سے ہر لڑ کی گولائی $\frac{۳}{۱۶}$ انچ ہے۔

یہ رسیاں دونوں جانب دو برجوں سے باندھی جائیں گی جن میں سے ہر ایک کا رقبہ ایک ایک ایکڑ ہوگا۔ اس پل میں ۶۰ لاکھ گنی کے صرف کا اندازہ کیا گیا ہے۔

ریاضیات اور مشرق قدیم

تحقیق انسانی جس قدر وسیع ہوتی جائے گی، اسی قدر مشرق کی علمی خدمتیں نمایاں ہوتی جائیں گی چنانچہ یہ امر پایۂ ثبوت کو پہونچ گیا ہے کہ تمام موجودہ تجارتی حسابات، اوزان اور پیمانوں کا تعین، ہندسی طریقہ سے زمین کی پیمائش، اور نظام ستینی (جس میں اعداد کا حساب و شمار ۶۰ سے کیا گیا ہے) اور جس کا تتبع اب بھی جاری ہے کہ گھنٹہ کی تقسیم ۶۰ منٹ میں اور منٹ کے ۶۰ سکنڈ میں، اور دائرۂ فلکی کی تقسیم ۳۶۰ درجوں میں اور ہر درجہ

کی ۶۰ دقیقہ میں اور ہر دقیقہ کے ۶۰ ثانیہ میں کی جاتی ہے) یہ سب بہت قدیم چیزیں ہیں۔ یہاں تک کہ مابین النہرین جو ٹاٹک (اینٹیں) حال ہی میں زمین سے برآمد ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام ہندسی اصول ۳۰۰۰ قبل مسیح مرتب ہو چکے تھے۔

انھیں اینٹوں کے دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک سے لیکر ۶۰ تک اعداد کا مربع، انکا مکعب اور جذر اس وقت معلوم ہو چکا تھا۔ علاوہ اس کے نسبت و تناسب، اور ہندسوں کا سلسلۂ متصلہ بھی ان کی علم میں تھا اور اشکال ہندسی مربع مستطیل، مثلث و دائرہ بھی وہ جانتے تھے۔

فلکیات میں وقت اعتدال ربیعی کی تعین انھوں نے کرلی تھی جس سے وہ اپنے سال کی ابتدا کرتے تھے اور اول مہینہ کا نام انھوں نے وہ رکھا تھا جسے اب ثور کہتے ہیں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جب آفتاب برج ثور میں جاتا تھا اس وقت سے وہ سال کی ابتدا کرتے تھے۔ انھوں نے دائرہ بروج کو بارہ حصوں میں تقسیم کرکے سیاروں کی حرکت کو بھی متعین کیا تھا۔ سال کبیسہ، دھوپ گھڑی، فصلوں کی تقسیم، نجوم و کواکب کے اوقات طلوع و غروب کی تعیین یہ سب اسی وقت ہو چکا تھا اور ایسا ہونا ناگزیر تھا کیونکہ فن جہاز رانی میں ان باتوں کے علم کی سخت ضرورت تھی یہ باتیں ۵۰۰۰ سال قبل مسیح کی ہیں۔

اب اس کے بعد ۴۲۴۱ قبل مسیح مصر میں جو کچھ ہوا اسے بھی دیکھئے کہ انھوں نے سال کو بارہ مہینوں میں اور ہر مہینہ کو ۳۰ دن میں تقسیم کیا اور باقی پانچ دنوں کا اضافہ کرکے ان کو تہوار کی صورت دی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ضبط حساب، نظام عدد اور علم رصد میں وہ کتنی دستگاہ رکھتے تھے اسی کے ساتھ فن تعمیر، مکانکی معلومات، علم مساحت عملی میں بھی اُن کی ترقی اس سے ثابت ہے کہ مسافات بعیدہ تک خطوط مستقیم کا قایم کرنا اور سطح مستوی کی تعیّن یہ سب اُن کو معلوم تھا۔ چنانچہ اہرام مصر کی تعمیر کو دیکھئے کہ اس کے زوایا اور جوانب کے تعین میں موجودہ آلات کی مدد سے بھی جو غلطی نکالی جاسکتی ہے اس کے مقدار نہ ہونے کے برابر ہے۔

اس زمانہ کے بعد معلومات یونان میں منتقل ہوئیں جہاں اصول علمی پر ان کی تدوین ہوئی اور افلاطون، ارسطو، ارخمیدس اور اقلیدس ایسے انسان پیدا ہوئے۔ جب عہد اسلام آیا تو مسلمانوں نے علوم طبیعی، ریاضیات، فلکیات کی تمام کتابیں، یونان اور ہندستہ لیکر اپنی زبان میں منتقل کیں، جب خلفاء عباسیہ کا زمانہ ہوا تو ترجمہ و تالیف کے مستقل شعبے قایم کئے گئے اور تمام علوم یونان، وہند کو اپنا کر لیا۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں کہ مسلمانوں نے صرف ترجمہ پر اکتفا کیا اور اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہیں کیا۔ کیونکہ اب تحقیقات جدیدہ سے اس خیال کی غلطی ثابت ہوتی جاتی ہے۔ چنانچہ نظریات اعداد، تہذیب ارقام تبویب موضوعات میں اُن کے اضافے اب بھی رائج ہیں۔ صفر کی ایجاد مسلمانوں کی ہے جس کو بجنسہ انگریزی میں (Cipher) کے نام سے لے لیا اور کسر عشری کی علامت فاصلہ بھی انھوں نے ہی مقرر کی علم جبر میں اس کے اصول کا وضع کرنا، علامات و اشارات کے تعین سب مسلمانوں ہی کی ایجاد ہے۔

خوارزمی ہی اول وہ شخص تھا جسنے اس علم کا نام علم الجبر والمقابلہ رکھا اور پھر یورپ نے اُس کو (Algebra) کے نام سے اپنے ہاں لے لیا۔ ریاضی کا یہ نظریہ کہ دو مکعب عددوں کا مجموعہ، عدد مکعب نہیں ہو سکتا، اہل عرب ہی کا نکالا ہوا ہے

علم مثلثات و تناسب میں ان کی خدمات نہایت بلند ہیں۔ قانون تناسب جیوب، ضوابط مثلثات کروی غیر قائمۃ الزاویہ، قاطع و نظیر کا علم، وضع جداول، سطح کروی پر اصول نقشہ کشی یہ سب مسلمانوں ہی کے ایجاد میں ہیں۔

فلکیات میں اُن کے خدمات اور زیادہ اہم ہیں خط نصف النہار سے طول درجہ کا معلوم کرنا، قیام حرکات قمر کی جدولوں کی تصحیح، زمین کی گردش کے لحاظ سے رصدگاہوں کا قایم کرنا وغیرہ وغیرہ بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کی بناء پر مسلمانوں کو یونانیوں سے تفوق حاصل ہے، کیونکہ یونانیوں کے ہاں جو کچھ تھا وہ صرف نظری تھا، مسلمانوں نے اپنے عمل و استقراء سے اُس کو مستقل علم کی صورت دیدی۔

کہکشاں سے اُس طرف

قدماء نے یہ امر دریافت کر لیا تھا کہ قبۂ فلکی میں بعض اجرام روشن بادوں کی طرح ایسے بھی ہیں جو نہ شمس و قمر ہیں اور نہ اُن کو نجوم کہہ سکتے ہیں۔ چنانچہ ابوالحسن صوفی نے جو اہل عرب میں فلکیات کا بہت بڑا ماہر تھا لکھا ہے کہ میں نے خود ان روشن بادلوں کو دیکھا جس کا نام اُس نے "لطخہ سحابیہ" رکھا اور انگریزی میں جس کو (Nebula) یا عربی کی جدید اصطلاح میں سدیم کہتے ہیں۔ جب وقت تک دوربین ایجاد نہیں ہوئی یہ اجرام دخانی یا سدیم فلکیات کا نہایت پیچیدہ معمہ بنے رہے۔ جب گلیلو نے دوربین بنا کر اس کی مدد سے کہکشاں کو دیکھا جس میں اجرام سدیمی پائے جاتے ہیں تو اُس نے کہا کہ جس کا نام کہکشاں ہے وہ حقیقتاً بیشمار ستاروں کا مجموعہ ہے جو بہت قریب قریب واقع ہونے کی وجہ سے علحدہ علحدہ نظر نہیں آتے۔ جب سترہویں صدی کے آخر میں نیوٹن نے دوربین عاکس ایجاد کی اور اس اصول پر بڑی بڑی دوربینیں بن گئیں تو اجرام سدیمی کا مطالعہ ایک مخصوص علم ہو گیا اور بہت سی وہ باتیں معلوم ہونے لگیں جو اس سے قبل غیر معلوم تھیں اور خدا معلوم کتنے سدیمی اجرام جو مختلف شکلوں کے ہیں اور مختلف حالتوں سے گزر رہے ہیں نظر آنے لگے۔

اجرام سدیمی دو قسم کے ہیں ایک وہ جو بالکل بادل کی طرح مشتعل اور ملتہب گیس (یا دھویں) کی صورت میں پائے جاتے ہیں، دوسرے وہ ہیں جو کمانی کی طرح چکردار صورت رکھتے ہیں۔ اول اول یہ خیال کیا گیا تھا کہ یہ چکردار سدیم بہت سے چھوٹے ستاروں کا ہجوم ہے جو ہمارے آفتاب کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ لیکن جب آلات رصد و تصویر و حل طیفی (یعنی مثلثی شیشہ کے ذریعہ سے انحلال نور) مکمل ہوگئے اور ان کے ذریعہ سے تحقیق کی گئی تو ثابت ہوا کہ ہر سدیم ہماری کہکشاں کی طرح ایک مستقل کائنات ہے اور اس طرح کے سدیم فضا میں ہزاروں لاکھوں پائے جاتے ہیں۔ پس سدیم اس جہت سے دو قسم کے ہیں ایک وہ جو ہماری کہکشاں میں شامل ہیں اور دوسرے وہ جو اس سے خارج ہیں

ہماری کہکشاں ایک بڑا مجموعہ ہے ستاروں کا اور گیسی سدیم کا جس میں بعض ستارے تو ایسے ہیں جو آنکھ سے نظر آجاتے ہیں، ہزاروں وہ ہیں جو دوربین کی مدد سے دیکھے جا سکتے ہیں اور لاکھوں وہ ہیں جو تصویری کی لوح پر نظر آسکتے ہیں۔

رصد سے ثابت ہوا ہے کہ کہکشاں ایک قرص ہے جس کے قطر کا طول ایک لاکھ نوری سال کا ہے اور ہمارا نظام شمسی تقریباً اس کے وسط میں واقع ہے۔

کہکشان کے قرص میں ۳۰۰۰۰ ہزار ستارے ایسے ہیں جو بہت دور دور منتشر ہیں اور چونکہ ایک کا بُعد دوسرے سے یکساں نہیں ہے اس لئے مختلف جگہ جگمگاہٹ سا نظر آتا ہے اور بعض جگہ روشن بادل کی سی کیفیت محسوس ہوتی ہے کہکشاں میں کیسی سدیم بھی ہیں جن میں سے بعض روشن ہیں اور بعض تاریک۔

وہ اجرام سدیمی جو ماورا کہکشان ہیں ان کا مطالعہ پروفیسر ہبل امریکی نے جو مشہور فلکی ہے خصوصیت کے ساتھ کیا ہے ۴۰۰ سدیمی اجرام کا حال معلوم کرچکا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ ان اجرام میں سے بعض کی خاص ہیئت وصورت نہیں ہے۔ لیکن اکثر چکردار ہیں یا بیضوی ہیں۔ یہ اجرام ۹ لاکھ نوری سال کے فاصلہ پر واقع ہیں اور ان کی رفتار ۳۰۰ کلیومیٹر فی سکنڈ ہے بعض ۶۰۰ کلیومیٹر فی سکنڈ کی رفتار سے حرکت کرتے ہیں۔

ان سدیمی اجرام میں سے ایک چکردار جرم ہمارے آفتاب سے دو ارب گنا بڑا ہے اور اس کا ایک چکر ایک کرور ستر لاکھ سال میں پورا ہوتا ہے۔

قوت و ضعف کی جنگ

بعض لوگ اصول ارتقاء پر ہنسی اڑاتے ہیں، اور انتخاب طبعی، تنازع للبقا اور بقاء اصلح کو لغو وبہمل قرار دیتے ہیں حالانکہ اگر وہ نظام عالم اور اصول فطرت پر غور کریں تو اُنھیں ان مسائل کی صداقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

تاریخ انسان اپنے ابتدا ظہور سے لیکر اس وقت تک شاہد ہے کہ جس طرح عہد وحشت میں قوی ضعیف کو ہلاک کرڈالتا تھا اسی طرح اب زمانۂ تہذیب میں بھی کمزور کا کہیں ٹھکانا نہیں ہے عالم حیوانات میں مشاہدہ کرنے سے بہت سی مثالیں اس کی نہایت دلچسپ مل سکتی ہیں۔ چنانچہ آج کی صحبت میں ہم بعض مثالیں پیش کرتے ہیں۔

ایک مچھلی ہے جس کا نام ہی مختلف زبانوں میں تیر انداز ہوگیا ہے۔ جب یہ کسی کیڑے کو ساحل کی گھاس پر دیکھ لیتی ہے تو نہایت آہستہ آہستہ جسقدر قریب ممکن ہوتا ہے پہونچ جاتی ہے، پھر اپنے منہ میں پانی بھر کے نہایت قوت کے ساتھ اسپر پانی پھینکتی ہے جس کے صدمے سے وہ کیڑا بیہوش ہوکر پانی میں گرجاتا ہے اور وہ اسے نگل لیتی ہے۔ یہ مچھلی جزائر ہند کے دریاؤں میں کثرت سے پائی جاتی ہے۔

گھڑیال شکار کرنے کے لئے گھاس پر یا پانی میں دنوں تک بے حس وحرکت پڑا رہتا ہے گویا وہ مرگیا ہے۔ اور جب شکار اس کے قریب سے اس کو بے جان سمجھکر گزرتا ہے، تو بجلی کی طرح جھپٹ کر اُس کو پکڑ لیتا ہے۔ اسی طرح ایک سانپ ہے جو درخت میں لٹکا رہتا ہے اور اس قدر سکون کے ساتھ کہ شاخ میں اور اس میں کوئی تمیز نہیں ہوسکتی جب شکار درخت کے نیچے سے گزرتا ہے تو اس کو لپیٹ لیتا ہے۔ افریقہ کے جنگلوں میں ایک قسم کی جونک ہوتی ہے جو درخت کی شاخوں میں لٹکتی رہتی ہے۔ اور جب کوئی انسان یا جانور نیچے سے گزرتا ہے تو اس کے جسم پر گرکر لپٹ جاتی ہے اور خون چوسنے لگتی ہے۔

ایک مچھلی عجیب وغریب حیلہ سے شکار کرتی ہے اس کے ناک کے پاس کا حصہ "مرغ لیس" گھاس کی طرح ہوتا ہے۔

جب اس کو شکار کرنا ہوتا ہے تو کیچڑ میں اپنے آپ کو دفن کر دیتی ہے اور صرف وہی ناک کا حصہ اوپر رکھتی ہے، گھاس پات کھانے والے کیڑے اس کو دیکھ کر دوڑتے ہیں کیونکہ وہ اُسے مرغ کیس سمجھتے ہیں، جب کیڑے قریب آجاتے ہیں تو یہ منہ کھول کر فوراً نگل جاتی ہے۔ بعض کیڑے زمین میں اس طرح سوراخ کرتے ہیں کہ چاروں طرف ریت یا مٹی احاطہ کئے رہے اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی اور کیڑا اسپر سے گزرے تو پھسل کر نیچے سوراخ میں آجائے۔

ایک جانور ہے جس کی غذا چیونٹی ہے۔ اس کی زبان بہت لمبی ہوتی ہے۔ جب اس کو غذا کی ضرورت ہوتی ہے تو اپنی زبان نکال کر پڑ جاتا ہے اور چیونٹیاں اس کا لعاب چاٹنے کے لئے جمع ہو جاتی ہیں۔ جب چیونٹیوں کی کافی تعداد زبان سے لپٹ جاتی ہے تو یہ زبان کو منھ کے اندر کر لیتا ہے اور ایک لمحہ میں ان سب کا تمعہ ختم کر دیتا ہے

سیال ستارے

انگلستان کی جمعیۃ فلکیہ کے پریسیڈنٹ پروفیسر جینیز کی رائے ہے کہ اکثر ستارے فضا میں سیال ہیں، یعنی پانی کی طرح ان میں سیلان پایا جاتا ہے۔ دیگر علماء کی رائے اسوقت تک یہی ہے کہ ستارے گیسی یا دخانی حالت میں پائے جاتے ہیں، لیکن اس پروفیسر نے یہ جدید تحقیق پیش کی ہے۔ اس کے ثبوت میں وہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ فضا میں جو اکثر دو دو ستارے ساتھ نظر آتے ہیں ان کی صورت یہ ہے کہ ایک دوسرے کے گرد طواف کر رہا ہے یا دونوں کسی اور مرکز کے گرد گھوم رہے ہیں، علماء کی رائے ہے کہ ہر جوڑواں ستارے کی اصل ایک ہی ستارہ ہے جو دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے اور اس طرح وہ دونوں حصے اپنے مرکز کے گرد گھوم رہے ہیں۔ پروفیسر مذکور کا بیان ہے کہ اگر ستارے گیسی یا دُخانی حالت میں ہوتے تو اسطرح دو حصے اُن کے نہ ہو سکتے، لیکن سیال ہونے کی حالت میں، ایسا ہو جانا بہت آسان ہے۔

معجزۂ انجنیری

سب سے زیادہ عجیب و غریب تعمیر جو ۱۹۲۷ء میں ختم ہوئی ہے۔ امریکہ کے صوبہ کولوراڈو کی ایک سرنگ ہے جو چھ میل لمبی ہے۔ اسی طرح ایک اور سرنگ ہے جو نیویارک اور نیوجرزی کے درمیان موٹروں کے لئے بنائی گئی ہے اس کا طول دو میل ہے۔

ایک اور حیرت انگیز عمارت کلیفورنیا میں بنی ہے جو دو محرابوں پر قایم ہے جن میں سے ہر ایک کی وسعت ۱۱۰۰ فٹ ہے۔ اسیطرح امریکہ میں ایک بجلی گھر بنایا گیا ہے۔ جہاں پانی کے ذریعہ سے کہربائی قوت پیدا کی جاتی ہے، اور یہ قوت ۹۰۰۰۰ گھوڑوں تک پہنچتی ہے

انسان کا عہد اولین

خیال کیا جاتا تھا کہ سب سے پہلے انسان کا ظہور وسط ایشیا میں صحرا گوبی کے اندر کسی جگہ ہوا تھا کیونکہ یہاں پانی اور گھاس کی اس وقت کثرت تھی، لیکن اب اہل فرانس و انگلستان کا دعویٰ ہے کہ سب سے پہلے انسان ان کی سرزمین میں پیدا ہوا کیونکہ وہاں بعض مقامات سے جو چقماق کا پتھر دستیاب ہوا ہے وہ اسی قسم کا ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انسان کے عہد حجری میں اس کا بڑا رفیق تھا۔ لیکن اگر اسکو صحیح مان لیا جائے تو بھی زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان عہد حجری میں وہاں پایا جاتا تھا۔ لیکن وہ زمانہ جو عہد حجری سے پہلے کا ہے اس کے متعلق انگلستان یا فرانس کیا ثبوت پیش کر سکتا ہے۔

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴　　　　بسم اللہ　　　　جلد ۱۲ شمارہ ۴

نگار

لکھنؤ سے ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے چندہ سالانہ ہندوستان میں پانچ روپیہ ہندوستان سے باہر سات روپیہ

فہرست مضامین اکتوبر ۱۹۲۷ء

مضمون	مصنف	صفحہ
ملاحظات		۲
مثنوی سحر البیان (تنقید)	جناب محمد عبدالقادر سروری بی اے	۵
حسرت آرزو (فسانہ)	جناب سید امتیاز احمد بی اے	۱۶
مثنوی اور سودا (تنقید)	جناب تمکین کاظمی	۳۰
؟ (فسانہ)	جناب حفیظ الرحمن بی اے	۴۴
علم فراست الید		۴۹
ملاح کی لڑکی (فسانہ)	جناب اعظم کریوی	۵۴
رامائن کے چھ ورق (نظم)	جناب طالب الہ آبادی	۶۱
لارڈ رپن کا عہد حکومت	ض - ا - ب، بی اے	۷۰
استفسارات		۷۵
کتب موصولہ		۸۵
منظومات:	غلام ربانی عزیز - قدیر الوری	۹۳
”	شہاب برقی	۹۴
غزلیات :-	اکبر حیدری - راز رامپوری	۹۵
”	حافظ غازیپوری - یوسف گجراتی	۹۶

بسم اللہ

نگار

اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری

جلد (۱۲)	اکتوبر ۱۹۲۷ء	شمار (۴)

ملاحظات

دارالاقبال بھوپال کے جواں بخت اور فرخندہ شیم فرمانروا نے جس فراخدلی کے ساتھ اپنی حکومت کا نظم و نسق، آئین جدید کے ماتحت ایک مجلس مقننہ کے سپرد کیا ہے، وہ تاریخ حکومت میں ہر چند کوئی نئی چیز نہیں، لیکن کم ازکم ریاستوں کے حلقہ میں نادر الوقوع ضرور ہے۔ وہ حضرات جو ریاستوں کے حالات سے باخبر ہیں ان سے یہ امر مخفی نہیں کہ ریاستوں کا نظام حکومت ایک ایسا سخت استبدادی آئین حکومت ہے جو اس عہد اشتراکیت میں بھی دور فراعنہ کی یاد کو زندہ رکھے ہوئے ہے اور یہ بھی ایک نفسیاتی صداقت (Psychological truth) ہے کہ تفوق شخصی کی لذت ایسی معمولی لذت نہیں ہے جس کو ایک شخص آسانی کے ساتھ ترک کردے اس لئے اگر بھوپال کے جدید فرمانروا کی طرف سے جبکہ عنان حکومت ہات میں لئے ہوئے انھیں ایک سال سے زیادہ زمانہ نہیں گزرا اور اس حالت میں کہ عمر کے لحاظ سے انھیں سلطنۃ ذاتی اور حکومت شخصی ہی کو پسند کرنا چاہئے دفعۃً" اس روشن خیالی کا ثبوت بہم پہونچتا ہے، تو ہم سوائے اس کے کوئی تاویل نہیں کرسکتے کہ یہ نتیجہ ہے صرف اس تربیت صحیحہ کا جو ان کو اپنی مادر محترم سابق فرمانروائے بھوپال علیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم بالقابہا (طول اللہ عمرہا) کی آغوش میں حاصل ہوئی۔ جن لوگوں نے عہد سلطانی میں زندگی بسر کی ہے اور اسی کے ساتھ نظم حمیداللہ خانی کا مطالعہ کیا ہے، وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں کہ اس انقلاب کا تخم اب سے بہت پہلے بویا جاچکا تھا اور اس "سال نمو" کی بہار اس سے قبل ہی پہچان لی گئی تھی۔ اس لئے ہمارے لئے

یہ اعلان کوئی جدید چیز پیش نہیں کرتا، بلکہ انھیں اُمیدوں کی تکمیل ہے جنھیں خود اِنھیں محترم و متبرک ہستیوں نے ہمارے اندر پیدا کر دیا تھا۔

ہز ہائنس سکندر صولت بالقابہ (کثر اللہ امثالہ و ادامہ اللہ بالعز و الاجلال) نے افتتاح مجلس کے وقت جو پیام اپنے ملک کے باشندوں کو دیا ہے وہ ایسی دانشمندانہ محبت سے لبریز ہے کہ اس پر وثوق کرکے ہم بھوپال کے لئے ایک نہایت ہی روشن عہد کی توقع قائم کرسکتے ہیں اور عالی جناب علیا حضرت نواب سلطان جہاں بیگم بالقابہا نے جن الفاظ میں اپنے خیالات کو پیش کیا ہے وہ ایک قوم کے لئے بجا طور پر قابل فخر و ناز ہو سکتے ہیں۔

علیا حضرت اپنے عہد حکومت میں بھی ہمیشہ ایک رحمدل خاتون ہی رہیں اور فرمانروا کی حیثیت سے کبھی اپنے آپ کو پیش نہیں کیا اور یہ کا نتیجہ ہو کہ ان کے جانشین فرزند نے بھی تخت حکومت پر متمکن ہوتے ہی زیادہ مستحکم و موثق انداز سے اس خلوص و خبت کو ظاہر کر دیا جو ایک نیک نفس روشن خیال، تعلیم یافتہ اور مہذب فرمانروا کو قدرتاً اپنی رعایا کے ساتھ ہونی چاہئے۔

ناظرین نگار کے لئے یہ خبر نئی نہیں ہے کیونکہ وہ اس سے قبل ملک کے اخبارات میں اس کا ذکر دیکھ چکے ہیں، لیکن چونکہ میری ادبی و علمی زندگی اور نگار کی حیات اسی آستان نکتہ نواز اور اسی بارگاہ علم پرور سے وابستہ ہے اس لئے میرے لئے ناگزیر تھا کہ میں اس عہد جدید انقلاب کے بعد سب سے پہلی اشاعت کا سرنامہ اسی خبر کو قرار دوں جو نہ صرف میرے بلکہ تمام وابستگان دامن دولت کے لئے ایک دنیائے مسرت اپنے ساتھ لائی ہے۔

تاگل و سبزہ و ریحاں زخیاباں جویند — تاکف و موجہ و گرداب بدریا بینند
تا بریں پشتہ نشاں از مہ و پرویں یابند — تا دریں رہ اثر از آدم و حوا بینند
تا ہر سال شمار دے و بہمن و رزند کہ — تا ہر ماہ طراز دی و فردا بینند

ہم بدیں ساز ہنگامۂ ہر عید سعید
شاہ جم کو کبہ را انجمن آرا بینند

لکھنؤ کا موسم ابھی تک ناخوشگوار ہے گرمی ہر چند مذبوحی حالت میں ہے لیکن رقص بسمل کی طرح ناپایدار نہیں آفتاب کا طلوع و غروب ابھی تک خط استوا سے ہٹ کر جنوب کی طرف نہیں ڈھلا اس لئے زمانہ بدستور عرقناک ہے سنتے ہیں کہ ۱۵ اکتوبر کے بعد سے یہاں نمایاں تغیر پیدا ہو جائیگا۔ لیکن ایفائے عہد کے خیال کے ساتھ جینے کی تمنا بالکل غیر شاعرانہ بات ہے، اس لئے میں کوشش کر رہا ہوں کہ عالم نامرادی ہی میں زندہ رہنا سیکھ جاؤں۔

اس اشاعت میں جناب عبد القادر سروری بی اے کا تنقیدی مضمون مثنوی سحر البیان پر ختم ہوتا ہے۔ دوسرا تنقیدی مضمون جناب تمکین کاظمی کا ہے جس میں سودا کی مثنوی نگاری سے بحث کی گئی ہے۔ فسانوں میں ہمارے عزیز دوست سید امتیاز احمد بی اے کا فسانہ حشر آرزو ایک ایسی استعداد کا پتہ دیتا ہے جس کو مستقبل میں ہمارے اردو لٹریچر کے فن افسانہ نگاری میں بیش بہا اضافہ ثابت ہونا چاہیے۔ بلند فسانہ نگاری کی روح نفسیاتی تحلیل ہے اور اس کے بہت سے کامیاب ٹکڑے اس فسانہ میں پائے جاتے ہیں جناب اعظم کریوی کا افسانہ "ملاح کی لڑکی" جو غالباً بنگالی زبان سے لیا گیا ہے اس قدر مکمل فسانہ ہے جو داد سے مستغنی ہے۔ حفیظ الرحمن صاحب کے افسانہ کا پلاٹ بہت دلچسپ ہے گو نیا نہیں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میاں عطاء الرحمن صاحب کا ایک افسانہ اسی قسم کے پلاٹ کا اب سے کئی سال قبل ہمایوں میں شائع ہو چکا ہے۔

جناب طالب الہ آبادی نے رامائن کے بعض مناظر کو اردو نظم میں پیش کیا ہے۔ امید ہے کہ یہ کوشش مستحسن نگاہ سے دیکھی جائے گی۔

اس مرتبہ استفسار نے بھی کافی جگہ لیلی اور کتب موصولہ کے لئے بھی زاید صفحات دینے پڑے کیونکہ بہت عرصہ سے تبصرہ کو ملتوی کرتا چلا آرہا تھا اس لئے معلومات کا حصہ نہ دے سکا۔

خیال تھا کہ اس مہینے سے ایک مستقل باب "نگار کی ڈاک" قائم کر کے بعض دلچسپ خطوط کا اقتباس اور ان کا جواب درج کروں لیکن اس کے لئے بھی جگہ نہ نکل سکی

منظومات میں غلام ربانی صاحب کی نظم اور غزلیات میں جناب اکبر حیدری کے افکار مخصوص طور پر قابل مطالعہ ہیں۔ جناب راز رامپوری اور جناب حافظ غازیپوری کے بھی بعض بعض شعر خوب ہیں۔

کلام مومن پر اس وقت تک کوئی قابل ذکر تنقید موصول نہیں ہوئی۔ بہرحال دسمبر تک انتظار کروںگا۔ اس کے لئے پچاس روپیہ کا حقیر ہدیہ مخصوص کر دیا گیا ہے

نیاز فتحپوری

سحر البیان

(گزشتہ سے پیوستہ)

(۵)

نجم النسا کی جملہ کرداری خوبیوں میں سے ایک اہم خوبی اس کی قوت گفتار ہے اس کے مکالمے اردو زبان کی بول چال کے چند ایسے دلکش نمونے ہیں کہ اردو ادب ان پر بجا طور پر ناز کر سکتا ہے۔ "سحر البیان میں سوائے میر حسن کے فطری بیانات کے اگر کوئی چیز دلچسپ ہو سکتی ہے تو وہ نجم النسا اور بدر منیر کے مکالمے ہیں جن کی وجہ سے تمام قصے کا پایہ بلند ہو گیا ہے۔ اگر قصے میں سے صرف نجم النسا ہی کے مکالمے نکال لئے جائیں تو یہ امر شبہ سے خالی نہیں رہ سکتا کہ "سحر البیان" کو پھر بھی وہی قبولیت حاصل رہیگی دراصل "اگر توجہ سے انجام پائے تو مکالمہ ناول کا بہترین عنصر ہوگا"..... عمدہ مکالمہ ناول کے گوشہ گوشہ کو روشن کر دیتا ہے۔ اس سے نہ صرف ترتیب یافتہ لوگ حظ اُٹھاتے ہیں، بلکہ جہلا بھی حسب مقدور لطف اندوز ہو سکتے ہیں[۱]" اس معیار پر ذیل کے مکالمے کس قدر ٹھیک اترتے ہیں۔

(۱) بے نظیر اور بدر منیر کی پہلی ملاقات کے وقت، بدر منیر کو شرماتی اور کھنچتی دیکھکر وہ اپنی زبان کے جوہر دکھلاتی ہے۔

مجھے چوچلے تو خوش آتے نہیں ہو　　ترے ناز بے جا یہ بھاتے نہیں
مری طرف ٹک دیکھ تو ہائے ہائے　　مثل ہے کہ من بھائے منڈیا ہلائے

. . . .
ملک اک حظ اٹھا زندگانی کا تو تو　　مزا دیکھ اپنی جوانی کا تو تو

مے عیش کا جام اب نوش کر　　غم دین و دنیا فراموش کر
. . . .

کہاں یہ جوانی، کہاں یہ اُبھار　　یہ جوبن کا عالم رہے یادگار
سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں　　گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں
کہاں چاہ رہ لے ہیں یوسف عزیز　　اری باولی! چاہ میں کر تمیز

(۲) ذیل کے اشعار بھی ملاحظہ ہوں۔

لگی کہنے ہنس ہنس کے وہ ماہوش　　ہوئی تھی اسے دیکھ میں ہی تو غش!
تمہیں نے تو جھڑکا تھا مجھ پر گلاب　　بھلا میری خاطر بلا لو شتاب

یہ شعر اس موقع پر نجم النسا کی زبان سے ادا ہوئے ہیں جب وہ بدر منیر کو شہزادے سے ملنے پر مجبور کر رہی ہے اور بدر منیر خود اسی پر بے نظیر سے محبت کرنے کا الزام لگاتی ہے

(۳) نجم النسا کے مجبور کرنے سے، شہزادی بے نظیر کے پہلو میں بیٹھ تو گئی۔ لیکن حیا نے اسکو تکلم سے باز رکھا۔ نجم شہزادی کو سمجھاتی ہے تو یہ نہیں کہتی کہ مہمان کی خاطر زبان کھول، بلکہ :-

لب لعل شیریں کو ٹک کھول تو　　ذرا میری خاطر سے ہنس بول تو

---

[۱] "دنیائے افسانہ" ص ۹

(۴) بے نظیر کی فراق کی حالت میں، شہزادی کی سوگواری ملاحظہ ہو۔ بدر منیر کہتی ہے "اے نجم النسا! خدا جانے اس شخص پر کیا ہوا!" کہ اس کا آنا جانا دفعتاً رک گیا ہے۔ نجم النسا جواب دیتی ہے۔

...... بی تمکو سودا ہے کچھ؟ وہ معشوق ہے اسکو پروا ہی کچھ؟ خدا جانے کس شغل میں لگ گیا مری چڑھ ہے اتنا ہی ہونا خدا

وہ رہ رہ کے تم کو دلاتا ہے چاہ عبث آپ کو مت کرو تم تباہ

اس کے بعد وہ شعر آتا ہے جسمیں خاص و عام سب کے لئے یکساں نصیحت موجود ہے

کہ جو کوئی اس سے رک جائیے جھکے آپ سے وہ تو جھک جائیے

(۵) بے نظیر کی جدائی کی مدت کے ساتھ اسکا قلق بھی بڑھتا جاتا ہے حتیٰ کہ ننگ و ناموس کا خیال بھی محو ہونے لگا

یہ احوال دیکھ اس کا دخت وزیر لگی جا کے کہنے کہ بدر منیر

کدھر دل گیا تیرا اے بیوقوف؟ تو وہ ہے کہ سب کے تئیں دے وقوف

مسافر سے کرتا ہے کوئی بھی پیت مثل ہے کہ جوگی ہوئے کس کے میت

ملا دل کو آخر کرے ہیں جدا! اری چار دن کے ہیں یہ آشنا

سنو بھائی اپنے پہ جو کوئی مرے تو دل چلے اپنا بھی صدقے کرے

تو پھر چاہیے اس کی پروا نہ ہو اگر آپ پر کوئی شیدا نہ ہو

.... تمھاری اسے چاہ ہوتی اگر تو اب تک وہ تم کو نہ آتا نظر؟

پانچویں شعر میں "کوئی" کا روزمرہ کے مطابق استعمال، آخری شعر کا استفہامیہ انداز اور ہر ایک کا اسلوب بیان صرف باکمال اہل زبانوں سے ادا ہو سکتا ہے۔ سب سے زیادہ ملاحظہ کے قابل نجم النسا کی نصیحت میں عمومیت ہے۔ نصیحت براہ راست ہمیشہ بارگوش ہوجاتی ہے لیکن نجم النسا کی عام طرز ادا نے اسکو سعدی کا "حنظل ...... از دست خوش خو بنا دیا ہے

(٦) میر حسن کو فطری مناظر کے بیان کرنے میں یدطولیٰ حاصل ہے لیکن "سحر البیان" کا وہ سمان میر حسن کا شہ پارہ ہے جو نجم النسا اور فیروز شاہ کی پہلی ملاقات کے وقت کا کھینچا گیا ہے اسمیں شک نہیں کہ اس منظر کی روح رواں نجم النسا ہی ہے تاہم اس مناظر کی کامیابی کے دو اجزا ہیں۔ ایک تو میر حسن کے خارجی بیانات دوسرے نجم النسا کے افعال اور مکالمہ یہاں ہمارا تعلق صرف نجم النسا کے مکالمے سے ہے میر حسن نے جو ماحول "جوگن" کا پیدا کیا ہے اور جو بذات خود دلچسپ ہے، وہ جوگن کی دلچسپ گفتگو کی وجہ سے روشن معلوم ہونے لگتا ہے۔ میر حسن نے چند الفاظ میں خیالات کی ایک کائنات پیدا کر دی ہے خیال کیجئے کہ ایک سہانا دشت ہے جسمیں چودھویں رات کی ہلکی ہلکی چاندنی درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر عجیب گنگا جمنی سمان پیدا کر رہی ہے۔ شفاف ریت پر ایک مرگ چھالا بچھا ہوا ہے جس پر اس منظر کو روشن کرنے والی ایک "زہرہ جبین" دو زانو بیٹھی ہوئی ہے۔ بین دست نازک میں ہے اور اپنے میٹھے بولوں سے ہوا میں ایک خوشگوار تموج پیدا کر رہی۔

وہ سنسان جنگل وہ نور قمر وہ براق سا ہر طرف دشت و در

وہ اجلا سا میدان چمکتی سی ریت اگا نور سے چاند تاروں کا کھیت

.... درختوں کے سایہ سے مہ کا ظہور

گرے جیسے چھلنی سے چھن چھن کے نور

ایسے عالم میں فیروز شاہ اجنون کے بادشاہ کا بیٹا وارد ہوتا ہے۔ جوگن کی تیز نظر اس کی مبہوت آنکھوں کے راستے سے اس کے دل تک جا پہنچتی ہے

وہ سمجھی کہ دل اس کا آیا ادہر کہ دل بھی تو رکھتا ہے دل کی خبر

کیا اس منظر کی نظر فریبی ایسی نہ تھی کہ فیروز جوگن کی تیروں کا شکار ہو جاتا؟ وہ دریافت کرتا ہے "جوگی جی، آدیس ہے" بڑا تپہ ایسا کہو، کیا جوگ لیا واسطے کس کے تجتے یہ جوگ" کدہر سے تم آئے کدہر جاؤ گے" دیا اپنی ہمیں بھی فرماؤ گے "

جوگن اسکی حالت سے واقف ہو چکی ہے۔ اسی لئے اس سرد مہری کے ساتھ جواب دیتی ہے

کہا ہنسکے جوگن نے، ہر بولہر جہاں سے تو آیا چلا جا ادھر
کہا تب پری زادنے واہ جی! بہت گرم ہیں آپ اللہ جی
نہ رو کھی ہو اتنی بھلا جاؤں گا ذرا بین سنکر چلا جاؤں گا
کہا ہوتے سوتو نہ سے اپنے کہو فقیروں کو چھیڑو نہ بیٹھے رہو

اس قیل وقال کے ختم ہوتے ہی فیروز شاہ جوگن کو تخت پر بٹھا لیتا ہے اور۔ زمین سے اڑا آسمان کے تئیں وہ کہتا کہا کی نہیں رسے نہیں

(۷) نجم النسا پرستاں میں فیروز شاہ کے باپ جنوں کے بادشاہ کی مہمان ہے۔ تمام لوگ اس کے کمال موسیقی پر حیران ہیں۔ خود فیروز کا باپ ہزار منتوں سے اسکی خوشامد کرتا ہے کہ جوگن اپنے کمال سے مسرور کرے لیکن جوگن کی بیرخی ابتک جاری ہے۔ جوگن کی یہ بیرخی نہایت بر معنی ہے۔ وہ اس حربے سے دو کام لے رہی ہے۔ ایک طرف تو شہزادے بے نظیر کے معاملے میں فیروز سے کام لینے کا خیال اسکے دل میں جاگزین ہے۔ جسکی وجہ سے فیروز کو باور کرانا چاہتی ہے کہ اس کا قابو میں آنا سہل نہیں ہے۔ دوسری طرف وہ اپنے آپ میں اصلی فقیروں کی خصوصیت اور خوبیاں دکھانا چاہتی ہے۔ فیروز کا باپ اس کی بڑی عزت کرکے درخواست کرتا ہے۔

کہا ہم ہیں مشتاق کچھ گائیے سماں بین کا ہمکو دکھلائیے
کہا کچھ بجانا نہیں اپنا کام ہر اک طرح لینا ہمیں ہر کا نام

اوپر کے جواب میں لفظی اور معنوی خوبیاں ملاحظہ کے قابل ہیں۔ اپنے مخاطب کو وہ خبردار کر رہی ہے کہ اس کو پیشہ ور گائن نہ تصور کر لیا جائے بلکہ گانا بھی اس کی ایک عبادت ہے :-

ہے بیزار فرمائشوں سے یہ فقیر وے کیا کریں اب ہوئے ہیں فقیر

بادشاہ معذرت کرتا ہے کہ جوگی صاحب آپ ہمارے اسیر کیوں ہونے لگے، اسیر تو ہم ہیں۔ یہ تو آپ کی عنایت ہے کہ آپ چاہیں تو اپنے کمال سے ہم کو خوش کریں ورنہ جسمیں راضی ہو تم سو کریں"

کہا اس طرح سے جو فرماؤ گے تو ہاں بندگی ہی میں کچھ پاؤ گے

جوگن کے کمال پر بادشاہ مفتون ہو جاتا ہے۔ اور جوگن کی منت کرتا ہے کہ یہ گھر آپ ہی کا ہے اور ہم آپ کے غلام ہیں۔

کہا اس نے مطلب نہیں کچھ ہمیں تمھارا مبارک رہے گھر تمہیں
کہاں ہم کہاں تم ہوا یہ جو ساتھ یہ بھی بات سب آب و دانہ کیساتھ

جب فیروز شاہ کے صبر کا پیمانہ چھلکنے کے قریب ہو گیا تو وہ جوگن کے قدموں پر گر پڑتا ہے نجم النسا کو بھی منزل مقصود سامنے نظر آنے لگی تاہم وہ عجب انداز سے فیروز کا حال دل دریافت کرتی ہے۔

گر ااس طرح سے قدم پر جو وہ ٭ تو کہنے لگی مسکرا اسکو وہ ٭ کہ ہے آج کیا یہ خلاف قیاس گر اا تنا تو ہو کے کیوں بے حواس
کسی نے ترا دل ستایا کہیں دیا جی کو تیرے لبھایا کوئی ؟ مرے بیٹھنے سے اذیت ہوئی ٭ کہ بھائیوں کی مصیبت ہوئی ٭
فقیروں سے اتنا نہ ہو تو خفا چلے ہم' بھلا' جا ترا ہو بھلا اذیت مگر ہم سے پاتا ہے تو کہ اب پاؤں پڑ پڑ اٹھاتا ہے تو

اس واقعہ میں اتنی ہی ظرافت موجود ہے جتنی مرزا غالب کے اس "ستم ظریف" معشوق میں ہے جو اپنے عاشق کی اس درخواست پر کہ بزم ناز اغیار سے خالی ہونی چاہیے۔ خود عاشق کو بزم سے اُٹھا دیتا ہے۔ صرف اس تغیر کے ساتھ کہ میرحسن کے پاس کا یہ واقعہ غالب کے واقعہ کا عکس ہے۔ غالب کا معشوق اپنے عاشق کو بزم سے اٹھا دیتا ہے اور نجم النسا معشوق ہو کر خود عاشق کی بزم ناز سے اُٹھ جاتی ہے۔

نجم النسا کے کردار کی یہ خصوصیت ان خوبیوں میں سے ایک ہے جو اس کے کردار کو ایک نمایاں انفرادی حیثیت عطا کر رہی ہے۔ میرحسن نے کردار نگاری کے اس راز کو سمجھ لیا تھا کہ اشخاص قصہ میں کسی کو ممتاز اور زندہ کس طرح کرنا چاہیے[۹]۔ فیروز جب حال دل کہہ چکتا ہے۔ تو نجم النسا اس کے جواب میں جو کچھ کہتی ہے اس کا انداز اور طرز ادا کی بیباختگی اور آخری حصے میں احتمال کا اشتمال ملاحظہ ہو۔

لگی ہنس کے کہنے کہ اک طور سے جو میری کہانی سنے غور سے مطالب اگر میرے بر لائے تو تو شاید مراد اپنی بھی پائے تو

(۹) کسی کامل فن قصہ نگار کے قصے کے "دو چار صفحوں کے پڑھنے سے بخوبی روشن ہو جائیگا کہ اس کی کردار کشی میں کیا راز پوشیدہ ہے۔ وہ کسی شخص قصہ کا تعارف چند الفاظ میں قاری سے کرا کر، خود خاموش بیٹھ جاتا ہے باقی اپنے واقعات بیان کرنے اور قاری کو مانوس بنا لینے کا کام خود شخص قصہ پر چھوڑ دیتا ہے .... ناول نگار کا مہتم بالشان کمال یہ ہے کہ بیان کے بغیر بھی متکلم کے تیور اور حرکات کو قاری پر واضح کر دے"[۱۰]

فیروز شاہ بے نظیر کو کنوئیں سے نکال کر لاتا ہے اور جوگن کو اس کے پاس پہونچاتا ہے۔ یہاں پر نجم النسا کا طرز عمل اس کے کردار کی ایک خوبی کی وضاحت کرتا ہے جسکی طرف میرحسن نے "ستارہ سی" اور "قیامت شریر" کے الفاظ کے ذریعہ ایک اجمالی اشارہ تعارف کی تقریب میں کر دیا تھا۔ یہ نجم النسا کی ظرافت نہیں بلکہ اس کی "ستم ظریفانہ" سرشت کا ایک منظر ہے۔ اس خاص موقع پر جو اعلیٰ قسم کی ظرافت کا نمونہ اور اردو زبان کا ایک شہ پارہ ہے میرحسن کا قلم ایک لفظ بھی نجم النسا کے طرز عمل کی توضیح کے متعلق نہیں لکھتا۔ بلکہ خود اس کے قول فعل سے یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ درحقیقت کردار نگاری کا یہ بڑا کمال ہے۔

.... لے آیا وہ جوگن کو وان ساتھ ساتھ .... دکھایا اُسے اور کہا کر تو غور ٭
جسے ڈھونڈتی تھی، سو یہ ہے وہی؟ کہا، ہاں ری ہاں یہ وہی ہے وہی یہ کہہ اور اس تخت کے پاس آ کہا اے پریزاد! تو اٹھ ذرا
کہ اس تخت کے گرد اک دم پھروں بلائیں میں دل کھول کر اس کی لوں کہا اس نے ہنسکر بھلا دیکھ تو تو اس بات پر میرے صدقہ نہ ہو

[۹] ملاحظہ ہو "دیباچہ افسانہ" صفحہ ۔۔۔ سطر ۔۔۔ ۱۱
[۱۰] ملاحظہ ہو "دیباچہ افسانہ" صفحہ ۸۵-۸۶

کہا اس نے تب اپنی جوتی دکھا　　　　اے دیو تو کیوں دیوانہ ہوا!

(۱۰) اپنی مہم سے کامیاب واپس ہونے کے بعد نجم النسا بدر منیر شہزادہ کے آنے کی خوشخبری سناتی ہے۔ بدر منیر کو بمصداق 'عشق است و ہزار بدگمانی' نجم النسا کے کہنے کا یقین نہیں آتا اُسنے ؎ "تعجب سے پوچھا کہ سچ مچ ہے یہ؟　　　　دیا چھیڑنے کو مرے کچھ ہے یہ؟"

نجم النسا نے جواب میں گفتار کے جو پھول بکھیرے ہیں، وہ اردو روزمرہ اور طرز تکلم کے بہترین نمونے اور ادبیات کا خوشنما زیور ہیں ؎

کہا مجھکو سوگند ہے اس جان کی　　　　غلط کہنے والی میں قربان کی

پھر فطرت کی ایک حقیقت کا اظہار کرتی ہے کہ

نشاط و خوشی کی خبر یک بیک　　　　نہیں منہ پہ کہہ بیٹھتے بے دھڑک

"مکالمے کی عمدگی کے جانچنے کا پہلا معیار یہ ہے کہ وہ قصہ میں اس قدر پیوست ہو جائے کہ اس کا جزو معلوم ہونے لگے اور اس سے در حقیقت پلاٹ کے ارتقا یا اشخاص قصہ کے کردار کی توضیح میں مدد ملتی ہو"[۱]

"سحر البیان" کے مکالمے جس خوبی کے ساتھ قصے میں گھل مل گئے ہیں، اس کا ایک عمدہ نمونہ خود کردار زیر بحث ہے اسکی گفتگو کہیں بھی بے موقع اور طویل یا خارج بحث نہیں ہوتی۔ اوپر کی مثالوں کے علاوہ بھی کسی اور مقام سے اس کا امتحان کیا جا سکتا ہے۔ نجم النسا کی قوت گفتار اور خوبی گفتار کے ضمن میں ایک اور اضافہ اس امر کا کر لیا جائے کہ اس کی تقریر کے ضمن میں بعض ضرب الامثال اور حقایق مسلّمہ (Commonplaces) بھی مترشح ہوتے رہتے ہیں، مثلاً یہ شعر ملاحظہ ہو۔ "سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں　　　　گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں"

دوسرا معیار مکالمے کی جانچ کا یہ ہے کہ وہ کہاں تک زبان کے اصول اور قواعد اور سب سے زیادہ روزمرہ اور محاورے کے مطابق ہے۔ میر حسن (اور ان کے اجداد اور اخلاف) کی ٹکسالی زبان اور فصاحت اور بلاغت کے متعلق بہت کچھ کہا گیا ہے اس لئے یہاں اور کچھ کہنا تحصیل حاصل ہے اردو زبان اس خاندان کی بڑی منت کش ہے۔ وہ حسن اور انیس کے کلام سے اپنی سند لیتی ہے۔ اگر میر حسن کی زبان پر قدرت کا اندازہ کرنا ہو تو اس کے لئے بدر منیر یا نجم النسا کے مکالمات کا مطالعہ نہایت مفید ہوگا۔

(۶)

نجم النسا کی کرداری خصوصیت کی طرف ایک اجمالی اشارہ میر حسن نے سب سے پہلے موقع پر اس وقت کیا ہے جبکہ وہ قاری سے اس کا تعارف کراتے ہیں۔

"تھی ہمراہ ایک اس کے دخت وزیر　　　　نہایت حسین اور قیامت شریر"

"زبس تھی ستارہ سی وہ دلربا　　　　اسے لوگ کہتے تھے نجم النسا"

حسن کا ہونا تو ہر ایسے شخص میں بے حد ضروری ہے جس سے ایک قصہ نگار اور خصوصاً مشرقی قصہ نگار اپنی مرضی کے مطابق کام لینا اور جس کو قصے میں نمایاں حیثیت عطا کرنا چاہتا ہے یا قاری کی توجہ اسکی طرف وہ منعطف کرانا چاہتا ہے اسی لئے "سحر البیان" جیسے معرکۃ الآرا قصے میں ایک اہم شخص قصہ کا "نہایت حسین ہونا کوئی تعجب خیز یا قابل قدر بات نہیں لیکن اگر نجم النسا کی نوعیت کے کردار میں قیامت کی شرارت اور ستارہ پن نہ ہوتا، تو اس کی

---

[۱] ملاحظہ ہو "دنیائے افسانہ" ص۹

کامیابی میں ہم کو شبہ ہو سکتا تھا۔

"ستارہ سی" ہونے سے مراد ہم اس کی چلبلی طبیعت لے سکتے ہیں جسکے لئے انگریزی میں بھی ایک موزون لفظ (mercurial) ہے نجم النسا کی شرارتوں اور شوخیوں نے جسم قصہ میں زندگی کی لہریں پیدا کر دی ہیں اور یہ قصے کے وہی مقامات ہیں جو زیادہ نمایاں اور دلچسپ ہیں افسانہ گوئی اور فسانہ نگاری کی پیدائش کی تاریخی وجہ انسان کا حیرت انگیز واقعات میں دلچسپی لینا ہے۔ اور فلسفیانہ وجہ مسرت طلبی۔ قصے میں نشاط انگیزی اسوقت تک پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اسمیں کچھ شوخی اور شرارت موجود نہ ہو۔ اسی لئے "سحر البیان" میں بھی ایک کردار کو شوخی اور شرارت کی کمند قاری کی توجہ کو شکار کرنے کے لئے عطا ہوئی ہے۔ یہی چیز ہے جو نجم النسا کے کردار کو "سحر البیان" کے دوسرے اشخاص سے زیادہ دلچسپ بنا رہی ہے۔ ذیل کی مثالوں سے نجم النسا کی اس کرداری خوبی کی وضاحت ہو سکیگی۔

(۱) بدر منیر کے شہزادہ کو مبہوت چھوڑ کر مکان میں چھپ جانے پر نجم النسا کا شرارت آمیز غصہ ملاحظہ فرمائیے

مثل ہے کہ من بھائے منڈیا ہلائے　　　مری طرف ٹک دیکھ تو ہائے ہائے
ترے ناز بیجا یہ بھاتے نہیں　　　مجھے چوچلے تو خوش آتے نہیں

(۲) نجم النسا، شہزادی کو بے نظیر سے ملاقات کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ شہزادی بے نظیر کی چاہ کا الزام اسی کے سر پر رکھنا چاہتی ہے اور کہتی ہے کہ میں سمجھی کہ تیرا دل ادھر گیا ہے۔ تو مجھپر دھر کر بھانے کیوں کرتی ہے؟ نجم النسا دندان شکن جواب دیتی ہے۔

بھلا میری خاطر بلا لو شتاب!　　　تمھیں نے تو چھڑکا تھا مجھپر گلاب
ہوئی تھی اسے دیکھ میں ہی تو غش!　　　لگی کہنے ہنس ہنس کے وہ ماہوش

(۳) شرارت اور ظرافت بسا اوقات ایک ہی گہوارے میں پرورش پاتے ہیں۔ اس کا مطالعہ ذیل کی مثال سے کیجئے۔

پیالے کو پھر جلد اس نے بھرا　　　گلابی کو لا اس کے آگے دھرا
ہوئی دل میں اپنے وہ نجم النسا　　　انھوں کے رکے بیٹھنے سے خفا
لب لعل شیریں کو ٹک کھول تو　　　ذرا میری خاطر سے ہنس بول تو
یہ پیالہ تو اُس بت کے منہ سے لگا　　　کہا شاہزادی کو بیٹھی ہے کیا؟

کسی شخص سے یہ کہنا کہ "میری خاطر سے فلان کام کر لو" ایک عام بات ہے۔ لیکن جس موقع پر نجم النسا نے یہ کہا ہے اس کے بیحد شوخ ہونے کی دلیل ہے شہزادہ کے پہلو میں بدر منیر بیٹھی ہے لیکن شرم مانع تکلم ہے۔ اور خاموشی دیکھنے والوں پر شاق گزر رہی ہے۔

(۴) نجم النسا کا تعلق فیروز شاہ کے ساتھ شروع سے آخر تک معشوقانہ شوخیوں کا ایک مجموعہ ہی ہے اوپر کہیں نجم النسا کی "ستم ظریفی" کی طرف اشارہ کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ اسکی شوخیاں عموماً ستم ظریفی کے پیرایہ میں ظاہر ہوئی ہیں۔ فیروز شاہ کے شہزادہ کو لانے اور نجم النسا کی شرارت کا اوپر ذکر آ چکا ہے گر گم گشتہ کے دوبارہ ملنے پر وہ اس کے صدقہ ہونا چاہتی ہے۔ موقع کی اہمیت کا لحاظ کرتے ہوئے یہ کام ایک بیساختہ انداز میں پورا ہونا چاہئے تھا لیکن نجم النسا کی شوخ طبیعت نے اس کام کو بھی دلچسپی پیدا کئے بغیر ختم ہونے نہ دیا۔ چنانچہ وہ تخت سے فیروز کو اتارنا چاہتی ہے۔ صرف اس لئے کہ کہیں وہ اس غلط فہمی میں نہ پڑ جائے کہ نجم میری خدمات کیوجہ سے میرے صدقے ہو رہی ہے اس موقع سے مکمل ظریفانہ سمان اسوقت تک پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ جب تک کہ فیروز شاہ بھی اسی سے فائدہ نہ اٹھاتا۔ چنانچہ یہی ہوا کہ بے زبان فیروز شاہ نے اول اور آخر مرتبہ زبان کھولی اور نجم کی

شرارتوں کا انتقام لینا چاہا۔ کہا اس نے ہنسکر بھلا دیکھ تو تو اس بات پر میرے صدقے ہو" لیکن نجم نے بھی اچھی طرح خبر لی اور اس کے دانت خوب کھٹے کئے۔ کہا اس نے تب اپنی جوتی دکھا ارے تو تو کیوں دیوانہ ہوا؟ "تنگ آمد بجنگ آمد" غریب فیروز مجبوراً تخت کو اپنے وجود سے خالی کر دیتا ہے۔

(۷)

شوخی اور شرارت کے صفات سے متصف ہونے کے علاوہ، نجم النسا ذہانت اور عقل کے زیور سے بھی آراستہ ہے۔ شوخ اور چلبلی طبیعت سے وہ شخص کماحقہ فائدہ اٹھا سکتا ہے جو ذہین بھی ہو اور جسکی عقل ہر واقعہ سے ایک ظریفانہ حالت پیدا کرنے کے رازوں سے واقف ہو۔ نجم النسا کے متعلق یہ امر نہایت اطمینان کیساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے ایک سے زیادہ موقعوں پر اپنی غیر معمولی ذہانت حکمت عملی اور عقلمندی کا کافی ثبوت دیا ہے

(۱) سب سے پہلا موقع جہاں ہمکو نجم النسا کی عقلمندی کے امتحان کا اتفاق ہوتا ہے وہ بدر منیر اور بے نظیر کی پہلی ملاقات ہے حسین بدر منیر کی شرم کا اضطراری جذبہ اسکی شہزادے سے ملنے کی تمنا پر غالب آ جاتا ہے اور وہ پردے کے اندر چھپ جاتی ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ نجم النسا سے کم عقل کا آدمی بھی بدر منیر کی چاہ کا قیاس کر سکتا ہے لیکن نجم النسا اپنے قیاس پر جس طرح عمل پیرا ہوتی ہے وہ اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ وہ شہزادی کو وہ صرف صاف کہدیتی ہے کہ تجھکو اپنے عاشق کو نیم بسمل چھوڑ کر اس طرح سے خاموش نہ بیٹھ جانا چاہئے بلکہ ایک نہایت طول طویل تقریر میں اسکو منزل عشق کی راہ و رسم بھی سکھاتی ہے۔ نجم النسا کی اس طولانی تقریر کو ہم یہاں نقل کرنا اس لئے بے ضرورت سمجھتے ہیں کہ پہلے انھیں اشعار کا اسکی قوت تکلم کے ضمن میں اندراج ہو چکا ہے تاہم یہاں اس امر کا اعادہ کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ نجم النسا کی محولہ تقریر میں بعض ایسے خیالات کا بھی اظہار ہو گیا ہے، جو کائناتی صداقت" (Universal truth) سے پُر ہیں۔ مثلاً

سدا عیش دوران دکھاتا نہیں گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں
سبھی یوں تو دنیا کے ہیں کاروبار ولے حاصل عمر ہے وصل یار
خوشا وہ زمانہ کہ دو اک جگہ کریں یکدگر جلوہ مہر و مہ .. وغیرہ انھیں میں بعض اشعار ایسے بھی ہیں جو دو سو سال سے زیادہ عرصہ سے اردو دانوں کی تقریروں یا تحریروں میں استعمال ہوتے آ رہے ہیں۔

(۲) ایک دوسرے موقع پر بھی جبکہ بدر منیر کی شرم اسکو بناؤ سنگار کرنے سے روک رہی تھی نجم النسا اس کے دلی رجحانات کو تاڑ لیتی ہے اور ایک اجنبیت کے ساتھ اس طرح کہ بدر منیر کے دل میں کس قسم کا خیال نہ گزرے، نہایت سنجیدگی کے ساتھ اسکو باتوں میں الجھا کر کہتی ہے کہ میری بڑی خواہش ہے کہ آج تجھکو سنگار کرتے دیکھوں اور تیرے حسن کی بہار کے مزے لوٹوں نہ پہلے تو شہزادی بدر منیر کچھ بگڑ سی گئی لیکن یہ تصنع آخر کار نجم النسا کی اطاعت میں بدل گیا۔

(۳) تیسرا موقع وہ ہے جبکہ شہزادی ابھی بے نظیر سے کھلی نہ تھی اور نہ اس کی شرم اسکو کھلنے دیتی اگر نجم النسا کی عقل خداداد اسکو یہ ترکیب نہ سجھاتی کہ بدر منیر کی شرم کو دور کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ یہ کہ اسکو شراب پلا کر مدہوش بنا دیا جائے چنانچہ نجم کی یہ ترکیب اپنا کام کر گئی

(۴) وہاں بھی نجم النسا نے بڑے نفسیاتی نکتے سے کام لینا چاہا جب بدرمنیر نے بے نظیر کے فراق میں اپنا حال تباہ کر رکھا تھا نجم النسا کا خیال تھا کہ اگر شہزادی کے دل پر بے نظیر کی بیوفائی کا نقش بٹھا دیا جائیگا تو اس کی حالت میں اصلاحی تغیر ہو جائیگا۔ اس موقع کی تصویر بھی خود میرحسن کے الفاظ میں پیش کر دی گئی ہے وہ بدرمنیر کو سمجھاتی ہے کہ بے نظیر کی محبت ایک مسافر کی محبت تھی اسپر اعتماد کرنا غلطی ہے اگر محبت استوار ہوتی تو کبھی وہ بے سبب تجھکو اس طرح مفارقت کے غم میں مبتلا کر کے خود پری کے ساتھ مزے اڑاتا نہ رہتا۔ یہ تیری بدقسمتی تھی کہ تیرا دل آیا بھی تو ایسے بیوفا پر جو "جہاں بیٹھا وہیں کا ہو رہا" اپنی حالت ایسے شخص کی جدائی میں تباہ کرنی مناسب نہیں ہے جو اپنی طرف سے بھی کچھ محبت کا اظہار کرے نہ ایسے شخص کے لئے جسکو تم جتنا اپنی طرف "کھینچو" اور کھنچتا جائے

نجم النسا کی یہ چال اس لئے نہ چل سکی کہ شہزادی کی محبت بے نظیر کیساتھ عشق کے اس درجہ تک پہنچ چکی تھی جہاں وہ لاعلاج ہو جاتی ہے اور جہاں تک ترقی کرنے کے بعد محبت فریق ثانی کی طرف کے جواب سے بھی بے نیاز ہو جاتی ہے۔ بدرمنیر نجم النسا کی قیاسی دلائل کے مقابلے میں نہایت قوی اور یقینی عذرات پیش کرتی ہے۔ اس دفعہ تو بدرمنیر کو بہ حیثیت اس کے وہ اصلی شخص قصہ ہے ضرور کامیابی ہونی چاہئے تھی اس کی کامیابی ہی قصے کو آگے لیجانے کا باعث ہوتی ہے۔

(۵) نجم النسا کی غیرمعمولی ذہانت اور عقلمندی کا مہتم بالشان ثبوت قصے کے اس حصے میں ملتا ہے جہاں اُسنے اپنے دلدادہ فیروز شاہ سے کام لینے کا عجیب ڈھنگ اختیار کیا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ فیروز شاہ سے ایک ایسی خدمت لینی ہے کہ جسکی اہمیت اسوجہ سے زیادہ ہو گئی تھی کہ فیروز کو خود اسکے ایک ہم جنس سے مقابلہ کرنے پر ابھارنا تھا نجم النسا کے تخیل عارفانہ نے فیروز شاہ کے دل میں جوگن کے متعلق نہایت بلند خیالات پیدا کر دئے وہ اسکو بے پروا، مستغنی اور ایک ایسی چیز تصور کرنے لگا جسکا حاصل ہونا آسان کام نہیں جب اس کے دل میں اس قسم کے نقوش تاثر بیٹھ گئے، تو اس کے دو نتائج نجم النسا کے حسب مقصد پیدا ہونے ضروری تھے ایک تو یہ کہ فیروز کی الفت کا جذبہ قوی تر ہوتا گیا اور اس لئے وہ نجم کی تمام پیش کردہ شرائط بر کار بند ہونے کیلئے تیار نظر آنے لگا۔ اس طرح نجم النسا کی ہوشیاری اس کی عظیم الشان مہم کو کامیاب بنانے کی ایک وجہ بن گئی۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صرف ایک خواب کی دہمی کی بنیاد پر نجم النسا کا ایسی عظیم الشان مہم کے سر کرنے پر آمادہ ہو جانا کہاں تک اس کی عقلمندی اور ذہانت کے مطابق تصور کیا جا سکتا ہے؟ اس میں شک نہیں کہ خواب کی بے ثباتی ضرب المثل ہے تاہم خواب کو محض بے بنیاد سمجھنا صحیح نہیں۔ ٹنی سن نے بھی اپنے قصے "اینک آرڈن" میں اس قسم کا عنصر شامل کیا ہے۔ چنانچہ اینی کی صرف خواب ہی کی بنا پر اینک آرڈن کو مردہ تصور کرتی اور فلپ کے ساتھ عقد کرنے پر تیار ہو جاتی ہے۔ یہاں اس امر کا لحاظ رہے کہ اینی لی نے اپنے خواب کے اشاروں کا مفہوم غلط سمجھا تھا۔ وہ اینک ارڈن کو ایک ٹیلے پر تار کے درخت کے نیچے بیٹھا پاتی ہے جسکو وہ جنت کا درخت اور سورج کی منور شعاعوں کو حضرت عیسیٰ کا نور تصور کر کے یہ نتیجہ اخذ کرتی ہے اینک فردوس میں ضرور حضرت عیسیٰ کی معیت میں بسر کر رہا ہے لیکن بدرمنیر کا خواب واضح ہونے کی وجہ سے اگر نجم النسا نے اسکو صحیح اشارہ سمجھا تو یہ کوئی نامناسب بات نہ تھی ٹنی سن کے شارحین "اینک آرڈن" کے خواب کے عنصر پر بحث کرتے کرتے خود خواب اور ان کے فلسفے کے متعلق کافی ادب پیدا کر چکے ہیں ہم بھی آئندہ میرحسن کے اس خیال پر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ یہاں صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ ہپناٹیزم کی رو سے کسی شخص کا اپنے خیالات کے

مرکز کو اسکی سچی حالت میں مشاہدہ کرنا ناممکن نہیں ہے۔

(۸)

نجم النساء کے معرکۃ الآرا کردار کی تمام خوبیاں متذکرہ بالا صفات ہی پر ختم نہیں ہوجاتیں اس فہرست میں ہم ایک اور خصوصیت کا اضافہ کرتے ہیں جو اسمیں بدرجہ اتم موجود ہے اور جس سے وہ بڑے نازک موقع پر کام لیتی ہے یہ اسکی موسیقی دانی ہے۔ ایک عمدہ کردار کو پوری کامیابی حاصل ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ مصنف اس کے تعارف کیوقت ہی اس کا ایک ایسا خاکہ (نکہ مکمل تصویر) پیش کردے کہ بعد میں جس قدر صفات وہ اس کردار سے منسوب کرنا چاہتا ہے ان سب کے اثرات اسی میں مضمر معلوم ہوں۔ یا کم سے کم ہر نو پید اصفت ایسی ہو کہ اس کے کردار زیر بحث سے منسوب کئے جانے سے کوئی تکلف یا کردار کی سرشت کیساتھ منافات نہ ظاہر ہو۔ ہر موقع کی مناسبت سے کردار میں ایک نئی صفت کا اضافہ کردینا کردار نگاری کا عیب ہے۔ کیونکہ یہ چیز اشخاص قصہ کو قصہ نگار کے ہاتھ کی کٹ پتلی بناکر ان کو غیر فطری اور غیر اہم بنا دیتی ہے میر حسن نے نجم النساء کے تعارف کے وقت اسکے اس خاص وصف کی طرف اشارہ تو نہیں کیا تاہم اس کی سرشت میں " ستارہ سی " اور " قیامت شریر " ہونیکی دو ایسی جامع اور لچکدار خوبیاں رکھدی ہیں کہ نجم النساء کا کردار اسوقت بھی مصنف کے ہاتھ کی کٹ پتلی نہیں معلوم ہوتا، جبکہ وہ پرستان میں اس کے کمالات موسیقی کا اظہار کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ عموماً مغل شاہزادیاں اور امیرزادیاں (اور اسی لئے وزیرزادیاں) رقص وسرور کی بڑی دلدادہ تھیں ان کی ذاتی گائیوں کے علاوہ وہ خود بھی بعض وقت نہایت باکمال موسیقی دان ہوتی تھیں۔ اگر وزیرزادی اور وہ بھی نجم النساء کی فطرت والی اس کمال سے متصف ہو تو چنداں تعجب کی بات نہیں لیکن میر حسن سے سیاق سے نجم النساء کے کمال موسیقی دانی میں سوائے ایک تصوری کمال کے کسی ممتاز خصوصیت کا پتہ نہیں چلتا۔ (ملاحظہ ہوں صفحات ۹۴ سے ۱۰۴ تک) شاید وہ یہیں پر کردار اخوب بجا سکتی تھی۔ گو ان مقامات میں جہاں میر حسن نے پیشہ ور گائینوں کی تصویریں پیش کی ہیں ایسی وافر معلومات کا ثبوت دیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنی ساری عمر انھیں کی راز دل اسکے سیکھنے میں بسر کی ہے

یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ نجم النساء اپنی موسیقی دانی سے نہایت شائستہ خدمات لیتی ہے مغلوں کی حکومت ہند کے زمانے میں ایک شخص کا محض موسیقی دانی کی بدولت عزت ثروت اور شہرت پانا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ تان سین اور بیجو باورے کے نام آج تک ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سے مطرب شعرا کو درباردار ی نصیب ہوچکی ہے۔ نجم النساء کا موسیقی دانی کی بدولت جنوں کے بادشاہ اور فیروز شاہ کے باپ کے دربار تک پہونچنا اور ان کے دلوں کو مسخر کرلینا میر حسن کا اپنے ماحول کی ترجمانی کرنا۔

(۹)

ایثار، ہمدردی اور خود فراموشانہ دوستی نجم النساء کے کردار کے اعلیٰ صفات ہیں۔ یہ چیزیں اس کے کردار میں جتنی زیادہ مضمر ہیں اسیقدر اس کو انسان کا ایک بہترین اور زیادہ مکمل نمونہ بنا رہی ہیں۔ بدرمنیر کے ساتھ نجم النساء کی رفاقت ہمدردی اور ایثار دوستانہ خود فراموشی کا ایک قابل تقلید نمونہ ہے۔ اگر اس کا قدم درمیان نہوتا تو ہمکو یقین ہے کہ بہ حالات موجودہ، قصے کا خاتمہ بجائے طربیہ کے کچھ اور ہوتا

اگر ہم الفاظ قانونی کے غلط استعمال کے مرتکب نہ سمجھے جائیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ نجم النسا ہر امر میں بدر منیر کی نہ صرف مشیر کار ہے بلکہ کارندہ بھی۔ اور یہ کارندگی نفس قصہ سے جہاں تک متعلق ہے معمولی معاملات کی نسبت نہیں بلکہ خود معاملات عشق کی نسبت ہے اسکے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ اپنے آپ کو بدر منیر کا قائمقام بناکر معاہدات عشق کی تکمیل کرتی ہے بلکہ اس سے ہمارا مراد صرف اس قدر ہے کہ اسکی ہمدردی ایسے کاموں میں بھی اسکو بدر منیر کی نیابت پر مجبور کرتی ہے۔ جو عام طور سے فریقین عشق انجام دیتے ہیں چنانچہ بدر منیر کیلئے بجائے بدر منیر کے وہ خود بے نظیر کو ڈھونڈنے نکلتی ہے اور یہی اس دشوار کام کے لئے بدر منیر سے زیادہ موزوں بھی تھی جیساکہ ہمنے ابھی اوپر کہا ہے قصے میں نجم النسا کی زندگی ایک قطعی خود فراموشانہ دوستی کا عمدہ نمونہ ہے بدر منیر کے ایک خواب اور پری کے ساتھ بے نظیر کے تعلقات کی بنا پر اسکا ذہن رسا اس کو اس خیال تک صحیح طور سے پہونچا دیتا ہے کہ ضرور کسی نہ کسی طرح پری کو بے نظیر اور بدر منیر کی ملاقات کا حال معلوم ہوگیا ہے اور کیا تعجب ہے کہ پری کا جذبۂ انتقام، بے نظیر کے حق میں زندان مصیبت ثابت ہوا ہو۔ بس اسی قیاس پر وہ ایک مہتم بالشان مہم کے لئے تیار ہوجاتی ہے۔

یہ بہت ممکن ہے کہ ایک شخص، کسی رفیق کی ہمدردی اور مدد کے لئے وہاں تک تیار ہوجائے جہاں تک کہ ایسی مدد خود اس کے مفاد سے نہ ٹکراتی ہو لیکن اپنے مفاد کو پس پشت ڈالکر بھی دوسرے کی مدد کرنے پر قائم رہنا درحقیقت ایک عظیم الشان ایثار ہے۔ اس ایثار کی حقیقی عظمت اس وقت تک کماحقہ ظاہر نہیں ہوسکتی جب تک اس امر کا تصفیہ نہ ہوجائے کہ آیا نجم النسا کو اُسکے عاشق فیروز شاہ کے ساتھ الفت بھی تھی یا نہیں؟ اگر اس کو الفت تھی اور اس کے بعد اس نے فیروز سے شادی کرنیکا وعدہ کیا تھا۔ تو اس کے ایثار کی اہمیت صرف اس قدر ہوگی کہ اس نے بجائے فیروز شاہ کی محبت میں محو ہوکر ایک مسرت بخش پرلطف زندگی بسر کرنے کے اپنے خود اختیار کردہ فریضہ کی تکمیل کرنی ضروری سمجھی اور اس وقت تک اپنے آپ کو ہر قسم کی نعمتوں سے محروم رکھا جب تک ہیرو اور ہیروئین میں مواصلت نہ ہوچکی۔ لیکن اگر متذکرہ بالا سوال کا جواب نفی میں دیا جائے تو نجم النسا کے ایثار کی عظمت میں چار چاند لگ جائیں گے۔ کیونکہ اس صورت میں وہ اپنے آپ کو بدر منیر کی دوستی کے ہاتھ بیچ دیتی ہے اور اپنی ذات کے متعلق ہر قسم کے مفاد کو بدر منیر کے آرام پر قربان کرکے فیروز شاہ سے اس امر کا عہد کرلیتی ہے کہ اگر وہ بے نظیر کو تندرست واپس لائے تو وہ اسکی ہوجائیگی۔ ایسا عہد درحقیقت اس کے لئے زندگی میں موت ہے لیکن اس سے پہلے کہ ہم اس امر میں قطعی فیصلہ صادر کریں بہتر ہوگا کہ نجم النسا اور فیروز شاہ کے تعلقات پر غور کریں کہ آیا نجم النسا کو بھی فیروز شاہ سے الفت تھی یا نہیں۔

میر حسن کے جملہ بیانات میں صرف ایک مصرعہ اور وہ بھی عام نوعیت کا ایسا ملتا ہے جس سے نجم النسا کی الفت کا پتہ چل سکتا ہے ؎

"وہ بھی کہ دل اس کا آیا ادھر   کہ دل بھی تو رکھتا ہے دل کی خبر"   لیکن اس مصرعہ سے بجائے اس کے کہ نجم النسا کی الفت ظاہر ہو صرف اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ وہ فیروز شاہ کی للچائی ہوئی نظروں سے غافل نہ تھی اس مصرعہ کے سوا خود میر حسن نے اس امر کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں لکھا کہ نجم النسا کو بھی فیروز شاہ سے محبت تھی خود نجم النسا کے افعال یا کلمات سے اسکی محبت کا بالکل پتہ نہیں چلتا کیونکہ کہیں بھی اس نے محبت کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ وہ ہر جگہ فیروز شاہ کے معاملے میں ستم ظریفانہ طرز روش اختیار کرتی رہی ہے ہم اسکے دل کی صرف ایک منفی کیفیت کے متعلق یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسکو فیروز شاہ سے نفرت نہ تھی۔ اس لئے اسکی بساط ماحول پر نظر کرتے ہوئے ہم یہ یقین دلا سکتے ہیں کہ نجم النسا کا ایثار حاتم طائی کے افسانوی ایثار یا ڈکنز کی ذہنی مخلوق سڈنی کارٹن کے عظیم الشان ایثار سے کم نہیں کہلایا جاسکتا۔

(۱۰)

آخر میں نجم النسا کے بعض خیالات پر بھی ہم کچھ روشنی ڈالنا ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کے یہ خیالات اس کا ثبوت ہیں کہ وہ دنیا کے واقعات پر غور و فکر بھی کرتی تھی اور اس پر اسکی نظر تنقیدی پڑتی تھی چنانچہ ہم کسی فصل میں نجم النسا کے ان خیالات کا اعادہ کر چکے ہیں جو اُسنے بے نظیر کی بیوفائی کے تذکرہ میں عام جنس مخالف کے متعلق ظاہر کئے تھے۔ نجم النسا کا خیال تھا کہ مرد کی ذات بیوفا، متلون مزاج اور سخت دل ہوتی ہے

اری چار دن کے ہیں یہ آشنا ملا دل کو آخر کرے ہیں جدا
گئے آسمان گہہ زمین کے ہیں یہ جہاں بیٹھے جا، بس وہیں کے ہیں یہ
وہ خوش ہو گا اپنی پری کو لئے عبث اپنے بیٹھی ہو تم جی دئے
تمھاری اسے چاہ ہوتی اگر تو تو اب تک وہ تم کو نہ آتا نظر؟

اسکا خیال تھا کہ محبت میں بھی خود داری کو ہاتھ سے نہ دینا چاہئے۔

سنو جانی اپنے پہ جو کوئی مرے تو دل پہلے اپنا بھی صدقے کرے
اگر آپ پر کوئی شیدا نہ ہو تو پھر چاہئے اس کی پروا نہ ہو

اگر متذکرہ بالا بیانات نجم النسا کے خیالات کی واقعی ترجمانی سمجھی جائیں، تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ نجم النسا عملاً بھی ان خیالات کو اہم سمجھتی تھی کیونکہ اس کے خیالات کا آئینہ خود اس کا طرز عمل ہے جو اس نے فیروزشاہ کے ساتھ اختیار کیا تھا۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ مرد ذات کے متعلق اسکی بدگمانی ہی نے اسکو فیروزشاہ کا کڑا امتحان لینے پر ابھارا ہو؟ اور کیا ہم اس خود داری کو جو اُسنے فیروزشاہ کی ملاقاتوں کے دوران میں قائم رکھی اسکے دلی خیالات اور نظریات کا عملی مظہر نہیں کہہ سکتے؟ حقیقت میں نجم النسا کی حیات کا وہ حصہ جو فیروزشاہ کی ملاقات کے بعد سے شروع ہوتا ہے ایک عجیب انفرادیت رکھتا ہے۔ جسکی وجہ سے نجم النسا کا کردار "سحرالبیان" کے دوسرے اشخاص قصہ کے مقابلے میں زیادہ نمایاں واقعی اور زندہ نظر آنے لگتا ہے۔ نجم النسا کی بساط تفکر میں حیات کے متعلق بھی چند خیالات موجود ہیں وہ سمجھتی ہے کہ زندگی حظ اٹھانے اور عیش و عشرت میں گزارنے کیلئے ہے ذیل کے اشعار اسکے اس خیال کی توضیح میں پیش کئے جاسکتے ہیں۔

"ٹک اک حظ اٹھا زندگانی کا تو مزہ دیکھ اپنی جوانی کا تو
مے عیش کا جام اب نوش کر غم دین و دنیا فراموش کر
کہاں یہ جوانی کہاں یہ ابھار یہ جوبن کا عالم رہے یادگار
سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں
سبھی یوں تو دنیا کے ہیں کاروبار ولے حاصل عمر ہے وصل یار"
. . . .
شب و روز پی مل کے جام شراب مہ و مہر کو رشک سے کر کباب

ان اشعار کا اگر ان خیالات سے مقابلہ کیا جائے جو اے پی کیورس کی جانب منسوب کئے جاتے ہیں اور اس کے فلسفہ کا ماحصل تصور کئے جاتے ہیں، تو معلوم ہوگا کہ نجم النسا کے خیالات درحقیقت اے پی کیورس کے ان خیالات کی ترجمانی اور تشریح ہے۔

Eat, drink & be merry, for tomorrow we may die

یعنی "کھاؤ، پیو اور خوش رہو کیونکہ ہم کل مرنے والے ہیں"

محمد عبدالقادر سروری ایم اے

حشرِ آرزو

(فسانہ)

(۱)

"اس کا کیا علاج ؟" مشتاق کی زبان سے یہ جملہ سنتے ہی میں یکبارگی چونک اٹھا دیر سے ہم دونوں خاموش بیٹھے تھے میری خاموشی کا باعث مشتاق کا وہ حسرت انگیز سکوت تھا جو کبھی کبھی اس پر طاری ہو جاتا تھا۔ لیکن آج مشتاق کے تخیلات میں جو اضطراب و تلاطم تھا وہ کچھ اس جملہ سے مترشح تھا۔ بارہا اتفاق ہوا ہے کہ مشتاق باتیں کرتے کرتے رک گیا۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوا ہے کہ بے اختیاری میں اس کی زبان سے "یہ کیا ہوا" "کیا مشکل ہے" نکل گیا ہے لیکن "اس کا کیا علاج" وہ جملہ تھا جسکو مشتاق جیسے آدمی سے میرے کان سننے کے نہ خوگر تھے نہ متوقع۔ میں نے سامنے نگاہ اُٹھائی مشتاق اب بھی سگریٹ کے کش لے رہا تھا وہ ہوا اور فضا میں بے ربطی کیساتھ چکر لگا رہا تھا شاید مشتاق کے بے ربط و پراگندہ خیالات سے وہ بھی متاثر ہو گیا تھا۔ میں کچھ پوچھنے والا ہی تھا کہ اسکی نگاہیں مجھ سے ملیں جو مجھ سے حاکمانہ انداز میں ملتجی تھیں کہ خدا کے لئے مجھے اسوقت میرے حال پہ چھوڑ دو۔ مجھے پھر جرأت نہ ہوئی کہ کچھ دریافت کروں دس پندرہ منٹ یونہی گزر گئے۔ بار بار جی چاہتا تھا کہ کچھ پوچھوں مگر اسکی ساکت کر دینے والی نگاہیں یاد آجاتی تھیں —— بڑی مشکل سے دل کو یہ سمجھا کر سوال کیلئے آمادہ کیا کہ ممکن ہے گفتگو سے مشتاق کی یہ صبر آزما حالت کسی دوسری بہتر حالت سے بدل جائے اب یہ دقت آپڑی کہ کن الفاظ میں اسے مخاطب کیا جائے مشتاق جس عالم میں رہا ہو اب تو میں اسکی بدولت خود بھی بلا وجہ پریشان ہو چلا تھا۔ جی چاہا اٹھکر وہاں سے چلا جاتا مناسب سمجھا۔ لیکن مشتاق کی نگاہیں پھر مجھ سے دو چار ہوئیں اور اس کی زبان سے یہ جملہ نکلا "ابھی مت جاؤ" مجھے ٹھہرنا پڑا اور اب یہ مسئلہ بھی حل ہو چکا تھا کہ مشتاق کو کیونکر مخاطب کیا جائے میں نے بیٹھتے ہی پوچھا "تمھاری حالت کیا ہے" جواب میں وہ مجھے بے معنی نگاہوں سے دیکھا کیا میں بھی جواب الجواب میں مجسم سوال بنکر خاموش رہا میری یہ ادا بیکار نہیں گئی۔ مشتاق نے کہا "تم جانتے ہو کہ میں اسوقت مسٹر چیٹرجی کے ہاں سے چار پی کر آرہا ہوں ؟"

مسٹر چیٹرجی الہ آباد میں تاریخ کے پروفیسر تھے بس ان کے حالات کے متعلق کچھ زیادہ علم نہیں رکھتا۔ اتنا جانتا ہوں کہ وہ سناتن دھرم کو چھوڑ کر پہلے برہمو سماج میں داخل ہوئے اور اب دین مسیحی کے پیرو ہیں۔ مسز چیٹرجی بالکل انکی ضد واقع ہوئی ہیں انکو قصہ ہائے پارینہ سے دلچسپی ہے اور اسی میں محو رہتے ہیں۔ مگر مسز چیٹرجی ان سب چیزوں کو مردہ سمجھکر قابل اعتنا نہیں سمجھتیں ان کو بس نیرنگ ہائے امروز سے سروکار ہے ان کی علمی استعداد کچھ زیادہ نہیں سنا گیا ہے کہ انٹرینس تک تعلیم پائی ہے مگر وہ عورت ہے اور وہ بھی بنگالی عورت عورت کو فطرت خود تعلیم دیتی ہے انسانی تعلیم اس کو نسائیت کی ملکوتیت کو حیوانیت سے پست تر کر دیتی ہے۔ عورت طنز مجسم ہے اور بنگالی عورت کا طنز تو سحر بنگالہ کی خاصیت رکھتا ہے جو نیش کو نوش کر کے ہلاہل سے زیادہ مہلک بنا سکتا ہے۔ مسز چیٹرجی حسین بھی ہیں یا نہیں ؟ اس کے متعلق میں خود کچھ نہیں جانتا۔ بعد کو مشتاق ہی کی زبان سے معلوم ہوا کہ وہ پوری بنگالی عورت ہے جس کے بدن کا کوئی حصہ اپنی جگہ معیار حسن پر پورا نہیں اترتا لیکن خدا ہی

جانتا ہے کہ یہ جسمانی نقایص بحیثیت مجموعی ایک بنگالی عورت کو بیکرِ حسن بنا کر خطرناک حد تک کیونکر دلکشی پیدا کر لیتے ہیں۔ مشتاق اسی "سحرِ بنگال" کا شکار ہو چکا تھا۔

(۲)

مشتاق کی بابت عام طور پر لوگوں کی یہ رائے ہے کہ وہ ایک لااُبالی مغرور اور وحشی آدمی ہے میری اور مشتاق کی ملاقات بچپن ہی سے شروع ہوئی تھی جب ہم دونوں رنج و غم سے آزاد فکرِ دنیا سے ناآشنا ایک دوسرے کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ ہماری طبیعتوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ وہ اگر تیز و طرار تھا تو میں خاموش اور کاہل۔ بایںہمہ اپنے ہم عمر لڑکوں سے بھی نفرت تھی اور مجھے بھی مجھے یاد نہیں پڑتا کہ ہم دونوں کو کبھی دوسرے لڑکوں کی صحبت میں لُطف آیا ہو ہماری نظروں میں الہ آباد میں کوئی ایسا لڑکا تھا ہی نہیں جو ہماری توجہ کا مستحق ہوتا یعنی ہم سب کو جاہل سمجھتے۔ ہم ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور ایک عرصہ کیلئے۔ جب ہم انٹرنس میں تعلیم پا رہے تھے تو میں سلطانپور ہائی اسکول میں تھا۔ اور وہ اپنے وطن الہ آباد میں۔ امتحان کے بعد چھٹیوں میں ہمکو پھر ایک دوسرے سے الہ آباد میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ میری اور مشتاق کی تربیت بالکل دو جداگانہ اصول پر ہوئی تھی۔ لیکن خدا جانے کونسی قوت تھی جو ہمیں کشاں کشاں ایک دوسرے سے قریب تر کر رہی تھی۔

الہ آباد میں مجھے معلوم ہوا کہ مشتاق اسوقت عالمِ سفلی کی سیر کر رہا ہے اس نے بلا سوچے سمجھے اپنے کو دنیا کی گمراہ کرنے والی آزمائشوں کے حوالہ کر دیا تھا۔ مجھے یہ دیکھکر بڑا افسوس ہوا میں جانتا ہوں کہ وہ ان سب پستیوں سے کہیں زیادہ بلند و بالا ہے اور خواہمخواہ اپنے جوہرِ اصلی کو آلودہ کر کے مٹا رہا ہے لیکن اس رندگی میں جسے لوگ عیش و عشرت سے تعبیر کرتے ہیں اسکو سکون نہ ملا مشتاق ایک عجیب بے قرار طبیعت کا انسان تھا اس نے دنیا کی ہر ممکن کوشش کی مگر اسکی فطری بے قراری میں کوئی کمی نہ ہوئی یہانتک کہ اُس نے اپنی خودی کو فراموش کرنے کے لئے دخترِ رز کو بھی منہ لگایا لیکن وہ بھی اسکی غمگسار نہ بن سکی۔ اب مشتاق دنیا کی دلچسپیوں کی حقیقت سمجھ چکا تھا اور شاید یہی زمانہ تھا جب تاہل کی بیڑیاں اس کے پانوں میں ڈالدی گئی تھیں مشتاق اُن پاگلوں میں نہ تھا جو گریبان چاک کر کے صحرا کی راہ لے لیتا۔ اس نے شہر ہی کو صحرا سمجھا اور اپنی وحشت کی ساری جولانی اپنی ہستی کو ابھارنے میں صرف کر دی اور اسمیں شک نہیں کہ وہ ایک غیر معمولی ہستی ہو کر رہ گیا لوگ اُسے وحشی اور مغرور سمجھنے لگے میرا خیال ہے کہ مشتاق خوددار۔ غیور اور ایک نوکھا آدمی ہے اسکی جرأت دایرۂ اعتدال سے باہر ہوتی ہے اور عرفی کا یہ شعر جسکو وہ اکثر پڑھا کرتا ہے اسکے خیالات کی کافی ترجمانی کرتا ہے ؎

قدم بروں منہ از جہل یا فلاطوں باش　　که گر میانہ گزینی سراب تشنہ لبی است

خود مشتاق کی اپنی بابت یہ رائے ہے کہ مجھے سوئی کی جگہ نشتر چبھونے سے زیادہ تسکین ہوتی ہے۔ اس جگہ یہ بھی بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مشتاق نے اپنی جوشِ طبیعت کے تقاضہ سے دنیا کا ہر علم حاصل کرنیکی کوشش کی چنانچہ اس نے کالج میں کبھی تو فلسفہ و تاریخ پڑھی کبھی اقتصادیات اور ریاضیات اور کبھی طبیعیات اور کیمیا وغیرہ۔ اور ان سب علوم میں اسکو کافی دستگاہ حاصل تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ مباحثہ اور مکالمہ میں کوئی شخص اس کے سامنے ٹھہر نہ سکتا تھا۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ ایک پروفیسر صاحب اس کے درجے میں طبیعیات پر لکچر دے رہے تھے مشتاق متوجہ نہ تھا اس کی نگاہیں سامنے میدان میں جہاں ایک گھسیارہ جون کی دوپہر کی دہوپ میں گھاس کھود رہا تھا جمی ہوئی تھیں گھسیارے کی پیشانی سے پسینے کی بوندیں ٹپک رہی تھیں اور وہ ہنر کام میں مشغول تھا۔ پروفیسر صاحب کو یہ دیکھکر ناگوار ہوا کہ میں تو اپنا سر کھپا رہا ہوں اور طالبعلم میری طرف متوجہ نہیں ہے۔ انھوں نے ذرا تند ہو کر کہا "مشتاق اگر تم متوجہ نہیں ہوتے تو کمرہ سے باہر چلے جاؤ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سامنے

میدان میں کونسی ایسی دلچسپی ہے کہ تم حرارت جیسے اہم مسئلہ کی طرف سے غافل ہو اگر تم نے آج میرا لکچر نہ سنا تو پھر کبھی اس کا موقع نہ ملیگا اور امتحان میں حرارت بامقیاس الحرارت سے متعلق جتنے سوالات آئیں گے اُن کے شافی جوابات تم نہ دے سکو گے" مشتاق نے اس کو اپنی توہین سمجھی اور ترشی کیساتھ بول اٹھا "آپ اس کمرہ میں بیٹھکر جہاں خس کی ٹٹیاں لگی ہوئی ہیں اور برقی پنکھا چل رہا ہے طبیعیات کا سبق دے رہے ہیں۔ آپ کہتے ہیں اسوقت حرارت فلاں درجہ پر ہے آپکے پاس اسکا کوئی ثبوت بجز مقیاس الحرارت آپکے دعویٰ پر حجت ہے آپ کیا جانیں کہ حرارت کس چیز کا نام ہے اور اس کے درجات کیا ہیں وہ سامنے گھسیارے کو دیکھئے اسکو البتہ حرارت کا کماحقہٗ علم ہے۔ اسلئے کہ وہ اسکی اہرین اپنے جسم کے ریشے ریشے میں دوڑتی ہوئی محسوس کر رہا ہے جس شے کو آپ محسوس نہیں کرتے اس کی بابت کوئی قطعی حکم کیونکر لگا سکتے ہیں"۔ پروفیسر صاحب بہت خفیف ہوئے اور بولے "اچھا تو میرا کلاس چھوڑ دو" مشتاق کی یہی ذہنیت تھی جس کا ایک زمانہ شاکی تھا اور جو ہمیشہ اور ہر موقع پر نمایاں رہتی تھی۔

یہی مشتاق صاحب کی زبان سے آج یہ مبہم جملہ نکل گیا تھا کہ "اسکا کیا علاج" اور اس کا سبب صرف یہ تھا کہ مسز چیٹرجی نے اُسے چار کی دعوت دی تھی۔ خدا جانے کیا واقعات پیش آئے تھے کہ مشتاق جیسے زوردار آدمی نے ہتھیار ڈالدیا۔ اب مجھے یاد آیا کہ ایک دن پیشتر مشتاق کے پاس ایک تحریر آئی تھی جسمیں صرف اس قدر لکھا تھا "کل تمھیں چار بجے یہاں چار کی دعوت میں شریک ہونا ہے" اس اندازِ حکومت سے مسز چیٹرجی کی قوت کا خیال شاید کیا جاسکے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں مشتاق کی ساری قوتیں سلب ہوگئی تھیں وہ شخص جسکی سوئی اوروں کیلئے نشتر ثابت ہوتی تھی ایک عورت سے اتنا سہم جائے! یہ ایک حیرت کی بات ہے۔ مجھے مزید حالات سننے کا اشتیاق ہو گیا

مشتاق تو تھا ابا اسی جملہ پر ختم کردینیوالا تھا کہ "تم جانتے ہو کہ میں اسوقت مسز چٹرجی کے ہاں سے چار پیکر آرہا ہوں" لیکن میرے منہ سے نکل گیا "پھر کیا چار میں زہر ملا تھا کہ تمھاری حالت متغیر ہو گئی ہے" مشتاق نے مجھکو کچھ ایسی نگاہوں سے دیکھا کہ میں باوجود انتہائی بے تکلفی کے نادم ہو گیا۔ اور اپنی ندامت کو خواہ مخواہ کی مصنوعی مسکراہٹ سے چھپانا چاہا۔ سلسلہ کو جاری رکھنے کی اب میرے پاس کوئی تدبیر نہ تھی۔ مگر خیریت ہوئی کہ مشتاق نے خود ہی گفتگو شروع کردی "تم پوچھتے ہو کیا چار میں زہر ملا تھا؟ ہاں وہ زہر ہی تھا جو چار کی صورت میں مجھے پلایا جا رہا تھا۔ میں نے ہمیشہ کوشش کی کہ اس عورت سے دور رہوں مگر ...." مجھ سے نہ رہا گیا میں بات کاٹ کر بولا "پھر تم دعوت میں شریک ہونے سے انکار کرسکتے تھے"۔

"انکار کرسکتا تھا؟ ذرا اس تحریر کے تیور تو دیکھو۔ تمھیں کل چار بجے چار پر شریک ہونا ہے"۔ اس شریک ہونا ہے کا کیا علاج؟ کیا انکار محض اس کا جواب ہوسکتا تھا۔ میں تو انکار میں یہ قوت نہیں دیکھتا کہ مسز چیٹرجی کے اس جملے کے سامنے ٹھہر سکے۔ دعوت کا ہیکو ہے "کوہ ندا کا طلب نامہ ہے" مجھے افتاں وخیزاں جانا پڑا مجھے مسز چیٹرجی کی قوت آزادی کھینچ کر لیگئی۔ بس مسحور کر لیا گیا۔ بغیر شریک ہوئے مجھکو کوئی چارہ کار نظر نہ آیا" مشتاق یہ کہہ رہا تھا اور میری نظر اس کے چہرہ پر تھی جو اس طوفان کا آئینہ دار تھا جو اس کے دماغ میں برپا تھا۔ بہرحال میں گیا۔ مسٹر چیٹرجی نے مجھے تپاک سے لپٹایا۔ یہی ایک پروفیسر تھے جو ایام طالبعلمی میں میرے ہمدرد اور مداح تھے۔ آج بھی وہ اپنے شاگرد کو دیکھکر خوش ہوئے مسٹر چیٹرجی ابھی تک میز پر نہیں آئی تھی محض اس کی آمد کی تصور سے میں اندر ہی اندر گھبرا رہا تھا۔ مسٹر چیٹرجی میری طبیعت سے بزعم خود واقف تھے کچھ دیر وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے لیکن مجھے متوجہ نہ پاکر خاموش ہو رہے۔ اتنے میں سامنے کے پردہ کو جنبش ہوئی اور وہ دفتاً بھی آگیا جسکا

میں سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مسز چیٹرجی نے آتے ہی مسٹر چیٹرجی کی سامنے ایک طنز آمیز تبسم کے ساتھ میرے آنے پر اظہار مسرت کیا۔ یہ مسرت گویا میری شکست پر فاتحانہ مسرت تھی۔ مگر اس کے بعد وہ خاموش ہو گئی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی دوسری دنیا میں ہے۔ میں سر جھکائے بیٹھا رہا چا کا دور چلنے لگا مسز چیٹرجی میری پیالی میں چا ڈال رہی تھیں۔ انداز سے صاف پتہ چلتا تھا کہ اس کا خیال کہیں اور ہے۔ میں اس "کہیں اور" سے واقف تھا۔ اس نے آنکھیں نیچی کئے ہوئے ایک خفیف لغزش کیساتھ میری پیالی میری طرف بڑھائی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اسکی بیخودکرنیوالی نگاہیں بھی چا میں حل ہو گئی ہیں۔ میری عجیب کیفیت تھی نظریں نیچی پیالی منہ سے لگی ہوئی اور گرم چا ایک عالم بیخبری میں میرے حلق سے نیچے اترتی جاتی تھی۔ مسز چیٹرجی کا لب زیریں اس کے دانتوں میں دبا ہوا تھا۔ پلکیں تیر کی طرح سیدھی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دلمیں اتر کر رہیں گی۔ میرا ہاتھ کانپ رہا تھا میرا دماغ مختل تھا میرے حواس کا شیرازہ بکھرا ہوا معلوم نہیں کب تک میری یہ حالت رہی کہ ایکبار مسٹر چیٹرجی کی آواز سنائی دی "مسٹر مشتاق معاف کرنا آج مجھے کلب میں ٹینس کھیلنے جانا ہے" کلب کا نام اچھی طرح میں سن بھی نہ سکا اور خوش ہو کر اٹھا کہ اس آزمائش گاہ سے کسی طرح رہائی ملی۔ لیکن اسی کے ساتھ مسز چیٹرجی نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا "نہیں مسٹر مشتاق ابھی نہیں جائیں گے"۔ کوئی پانچ منٹ کے بعد مجھے یہ معلوم ہو سکا کہ میں نہیں گیا اور ایک کرسی پر مسز چیٹرجی کے سامنے بیٹھا ہوں۔ درمیاں میں میز حائل تھی۔ مسز چیٹرجی کی زبان سے "مسٹر مشتاق" سن کر میں مشتاق بھی نہ رہا تھا"

میں ہمہ تن گوش ہو رہا تھا اور یہ معلوم کرنے کے لئے بیتاب تھا کہ آخر بات کیا ہوئی جو آج مشتاق کے منہ سے بیساختہ "اس کا کیا علاج" نکل گیا۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا اور گزر گیا مشتاق نے اپنے پریشان بالوں کو ناحق ہاتھوں سے درست کرنے کی کوشش کی میں مشتاق کی زبان سے آگے کے حالات سننے کا متمنی تھا۔ میں نے دیکھا کہ مشتاق سگرٹ جلانے میں مشغول ہے اور شاید گزشتہ واقعات کو بیان کرنے کیلئے تیار ہو رہا ہے اس نے پھر ایک سانس لے کر کہنا شروع کیا "مسز چیٹرجی نے جسوقت میرے نام کے آگے مسٹر کا اضافہ کیا میرے رہے سہے حواس بھی غائب ہو گئے اور میری رگوں میں تشنج ہونے لگا" میں نے مشتاق کی زبان سے آج پہلی بار سنا تھا کہ میرے رہے سہے حواس غائب ہو گئے۔ میں نے حیرت سے اس کو دیکھا مشتاق میرا مطلب سمجھ گیا اور کہا "ہاں وہ ایسی ہی خوفناک عورت ہے کہ میرے حواس بھی اسکے سامنے غائب ہو سکتے ہیں تنہائی میں اس کے سامنے مجھ پر ایک قیامت گزر رہی تھی۔ اگر قیامت کسی جانکاہ ساعت کا نام ہے۔ مسز چیٹرجی کے روبرو میری حالت اس مجرم کی سی تھی جو سولی کی سزا سننے کے لئے حاکم کے سامنے کھڑا ہو آخر کار اسکے ہونٹ ہلے۔ اسکی بھنویں تنیں اور میں ہمہ تن اس کے قابو میں ہو گیا۔ میرے کانوں میں پھر "مسٹر مشتاق" کی آواز آئی۔ جی چاہتا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور مجھے اپنی پناہ میں لے لے یا پھر یہ عورت یہیں بیٹھی بیٹھی نیست ہو جائے میرے خیالات ابھی نہ جانے کتنے پہلو بدلتے کہ جملہ پورا کیا گیا "کہئے اس دوران میں آپ کن کن دلچسپیوں میں محو تھے کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ میں نے آپ کو کتنے دنوں بعد دیکھا ہے؟" اللہ! ان دو جملوں میں جو تاثرات تھے وہ میرے اعصاب میں ابتک ایک ہنگامہ بپا کئے ہوئے ہیں اسکی نگاہیں مجھے خاکستر کئے ڈالتی تھیں ریاض تم اس عورت کو نہیں جانتے اسوقت یہ تذکرہ جلانے دو میں اپنے دل میں تاب نہیں پاتا۔ پھر کبھی سن لینا کہ مجھ سے اور مسز چیٹرجی سے کیونکر راہ و رسم پیدا ہوئی اور پھر کس حد تک

جب تک تم سارے واقعات نہ جان لو میری داستان سے کوئی نتیجہ نہ نکال سکو گے،" یہ کہکر مشتاق نے گردن جھکالی اور کھو یا گیا۔ میں بھی سلام علیکم کہکر رخصت ہو گیا۔

(۳)

بیکاری کا زمانہ تھا الہ آباد سے ہم لوگوں کی طبیعت گھبرا رہی تھی۔ مشتاق کی رائے ہوئی کہ بے کیفی دور کرنے کے لئے سفر اختیار کرنا چاہئے ہماری پہلی منزل فیض آباد میں ہوئی۔

شام کا وقت تھا ہم گلاب باڑی کی سیر سے واپس ہو رہے تھے۔ نٹشے کے مافوق الانسان پر نہایت پر زور تنقید ہو رہی تھی کہ یکایک مشتاق ایک گلفروش کی طرف لپکا اور اس کے ہاتھ سے ایک ہار لیکر اس طرح سونگھنے لگا گویا پھولوں کی تمام خوشبو اپنی ہستی میں جذب کر لینا چاہتا ہے اسپر تماشہ یہ، کہ اس نے ہار خریدا نہیں بلکہ چند لمحوں بعد ہار بیچنے والے کو واپس کر دیا۔ میں نے کہا "یہ کیا وحشت تھی۔ اگر تمھیں ایسا ہی شوق تھا تو کوئی ہار خرید لینے" مشتاق نے سنجیدگی سے کہا "آپ نہیں جانتے ملکیت کا تصور ہی ان نیم شگفتہ کلیوں کی دلربائیوں اور دلنوازیوں کو فنا کر دیتا یہی وجہ ہے کہ میں اس محبت کا قائل نہیں جو محبوب کو اپنا بنانے کی آرزومند ہو چنانچہ میرے خیال میں مناکحت محبت کی ساری لذتوں کو زائل کر دیتی ہے۔ میری شریعت میں اگر کوئی گناہ ناقابل معافی ہے تو وہ محبوب کے ساتھ زوجیت پیدا کرنا ہے۔ محبت جیسی معصوم شئے کو دنیا کے رسوم و قیود میں جکڑنا کیا معنی؟" میں نے دل میں کہا "بک لے، اسوقت سکوت ہی بہتر ہے۔" ایمان کی تو یہ ہے کہ مشتاق کے عجیب و غریب نظریوں اور اس کے طریق استدلال سے عاجز ہو کر "جواب جاہلاں باشد خموشی" پر عمل کرنے لگا تھا مشتاق کی عادت تھی کہ جب وہ میری گفتگو سے کچھ خوش نہ ہوتا تو مجھے تم کے بجائے آپ سے مخاطب کرنے لگتا۔ آج بھی وہ میری دخل در معقولات سے کچھ مکدر سا ہو گیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیر تک مجھے اس کے طنز کا مقابلہ کرنا پڑا۔

چوک سے ہم نے یکہ کرایہ پر کیا اور اپنی قیام گاہ کی طرف چلے صانع نے جو غلطی یکہ بنانے میں کی تھی اس کا کفارہ آج ہم کو ہچکولوں اور دھکوں کی صورت میں ادا کرنا پڑا۔ مشتاق صبر نہ کر سکا۔ اس نے کہا "ریاض میری ایک بات ذہن نشین کر لو جب تک ہندوستانی یکہ کی صعوبتیں برداشت کر سکتے ہیں اسوقت تک سوراج پانے کا نہ ان کو کوئی حق ہے اور نہ سوراج مل سکتا ہے" میں ابھی اس کے جملے سے لطف اٹھا ہی رہا تھا کہ وہ یکہ سے کود کر سڑک پر ہو لیا اور یکہ والے کو دو آنہ پیسے دے کر بولا "میاں بس اب معاف کرو" میں نے دل میں کہا یا اللہ کس وحشی سے پالا پڑا ہے تقریباً آٹھ بجے رات کو ہم اپنی قیامگاہ کو پہونچے۔ مشتاق ہمیشہ اپنے سفر و حضر میں برقی چولہا ساتھ رکھتا تھا۔ وہ چائے بنانے میں مصروف ہو گیا اور میں اسکی مصروفیت دیکھکر مسکرانے لگا مجھے مسز چیٹرجی کی چاء یاد آگئی تھی۔ مشتاق نے کچھ دیر بعد میری طرف دیکھا تو مجھے آپ ہی آپ ہنستے ہوئے پایا۔ پہلے تو اس نے مجھے قابل التفات نہ سمجھا لیکن آخر کار پوچھ بیٹھا "یوں بیکار ہنسنے کا مطلب؟" میں نے کہا بھائی مسز چیٹرجی کی چاء یاد آگئی" یہ سنکر مشتاق کے چہرہ پر جو رنگ آگیا وہ کہہ رہا تھا کہ اگر اس وقت یہ تذکرہ نہ چھیڑا جاتا تو بہتر تھا وہ ایک بار پھر غوطہ میں پڑ گیا میں ابتک عورت اور اس کی قوتوں سے ناواقف ہوں۔ مشتاق کی صورت میرے سامنے تھی اور میں تعجب کر رہا تھا کہ عورت جو "ایک" "نیاز ناتواں" سمجھی جاتی ہے اس کی بابت کہا جاتا ہے کہ مرد کی غلامی کے لئے بنائی گئی ہے اپنے اندر کیسی کیسی طاقتیں پوشیدہ رکھتی ہے! اسکی قوت ارادہ اور قوت فعل کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ صرف تجربہ کیا جا سکتا ہے۔ عورت کیا نہیں کر سکتی

اگر وہ کرنے پر تُل جائے - اب مشتاق مجھے چا ر پلا رہا تھا اور خود بھی پی رہا تھا لیکن ایک خیال تھا - جو اسکی ساری ہستی پر چھایا ہوا معلوم ہوتا تھا شاید اپنے ایک نادانستہ حملہ کے بدولت میں مشتاق کی اسی حالت کا مشاہدہ کر رہا تھا جو مسز چیٹرجی کے سامنے اسپر طاری ہوئی ہوگی - چہرہ کا رنگ متغیر ہو رہا تھا ہاتھ میں لرزش تھی - اور وہ رہ رہ کر اپنے ہونٹ چبا رہا تھا اسکی حالت مجھ سے دیکھی نہ گئی اور میں نے ڈرتے ڈرتے کہا "کیوں مشتاق تم کو ہوا کیا ہے اگر مناسب سمجھو تو مجھے بھی مسز چیٹرجی والی سرگزشت سنادو"

مطلع ابھی صاف تھا دیکھتے دیکھتے ایک طرف سے بادل اٹھا اور سارے آسمان پر چھا گیا - ہوا میں فرحت بخش خنکی پیدا ہوئی اور تھوڑی دیر بعد بوندیں پڑنے لگیں گویا ساری کائنات مشتاق کے تاثرات قبول کر رہی تھی - اور وہ فطرت اس کے واردات قلب کی آئینہ دار بن گئی تھی - میں نے کہا "مشتاق دیکھو اس وقت فطرت بھی تمہاری ہم آہنگ ہونا چاہتی ہے - کون کہہ سکتا ہے کہ وہ بھی پس پردہ کسی ہستی کی ستائی ہوئی نہیں ہے؟" مشتاق نے اپنے مطلب کی بات سن کر ایک حسرت خیز تبسم سے میری داد دی -

رات کے ۹ بج چکے تھے بستر بچھایا گیا - بلکہ یوں کہئے کہ ہم نے اپنا بستر بچھایا یہ بھی نہیں "تنہا مجھی کو دونوں بستر بچھانے پڑے - اس لئے کہ کبھی کبھی اسپر ایک عجیب عالم طاری ہوجاتا تھا جسمیں وہ دنیا کا کوئی کام کرنا نہیں چاہتا تھا اور مجھے اپنی تمام کاہلی اور سستی برطرف کر کے جست و چالاک بن جانا پڑتا تھا - اب ہم تھے اور ایک بنگالی رن کا طویل فسانہ -

"ریاض تم دیکھنے میں سیدھے سادے مولوی نما مسلمان معلوم ہوتے ہو لیکن ہو بڑے کافر - آخر اس وقت مسز چیٹرجی کیوں سوجھ گئی - خواہ مخواہ مجھے پریشان کر رہے ہو" مشتاق نے کہا - حالانکہ اس کے لب و لہجہ سے ظاہر ہوتا تھا کہ موسم نے اسپر اپنا کافی اثر کیا ہے اور وہ اس وقت خود پریشان ہونے کا آرزومند ہے - اس نے ایکی بار یوں سلسلہ شروع کیا:-

"یہ قصہ اُس وقت کا ہے جبکہ میں ایف اے میں پڑھتا تھا - یہاں اس بات کو یاد رکھو کہ یہ زمانہ میری زندگی کا نہایت پرشور زمانہ تھا میری پراگندہ دلی کی کوئی انتہا نہ تھی میں بلاوجہ پریشان و منتشر مزاج رہا کرتا تھا اور جہاں کہیں سکون کی موہوم سے موہوم امید ہوتی تھی میں وہاں اپنے دل کو لگانے کی کوشش کرتا تھا - چنانچہ ان دنوں طرح طرح کی آلائشوں میں اپنے لطیف عناصر کو خراب کر رہا تھا - لیکن آہ سب بیکار ثابت ہوا -

این بادہ خمار داشت ہشیار شدیم   ایام شباب بود مستی کردیم

خیر اصل قصہ سنئے تم مسٹر بینرجی کو جانتے ہوگے وہی جو آلہ آباد میں میرے انگریزی کے پروفیسر تھے مسز بینرجی کلکتہ یونیورسٹی کی بی اے آنرس تھیں جب کبھی مسٹر بینرجی کا دل کالج جانے کو نہ چاہتا تو اپنی بیوی کو بھیجدیتے - یعنی بیوی کے گریجویٹ ہونیسے پورا فائدہ اٹھاتے تھے جب مسز بینرجی کلاس میں آتیں تو میری روح کو تکلیف ہوتی تھی - میری باغیانہ طبیعت اس منظر کو برداشت نہ کر سکتی تھی - مجھے اب محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ عورت اب عورت رہنا نہیں چاہتی - اور اپنی نسائیت سے برسر پیکار ہے - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے کلاس میں مسز بینرجی سے غیر ضروری سوالات کرنے شروع کئے - جب وہ سقراط کے حالات پر لکچر دینے لگتیں تو میں خواہ مخواہ تنقید کرنے کھڑا ہوجاتا اور پے بہ پے سوالات سے ان کو پریشان کر دیتا مسز بینرجی میرے وسیع مطالعہ اور غایر نگاہ کی قائل ہوگئی تھیں لیکن آخر میری حیثیت کیا تھی؟ ایک معمولی طالبعلم کی - ان کو میری چھیڑ ناگوار ہوئی اور ایک دن کہنے لگیں "مسٹر مشتاق اگر واقعی تم اس سوال کو حل کرنا چاہتے ہو تو میرے بنگلہ پر آؤ اگر کالج میں مجھ سے پڑھنا منظور نہیں تو صاف صاف مجھ سے کہدو میں کلاس چھوڑ دوں

وہ بھی نہایت شریف عورت - دل ہی دل میں میری ذہانت کی داد دیتی تھی - ایک دفعہ میرا سہ ماہی یا ششماہی امتحان تھا ہماری کاپیاں مسز بنرجی کو دیکھنے کو ملیں - میری کاپی دیکھ کر اُس کی آنکھیں کھل گئیں اور اُس نے مجھے بلا کر کہا "آج تک ایسی گہری تنقید اور ایسا دلکش اسلوبِ بیاں میری نظر سے نہیں گزرا - میں چاہتی ہوں کہ تم سے اکثر تبادلۂ خیالات کیا کروں جس سے ہم دونوں کو فائدہ ہوگا" دوسرے دن میں چار پر بلایا گیا یہیں سے مسز بنرجی سے بے تکلفی شروع ہوئی - تھوڑے عرصہ میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ بیچاری میری گرویدہ ہوگئی ہے اور اگر یہ کہوں کہ مسز بنرجی مجھے چاہنے لگی تھی تو غلط بیانی نہ ہوگی جب تک میں اس کے سامنے رہتا وہ میری صورت دیکھتی رہتی اور میری باتوں کو محویت کیساتھ سنتی رہتی حتیٰ کہ اس نے مجھ سے کہدیا "تم میں نہ جانے وہ کونسی کشش ہے جسنے مجھے مبہوت کر لیا ہے اور اب میں اپنے اندر تمھارے لئے ایک تمنا ایک حسرت - ایک تڑپ پاتی ہوں اب شاید تمھاری صحبت کے بغیر مجھے کسی بات میں دلچسپی نہ ہو" جو کچھ اُس نے کہا اُس کی آنکھوں نے اسکی تائید کی میں نے بیدلی اور بے نیازی کے ساتھ سب کچھ دیکھا اور سنا - اور ایک غیر ذمہ دارانہ تبسم کے ساتھ جواب دیا "تو کیا حرج ہے ؟" اس کے بعد میں نے گفتگو کا موضوع بدل دیا" -

پیالی کی چار ختم ہو چکی تھی میں نے بات کاٹ کر مشتاق سے کہا "اچھا لاؤ اور چار ڈھال دو" مشتاق نے پیالی مجھے دیدی اور ایک لمبی سانس لے کر چند منٹ چپ رہا - چار کا دوسرا دور شروع ہوا اس نے پھر کہنا شروع کیا "ہاں تو اول اول مسز چٹرجی سے مجھ سے مسز بنرجی کے کمرہ میں ملاقات ہوئی مسز بنرجی کا بنگلہ بھی پاس تھا اور وہ اکثر مسز بنرجی کے ہاں آیا کرتی تھی - ایک روز چار پر وہ بھی موجود تھی اور مختلف مسئلوں پر بحث ہو رہی تھی - اسی سلسلہ میں یونان کی مشہور شاعرہ صافو کا ذکر آیا مسز بنرجی پر صافو کی داستان محبت نے بڑا اثر کیا تھا - اُس نے بات ہی بات میں فلسفۂ محبت پر بحث چھیڑ دی - اس کا خیال تھا کہ انسان کے پیدا کرنے کی صرف اس لئے ضرورت پڑی کہ کائنات کی کوئی دوسری چیز محبت جیسی امانت کی حامل نہ ہو سکتی تھی وہ حافظ کے اس فلسفہ کی پیرو تھی ؎

جلوۂ کرد رخش دید ملک عشق نداشت　　عین آتش شد ازیں غیرت و بر آدم زد

جب مجھ سے میری رائے پوچھی گئی تو میں نے کہا "سچ تو یہ ہے کہ آج تک میری سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ محبت ہے کیا بلا اور کب اور کیوں رونما ہوتی ہے اور انسان کے قلب و دماغ پر اس کے کیا اثرات ہوتے ہیں محبت کا واقعی کوئی وجود ہو یا نہ ہو میرے خیال میں یہ امر مسلمہ ہے کہ ننانوے فیصدی محبت کرنے والوں کو محبت نہیں بلکہ ایک غلط فہمی ہوتی ہے جس کو وہ اور دنیا والے خوامخواہ محبت سے تعبیر کر لیتے ہیں" میں نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا تھا - لیکن مسز چٹرجی کے دل میں ایک شورش برپا ہوگئی مجھ سے اس سے اب تک کوئی بات نہ ہوئی تھی - میں خدا جانے کیوں اُس کی نگاہوں سے پہلو بچا رہا تھا مگر اب اس نے مجھے مخاطب کیا اور صرف اتنا پوچھا "کیا سچ ہے اب تک آپ نہیں جانتے محبت کیا چیز ہے" میں اس سوال کے لئے تیار نہ تھا - اسی کے ساتھ مسز چٹرجی نے مجھے کچھ ایسی نگاہوں سے دیکھا کہ میں نے سر جھکا لیا - میرے اعصاب میں رعشہ پیدا ہوگیا اور پیالی میرے ہاتھ سے چھوٹ کر چور چور ہوگئی - مسز بنرجی نے مجھے دیکھا اور اپنی حیرت کو مسکراہٹ سے چھپا لیا میں نادم ہو کر رہ گیا شگون کچھ اچھا نہ تھا میرے دل میں ایک نامعلوم خطرہ پیدا ہوا تقریباً پندرہ منٹ بعد میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا قریب قریب روز شام کو مسز بنرجی سے ملنے جایا کرتا تھا -

اب مجھے ہر وقت یہ اندیشہ رہنے لگا کہ کہیں مسز چیٹرجی نہ آجائے۔ میں اس عورت سے کیوں گھبراتا تھا مجھے نہیں معلوم اس کی آنکھیں۔ اس کے تیور اس کے سب کچھ اُف نہ جانے کیا تھے! اتفاق دیکھئے اس روز کے بعد مسز چیٹرجی مسز بینرجی کے مکان پر بلاناغہ آنے لگی۔ اس درمیان میں مجھ سے اس سے کچھ زیادہ گفتگو نہ ہوئی تھی وہ اپنے دو خوبصورت چھوٹے بچوں کیساتھ مشغول رہا کرتی تھی۔ مگر میں محسوس کرتا تھا کہ وہ مجھ سے ایک لمحہ کے لئے غافل نہیں ہے۔ اس کی بیگانگی اس کے قلبی لگاؤ کا راز فاش کر رہی تھی مسز بینرجی اُس سے بہت بچ بچ کر بات کرتی تھی۔ اس لئے کہ مسز چیٹرجی اسکو حقارت سے دیکھا کرتی تھی۔ اسکو اپنے ذی اولاد ہونے پر غرور تھا اور مسز بینرجی غریب کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ عورت کا بے اولاد ہونا اس کی زندگی کو کہاں تک بدمزہ بنا سکتا ہے۔ مسز بینرجی سمجھی تھی کہ مسز چیٹرجی کو اپنے تفوق پر ناز کرنے کا حق حاصل ہے وہ مسز چیٹرجی سے ہر حالت میں زیادہ حسین و جمیل کہے جانے کی مستحق تھی۔ لیکن قوت ارادی کی کمی اور اعلیٰ تعلیم نے اس کی نسائیت کو مسز چیٹرجی کے مقابلہ میں کمزور کر دیا تھا۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ مسز بینرجی کے ہاں مسٹر چیٹرجی اور چند دوسرے پروفیسر جمع تھے میں بھی موجود تھا اور مسز چیٹرجی بھی۔ ہر پروفیسر اپنے اپنے رنگ کی بات کر رہا تھا مسٹر چیٹرجی نے حروب صلیبی کا قصہ چھیڑ دیا مجھے ان کی رائے سے اختلاف تھا۔ وہ کسی طرح میری رائے کو تسلیم نہ کرتے تھے میں نے مغربی مورخین کے اتنے حوالے دئے کہ اُن کو چکر آگیا اور وہ میرا منہ تکنے لگے جب مجمع برخاست ہونے لگا تو انھوں نے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوے کہا۔ ”اچھا اب کی اتوار کو میرے مکان پر آؤ تو ہم آج کی بحث کا فیصلہ کریں“ میں نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ مسز چیٹرجی بول اٹھی ”ہاں ہاں ضرور آئیے آپ بڑی دلچسپ چیز ہیں اور آپ کی صحبت میں انسان بہت کچھ سیکھ سکتا ہے آپکے آنے سے مجھے بڑی مسرت ہوگی میں نے آہستہ سے آنے کا وعدہ کر لیا اس پر مسز چیٹرجی کی ذرا شرارت دیکھنا مسز بینرجی سے کہنے لگی ”کیوں تمھیں کچھ ناگوار تو نہ ہوگا؟“ مسز بینرجی کی پیشانی نم آلود ہوگئی اور اس نے نیچی نگاہوں سے مجھے دیکھا گویا مطلب یہ تھا کہ میں نہ صرف تمھارے لیے خفیف کی گئی بلکہ آج سے تم کو کھو رہی ہوں مشتاق اتنا کہکر رک گیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر ایک مجھے دیا اور ایک خود پینے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے سلسلہ پھر جاری کیا۔

”ریاض تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں ان دنوں کس دور انتشار سے گزر رہا تھا۔ اسی اتوار کی شام کو میرا نکاح ہونے والا تھا۔ میرے پاؤں میں زبردستی زنجیریں ڈالی جا رہی تھیں۔ خود میری زندگی مجھے وبال ہو رہی تھی۔ اس پہ نئی مصیبت یہ کہ ایک معصوم عورت کی زندگی مجھ ناکارہ سے وابستہ کرکے خراب کیجا رہی تھی۔ یہ والدین کی وہ غلطی ہے جسے خدا معاف کرے تو کرے میں نہیں کرتا اور پھر خدا کو معاف کرنے کا حق ہی کیا حاصل ہے؟ بہرحال میری عجیب کیفیت تھی۔ میرے اضطراب کا اس وقت تک کوئی علاج نہ ہو سکا تھا میں نے مختلف دلچسپیوں میں اپنا جی بہلانا چاہا۔ لیکن سب بے سود ہاں تو وہ میرے نکاح کا دن تھا۔ میرا دل دھڑک رہا تھا میں ایک نئی زندگی سے گھبرا رہا تھا۔ اس گھبراہٹ کو دور کرنے کے لئے میں نے قریب قریب سارا دن مسٹر چیٹرجی کے ہاں صرف کر ڈالا ہر طرف میری تلاش ہو رہی تھی۔ اور یہاں مسز چیٹرجی کی دلربائیاں اپنا جادو چلا رہی تھیں میں مسٹر چیٹرجی سے باتیں کرنے میں مصروف تھا و مسز چیٹرجی بہانہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر مجھے اپنی طرف مخاطب کر رہی تھی میں عجیب عالم میں تھا۔ ایک طرف تو اس عورت سے

خائف تھا دوسری طرف اس کی دلنشین ادائیں میری رگ رگ میں اپنا اثر پھیلا رہی تھیں شام کو کوئی تین بجے میں اس کے پاس سے اٹھا اور گھر واپس ہو کر ایک معصوم عورت کے ساتھ زبردستی پیمانِ رفاقت باندھ لیا اس کے بعد میں ایک عرصہ تک مسز چیٹرجی سے نہیں ملا البتہ مسز بینرجی سے ملتا رہا وہ مضمحل رہنے لگی تھی اس میں وہ تپاک نہ تھا میں اس تغیر کا سبب جانتا تھا لیکن اس سے کچھ پوچھ نہ سکتا تھا ایک دن میں کتابیں لئے کالج جا رہا تھا راستہ میں مسٹر چیٹرجی کا بنگلہ پڑتا تھا۔ مجھے آدھا گھنٹہ دیر ہو چکی تھی اور اس لئے جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا جا رہا تھا کہ یکایک میرا نام لے کر کسی نے مجھے مخاطب کیا۔ مڑ کر جو دیکھا تو مسز چیٹرجی برآمدہ سے مجھے بلا رہی تھی ریاض میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ اس عورت میں کچھ غیر معمولی قوتیں ہیں جن کے سامنے انسان اپنی تاب مقاومت قائم نہیں رکھ سکتا۔ مجھے دیر ہو رہی تھی باوجود اس کے میں اس سے ملنے گیا۔

اس نے بلا کسی تمہید کے ایک حاکمانہ لہجہ میں کہا "آج کالج نہ جاؤ مجھے تم سے ایک ضروری بات کہنی ہے جو تمہاری وسیع معلومات میں ایک بیش بہا اضافہ کر دیگی"۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی میں گھبرایا میری گھبراہٹ میرے چہرہ سے ظاہر ہونے لگی۔ وہ میری حالت سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ میں خاموش کھڑا تھا اور وہ میرے بشرہ کا مطالعہ کر رہی تھی دو تین منٹ اس طرح گزرے ہوں گے کہ اس نے پھر مجھ سے اس طرح کہا۔ سوچتے کیا ہو بیٹھ جاؤ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اگر ایک دن کالج نہ جاؤ گے تو کچھ بڑا نقصان نہ ہو جائیگا"۔ میں چپ رہا اور کتابیں ایک طرف میز پر ڈال کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ سامنے وہ بھی بیٹھ گئی کچھ دیر تک پتھر کی دو مورتوں کا مقابلہ تھا۔ آخر کار اس کے ہونٹ ہلے اور ایک مرعوب کرنے والے لہجہ میں اس نے کہا میں ایک بات کہنا چاہتی ہوں اگر تم اس کو سننے اور سمجھنے کے لئے تیار ہو یعنی اگر بلا سوچے سمجھے کوئی رائے نہ قائم کر لو"۔ میں نے عاجز ہو کر اور اپنے دل کو مضبوط کر کے جواب دیا "کہہ بھی ڈالئے"۔

"آخر تمہارے اعصاب ایسے کھنچے ہوئے کیوں ہیں؟۔ تمہاری رگوں میں اس قدر ضرورت سے زیادہ تناؤ کہاں سے آیا؟ تم جیسے سخت دل اور بے حوصلہ آدمی سے اپنی بات اس وقت تک نہ کہوں گی جب تک کہ تم سے پوری ہمدردی کا وعدہ نہ لے لوں" میری سراسیمگی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جاتی تھی میں نے آنکھیں اٹھا کر مسز چیٹرجی کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس کی جادو نگاہی کا مقابلہ میں نہیں کر سکتا۔ وہ آنکھیں! اُف! .... میں ان کا سامنا کر کے کانپ گیا اور یہ کہتے ہی بن پڑا "کہئے میری ہمدردی آپ کے ساتھ ہے" اس نے کرسی قریب کھینچ کر کسی قدر دبی زبان سے کہا "مشتاق مجھے معاف کرو میں تم کو بُری طرح چاہتی ہوں......"

یہ جملہ سنتے ہی میں چونک پڑا اور پھر سر جھکا لیا اس نے سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا "للہ مجھکو کوئی آبرو باختہ بے حیا یا گری ہوئی عورت نہ سمجھنا۔ زندگی میں چند لمحے ہوتے ہیں جنسے بچنا انسان کے بس کی بات نہیں جب میں نے پہلی بار تم کو مسز بینرجی کے ہاں دیکھا اسی وقت تم میں ایک کشش محسوس کی اور تمہاری وہ محبت پر بحث سن کر تمہاری طرف اور بھی کھنچی تمہاری بے نیازی بے حوصلگی تمہاری بے پروائی نے میرے دل میں ایک تمنا پیدا کر دی جسکو میں نے بہت چاہا مگر مٹا نہ سکی آج اسی تمنا کو تم اس صورت میں دیکھ رہے ہو" یہ کہکر اس نے اپنے دعویٰ محبت کے بلند آہنگی پر میرا بوسہ لے کر مہر ثبت کر دی۔ ریاض پھر نہ پوچھو کیا ہوا۔ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا اور جس سے میں بچ رہا تھا۔ ....."

میں بول اٹھا "تو یوں کہو کہ وہ ہوا جو نہ ہونا چاہئے تھا" مشتاق

نے کہا "نہیں نہیں ریاض وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا کیونکہ اس دنیا میں وہ ہو ہی نہیں سکتا جو نہ ہونا چاہیے۔ اب اپنے دل کی حالت کیا بیان کروں وہ احساس گناہ تھا یا کیا جس نے میرے اندر ایک ہلچل مچا رکھی تھی۔ احساس گناہ کیونکر کہوں ہاں اگر گناہ اسی کو کہتے ہیں تو میں اس سے پیشتر ایسے صدہا گناہوں کا مرتکب ہو چکا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ میری پہلی شکست تھی اور وہ بھی ایک عورت کے ہاتھوں جو میرے دل میں کھٹک پیدا کر رہی تھی۔ میں جو ایک عورت کو مرد کی معلم دیکھنا گوارا نہیں کر سکتا تھا آج اس عورت کے بس میں کیونکر آ گیا۔ اس کے بعد مدتوں میرا یہ حال تھا کہ بلا ارادہ میرے قدم مسز چیٹرجی سے ملنے کے لئے اٹھ جاتے اور میں وہاں جا کر زندگی کی اہم تر ذمہ داریوں کو بھول جاتا۔ بس ہوش میں تھا مجھ پر ایک گہرا نشہ چھا گیا تھا جو عرصہ تک قائم رہا۔ ایک دن میں نے سنجیدگی کے ساتھ مسز چیٹرجی سے کہا "تم نے یہ سب کچھ تو کیا۔ لیکن اس کا خیال نہ ہوا کہ ہم اپنے پیمان محبت کو نباہ بھی سکتے ہیں یا نہیں آخر اس طرح کب تک بسر ہوگی؟ فرض کرو کہ میں نے تم سے کنارہ کشی اختیار کر لی تو تم کیا کرو گی؟ میں دنیا میں آج تک کبھی کسی کا پابند نہیں رہا خواہ مخواہ تم مجھے پابہ زنجیر کرنا چاہتی ہو۔ حالانکہ میں الہ آباد میں ہمیشہ رہ سکتا ہوں نہ تم" وہ کچھ دیر کے لئے افسردہ ہو کر مجھے دیکھنے لگی مگر پھر میرے گلے میں ہاتھ ڈال کر کہنے لگی۔ "نہیں اب تم مجھے نہیں چھوڑ سکتے میں نے تم کو محبت کی لذت سے آشنا کر دیا ہے۔ تم نہیں جانتے تھے کہ محبت کیا چیز ہے میں نے تمکو بتا دیا میں تمھاری محسن ہوں تم مجھ پر ظلم نہ کرو گے" اف وہ کیسے دھوکے میں تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ میں اب تک نہیں جانتا کہ محبت کس عنقا کا نام ہے لیکن مسز چیٹرجی کے لب و لہجہ میں کچھ زور ایسا تھا کہ میں اس کا دھوکہ رفع کرنے کی بھی جرأت نہ کر سکا۔ سال بھر اسی طرح گزر گئے آخر کار مجھے ہوش آیا اور اپنی ذات سے شرم معلوم ہونے لگی۔ میں نے تدریجاً مسز چیٹرجی سے ملنا کم کرنا شروع کیا اور کچھ دنوں میں مجھے الہ آباد چھوڑ دینے کا ایک بہانہ مل گیا۔ میں نے سمجھا کہ بڑی آفت سے نجات ملی لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ ہاں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس درمیان میں میں نے مسز چیٹرجی سے ملنا یک قلم ترک کر دیا تھا۔ مجھے ان سے نفرت معلوم ہوتی تھی اور میں اپنے کو ان کا گنہ گار سمجھنے لگا تھا"

رات ختم ہو گئی تھی صبح کا تارہ نکل آیا تھا مشتاق نے اپنی داستان کو نامکمل چھوڑ دیا اور ہم لوگوں نے دہلی کے لئے سامان سفر درست کیا۔

(۴)

دہلی میں یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ ہم بھاڑ جھونکتے رہے لیکن خاک ضرور چھانتے رہے۔ "کارونیشن ہوٹل" میں ہمارا قیام تھا دو تین روز تک ہم کچھ ایسے ضروری کاموں میں مصروف تھے کہ نہ تو مشتاق کو مسز چیٹرجی کا ذکر چھیڑنے کی فرصت ملی اور نہ مجھے اتنا یاد رہا کہ اس سے فرمائش کر کے کچھ اور حالات سنتا۔ ایک دن ہم جامع مسجد سے چاندنی چوک جا رہے تھے راستہ میں ایک تانگہ پر باجا بجتا ہوا جا رہا تھا جس کی بھدی اور کریہ آواز اعلان کر رہی تھی کہ کسی تھیٹر یا سینما کا اشتہار تقسیم ہو رہا ہے۔ ایک اشتہار میرے ہاتھ میں بھی دیدیا گیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کے لینے میں میرے ارادہ کو کتنا دخل تھا۔ بہر حال میرے ہاتھ میں اشتہار تھا "مدن پکچر پیلس میں آج "سالومی" کا مشہور و معروف کھیل دکھایا جائیگا" اور خدا جانے کیا کیا اشتہار میں درج تھا۔ ہمارا جیب خرچ سرعت کے ساتھ ختم ہو رہا تھا۔ یہاں تک کہ مشتاق کو اپنی چاء اور سگریٹ میں کمی کرنی پڑی اور میں نے تو سگریٹ پینا چھوڑ ہی دیا تھا۔ لیکن مشتاق نے کہا چاہے آگرہ بلا ٹکٹ ہی جانا پڑے مگر سینما ضرور دیکھا جائیگا" میں نے کہا

"جی نہیں یہ نہیں ہوگا" "نہیں یہی ہوگا" مشتاق نے پر زور لہجہ میں کہا۔ آخر وہی ہوا جو اس نے کہا۔ اور ہم پونے نو بجے کھیل کی دوسری نمائش کے وقت پکچر پیلس میں موجود تھے۔ نمائش شروع ہوئی میرے لئے ان تصویروں میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ میں اس ڈرامہ کو پڑھ بھی چکا تھا۔ اور اب قصہ کی حیثیت سے بھی میں اس میں کوئی نئی لذت نہ پاتا تھا۔ جب تک تماشا ختم نہ ہوا میں نہایت غور سے مشتاق کے چہرہ کو دیکھ رہا تھا جو بجائے خود متلون اور متضاد جذبات کا محل نمائش ہو رہا تھا۔ آج میں نے دیکھا کہ مشتاق کی پھر وہی حالت ہے جو اس روز تھی جبکہ وہ بےساختہ "اس کا کیا علاج" کہہ اٹھا تھا۔ پردہ پردہ وقت بھی قیامت کا تھا جب سالومی یوحنا سے کہتی ہے کہ "میں تمہارا بوسہ لے کر رہوں گی" معلوم ہوتا تھا کہ مشتاق بیہوش ہو جائے گا۔ اور وہ بیہوش ہو جاتا اگر نمائش اسیوقت بند ہو جاتی۔ لیکن چونکہ متحرک تصویریں پے بہ پے آ جا رہی تھیں اور اس کی توجہ کو اپنا بنائے ہوئے تھیں۔ اسلئے اسکو بیہوش ہونے کا موقع نہ ملا۔ کھیل اختتام کو پہونچ رہا تھا۔ ایک تصویر سے میں بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اب بھی جب کبھی عالم خیال میرے سامنے وہ منظر آ جاتا ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں سالومی اپنے ہنگامہ جذبات سے مجبور ہو کر یوحنا کا سر کٹوا لیتی ہے اور ایک فاتحانہ تبسم کے ساتھ اس کے بیجان رخساروں کو چومنے لگتی ہے۔ عورت بھی کائنات کا ایک معمہ ہے وہ اپنے جذبات کے سامنے دنیا کو دنیائی برگزیدہ ترین ہستیوں کو ہیچ سمجھتی ہے۔ نخیت میں وہ اس طرح بھی محو ہو سکتی ہے کہ وہ زندہ اور مردہ چیزوں میں کوئی امتیاز نہ کر پائے۔ سالومی بھی اسی قماش کی عورت تھی۔ اسکو کائنات میں یوحنا ہی یوحنا نظر آ رہا تھا وہ یوحنا کی دھن میں اپنے گرد و پیش سے اس طرح بے خبر تھی کہ اس کے چاہنے والے نوجوان شامی نے انتہائے رشک سے مغلوب ہو کر اس کے سامنے خودکشی کر لی اور سالومی نے مڑ کر دیکھا بھی نہیں۔ عورت اپنے محبوب کا خون بھی کر سکتی ہے۔ اگر اس طرح اس کے خروش محبت کو آسودگی اور سکون نصیب ہو جائے میرے تاثرات کی کوئی حد نہ تھی۔ مشتاق کا حال ناقابل بیان تھا۔ ہم کس عالم میں اپنے قیام گاہ تک پہونچے ہم کو کچھ خبر نہیں آج مشتاق پھر خاموش تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کھیل نے اس کو کسی دوسری دنیا میں پہونچا دیا ہے۔ سوچتے سوچتے وہ اٹھا اور برقی چولھا جلا چا بنانے لگا میں سمجھ گیا کہ آج کی رات یوں ہی گئی۔ مشتاق کی نیت سونے کی نہ تھی۔ میں منتظر ہی تھا کہ دیکھئے اب کون سا پہلو بدلتے ہیں کہ اتنے میں اس کی زبان سے نہایت دردناک آواز میں یہ مصرع نکل گیا۔

کیا شہید بھی قاتل نے خون بہا بھی دیا

اور اب مجھے معلوم ہوا کہ سالومی ابھی تک حضرت پر مسلط ہے۔ چند منٹ بعد اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا "نہ جانے مسز چیٹرجی کا کیا حال ہے؟" میں سمجھ گیا۔ لیکن پھر بھی اس سے پوچھا "آخر یہ بے وقت مسز چیٹرجی کی یاد کیوں آ گئی؟" اس نے جواب دیا "نہ جانے سالومی اور مسز چیٹرجی میں کون سی چیز مشترک ہے کہ میں اسوقت دہلی میں ہوں اور وہ الہ آباد میں، یقین مانو جسوقت مسز چیٹرجی نے میرا بوسہ لیا ہے اس کی ہیئت بالکل سالومی کی سی تھی اور میں گلو بریدہ یوحنا سے کسی طرح کم نہ تھا جہاں تک مجبوری اور فقدان ارادہ کا تعلق ہے اسوقت ساری کائنات میرے خلاف صف آرا تھی اور مجھے شکست دینے پر تلی ہوئی تھی۔ آہ! مجھ سے کوئی پوچھے کہ انسان فطرت کے ہاتھوں کتنا مجبور ہے مسز چیٹرجی کا یہ جملہ سنہرے حرفوں میں لکھے جانے کے قابل ہے کہ "بعض لمحے ایسے ہوتے ہیں جنمیں انسان مجبور ہوتا ہے" جو واقعات میں تم سے بیان

کرچکا ہوں ان میں میرے ارادہ کو کوئی دخل نہ تھا

جو چاہیں سو آپ کرے ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

میں دیکھتا ہوں کہ تمھیں میری تمام سرگزشت سننے کا اشتیاق ہے بہتر ہے آج کی رات بہرحال آنکھوں میں کٹے گی خیر یوں سہی ۔ جب میں نے مسز چیٹرجی سے ملنا ترک کیا تو اس کے متعدد شکایت نامے آئے ان میں سے بعض نہایت پر اثر اور دل ہلا دینے والے تھے ۔ لیکن اب میں ہوش میں آچکا تھا ۔ اپنے خواب سے بیدار ہو چکا تھا وہ جو ایک وقتی اثر میری رگ رگ پر طاری ہو گیا تھا فنا ہو چکا تھا ۔ اور اب میں خواہ مخواہ اپنی ایک لغزش اپنی ایک غلطی کو نباہنا نہیں چاہتا تھا جب میں نے انہ آبا ۔ چھوڑ دیا تو شروع شروع کچھ دنوں تک مسز چیٹرجی کو نہ جانے کس طرح میرا پتہ معلوم رہا ۔ چنانچہ اس نے تین چار خطوط بھیجے اور میرے رہے سہے سکون میں خلل ڈالتی رہی ۔ آخرکار میں نے اس کی باضابطہ کوشش کی کہ اسکو میرا پتہ معلوم نہ ہو سکے ۔ چند خط میرے ٹرنک میں موجود ہیں تم ان کو دیکھ سکتے ہو "۔

یہ کہکر مشتاق نے اپنے ٹرنک سے وہ تحریریں نکالیں جن کے لکھنے میں معلوم ہوتا ہے کہ دل کا ایک ایک قطرۂ خون صرف کیا گیا ہے ۔ ایک خط میں لکھا تھا " یہ بے اعتنائی میرے کس جرم کی سزا ہے ۔ میں نے اگر کسی کو نقصان پہونچایا ہے ۔ کسی کو تباہ کیا ہے یا کسی کو خاک بسر کیا ہے تو اپنی ذات کو ۔ تم کو نہیں ۔ پھر یہ کشیدگی کیوں ؟ یہ عتاب کس لئے ؟ یہ دل آزاری کیسی ؟ میرے مشتاق کچھ جواب دو ! "۔ دوسرے میں نے لکھا تھا " مشتاق ! پیارے مشتاق ! تم کو کچھ احساس نہیں تمھارا دل پتھر سے بھی زیادہ سخت ہے ۔ تم نہیں سمجھتے کہ میں ساری دنیا سے منہ موڑ سکتی ہوں جوگ لے سکتی ہوں ۔ تیاگی بن سکتی ہوں ۔ مگر تم کو آہ ! تم کو نہیں چھوڑ سکتی ۔ مشتاق میری بات سنو سمجھو اور مجھ پر رحم کرو ۔ تیسرے میں لکھا تھا " ظالم میری بددعائیں یوں بیتا ہے ۔ دکھے ہوئے دل کے کوسنے خالی نہیں جاتے ۔ "

میں تحریریں نہ دیکھ سکا ۔ میرے دل میں تاب نہ تھی جو عورت محبت میں بددعائیں دے سکے ۔ اسکی بیزاری اور دلبستگی کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہوگا ۔ مشتاق اپنے ہیجان کو ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا وہ پلنگ سے اٹھ کر ٹہلنے لگا تھا ۔ میں اسکی حالت پر غور کر رہا تھا ۔ یکایک اس نے شاید خود اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہا " کچھ نہیں ہونے والی بات تھی " اب میں نے اس کو اپنی طرف متوجہ کرنا ضروری سمجھا ۔ میں نے کہا عجیب ناعاقبت اندیش عورت ہے ۔ تیاگی رسمی پابندیوں اور معاشرتی مجبوریوں کو نہیں سمجھتی ۔ خواہ مخواہ تم سے امیدیں لگائے ہوئے ہے ، تم کر ہی کیا سکتے ہو ؟ مشتاق نے بیتاب ہو کر جواب دیا " ریاض تم کچھ نہیں سمجھتے میں اپنی طبیعت سے مجبور ہوں ورنہ جن پابندیوں اور مجبوریوں کا تم ذکر کرتے ہو وہ نہ میرے لئے کوئی معنی رکھیں ، نہ اس کے لئے میں سب کچھ کر سکتا تھا ۔ مشتاق کی بیچینی بڑھ رہی تھی وہ ایک خاص کشمکش میں پڑا تھا ۔

اس وقت اس کے قیافہ سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنے کو ملامت کر رہا ہے اور مسز چیٹرجی سے تغافل برتنے پر پشیمان ہے اس کی یہ کیفیت دیر تک قائم نہ رہی اس نے اپنے تیور درست کر کے کہنا شروع کیا ۔ میں الہ آباد سے دور رہ کر یہ سمجھتا تھا کہ اب میں بالکل محفوظ ہوں اور اب مسز چیٹرجی شاید مجھ پر قابو نہ پا سکے گی ۔ میرا یہ خیال بالکل غلط ثابت ہوا ۔ ایک دفعہ مجھے الہ آباد جانے کا اتفاق ہوا ۔ اسکو میری آمد کی خبر ہو گئی الہ آباد پہونچنے پر دوسرے ہی دن شام کو اس کا ایک رقعہ آیا جس میں لکھا ہوا تھا " مجھ سے آکر مل جاؤ ورنہ میں خود تم سے ملنے آتی ہوں ۔ میرے ہاتھ پاؤں بھول گئے اور میں گیا پھر کیا بتاؤں کیا ہوا وہ کھلے ہوئے سانپ

کی طرح مجھ پر چوٹ پر چوٹ کر رہی تھی۔ کبھی روتی تھی اور کبھی کھا جانے والی آنکھوں سے مجھے دیکھتی تھی کبھی مجھ سے رحم و تلطف کی التجا کرتی تھی اور کبھی حاکمانہ انداز میں مجھ سے جواب طلب کرتی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا "کیوں مشتاق میں نے کیا گناہ کیا ہے کہ اس طرح مجھے مٹانے کے درپے ہو گئے ہو؟" میں نے دبی ہوئی زبان سے کہا "ابتدا تمہیں نے کی تھی" وہ بولی "صحیح ہے لیکن تم تو شکست کا اعتراف کر چکے تھے۔ اب اس سرتابی اس پہلو گردانی کے کیا معنی؟" پھر میں کچھ کہنے کی ہمت نہ کر سکا۔ میں اس کی چلتی ہوئی زبان کے سامنے ٹھہر نہ سکا۔ وہ پھر کہنے لگی "بتاؤ کوئی ایسی ہستی بھی ہے جس سے التجا کروں جس کے قدموں کو چوم کر تمہاری توجہ کو اپنی طرف منعطف کرا سکوں۔ نہیں ہو سکتا کہ تم مجھ سے بے نیاز ہو کر رہو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک عورت تمہارا دم بھرتی ہو، تمہارے لئے برباد ہوتی ہو اور تم اس سے مستغنی ہو کر چین سے زندگی بسر کرو۔ وہ عورت جس نے اپنی عزیز ترین چیز تم پر نچھاور کر دی ہو کیونکر گوارا کر سکتی ہے کہ تم اُسے بھول جاؤ۔"

اس کی گھاتیں اتنی ہی تھیں کہ جو کچھ وہ زبان سے کہہ رہی ہے اس سے زیادہ کر کے دکھا سکتی ہے مبالغہ نہ سمجھو ارادہ کو عمل میں لانے کی قوت اسمیں ساوتری سے کم نہیں۔ ایسی عورت کا کیا علاج اور پھر اس کا کیا علاج کہ میں کسی طرح محبت کے مغلوب تر ہوائے جذبات اپنے اندر نہیں پاتا جو دین و دنیا سے بے خبر ہو کر میں اس عورت کا ہو جاؤں۔

جس وقت میں مسز چٹرجی کے بنگلہ سے نکلا ہوں سامنے مسز بینرجی اپنے بنگلہ کے برآمدہ میں کسی خیال میں محو کھڑی تھی اس نے مجھے دیکھ لیا اب میں بغیر اس سے ملے نہیں جا سکتا تھا۔ میں اس کی طرف بڑھا۔ اس نے محبت اور حسرت بھرے لہجہ سے کہا "مسٹر مشتاق بہت دنوں کے بعد آپ سے ملاقات ہوئی اور وہ بھی ایسے وقت کہ دو ایک گھنٹوں میں الہ آباد کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینے والی ہوں۔" چونکہ اسکی آواز دردمند تھی میں جواب نہ دے سکا وہ مجھے غور سے دیکھنے لگی گویا میری پیشانی پر میری سرگزشت لکھی ہوئی تھی۔ پڑھ کر اس نے کہا "مسٹر مشتاق، ہم آپ سب اتفاقات کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ نہ آپ سے کوئی شکایت ہے نہ مجھے۔ جو ہونے والا تھا وہ ہوا اس میں نہ آپ کی کوئی خطا ہے نہ میری اور نہ مسز چٹرجی کی۔ قدرت کو یہی منظور تھا کہ آپ جب سے ہم جدا ہیں اور مسز چٹرجی کی زندگی کو خوشگوار بنائیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اب آپ محبت کی چیز نہ رہے پھر بھی میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھونگی"

میں یہ سنکر پانی پانی ہو گیا۔ لیکن زبان سے کچھ نہ کہہ سکا۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ مسٹر بینرجی الہ آباد چھوڑ کر میرٹھ کالج جا رہے ہیں میری مسلسل خاموشی سے نہ جانے وہ کیا سمجھی اور کہا "اچھا تو الوداع" اور ہاتھ ملا کر کمرہ میں چلی گئی میں سیدھا اپنے گھر آیا مسز چٹرجی کی ملاقات نے از سر نو مجھے ایسا پریشان کیا تھا کہ دوسرے ہی دن میں الہ آباد سے بھاگ کھڑا ہوا اور مدتوں اسکو بھولا رہا اس دوران میں اس کی جو حالت بھی رہی ہو مجھے کوئی صحیح علم نہیں۔ اب کی بار اپنی بدنصیبی سے الہ آباد پھر آنا پڑا اس دفعہ تم بھی موجود تھے میں نے لاکھ چاہا کہ مسز چٹرجی کو میرے الہ آباد پہنچنے کا علم نہ ہو مگر وہ جان گئی اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ تم سے کہہ چکا ہوں۔ اب کی دفعہ میں زیادہ پریشان اس لئے ہوں کہ وہ کہہ چکی ہے "مشتاق تم جہاں رہو زندگی میں جو دلچسپیاں چاہو پیدا کر لو مگر یہ یاد رہے کہ میں زیادہ عرصہ تک اس طرح رہ سکتی ہوں اور نہ تم" ریاض اس جملہ کے سیکڑوں معنی ہوتے ہیں نہ جانے یہ کیا کیا ولولے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ خدا ہم دونوں کی مدد کرے۔"

"مشتاق کا افسانہ ختم ہوگیا وہ بیجان تھا۔ میں خاموش۔ رات بھر ختم ہوگئی تھی۔ تکان اور ماندگی سے مجبور ہو کر صبح کے وقت دونوں کی آنکھیں لگ گئیں۔"

(۵)

تقریباً دو برس میں مشتاق سے منزلوں دور رہا۔ جب ہم ایک دوسرے سے جدا ہوئے تھے تو آپس میں خط و کتابت کے بڑے بڑے وعدہ ہوئے تھے لیکن ع کون نباہتا ہے وفا کون کرتا ہے۔ ایک مدت تک میں مشتاق کی زندگی کے حالات سے بالکل بے خبر رہا۔ ایکا ایک خلاف امید اس کی ایک مختصر تحریر مجھکو ملی جسمیں اصرار کیا تھا کہ مجھکو بلایا گیا تھا میں گیا جو کچھ کہ میری آنکھوں نے دیکھا اس کا کبھی خواب میں بھی گمان نہیں ہو سکتا تھا۔ مشتاق دنیا کے ہر کاروبار سے سرد ہو کر گوشہ نشین ہوگیا تھا اور سادہ تریں زندگی بسر کر رہا تھا جو کچھ واقعات اس کی زبانی مجھے معلوم ہوئے وہ یہ ہیں

مشتاق گزشتہ دو سال سیاسی ہنگاموں میں نہایت جوش و سرگرمی کے ساتھ پڑا رہا اور جانے کہاں کہاں مارا مارا پھرا۔ اس سے بھی اسکو آسودگی میسر نہ ہوئی اور اب تو اس کا خیال ہے کہ ہندوستان کی سیاسی زندگی سب سے زیادہ لغو اور بے معنی زندگی ہے وہ کہتا ہے "اگر خدا عرش سے اتر کر آئے اور مجھ سے کہے کہ تمھاری ایک انگلی کی جنبش سے ہندوستان میں سوراج ہو جائیگا تو میں اس انگلی کو ہرگز جنبش نہ دونگا۔"

وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر الہ آباد چلا آیا تھا اور ایک گوشہ میں بیٹھکر مطالعہ اور مراقبہ میں زندگی کے باقیماندہ دن گزار دینا چاہتا تھا مسز چیٹرجی نے پھر اس کو چین نہ لینے دیا۔ مگر مشتاق کی دنیا بدل چکی تھی۔ اُس کے خیالات میں زمین و آسمان کا فرق ہو چکا تھا اس کو اپنے اوپر اعتماد پیدا ہو گیا تھا۔ اس نے مسز چیٹرجی سے ایک بار صاف صاف جا کر کہہ دیا "آپ بیکار مجھے سکون سے محروم نہ کیجئے مجھ کو آپ کی کوئی امید نہیں ہے۔ میں اب دنیا میں کسی سے محبت نہیں کر سکتا۔ بجز کوئی میری محبت کیوں کرے" اس کے چند ماہ بعد مسز چیٹرجی کے دماغ میں فتور کے آثار نمایاں ہونے لگے اور جب میں الہ آباد پہنچا ہوں تو وہ پوری پاگل ہو چکی تھی قصے عجیب و غریب ہوا کرتے ہیں اگر واقعات ان سے بھی زیادہ محیر العقول ہو سکتے ہیں۔ ہماری خیالات کی انتہائی پرواز جہاں ختم ہو جاتی ہے وہاں سے اکثر سنگین اور تلخ واقعات کی ابتدا ہوتی ہے۔ مسز چیٹرجی کی سی عورت جو دنیا میں صرف ستانے آئی ہو۔ فطرت کی ستم ظریفی دیکھیے خود مبتلا رہی ہر دہ اپنے حلقوں میں مشتاق کو "غارت گری کا دیوتا" کے لقب سے یاد کیا کرتی ہے مگر مشتاق اب اُس دور سے گزر چکا ہے جسمیں انسان کو رسوائی اور بدنامی کا ڈر ہوا کرتا ہے وہ نہ اب مسز چیٹرجی سے خائف ہے اور نہ اسکو پرواہ ہے۔ سارے شہر میں مشتاق اور مسز چیٹرجی کا قصہ مشہور ہو رہا ہے اس کو اس کی بھی پروا نہیں ہے وہ اس دنیا کو چھوڑ چکا ہے اور نہ جانے کس دنیا میں رہتا ہے۔ صرف دل بہلانے کی غرض سے اس نے شاعری شروع کر دی ہے اور بیگانہ تخلص کرتا ہے اس پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی ہے کہ زندگی میں سکون کی آرزو کرنا ایسا ہی ہے جیسا لڑکوں کا چاند کے لئے بیتاب ہونا مجھ کو تو اسکی زندگی "ناشاد و نامراد زیستن" کی بہترین مثال معلوم ہوتی ہے واللہ اعلم بالصواب لیا ہے اس کا ایک شعر سننے کے قابل ہے جو بہت کافی حد تک اس کے معتقدات پر روشنی ڈالتا ہے۔

اے دل راحت طلب یہ عاقبت نا آشنا — کہتے ہیں راحت جسے رسوائیوں کا نام ہے

امتیاز احمد (بی اے)

مثنوی اور سودا

شعراء اردو نے غزل کے ساتھ مثنوی پر بھی توجہ کی ہے، بلکہ بعض شعراء نے اسی سے ابتدا کی اور بعض محض مثنوی کی وجہ سے مشہور ہوئے مثلاً میر حسن نے "بدر منیر" اور نسیم نے "گلزار نسیم" لکھکر بقائے دوام پائی دکھنی شعراء نے خصوصاً اس طرف زیادہ توجہ کی اور مشہور فارسی مثنویوں کا اردو میں ترجمہ کیا اور اکثر نئے نئے واقعات نظم کر ڈالے۔

میر حسن نے اپنی طویل مثنوی میں اصناف مثنوی کو نہیں چھوڑا مگر اخلاقی پہلو نباہ نہ سکے، بخلاف ان کے میر تقی میر نے گو چھوٹی چھوٹی مثنویاں لکھیں مگر دامن اخلاق ہاتھ سے چھوٹنے نہ پایا اسیطرح میرزا رفیع سودا نے بھی چھبیس چھوٹی چھوٹی مثنویاں لکھی ہیں جنمیں بکمال متانت دامن اخلاق سنبھالا ہے ان میں دو تین خار بھی ملتے ہیں جو چشم اخلاق میں بری طرح کھٹکتے ہیں مگر یہ اور جنبہ وہ ہجو کے بادشاہ تھے اور اپنے وقت کے عبید زاکانی، اس سے قطع نظر کر لی جائے تو ان کانٹوں میں اکثر خوشرنگ اور خوشبودار پھول مشام دماغ معطر کر دیتے ہیں اور گلچیں ان خاروں کی خراش کو یک لخت بھول جاتا ہے۔

سودا کی کل مثنویاں جو اب تک مل سکیں حسب ذیل ہیں،

نمبر	صنف	عنوان	کیفیت	نمبر	صنف	عنوان
۱	مثنوی،	قصۂ پسر شیشہ گر		۱۱	مثنوی	ہجو موسے سر
۲	"	شکار نواب آصف الدولہ		۱۲	"	ہجو دولتمند بخیل
۳	"	بطور خط		۱۳	"	ہجو میر ضاحک
۴	"	ایضاً		۱۴	"	ہجو طفل کاڑی باز
۵	"	معانی شعر مولانا روم رح		۱۵	"	ہجو حکیم غوث
۶	"	تعریف چھڑی		۱۶	"	ہجو چیک میرزا فیضو
۷	"	تعریف دیوان مہربانخان		۱۷	"	ہجو میاں فوقی
۸	"	ہجو فیل تربیت سنگھ	دہلی میں لکھی گئی	۱۸	"	ہجو فدوی
۹	"	ہجو فولاد خاں کوتوال	شاہجہاں آباد میں لکھی گئی	۱۹	"	حکایت شخص اہل کمال
۱۰	"	موسم گرما		۲۰	"	بادشاہ و درویش

۲۱	مثنوی، حکایت مرد آزاد		۲۴	مثنوی، عشق درویش
۲۲	" " ہوس درویش		۲۵	" قصہ کدخدائی زن بدصورت
۲۳	" تعریف چاہ مومن خان			

مرزا سودا عشق کو عمدہ نظر سے دیکھنے کے علاوہ عشق مجازی کو عشق حقیقی کا زینہ خیال کرتے تھے چنانچہ ان کی پہلی مثنوی قصۂ عشق پسر شیشہ گر بزرگر ایسی ہی ہے اور نہایت ہی عمدہ اور بہترین مثنوی ہے خاصکر اس مثنوی کا بیان توحید نہایت عمدہ ہے مختصر ساقی نامہ اور بیان توحید کے بعد نعت لکھکر موسم بہار کی تعریف کرکے قصہ شروع کرتے ہیں کہ ایک خدا رسیدہ درویش ان سے ملکر قصد کعبۃ اللہ کرتے ہیں اور میرزا صاحب بھی تیار ہوجاتے ہیں مگر روانگی کے بعد پانچویں منزل کے راستہ میں قزاق ملکر لوٹ لیتے ہیں۔ اور اس بری طرح لوٹتے ہیں کہ پیراہن تک نہیں چھوڑتے درویش کو اپنے سلطان کے لٹنے کا بہت رنج ہوتا ہے اور وہ ایک ایک چیز کی تفصیل کہ کر اس طرح روتے ہیں۔

کبھو عمامہ کے جانے کا مذکور — کبھو تھا فکر پیراہن سے دل چور
سلیمانی کی گہ یاد آتی تسبیح — ہوجاتی تھی جسکے غم سے تشریح
کبھو کہتے مصلا تھا چکن کا — کہ جس پر تھا چکن کار دکن کا
کبھو کہتے کہ یارو کیا عصا تھا — بڑے حضرت کے میرے ہاتھ کا تھا
کہا کیا ٹیکا تھا میری کمر کا — سفر در پیش آیا یہ کدھر کا
عقیق سرخ کا جو نا سداں تھا — اگر بکتا تو قیمت میں گراں تھا

غرض بڑے میاں نے رو دھو کر میرزا صاحب سے کہا۔

ارادہ تھا کہ واں جا کر رہیں ہم — نچاہے گر خدا تو کیا کریں ہم

یہ سنکر مرزا صاحب نے کہا کہ اب گھر جانا بھی ممکن نہیں کیا منہ لیکے جائیں بہتر یہی ہے کہ آگے بڑھیں،

کہا حضرت نے سنکر تم ہو گمراہ — نہیں مسلے مسائل سے کچھ آگاہ
عزم کا قرض ہے معدور پر طوف — گیا یاں مال آگے جان کا خوف

چونکہ بڑے میاں کے مریدان واثق بھی انہیں کے ہم خیال تھے اس لئے میرزا صاحب کو مجبوراً خاموش ہونا پڑا اور جس راہ سے گئے تھے اسی سے لوٹے۔ پہلی منزل پر پہونچ کر بڑے میاں نے قصہ کہانی کی فرمائش شروع کی۔

کہا سودا سے حضرت کو تو ہے خبط — مجھے قصہ کہانی سے ہے کیا ربط
کہوں اک شہر کی میں واردات اب — جو گوش ہوش سے اپنے سنیں سب

اس کے بعد ایک ساقی نامہ لکھکر اصل قصہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شیشہ گر کا لڑکا نہایت ہی حسین جمیل تھا اتفاقاً ایک زرگر کے لڑکے پر مائل ہوگیا اور اس کی حالت بدلنے لگی جسے دیکھکر تعویذ ٹوٹکے شروع ہوئے مگر علامات بھی نہایت ہی خراب۔ ہوتی رہی اور وہ گھر سے نکل گیا، اس کے والدین کی آہ و زاری محلے والوں کی بے قراری مرزا صاحب نے نہایت ہی خاص طریقے سے بیان کی ہے، غرض وہ لڑکا بہت دور چلا جاتا ہے اور ایک منجم کی رہنمائی سے اس کے والدین اسے ڈھونڈھ کر لاتے ہیں مگر گھر آکر بھی وہ وحشت زدہ رہتا ہے اور زرگر کا لڑکا جذب محبت سے متاثر ہوکر شیشہ گر کے لڑکے کے پاس آتا ہے اور دونوں خط بھیج بھیج کر گلے ملتے ہیں خوب خوب [illegible] شکوے ہوتے ہیں، اتنا لکھکر مرزا صاحب فرماتے ہیں

کسی سے میں نے یہ قصہ سنا تھا — ہر اک اظہار سے یہ مدعا تھا
طلب میں وہ جوان اک شیشہ گر کا — ہوا عاشق جو اک زرگر پسر کا
رہا از بسکہ عشق اس کے میں محکم — ہوئے اک روح دو قالب وہ باہم
جو کوئی آپ کو اس طرح کھووے — خدا کا وہ خدا تب اس کا ہووے
ہوا زرگر پسر جوں اس میں موجود — محبت یوں ہو تو ہو عبد معبود
محبت حق کی جسمیں یوں در آئی — کہے ہے بندگی میں یوں خدائی
جو حق کے عشق میں ثابت قدم ہو — مکان دیر بھی اس کو حرم ہو
جو آگے اس کے ہو دیوار یا در — نہ سمجھے حق سے خالی ہے یہ اب گھر
خدا کب عشق کو ان کے مانتے — جو اس کو ہر جگہ حاضر نہ جانے

اسکے بعد کہتے ہیں :-

سنی حضرت نے یارو یہ کہانی — اگر سمجھیں ذرا نکتہ دانی
تو لوں میں دو ڈگر ان کے قدم ہوں — وگرنہ یاں ارادت اپنی معلوم
بھلا تک منصفی کے ہوکے درپے — کہو یارو یہ سچ ہے یا غلط ہے
لگی ہو گر بری تم کو یہ تقریر — تحمل کیجیے سودا کی تقریر

یہ مثنوی نہایت ہی دردانگیز ہے اور ساتھ ساتھ ایک اخلاقی پہلو بھی موجود ہے اور ہجر ان مشایخان عظام کی قلعی بھی اچھی طرح کھولی ہے یہ مثنوی کے بڑی اور (۵۰۰) شعر کی ہے کلام میں سادگی، واقعہ میں صداقت اور سلاست و روانی بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہ ان چیز گنتی کے مثنویوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے جو ادب اردو کی مایۂ ناز ہیں۔

مثنوی دربیان عشق درویش زادیہ نشیں، افسوس ہے کہ میرزا صاحب نے اس مثنوی کا کوئی نام ہی نہ رکھا بلا کسی عنوان کے بسم اللہ لکھکر شروع کر دیا۔ ابتدا میں ۱۲ شعر بطور مناجات کے کہے ہیں جسمیں درد دل طلب کیا ہے یہ بہترین مناجات ہے ہر ایک مصرع درد میں [illegible] ہوا ہے۔

اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی صاحب دل کا پر اثر کلام ہے حمد میں (۱۱) اور نعت میں (۱۰) شعر لکھکر ایک چھوٹی سی (۴۲) شعر کی مناجات کے بعد قصہ شروع کیا ہے کہ ایک صاحب دل درویش آبادی سے دور ایک قطعہ جنت نظیر میں تنہا رہا کرتے تھے اتفاقاً ایک بارات جاتی ہوئی وہاں ٹھیری، دلہن کی ڈولی بھی شاہ صاحب کی منڈلی کے قریب رکھی گئی جب لوگ ادھر ادھر ہٹ گئے تو دلہن نے گرمی سے آکتا کر ڈولی کا پردہ اٹھا ادھر ادھر دیکھا شروع کیا اتفاقاً شاہ صاحب کی نظر ہی اسپر پڑ گئی اور وہ دل دے بیٹھے۔ جب برات روانہ ہوئی تو شاہ صاحب بھی اٹھکھڑے ہوئے اور دور تک اسے بصد آہ وزاری حسرت وافسوس دیکھا کئے جب برات نظروں سے اوجھل ہونے لگی تو آپ ایک درخت پر چڑھ کر معائنہ کرنے لگے جب یہاں بھی نظر نے جواب دیدیا تو آہ کر کے درخت سے گر پڑے جسد خاکی زیر درخت پڑا رہا اور روح برات کے ساتھ ہوگئی۔ شاہ صاحب کے معتقدوں نے وہیں دفنا دیا جہاں کہ وہ رہا کرتے تھے، عشق کا یہ اثر بھی دیکھئے کہ دلہن گھر پہونچکر رونے پیٹنے آہ وزاری کرنے لگی، ہزاروں گنڈے کئے گئے مگر کچھ نہ ہوا آخر دولہا والوں نے دلہن کے والدین کو اطلاع کی اور وہاں سے لوگ لینے کے لئے آئے جب وہ دلہن کو اپنے گھر لے چلے تو ایک بوڑھی دلالہ بھی دلہن کی ڈولی کے ساتھ ہوگئی یہی شاہ صاحب کے مزار کے پاس پہونچکر اس نے سب کو رائے دی کہ تھوڑی دیر یہاں ٹھہرنا چاہئے ممکن ہے کہ کھلی ہوا سے دلہن کو تسکین ہو غرض ڈولی رکھی گئی اور سب لوگ ٹھہر گئے۔ دلہن تڑپ کر ڈولی سے نکل پڑی اور شاہ صاحب کی قبر پر آئی جوں ہی وہ قبر پر پہونچی قبر شق ہوئی اور وہ ہمیشہ کے لئے شاہ صاحب سے وصل ہوگئی۔

اسی صورت سے یہ غلطان بھی کچھ دور	کہ جذب عشق نے ٹکڑے کی نہ گور
اٹھا در دول اس جا کہ کچھ ایسا	نظر آتا جسے کہتے ہیں کیسا
نجانے پھر کہ واں کا حال کیا تھا	یہی وہ گور تھی یا اژدہا تھا
کہا جن نے تامل ایک دم میں	لیا اوس ناز پرور کو شکم میں
ادسے اوس گور نے اس طرح کھایا	نہ ماہی بیچ یونس یوں سمایا

دلہن کے رشتہ دار روتے پیٹتے واپس ہوگئے چند شعر قصہ کے متعلق اور اپنی کاوش طبع کا تذکرہ کر کے میرزا صاحب نے مثنوی ختم کر دی ہے یہ مثنوی بھی اخلاقی مثنوی ہے اور عشق مجازی کی حقیقی داستان کہلانے کی مستحق، اس مثنوی کے کل شعر (۳۶۲) ہیں

مثنوی کدخدائی دوست۔ یہ مثنوی بھی طویل اور اخلاقی ہے مگر نام ندارد قصہ یہ ہے کہ مرزا صاحب کے ایک دوست مدت کے بعد ملتے ہیں مگر انکی حالت بدلی ہوئی نظر آتی ہے یعنے

دیکھتا کیا ہوں کہ عالم اور ہے	گرد رخساروں کے خط کا دور ہے
ٹک دہواں سا اٹھ رہا ہے آگ سے	اڑ گئے ہیں جیسے منہ کے بھاگ سے
نے وہ شوخی نے وہ لڑکا پن رہا	نے وہ صورت ہے نہ وہ جوبن رہا

پڑ گئیں ہیں منہ کے اوپر جھائیاں ناک پر بھی آ گئی ہیں سیاہیاں
چہرہ مسّوں سے ہے سارا بدنما رنگ منہ کا اڑ گیا جیسے ھُما
چاند پر بادل کہ جیسے چھا گیا مور جیوں مغربی کوں کھا گیا
منہ پہ سبزی اور سیاہی تم گئی جس طرح پانی پہ کائی جم گئی
ہو گیا اک مرتبہ ہی سبز رنگ جیسے آئینے کو کھا جاتا ہے زنگ

مرزا صاحب وجہ پوچھتے ہیں تو وہ کہتا ہے

بیاہ کے کرنے سے ہوتی ہے خوشی میں نے دیکھا تو یہ ہے مردم کشی
جب تلک اک عالم تجرید تھا ہمکو جو دن تھا سو روز عید تھا

یہ کہکر اپنی شادی اور دلہن کی زشت روئی کا تذکرہ بڑی ہی متانت سے کرتے ہیں اور کہتے ہیں

لوگ تو خورسند اور خرم ہوئے اک گرفتار مصیبت ہم ہوئے

اس کے بعد بیان کرتے ہیں کہ جب چند روز یکجائی رہی تو ان کی نیک بخت نے پوچھا۔

جس سے آپ فرمائے اس سے چھپوں! کس کے آگے رہیں اور کس سے چھپوں؟

یہ سنکر آپ فرماتے ہیں

جان میری ہو جیسے سب کے حضور ایک اس عاصی سے رہئے دور دور
اپنا منہ سارے قبیلے کو دکھاؤ پر خدا کے واسطے مجھ سے چھپاؤ
یہ تو سلیدی سے کہیں یارب مرے ایسا تیسا ہو جو بیاہ اب پھر کرے

یہ سنکر مرزا صاحب اپنے دوست کو ایک طویل نصیحت کرتے ہیں کہ ہر ایک کو خداوند عالم نے بنایا ہے اور کسی بدصورت پر اعتراض کرنا اس صانع یعنی خداوند عالم پر معترض ہوتا ہے، اور پھر کہتے ہیں کہ حسن عارضی ہے مثلاً تم ہی ایک زمانہ میں حسین تھے مگر اب غور کرو کیا ہو، پھر مرنے والے حسینوں کا ذکر کر کے سمجھاتے ہیں،

آدمی کو چاہئے وارستگی ہو صورت فانی سے کیا دلبستگی ہو

اس مثنوی سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان مدت سے یہ رونا رو رہے ہیں خدا مشاطہ کا بھلا کرے ان کے طفیل میں کیا کیا مصیبتیں نہیں نازل ہوتیں،
اس مثنوی میں سودا کے خیالات کا حقیقی پہلو تو نظر آتا ہے اور ان کے اعتقادات کی جھلک بھی نمایاں ہے۔ یہ (۱۱۰) شعر کی مثنوی انکی کلیات کی آخری مثنوی ہے۔ مثنوی در تعریف شکار نواب آصف الدولہ ؎

سر صفحہ یہ آج یوں صبح دم لگا دست سودا میں کہنے قلم

جو اس عہد میں ہند کا ہے وزیر　　　بہمت جوان و بتدبیر پیر
یہ ہے آصف الدولہ جسکا ہے نام　　　سلیماں شکوہ و ذوی احتشام

کہکر آصف الدولہ کے شکار کی تعریف کی ہے، تمام درندے، پرندے، جانوران آبی سب کو شکار کرا دیا ہے، آخر میں ہاتھیوں کو زندہ لانے کا تذکرہ کیا ہے۔

نگرواں سے جیتے کئی پیل لائے　　　سو حلقہ بگوش اس کے وہ ہو کے آئے
سبھی پیل ہرچند محبوب ہیں گو　　　سواری کی خاطر بہت خوب ہیں
پر اک پیل کا ان میں ایسا جمال　　　زبان وصف میں جسکے میری ہے لال
کبھو پیل ایسا بچشم جہاں　　　نہ آیا نظر زیر نہ آسماں
وہ ہے قد و قامت میں اتنا بلند　　　لگا کہنے دیکھ اس کو ہر ہوشمند
بدانست اپنے یہ ہاتھی نہیں　　　ہوا دیکھ اسکو مجھے بالیقین
رہے جب نہ واں صید سو سو کروہ　　　تو زنجیر کو کھینچ لائے ہیں کوہ
نہیں اسکی خوبی میں ذرہ قصور　　　خدا چشم بد سے رکھے اسکو دور
ترے سائے میں یہ جئے تا ابد　　　تجھے پرورش کی رہے اسکے کد

اس مثنوی کے کل (۳۵) شعر ہیں جو مختصر اور دلچسپ ہیں۔

مثنوی بطور خط۔ یہ مثنوی کسی خاں صاحب کو بطور خط لکھی گئی ہے اسمیں اپنی محبت اور دوری (۳۸) شعر میں دل کھول کر بیان کی ہے شعر پر درد اور عمدہ ہیں۔ مثنوی دوم بطور خط یہ بھی مثنوی کسی کو بطور خط لکھی گئی ہے

پہلے پہونچے میری طرف سے سلام　　　کہ یہی ہے طریقۂ اسلام

سے شروع کیا ہے یہ خط جو آیا لکھا گیا ہے (۱۹) شعر میں بڑے مزے کی مثنوی کہی ہے مثنوی دربیان معانی بیت مثنوی شریف۔ مولانا روم کے اس شعر

ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام　　　ہفصد و ہفتاد قالب دیدہ ام

کی تشریح کی ہے۔

مدعا اسکے سے ہے نشو و نما　　　ہر جگہ کرنا خودی سے ہو فنا
ہے غرض قالب سے دل ہر ایک کا　　　خلقتِ خالق میں بد اور نیک کا
سیکھے تا انساں سے تا وحش و طیر　　　دیکھنی قالب سے مطلب اسکی سیر
یوں کلام مولوی دے ہے خبر　　　یعنی میں جب دل میں دیکھا بیٹھکر

صغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ کے عطر حنا کا نسخہ کسی دوسرے عطر ساز کو دستیاب نہ ہو سکا

کچھ نظر آیا نہ غیر از اسکی ذات　　　اس قدر پایا محیط کائنات
معنی ہم اس شعر کے سمجھے ہیں یوں　　　اور کی فہمید میں کچھ اور ہوں

اس مختصر مثنوی میں صرف (۳۴) شعر ہیں۔

مثنوی در تعریف چھڑی۔
ہوتی ہے دنیا میں جو کچھ تحفہ چیز　　　سب سے ہے سودا کو یہ لاٹھی عزیز
کھینچ نہ سکئے جہاں شمشیر و تیغ　　　اسکو لگا بیٹھئے واں بے دریغ
اتنا کم آزار اور ایسا شفیق　　　اور بھی کوئی ہے کسی کا شفیق
چوب نہیں، لیک خوش خو ہے یہ　　　یار ہے یہ قوتِ بازو ہے یہ

غرض (۲۵) شعر چھڑی کی تعریف میں کہے ہیں اس کے خاندان کی تفصیل بھی ظاہر کی ہے آخر میں کہتے ہیں -

لکڑی کی نسبت سے تو معذور ہے　　　آدمی ہونا تو بہت دور ہے

مثنوی در تعریف دیوان مہربان خان - یہ مثنوی مہربان خان کے دیوان اور اشعار اور ان کی سخاوت و ہمت کی تعریف میں کہی گئی ہے (۱۴) شعر کہے ہیں مگر صرف دوستی میں صلہ کے لئے نہیں چنانچہ خود ہی کہتے ہیں -

لیکن اس نظم سے نہ سمجھیو تو تو　　　کہ صلہ سے غرض ہے سودا کو
اس سے رکھتا ہے یہ دل مہجور　　　مہربان دوستی تیری منظور

اس مثنوی میں اصناف شعر پر بھی مختصر نظر ڈالی ہے۔

حکایت (۱) "مرو اہل طریق" کی حکایت نظم کی ہے کہ وہ جب کسی مجلس میں بیٹھتا تو مکھی نہ اڑاتا تھا کسی نے سبب پوچھا تو کہا

تا کز محنت دیگراں بے غمی　　　شاید کہ نامت نہند آدمی

یہ (۱۱) شعر بالکل ناصحانہ انداز میں کہے گئے ہیں اور حق یہ ہے کہ نہایت ہی عمدہ ہیں نصیحت کا طریقہ دیکھو کتنا دلچسپ ہے۔

حکایت ۲ - اس کے بعد اور ایک حکایت نظم کرتے ہیں کہ شاہان عجم میں سے ایک بادشاہ "درد قولنج" میں مبتلا ہوگیا، ہزاروں علاج کئے مگر شفا نہ ہوئی آخر میں ایک فقیر نے بادشاہ سے ایک اقرار نامہ اس مضمون کا لکھوا کر کہ شفا ہو جائے تو سلطنت دے دیگا۔ دعا کی اور بادشاہ تندرست ہوگیا جب بادشاہ ـــــ کو شفا ہوگئی تو اس نے درویش سے سلطنت کا بار سنبھالنے کو کہا۔

کہا مرد درویش نے اے عزیز　　　اسے چاہئے شخص پر بے تمیز
کہ خواہش میں اس سلطنت کی دہر جان　　　کہ البتہ اک گو نہ ہے زندان
یہ دنیا جہاں جاے رنج ہے　　　عبث دل ترا اسکا بند ہے

مسلم ہو اجب کہ ہونا ہلاک — چہ بر تخت مردن چہ برروئے خاک

یہ (۲۳) شعر کی مثنوی پُر اثر دلچسپ اور ناصحانہ ہے، ان حکایتوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کے اعتقادات کیا تھے اور خیالات کیسے ؟

حکایت ۳ - یہ مختصر سا قصہ ہے کہ ایک شخص آزاد مزاج جب تک گھر میں رہتا کواڑ بند کر لیتا اور جب باہر جاتا تو دروازے کھول کر چلا جاتا تھا اس حکایت کے (۱۷) شعر ہیں

حکایت ۴ - ایک ہوس کا قصہ بڑا عجیب نظم کیا ہے کہ وہ کیمیا کا شائق تھا ایک درویش کے پاس جا کر اس نے کیمیا کا نسخہ مانگا درویش نے نسخہ بتلا دیا اور کہا کہ جب نسخہ بنانے بیٹھو تو بندر کا خوف یا خیال دل میں نہ آنے دینا ورنہ نسخہ نہ بنے گا، ہوس نے کہا یہ بات ممکن نہیں جو خطرہ دل میں ہو وہ کہیں نہ جائے گا اگر آپ کو نسخہ بنوانا ہی تھا تو اس سے آگاہ ہی نہ کیا ہوتا کہ بندر کا خطرہ نہ لاؤ مگر۔

نہ سمجھا غرض اس کے رمز و نکات — کہ پردے میں تھی مرد عارف کی بات

کہ جب دل کو خطرے پہ قادر کیا — تو پھر ہیچ ہے خطرۂ کیمیا

مثنوی در تعریف چاہ مومن خان - مومن خان کی چاہ کی تعریف میں (۱۸) شعر کہے ہیں شروع میں پل و مہمان سرا و مسجد و چاہ بنانے کی ترغیب دی ہے تاکہ نام باقی رہے، یہ بالکل معمولی مثنوی ہے، ان مثنویوں کے بعد ہجویں ہے جسکے مرزا صاحب بادشاہ تھے، چونکہ یہ ہجو بھی مثنوی کی بحر میں ہیں اس لئے انھیں بھی مثنوی کی تحت میں شمار کیا جاتا ہے انشاء اللہ مرزا صاحب کی ہجو پر ایک مستقل مقالہ سپرد قلم کیا جائیگا۔

مثنوی در ہجو فیل راجہ نرپت سنگھ - خود سرائی سے تمہید کا آغاز ہے اور پھر راجہ کے ہاتھی کا بیان - وہاتھی کے عیوب ہاتھی میں دکھلائے ہیں اور اسکی لاغری کی بہترین تصویر کھینچی ہے -

علامہ آزاد تحریر فرماتے ہیں کہ "مرزا نے جو راجہ نرپت سنگھ کے ہاتھی کی ہجو میں مثنوی لکھی ہے اس کے جواب میں بھی کسی شخص نے مثنوی لکھی ہے اور خوب لکھی ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں ؎ تم اپنے نیسل منہ کو نکالو ذرا — مرے ہاتھی سے دو ٹکر لڑا لو ذرا

مگر افسوس ہے کہ یہ جوابی مثنوی نہ ملی ورنہ بڑی اچھی چیز تھی - مرزا صاحب کی یہ ہجو (۷۰) شعر کی ہے اور خوب ہے بڑی بات یہ ہے کہ عریانی کا زیادہ دخل نہیں ہے -

مثنوی در ہجو شیدی فولاد خان کوتوال شہر شاہجہان آباد - یہ بڑی دھوم دھام کی ہجو ہے معلوم نہیں فولاد خاں نے مرزا صاحب سے کیا گستاخی کی تھی جسکا خمیازہ یوں بھگتنا پڑا، فولاد خاں کی رشوت ستانی اور چوروں کی سینہ زوری خوب بیان کی ہے (۱۷) شعر کوتوال ہی کی ہجو میں ہیں آخر میں بکمال انصاف فرماتے ہیں - یہ جو سودا سبک ہے لایعنی — آپ کرتا ہے وزد دیں معنی

مثنوی موسم گرما - یہ بھی ہجو یہ مثنوی ہے جس میں (۸۱) شعر موسم گرما کی ہجو میں کہے ہیں، حق یہ ہے کہ خوب کہے ہیں خزاں کی تصویر کھینچکر رکھدی ہے -

مثنوی در ہجو موسم سرما - یہ ہجو بڑی پرکیف ہے ذرا انہماک سے مطالعہ کیجئے تو مارے سردی کے دانت بجنے لگیں نہایت ہی فراخدلی سے ۴۵ شعر ایسے گرم لکھے ہیں کہ سردی کا سماں سامنے آجاتا ہے -

سودا آخر ہے سردی کا مذکور　　شعر بھی گر خنک ہوں رکھو معذور

آگے جاتا نہیں ہے اب بولا　　ہوگئی ہے زبان بھی اولا

مثنوی در ہجو امیر دولتمند - یہ مثنوی حمد سے شروع ہوتی ہے ، شعر کہکر فرماتے ہیں ،

سنو یارو کروں ہوں میں اک نقل　　جسکو باور کرے نہ ہرگز عقل

اپنے ایک دوست کی حکایت فرماتے ہیں کہ وہ کسی ملنے والے کے گھر گئے اتفاقاً وہاں پہونچتے ہی ابر امنڈ آیا جسکو دیکھکر صاحب خانہ سخت گھبرایا۔

نہ خبر ان کی پوچھی نہ احوال　　بیٹھتے ہی کیا یہ انسے سوال

کچھ ہوا ہر بھی تم رکھو ہو نگاہ　　گھونگھڑی بٹو کچھ بھی ہے ہمراہ

انھوں نے کہا کہ مجھے بارش کا حال معلوم نہ تھا ورنہ میں ضرور لاتا ، مگر صاحب خانہ اسپر بھی نہ سمجھے جھٹ "باران" لاکر سامنے رکھدی مگر مہمان بھی ترسے کو رہے ہی نکلے انھوں نے جانے کا نام ہی نہ لیا بلکہ وہیں سونے کی ٹھان لی یہ معلوم کرکے بخیل میزبان کی جان ہی تو نکل گئی جب پانی نہ تھما تو دعا کرنے لگے کہ اس قدر بارش ہو کہ دنیا غرق آب ہوجائے مگر افسوس کہ یہ بھی نہ ہوا ، تو چاچار بیٹھکر باتیں کرنے لگے جب کھانے کا وقت آیا تو "جائے ضرور" میں آفتابہ رکھواکر خود تشریف لے گئے اور مہمان کے کان میں کہدیا کہ -

چاہو جو کچھ کہ اب تناول کو　　کہدو بلوا کے اب بکاول کو

مہمان نے بکاول کے لئے "فریاد" شروع کی جو بعد از سماجت بسیار" آیا تو مہمان صاحب نے پوچھا کہ کچھ تیار ہے ؟

بولا تیار تو نہیں ہے کچھ　　جاؤں ڈھونڈوں اگر کہیں ہے کچھ

تو تو لاؤں ہوں آپ کی خاطر　　ورنہ کہاؤ مجھے میں ہوں حاضر

بولے یہ کچھ اگر نہیں تیار　　دیکھو ہووے گا مودی سرکار

اس سے تم جا کے جنس منگواؤ　　واسطے میرے کچھ تو پکواؤ

لگا کہنے وہ کون مانے ہے　　آپ ہی بھڑوا خاک چھانے ہے

جب کہ اس کا حساب ہوتا ہے　　جان کو وہ برداں کی روتا ہے

اور قصاب بھی جو آدے ہے　　چھری لیکر اب مجھے بتادے ہے

اسی طرح بخیل دولتمند کی ہجو کرکے ایک قصہ بھی کہتے ہیں کہ اس کا ایک بیٹا تھا جسنے اپنے ایک دوست کی ضیافت کی اور وہ بھی" اک رکابی طعام دو نگیر" بس

اسپر دولتمند کا بگڑنا اپنی بیوی اور بیٹے پر خفا ہونا بڑے مزے سے بیان کیا ہے بہرحال بخیل کی ہیئت بھر کر ہجو کی ہے نسبتاً اور ہجوؤں کے یہ ہجو زیادہ مہذب ہے۔

"مثنوی در ہجو میر ضاحک" - میر ضاحک سید اور امام ہادی کی اولاد سے تھے۔ پرانی دلی کے شریف اور باوضع بزرگوں میں شمار ہوتا تھا محض سودا کی ہجوؤں کی وجہ سے اب تک میر صاحب کا نام باقی ہے ورنہ ان کی اپنی کوئی چیز ایسی نہیں جو باعث شہرت ہو۔ بعض لوگوں کو سودا پر اعتراض ہے کہ انھوں نے ایک سید کی ہجو کہی مگر واقعات بتلاتے ہیں کہ پہل مرزا صاحب سے نہیں ہوئی۔ علامہ آزاد فرماتے ہیں۔ "سودا نے جو ان کے حق میں گستاخی کی ہے اس کا سبب یہ ہوا کہ کسی موقع پر انھوں نے سودا کے حق میں کچھ فرمایا۔ سودا خود ان کے پاس گئے اور کہا آپ بزرگ ہیں میں خورد، آپ سید ہیں میں آپ کے جد کا غلام عاصی اس قابل نہیں کہ آپ اس کے حق میں کچھ ارشاد فرمائیں ایسا نہ کیجئے گا کہ مجھ گنہگار کی منہ سے کچھ نکل جائے اور قیامت کے دن آپ کے جد کے سامنے روسیاہ ہوں تلامیذ الٰہی کے دماغ عالی ہوتے ہیں ان کی زبان سے نکلا کہ نہیں بھئی یہ شاعری ہے اس میں خوردی اور بزرگی کیا؟ سودا آئیں تو جائیں کہاں پھر جو کچھ انھوں نے کہا زمانہ سنوائے یہ بھی بزرگوں سے سنا کہ مرزا نے جو کچھ ان کے جواب میں یاوہ گوئی کی ہے میر موصوف نے اس سے زیادہ خراب و خوار کیا لیکن وہ کلام عجیب طرح تباہ ہوا، میر حسن مرحوم ان کے صاحبزادے سودا کے شاگرد تھے میر ضاحک کا انتقال ہوا تو سودا فاتحہ کو گئے اور دیوان اپنا ساتھ لیتے گئے، بعد رسم عزا پرسی کے اپنی یاوہ گوئی پر جو اس مرحوم کے حق میں کی تھی بہت عذر کئے اور کہا کہ والد مرحوم نے دنیا سے انتقال کیا تم فرزند ہو جو کچھ اس روسیاہ سے گستاخی ہوئی معاف کرو۔ بعد اس کے نوکر سے دیوان منگوا کر جو ہجویں ان کی کہی تھیں سب چاک کر ڈالیں میر حسن نے بہ مقتضائے علو حوصلہ و سعادتمندی اسی وقت دیوان باپ کے گھر سے منگایا اور جو ہجویں ان کی تھیں وہ پھاڑ ڈالیں لیکن چونکہ سودا کی تصنیف قلم سے نکلتے ہی بچہ بچہ کی زبان پر تھیں اس لئے قائم رہیں، انکا کلام اسی مجلد کے اندر تھا جو مفقود ہو گیا"

مرزا نے دل کھول کر میر ضاحک کی ہجویں کہی ہیں۔ اس ہجو میں میر صاحب کو "بیٹھ" قرار دیا ہے اور انکی "جوع البقر" "بے حیائی" وغیرہ کا تفصیلی منظر دکھایا ہے یہ ہجو یہ مثنوی بھی طویل ہے۔

"مثنوی ہجو طفل لکڑی باز" گو یہ ایک ہجو ہے مگر بہترین ناصحانہ مثنوی ہے ——— اس سے بہتر اندازِ نصیحت شاید ہی ہو سکتا ہے۔

نالے پر ایک لڑکا رہتا تھا	باپ سے یہ روز کہتا تھا
موٹے جامے سے مجھکو ذوق نہیں	چھوڑتے جبہ کا دلکو شوق نہیں

اپنی فرمائشات کی طویل فہرست گنا کر لڑکا کہتا ہے،

جو کہ جاگیر سے اب آتا ہے	سب ترے خرچ بیچ جاتا ہے
تو پیئے ہے شراب و بھنگ و افیم	اب خدا کا بھی کچھ ہے تجھکو بیم

لے ہے نقدی کے بیسے آپ تمام　　اسمیں سے بھی مجھے نہ دیا کدام
مجھ سے بیٹے کو روز چھ پیسے　　سو بھی دے ہے فقیر کو جیسے

جب سعادت اطوار نے باپ کی تمام بُرائیاں بیان کردیں تو اس نے جواب دیا،

ہم غریبوں کی دال روٹی ہے　　گاہ پتلی ہے گاہ موٹی ہے
موٹا کپڑا ہے تاش سے بہتر　　در بدر کی تلاش سے بہتر

بزرگوار نے بکمال پسر نوازی ایک اور ترکیب بھی تبلادی،

اپنے اوپر کسی کو کر عاشق　　یا ہو وہ پاکباز یا فاسق
نخرے سے اس کی گود میں جالیٹ　　کھول چھاتی کو اور دکھا کر پیٹ
جب تو جانے وہ ہو چکا محکوم　　چاہ اس کی ہو تجہ اپر معلوم
مانگ تیار اس سے چڑھنے کو گھوڑا　　تب ہے کس بات کا تجھے توڑا
تب تو بیٹا یہ بولا ہو کڑوا　　ہاے یارو یہ باپ یا بھڑوا

برخوردار اسیطرح کی چند اور مغلظات سناتے ہیں اور بزرگوار نے ؎　　غرض ان سے یہ گالیاں کھاکر　　دہی چھ پیسے پھر دئے لاکر
یہ کہکر مرزا فرماتے ہیں ؎　　دیکھو یارو عجب زمانہ ہے　　بیٹے سے باپ کیا یگانہ ہے
باپ سے بیٹا نا امید ہوا　　خون دنیا کا کیا سفید ہوا
الغرض باپ سے وہ ہو کے جدا　　ملنے لاگا ہر ایک سے جا جا
تھے محلے کے بیچ کئی عشاق　　جنمیں تھے مرزا معنت برجی طاق

یہ سعادت مند مرزا معنت کی تعلیم میں جانے لگے اور انھوں نے کشتی سکھانا شروع کیا مگر اسی کشتی میں ایک داؤں ایسا باندھا کہ کہتے نہ بنے گو بہت سمجھایا منایا مگر ایک پیش نہ گئی اور لڑکا یہ کہتا ہوا وہاں سے نکلا،

سنو اے لڑکو ہو نہ راہ سے گم　　اس نصیحت کو گوش جان سے تم
باپ کے گھر کی چاٹ کر چٹنی　　کرو گذران یارو تم اپنی

گو یہ مثنوی کسی قدر عامیانہ ہے مگر کشتی گیروں کے طبقے کا سچا فوٹو اور ایک ناصحانہ نتیجہ خیز مثنوی ہے

"مثنوی در ہجو حکیم غوث" نہ جانے یہ حکیم غوث کون تھے در مرزا صاحب ان سے خفا کیوں ہو گئے تھے کہ ایک مثنوی ہجو میں رادی، شعر کی کہنہ حکیم جی کا حلیہ کس متانت سے بیان کرتے ہیں ؎　　شکل ہے شیطان کی اور غوث نام　　جگ میں بلا کو کاٹ تا ہُم مقام

حکیم جی کا ایک ادنیٰ سا معجزہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ کسی درد سر کے مریض کو دیکھکر دق تجویز کر دیا اور نسخہ میں معجون زرانبا دلکھ دی اور ایک شخص کی نبض دیکھکر قبض کہا اور سفوف بہیو دلکھ مارا۔

اور غذا اس کو یہ بتلائی درست ماش کی روٹی سے تو کھا ساگ پوست

صاحب پیچش کو بتلا یا کٹول واسطے ہیضے کے لکھا اسپغول

کہدیا مجنون کو شیر شتر کہدیا مستسقی کو جا فصد کر

دیکھا جو ان نے کہ غذا کیا کہی ساتھ گلتھی کے کہا کھا دہی

اسطرح اور بہت سے معجزے لکھے ہیں، اور آخر میں ایک مریضہ کا ذکر کیا ہے جسے دیکھکر حکیم جی لقوہ اور فالج تجویز کرتے ہیں اور خوب پٹتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ واقعات ہوں اب بھی بعض جگہ ایسے حکما حکمت شعار وطبابت آثار نظر آتے ہیں۔

مثنوی در ہجو چپک مرزا فیضو۔ میرزا فیضو کے چپک مر گئے تو شخاسے نے جگ کے ویران کر گئے

تمام پرندوں کے نام لیکر ان کے جوشی منانے کا تذکرہ کیا ہے اور مرزا کی بے چارگی اور مفلسی کا حال بھی لکھا ہے آخر میں چپک کی تعریف اس طرح کی ہے

کیا کہوں چپک تھے یا باشین تھے باز کے بچے تھے یا شاہین تھے

اور آخر میں مرزا جی کو پرسا بھی دیا ہے یہ ہجو یہ مثنوی (۷۹) شعر کی ہے معلوم نہیں اب چڑی مار سے کیوں بگڑ بیٹھے جو غریب کی ہجو کہدی اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کو پرندوں کے متعلق بھی اچھے معلومات تھے اور شکاریوں سے بھی خوب واقف تھے

مثنوی در ہجو میاں فوقی۔ علامہ آزاد اس ہجو کے متعلق تحریر فرماتے ہیں کہ "ہجوں میں ایک ساقی نامہ ہے جسمیں فوقی شاعر کی ہجو ہے اصل میں قیام الدین قائم کی ہجو میں تھا وہ بزرگ باوجود شاگردی کے مرزا سے منحرف ہو گئے تھے، جب یہ ساقی نامہ لکھا گیا تو گھبرائے اور آخر کار خطا معاف کروائی مرزا نے انکا نام نکال ڈالا اور فوقی ایک فرضی شخص کا نام ڈال دیا" پہلے ایک ساقی نامہ کہا ہے اور پھر میاں فوقی کو میدان میں آنے کی دعوت دی ہے اور پھر ان کے سرقہ کا تذکرہ کر کے کہا ہے کہ آپ کی ایک غزل میرے پاس موجود ہے۔

مولانا روم کے دو شعر۔ بشنو از نے چو حکایت میکند وز جدائی ہا شکایت میکند

کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند وز نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

کہکر بعض نہایت ہی درد انگیز شعر کہے ہیں یہ (۱۲۰) شعر کی مثنوی ہو آخر میں فوقی کے شعر بھی دے گئے ہیں اور اس کے سرقہ کا تذکرہ کیا گیا ہے

مثنوی در ہجو فدوی پنجابی۔ علامہ آزاد فرماتے ہیں کہ فدوی اصل میں ہندو تھے مکند رام نام تھا۔ مسلمان ہو گئے تھے پنجاب وطن تھا علم کم مگر طبیعت مناسب تھی شعر اردو کہتے تھے۔ ماہر علی شاہ کے شاگرد تھے اور فقیرانہ وضع سے زندگی بسر کرتے تھے مشاعرہ میں جاتے تو کبھی بیٹھ کبھی کھڑے ہی کھڑے غزل پڑھتے اور چلے جاتے تھے۔ جب انھوں نے قصیدہ کہا تو بادشاہ نے ہزار روپیہ نقد اور گھوڑا اور تلوار

انعام دی ان کا بھی دماغ بلند ہوا اور دعویٰ ملک الشعرائی کا کرنے لگے کچھ مرزا پر اعتراض کئے اس پر مرزا نے الو کی اور بنئے کی ہجو کہی، انجام کو طرفین کی ہجویں حد سے گزر گئیں، مرزا نے جو کچھ کہا وہ بچے بچے کی زبان پر ہے انھوں نے جو کہا وہ ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملتا، انھیں میں سے ایک شعر ہے کہ فدوی کی طبع موزوں سے مرزا صاحب کی شان میں واقع ہے۔

پھکٹ گئی ہے پیٹی کچھ کٹ گیا ہے ڈورا　　دم داب سامنے سے وہ اڑ چلا لٹورا

یا یہ کہ بچھڑا ہے تتر ا ہے سوا اسے ہوا ہے، مرزا صاحب نے ایک حمد یہ شعر کہکر بچ بوٹ کی تلقین کرتے ہوئے فدوی کا تعارف اس طرح کرایا ہے ؎

واحد احمد نگر ایک ہیں مرد عزیز　　تم ہیں سرتاقدم اور سراپا تمیز

اس کے بعد ان کے اعتراضات کا تذکرہ کیا ہے اور پھر ان کے اعتراض کا جواب دیا ہے، اور ایک نقل لکھی ہے کہ ایک شخص کسی بنئے کا قرضدار تھا اور بنئے کے تقاضوں سے تنگ آچکا تھا اتفاقاً ایک الو اس کے ہاتھ لگا اور اسے باز کی طرح ہاتھ پر بٹھا کر بنئے کی دوکان کے سامنے سے چکر کاٹنا شروع کیا، اس آدمی کی اور بنئے کی گفتگو نہایت ہی مزے سے بیان کی ہے مارواڑیوں کی اردو کا نہایت ہی صحیح نمونہ دیا ہے فرماتے ہیں ؎

ہنسکے لگا پوچھنے کہ ہے جی یہ جانور　　پر کہاں ہمسے کھوے چلے اس کو کدھر

جب بنئے سے کہا جاتا ہے کہ یہ باز ہے اور بادشاہ و وزیر اس سے شکار کھیلتے ہیں تو ؎

ہنسکے کہا بنئے نے یہ مرگ ہے یہ اپنی بہا ل　　سانچ کہو پر کہاں باج اسکا ہے ناؤں

جب بنئے نے خوب پوچھ کوچھ کر لی تو گھر گھر باز کا بھاؤ دریافت کرنا شروع کیا ؎

سانچ بتاؤ مجھے باج کا کے بھاؤ ہے　　ایک خریدار کو اس کا گاہنا یاد ہے

باز کی قیمت دریافت کرکے بنئے نے باز کا خریدنا طے کر لیا اور رات کو اپنی بیوی سے مشورہ کرنے لگا،

بیٹے میرے گھر تی ہیں ایک سپاہی پاس　　اسکے خریدنے کی تجھکو ہیں ہے اب آس

باج بڑا ہی سا ایک کچھا ہیرا ہے ر کنے　　اسکو خریدوں میں اب کال کو جوڑ ہ نے

بولی بنینی یہ سن اوت تجھے گھیر ہے　　اسکو سولی ہے ناس جس ہیں بیر ہے

ہنسکے کہا بنئے نے کے کہی یہ تینے بات　　ناہ ری پر بہادتی رام کرن دو دیہات

بولی یہ جو سانچ ہے لاکے سر تو سویر　　تھوڑے گہنے کو نہ سوچ جو کچی تو بیچ گھیر

جورو کے مشورہ کے بعد صبح صبح سیٹھ جی بغل میں بہی دابے کان پر قلم رکھے سپاہی کے گھر جو پہنچ گئے اور لڑ جھگڑ کر تین سو روپیہ کو باز خرید لیا اور گھر لاکر جورو سے کہا،

دیکھ تو پر بہادتی پر کھاکے باج ہے　　رام جی کے کھیل سے آج ہمیں راج ہے

دیکھ کے اوت نے کہا اوت تجھے لوٹ　　یہ تو جناور ہے وہ ترا کہیں جسے بوم

نانوں نہیں یوہیں پرتھی ہیں اکا سیر　　کھویا گرچ سا تھ تین نکد رو پیونکا ڈھیر

یہ سنتے ہی سیٹھ جی سپاہی کے گھر پہونچے مگر یہاں رکھا گیا تھا وہ تو گھر سے غائب ہو چکا تھا اب سیٹھ جی روتے پیٹتے لوٹے اور کہنے لگا ہائے وہ کیا یہ دگا دگیا　　سو نکدا ور دو کی جتس گھرسی جھپٹ لے گیا

جب خوب رو پیٹ چکے تو کھونٹی پر الو بٹھا دیا، اور آپ دوکان پر بیٹھ گئے کوئی کچھ لینے آتا تو نہایت ہی متانت سے فرماتے،

ساچ تھا میری بات لینے پچھ بی تو ہے　　سب ہے دیارام کی یہ بہی ہی الو ہی ہے

یہ نقل بیان کر کے مرزا صاحب کہتے ہیں کہ کسی نے باز معانی بنا کر فدوی کو بھی الو دیدیا ہے اور یہ ایک عطار کی دوکان پر بیٹھ کر شعر خوانی کرتے ہیں جب کوئی شخص کچھ خریدنے عطار کی دوکان پر جاتا ہے تو بنئے کی طرح عطار کہتا ہے　　وہ ہی ہے فدوی بہی ہے۔

اور پھر اپنے ایک شعر کے سرقہ کا تذکرہ اور اس سرقہ شدہ مضمون کو غلط باندھنے کا قصہ کہا ہے۔ غرض یہ مثنوی ہجو یہ ہے گو یہ بہت دلچسپ اور کسی قدر مہذب بھی ہے گو ہجو کی ہے مگر صرف فدوی کو الو بنانے کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا یہ بھی غنیمت ہے ورنہ "غنچہ" کو بچا کر قلمدان منگوانے کے بعد مرزا صاحب کہیں رک سکتے تھے یہ (۱۰۹) شعر کی مثنوی ہے جو آخری ہے

ہم صرف مرزا صاحب کی مثنویوں کا تذکرہ کرنا چاہتے تھے مگر مثنوی کی بحر میں ہونے کی وجہ سے انکی ہجو کو بھی لینا پڑا انشاء اللہ آئندہ کبھی "ہجویات اور سودا" پر ایک تفصیلی نظر ڈالی جائیگی۔ گو مرزا سودا نے صنف مثنوی میں کوئی خاص بات پیدا نہیں کی مگر ان کی مثنویاں اس قدر خراب بھی نہیں ہیں جیسی کہ عام طور پر خیال کی جاتی ہیں۔ ہمیں کوئی حق نہیں کہ ان آقایان اردو پر تنقیدی نظر ڈالیں بلکہ ہمیں چاہئے کہ انکا جو کچھ بھی ملے قدر کی نگاہوں سے دیکھیں۔

تمکین کاظمی

؟

(فنا)

(۱)

مجھے بمبئی آئے ہوئے ایک ماہ سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ زر نقد انحطاط پذیر تھا میری تمام پونجی ختم ہو چکی تھی اسوقت میرے پاس سو روپیہ کا صرف ایک نوٹ تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ بمبئی جیسے شہر میں اس قلیل رقم کی کوئی حقیقت نہیں اور ہنوز مجھے اپنی امید کے بر آنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی اس کے علاوہ ہوٹل کے اخراجات ادا نہیں کئے گئے تھے۔ آج ہفتہ کا آخری روز تھا اور اس کا حساب صاف کرنا لازم۔ یہ خیالات میرے دل میں گزر رہے تھے کہ ہوٹل کے ملازم نے دستک دی اور طشتری پر ایک کاغذ پیش کیا یہ میرے اخراجات کا بل تھا کل ۹۷ روپیہ ہوتے تھے میں نے نوٹ نکال کر رکھدیا اور کچھ دیر بعد ہی ملازم تین روپیہ مجھے واپس کر گیا۔ میں حیران و پریشان تھا۔ اگر آج بھی ملازمت کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو میں موت کو گداگری پر ترجیح دونگا۔ یہ خیال کرکے اٹھا۔ اور وکٹوریہ ٹرمنس کی طرف چلدیا وہاں میرے والد مرحوم کے ایک عزیز دوست جی آئی پی ریلوے کے افسر اعلیٰ تھے اور قوی امید تھی کہ وہ مجھے اس کشمکش سے ضرور نجات دلائینگے ۹ بجے کا وقت انھوں نے ملاقات کیواسطے مقرر کیا تھا۔ ۹ بجنے میں دس منٹ کی دیر تھی میں اسٹیشن پر پہونچ گیا اور وقت مقررہ کا انتظار کرنے لگا مگر انتظار میرے واسطے بے سود تھا کیونکہ اسیوقت مجھے معلوم ہوا کہ مسٹر ہگنس آدھ گھنٹہ قبل نہایت ضروری کام سے بھساول جا چکے ہیں۔ اور دو ایک روز تک ان کا آنا محال ہے

دنیا میرے واسطے تاریک ہوگئی۔ میری آخری امید منقطع ہو چکی تھی میں لڑکھڑاتا ہوا باہر نکلا اور ایک سمت چلدیا میں نہیں کہہ سکتا کہ کتنی دیر بمبئی کے بازاروں میں گشت لگاتا رہا مگر جسوقت ہوش آیا تو اپنے ہوٹل کے سامنے تھا میں تیزی کے ساتھ اوپر چڑھ گیا اور کمرہ میں پہونچکر دیوانوں کے مثل پلنگ پر گر گیا چاہتا تھا کہ نیند آجائے مگر پریشان حالی میں وہ بھی نہیں آتی۔ پریشان کن خیالات دماغ میں ہجوم کئے ہوئے تھے اسکیمیں مرتب کرتا تھا اور بگاڑ دیتا تھا میں اس قدر محو تھا کہ دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز تک نہ سنی۔ ملازم کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد اندر آیا اور ایک کارڈ مجھے دیا۔ کمرہ میں اندھیرا تھا۔ اس نے بڑھکر بٹن دبایا اور روشنی کردی۔ میں نے کارڈ پر نظر ڈالی۔

احمد مرزا

"کون احمد مرزا؟ میں اس نام کے کسی شخص سے واقف نہیں۔ اچھا بلاؤ۔"

ایک لمحہ بعد ایک پستہ قد مگر جسیم آدمی میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اور کہنے لگا "کیا مجھے مسٹر رفیق احمد سے خطاب کا فخر حاصل ہے؟"

"بندہ ہی کو رفیق احمد کہتے ہیں۔ فرمائیے کیسے تکلیف کی"

"مجھے کچھ دیر آپ سے تخلیہ میں گفتگو کرنا ہے۔ زحمت ہوگی۔ معاف کیجئے"

"فرمائیے فرمائیے۔ میں حاضر ہوں"

"میں آپ کو زیادہ تکلیف نہ دونگا اور مختصراً یہ عرض کرنے کی جرات کرونگا کہ مجھے آپ کی خدمات کی چند گھنٹوں کے واسطے ضرورت ہے اس تکلیف کے معاوضہ میں آپ جس قدر روپیہ طلب کریں گے ادا کیا جائیگا۔ کیا پانچسو روپیہ فی گھنٹہ آپ کو منظور ہے؟"

"مگر مجھے کام کی نوعیت معلوم ہونی چاہئے۔ اسوقت میں آپ کو بتا سکونگا کہ مجھے آپ کی خدمت کا فخر حاصل ہو سکتا ہے یا نہیں۔"

"مجھے افسوس ہے کہ نوعیت کے متعلق میں آپ سے کچھ نہیں کہہ سکتا صرف اس قدر عرض کر سکتا، کوئی بات آپ کے ضمیر کے خلاف نہیں ہوگی۔ ہمیں آپ کی امداد کی سخت ضرورت ہے میں کل صبح آٹھ بجے پھر حاضر ہونگا امید ہے اسوقت تک آپ میری درخواست پر کافی غور فرمائیں گے اور اسے رد نہ کیا جائیگا۔"

میں ابھی کوئی جواب نہ دینے پایا تھا کہ وہ کھڑا ہو گیا اور السلام علیکم کہکر کمرے کے باہر تھا۔ "پانچسو روپیہ فی گھنٹہ" یہ شیریں الفاظ میرے کانوں میں ابتک گونج رہے تھے اس قدر رقم کوئی شخص ایک گھنٹہ کے واسطے نہیں دیسکتا۔ جب تک کہ کسی کی جان ہی پر نہ بنی ہو ——— ضرور کوئی خطرناک کام ہے۔ میں اسکو کبھی قبول نہیں کر سکتا۔ مگر نہیں۔ اگر اسکی درخواست کو منظور نہ کیا تو کل ہی سڑک کی پٹری پر پڑا ہوا نظر آؤنگا اس کے سوائے الحال کوئی چارہ کار نہیں۔ یا الہی! مجھے کیا کرنا چاہئے۔ خیر صبح دیکھا جائیگا میں پلنگ پر لیٹ گیا اور زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ انھیں خیالات میں محو ہو کر سو گیا۔

(۲)

ٹھیک آٹھ بجے میرا اجنبی ملاقاتی کمرے میں داخل ہوا میں نے اس کی درخواست کو منظور کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور بغیر کسی قسم کی رسمیات کے اپنے ارادے سے آگاہ کر دیا۔

"میں آپ کی عنایت کا کن الفاظ میں شکریہ ادا کروں۔ مجھے امید تھی کہ آپ میری درخواست کو نہ ٹھکرائینگے۔ پس تو اب بسم اللہ کیجئے۔ جسقدر جلد کام شروع ہو جائے بہتر ہے۔ میرا موٹر نیچے موجود ہے۔"

ابھی اور میں موٹر میں سوار ہوگئے قریب آدھ گھنٹہ کا سفر تھا آخرکار موٹر ایک عالیشان مکان کے سامنے رکا ہم اندر داخل ہوئے میرا ہمراہی مجھے ایک کمرہ میں چھوڑ کر خود [illegible] لینے کیواسطے باہر چلا گیا میں کمرے میں اکیلا تھا۔ اور خیالات میں محو کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا

کہ کمرہ آہستہ آہستہ اوپر اُٹھ رہا ہے میری حیرت کی انتہا نہ تھی، میرا دل خود بخود بیٹھا جارہا تھا، یہ مکان مجھے طلسم خانہ معلوم ہوتا تھا۔ میں دروازے کی طرف بڑھا مگر وہ مقفل تھا لیکن اگر کھلا بھی ہوتا تو میں اسوقت کس طرح نکل سکتا تھا بہرحال اب مجھے معلوم ہوگیا تھا۔ مگر کیوں؟ میں نے اُٹکا کیا بگاڑا تھا کمرہ کم ازکم پچیس فٹ کی بلندی پر پہونچکر ٹھہر گیا اور ساتھ ہی دروازہ بھی کھل گیا۔ میں نے دیکھا کہ یہ دروازہ ایک اور کمرے میں جاتا تھا رہائی پانے کی امید میں اس کی طرف بڑھا۔ مگر چند ہی قدم گیا ہونگا کہ ایک عجیب وغریب نظارہ نے ہاتھ پیر پھلا دئے۔ میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور میں مثل بید کے جنبش کرنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ ایک خوبصورت نوعمر لڑکی جس کی عمر مشکل سے ۱۶ سال کی ہوگی کمرے کے درمیان میں فرش پر پڑی ہے۔ ہاتھ پیر بندھے ہیں اور ظاہرا بیہوش ہے میں اُس کے قریب گیا اور غور سے دیکھا وہ نہایت بیش قیمت لباس پہنے ہوئے تھی مجھے معاملہ کی اہمیت کا احساس ہوا اور صاف نظر آنے لگا کہ یہ جرائم پیشہ اشخاص کی آرام گاہ ہے جو اس غریب لڑکی کو کہیں سے پکڑ لائے ہوں گے۔ زیور وغیرہ اتار کر یہاں قتل کرنے کے واسطے ڈال دیا ہے۔ اتفاق تھا کہ میں اس موقع پر پہونچ گیا ہر چہ بادا باد میں اس کے بچانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرونگا۔

کانپتی ہوئی انگلیوں سے میں نے اس کے بند کھولنے شروع کئے۔ دونوں ہاتھ مشکل سے کھول پایا تھا کہ پشت پر ایک عجیب آواز سنائی دی مڑکر دیکھا تو ایک سیاہ زہریلا سانپ پھن اٹھائے ہوئے چلا آرہا ہے۔ یہ وحشت خیز نظارہ دیکھکر میرے حواس جاتے رہے یہ لوگ کس درجہ خطرناک طریقہ سے اس بے رحم اسکو قتل کرنا چاہتے تھے اس کا نقشہ میری آنکھوں کے آگے پھر گیا۔ میں کانپ اٹھا۔ اور تہیہ کر لیا کہ ہر ممکن طریقہ سے موت کے منہ میں جانے سے اسے بچاؤں گا اس کمرے میں فرنیچر کی قسم سے کوئی چیز نہ تھی مگر جس کمرے سے میں آیا تھا وہ ہر طرح سے آراستہ تھا معاً مجھے خیال آیا کہ اسے اُٹھاکر جس طرح ممکن ہو کوچ پر پہونچا دینا چاہئے میں نے اپنی دانست میں جلدی کی لڑکی کو اٹھا کر ساتھ کے کمرے کی طرف بڑھا سانپ بھی نزدیک آگیا تھا۔ مگر پھر بھی جوں توں کرکے کوچ تک پہونچ گیا اور اس کو احتیاط کے ساتھ لٹا دیا سانپ اب بالکل میرے قریب تھا کمرے میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے میں اس کا مقابلہ کرتا اور نہ اس کی مہلت تھی۔ آخرکار وہ میرے پیروں سے چمٹ گیا بہت ہاتھ پیر مارے مگر اس موذی جانور سے چھٹکارا ناممکن تھا۔ خوف کے مارے میرا برا حال تھا موت میرے سامنے تھی آخرکار میں بیہوش ہوکر گر پڑا۔



(۳)

جسوقت آنکھ کھلی تو میں اپنے کمرہ میں تھا۔ میرے غصہ کی انتہا نہ رہی جب میں نے اسی اجنبی مسٹر احمد مرزا کو اپنے سامنے پایا، وہ کہہ رہا تھا "مسٹر رفیق"۔ میں آپ کا تہ دل سے شکر گزار ہوں کہ آپ نے اس قدر تکلیف گوارا فرماکر بیش بہا امداد پہونچائی۔ میں آپ کا احسان عمر بھر نہ بھولوں گا۔ ہم یہاں سے آٹھ بجے روانہ ہوئے تھے۔ اسوقت دس کا عمل ہے۔ گویا دو گھنٹہ صرف ہوئے یہ دوسو روپیہ کے دس نوٹ معاوضہ میں قبول فرماکر شکر گزاری کا موقع دیجئے"!

میں بہت ضبط کر چکا تھا۔ معاملہ حد کو پہونچ گیا تھا۔ میں پلنگ سے کود پڑا اور ٹیلیفون کی طرف جھپٹا گھنٹی بجائی اور کہا۔

"بھانہ سے ملادو جلدی کرو"

احمد مرزا" جناب والا آخر یہ وحشت کیا ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ آرام فرمائے ابھی کمزوری باقی ہے"

"معاف کیجئے۔ مذاق بہت ہو چکا میں نے آپ کی جائے قیام کی حقیقت معلوم کرلی ہے۔ آپ نہایت خطرناک مجرم ہیں اور میں آپ کو پولس کے حوالہ نے میں کوئی تامل نہیں کرونگا ایک بے گناہ لڑکی کو جکڑ کر باندھ دینا اور نہایت دردناک طریقہ سے قتل کرنے کی کوشش کرنا تاکہ ارتکاب جرم کا پتہ نہ چلے اور یہی معلوم ہو کہ سانپ کے کاٹنے سے مری ہے۔ آپ کے نزدیک خفیف سی بات ہوگی مگر میں حقیقت سے واقف ہوں۔ اور تمام واقعات من وعن پولس کے سامنے بیان کردونگا"

ٹیلیفون کی گھنٹی زور زور سے بج رہی تھی۔ میں نے آلہ ہاتھ میں لیا۔ مختصراً تمام واقعات بیان کئے اور جلد آنے کے واسطے کہا۔ یہ تمام باتیں ہو رہی تھیں مگر اجنبی کے چہرے پر مطلق پریشانی کے آثار نہ تھے وہ نہایت سنجیدگی کے ساتھ ان تمام باتوں کو دیکھ رہا تھا اس نے ایک قہقہہ لگایا گویا وہ اس کو مضحکہ انگیز بات خیال کر رہا ہے۔

"اب آپ اپنے کام سے فارغ ہوگئے۔ آئیے اپنا تعارف کرادوں اسوقت تک آپ مجھکو احمد مرزا کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ کارڈ ملاحظہ ہو

> پیر بھائی۔ پروپرائٹر
> انڈین فلم کمپنی۔ بمبئی

مجھے حیرت تھی کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے کل ایک شخص احمد مرزا کے لقب سے آکر مجھسے ملتا ہے اور دو گھنٹے کے واسطے ایک ہزار کی کثیر رقم دینے کے واسطے آمادہ ہے میں اس کے ہمراہ اس کے مکان پر جاتا ہوں اور وہاں عجیب وغریب واقعات کا مشاہد کرتا ہوں بیہوش ہونے کے بعد اپنے کو پھر ہوٹل میں پاتا ہوں اور وہی اجنبی میرے سامنے ہے۔ لیکن اسوقت وہ اپنے کو ہندوستان کی مشہور فلم کمپنی کا مالک ظاہر کرتا ہے آخر یہ اسرار ہے تو کیا ہے۔ مجھے حیرت میں دیکھکر وہ ہنسا اور کہنے لگا۔ آخر آپ یقین کیوں نہیں کرتے۔ کیا آپ پچھلے چند گھنٹے کے واقعات کو صحیح تصور کرتے ہیں خیال تو کیجئے وہ واقعات کسی ڈرامے کے ایک حصہ کے واسطے کس قدر موزوں ہیں اس میں تعجب کی کونسی بات ہے ہمارا ایک ایکٹر دو ہفتہ ہوئے یکایک انتقال کرگیا وہ حال ہی میں ایک ڈرامہ پورا کر چکا تھا جسوقت فلم دیکھی گئی تو ہماری ناکامی کی انتہا نہ تھی۔ فلم کا وہ حصہ جو تمام ڈرامے کی جان تھا نہایت دھندلا تھا۔ ہم فلم کو اس حالت میں کبھی کام میں نہیں لاسکتے تھے اُس کا تکمیل کو پہونچانا بس ضروری تھا۔ دو ہفتہ سے ہم حیران وسرگرداں کسی ایسے شخص کی جستجو میں تھے جو ہمارے مرحوم ایکٹر کی شکل سے مشابہت رکھتا ہو۔ کل میرے ایک ایجنٹ نے آپ کو کٹولہ ٹرمس سے نکلتے ہوئے دیکھا آپ کی شکل ہمارے ایکٹر سے بہت مشابہت رکھتی ہے مجھے اطلاع ہوئی میں فوراً آپ کے پاس حاضر ہوا اور آپ کی امداد کا

طلبگار۔ بڑی خوش قسمتی تھی کہ آپ نے میری درخواست کو قابل پذیرائی تصور فرمایا۔ اصل واقعہ سے اگر آپ کو مطلع کر دیا جاتا تو آپکی حرکات و سکنات میں وہ پھرتی ہرگز نہ پائی جاتی جسکا آپ نے ابھی دو گھنٹہ قبل اظہار کیا اور پھر یہ تمام باتیں بناوٹی دکھائی دیتیں اسکو پوشیدہ رکھکر ہمنے آپ کو مجبور کیا کہ آپ اس طرح عمل کریں گویا تمام باتیں در اصل پیش آ رہی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آپ بالکل خوف زدہ ہوگئے اور بالکل ہماری خواہشات کے مطابق عمل کیا حقیقتاً آپ کو بے حد تکلیف ہوئی۔ جس کی میں معافی چاہتا ہوں اور یہ ناچیز نذرانہ پیش کرتا ہوں۔ اور ہاں اگر آپ اپنے کو فلم میں دیکھکر حظ اٹھانا چاہتے ہیں تو کل شام بمبی پکچر پیلس میں تشریف لائیے"۔

"مگر وہ سانپ! وہ تو جاندار تھا؟"۔ میں نے سوال کیا۔

اس نے قہقہہ لگایا "آپ اسی دہوکے میں آ گئے۔ وہ سانپ یہ ہے دیکھئے بالکل مصنوعی ہے اور میری حال ہی کی ایجاد اسمیں یہ چھوٹا سا انجن کہربائی قوت پیدا کرتا ہے اور جب مشین حرکت میں آتی ہے تو بالکل اصلی سانپ کی طرح چلتا ہے مگر دیکھیے ربڑ کا بنا ہوا ہے"۔

میرے تمام شکوک رفع ہوگئے۔ مگر اب زینہ پر بھاری بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی اور ایک سارجنٹ کمرہ میں داخل ہوا میں نے اس سے بہت بہت معافی مانگی۔ اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ اور وہ بڑبڑاتا ہوا نیچے اتر گیا۔

"آپ نہایت عقلمند ہیں" میرے ساتھی نے کہا "اچھا کیا۔ سارجنٹ کو واپس کر دیا۔ مفت میں مجھے اور آپ کو زحمت ہوتی۔ مگر قبل اس کے کہ میں آپ سے رخصت ہوں ایک درخواست کرونگا کہ آپ ہمارے مرحوم ایکٹر کی جگہ مستقلاً کام کیجئے ایکہزار روپیہ ماہوار آپکی تنخواہ ہوگی۔ فرمائیے منظور ہے"۔

. . . .

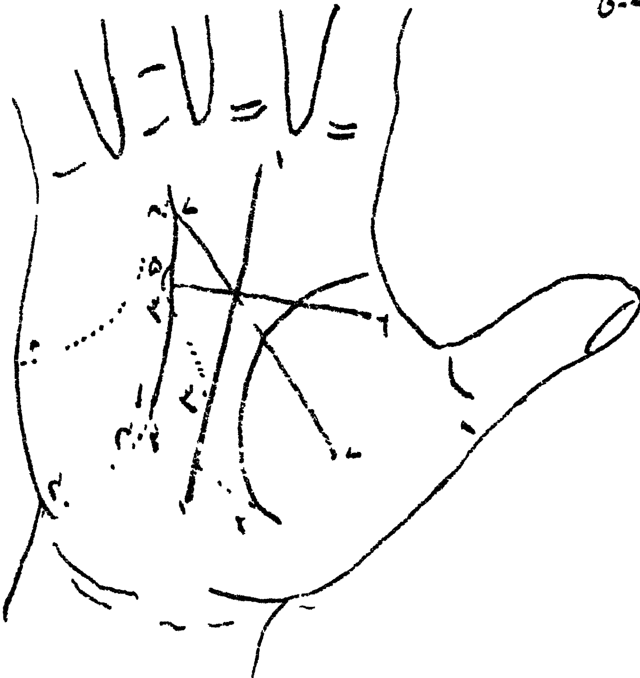
اور کیا آپ 'بہرام' کے نام سے واقف نہیں؟

حفیظ الرحمٰن

علم فراست الید
یا
سمدرک

(گزشتہ سے پیوستہ)

شمسی لکیر اس لکیر کو کامیابی کی لکیر بھی کہتے ہیں اور اس کا ذکر مختصراً گزشتہ ماہ کے رسالے میں بھی آچکا ہے کہ جب تک یہ لکیر اچھی نہ ہو، قسمت کی لکیر کا اچھا ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا اور دنیا میں کامیابی مشکل ہے خواہ ایک شخص اپنے دہنی اکتسابات اور دماغی کمالات کے لحاظ سے کتنا ہی کامیاب کیوں نہ ہو۔ برخلاف اس کے اگر یہ لکیر اچھی ہو تو ایک شخص شہرت، اقتدار، دولت عزت سبھی کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ ذیل کے نقشہ سے معلوم ہوگا کہ یہ لکیر ہاتھ میں کس جگہ پائی جاتی ہے۔ اس لکیر کی اصل جگہ (۱-۱) سے ظاہر ہوگی، لیکن یہ لکیر مختلف مقامات سے پیدا ہو سکتی ہے یعنی



زندگی کی لکیر سے، مریخ کے ابھار سے چاند کے ابھار سے، دماغی لکیر سے قلب کی لکیر سے اور کبھی وہ خود اپنے ہی ابھار میں مختصر سی نظر آتی ہے اور کسی دوسرے ابھار یا خط سے پیدا نہیں ہوتی۔

اگر یہ عمر کی لکیر سے نکلی ہو جیسا کہ (۲-۲) سے ظاہر ہوتا ہے تو معلوم ہوگا کہ ایسا شخص اپنے باپ دادا کی طرف سے کامیابی کے ذرائع ساتھ لایا ہے، خود اس کی سعی و کوشش کو زیادہ دخل نہیں ہے۔

اگر یہ لکیر قسمت کی لکیر سے پیدا ہوئی ہو جیسا کہ (۳-۳) سے ظاہر کیا گیا ہے، تو سمجھا جائے گا کہ اس شخص کی کامیابی دنیا میں یقینی ہے

جو خود اسی کی کوشش سے حاصل ہوگی۔ اگر یہ لکیر مریخ کے اُبھار سے پیدا ہو کر تنہا بغیر کسی اور لکیر سے ملی ہوئی چلی گئی ہو جیسا کہ (۸ - ۸) سے ظاہر ہوتا ہے تو معلوم ہوگا کہ کامیابی بہت مشکل سے حاصل ہوگی اگر اس لکیر کی ابتدا چاند کے اُبھار سے ہوگی جیسا کہ (۴ - ۴) سے بتایا گیا ہے تو ظاہر ہوگا کہ ایسے شخص کی کامیابی کسی دوسرے کی امداد و مرضی پر منحصر ہوگی اور پائیدار نہ ہوگی۔ چنانچہ ایکٹروں، مقرروں، واعظوں اور مقرروں وغیرہ کے ہات میں ایسی لکیر کا ہونا ان کی کامیابی کی دلیل ہے

اگر یہ لکیر، دماغی لکیر سے پیدا ہوگی تو معلوم ہوگا کہ ایسا شخص خود اپنی دماغی محنت و قابلیت سے ترقی حاصل کریگا لیکن عمر کا کافی حصہ گزر جانے کے بعد یہ لکیر مصنفوں اور دوسرے دماغی کام کرنے والوں کے ہات میں اکثر پائی جاتی ہے

اگر یہ لکیر قلب کی لکیر سے نکلی ہو تو معلوم ہوگا کہ کامیابی ادھیڑ عمر میں ہوگی اور کسی قلبی تعلق کی بنا پر ایسی لکیر والا اخیر عمر میں کامیاب شادی کریگا جو آرام و سکون کا باعث ہوگی۔

اگر یہ لکیر اپنی ہی اُبھار میں نظر آئے اور کسی اور لکیر سے نہ پیدا ہوئی ہو تو معلوم ہوگا کہ کامیابی کا زمانہ بالکل آخری عمر میں آئیگا اور جسکا ہونا نہ ہونا برابر ہوگا۔

اگر ہات کی تیسری انگلی (جو شمسی انگلی کہلاتی ہے) پہلی انگلی سے لانبی ہو اور شمسی لکیر بھی نمایاں ہو تو سمجھا جائیگا کہ ایسے شخص میں قمار بازی کا جذبہ قوی ہے اگر یہ انگلی بیچ کی انگلی کے برابر ہوگی تو معلوم ہوگا کہ ایسے شخص میں دولت جمع کرنے کی حرص بہت قوی ہے اگر تیسری انگلی بہت لانبی ہو اور اسی کے ساتھ اینٹھی ہوئی یا ٹیڑھی ہو تو ثابت ہوگا کہ ایسا شخص روپیہ حاصل کرنے میں جائز و ناجائز ذریعہ سے کام لیگا۔ چنانچہ چوروں اور قزاقوں کے ہات میں اس قسم کی انگلی اکثر پائی جاتی ہے۔

اگر کسی کا ہات لانبا اور انگلیاں نوکدار ہوں (جو مخروطی ہات کی خصوصیات ہیں اور جس کا ذکر اپریل ۱۹۲۷ء کے نگار میں آچکا ہے) اور اسی کے ساتھ شمسی لکیر بھی اچھی ہو تو معلوم ہوگا کہ ایسا شخص فنون لطیفہ میں سے کسی فن کے ماہر ہونے کی حیثیت سے کامیابی حاصل کریگا لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ فن موسیقی کے بڑے بڑے ماہر جنھیں نائک کہتے ہیں اُن کا ہات مخروطی نہیں ہوتا بلکہ چوکور ہوتا ہے جسے فلسفیانہ ہات بھی کہتے ہیں۔ اگر کسی کا ہات بہت زیادہ لانبا اور مخروطی ہو تو پھر شمسی لکیر کوئی خاص معنی نہیں رکھتی۔ کیونکہ ایسے آدمی بہت زیادہ خیال پرست ہوتے ہیں۔ اور دولت و شہرت وغیرہ کی پرواہ نہیں کرتے۔ اُن کی زندگی خواب کی طرح بسر ہوجاتی ہے اور وہ اسی میں خوش رہتے ہیں۔

یہ بات ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ کسی ہات میں شمسی لکیر کا پایا جانا اس بات کی یقینی علامت ہے کہ ایسا آدمی اپنے ماحول سے بہت متاثر ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ لکیر زیادہ تر آرٹ پسند فطرت کے لوگوں میں پائی جاتی ہے اور ایسے لوگ حسن پسند اور نفاست پسند ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کے ہات میں یہ لکیر نہیں ہوتی وہ ماحول سے متاثر نہیں ہوتے اور ہر حال میں خوش زندگی گزار دیتے ہیں۔

اگر شمس کے ابھار میں بہت سی لکیریں پائی جائیں گی تو مقاصد کی کثرت اور اغراض کے تنوع ظاہر ہوگا اور ایسی صورت میں جیسی کامیابی ہونی چاہئے نہیں ہو سکتی

اگر شمسی لکیر دو تین متوازی پائی جائیں تو معلوم ہوگا کہ ایک سے زاید صورتیں حصول دولت کے پیدا ہونگی

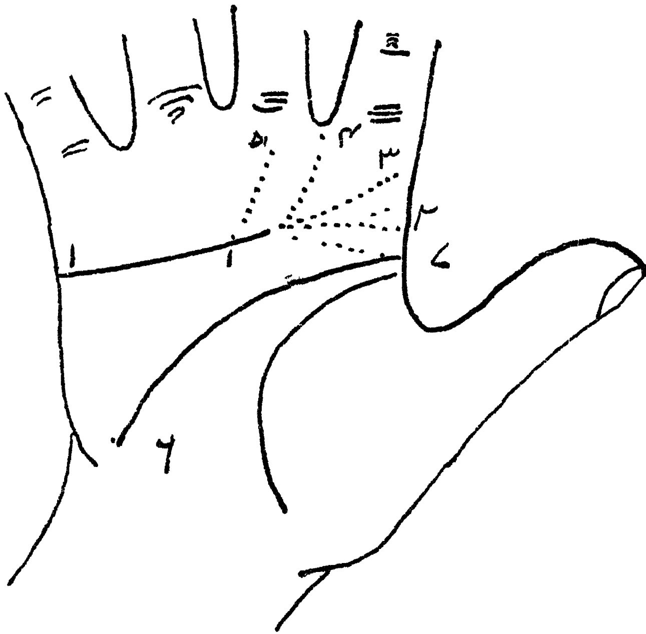
اس لکیر میں جزیرہ کا پایا جانا اچھی علامت نہیں ہے (ملاحظہ ہو نشان نمبر ۵) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک خاص زمانہ میں اس کی بدنامی ہوگی۔ اگر انگوٹھے کی طرف سے لکیریں آکر اس کو قطع کریں یا مریخ کے اُبھار سے کوئی خط آکر اس سے ملے (ملاحظہ ہو ۶-۶) تو اس کو بُری علامت سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ اس سے ثابت ہوگا کہ لوگ اس سے حسد رکھیں گے اور مقصد کے حصول میں حائج ہوں گے۔ اگر زہرہ کے اُبھار سے کوئی خط آکر اس سے ملیگا تو معلوم ہوگا کہ وہ حرج پیدا کرنے والی ہستی کسی عورت کی ہوگی (نشان ۷-۷)

اس لکیر پر کسی ستارہ کا پایا جانا نہایت عمدہ علامت ہے۔ صلیبی نشانات کا ہونا مشکلوں اور دقتوں کو ظاہر کرتا ہے۔

گہری ہتھیلی میں یہ خط بالکل بے معنی چیز ہے

قلب کی لکیر

قلب کی لکیر کی جائے وقوع ذیل کے نقشے میں (۱-۱) سے معلوم ہوگی یہ لکیر انسان کی تعلق قلبی کو ظاہر کرتی ہے۔ یعنی اس سے معاملات محبت میں دماغی کیفیت کا پتہ چلتا ہے۔



اس لکیر کو گہرا اور خوشرنگ ہونا چاہئے

یہ لکیر کبھی تو مشتری کے افقی ابھار سے نکلتی ہے (ملاحظہ ہو نشان ۲) اور کبھی اس کے وسط سے (نشان نمبر ۳) کبھی پہلی دوسری انگلی کے درمیان پیدا ہوتی ہے (نشان نمبر ۴) اور کبھی زحل کے اُبھار سے (نشان نمبر ۵)

مشتری کے افقی ابھار سے اس کا روشنا ہونا ظاہر کرتا ہے کہ ایسا شخص محبت کے معاملہ میں بالکل اندھا ہے اور اپنے جوش میں پس و پیش کچھ نہیں سوچتا لیکن اگر اس کے وسط سے پیدا ہوگی تو اس کیفیت اور جوش میں اعتدال ہو جائیگا۔ ایسے لوگ اپنی محبت میں قابل اعتماد اور استوار ہوتے ہیں اخلاق اور عزت کا خیال بھی اُن کے سامنے ہوتا ہے چنانچہ وہ اپنے سے کمتر درجے کے لوگوں میں

شادی نہیں کرتے اور نہ کثرت ازدواج کو اچھا سمجھتے ہیں۔

پہلی دوسری اونگلی کے درمیان سے اس لکیر کا ظاہر ہونا معاملات محبت میں نہایت گہری فطرت کو ظاہر کرتا ہے، یعنی یہ بہت سوچ سمجھکر محبت کرتے ہیں اور اپنے آپ کو ہمیشہ تباہ نہیں کر دیتے۔ لیکن اگر کوئی خاص ہستی ان کو ملجاتی ہے تو وہ ہر ممکن قربانی کے لئے تیار ہوجاتے ہیں۔ اگر یہ لکیر زحل کے ابھار سے نکلی ہوگی تو خودغرضی ظاہر ہوگی۔ ایسے لوگ اپنے محبوب کے حاصل کرنے کے لئے کوئی دقیقہ کوشش کا نہیں اُٹھا رکھتے۔ لیکن اس کے ملجانے کے بعد کچھ زیادہ قدر بھی نہیں کرتے اور محبوب کی ذراسی غلطی یا فروگزاشت کو بھی معاف نہیں کرتے۔

اگر یہ لکیر زحل کے ابھار کے بالکل نیچے سے شروع ہوتی ہے (نشان ۸ - ۱) تو یہی خصوصیات جو ابھی بیان ہوئے ہیں بہت زیادہ نمایاں ہوجائیں گے ایسے لوگ صرف اپنی ہی خاطر جیتے ہیں اور اپنی متعلقین کی پروا نہیں کرتے۔ قلب کی لکیر جسقدر مختصر ہوگی اسی قدر احساس محبت کم ہوگا اور اگر یہ لکیر بہت لانبی ہوگی (نشان نمبر۲) تو ضرورت سے زیادہ رشک کو ظاہر کرے گی۔ اور اگر اسی کے ساتھ دماغی لکیر چاند کے اُبھار تک جاتی ہوئی نظر آئے (ملاحظہ ہو نشان نمبر۶) تو سمجھ لینا چاہئے کہ رشک کے ساتھ کڑھنے اور اندر ہی اندر گھلنے کا بھی قوی جذبہ موجود ہے

اگر قلب کی لکیر خم کھاکر مشتری کے اُبھار کے بالکل نیچے نیچے چلی گئی ہو (نشان نمبر۷) تو سمجھا جائے گا کہ معاملات محبت میں اس کو بہت ناکامیاں ہونگی۔ ایسے لوگ عشق و محبت کے معاملات میں بہت منکسر مزاج ہوتے ہیں اور اپنے سے کم درجہ کے لوگوں میں آسانی سے شادی کر سکتے ہیں۔ اگر لکیر زنجیر دار ہو یا چھوٹی چھوٹی لکیریں اسمیں سے پھوٹی ہوں تو سمجھا جائے گا کہ ایسے شخص کی محبت کو قیام نہیں ہے اور وہ ہر جگہ محبت کر سکتا ہے۔ اگر یہ لکیر زحل کے ابھار سے نکلی ہو اور زنجیردار ہو تو معلوم ہوگا کہ ایسا انسان جنس مقابل کی طرف سے نفرت رکھتا ہے اگر یہ لکیر چوڑی اور زرد رنگ کی ہو تو سمجھا جائے گا کہ ایسا شخص محبت کے باب میں نہایت سطحی جذبات رکھتا ہے اگر یہ لکیر دماغی لکیر تک چلی گئی ہوگی تو معلوم ہوگا کہ معاملات محبت اس کی دماغی ترقی میں حائل ہونگے

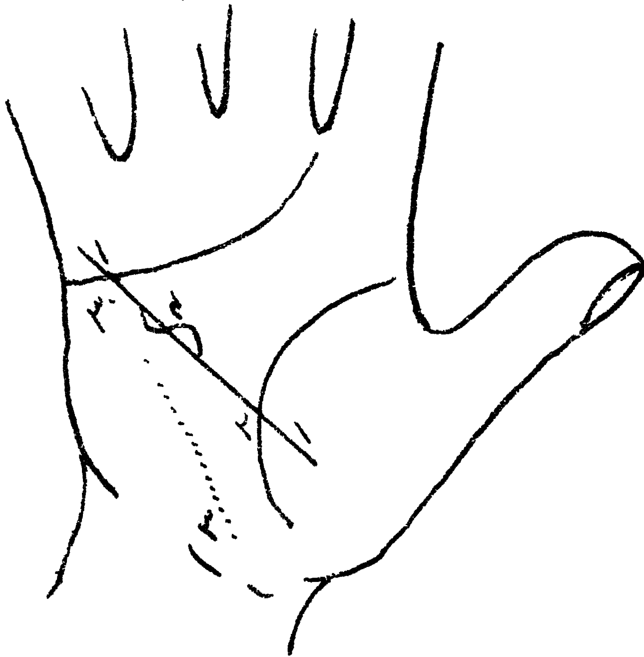
اگر یہ لکیر سراسر چلی گئی ہو اور دماغ کی لکیر بھی اس سے بالکل ملی ہوئی گئی ہو تو معلوم ہوگا کہ ایسا شخص اگر کسی چیز کی طرف مائل ہوتا ہے تو دل و دماغ دونوں کی قوتیں صرف کرڈ التا ہے اور کسی چیز کی پروا نہیں کرتا ایسے لوگ بہت خودداراور ایک حد تک خطرناک بھی ہوتے ہیں کیونکہ اگر ایک مرتبہ ان کو برہم کر دیا جائے تو پھر وہ خونخوار بھی ثابت ہوتے ہیں اور ان کا احساس اسقدر قوی ہوتا ہے کہ بعض اوقات اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔

اگر اس لکیر کی ابتدا دو شاخہ سے ہو یعنی ایک شاخ مشتری کے ابھار کی طرف گئی ہو اور دوسری شاخ پہلی دوسری انگلی کے درمیان چلی گئی ہو تو معلوم ہوگا کہ ایسا شخص بہت معتدل ہے اور معاملات محبت میں وہ بہت خوش نصیب ثابت ہوگا۔

اگر یہ لکیر کسی کے ہاتھ میں نہ ہو تو سمجھنا چاہئے کہ وہ بہت بے حس، ظالم ہے، اور اگر اس کے ساتھ زہرہ کا ابھار اچھا ہوگا تو معلوم معلوم ہوگا کہ وہ صرف شہوت پرست ہے۔

صحت کی لکیر اس لکیر کی ابتدا کہاں سے ہوتی ہے اس میں اختلاف ہے لیکن کیرو کا تجربہ یہ ہے کہ وہ عطارد کے اُبھار سے یا اس کے نیچے سے شروع ہوتی ہے۔ (نشان ۱-۱-۱) اور عمر کی لکیر کی طرف بڑھکر اس کو قطع کرتی ہے یہ مقام انقطاع گویا ہلاکت کا نقطہ ہے

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ عمر کی لکیر سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر خارجی اسباب پیدا نہ ہوں تو ایک شخص کی عمر اتنی ہونی چاہیے، لیکن صحت کی لکیر سے بیماریوں وغیرہ کا حال معلوم ہوتا ہے۔ یہانتک کہ وہ عمر کی لکیر کو قطع کر دے کہ یہی وقت اختتام عمر کا ہے خواہ عمر کی لکیر آگے ہی کیوں نہ گذر جائے۔ (نشان نمبر ۲)



صحت کی لکیر بنتی مٹتی رہتی ہے اور اس لحاظ سے گویا صحت کا تھرما میٹر ہے جسکے ذریعہ سے بیماریوں کے پیدا ہونے اور دور ہونے کا حال معلوم ہوتا رہتا ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ بچپن میں یہ لکیر گہری اور خوفناک ہوتی ہے اور پھر مٹ جاتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ بعد کو صحت اچھی ہوگئی۔ اسکی بہترین جائے وقوع نشان (۳-۳) سے ظاہر ہوتی ہے، لیکن جس کے ہاتھ میں یہ لکیر نہ ہو وہ صحت کے لحاظ سے، زیادہ خوش نصیب سمجھا جائیگا۔ اگر یہ خود عمر کی لکیر کی طرف نہ گئی ہو بلکہ اس سے کچھ خطوط نکل کر اس سے ملے ہوں تو معلوم ہوگا کہ ایسا آدمی ضرور کوئی بیماری رکھتا ہے جو اس کی صحت کو خراب کئے دیتی ہے۔

"یہ لکیر بہت سرخ ہو تو اعصابی بخار کی علامت سمجھی جاتی ہے اگر بے قاعدہ ٹیڑھی میڑھی ہو اور رنگ زرد ہو تو جگر کی خرابی ظاہر ہوگی۔ اگر بہت نمایاں ہو اور قلب و دماغ کی لکیر سے ملی ہو تو دماغی بخار کا اندیشہ پیدا ہوگا۔ لیکن اس لکیر کے ساتھ ناخنوں کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ جن سے انسانی صحت کا حال زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ (ان کا ذکر مئی ۱۹۲۶ء کے نگار میں آچکا ہے)　　باقی ــــ ــــ ــــ ــــ باقی

ملاح کی لڑکی

(فسانہ)

بہت دنوں تک رام موہن ملاح کے کوئی اولاد نہ ہوئی کتنے ہی دیوی دیوتاؤں کی منت مانی پیروں کی خوشامدیں کیں لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ آخیر میں رام موہن کی بیوی نے گنگا مائی کی منت مانی کہ "گنگا مائی اگر میرے کوئی اولاد ہوئی تو میں ایک من بتاسے چڑھاؤں گی"۔ شاید گنگا مائی ایک من بتاسے کی لالچ میں آگئیں کچھ دنوں کے بعد ملاح کے گھر میں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ چھٹی کے دن ایک من بتاسے گنگا مائی کو دکھا کر "پرساد" کے نام سے سب گاؤں والے ہی بانٹ کر کھا گئے۔ پروہت جی نے بچار کر کہا "بتاسے چڑھانے سے لڑکی پیدا ہوئی ہے اس وجہ سے اس کا نام "بتسیا" رکھنا چاہئے۔ پروہت جی کی بات مان لی گئی اور لڑکی کا نام بتسیا ہی رکھا گیا۔ بتسیا پیچ دار اور درخت سے لپٹی ہوئی بیل کی طرح بڑھی۔ گاؤں میں رہنے والی لڑکیوں کی طرح اس کے عضو عضو میں شگفتگی اور ملاحت آگئی حتیٰ کہ وہ اس سن کو پہنچ گئی جس کے آگے لڑکی کو کواری رکھنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ بتسیا بڑی ہنس مکھ اور خوبصورت تھی۔ قدرت کے فیاض ہاتھوں نے اُسے نور کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ اس کی سگائی بہت جلد سری بلدار کے لڑکے سروپ کے ساتھ ہو گئی۔ ہری بلدار گاؤں کے پاس بہنے والی "اچھامتی" ندی کے گھاٹ کا ٹھیکیدار تھا جس سے اسکو خوب آمدنی ہوتی تھی ایک طرح سے گھاٹ کا ٹھیکہ اس کا موروثی ہو گیا تھا کیونکہ ہر سال جب گھاٹ نیلام ہوتا تو سری بلدار کے مقابلہ میں اور کوئی آدمی بولی نہ بولتا جس سے اسی کے نام پر نیلام ختم ہو جاتا۔ جب رام موہن نے اپنی لڑکی کا پیغام دیا تو اُس نے بخوشی منظور کر لیا اور طے ہوا کہ پھاگن میں بیاہ ہوگا۔ سروپ بھی اس نسبت سے بہت خوش تھا وہ بتسیا کے ساتھ لڑکپن میں کھیلا کرتا تھا اسی وقت سے اس کے دل میں بتسیا کی محبت تھی۔

پھاگن کے دو مہینے باقی تھے ایک دن گاؤں میں ایک جوتشی مہاراج آئے انھوں نے سروپ کا ہاتھ دیکھکر کہا "تیرے لئے یہ سال خراب ہے" سروپ کی ماں نے سنا تو کہا "یہ سال نکل جائے تو سروپ کا بیاہ ہوگا"۔ عورت کی بات مردوں نے مان لی اسروپ کا بیاہ اس سال نہ ہو سکا۔

جوتشی جی سروپ کے لئے بتا گئے تھے کہ اس سال سروپ پر کوئی مصیبت آئے گی لیکن سروپ کو ایک دن بخار بھی نہ آیا مگر اس کی ماں ہیضہ کی بیماری میں چل بسیں۔ دوسرے سال بھی بیاہ کا کوئی انتظام نہ ہو سکا اور وہ سال بھی یونہی گزر گیا۔ اب بتسیا کی عمر سولہ اور سروپ کی عمر بیس سال کی تھی۔ سری بلدار نے بیاہ کے لئے جلدی مچانی شروع کر دی کیونکہ اس کے گھر میں گرہستی سنبھالنے والی کوئی عورت نہ تھی دونوں طرف سے بیاہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ لیکن بھگوان کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ یہ نیک کام انجام نہ پا سکا۔ یکایک گاؤں میں سیتلا مائی نے زور پکڑا اور اس کے ساتھ ہی ہیضہ بھی نمودار ہو گیا۔ گاؤں میں کہرام مچ گیا پہلے دیوی پھر ہیضہ نے ملاحوں کے محلہ میں ڈیرا جما دیا آج اس گھر کا لڑکا

مرا تو کل اس گھر کی بہو مری۔ پرسوں "چودھرائن" مریں تو ترسوں "چودھری" چل بسے۔ اسی طرح ایک دن ہری ہلدار بھی بیمار ہوا اور دو ہی دن کے اندر سرگباش ہوگیا۔ رام موہن نے اپنے سمدھی کی بیماری میں بڑی خدمت کی اس نے اسکی تیمارداری میں اپنی صحت کی بھی پروا نہ کی نتیجہ یہ ہوا کہ خود بھی بیمار ہوگیا۔ اس کے ساتھ میں اس کی بیوی بھی بیمار پڑی اور ایک ہی دن کے اندر دونوں پرلوک سدھارے۔ رام موہن کی بڑھیا ماں اور اس کے بڑھاپے کا سہارا بتسیا زندہ بچ گئی۔ ہیضہ یا دیوی نے ان دونوں کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کی۔ آخرکار آدھے سے زیادہ گاؤں کا صفایا کرکے بیماری دوسرے گاؤں میں چلی گئی۔ بھلا اس آپادھاپی میں رام سروپ کا بیاہ کیسے ہوتا۔

(۲)

دو تین مہینے اور گزر گئے۔ رام موہن نے لڑکی کے بیاہ کے لئے تین سو روپے جمع کئے تھے اس سے بتسیا اور اس کی دادی اپنا گزر کرنے لگیں اسی حالت میں ایک دن پروہت جی رام موہن کے گھر آئے اور بڑھیا سے کہنے لگے "رام موہن تو اب اس دنیا میں نہیں ہے اب تم لوگوں کی بھلائی برائی کا خیال رکھنا میرا کام ہے۔ لڑکی بہت سیانی ہوگئی ہے اس کا بیاہ بہت جلد کر دینا چاہئے"۔

"بڑھیا نے جواب دیا "مہاراج! آپ کے سوا ہمارے اور کون بیٹھا ہے جو کچھ مناسب سمجھئے کر دیجئے"۔

پروہت جی نے کہا "اچھا تم خاطر جمع رکھو میں آج ہی سروپ سے مل کر بیاہ کی تاریخ مقرر کراؤں گا" یہ کہکر پروہت جی چلے گئے۔ بتسیا گھر ہی میں تھی اس نے سب باتیں سن لیں۔ پروہت جی کے چلے جانے کے بعد بتسیا نے اپنی دادی سے کہا "اماں میں نے سب کچھ سن لیا ہے لیکن میں صاف صاف بتائے دیتی ہوں کہ میں ابھی بیاہ نہ کرونگی۔ ماں باپ کی جدائی کا رنج ابھی میرے دل سے دور نہیں ہوا"۔ بڑھیا پوتی کی باتیں سنکر سناٹے میں آگئی کچھ دیر چپ رہ کر بڑھیا نے کہا "بتسیا! تو کہتی کیا ہے۔ بیاہ نہیں کرے گی۔ بتسیا! بیاہ نہیں کرے گی؟ ایسی بات منہ سے نہ نکال لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے"۔

بتسیا نے کچھ بگڑ کر جواب دیا "نہ میرے بھائی ہیں نہ بہن۔ پھر میں لوگوں کے کہنے سننے سے کیوں ڈروں۔ صرف تو ہی ہے تیری آنکھیں بند ہوتے ہی سب جھگڑا ختم ہو جائے گا۔ میں کسی طرح بیاہ نہ کرونگی"۔

بڑھیا نے کھسیا کر کہا "بدقسمت لڑکی! بیاہ نہیں کرے گی تو کھائیگی کیا؟ تیرا باپ کوئی 'زمینداری' تو چھوڑ نہیں گیا۔ اگر چھوڑ بھی جاتا تو بیٹھکر کھانے سے وہ بھی چند دنوں میں ہاتھ سے جاتی رہتی۔ آخر تیرا مطلب کیا ہے کیا تو سب میں کلنک کا ٹیکا لگوائے گی؟

بتسیا نے جواب دیا "کسی کی مجال نہیں جو رام موہن کی لڑکی کی طرف بری نظر سے دیکھے۔ کلنک کا ٹیکا لگانا ہنسی کھیل نہیں ہے تو پوچھتی ہے کھاؤنگی کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ملاح کی لڑکی کے لئے کھانے پینے کی کوئی تکلیف نہیں ہو سکتی۔ تو بوڑھی ہوگئی ہے گھر میں بیٹھی رہنا۔ میں گاؤں گاؤں گھوم پھر کر مچھلیاں بیچا کرونگی خود بھی کھاؤنگی اور تجھے بھی آرام سے کھلاؤنگی"۔

اب بڑھیا نے ذرا نرم ہوکر کہا "بیٹی یہ سب کچھ صحیح ہے مگر تو جوان ہے۔ دستور ہے کیا تجھے کواری رہنا چاہئے کہیں کسی کی جوان بیٹی عمر بھر کواری رہتی ہے"۔

بتسیا نے بڑے اطمینان سے جواب دیا "دادی تیرا جو جی چاہے کہہ لے لیکن میں تو اس جنم میں اپنا بیاہ نہ کرونگی"
بڑھیا بولی "کیا سروپ پسند نہیں ہے اگر تو اس کے ساتھ بیاہ نہیں کرنا چاہتی تو میں دوسرا لڑکا تلاش کردوں"
بتسیا نے جواب دیا "میں کسی کے ساتھ بیاہ نہیں کرونگی اگر آئندہ تو نے پھر کبھی مجھسے بیاہ کا چرچا کیا تو میں کہیں بھاگ جاؤنگی"
بڑھیا نے اداس ہوکر کہا "میرا کہنا تو نہیں مانے گی۔ اب میں جاکر سروپ سے کہتی ہوں شاید وہ تجھے راہ پر لے آئے" یہ کہکر بڑھیا سروپ کے پاس گئی اور اس سے سب حال کہا۔ سروپ نے کچھ دیر سوچ کر کہا "دادی تم اب گھر جاؤ میں بتسیا سے مل کر اسکو سمجھاؤنگا"

(۳)

سروپ نے انتہائی کوشش کی بتسیا کو بہت سمجھایا لیکن وہ برابر یہی کہتی گئی "میں بیاہ نہیں کرونگی۔ تم سے بھی نہیں ــــ اور کسی سے بھی نہیں"
کچھ عرصے کے بعد سروپ نے بتسیا سے پھر کہا "بتسیا دیکھو تمھاری ہی وجہ سے ابتک میں کوارا بیٹھا ہوں میرے اور کوئی نہیں ہے کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ میں تمھیں پیار نہیں کرتا، کیا تمھارا یہ خیال ہے کہ میں تمھاری قدر نہ کرونگا۔ ہائے تم کو کیا معلوم کہ میرے دل کی تمھاری محبت میں کیا حالت ہے۔ میں رات دن تمھیں کو یاد کیا کرتا ہوں۔ تم میرے دل میں بسی ہوئی ہو میں سر سے پیر تک تمھارا ہوں۔ رات کو جب سارا سنسار سوجاتا ہے تو میں تمھاری یاد میں جاگتا رہتا ہوں جب آندھی پانی آتا ہے اور مجھے ندی کے اس پار کھیوا لے کر جانا پڑتا ہے اسوقت بھی تمھاری یاد میرے دل کو ڈھارس دیتی ہے۔ جب رات کی "اندھیاری" میں ریتی پر کھیڑی پکاتا ہوں تب بھی دل میں تمھارا ہی خیال رہتا ہے تمھاری ہی موہنی صورت میرے آنکھوں کے سامنے ناچا کرتی ہے۔ کبھی کبھی تو تمھاری یاد میں ایسا بیخود ہوجاتا ہوں کہ نہ کھانے کی سدھ رہتی ہے نہ پینے کی نہ سونے کی ــــ" سروپ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا اس کا دل بھر آیا اور آنسو آگئے۔ معلوم نہیں کہ سروپ کی باتوں نے بتسیا کے دل پر کیا اثر کیا اس نے بھی آج سروپ سے خوب دل کھول کر باتیں کیں اس نے پیشتر کبھی سروپ کی باتوں پر کچھ دھیان نہیں کیا تھا۔ لیکن آج اس نے سروپ سے کہا "تمھارے کوئی نہیں ہے مگر میری بڑھیا دادی زندہ ہے تمھارے ساتھ میرا بیاہ ہوگیا تو بڑھیا کہاں جائیگی۔ تم شاید اس کا جواب یہ دوگے کہ میرے گھر میں آکر رہے گی"۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ رام موہن ملاح کی ماں مٹھی بھر اناج کے لئے داماد کا احسان نہیں اٹھا سکتی اور نہ میں اس بات کو پسند کرتی ہوں میں خود کما کر اپنی دادی کو کھلاؤنگی اور تمھارا محتاج نہ ہونے دونگی شاید تم اس بات کے لئے تیار ہوجاؤ کہ تم ہی خود میرے گھر میں رہوگے تو میں یہ پسند نہیں کرتی۔ میں تم کو پیار کرتی ہوں یا نہیں یہ دوسرا سوال ہے۔ لیکن میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ تم اپنا گھر بار چھوڑ کر سسر کا گھر بساؤ یہ ظلم میں نہیں دیکھ سکتی جو آدمی اپنے بزرگوں کی کٹھیا اجاڑ کر بیاہ کے لالچ سے سسر کے گھر میں پڑ رہنے کو تیار ہو میں اسکے ساتھ بیاہ نہیں کرسکتی۔ بس مجھے جو کچھ کہنا تھا تم سے کہہ چکی آئندہ سے اس بات کا خیال رکھنا کہ اگر تم پھر مجھ سے بیاہ کی بات چیت کروگے تو میں تم سے بولوں گی بھی نہیں"
سروپ چپ چاپ بتسیا کی باتیں سنتا رہا۔ بتسیا کے خاموش ہوتے ہی اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن بتسیا وہاں سے جلدی اور سروپ سر جھکائے کچھ دل میں سوچتا ہوا اپنی ناؤ پر بیٹھ گیا۔

بتسیا نے مچھلی بیچنا شروع کردیا۔ ندی کے کنارے گھوم پھر کر وہ مچھیروں سے مچھلیاں خرید لیتی اور پھر ان کو اُس پار جاکر بازار میں بیچ آتی کچھ دنوں تک تو وہ سروپ ہی کی ناؤ پر بیٹھکر اسی کے گھاٹ سے آیا جایا کرتی تھی سروپ کو جب موقع ملتا وہ بتسیا کو اپنا درد دل سنایا کرتا تھا لیکن بتسیا کوئی جواب نہ دیتی۔ مہینہ گزرنے پر بتسیا نے چار آنے پیسے سروپ کے ہاتھ میں رکھدیئے اور کہا "یہ پار پہنچانے کی مزدوری ہے"۔ سروپ نے وہ پیسے ندی میں پھینک دئے اور کہا "بتاسو! کیا میں تم سے مزدوری لے سکتا ہوں۔ تم نے کیا سمجھکر مجھے مزدوری دی ہے؟" بتسیا نے کوئی جواب نہ دیا چپ چاپ گھر چلی گئی۔ لیکن دوسرے دن سے اس نے سروپ کے گھاٹ سے پار اترنا چھوڑ دیا۔ گاؤں سے ایک کوس کے فاصلہ پر ایک اور گھاٹ تھا۔ بتسیا اسی گھاٹ سے آنے جانے لگی گو اس راہ سے اس کو روز دو کوس زیادہ چلنا پڑتا تھا لیکن اس نے اسکی پرواہ کی ادھر سروپ کے گھاٹ سے اس کی ناؤ میں روزانہ ہر طرح کے آدمی پار اترتے تھے لیکن بتسیا نہ دکھائی دیتی تھی۔ پو پھٹنے کے وقت جب لوگ سورج دیوتا کی راہ دیکھتے سروپ اپنی ناؤ پر بیٹھا ہوا بتسیا کا انتظار کرتا دور سے لوگوں کو آتے ہوئے دیکھکر سروپ خیال کرتا کہ انمیں بتسیا ضرور ہوگی۔ لیکن جب وہ لوگ گھاٹ پر پہنچ جاتے اور بتسیا نہ دکھائی دیتی تو سروپ ایک لمبی سانس لیکر ناؤ کو کھول دیتا کبھی کبھی وہ دن بھر ناؤ لئے بیٹھا رہتا لیکن بتسیا نہ آتی۔ اسی طرح بتسیا کے انتظار میں سروپ کے دن گزرنے لگے شام کو جب پار سے آنے والا کوئی نہ ہوتا تو سروپ ناؤ پر بیٹھا ہوا بتسیا کی یاد میں محو ہوجاتا ذرا سا بھی کھٹکا ہوتا اور وہ کنارے کی طرف دیکھنے لگتا کبھی کبھی تو اس کو عالم خیال میں ایسا معلوم ہوتا کہ بتسیا آرہی ہے۔ جب رات زیادہ ہوجاتی اسٹمی کا چاند خواب گاہ میں چلا جاتا دوپہر کے کنول کی طرح صاف و شفاف آسمان میں تارے کھلتے تو سروپ کو کسی کھیت کے رکھوالے کی بانسری کی آواز میں یہی معلوم ہوتا گویا بتسیا کی پیاری آواز اس کے کانوں میں آرہی ہے وہ گھبراکر چاروں طرف دیکھنے لگتا لیکن اس کی آنکھوں کے سامنے بتسیا کی موہنی صورت نہ دکھائی دیتی۔

(۴)

اسی طرح کچھ دن اور گزر گئے۔ ایک دن سہ پہر کو بڑی زور سے آندھی آئی تین بجے سے ہی بادل گھر آئے تھے چار بجتے بجتے ہوا نے زور پکڑا آندھی کے ساتھ ہی مینہ کا بھی ایک بھاری جھلا آیا اور جھما جھم پانی برسنے لگا۔ اچھا متی کے لہروں کی آواز بہت خوفناک معلوم ہوتی تھی اور بڑے زوروں سے تھر تھر کرتی ہوئی کسی نامعلوم مقام کو بہتی چلی جارہی تھی چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ نزاع ہستی کا خوفناک منظر دیکھکر سروپ نے ناؤ کو مضبوط رسی سے کنارے پر باندھ دیا اور جلدی سے اپنی جھونپڑی میں گھس گیا۔ پانی میں اس کے کپڑے بھیگ گئے تھے۔ اس نے انکو اتار کر دوسرے کپڑے پہن لئے ایک چلم بھر کر وہ تمباکو پینے کے لئے بیٹھا ہی تھا کہ اس کو ایسا معلوم ہوا کہ باہر سے کوئی اس کا نام لیکر بلا رہا ہے۔

سروپ نے سوچا "ایں! یہ تو پہچانی ہوئی آواز معلوم ہوتی ہے۔ اس پیاری آواز سننے کے لئے تو میں ایک مہینہ سے بیتاب ہوں لیکن آج یہ کیا بات ہے ایسے ناوقت۔ ایسی خوفناک آندھی پانی میں بھلا بتسیا یہاں کیوں آنے لگی ـــــ نہیں نہیں یہ سب میرا وہم ہے ـــــ بتسیا

ایسی مصیبت میں میرے جھونپڑے کے دروازہ پر کیوں آئے گی؟" یہ خیال کر کے سروپ چپ چاپ بیٹھا رہا لیکن کان آہٹ پر لگے رہے تھوڑی دیر کے بعد پھر وہی آواز سنائی دی "سروپ! سروپ! کیا گھر میں ہو؟"

سروپ نے جلدی سے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ سامنے بتسیا سر پر ایک ٹوکری دھرے ہوئے کھڑی تھی۔ اس کے کپڑے پانی سے بھیگے ہوئے تھے۔ سروپ نے بتسیا کو کچھ کہنے کا موقع نہ دیا فوراً اس کے سر پر سے مچھلیوں کی ٹوکری اُتاری اور اس کا ہاتھ پکڑ کر جھونپڑی کے اندر لے گیا، اور ایک طرف کھڑے ہو کر خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

بتسیا نے کہا "سروپ کیا تم مجھے اس وقت اس پار پہنچا دو گے"

"پار۔۔۔ ایسے ناوقت! ایسی آندھی پانی میں؟ بتاسو! تو کیا کہہ رہی ہے۔ اس خوفناک طوفان میں پار جانا ہوگا کس کو؟ بتاسو کو" بتسیا کہتی کیا ہے سروپ نے شاید اس کا مطلب نہیں سمجھا یہ سوچکر بتسیا نے پھر کہا "سروپ! مجھے پانچ بجے سے پیشتر ہی یہ مچھلیاں اس پار مکرجی کے ہاں پہنچانی ہیں۔ میں تین روپیہ بیعانہ بھی لے چکی ہوں مجھے جتنی جلدی ہو سکے اس پار پہنچا دو۔ میں اس گھاٹ پر جہاں سے اب پار اترا کرتی ہوں گئی تھی لیکن وہاں کے ملاح اس طوفان میں اس پار ناؤ لیجانے کے لئے راضی نہیں ہوتے اسی سے مجبوراً اس مصیبت میں تمھارے پاس آئی ہوں۔ کیا تم ایسی حالت میں میری مدد نہیں کر سکتے۔۔۔ سروپ! تم مجھے پار پہنچا دو تمھارے سوا کوئی اور اس طوفان میں پار ناؤ لیجانے کی ہمت نہیں کر سکتا" اتنا کہکر بتسیا سروپ کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگی سروپ نے بتسیا کا ایسا روپ اور کبھی نہیں دیکھا تھا ایسی پیاری اور میٹھی بولی کبھی نہیں سنی تھی۔ اسوقت بتسیا کی عجیب حالت تھی اس کے سُرخ رخساروں پر بھیگے بالوں کے گچھے ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے بھونرے پھول پر بیٹھے ہوئے رس چوس رہے ہیں۔ بھیگی ساری کے اندر سے اس کا جسم چمپا کلی کے مانند خوبصورت نرم و نازک معلوم ہوتا تھا۔ سروپ نے اپنا کلیجہ تھام کر کہا "بتاسو! میں تم کو پار ضرور لے جا سکتا ہوں اسمیں کوئی شک نہیں ہے لیکن تم اگر نہ جاؤ تو کیا کام نہیں ہو سکتا۔ تم یہیں ٹھرو میں ابھی اس پار جاکر مکرجی کے یہاں مچھلیاں دے کر واپس آجاؤں گا۔ بتاسو! تم نہ جاؤ آج بڑا خوفناک طوفان آیا ہے"

بتسیا نے جواب دیا "ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ سروپ تم مجھے یہاں آرام سے بٹھا کر اکیلے پار جاؤ یہ نہیں ہو سکتا میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی۔ چلو اب زیادہ دیر نہ کرو آندھی آہستہ آہستہ بڑھتی ہی جا رہی ہے"

سروپ نے کہا "بتاسو! تم میرے لئے ڈرتی ہو ایسی بات تو تم نے اپنے منہ سے کبھی نہیں نکالی۔ اچھا چلو آج میں تم کو اس پار لے چلوں گا۔ سروپ آج آندھی پانی سے لڑکر ناؤ کو اس پار لیجائے گا۔ اٹھو بتاسو! اٹھو۔ تم کو پار لیجانے کا یہی وقت ٹھیک ہے" اس وقت معلوم ہوتا تھا کہ سروپ کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں اس کا ریشہ ریشہ نشۂ محبت میں سرشار ہو گیا بتسیا کی شیرین بیانی نے سروپ کے دل میں ایک آگ لگا دی اس نے بتسیا کی ٹوکری سر پر رکھ لی اور بتسیا نے ناؤ کے دونوں ڈانڈ اٹھا لئے۔

ندی کے اندر ناؤ کا کھولنا دشوار تھا۔ پرجوش لہروں سے ناؤ ڈگمگا رہی تھی بڑی مشکل سے سروپ نے بتسیا کو ناؤ پر سوار کیا پھر اُس نے حسرت بھری نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھکر بتسیا کے پیارے مکھڑے کو دیکھا اور "چھامتی مائی کی جے" کہکر ناؤ کو کھول دیا۔ ناؤ ناچتی ہوئی منجھدار کی طرف چلی سروپ نے اسوقت بتسیا سے کہا "بتاسو! تم اس وقت میرے پاس آکر بیٹھ جاؤ دیکھو آج میں تمکو پار لے جا سکتا ہوں کہ نہیں"

اتنا کہکر سروپ زور سے گانے لگا۔ پربھو موری نیا ڈگمگ ڈولے

آر پار سوجھت ناہی ناؤ پڑی منجھدار مولا اپنی موج سے کردو بیڑا پار

بالم موری نیا ڈگمگ ڈولے

(۵)

سروپ آندھی پانی سے لڑتا ہوا آگے بڑھنے لگا بتسیا رہ رہ کر کہتی جاتی تھی "بائیں سروپ! بائیں لہر کا ٹو۔ وہ لہر آ رہی ہے اس سے ناؤ کو بچاؤ" یہ کہکر وہ بڑی محبت سے سروپ کی طرف دیکھنے لگتی۔ سروپ بھی اپنے دل کو بڑھانے کے لئے خود بخود کہتا جاتا تھا "شاباش! اور تھوڑی دور ہے۔ شاباش" جب وہ بہت تھک جاتا تو بتسیا کی طرف دیکھنے لگتا جس سے اس کے دل میں اس کے بازوؤں میں پھر نئی طاقت آجاتی۔

آخرکار سروپ کی ناؤ اس پار پہنچ گئی سروپ نے جلدی سے کنارے اتر کر ناؤ کو ایک برگد کی جڑ میں باندھ دیا۔ ابھی شام ہونے میں کافی وقت تھا سروپ بہت تھک گیا تھا وہ وہیں ندی کے کنارے ریت پر بیٹھ گیا اسوقت بھی پانی برس رہا تھا بتسیا نے سروپ سے کہا "سروپ! آج اس پار جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ناؤ یہیں بندھی رہنے دو اور تم میرے ساتھ بازار چلو وہیں کسی دوکان میں آج آرام کر لینا میں جو روپئے مکرجی کے یہاں سے پاؤنگی تم کو دیدونگی اس میں تم اپنے کھانے پینے کا انتظام کر لینا میں بابوجی کے یہاں کسی کونے میں پڑ رہونگی جب صبح ہوگی تو اس پار چلیں گے۔ کیوں ٹھیک ہے نا"

سروپ اٹھکر کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا "بتاسو! ایسا نہیں ہو سکتا تم کو پھر اس پار پہنچائے بغیر مجھے چین نہ ملیگا میں تم کو اس پار سے لے آیا ہوں اس پار آج ہی پہنچاؤں گا۔ جب تک تم مکرجی کے یہاں سے لوٹ کر نہ آؤ گی میں اسی ناؤ پر بیٹھا ہوا تمھارا انتظار کرونگا چاہے کتنی ہی مصیبت میرے سر پر کیوں نہ آئے میں یہاں سے نہ ٹلوں گا"

بتسیا نے ہنسکر کہا "اور اگر میں واپس نہ آؤں تو"

سروپ نے جواب دیا "تو پھر سروپ کی زندگی میں یہی آخری بار ناؤ کھینا ہے۔ اب سروپ اور کسی کو پار نہیں لے جائے گا جسکو پار لیجانے کے لئے وہ آج تک زندہ رہا وہی اگر پار نہ جائے گی تو سروپ بھی اب کھیوا نہ لے جائے گا"

بتسیا سر جھکا کر کچھ سوچتی رہی اس کے بعد بولی "اچھا تم یہیں ٹھیرو میں مچھلیاں دے کر واپس آتی ہوں۔ پھر ہم دونوں گھر واپس چلیں گے" اتنا کہکر بتسیا نے مچھلیوں کی ٹوکری سر پر رکھ لی اور مکرجی کے مکان کی طرف چلدی۔ سروپ ٹکٹکی باندھ کر بتسیا کی طرف دیکھتا رہا اور جب وہ

جب وہ آنکھوں سے اوجھل ہوگئی تو ایک لمبی سانس بھر کر لمبا لمبا ناؤ پر لیٹ گیا۔ اس وقت پانی تھم گیا تھا۔ کبھی کبھی بوندا باندی ہونے لگتی تھی شام ہونے میں کچھ دیر تھی کہ بتسیا واپس آگئی اسوقت آسمان میں ایک کالی گھٹا اٹھتی ہوئی دکھائی دی اسوقت چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی بکلیں ندی سے بہت دور کئی پرشور نالوں سے گزر کر جوار اور باجرے کے کھیت تھے اور ان کی مینڈوں پر کسان جابجا کھیتوں کی نگہبانی کر رہے تھے۔ بتسیا نے پکارا "سروپ"

سروپ بتسیا کہتا ہوا ناؤ سے اُٹھ کر چھلانگ مار کر بتسیا کے پاس پہنچ گیا۔ بتسیا نے آسمان پر نئی اٹھنے والی کالی گھٹا کو دکھا کر کہا "سروپ یہ گھٹا خوفناک معلوم ہوتی ہے ذرا سمجھ بوجھ کر ناؤ کھولنا"

سروپ نے آسمان کی طرف دیکھکر کہا "یہ گھٹا معمولی ہے یہ اچھی طرح آسمان میں پھیلنے بھی نہ پائے گی کہ ہم اس پار پہنچ جائینگے بتاسو آؤ ناؤ پر بیٹھ جاؤ"

بتاسو نے ناؤ پر بیٹھکر کہا "سروپ! گھٹا کا رنگ ڈھنگ دیکھ لو تب چلو" سروپ نے بتسیا کے کہنے کا کچھ خیال نہ کیا اور ناؤ کھول دی۔ منجھدار میں پہنچنے سے پہلے ہی بڑے زور کا طوفان آگیا اور وہ کالی گھٹا چاروں طرف چھاگئی سروپ نے بتسیا سے کہا "بتاسو! ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے وہ سامنے کنارہ دکھائی دیتا ہے بس اب پہنچ گئے"

بتسیا کچھ دور پر ناؤ کے دوسرے سرے پر بیٹھی تھی وہ کھسک کر سروپ کے پاس آگئی۔ سروپ بڑی پھرتی سے ڈانڈ چلانے لگا۔ اسوقت یکایک "ہال" ٹوٹ گیا۔ سروپ پانی میں گرتے گرتے بچا۔ ناؤ لہروں سے ٹکرانے لگی تب سروپ نے چلاکر کہا "بتاسو" اب کوئی اُمید نہیں ہے "ڈانڈ کہاں ہیں" بتسیا نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ وہ بھی نہیں تھے ان کو نہ معلوم ہوسکا کہ ہال ٹوٹنے پر گھبراہٹ میں دونوں ڈانڈ پانی میں گر پڑے تھے۔ سروپ نے کہا "بتاسو! اب بچنے کی کوئی اُمید نہیں ہے دیکھو وہ جو بڑی لہر اس طرف آرہی ہے اسی میں ہماری ناؤ پلٹ کر ڈوب جائیگی" بادلوں کا کالا بھنور جھوم جھوم کر برسنے لگا۔ بتسیا اٹھکر کھڑی ہوگئی اور اس نے کہا "سروپ! تم کیوں گھبرا رہے ہو؟ کیا تم مرنے سے ڈرتے ہو؟ آؤ میری پریم کی نیا کو پار لگانے والے سروپ آؤ ہم دونوں لپٹ کر اچھامتی مائی کی گود میں بخوشی جان دیدیں۔ آج ہمارا بیاہ ہے سروپ آج ہمارا بیاہ ہے" اتنا کہکر بتسیا سروپ سے لپٹ گئی۔ سروپ نے خوب بھینچ بھینچ کر اسکو اپنی چھاتی سے لگالیا اور کہا "بتاسو! اسی بیاہ کے لئے میں تو آجتک زندہ تھا" بتسیا نے پھر چلا کر کہا "سروپ چلو ہم اس پار چلیں آج ہمارا بیاہ ہے"۔ دونوں کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں ضبط و استقلال کے لنگر اُکھڑ گئے اور جذبات و دروں کی کشتی پریم کے اتھاہ ساگر میں ہچکولے کھانے لگی ٹھیک اسی وقت بے پرواہ اور سرشار جوانی کی طرح چڑھی ہوئی ندی کی ایک بہت بڑی لہر اچھلتی کودتی آئی اور اس نے ناؤ کو پلٹ دیا۔ سروپ اور بتسیا دونوں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے اچھامتی کی لہروں میں غائب ہوگئے۔ آسمان اور زمین! رنج اور خوشی! موت اور زندگی سب ملکر ایک ناقابل برداشت خوشی کی موجوں میں ڈوب گئے۔ بدل گنج (بنگال) میں سروپ اور بتسیا کی یہ پریم کتھا آج تک زبان زد خاص و عام ہے جس گھاٹ کے سامنے ناؤ ڈوبی تھی اسے اب تک لوگ "سروپ مانجھی کا گھاٹ" کہتے ہیں۔

(ماخوذ)

اعظم کریوی

رامائن — چھ ورق

پہلا ورق :-

رام اور لچھمن جنگل میں یا شیر کچھار کے اندر ہیں ۔ مار چھ کو بھگا کر بیٹھے ہیں، اور کیسے شاد و مظفر ہیں
گھر واپس ہونے کے لئے آمادہ ہیں اور مضطر ہیں

(۲)

ادھر کیطرف سے دیکھتے ہیں اک گرد اٹھی دھندلی دھندلی ۔ جب نزدیک آ کے گرد بیٹھی تو اسمیں سے اک ٹولی نکلی
چرنوں کو چھو کر شہزادوں کے وہ چپکے چپکے کہنے لگی

(۳)

راجہ جنک جی نے متھلا کے جشن عظیم کیا ہے برپا ۔ شیو جی کی کمان اس محفل میں جو بھی آ کے چڑھا دیگا
دیدین گے اُس کو مہاراجہ اپنی پیاری بیٹی سیتا

(۴)

یہ سن کے چلے متھلا کیطرف، وہ دونوں بہادر تیزی سے ۔ پہونچے جو وہاں تو کیا دیکھا ہیں جمع ہزاروں شہزادے
سب کے دل میں ہے یہی ارمان شیو جی کی کمان چڑھا دیجئے

(۵)

کی سب نے باری باری کوشش لیکن سب ناکام رہے ۔ وہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکی مایوس ہوئے بدنام رہے
اب ہمت والوں میں باقی اک لچھمن اور اک رام رہے

(۶)

جب نوبت رام کی آ پہونچی، شیر دل کی طرح پنجہ ڈالا ۔ اور اسکو اٹھایا سینہ تک جیسے ہو کوئی گلدستہ
ایسے بہادر کو حیرت سے ہر بچے بوڑھے نے دیکھا

(۷)

دیکھتے دیکھتے کھینچی شیر نے اب پوری بل سے شیو کی کمان ۔ وہ لچکی اور وہ جھکنے لگی لو ٹلگئے دونوں کونے وہاں

کڑکی بیچ سے اور تڑ کی دو ٹکڑے ہیں وہ کمانِ گران

(۸)

ایسی کڑکی جیسے بادل ایسی ٹوٹی جیسے بجلی   شور مچا یہ چار طرف لو جیت ہی لی اُس نے بازی
سیتا نے خود رام کی گردن میں پھولوں کی مالا ڈالی

(۹)

ہونٹھوں پہ جنک جی کے آخر رخصت کو ہوئی کلمہ جاری   اے دسرتھ کے بیٹے لے جا اب تیری ہے سیتا پیاری
جیسے مجھ کو خوش رکھنا دولت تھی یہی میری ساری

(۱۰)

جیسے ہو سایہ اور بدن یہ ساتھ تمھارا یوں دیگی   ممکن ہے کبھی بھولے سے اگر ہو جائے کوئی اس سے غلطی
بے سمجھے بوجھے تم ہرگز اس پر نہ دکھانا کچھ خفگی

(۱۱)

چہرہ سے نقاب ہٹی جس دم ساون کی بجلی کوندگئی   دو گونگی نظریں جھک گئیں آنکھوں میں چکا چوندھ ایسی ہوئی
سو چاند سے بڑھ کر تابان تھی وہ حسن وجوانی کی دیوی

دوسرا ورق:۔

عجیب اک بھینی بھینی خوشبو بسی ہوئی ہے گلی گلی میں   لٹا رہے ہیں تمام پھول اپنی اپنی دولت ہنسی ہنسی میں
مسرتوں کی رواں ہیں نہریں اجودھیا کی گلی گلی میں

(۲)

مگر محل میں ہر ایک ذرہ پہ صاف چھائی ہے سخت اداسی   نہ جانے کیوں آج تڑکے تڑکے ہوئی ہے یوں رام جی کی طلبی
ضرور کل شب کو بوڑھے راجہ پہ چل گئی موہنی کسی کی

(۳)

چھری سی اک پھر گئی جگر پر جو باپ کے پاس رام پہونچے   وہ فرطِ شدت سے ہچکیوں کی عجیب تصویرِ غم بنے تھے
نہ بولنے کی تھی تاب اُنہیں نہ سر اٹھانے کی درد دل سے

(۴)

جو رام نے دیکھی ایسی حالت تو جھک کے بولے کہ میری ماتا   اداس کیوں ہیں بتا ہمارے بتائیے کچھ قصور میرا

تو کیکئی مثلِ شیرنی کے گرج کے بولی کہ سن لو بیٹا

(۵)

خفا نہیں تم سے راجہ دسرتھ مگر ضروری ہیں چند باتیں　　ہوئے تھے زخمی یہ اک لڑائی میں چل گئی تھیں عدو کی گھاتیں

بچائی تھی میں نے جان انکی تڑپ کے کاٹی تھیں کالی راتیں

(۶)

انھوں نے دو بخششوں کا وعدہ کیا تھا صحت کے بعد مجھ سے　　وہ وقت اب آ گیا ہے شاید کہ پوری دیکھوں میں انکے وعدے

مدد کرو اپنے باپ کی تم اگر ہو نیک اور سعید بیٹے

(۷)

بھرت جو ہے میرا پیارا بیٹا وہ بیٹھے گا تخت سلطنت پر　　تم آج سے چودہ سال پورے رہو گے اپنے وطن سے باہر

جو لاج رکھنی ہو بوڑھے بابا کی تم نہ ہونا ذرا مکدر

(۸)

بڑی مسرت سے رام جی نے سُنے یہ احکام سخت ماں کے　　کہا کہ میرے لئے نہ ہوگی خوشی کوئی بڑھ کے اس خوشی سے

کہ باپ کا حکم میں بجا لاؤں اور وعدے ہوں انکے پورے

(۹)

بھرت کو بلوائیے میں جاتا ہوں آج ڈنڈک کی سمت ماتا　　مگر پریشان کیوں ہیں بابا نثار تن من ہو ان پہ میرا

انھیں یہ سمجھائیے کہ خوش ہوں نہیں ہے سرکش غلام انکا

تیسرا ورق :-

رخصت کرو ہم کو پیاری بستے ہیں ہم آج سے بن میں　　چودہ سال گزر جائیں گے آنکھ جھپکتے دار محن میں

(۲)

سیتا بولیں میں بھی چلوں گی ساتھ تمھارے جوگن بن کر　　سیج بچھاؤں گی کلیوں کی جنگل جنگل مالن بن کر

(۳)

ہوسے وہ دکھ درد بہت ہیں جنگل کے رہنے میں پیاری　　وہ لوں اور وہ دھوپ کی شدت اور تم ایسی راج دلاری

(۴)

یہ بولیں جب بچھونگی میں چاند ایسے مکھڑے کو تمھارے ‌ ‌ درد ہیں جتنے ہوں گے دوا سب دکھ ہو جائیں گے کنارے

(۵)

بولے وہ کھانے کے لئے کڑوے کڑوے پھل پائینگے ‌ ‌ یہ بولیں جب آپ رہینگے میٹھے میٹھے ہو جائینگے

(۶)

بولے وہ کیا ہوگا پیاری ہوگی جس دم پیاس کی شدت ‌ ‌ یہ بولیں آواز تمھاری رکھتی ہے امرت کی لذت

(۷)

وہ بولے کھالیں اور چھالیں ہونگی بس دو چیزیں کپڑے ‌ ‌ یہ بولیں وشنو کی خاطر پاربتی نے جو پہنے تھے

(۸)

وہ بولے کہ چٹانوں پر اور سخت زمین پر ہو گا سونا ‌ ‌ یہ بولیں پہلو میں تمھارے وہ بھی مخمل کا بچھونا

(۹)

وہ بولے آفت سے بھرا ہے ہر جنگل کا کونا کونا ‌ ‌ یہ بولیں تم جا ہوگے تو مٹی ہوگی مجھ کو سونا

(۱۰)

ساتھ مصیبت میں گر چھوڑوں پاپن ہو جاؤنگی پیارے ‌ ‌ عصمت والفت کی دنیا میں کیا منھ دکھلاؤنگی پیارے

چوتھا ورق:۔

بنجارتی کا دامن پھولوں سے بھر گیا ہے ‌ ‌ طاؤس رقص میں ہیں چھائی ہوئی گھٹا ہے

ساون کی بجلیوں میں اک حشر سا بپا ہے

(۲)

بادل ابھی تھمے ہیں گھنٹوں سے روتے روتے ‌ ‌ چپکے سے لی ہے کروٹ سبزہ نے سوتے سوتے

کوئل نے دم لیا ہے جان اپنی کھوتے کھوتے

(۳)

بیٹھے ہیں اک کٹی میں بے فکر رام و سیتا ‌ ‌ اتنے میں ایک آہو اُن کی نظر سے گزرا

بھرتا ہوا چھلاوے اٹکھیلیاں دکھاتا

(۴)

کندن کی جگمگاہٹ تھی جلد سے ہویدا
چاندی کا کام سارے تن پر بنا ہوا تھا
تھا سینگ اس کا جیسے یاقوت سے تراشا

(۵)

یہ خوشنما چرندہ سیتا کو ایسا بھایا
کہنے لگیں کہ پیارے ہر دلعزیز مسیحا
جنگل سے اس کو لا دو زندہ کہ مردہ

(۶)

شاید دغا ہو اسمیں پہلے تو رام سوچے
سیتا کی ضد سے لیکن مجبور ہو کے بولے
لچھمن یہیں پہ رہنا جب تک نہ بھائی آئے

(۷)

جنگل کو چل دیئے پھر تیر و کمان لے کر
قابو نہ اُسپہ پایا کھائے بہت سے چکر
آخر چلایا ناوک سوئے غزال جھمکر

(۸)

زخمی ہوا ہرن تو بے چین ہو کے تڑپا
اور رام کی زباں میں مکاریوں پکارا
لچھمن مدد کو آؤ میری خبر لو سیتا

(۹)

سیتا تڑپ گئی جب آواز درد آئی
کہنے لگی کہ لچھمن جاؤ مدد کو جلدی
وہ بولے کیسے جاؤں جب تک نہ آئیں بھائی

(۱۰)

غصہ میں آکے بولیں سیتا کہ تم ہو بزدل
حیلہ ہے اک وفا کا قابو میں خود نہیں دل
میرے مقابلہ میں ہے مکر حیلت شکل

(۱۱)

لچھمن کو تاب ایسے الزام کی کہاں تھی
چپکے سے ہو گئے وہ جنگل کی سمت راہی

حسن و وفا کی دیوی بس رہ گئی اکیلی ہو

(۱۲)

اتنے میں اک بھکاری آیا کٹی کے در پر — پہلے تو اُس کو دیکھا سنیتا نے ہو کے مضطر
دیکھا کہ برہمن ہے تب دور ہو گیا ڈر ہو

(۱۳)

دینے لگیں وہ لا کر پھل اور سرد پانی — راون نے پھاڑ ڈالا بھیس اپنا زعفرانی
شیطان بن کے اپنی کہنے لگا کہانی ہو

(۱۴)

بن جاؤ میری بیوی تم پر فدا ہوں سیتا — لنکا کی ہو گی رانی اور میرے دل کی آستا
خدمت کریں گے لاکھوں میں بھی کروں گا پوجا

(۱۵)

نفرت کے ساتھ بولیں سیتا کہ دور ہو جا — میں اور تیری بیوی پاگل ہوا ہے تو کیا
آ سے تو دے انھیں تو ٹکڑے کا تیر انقشا ہ

(۱۶)

سنتے ہی یہ سخن وہ بس ہو گیا بگولا ہو — ظالم نے بال پکڑے اور گود میں اٹھایا
اپنے ہوائی گاڑی میں جبر سے بٹھایا

(۱۷)

طیارہ بن کے گاڑی اڑنے لگی ہوا پر — نظرت کو آ گیا خود لرزہ سا اس جفا پر
سیر دی گھن میں آیا تیر نگی قضا پر

(۱۸)

لچھمن کو بھی نہاں سے — آ جاؤ رام پیارے صدقے گئی میں جان سے
چھمن بچاؤ رکھ سے لاؤں تمھیں کہاں سے

(۱۹)

آ کے کہ تیرا — اپنا محل دکھایا اور شہر کا تماشا

کہنے لگا وہ موذی کر لو غلام سیتا

(۲۰)

شیطان ہوش میں آ غصہ سے بولیں سیتا دس سر! تو جو بھی مر کر جیو ہوں میں زندہ
اک بار بھی نہ ہوگی پوری تری تمنا

(۲۱)

سنتے ہی یہ ستمگر طیش و غضب میں آیا بولا کہ دو مہینے دیتا ہوں تم کو اچھا
ورنہ قسم ہے اپنی کھا لوں گا کر کے قیمہ

پانچواں ورق :-

ساقی پلا دے آج کہ وقت خمار ہے لنکا میں گرم معرکۂ گیر و دار ہے

(۲)

آپس کے تفرقوں کو مٹا دے وہ مے پلا بچھڑے ہوؤں کو آج ملا دے وہ مے پلا

(۳)

راون کھڑا ہے ایک طرف رام اک طرف کانٹے ہیں ایک سمت گل اندام اک طرف

(۴)

ناوک برس رہے ہیں کہ ساون کی ہے جھڑی تیروں میں ڈوب جاتے ہیں دونوں گھڑی گھڑی

(۵)

ترکش جو خالی ہو گئے تلواریں کھنچ گئیں دو بجلیاں چمکنے لگیں اُڑ کے یوں چلیں

(۶)

سورج بھی دنگ ہو گیا رام اس طرح لڑے راون کے ایک ساتھ دسوں سر قلم کئے

(۷)

لیکن ابھی پلک بھی نہ جھپکانے پائے تھے دس سر نئے کٹے ہوؤں کے گردن پہ آ گئے

(۸)

تلوار کو نیام میں پھر تھک کے رکھ لیا اور تیر اندر کا سوئے راون روانہ کیا

(۹)

ناوک کی شکل میں ہر اجل کا [illegible] تھا   برما کے دل کو پشت سے باہر نکل گیا

(۱۰)

یوں فتح پا کے [illegible]   جیسے ہو چاند حسن و لطافت کے اوج پر

چھٹا ورق :-

دشمنوں کو مار کے تمکو چھڑایا میں نے آج   اپنی حرمت اور عزت کو بچایا میں نے آج

حق کی قوت اور صداقت کو دکھایا میں نے آج

(۲)

پاس رکھ سکتا نہیں تمکو بہت معذور ہوں   مجھکو عزت چاہئے الفت سے کوسوں دور ہوں

تم مہینوں غیر کے گھر میں رہیں مجبور ہوں

(۳)

دلشکن الفاظ ایسے سنکے سیتا رو پڑی   بے بسی پر اپنی وہ مجبور دکھیا رو پڑی

اسطرح روئی کہ اسکے ساتھ دنیا رو پڑی

(۴)

اور کہا لچھمن سے جلدی کر دو طیار اک چتا   کچھ خرابی ہے تو جل جاؤنگی اسمیں برملا

ورنہ خود شعلے میری عصمت پہ ہونگے فدا

(۵)

جب چتا روشن ہوئی حیرت سے سب ہو گئے   اسمیں داخل ہو گئیں سیتا عجب انداز سے

لے لیا شعلوں نے پھر آغوش اپنی کھول کے

(۶)

بعد تھوڑی دیر کے شعلے بنے اک در بنا   اگنی دیوتا آئے اس در سے بصد حسن ضیا

اُن کے زانو پر تھیں سیتا صاف جیسے آئینہ

(۷)

اگنی دیوتا نے کہا میں جانتا ہوں دل کا حال　　آگ سے بچ جائے میری کوئی پاپی کیا مجال
اب نہ کرنا عفت و عصمت میں اسکی قیل و قال

(۸)

رام بولے ہنس کے مجھکو تو کبھی کچھ شک نہ تھا　　امتحاں دنیا کی خاطر میں نے سیتا کا لیا
سب پہ روشن ہو گیا پیاری ہے میری پارسا

(۹)

ایک گدی پر ہوئے جب چاند سورج جلوہ گر　　بن گیا تصویر حیرت پڑ گئی جس کی نظر
پھر نہ بھارت نے کبھی پیدا کئے ایسے گھر

طالب الہ آبادی

لارڈ رپن کا عہد حکومت

(گزشتہ سے پیوستہ)

اس تبدیلی سے اتنا ہوا کہ گورنمنٹ کو مالگزاری جمع کرنے میں بہت کم اخراجات برداشت کرنے پڑے اور ساتھ ہی روپیہ اس کے ہاتھ آگیا۔ اب سے اس نے سمجھا کہ یہ طریقہ فائدہ مند ہے اور مالی استدلال کے لازمی عمل کا یہ نتیجہ نکلا کہ قرض لینے میں ترقی ہو گئی۔ پھر دلیل یہ پیش کی گئی کہ اگر سرمایہ زمین میں لگا دیا گیا تو مالگزاری کی بچت کے ساتھ ساتھ زراعت پیشہ آبادی کی دولت میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔ لیکن سرمایہ کو لگانے کی اس سے بہتر اور کیا ترغیب ہو سکتی ہے کہ اس کی حفاظت و ضمانت کو بڑھا دیا جائے۔ کسان کو قرضہ ملا، کیونکہ اس میں روپیہ دینے کی غرض سے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے کھیت کی فصل کے علاوہ اور کوئی زیادہ قیمتی شے اپنے قرض خواہ کو پیش کرے۔ کھیت ہی کو کیوں پیش نہیں کر دیا جاتا؟ سہولتیں بہم ہوئیں، اور قرض واپس لینے کے قوانین نافذ کئے گئے۔ عدالتیں مقرر کی گئیں۔ اس عمل نے کسان کی تباہی کی تکمیل کر دی۔ وہ جتنا روپیہ چاہتا اور حسب ضرورت مل سکتا ہے اس نے کسی پس و پیش کے بغیر قرض لینا شروع کر دیا۔ صرف مالگزاری ادا کرنے اور اپنی زمین کی بہتری و ترقی کرنے کی غرض سے بلکہ اپنے آرام و آسائش کے لئے بھی۔ جو تفصیلات میں نے بیان کی ہیں خواہ وہ غلط ہوں یا صحیح، اس میں کچھ شک نہیں کہ موجودہ زمانے میں برطانوی ہندوستان میں کوئی بھی گاؤں ایسا نہیں جو شدت کے ساتھ مقروض نہ ہو۔ تحقیقات کے سلسلہ میں مجھے بنگال میں بھی کوئی ایسا گاؤں نہیں ملا جو کلیتہً قرض سے آزاد ہو۔

یہ آخری انتہائی خرابی ہے جو انگریزی نظام حکومت نے ہندوستانی کسانوں پر عاید کی ہے اور جب ان کے افلاس اور روز افزوں مالی ذمہ داریوں کا خیال کیا جاتا ہے تو اس وقت سر جان اسٹریچی جیسے اشخاص کے خیالات کے ساتھ متفق ہونا مشکل ہو جاتا ہے جو ہندوستان میں اپنے کام کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ اس امر سے کوئی انکار نہیں کرے گا کہ ہم نے زراعتی ہندوستان کے لئے مفید کام نہیں کیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ——— ہم نے اُسے نقصان تو نہیں پہنچا دیا؟ ہم نے کسان کو اتنا فائدہ پہنچایا ہے کہ زبردستی کوئی شخص اسے جان سے نہیں مار سکتا لیکن ہم نے غالباً فاقہ کشی کے ذریعہ اس کی موت کے خطرے کو بڑھا دیا ہے یہی شبہ سمجھدار ہندوستانیوں کے دلوں میں پیدا ہو رہا ہے اور انگریزوں کیلئے اچھا ہوگا اگر وہ اس پر غور کریں۔ اس سے پیشتر کہ معاملہ ہاتھ سے نکل جائے۔

ہندوستان کے روز افزوں افلاس کے نظریہ کو تسلیم کرتے ہوئے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ آخر اس کا علاج کیا ہے۔ میں ایسے مریض کے لئے جسے کلیتہً تبدیلی علاج کی ضرورت ہے اور جو مالی آرام کی جلد مہلت چاہتا ہے۔ امپیریل گورنمنٹ کی قانون سازی کی جانب سے قدرے مشتبہ ہوں۔ اور میں بنگال رینٹ ایکٹ، یا زراعتی بنکوں کے قیام یا لوکل سیلف گورنمنٹ کی تجاویز کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہوں

بجائے خود ان برائیوں کے خلاف کافی روک پیدا کرنے والی ثابت ہوتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ [illegible] فائدہ پہنچیگا کہ ٹیکس کا بار جو بوجھ ہے اُسے [illegible] سے اور پر منتقل کر دیا جائیگا۔ تجاویز ات کے بوجھ میں سے ایک پائی بھی کم نہیں کریگی اور نہ گورنمنٹ کے شفیقانہ ارادوں پر [illegible] قائم کرنے میں مدد دیں گی۔ اس مصیبت کو ایک سال کے لئے ملتوی کر دیں گی جو پالیسی کے موجودہ [illegible] کے مطابق لازمی طور پر [illegible] نہیں ملک۔ مالیات تمام برائی کی جڑ ہے اور جب تک اُسے مفید بنیاد پر قائم نہ کیا جائیگا کوئی علاج مفید ثابت نہ ہوگا۔

جب میں کلکتہ میں تھا تو اس وقت ہندوستانی ماہرین اقتصادیات سے طول طویل بحثیں رہا کرتی تھیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ دوسرے [illegible] اس بارے میں کیا ہیں۔ صوبہ کی ضروریات کے متعلق مجھے تعلیم دینے کی غرض سے [illegible] جو ایک جلسہ کیا گیا تھا [illegible] اس لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ ہندوستانی مالیات کے متعلق جو کچھ ہندوستانیوں کے خیالات ہیں میں ان سے واقف ہوں۔ [illegible] کلکتہ کے بجٹ میں یہ خرابی ہے کہ وزیر مالیات محض [illegible] کے مفاد کو پیش نظر رکھنے کے بجائے جسکی وہ خدمت کرتا ہے جیسا کہ [illegible] کیا جاتا ہے، ہندوستان میں ہندوستان کے مفاد کے بجائے انگلستان کے فوائد کو ملحوظ رکھتا ہے۔ یہاں کے باشندوں کی ضروریات کی جانب توجہ کرنے سے پہلے دو قسم کے انگریزی مفاد کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اول یہ کہ اینگلو انڈین نظام حکومت کو قائم رکھا جائے اور اسے بڑی تنخواہ اور الاؤنس دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ انگریزی تجارت کو ہر قسم کا فائدہ پہنچایا جائے۔ میرے لئے یہ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ [illegible] اور فوجی تکمیل کے اخراجات [illegible] تمام دنیا میں یہ حکومت اپنے فوجی اخراجات کے [illegible] اور اگر ہم [illegible] دعویٰ کر سکتی ہے [illegible] مالی اعتبار سے ناکام ہونے سے کوئی [illegible] نہیں روک سکتی۔

ہندوستان میں جو لوگ سیاحت کرنے کی غرض سے آتے ہیں وہ یہ دیکھکر حیران رہ جاتے ہیں کہ ایک انگریز ملازم خواہ اس کی کتنی ہی معمولی حیثیت کیوں نہ ہو نہایت ٹھاٹھ کے ساتھ رہتا ہے۔ گورنروں اور لفٹننٹ گورنروں کے محلات پہاڑوں پر ان کی قیامگاہیں، ان کی ضیافتیں اور دعوتیں ان کے ملازموں کی وسیع تعداد، ان کے گھوڑے گاڑیاں، سفر کرتے وقت ان کی اسپیشل ٹرینیں، ان کے خیمے، ان کے عملے اور ملازمین وغیرہ [illegible] ان کی [illegible] کو ظاہر کرنے کے لئے کفایت کرتی ہیں۔ جنگلوں میں بھی ہر جگہ ایسی شان کی عمارتیں [illegible] ہیں جو [illegible] زبردست جزو شامل ہے۔ انھیں ہر بات کو ان کے تمام مقامات [illegible] حقیقت ہندوستان میں مددگار ہوتے ہیں [illegible] وہ اپنے ملک سے دور ہیں۔ [illegible] کسی کلکٹر کی بیوی ہندوستان کی ساختہ چیزیں ہرگز [illegible] سامان حتیٰ کہ غالیچے وغیرہ بھی سب کے سب انگریزی کارخانوں کے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔

مجھے خوب یاد ہے کہ سیاحت کے ابتدائی ایام میں مجھے گرمیاں نارتھ [illegible] ریلوے[1] کے ایک معمولی جگہ کے اسٹیشن ماسٹر کی مہمانداری سے متمتع ہونے کا موقع ملا تھا۔ سو وقت مجھے یہ دیکھکر حیرت ہوئی تھی کہ وہ ایک انگریز تھا اور [illegible] کے مقابلہ میں [illegible] اور زیادہ وسیع مکان میں رہتا تھا۔ اُس کے علاوہ [illegible] کے پاس [illegible] درجہ کی [illegible] ہمراہ [illegible] سے بھرے ہوئے تھے۔ مگر در حقیقت تعجب کی کوئی وجہ بھی

[1] [illegible]

وہ اسی طریقے سے رہتا سہتا تھا جس طریقہ سے سب انگریز ہندوستان میں رہنے کے خوگر ہیں - اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جس شان کے ساتھ اس کے مرتبہ کا آدمی انگلستان میں رہ سکتاہے اس سے وہ پانچ گنی زیادہ شان کے ساتھ ہندوستان میں رہتا تھا مگر یہ سمجھنا چاہیے کہ فاقہ زدہ ہندوستانی محض اس وجہ سے بہتر حالت میں ہیں کہ ان کے حکام شان کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں - میں نے انگریز سیاح ہونے کی حیثیت سے بطور مہمان فائدہ اُٹھایا اور مجھے یہ کہتے ہوئے شرم معلوم ہوتا ہے کہ مجھے کیسے کیسے لذیذ کھانے کھانے کا اتفاق ہوا لیکن حقیقت یہ ہے کہ غریب کسان میرا میزبان تھا - کیونکہ اسی کی گاڑھی کمائی کی بدولت مجھے اچھا کھانا ملا اگرچہ وہ خود اس کھانے میں شریک تھا میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایک سیاح کھانوں کی بہتات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا - دنیا میں یقیناً اور کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں فاقہ کشی کے ساتھ کھانے کی اس قدر چیزیں ضائع جاتی ہوں - اور ایسا ملک تو کوئی بھی نہیں ہے جہاں تمام اخراجات براہ راست غربا کو برداشت کرنے پڑتے ہوں - میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا کسی نے کبھی ان ہزارہا میل لمبی سڑکوں کا تخمینہ لگایا ہے جو مختلف اینگلو انڈین چھاؤنیوں میں بنائی گئی ہیں، اور جن کا مقصد اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہ افسروں کی بیویاں اپنی گاڑیوں میں بیٹھکر ایک دوسرے سے ملنے کے لئے چلی جایا کریں - کیا کبھی کسی نے ان قطعاً فضول گھنٹہ گھروں کا شمار کیا ہے جنھیں سر رچرڈ ٹمپل اور سر بارٹل فیریر[1] کے ہم خیال گورنروں نے مختلف صوبجات میں تعمیر کیا ہے؟ میں یہ پوچھتا ہوں کہ آیا کبھی کسی نے اس بات کا حساب لگایا ہے کہ گزشتہ نصف صدی میں پانی پینے والے کسان نے شراب کے کتنے ایسے پیپوں کے لئے روپیہ ادا کیا ہے جنکا بجٹ میں کوئی تذکرہ نہیں؟ سیاح ان باتوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا - لیکن ہندوستان میں رہنے والے (انگریز) اس سے متاثر نہیں ہوتے - یہ دلائل نہیں ہیں بلکہ محض اثرات ہیں لیکن پھر بھی ان میں کچھ نہ کچھ معنی پنہاں ہیں -

اگر ہندوستانی کسان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی ضروریات کو پورا کرنے سے پیشتر اپنے انگریزی حکام کے آرام و آسائش کا خیال رکھے تو پھر اسے اپنی تجارت کو نقصان پہنچا کر انگریزی تاجروں کو برقرار رکھنا چاہیئے - ہندوستانی شاکی ہیں کہ ہندوستان کے بجٹ مرتب کرنے والے کی راہ میں بشرطیکہ وہ دیانتدار شخص ہو - مانچسٹر کے سرمایہ داروں کو فائدہ پہنچانے کا خیال ایک بہت بڑی رکاوٹ پیش کرتا ہے - اور یہ کہ اگرچہ ہر انگریزی نوآبادی کا وزیر مالیہ مال درآمد پر محصول بڑھا کر اخراجات کو پورا کر سکتا ہے، لیکن ہندوستانی وزیر اس ذریعۂ آمدنی سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا - ہندوستانی ماہرین اقتصادیات نے میں نے آزاد تجارت پر بہت کچھ بحث کی ہے - وہ کہتے ہیں کہ انگلستان جیسے ملک کے لئے جہاں کھانے کی چیزیں باہر سے آتی ہیں، فری ٹریڈ[2] بالی زندگی کے لئے لازمی شے ہے - مگر ہندوستان پر اس اصول کا اطلاق نہیں ہو سکتا - ہندوستان ریاستہائے متحدہ امریکہ یا اسٹریلیا کی نوآبادی کے مانند اپنی پیداوار بھیجنے والا ملک ہے - کوئلہ اور لوہے کو اگر خارج کر دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کے مال درآمد میں کوئی ایسی شے شامل نہیں جو زندگی کے لئے نہایت ضروری ہو - روئی کی مصنوعات اور دیگر چیزیں بھی سامان تعیش میں شامل ہیں

[1] Sir Bartle Frere
[2] Free Trade (آزاد تجارت)

جن کا استعمال بالعموم امرا کرتے ہیں اور بالخصوص یوروپین اشخاص۔ یہ یقینی امر ہے کہ کوئی ہندوستانی کسان غیر ملکی کپڑا زیب بدن نہیں کرتا یا یہ کہ فری ٹریڈ ہو جانے سے اس کے ذرائع زندگی پہلے سے سستے ہو جائینگے۔ مال درآمد کے محاصل کا اثر صرف امرا پر پڑیگا اور یہ وہ لوگ ہیں جن پر بہت ہی کم ٹیکس ہے۔ ہندوستانی کہتے ہیں کہ اس کی سیاسی ضرورت ہو تو ہو لیکن مالی اعتبار سے ہندوستان کو اس سے فائدہ نہیں پہنچتا۔ میں مانتا ہوں کہ ان کے دلائل میں مجھے کوئی خامی نظر نہیں آتی۔

وہ اس امر کی بھی شکایت کرتے ہیں کہ فری ٹریڈ نے ہندوستانی مصنوعات کا خاتمہ کر دیا ہے اور اس کے بجائے انھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔ سو سال پیشتر جب انگریزی دیہات میں چرخوں کا استعمال بند ہو گیا تو وہاں کی آبادی بڑے بڑے شہروں میں چلی آئی اور کارخانوں میں کام کرنا شروع کر دیا لیکن ہندوستان میں اس قسم کی کوئی بات وقوع میں نہیں آئی جو لوگ خالی اوقات میں کپڑا بنا کرتے تھے، اب بیکار ہیں اس لئے کہ ان کے دیہات اور شہروں کے درمیان وسیع فاصلہ ہے اور دوسرے یہ کہ شہروں میں کافی کام موجود نہیں، لہٰذا وہ بیکار رہتا ہے۔ سستی سے سستی منڈی میں چیزیں خریدنے کے اصول سے اسے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا کیونکہ اُسے کوئی چیز سستی نہیں ملتی۔ اور اگر انگریزی کارخانہ دار کسی ہندوستانی کو اپنے فائدہ میں شریک کرتا ہے تو وہ شہر والے ہیں نہ کہ کسان وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ جس کسی ہندوستانی ماہر اقتصادیات سے میں نے گفتگو کی ہے وہ یہی رائے رکھتا ہے کہ مشنری وغیرہ کے سوائے باقی سب قسم کے مال درآمد پر محصول بڑھا دیا جائے۔ اس طرح سے الدارون پر ٹیکس لگ جائیگا اور اگر اس سے دیسی مصنوعات کو ترقی دینے کا خیال پیدا ہو گیا تو اور بھی اچھا ہے۔ ہندوستانی تجارت کے متعلق حفاظتی پالیسی نافذ کر دینے کا یہ نتیجہ ہوگا کہ شہروں میں کارخانے قائم ہو جائینگے جہاں دیہات کے بیکار لوگ آکر کام کر سکیں گے اور اب تک جو نقصان ہو چکا ہے اس کی کسی حد تک تلافی ہو سکیگی۔ اگر یہ اصول غلط ہے تو میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ غلطی کہاں کی گئی ہے۔

مجھے بمبئی والے جلسہ میں جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سب کے سب اس امر کے مؤید تھے کہ کسی نہ کسی قسم کا انکم ٹیکس لگایا جائے وہ اس بات سے غافل نہ تھے کہ عام لوگ اسے پسند نہیں کریں گے بلکہ وہ ضروری سمجھتے تھے کہ دولت پر ٹیکس عاید کیا جائے وہ کہتے ہیں کہ موجودہ انکم ٹیکس ایک نفرت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور انکم ٹیکس کے مقابلہ میں بہت کم نفع کی چیز ہے۔ یہ امر ناقابل یقین معلوم ہوتا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانی حصہ شہر میں ایک چھوٹی سی دوکان کے مالک کو اپنے سامان تجارت پر اتنا ہی ٹیکس دینا پڑتا ہے جتنا کہ ایکسچینج میں کسی انگریزی تاجر کو جس کا کاروبار خواہ کروڑوں کا ہو سے دس بیس پونڈ کی رقم تجارت ... ادا کرنی پڑتی ہے۔ ہندوستانی بجٹ ... اس قدر ... انگریزی تجارت کو اور زیادہ فائدہ پہنچاتے ہیں۔ انھوں نے مجھے یقین دلایا ہے کہ جو لوگ درحقیقت انکم ٹیکس کی راہ میں رکاوٹ پیدا کر رہے ہیں۔ وہ ہندوستانی تاجر نہیں ہیں بلکہ انگریز افسر ہیں کیونکہ ان پر اس کا براہ راست اثر پڑیگا۔ اگر مال درآمد

ف۱ اس سطور کو لکھنے کے بعد سے سنا ہے ہندوستان کے چند کپڑا بننے کے کارخانے قائم ہو گئے ہیں ... لیکن ... وہ لنکا شائر کے مال کا مقابلہ نہیں کر سکتے لارڈ کرزن بھی اسی غرض سے مصر میں مقابلہ میں محاصل جنگی عاید کئے تھے ... ف۲ ... ف۳ ... ف۴

اور آمدنیوں پر ٹیکس لگا دیئے جائیں تو غریب زراعتی آبادی کو قدرے آرام پہنچیگا لیکن کسی اور طریقہ سے یہ بات ممکن نہیں۔

زراعتی اصلاح کے بارے میں جس قانون کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اور جسکے متعلق تمام ہندوستان متفق ہے، وہ یہ ہے کہ جس طرح سے ۹۰ سال پیشتر بنگال میں بندوبست دوامی کر دیا گیا تھا اور اس کے ذریعہ گورنمنٹ کے غیر واجبی حقوق ملکیت کو محدود کر دیا گیا تھا اسی طرح تمام ہندوستان میں اس کا رواج کر دیا جائے جہاں جہاں حکومت کے حق ملکیت کا استعمال کیا گیا ہے وہاں مفلسی اور بے چینی پھیل گئی ہے اور صرف بنگال ہی (جہاں اس کا عمل درآمد نہیں ہے) خوش حال حالت میں ہے[1]، میں مسئلہ پر یہاں بحث نہیں کروں گا۔ اس مقام پر صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بنگال رینٹ بل کے خلاف جو زبردست شورش آج کل کیجا رہی ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ لوگ بندوبست دوامی کے حامی ہو گئے ہیں۔ یہ قانون لارڈ رپن کی غیر معمولی ہر دلعزیزی کے باوجود نہایت غیر ہر دلعزیز رہا ہے اور ہندوستانی سیاست دان یہ سمجھتے ہیں کہ جو احد صوبہ شاہی خزانہ میں اپنی دولت جمع کرنے سے اب تک بچا رہا ہے اس کی خوشحالی کو قانون ہذا کے ذریعہ نقصان پہنچانے کی کوشش کیجا رہی ہے میں بھی یقین کرنے پر مائل ہوں کہ لارڈ رپن نے تو نہیں لیکن اُن کے بعض مشیروں کا ایسا ارادہ ہوگا فی الحال میں اتنا بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ تمام ہندوستان بندوبست دوامی کا سخت مطالبہ کر رہا ہے ہندوستانی ماہرین اقتصادیات مختصراً یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ جس طرح سے اسٹریلیا اور دیگر نو آبادیوں میں بیرونی مصنوعات کی درآمد پر محصول لگایا جاتا ہے اسی طرح سے ہندوستان میں بھی عاید کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ جہاں تک ممکن ہو مالی بوجھ کو غریب زراعتی آبادی سے ہٹا کر مالدار تجارت پیشہ لوگوں پر منتقل کر دیا جائے تیسرے گورنمنٹ زمین کے متعلق بے نفع داری سے دستبردار ہو جائے ممکن ہے کہ انگلستان میں ان خیالات و جذبات کو مہمل و بے معنی قرار دیا جائے، لیکن یہ یقینی ہے کہ ہندوستانی رائے ہمارے خلاف ہے اور ہمارا اصول کفایت شعاری کے سبب ہندوستان دن بدن تباہی کے قریب آتا جاتا ہے۔ بلاشبہ موجودہ صورت حالات میں کہیں نہ کہیں خرابی ضرور مضمر ہے اس لئے کہ گورنمنٹ ملک کی تمام مالگذاری ہضم کرنے کے بعد بھی اپنے تئیں مالی مشکلات میں پاتی ہے زمین کا اصلی مالک ہونے کی حیثیت سے گورنمنٹ زمین کے لئے کچھ نہیں کرتی تمام روپیہ اور امور بیہ ضایع کر دیا جاتا ہے، اور جو لوگ زمین کی کاشت کرتے ہیں وہ سال بسال زیادہ غریب اور نا امید ہوتے جاتے ہیں، اسی کو میں زراعتی خطرہ سے تعبیر کرتا ہوں

نوٹ:۔ اس مضمون کے ۱۸۸۲ء میں شائع ہونے کے بعد سے نمک کے غیر منصفانہ محصول میں کچھ کمی کر دی گئی ہے۔ لیکن دیگر اقتصادی خرابیاں بدستور قائم ہیں مال درآمد پر ٹیکس لگانے سے دیسی مصنوعات کو از سر نو زندہ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی اور بندوبست دوامی ہی منظور کیا گیا ہے باوجود اس کے کہ اس اصول کو مصر میں مساوی حالات کے ماتحت زراعتی خوشحالی برقرار کرنے میں حیرت انگیز کامیابی ہوئی ہے۔ ہر وائسرائے یہی کہتا چلا آیا ہے کہ قحط اقتصادی اسباب کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ "صدائی فعل ہے" کیونکہ یہی بارش کو روک دیتا ہے۔ امپیریل اخراجات کم نہیں کئے گئے اور کسانوں پر سے انفرادی قرض کا بوجھ ہلکا کیا گیا ہے جس کی بوزیس برطانوی ہندوستان کے اکثر حصہ میں حکومت کے اسامی کی سی ہے جسے اپنی زمین کی قیمت کے مساوی لگان دینا پڑتا ہے۔

ض - ا - ب - برنی

[1] میرا خیال ہے کہ سر جان اسٹریچی یہ چاہتے تھے کہ جس طرح سے بھی بن پڑے مالیات کے مفاد کی خاطر بنگال کے بندوبست دوامی کو منسوخ کر دیا جائے۔

استفسارات

غالب کی مثنوی نگاری

(جناب سید بدر عالم صاحب شاہ پور)

کچھ عرصہ سے آپ کے رسالہ میں "غالب کے ذوقِ فارسی" پر ایک مسلسل مضمون غلام ربانی صاحب عزیز کا نکل رہا ہے جس میں ایک وقت تک اس کی مثنوی نگاری سے بحث کی گئی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ بحث تمام ہوگئی یا باقی ہے، لیکن ابھی نا تمام ہے تو بھی میرا جہاں تک خیال ہے۔ جناب عزیز ربانی اس بحث کو چھیڑتے ہوئے معلوم نہیں ہوتے کہ مثنوی نگاری میں غالب کا سب سے بلند کارنامہ کیا ہے اور کن اسباب کی بنا پر اسے ایسا کہا جا سکتا ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ آپ نے اس سلسلہ میں کبھی کوئی نوٹ نہیں دیا اور نہ اپنی رائے اس مضمون کے متعلق ظاہر کی تاکہ اسی سے کچھ اس حقیقت پر روشنی پڑتی بہر حال اب میری خواہش یہی ہے کہ آپ مطلع فرمائیں کہ غالب نے اپنی مثنویوں میں کس جگہ اور کیا امتیاز پیدا کیا ہے اور اس صنف میں اس کا شاہکار کیا ہے؟

(نگار) غالب کے ذوقِ فارسی کے متعلق مولوی غلام ربانی صاحب عزیز کا مضمون ابھی ختم نہیں ہوا، لیکن مثنوی کے نسبت انھیں جو کچھ لکھنا تھا لکھ چکے ہیں۔ آئندہ قصاید و رباعیات سے بحث کی گئی ہے اس لئے اگر اس مضمون کے شائع شدہ حصہ کو آپ تشنہ پاتے ہیں، تو تشنہ ہی رہیگا۔

میں نے بیشک کوئی رائے اپنی ظاہر نہیں کی تھی، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ میرا یہ سکوت برابر قائم رہتا، خیال تھا کہ جس وقت یہ مضمون مکمل ہو جائے گا، اسوقت اسپر تبصرہ کرونگا لیکن آپ کی بیتابی نے مہلت نہ دی اور میرے عہد انتظار کی مدت کو مختصر کر دیا۔

مولوی غلام ربانی صاحب نے اس وقت تک غالب کی فارسی مثنویوں کے متعلق جو کچھ اظہار خیال کیا ہے، وہ یقیناً "آخری لفظ" تو نہیں سمجھا جا سکتا، لیکن ایسی حالت میں کہ لوگ اس کے اردو کلام کی طرف سے کسی طرح ہٹتے ہی نہ تھے اور کبھی یہ غور کرنے کی زحمت برداشت ہی نہ کرتے تھے کہ غالب حقیقتاً غالب کہاں نظر آتا ہے۔ انھوں نے ایک ایسا نغمہ چھیڑا جو بالکل برمحل تھا۔ میں نے اس مضمون کی اشاعت اس لئے نہیں کی تھی کہ اسمیں اب کسی کلام کی گنجائش نہیں، بلکہ برخلاف اس کے مقصود یہی تھا کہ لوگوں کو "کلام" کا موقع ملے اور وہ نگاہیں جو اس کے صرف دیوان اردو پر جمی ہوئی ہیں، کسی طرح دوسری طرف بھی مائل ہوں۔ چنانچہ ایک مثال آپ ہی کی ہے کہ اس مضمون کو دیکھ کر یہ استفسار آپ کے ذہن میں پیدا ہوا اور مجھے بھی لب کشائی پر مجبور کیا

جب کسی شاعر کا کلام ہمارے سامنے ہوتا ہے تو ہم اس کی قوت شاعری کا اندازہ یا اُس کا صحیح میلان طبع جن اصناف سخن کو دیکھکر معلوم کرتے ہیں وہ غزل، قصیدہ اور مثنوی ہیں (قطعہ، رباعی کا ذکر میں نے اس لئے نہیں کیا کہ محض قطعات و رباعیات کے لحاظ سے شہرت حاصل کرنے والے کم ہیں اور ایسے تو بہت ہی کم ہیں جن کے عمر کا ماحصل صرف یہی ہو) اور انھیں کا ذخیرہ اردو فارسی میں کثرت سے موجود ہے۔

میں کسی طرح ماننے کے لئے طیار نہیں کہ ایک شاعر ان تینوں اصناف سخن میں یکساں قدرت رکھ سکتا ہے کیونکہ بہ لحاظ شعر ہونے کے جس طرح یہ تینوں ایک ہی چیز نظر آتی ہیں، اسی طرح اپنے داعیات کے لحاظ سے ایک دوسرے کے منافی بھی ہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک کا مقصود علیحدہ ہے اور مقصود کی علیحدگی حقیقتاً خیال کی علیحدگی، زبان کی علیحدگی ہے۔

قصیدہ و غزل کے فرق کو پیش نظر رکھ کر جب آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ایک کامیاب قصیدہ گو فیلسوف ہو سکتا ہے، خلاق معانی ہو سکتا ہے، ماہر لسانیات ہو سکتا ہے اور اگر اس کے دماغ کو مادی دنیا کے مطالعہ کا موقع ملے تو ایک کامیاب تاجر ہوشیار ماہر سیاست اور موجد و مخترع بھی ہو سکتا ہے، لیکن اس سے ہمدردی کی توقع رکھنا اس کے اندر جذبۂ ایثار و قدویت کی جستجو کرنا، یا اس کا دوستی اخلاق کی طرف مائل ہونا۔ اور دنیا میں اپنے آپ کو رحمت و برکت کی صورت سے پیش کرنا خلاف عقل ہے۔ اسی طرح ایک اچھا غزل گو، محبت میں قربانی کر سکتا ہے۔ ایک مفید متمدن انسان بن سکتا ہے۔ روحانیت میں ترقی کر کے وہ ایثار کرنے والا مصلح اور اپنے اوپر تکلیف اٹھا کر دوسروں کے لئے امن و سکون کی راہیں نکالنے والا مرد صالح بن سکتا ہے، لیکن اس سے یہ توقع کرنا کہ وہ مادی ترقی کی راہیں سوچے، سیاسیات میں ترقی کرے اور علوم و فنون کی اعانت کرے بالکل عبث ہے

پھر جب ان دونوں کی راہیں اس قدر علیحدہ علیحدہ ہیں تو کیونکر ممکن ہے کہ ایک کامیاب قصیدہ گو، کامیاب غزل گو اور اچھا غزل کہنے والا اچھا قصیدہ خوان ہو سکتا ہے۔ خاقانی کا سارا کلام پڑھ جائیے۔ انوری کا سارا کلیات ختم کر جائیے لیکن سعدی کی ان دو شعروں میں کسی ایک مصرع کا بھی جواب آپ کو نہ ملیگا۔

سرو سیمینا بصحرا میروی نیک بدعهدی کہ بے ما میروی

دیدۂ سعدی و دل ہمراہ تست تا نہ پنداری کہ تنہا میروی

خاقانی، غم عشق کا ذکر بھی کرتا ہے تو ان الفاظ میں۔

غم تخم خرمی ست کہ در یک دل افگنم در دست جنس من کہ یک دل آدم

کہ اگر حقیقتاً کسی پر کوئی کیف محبت طاری ہو تو بھی یہ شعر سنکر فوراً دور ہو جائے الغرض قصیدہ و غزل کے معیار بالکل جدا جدا ہیں اور مجھے حیرت ہوتی ہے کہ وہ لوگ جو اچھی غزل کہہ سکتے ہیں کیونکہ قصیدہ گوئی کی جرأت کرتے ہیں یا قصیدہ میں کامیاب ہونے والے غزل کی طرف کیوں مائل ہوتے ہیں۔

جس طرح قصیدہ و غزل سے الگ الگ [illegible] تبصرہ [illegible] کے لئے [illegible] چونکہ [illegible]
[illegible] نظم [illegible] [illegible] [illegible] تصنیف [illegible] کا [illegible] [illegible]
جزئیات پر قادر ہے بلکہ بجز کسی غیر ضروری رنگ آمیزی کے ان کو ظاہر کرنے کی بھی قدرت رکھتا ہے کیونکہ اگر اس [illegible] سے کام
لیا گیا تو واقعات کی اصلی [illegible] خراب ہو جائے گی اور مثنوی کا حسن غارت [illegible] ایک ایسے نقاش [illegible] کی ضرورت ہے جو [illegible]
امتزاج سے [illegible] کے جذبات کو [illegible] کر سکتا ہے [illegible] بالکل [illegible] قادر ہے [illegible]
زبان کا سادہ [illegible] تشبیہ [illegible] کا سر [illegible] [illegible] [illegible] متعلق [illegible] الفاظ [illegible]
[illegible] بالکل السامی [illegible] [illegible] [illegible] کا اچھا جانا۔

[illegible] غزل قصیدہ [illegible] اور ان تینوں کے علیحدہ علیحدہ
[illegible] خصوصیات کو [illegible] [illegible] [illegible] بعض [illegible] جنھوں نے قصیدہ [illegible]
اور غزل [illegible] [illegible] [illegible] شہرت حاصل کی اس لئے اگر
ان [illegible] کے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] صحیح معلوم ہوتا ہے کیا حقیقتاً
[illegible] کیونکہ [illegible] ایسے [illegible] [illegible] [illegible] صنف سخن [illegible]
خصوصیات [illegible] [illegible] [illegible] نے ان کے تمام اصناف سخن
کو [illegible] مخصوص [illegible] نہیں آتے
[illegible] سکتے ہیں [illegible] [illegible] خصوصیات کا لحاظ کر کے اپنے
[illegible] پیدا کر لیتے ہیں [illegible] کوئی [illegible] [illegible] پیدا کر دیتا ہے۔
ایسے [illegible] [illegible] [illegible] ہرگز ظاہر [illegible]
[illegible]

[illegible] ایک خاص
گانے کی مشق کرتے ہیں اور [illegible] [illegible] [illegible] لیکن دونوں
ایسے ہوتے ہیں [illegible] خیال اور ٹھمری [illegible] [illegible]
تم سمجھنا ہی [illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

مثلاً سعدی اپنی غزل گوئی کے لحاظ سے یا خاقانی اور انوری قصیدہ گوئی کی حیثیت سے بالکل ایک ایسے دُہرپدیے کی حیثیت رکھتے ہیں جس میں کوئی اور خصوصیت ایسی نہیں ہے جو ان کو موسیقی کے کسی اور صنف میں کامیاب بنا سکے، برخلاف اس کے امیر خسرو، عرفی اور غالب اس گویے کی طرح ہیں جسکی خوش گلوئی اُسے ہر رنگ میں کامیاب کرکے دکھا دیتی ہے۔ حالانکہ وہ باہر کسی کا نہیں ہے یا صرف ایک چیز کا ہے

آپ نے عرفی کے کلام کا مطالعہ کیا ہوگا اور اس کے قصاید کو دیکھ کر یہ حکم لگایا ہوگا کہ یہ قصاید ہی کے لئے وضع ہوا تھا، حالانکہ حقیقت یہ نہیں میرے نزدیک وہ صرف رنگیں غزلگوئی کے لئے پیدا ہوا تھا۔ (صحیح تغزل سعدی کا اس کے ہاں بھی نہیں ہے) لیکن چونکہ زبان کی رنگینی، خیال کی لطافت، اسلوب بیان کی ملاحت ایک ایسی چیز ہے جو بنا اثر پیدا کئے بغیر نہیں رہتی اس لئے ایک شخص اس کے قصاید میں ان خصوصیات کو دیکھ کر یہی سمجھنے لگتا ہے کہ وہ قصیدہ گوئی کے لئے پیدا ہوا تھا۔ یہاں ایک شبہہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر عرفی صرف غزلگو شاعر تھا تو اس کا دیوان کیوں پھیکا ہے۔ لیکن اس کا سبب صرف یہ تھا کہ زمانہ کی ضرورت نے اسکو مجبور کیا تھا۔ وہ قصاید ہی کی طرف توجہ کرے اور اپنے کمال کی قوت کو اس صنف میں ظاہر کرے، چنانچہ وہ اس میں کامیاب ہوا اور تمام وہ رنگینیاں، تمام وہ حلاوتیں، تمام وہ لوچ جو ایک غزل ہی کے لئے زیادہ موزوں ہیں اس کے قصاید میں پیدا ہو گئے۔ پھر یہ آپ کو اختیار ہے کہ اس کی ان نظموں کو آپ قصاید کہئے یا کچھ اور لیکن میں تو اس کے قصاید کو ہمیشہ غزل سمجھ کر لطف اٹھاتا ہوں۔

عرفی کے وہ قصاید جن میں سے قصیدہ کا تمام شوکت و دبدبہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے صرف چند ہیں لیکن وہ اپنی فطری غزلگوئی سے یہاں بھی مجبور ہو گیا۔ انھیں چند میں سے اس کا ایک قصیدہ نعت میں ہے جو اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

سپیدہ دم چو زدم آستین بشمع شعور — شنیدم آیہ استفتحوا ز عالم نور

اور یقیناً قصیدہ کا خالص رنگ رکھتا ہے، لیکن دوسرے ہی شعر سے فوراً یہ رنگ اس طرح تبدیل ہو جاتا ہے۔

بدل ز شاہد بزم ازل ندا آمد — کہ اے تمام وفا از رضائے ما بس دور
زہے اطاعت حسن ادب خہے طاعت — کہ با اجازت مائی ز وصل ما مہجور
زیادہ زیں نہ حلالست دوری از بر ما — اگر بحوصلہ تازی در آبہ بزم حضور
طلب بیار و مترس از متاع منع کلیم — بساط عذر میار اکہ نیستی معذور
اگر کرشمۂ مقصود دست عشوۂ ما — شکست ساغر امید او بسنگ فتور
نہ کوتہی ز عطا بود عشق میداند — کہ بر کرشمۂ ما ننگ بود خلعت طور

اسی طرح کا ایک دوسرا نعتیہ قصیدہ ہے جو اس شعر سے شروع ہوتا ہے۔

اقبال کرم میگزد ارباب ہمم را — ہمت نخورد نیشتر لا و نعم را

کیسا پُرشوکت شعر ہے، لیکن دوسرا شعر ملاحظہ ہو۔

ازرغبت دنیا الم آشوب مگردم   زین باد پریشاں نکنم زلفِ الم را

زلف کا خیال آہی گیا، اس سے زیادہ لطف وہاں پیدا ہوتا ہے جب اسی قصیدہ میں آگے چلکر وہ حدوث و قدم کے ایسے خشک الفاظ کا استعمال اس طرح کرتا ہے۔

تقدیر بیک ناقہ نشا نید دو محمل   سلمائے حدث تو و لیلائے قدم را

یہاں بھی اس کا کام بغیر سلمیٰ اور لیلےٰ کے ذکر کے نہ چلسکا۔

یہ حال ان قصاید کا ہے جہاں وہ حدود غزلگوئی سے بہت بچکر گیا ہے، لیکن جو قصاید اُس نے پوری تغزل کی کیفیت پیدا کر کے کہے ہیں وہاں تو ان جواہر پاروں کا انبار نظر آتا ہے۔ آپ نے اس کا وہ مشہور قصیدہ دیکھا ہوگا جس کا پہلا شعر یہ ہے:۔

جہاں بگردم و دردا بہیچ شہر و دیار   نیافتم کہ فروشند بخت در بازار

اور اسمیں آپ نے ان قسموں سے بھی لطف اٹھایا ہوگا جو عرفی نے کھائی ہیں، پھر آپ ہی انصاف کیجئے کہ کیا غزل کے لئے اس سے زیادہ کسی اور کیفیت کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے وہ خدا کی قسم کھاتا ہے لیکن اس انداز سے:۔

بدان خدائے کہ در شہر بند امکان نیست   متاع معرفتش نیم ذرہ در بازار

اس کے بعد وہ اور چند قسمیں کھاکر آخرکار ان قسموں پر آجاتا ہے:۔

بعشوۂ کہ زلیخا بُرید از و کف دست   بفتنۂ کہ مسیحا گزیر از و سر دار
بہ برقعِ مہ کنعاں کہ بود حسن آباد   بہ حجلہ گاہِ زلیخا کہ بود یوسف زار
بہ آن متاع کہ گوہر فروش کنعانی   بمصر بُرد و لبالب ز حسن شد بازار
بہ آن دروغ کہ فرہاد از و شہادت یافت   بہ آن ترانہ کہ منصور را کشید بدار
بہ ناقۂ کہ بہ لیلےٰ خیال مجنون بُرد   بہ آن کرشمہ کہ لیلی بر آن نمود نثار
بہ تیشۂ کہ بر اطراف صورت شیریں   ہمہ کرشمہ تراشید و ریخت بر کہسار

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ اشعار غزل نہیں ہیں۔ دوسرے قصیدوں کے اور چند اشعار ملاحظہ کیجئے:۔

دمید لشکر غم صف کشد بخونخواری   دلم بنالہ دہد منصب علمداری
خراب نرگس مستانۂ تو ام کہ نہد   ہزار شیوۂ مستی بہ طبع ہوشیاری

. . . .

دراں دیار [illegible] چہ [illegible] بسیاری

[illegible] ہمہ شوق [illegible]

[illegible] دوست [illegible] ساماں [illegible]

. . . .

[illegible]

[illegible] پریشانی [illegible]

[illegible]

[illegible] آب [illegible] جبین [illegible]

[illegible]

. . . .

[illegible]

[illegible]

گل [illegible]

بار [illegible] پریشاں [illegible] نیساں [illegible]

[illegible]

میرے نزدیک یہ اشعار اور اسی قسم کے [illegible] اشعار [illegible] لیکن [illegible] ہیں۔

یہ سلسلہ کلام میں خدا جانے کہاں ہے [illegible] کلام [illegible] ہیں

کہ ان کے متعلق یہ حکم لگانا کہ انکا صحیح رنگ طبیعت کیا ہے مشکل ہوجاتا ہے [illegible] غالب [illegible]

غالب کے فارسی کلام [illegible] سے معلوم ہوتا ہے [illegible] نہیں [illegible] کامیاب

کار [illegible] ہے۔ درحقیقت [illegible] خیر [illegible] عرفی کی تقلید [illegible] مکمل تقلید [illegible]

صفحہ علی محمد [illegible] لکھنؤ سے چھپ کر [illegible] شائع ہوئے

شکل سے دونوں میں امتیاز پیدا کرسکتے ہیں چنانچہ وہ خود بھی اس کو محسوس کرکے کہتا ہے :-

کیفیت عرفی طلب از طینت غالب جام دگراں بادۂ شیراز ندارد

غزل میں اس نے نظیری اور بیدل کے رنگ کو اعتدال کے ساتھ ملاکر پیش کیا اور اس حسن کے ساتھ کہ اس سے زیادہ ممکن نہ تھا بیدل سے فائدہ اٹھانے کا اعلان اس نے اپنے اردو دیوان میں کیا ہے اور نظیری کی پیروی کو یوں ظاہر کرتا ہے :-

زفیض نطق خویشم با نظیری ہم زبان غالب چراغے را کہ دودے ہست در سر زود در گیرد

مدعا یہ کہ جو شمع نظیری کی ذات سے روشن تھی اسے اب غالب نے روشن کیا ہے

اب رہا مثنوی کا مسئلہ، سو میں بلا تامل کہوں گا کہ غالب مثنوی کہنے کے لئے وضع نہ ہوا تھا اور نہ صحیح معنے میں اس نے کوئی مثنوی کہی، لیکن چونکہ بادۂ شیراز کی اس کے ہاں کمی نہ تھی، اس لئے مثنوی کے نام سے بھی اس نے جو کچھ کہا وہ رنگ و کیفیت سے خالی نہ رہا۔

کلیات غالب میں گیارہ مثنویاں نظر آتی ہیں جنہیں دس تو ایسی ہیں جو بہت مختصر ہیں اور جن کا موضوع مدح تقریظ اور اعتراض، تہنیت وغیرہ ہے جنھیں مثنوی سے کوئی علاقہ نہیں۔ گیارہویں مثنوی جس کا عنوان ابر گہر بار ہے بیشک طویل بھی ہے اور موضوع و ترتیب کے لحاظ سے بھی مثنوی کے تحت میں آتی ہے۔ اس میں حمد، نعت، منقبت، مناجات، حکایت، ساقی نامہ، مغنی نامہ سبھی کچھ ہے اور غالب کی طرف سے اگر کوئی کامیاب نمونہ مثنوی کا پیش کیا جا سکتا ہے تو یہی ہے

حمد و نعت یا مناجات کے لئے جس عجز و فتادگی کی ضرورت ہے وہ بیشک اس کے کلام میں پیدا نہیں ہوئی کیونکہ یہ اس کا رنگ نہ تھا لیکن جہانتک کہ جذبات کی بلندی، خیال کی پاکیزگی، زبان کی حلاوت کا تعلق ہے وہ ان میں بھی پائی جاتی ہے مگر اس مثنوی کا بہترین حصہ وہ ہے جہاں محشر کا منظر پیش کرکے خدا کے سامنے اپنی شکایات کا دفتر کھولا ہے۔

ایک شاعر کے کلام کا بہترین حصہ وہ ہوتا ہے جس میں وہ بے اختیار ہو کر اپنے آپ کو ظاہر کرنے لگتا ہے اور مثنوی کی اس وجہ میں غالب نے اپنے آپ کو اس قدر تکمیل کے ساتھ ظاہر کر دیا ہے کہ اگر کوئی چاہے تو اس سے غالب کی زندگی کے تمام جذبات کا مطالعہ بیک وقت کرسکتا ہے۔ محشر میں نیکوں اور بدوں کے اجتماع کے ساتھ اپنے وجود کا ذکر کرتا ہے :-

بروزے کہ مردم شوند انجمن شود تازہ پیوند جانہا بہ تن
رواں را بہ نیکی نواز ندگان بسرمایۂ خویش نازندگان
گہرہاے شہوار پیش آورند فروہیدہ کردار پیش آورند
زنورے کہ ریزند در خرمن کنند جہاں را بچشم روشن کنند
بہ ہنگامہ با این جگر گوشگاں در آیند مشتے جگر تشنگاں

زحسرت بدل بردہ دنداں فرو　　زخجلت سر اندر گریبان فرو
درآن حلقہ من باشم و سینۂ　　زغمہائے ایام گنجینۂ
درآبے درآتش بسر بردۂ　　ز دشواریِ زیستن مردۂ

اس کے بعد اور بہت سے شعر لکھ کر کہتا ہے :-

حساب مے درامش و رنگ بوے　　زجمشید و بہرام و پرویز جوئے
کہ از بادہ تا چہرہ افروختند　　دل دشمن و چشم بد سوختند
نہ از من کہ از تابے گاہ گاہ　　بدریوزہ رخ کردہ باشم سیاہ

یعنی کہاں تک ضبط کروں دل خون ہوگیا، اور پھر یوں بھی جب تو بغیر کہے سب کچھ جانتا ہے تو نہ کہنے سے کیا فائدہ۔ تجھے معلوم ہے کہ میں کافر ہوں، نہ گبر و ترسا نہ میں نے کسی کا خون کیا، نہ راہزنی کی۔ البتہ اگر کوئی قصور ہوا ہے تو صرف یہ کہ شراب پی ہے، سو اس کا مواخذہ اگر کرنا ہے تو جمشید و بہرام وغیرہ سے ہونا چاہئے جن کی عمریں اسکی لطف میں بسر ہوگئی نہ میں کہ اگر کبھی مجبور ہو کر پی بھی تو گدائی کر کے اور اس شان کیساتھ کہ :-

نہ بستان سرائے نہ میخانۂ　　نہ دستاں سرائے نہ جانانۂ
نہ رقص پری پیکراں بر بساط　　نہ غوغائے رامشگراں در بساط

اس کے بعد وہ اس خیال کو ظاہر کرتا ہے کہ خدا جانے کتنی بہاریں، کتنی برساتیں اور کتنی چاندنی راتیں بے سر و سامانی اور بادہ نوشی کی حسرتوں میں گزر گئیں، اگر کبھی کوئی سامان مہیا ہوا بھی تو "رقص بسمل" کی طرح ناپائیدار، نہ دنیا میں مجھے کوئی ایسا قدرداں بادشاہ ملا جو مجھے مالامال کر دیتا نہ کوئی ایسا معشوق ملا جو اسباب لطف پیدا کر دیتا۔ غالب کے الفاظ یہ ہیں :-

بسا روزگاراں بدلدادگی　　بسا نوبہاراں بہ بے بادگی
بسا ذرباران وشبہائے ماہ　　کہ بودست بے مے بہ پیشم سیاہ
انقہا پُر از ابر بہمن مہی　　سفالینہ جامِ من از مے تہی
بہاران و من درغم برگ و ساز　　درخانہ از بینوائی فراز
جہان از گل و لالہ پُر بو و رنگ　　من و حجرۂ و دامنے زیر سنگ
دم عیش جز رقص بسمل نبود　　باندازۂ خواہش دل نبود
اگر تافتم رشتہ گوہر شکست　　وگر یافتم بادہ ساغر شکست

. . . .

بہ گیتی درم بے نوا داشتی | دلم را اسیر ہوا داشتی
نہ بخشندہ شاہے کہ بارم دہد | بہر بار زر چہل بارم دہد
نہ نازک نگارے کہ نازش کشم | بہر بوسہ زلف و رازش کشم

اس کے بعد وہ یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ اگر میں فردوس میں گیا تو بھی وہاں کیا خاک لطف آئے گا۔ اگر وہاں صبوحی پی بھی تو جام بلور زہرۂ صبح اور ابر کا جھوم جھوم کر آنا کہاں؟ حور ملی بھی تو اس سے کیا لطف۔ معشوق کے ملنے کا لطف یہ ہے کہ پہلے اس سے فراق ہو، ہم بلائیں وہ گریز کرے، قسمیں کھائے اور وعدہ پورا نہ کرے اس کے علاوہ فردوس میں نظر بازی کا بھی کوئی لطف نہیں اور نہ وہاں دیواریں کوئی روزن کہ اس سے جھانک تانک کی جائے وغیرہ وغیرہ۔

غالب اس خیال کو جس تاثر و کیفیت کے ساتھ بیان کرتا ہے اس کا حسن اسی کے الفاظ میں دیکھنا چاہئے:-

چو آن نامرادی بیاد آیدم | بفردوس ہم دل نیاسایدم
دلے را کہ کمتر شکیبد بباغ | در آتش چہ سوزی بہ سوزندہ داغ
صبوحی خورم گر شراب طہور | کجا زہرۂ صبح و جام بلور
دم شبرد ہیائے مستانہ کو | بہ ہنگامہ غوغائے مستانہ کو
سیہ مستی ابر و باراں کجا | خزاں چوں نباشد بہاراں کجا
اگر حور، در دل خیالش کہ چہ | غم ہجر و ذوق وصالش کہ چہ
چہ منت نہد ناشناسا نگار | چہ لذت دہد وصل بے انتظار
گریزد دم بوسہ اینش کجا | فریبد بہ سوگند دینش کجا
بر د حکم و نبود لبش تلخ گوئے | دہد کام و نبود دلش کام جوئے
نظر بازی و ذوق دیدار کو | بفردوس روزن بدیوار کو
نہ پستم آرزومندو لالۂ | نہ دل تشنۂ ماہ پرکالۂ

اس کے بعد کہتا ہے کہ پھر جب میری حسرتوں کا اور ناکامیوں کا یہ عالم ہوگا تو

بفرمائے کایں داوری چوں بود | کہ از جرم من حسرت افزوں بود

مثنوی کے اس قصہ میں گویا غالب نے پہلے اس شعر کی تفسیر بیان کی ہے -

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد | یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

یا یوں کہئے کہ مثنوی کے اس حصہ کا خلاصہ اس شعر میں بیان کیا ہے

قصیدہ ہو یا غزل، غالب بادہ نوشی اور اس کے متعلقات کے بیان میں خاص ملکہ رکھتے تھے اور اسی لئے مثنوی میں جب یہ قصہ آگیا تو انھوں نے کلیجہ نکال کر رکھ دیا

غلام ربانی صاحب عزیز کی نگاہ میں غالباً اس حصہ کی طرف نہیں گئی۔ ورنہ وہ ضرور اس کی طرف توجہ کرتے یا ممکن ہے کہ انھوں نے اس کو توجہ کے قابل نہ سمجھا ہو، بہرحال میرے نزدیک غالب کی مثنویوں میں کوئی ٹکڑا اس سے بہتر نہیں ہے، ورنہ یوں تو وہ جس رنگ کا شاعر تھا اس کی جھلک ہر جگہ اور ہر شعر سے ظاہر ہے خواہ وہ قصیدہ ہو یا غزل، قطعہ ہو یا رباعی

کتب موصولہ

نیٹشے مترجمہ پروفیسر سید مظفر الدین ندوی ایم اے۔ لکچرار ڈھاکہ یونیورسٹی ضخامت ۱۰۲ صفحے مطبوعہ مطبع معارف قیمت عہ ملنے کا پتہ دار المصنفین اعظم گڑھ۔

نیٹشے، جرمنی کا ایک مشہور فلسفی گزرا ہے جس کے خیالات نے جنگ عظیم کے بعد سے زیادہ شہرت پائی ہے۔ بحیثیت فلسفی ہونے کے اسکا پایہ چنداں بلند نہیں اس کی شہرت کا راز انگریزوں کی برائی اور مسیحیت کی تردید میں مضمر ہے اُس کے فلسفیانہ مضامین کے روشن ادبی پہلو نے اس کی شہرت میں اور چار چاند لگا دیے۔

نیٹشے نے مسیحیت پر جہاں اور بہت سے اعتراض وارد کئے ہیں جنکی بنا پر اقبال کو "دستش از خون چلیپا احمر است" کہنا پڑا وہاں وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ "اگلے زمانہ کی تہذیب و تمدن سے ہمیں جو پھل ملنے والا تھا مسیحیت نے اسکو غارت کر دیا اور پھر جبکہ تمدن اسلام سے جو پھل ہمیں مل رہا تھا اسے بھی مسیحیت نے برباد کر دیا۔ مسیحیت نے اندلس کے شاندار تمدن اسلام کا گلا گھونٹ دیا۔ صلیبی جماعتیں مسلمانوں سے بار بار لڑائیاں لڑیں لیکن اس سے کہیں بہتر ہوتا کہ زمین پھٹ جاتی اور وہ اندر سما جاتے سگ صلیبی اعلیٰ درجے کی رہزنی تھی"۔ نیٹشے کی مسیحیت سے دشمنی بڑھتے بڑھتے مادیت کی آخری سرحد کو عبور کر گئی یہاں تک کہ خدا کو وہ ظالم کے سوا اور کچھ تصور ہی نہ کر سکتا تھا۔

ایک طرف مسیحیت پر شاندار تمدن اسلامی کے برباد کرنے کا الزام دوسرے جانب نیٹشے کے ظالم خدا کو دیکھ کر شاعر یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ "قلب او مومن دماغش کافر است" نیٹشے اشتراکیت کا دشمن ہے وہ انسان کی مساوات کو تسلیم نہیں کرتا اس کے خیالات اور نظریوں پر بحث کرنے میں سب سے بڑی دقت یہ واقع ہوتی ہے کہ وہ اپنے ایک اصول پر قائم نہیں رہتا آج ایک بات کہتا ہے تو کل دوسری وہ بھی ایک دوسرے کے منافی۔ ابتدائی زمانہ میں اسپنسر شوپنہار کا رنگ غالب تھا جیسے کبھی کبھی وہ فوق البشر تک تسلیم کرنے کو تیار ہو جاتا تھا۔ لیکن آخر میں اسکی نظریے "ماورائے خیر و شر" اور فوق البشر ازم نے ایک اجتہادی شان پیدا کر دی ہے۔

افسوس ہے کہ اصل کتاب ہمارے پیش نظر نہیں ہے اس لئے ترجمہ کے متعلق زیادہ صحیح رائے قائم نہیں کیجا سکتی۔ بظاہر زبان فلسفیانہ موضوع کو دیکھتے ہوئے کچھ دشوار نہیں معلوم ہوتی۔ حضرت مترجم خود بھی ترجمہ کے شکوہ سنج ہیں اور اسکی دقتوں سے واقف کتابت کی غلطیاں بھی کہیں کہیں نظر آتی ہیں مثلاً "نو قدیم ایران کا مشہور و معروف مقنن لکھا ہے بعض جرمن ناموں کا تلفظ بھی غلط ہے مثلاً مین بجائے رہائنا، گیٹے بجائے گوئٹے، نٹشے بجائے نیٹشے، وغیرہ ذیل کے حواشی پر دوبارہ نظر ڈالنے کی ضرورت ہے خصوصاً مل، ڈاروں، کارلایل وغیرہ پر جو نوٹ رہ گئے ہیں وہ خالی از اغلاط نہیں جن الفاظ کے لئے اصطلاحیں مقرر ہو چکی ہیں

ان کی پابندی کی اشد ضرورت ہے مثلاً صفحہ ۳ پر (Socialism) کا ترجمہ اشتراکیت کیا گیا ہے حالانکہ اشتراکیت (Communism) کا ترجمہ ہے (Socialism) کے لئے صحیح اصطلاح اجتماعیت ہے (Anarchism) کا ترجمہ فساد و شورش کے بجائے فوضویت، زیادہ مناسب تھا۔ امید ہے کہ طبع ثانی میں ان امور کا لحاظ رکھا جائے گا۔ جو لوگ نیٹشے کے خیالات سے واقف ہونا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوگی۔ یہ اور بات ہے کہ اردو زبان میں بعض بالغ نظر حضرات نیٹشے پر خصوصیت کے ساتھ دار المصنفین کی کوئی کتاب ہی دیکھنا پسند نہیں فرماتے

دنیائے افسانہ

جناب محمد عبد القادر سروری بی اے نے جو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے فاضل ہیں، یہ کتاب لکھی ہے اور غالباً اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ اردو زبان میں اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب ہے۔

چونکہ افسانہ نگاری کا رواج اب بہت وسیع ہوتا جا رہا ہے اور اسی کے ساتھ اکثر و بیشتر حصہ ان لوگوں کا ہے جو اس فن سے بالکل ناواقف ہیں، اس لئے جناب سروری کی محنت یقیناً قابل ستائش ہے کہ انھوں نے اس تصنیف کو پیش کر کے کم از کم یہ خیال پیدا کرنے کی تو کوشش کی کہ فن افسانہ نگاری ایک مستقل فن ہے اور ہر وہ شخص جو آئینہ رکھتے کا مدعی ہو۔ دعوائے اسکندری نہیں کر سکتا

یہ کتاب ۲۰ ابواب پر منقسم ہے اور ان میں افسانوں کی اہمیت، فنون لطیفہ اور افسانہ، افسانوں کی پیدائش، حقیقت اور افسانہ افسانوں کی قسمیں افسانہ کا ارتقا، ناول کی پیدائش ناول کا موضوع ناول کے عناصر، ناول کے منازل، اعلیٰ ناول کے خصوصیات ناول نگار کے فرائض، مختصر قصے، مختصر قصوں کا فن، اردو زبان اور افسانے، ابتدائی دور کے افسانے، فورٹ ولیم کالج کی کوشش اردو ناول، اردو مختصر افسانے، اردو افسانوں کے مستقبل سے بحث کی گئی ہے۔

اس فہرست سے صرف یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ فاضل مصنف نے بحث کے کسی پہلو کو چھوڑا نہیں ہے۔ لیکن اگر کتاب کا مطالعہ کیا جائے تو اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ انھوں نے کسی بحث کو تشنہ نہیں رہنے دیا اور جہاں تک تنقید و تمحیص کا تعلق ہے وہ اس میں بہت کامیاب ہوئے ہیں۔

میری رائے میں اس کتاب کا مطالعہ نہ صرف افسانہ نگار و ناول نویس کے لئے ضروری ہے بلکہ ان لوگوں کو بھی اس کا مطالعہ کرنا چاہئے جو افسانے اور ناول پسند کرتے ہیں تاکہ وہ سمجھ سکیں کہ افسانہ نگاری کا اصل معیار کیا ہے۔ اور اسی لحاظ سے وہ حسن و قبح کے متعلق فیصلہ کر سکیں۔

یہ کتاب مکتبۂ ابراہیمیہ اتحادی اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے عہ میں مل سکتی ہے۔

تاریخ فلسفۂ اسلام

ہالینڈ کے مشہور مستشرق دی بوئر نے انیسویں صدی میں فلسفۂ اسلام پر ایک کتاب لکھی تھی جس کا ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی، پروفیسر جامعہ ملیہ دہلی نے اردو میں اس نام سے

پیش کیا ہے۔

چونکہ د دبوئر کی یہ کتاب غیر زبان کی کتابوں میں اس موضوع پر مستند سمجھی جاتی ہے اس لئے اس کا ترجمہ ہوجانا فائدہ سے خالی نہیں ہے۔ لیکن بہتر ہوتا اگر فاضل مترجم اسی کے ساتھ ایک مقدمہ کا بھی اضافہ فرما دیتے تاکہ اصل کتاب پر تنقید بھی ہوجاتی اور وہ اسقام جو فارابی، ابن سینا ابن طفیل، ابن باجہ اور ابن رشد وغیرہ کے متعلق اظہار رائے میں کہیں کہیں پیدا ہوگئے ہیں، دور ہوجاتے

بہرحال بحالت موجودہ بھی کتاب بہت مفید اور پُر از معلومات ہے۔ طباعت کتابت نہایت پاکیزہ ہے اور دو روپیہ میں مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی سے مل سکتی ہے۔

بیداری ہند جلد اول

جس طرح دنیا مہاتما گاندھی کی ہستی سے روشناس ہے اسی طرح ان کے مشہور اخبار ینگ انڈیا سے بھی واقف ہے سنہ ۱۹۱۹ء سے لیکر اس وقت تک مہاتما گاندھی نے ینگ انڈیا کے ذریعہ سے جس جس انداز سے اپنے پیغام کو ملک تک پہونچایا اور جن جن نازک موقعوں پر رہبری کی، وہ بھی کم از کم انگریزی طبقہ سے مخفی نہیں ہے،

ضرورت تھی کہ مہاتما گاندھی کے ان خیالات کی نشر و اشاعت اردو داں جماعت کے لئے بھی ہوتی اور اس لئے ملک کو شکر گزار ہونا چاہئے جناب متصدی لال صاحب کا جنھوں نے میرٹھ میں ایک مخصوص دارالاشاعت قائم کرکے اس اہم ذمہ داری کو انجام دینا سر لیا اور پہلی جلد شائع کر دی۔ اس جلد میں تمام ان مضامین کا ترجمہ ہے جو سنہ ۱۹ء سے لیکر سنہ ۲۰ء تک مہاتما گاندھی کے قلم سے نکلے اور باقی مضامین سنہ ۲۱ء سے سنہ ۲۵ء تک کے دوسری جلد میں ہوں گے

حصۂ زیر تنقید میں کیا کیا مباحث ہیں اس کی تفصیل تو دشوار ہے لیکن یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس دو سال کے اندر کوئی اہم مسئلہ ملک و بیرون ملک کا ایسا نہیں ہے جس کے متعلق آپ اس میں رہبری نہ پائیں۔ ترجمہ بہت صاف و سلیس ہے اور طباعت کتابت بھی نہایت پاکیزہ ہے۔ ۴۰۰ صفحہ کی گنجائش کتابت ہے اور ۲۰×۲۶/۸ کی تقطیع ہے اس لئے قیمت دو روپیہ کسی طرح زاید نہیں ہوسکتی۔

میری رائے میں ہر وہ شخص جس کو کچھ بھی دلچسپی سیاسیات سے ہے اس کا فرض ہے کہ اس کو اپنے مطالعہ میں رکھے۔ یہ کتاب دارالاشاعت بیداری ہند میرٹھ کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

عروس ادب

حضرت ہوش بلگرامی کے مضامین کا مجموعہ ہے جو حال ہی میں اس نام سے شائع ہوا ہے ہرچند نام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں صرف اُن کے ادبی مضامین ہوں گے لیکن دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاسیات تاریخ، اور اخلاقیات کا عنصر غالب ہے اور چونکہ ان خشک مباحث میں بھی حضرت ہوش کے رنگینیِ قلم بدستور قائم ہے اس لئے اس مجموعہ کو عروس ادب کہنا نادرست نہیں ہوسکتا

حضرت ہوش کے نام سے علمی و ادبی دنیا ناواقف نہیں ہے کیونکہ جس زمانہ میں آپ حیدرآباد سے ذخیرہ نکالتے تھے آپ نے

ادیبوں کی صف میں اور آپ کے رسالہ نے اچھے رسالوں کی فہرست میں نمایاں جگہ حاصل کرلی تھی۔ چونکہ اس کے بعد بھی آپ رسائل وجرائد میں برابر مضامین لکھتے رہے اس لئے آپ کا ادبی رشتہ ملک سے قائم رہا اور ہے۔

خالص ادبیات کے تحت میں جو مضامین آپ کے قلم سے نکلے ہیں وہ بالکل تنقیدی ہیں اور اسی سے آپ کی ادبی ذوق کی پاکیزگی ظاہر ہوتی ہے۔ تاریخی حصہ میں ابونصر، مدہاناک بلگرامی، شہریار دکن، اخلاقیات میں مقصد حیات، اور موت خصوصیت کیساتھ قابل داد ہیں۔

حضرت ہوش کا انداز تحریر بالکل انھیں کا ہے تقلیدی نہیں ہے جو ان کے ذہن میں آتا ہے اُسے بغیر کسی تصنع کے ظاہر کردیتے ہیں۔ اور اسی لئے بیساختہ پن بہت ہے۔ ہوش نظر تاہت شوخ واقع ہوئے ہیں جس کا علم مجھے تو خیر ذاتی شناسائی و تعارف کیوجہ سے ہے۔ لیکن ایک شخص جس نے انھیں دیکھا وہ بھی اس مجموعہ کو پڑھکر یہی سمجھے گا کہ ان کی طبیعت نچلی رہنے والی نہیں ہے۔

یہ مجموعہ بہترین طباعت وکتابت کے ساتھ چکنے کاغذ پر شائع ہوا ہے اور علاوہ محصول دو روپیہ میں دفتر نگار سے مل سکتا ہے۔

پریم درپن ہز اکسلینسی مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر صدر اعظم حیدرآباد کی ایک مختصر سی مثنوی ہے جسمیں عہد جہانگیری کے ایک ایک تاریخی واقعہ کو نظم کیا گیا ہے۔ واقعہ صرف اس قدر ہے کہ جہانگیر ایک روز شکار کے لئے جنگل میں دور نکل گیا اور اسے پیاس کی تکلیف محسوس ہونے لگی اس کو ایک مندر نظر آیا۔ یہ وہاں پہونچا تو اسے ایک ہندو لڑکی نظر آئی جس کا نام روپ سنگار تھا۔ اس نے لڑکی سے پانی طلب کیا، اس نے پانی کے ساتھ جو کھانا حاضر تھا وہ بھی پیش کیا۔ اتفاق سے لڑکی اس کے ہاتھ میں انگوٹھی دیکھ کر متحیر سی ہوئی۔ کیونکہ اس کا باپ زائچہ بناکر ایک پیشین گوئی کرگیا تھا کہ ایک مرتبہ دہلی کا بادشاہ تیرا مہمان ہوگا اُسکے ہات میں یاقوت کی انگوٹھی ہوگی اور وہی ذریعہ کامیابی ہوگا۔ آخر کار جہانگیر کو بھی اس پیشین گوئی کا حال معلوم ہوگیا۔ بڑی دہوم سے اس کی شادی ایک معزز برہمن سے کرکے سوا لاکھ کی جاگیر اس کے جہیز میں ہمیشہ کے لئے دیدی۔ مہاراجہ بہادر نے اس واقعہ کو اسقدر خوبصورتی اور اثر کے ساتھ قلمبند کیا ہے کہ اُن کی شاعرانہ قوت اور مشق سخن کی داد دینی پڑتی ہے۔ اس نظم کی ابتدا ساقی نامہ سے کی گئی ہے اس کے بعد مہاراجہ بہادر نے اپنے کیش وملت کو اس طرح ظاہر کیا ہے کہ :۔

میں ہوں موحد میں ہوں صوفی — عارف بیخود مجنوں صوفی
دیکھتا ہوں وحدت میں کثرت — کثرت میں پاتا ہوں وحدت
میں ہوں ہندو میں ہوں مسلماں — ہر مذہب ہے میرا ایماں
شاد کا مذہب شاد ہی جانے — آزادی آزاد ہی جانے

اس کے بعد آپ نے موجودہ مسلم ہندو کشمکش کا نہایت عبرتناک الفاظ میں ذکر کیا ہے کہ :۔

ہندو مسلم ایک تھے پہلے — بیر نہ تھا کچھ نیک تھے پہلے

بغض وحسد سے پاک تھا سینہ　　دل سب کا تھا صاف آئینہ

. . . .　　. . . . .

عہد اکبر بھول گیا کیا　　دور گزشتہ آہ ہوا کیا

. . . .　　. . . . .

بڑھکے عزیزوں سے تھے ہندو　　طاقت دل تھے قوت بازو
دلسوزی تھی ہمدردی تھی　　ایک کو اک کی ہمدردی تھی

جہانگیر جب مندر پر پہونچا تو وہاں کا حال ان الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے۔

سامنے اس کے چشمہ ہے جاری　　اور تر و تازہ پھولوں کی کیاری
دیکھا وہاں اک حور لقا کو　　حسن کی دیوی ہوشربا کو
ماتھے پر چندن کا ٹیکا　　جس سے قمر کا رنگ ہو پھیکا
میلی سی بوسیدہ ساری　　اسپہ بھی صورت پیاری پیاری

جہانگیر اُس کو دیکھکر بولا۔

میں ہوں مسافر رہ گم کردہ　　بھول کے رستہ یاں آنکلا ہوں
تشنہ جگر کی آگ بجھا دے　　بیٹی تھوڑا پانی پلا دے

جب یہ کھانے پینے سے فارغ ہوا تو اُس لڑکی کی ماں باہر آئی اور بیٹی سے پوچھا۔

. . . .　　یہ نو وارد کون ہے روپا
شاہنشاہ نے دیکھ کے چہرا　　سر بہر تسلیم جھکایا
بولا میں ہوں ایک سپاہی　　دور فتادۂ لشکر شاہی
دہلی کا ہوں رہنے والا　　رنج و مصیبت سہنے والا
رستہ بھولا ادھر آنکلا ہو　　پائی راحت دل ہوا ٹھنڈا
شکر گزار اس لڑکی کا ہوں　　دل سے ہوں میں اس کا ممنون
کھانا کھلایا پانی پلایا　　ایک مسافر کا غم کھایا

ہنسنے لگی یہ سنکر روپا　　سر کو جھکایا ہات کو جوڑا

بولی میں پہچان گئی ہوں　　سچ کہتے ہو کیونکر مانوں
تم ہو شاہنشاہ ہمارے　　انداتا ہو واہ ہمارے

اس کے بعد جہانگیر کو زائچہ اور پیشین گوئی کا سارا حال روپا نے بتایا اور بولی کہ :-

آپ کا کہنا میں ہوں سپاہی　　دور افتادۂ لشکر شاہی
کون اسے تسلیم کرے گا　　آپ ہمارے ہیں انداتا

اس کو سنکر شاہنشاہ ہنسا اور بولا　　کوئی بھی ہوں میں اس سے غرض کیا

آج سے تم اماں ہو میری　　روپا میری بیٹی حقیقی ہو

جہانگیر پھر اس لڑکی کو نور جہاں کے پاس لے گیا اور وہاں چند دن کے بعد ٹالی کوٹا میں اس کی شادی ایک معزز برہمن سے ہوئی اسوقت کی تحریر مہاراجہ شاد کے پرزور قلم نے اس طرح کھینچی ہے :-

تھا پر لطف عجب وہ منظر　　شاہنشاہ جب آیا اندر
شاہجہاں بھی ساتھ تھا اس کے　　کل درباری اس کے پیچھے
تخت شہی کے جملہ ارکین　　تھے یہ براتی با صد تمکین
بھنوری دیکھی رسمیں برتیں　　مذہبی اور ملکی جتنی تھیں
نکلا جہیز اندر سے باہر　　صحن محل کا بھر گیا یکسر
ٹالی کوٹا کی بھی ریاست　　شاہ نے کی روپا کو عنایت
سولہ لاکھ کا حاصل جس کا　　نام یہ تھا روپا کے لکھا
پھر اس میں لاکھوں کا اضافہ　　شاہجہاں نے بھی فرمایا
عالمگیر نے بھی شاہانہ　　دی جاگیر اسے سالانہ
بیش بہا وہ شہ نے انگوٹھی　　اول دن جو روپا کو دی تھی
ہے محفوظ خزانہ میں اتبک　　رکھی ہے توشکخانہ میں اتبک

اس مثنوی کو ختم کرنے کے بعد نتیجہ جن الفاظ میں پیش کیا گیا ہے وہ بھی ملاحظہ کے قابل ہے :-

اب کچھ قوم کی حالت دیکھو　　دیکھا علم، جہالت دیکھو
آئے دن کی جنگ وجدل ہے　　آپس ہی میں ردوبدل ہے

گائے کی قربانی پہ جھگڑا — آگ پہ جھگڑا پانی پہ جھگڑا
مسجد کی دیوار پہ جھگڑا — باجوں کی جھنکار پہ جھگڑا
اسیر ہیں سوراج کے طالب — تخت کے طالب تاج کے طالب

ساری مثنوی اس قدر سادہ اور سلیس زبان میں لکھی گئی ہے کہ اس سے زیادہ سلاست کا امکان نہیں۔ دیگر محاسن شاعری کے متعلق کچھ لکھنا بیکار ہے۔ کیونکہ مہاراجہ شاد نہایت کہنہ مشق اور استادانہ رنگ کے کہنے والے ہیں جس سے ملک کا ہر فرد واقف ہے میرے نزدیک اس مثنوی کا مطالعہ ہر شخص پر فرض ہے اور ضرورت ہے کہ اُسے مدارس میں داخل نصاب کر دیا جائے تاکہ جو درس محبت واتفاق اس میں دیا گیا ہے وہ اسکول کی چار دیواری کے اندر ہی بچوں کے دل و دماغ تک پہونچ جائے۔ قیمت ۴ر رکھی گئی ہے اور سید صادق حسین صاحب غبار پیشکار مہاراجہ بہادر کے پتہ سے ملسکتی ہے۔

شرح شادمانی بر قصائد خاقانی

جناب شادمان لکھنوی نے جو رامپور کے اورنٹیل اسکول میں فارسی کے استاد اعلیٰ ہیں خاقانی کے اُن تیرہ قصیدوں کی شرح (جو الہ آباد، لکھنو اور لاہور وغیرہ کے فارسی امتحانات میں داخل نصاب ہیں) اس نام سے شائع کی ہے جو ۳۰۸ صفحات کو محیط ہے۔

جناب شادمان نے پہلے مختصراً اپنی اُن تمام مساعی کا اظہار کیا ہے جو شرح کرنے میں اُن کو برداشت کرنی پڑیں اور پھر خاقانی کے مختصر حالات لکھکر شرح کا آغاز کیا ہے۔ اس کی شرح وتفسیر کے سلسلہ میں انھوں نے اپنے بعض معاصرین پر کہیں کہیں حملے بھی کئے ہیں جس کی ضرورت نہ تھی نفس شرح کے متعلق تو اس وقت کوئی صحیح رائے دے سکتا تھا جب بااستیعاب اس کا مطالعہ کرتا، لیکن جا بجا سرسری نگاہ ڈالنے سے میں اس نتیجہ پر ضرور پہونچا ہوں کہ جناب شادماں نے کافی محنت ومطالعہ کے بعد اس شرح کو مرتب کیا ہے اور یہ طالب علموں کی ضرورت کو بڑی حد تک پورا کرنے والی ہے۔ بعض ان الفاظ کی تشریح میں جنکا تعلق روایات مذہب یا تاریخ مذہب سے ہے مجھے اختلاف ہے اس طرح کہیں کہیں تحقیق الفاظ میں بھی تسامح سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن اختلاف کے یہ معنی نہیں کہ میں جناب شادمان کے اس قابل قدر سعی وکاوش کا اعتراف نہ کروں۔ انھوں نے یقیناً اس کتاب سے بہت مفید اضافہ اردو لٹریچر میں کیا ہے کیونکہ خاقانی کا کلام سمجھنا ہی بہت دشوار ہے چہ جائیکہ دوسروں کو سمجھانا۔ کتابت، طباعت، کاغذ نہایت نفیس ہے اور جناب شادمان سے رامپور اورنٹیل اسکول کے پتہ سے ملسکتی ہے قیمت درج نہیں ہے

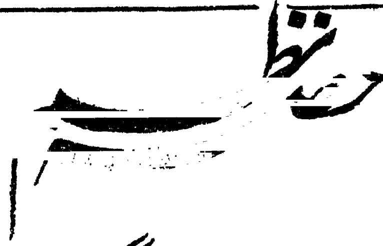
طفل اشک

یہ ترجمہ ہے کسی انگریزی ناول کا جسے مولوی محمد حسن صاحب صدیقی بی اے (علیگ) نے صاف وشستہ زبان میں کیا ہے مجھے اس کے پڑھنے کی فرصت تو نہیں ملی لیکن جا بجا ورق گردانی کرنے سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ مترجم نے کافی محنت سے اس خدمت کو انجام دیا ہے۔ فسانہ مغرب کے کسی متوسط الحال شریف گھرانہ سے متعلق ہے اور غالباً عامیانہ ذوق سے بلند ہے طباعت کتابت نہایت اچھی ہے ضخامت ۴۰۰ صفحات۔ ملنے کا پتہ مطبع رہبر دکن افضلگنج حیدرآباد ہے اور قیمت ہے

درثمین مجموعہ ہے اُن مختلف ۲۳ نظموں کا جنھیں مختلف حضرات نے مسز سروجنی نائیڈو کے انگریزی منظومات سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ مسز سروجنی کی شاعرانہ خوبیوں کا ذکر تحصیل حاصل ہے۔ ترجمہ بعض نظموں کا اچھا کیا گیا ہے اور بعض میں صرف خیال کو ظاہر کر دیا گیا ہے۔ اردو نظموں کے ساتھ انگریزی نظم بھی دیدی گئی ہے اس لئے یہ مجموعہ ان لوگوں کے بھی کار آمد ہے جو صرف انگریزی میں ان نظموں کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ قیمت مجلد ۱۲؍ اور بلا مجلد ۱۰؍ رکھی گئی ہے جو زائد ہے۔ احمدیہ پریس چار مینار حیدر آباد سے یہ مجموعہ مل سکتا ہے۔

سیر گل مجموعہ ہے جناب جلیل احمد صاحب قدوائی بی اے (علیگ) کے مختصر افسانوں کا جن میں سے بعض روسی معجز نگار چیخوف کے افسانوں کا ترجمہ ہیں اور بعض خود ان کی طبعزاد ہیں۔ چیخوف کے کمال فسانہ نگاری کے متعلق لکھنا بیکار ہے کیونکہ وہ روس کے نہایت ہی مقبول ادیبوں میں تھا، جناب جلیل نے ترجمہ میں بڑی کامیابی کے ساتھ اس کے افسانوں کی روح کو قائم رکھا ہے۔ خود اُن کے طبعزاد افسانے بھی خوب ہیں اور تجزیۂ سیرت، جزئیات نگاری، اثر آفرینی، سلاست زبان اور بلندی تخیل کے لحاظ سے قابل داد ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ جناب جلیل قدرت کی طرف سے بہت رومان پسند دماغ لیکر آئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اُن کے افسانے بجائے بیدار کرنے کے انسان کو سوجانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ طباعت کتابت نہایت پسندیدہ ہے ۱۲؍ میں مسلم یونیورسٹی پریس علی گڈھ سے ملسکتا ہے۔

مرقع ادب جناب صفدر مرزا پوری نے نہایت محنت و کاوش سے ملک کے اکثر شعراء و مشاہیر ادب کے خطوط اس نام سے جمع کئے ہیں اور اسمیں شک نہیں کہ بعض حضرات کے خطوط نہایت دلچسپ و با مزہ ہیں شروع میں چند خطوط غالب کے بھی ہیں جو اس وقت تک شائع نہیں ہوئے تھے۔ یہ مجموعہ نہایت دلچسپ ہے اور تنہائی کے لئے بہترین ذریعۂ تفریح۔ جناب ریاض خیر آبادی کے خطوط میرے نزدیک اس مجموعہ میں خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ قیمت علاوہ محصول دو روپیہ۔ منیجر نگار اور صدیق بکڈپو لکھنؤ سے مل سکتا ہے۔



کارزار زندگی

اے شہیدِ دلفریبہائے کالائے حیات — وے قتیلِ جلوہ پاشی شہابِ زندگی
زندگی نومیدی و امید کی ہے کشمکش — شعلہ در آغوش رہتا ہے سحابِ زندگی
دردِ ناکامی و حسرت سے رہیگا تلخ ہی — کیف سے لبریز مینائے شرابِ زندگی
قلزمِ ہستی میں فطرت کی کشاکش ہے ضرور — جس سے اٹھتا اور مٹتا ہے حبابِ زندگی
عیش و ناکامی کے ہنگامے ہیں ہنگامی سبھی — فطرتِ انساں ہے تفسیرِ کتابِ زندگی
ہے کبھی زینت دہِ تاج و کلاہِ خسرواں — خاک میں غلطاں کبھی درِ خوشابِ زندگی
ابرِ آذاری کی آمد سے کبھی سرسبز ہے — ہے خزاں خوردہ کبھی شاخِ گلابِ زندگی

ہستیٔ انساں چو مد و جزر را گہوارہ ایست
زاں متاعِ عیش در گردابِ او ہموارہ ایست

غلام ربانی عزیز

مجنون عامری کی تصویر کو دیکھکر

یہ وحشت سوادِ غم — یہ کاہش وفا شیم
یہ سوزشِ دروں ستم! — یہ حالِ زارِ پُر الم
ہے عشق سب ترا کرم — کہ ایک پیکرِ نعم
عرب کا صاحبِ خدم — رئیسِ دولت و حشم
ہیں جس کے در پہ سر قدم — جہاں نہ مارے کوئی دم
مگر ترے طفیل سے
وہ زار ہے، نزار ہے
یہ خار زارِ بے سکوں — یہ دشتِ نجد اور جنوں

یہ حالِ جذبۂ دروں — ہوا ہے، حد سے اب فزوں
تپاں ہے، قلبِ نیلگوں — رواں ہے چشمِ تر سے خوں
نہیں ہے کوئی رہنموں — سکھائے جو کوئی فسوں
کہاں ہے بختِ تیرہ گوں — کہے جو آکر اس سے یوں
کہ اے مریضِ جستجو!
یہ ایک خار زار ہے،
اسیرِ عشقِ جانستاں — رہینِ لذتِ فغاں
نثارِ محملِ رواں، — عرب کا ایک نوجواں
ہوا ہے ایسا نیم جاں — کہ استخواں ہیں سب عیاں

اسے یہی ہے، کچھ گماں
کہ آرہی ہے "جانِ جاں"
ہے دشت میں رواں دواں
وہ "روحِ دل" مگر کہاں
خیال ہی خیال ہیں
یہ وقفِ انتظار ہے

ہو داغِ قلب، خندہ زن
مثالِ لالۂ چمن
ہے چاک چاک، پیرہن
ہے سارا مضمحل بدن
خیالِ یارِ دل شکن
ہو دل میں ایک جنوں فگن
برات ہے نہ، ہے دلہن!
نہ بزم ہے، نہ انجمن
نہ ناقہ ہے نہ سیم تن
فقط ہے، ایک حسنِ ظن
خیال کی فضا میں بس
غبار ہی، غبار ہے

نگاہ کر کے چار سو
بہا کر آنکھ سے لہو
ہے پھر وہ وقفِ ہاؤہو
کہ بر نہ آئی آرزو
فدائے حسن و عشق خو
نثارِ لطفِ جستجو
جسے نہ پاسِ آبرو،
مگر کہاں؟ وہ "ماہرو"
جو آکے چشمِ فتنہ جو
دکھائے "اس غریب" کو
تنہ سے اک کھجور کے
کھڑا ہو "جاں نثار" ہے

قدیر ایولوی

سازِ زندگی

جام میں مئے ہے میں کیف کیف میں رازِ زندگی
کیف ہے زندگی کا سوز، سوز ہے سازِ زندگی
زخمۂ یاس سے مرا سازِ امید توڑ کر
مطربِ روزگار نے کھو دیا سازِ زندگی
موت ہے کیسی عشوہ زا! کیسی الم نصیب زیست!
طالبِ موت ہو وہی جس پہ ہے نازِ زندگی
ہوگئی جان کا عذاب کشمکشِ حیات و موت
جلتی ہے موت دیکھکر ہوں میں وہ نازِ زندگی
ہیں یہ شہاب طالعِ بد کی ستم ظریفیاں
تم کو دکھائے یوں امید اوج و فرازِ زندگی

شہاب برنی

غزلیات

جناب اکبر حیدری

جہانِ حسن میں محوِ ترنم ہے وفا میری
میں نغمہ ہوں محبت کا محبت ہے صدا میری

دلِ مضطر کو جبیرِ اعتبارِ کامرانی تھا
مرے احساسِ خودداری میں پردہ التجا میری

امینِ دورِ مستقبل ہیں میرے خاک کے ذرے
حقیقت میں بقا کا پیش خیمہ ہے فنا میری

مشیت کی نگاہوں میں جو معیارِ پرستش تھی
ہوئی ہے جذبِ اشکِ خونفشاں میں وہ دعا میری

جہانِ قدس تک روحِ تخیل سیر کر آئی
مری پرواز کتنی ہے کہاں تک ہے فضا میری

اک آنسو اور وہ بھی دل کی رنگینی سے بیگانہ
نہ دیکھی جائیگی دنیا سے تصویرِ وفا میری

نیاز و ناز کا افسانہ لکھنے کے لئے اکبر
سنی ہے کاتبِ قدرت نے رسول التجا میری

حضرت راز رامپوری

پھر بسانا ہے کسی عالم کو
دیکھو دیکھو نہ مٹاؤ ہمکو

سجدے کرنے کو ملک کافی تھے
کیوں بنایا ہے بنی آدم کو

سادگی ہائے محبت یعنی
ان سے امیدِ وفا ہے ہم کو

منزلیں ہجر کی طے کرنا ہیں
رات اندھیری ہے ستارو چمکو

شادمانی کی تمنا نکریں
غم ملے جائے جو پیہم ہمکو

لاؤ غم سارا مجھی کو دیدو
دیکھتے کیا ہو بھرے عالم کو

زندہ رہنا نہ سکھاؤ لیکن
جان دینا تو بتا دو ہمکو

راز دنیا سے الگ بیٹھے ہیں
لوگ کیوں چھیڑ رہے ہیں ہمکو

حضرت حافظ غازیپوری

اسرار ابتدا کی کوئی انتہا نہیں — میں نقطۂ ازل تو ہوں لیکن خدا نہیں

ہستی کا حرف حرفِ سکون آشنا نہیں — وہ کون ہے جو گرمِ رہِ مدعا نہیں

دیکھا نہیں ہے تجھکو کہ اب دیکھتا نہیں — یہ بات دوسری ہے جو خود آشنا نہیں

ہٹ کر حدودِ منظرِ فانی سے دیکھئے — اک مبدءِ نشاط ہے کچھ ماسوا نہیں

عشقِ ادب سرشت ہے محوِ سجودِ شوق — اللہ رے نازِ حسن اسے اعتنا نہیں

ہیں ہوں مٹا مٹا سا نشانِ عمر ہوش کا — دیوانگیِ عشق میں مجھکو فنا نہیں

وہ داغِ دل جو برقِ تجلی نہ بن سکے — کچھ ہو مری نظر میں مگر رہنما نہیں

سن سن کے جسکو روح میں پیدا ہو اضطراب — کیا نے نوازیوں میں تری وہ صدا نہیں

تھرا رہا ہے نورِ تجلی فروغ میں — مثلِ کلیم کوئی پئے التجا نہیں

حافظ انھیں سنا دے جنھیں ہو غرورِ حسن

تم وجہ مدعا ہو مگر مدعا نہیں

یوسف گجراتی

دیدنی ہے تری جمال کا رنگ — حسن اور حسن بے مثال کا رنگ

چشمِ مخمور کے تصور سے — کیف زا ہو گیا خیال کا رنگ

حسن جلوہ فروز دل میں ہوا — دیکھئے شوقِ لازوال کا رنگ

کھو گئے طور پر کلیم اللہ — اللہ اللہ تری جمال کا رنگ

موج میں آگیا ہے بحرِ کرم

دیکھکر میرے انفعال کا رنگ

جلد ۱۴ - شمارہ ۵
رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۱۰۴



نگار

صفحہ ۱۷ کا اعلان ضرور پڑھئے

فہرست مضامین نومبر ۱۹۲۸ء

ملاحظات ــــــــــــ ۲
اصحاب کہف — عبدالمالک السیفی آروی — ۹
تنقید روح نشاط پر ایک نظر — مرزا احسان احمد بی اے ال ال بی — ۱۸
اشاما — ابن السبیل — ۴۵
فلسفۂ مذہب — سید مقبول احمد بی اے — ۵۱
صدائے شکست (افسانہ) ــــــــ ۶۰
معاشیات ہند پر جغرافیہ کا اثر — ابوالمنصور حمید — ۶۵
حضرت شیخ محمود چشتی رح — ناظر دہلوی — ۶۹
فلسفۂ حسن (نظم) — سرور لکھنوی — ۷۲
ترانۂ دل (نظم) — آئین حزین — ۷۷
اُن سے (نظم) — اختر شیرانی — ۷۸
مدیر نگار سے (نظم) — ابو تراب ماہر انصاری — ۷۹
بصایر (نظم) — عبدالباری آسی — ۸۰
باب الاستفسار ــــــــ ۸۱
اقتباسات علمیہ ــــــــ ۸۶
مطبوعات موصولہ ــــــــ ۸۹-۹۶



اڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری

جلد ۱۴ | نومبر ۱۹۲۸ء | شمارہ ۵

ملاحظات

نہرو کمیٹی رپورٹ کی اشاعت اور لکھنؤ کے اجتماع کو دو ماہ سے زیادہ زمانہ گزر گیا اور سیاسیات کی وہ ساکن فضا جس کی تہ میں ایک بے پایاں تلاطم پنہاں تھا، اس کے اضطراب کی عمر بھی کافی ہوگئی لیکن نہ اس وقت تک یہ معلوم ہو سکا کہ اختلاف کا حقیقی راز کیا ہے اور نہ یہ بتایا گیا کہ کس اہم نتیجہ کی امید پر یہ شور و غوغا بلند کیا جاتا ہے۔

اگر کوئی جماعت یا کوئی فرد صرف اس اصول کی بنا پر اختلاف کرے کہ نہرو کمیٹی رپورٹ کی تجاویز ہندوستان کی مکمل آزادی سے متعلق نہیں ہیں اور حریت کاملہ اور غلامی کے درمیان کوئی ایسی منزل نہیں ہے جس پر قیام کیا جائے، تو میں اصولاً اس کو تسلیم کرونگا اور پورے احترام کے ساتھ تسلیم کرونگا، لیکن اگر کوئی نہرو کمیٹی رپورٹ کے مقاصد کو تسلیم کرنے کے بعد محض اس دلیل کی بنیاد پر اس کی مخالفت کرے کہ اس میں مسلمانوں کے حقوق کی محافظت نہیں ہے، یا (مولانا شوکت علی کی "طبل بلند بانگ و در باطن ہیچ" اصطلاح میں) مسلمانوں کا قتل عام کیا جا رہا ہے، تو میں ایک لمحہ کے لئے بھی اس کی صداقت پر ایمان لانے کے لئے طیار نہیں۔

ہر چند جب مولانا شوکت علی لکھنؤ کے جلسہ میں تمام تجاویز پر اتفاق رائے کا اظہار کر چکے تھے تو انھیں وہاں سے باہر نکل کر اختلاف کا حق حاصل نہیں تھا، لیکن خیر اس سے بحث کرنا فضول ہے کیونکہ ممکن ہے قیصر باغ کی مسحورکن فضا نے تاب تکلم

چھین لی ہو یا یہ کہ وہاں سے نکلنے کے بعد ان میں کسی شخص نے اشتعال پیدا کیا ہو، یا یہ کہ اُن کے مصالح قیادت نے کوئی علیحدہ زمین اپنی حکومت کے لئے بنانی چاہی ہو، بہرحال جو سبب بھی ہو اُس سے ہمیں بحث نہیں، لیکن یہ امر ضرور غور طلب ہے کہ ان کے دلایل مخالفت کیا ہیں۔ پھر جب ان پر غور کیا جاتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ وہی شوکت علی جو ہندو مسلم اتحاد کے لئے اپنی جان تک قربان کر دینے کے لئے آمادہ نظر آتے تھے، آج وہ افتراق و انشقاق پیدا کرنے کے لئے ڈاکٹر شفاعت احمد خاں اور سر محمد شفیع کی صف میں نظر آتے ہیں اور دلیل صرف یہ ہے کہ "ہم جاہل ہیں، مفلس ہیں، اس لئے ہم اپنا کاسۂ گدائی ہاتھ سے نہیں پھینک سکتے اور نہ برطانیہ کے خوان کرم کی اوش کو چھوڑ سکتے ہیں۔"

کیا آزادی کامل چاہنے والے، کیا وراثتِ زمین اور خلافت فی الارض کے مدعی اسی ذہنیت و دماغ کے ہوتے ہیں، اور کیا ایسا دعوی کرنے والوں کو شرم نہیں آتی کہ جب حقیقی موت و زندگی کا سوال سامنے آتا ہے تو ان کے منہ سے یہی آواز پیدا ہوتی ہے کہ اگر ہندو ہماری حیات کے ضامن ہو جائیں تو خیر انکا ساتھ دینے کے لئے طیار ہیں، ورنہ ہمارے لئے تو "جشن مرگ" ہی بہت ہے۔ پھر آئیے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دیکھ لیں کہ ہندوؤں نے نہرو کمیٹی رپورٹ میں کس حد تک مسلمانوں کی ضمانتِ حیات سے احتراز کیا ہے اور وہ کونسا نادر شاہ اس میں چھپا ہوا ہے جو مسلمانوں کا قتل عام کر دینے والا ہے۔ مسلمانوں کے لئے سب سے زیادہ خوف کی چیز ان کی اقلیت ہے لیکن اُسکی جس حد تک کیگئی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں کیونکہ مرکزی قانون ساز مجلس میں ان صوبوں کے مسلمان نمایندوں کے لئے جہاں مسلم آبادی کم ہے نشستیں محفوظ کر دی ہیں اور صوبوں کی قانون ساز مجلس میں آبادی کے تناسب سے نشستیں حاصل کر لینے کا بھی حق مسلمانوں کو دیا گیا ہے۔ جن صوبوں میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے مثلاً بنگال و پنجاب، وہاں کسی جماعت کے لئے نشست محفوظ نہیں کی گئی اور اس طرح گویا مسلمانوں کو زیادہ نشستوں پر قابض ہونے کا موقع دیا گیا ہے۔

صوبہ سرحد اور بلوچستان میں جہاں اسلامی آبادی بہت زیادہ ہے وہی نظام حکومت قایم کیا جائیگا جو دوسرے صوبوں میں ہے۔ سندھ جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے بمبئی سے علیحدہ کر کے ایک مستقل صوبہ بنا دیا جائیگا۔

یہ ہیں وہ رعایتیں جن کو مسلم کشی و حق تلفی سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جن کے خلاف صرف اس اندیشہ سے آواز بلند کیجاتی ہے کہ مسلماں چونکہ جاہل ہیں، بے جمیعت ہیں، نالایق ہیں، مفلس ہیں، اس لئے وہ کسی رعایت سے فائدہ نہ اٹھا سکیں گے، یہ بالکل نئی قسم کا خراج ہے جسے جہل علم سے طلب کرتا ہے اور یقین رکھتا ہے کہ وہ صداقت پر ہے۔

مسلمانوں کی اس مخصوص جماعت کی یہ ذہنیت کہ اگر نہرو کمیٹی رپورٹ سے اتفاق کیا گیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ انگریزی اقتدار کم ہوتے ہی ہندو موجودہ رعایتوں سے بھی مسلمانوں کو محروم کر دیں گے، ایسی غیر خود دارانہ اور شرمناک ذہنیت ہے کہ اگر خدانخواستہ آج مسلمانوں کی آبادی کا اکثر حصہ اس کا طرفدار ہو گیا تو ہمیشہ کے لئے اسلام کا اقتدار دنیا سے اٹھ جائیگا اور انگریزی قوم بھی جس سے اس طرح طلب اعانت کی جارہی ہے غلامی کے اس انتہائی ذلیل اعتراف کا جواب سوائے منہ پھیر کر ہنس دینے کے اور کچھ نہ دے سکے گی۔ مسلمانوں کے ایک اور زبردست قاید، جناب عبدالماجد صاحب دریا بادی نے یہ اعتراض کیا ہے کہ

نہرو کمیٹی رپورٹ میں مجرموں کو جسمانی سزا دینے سے اختلاف کیا گیا ہے، اور اس طرح گویا مسلمان چوری کریگا، لیکن اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائیگا، مسلمان زنا کریگا اور سنگسار نہ ہوسکیگا، مسلمان شراب پیئے گا اور اس کے درّے نہ لگائے جاسکیں گے۔ یعنی سات کروڑ مسلمان اپنی شریعت کی بیچارگی ہر منٹ محسوس کرکے رہجائیں گے"۔

غالباً یہاں یہ بحث بیکار ہے کہ ہاتھ کا کاٹا جانا، سنگسار کیا جانا اور دُرّے لگانا، کس حدتک سرقہ، زنا اور میخواری کا انسداد کرسکتا ہے اور اسوقت تک شدید یا خفیف جسمانی سزاؤں نے دنیا کے جرایم میں کتنی کمی پیدا کی ہے، لیکن جناب عبدالماجد صاحب سے یہ دریافت کرنے کو ضرور جی چاہتا ہے کہ اگر مسلمانوں کے لئے قانون میں ان کے تمام مطالبات کی رعایت کردیجائے تو پھر وہ اس میں کسی ایسی استثنائی دفعہ کا مطالبہ تو نہ کریں گے جس سے علماء اور رہبران قوم اس قسم کے تعزیروں سے محفوظ رہیں یا یہ کہ مفتیان اسلام کو کسی ایسے حیلہ شرعی پیدا کرنے کی اجازت نہ ہوگی جو ایک ہی ناجائز بات ان کے لئے قابل معافی اور دوسروں کے لئے لائق تعزیر ؟ کیونکہ خود شریعت کوئی چیز نہیں ہے اگر اس کے نافذ کرنے والے فاروق جیسے انسان نہ ہوں خیر، یہ تو سیاسی لطائف ہیں جنپر کوئی شخص توجہ نہیں کرتا، لیکن واقعی سنجیدگی کے ساتھ جو اختلاف کیا گیا ہے وہ بھی میرے نزدیک بالکل لایعنی ہے یہاں تک کہ بہت سے اختلاف کرنے والے خود بھی نہیں بتاسکتے کہ وہ کیوں مخالف ہوگئے ہیں۔

مسلم کانفرنس کا انعقاد جس کی صدارت کا فخر سر آغاخان کو ملنے والا ہے، بالکل تضیع اوقات ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ سے بھی وہی کام لیا جاسکتا ہے جو مسلم کانفرنس سے۔ انجمنوں کی کثرت ہمیشہ لامرکزیت کی طرف انسان کو لیجاتی ہے اور لوگوں کے خیال میں انتشار پیدا ہوتا ہے۔ اس وقت یقیناً کوئی وجہ ایسی پیدا نہیں ہوئی کہ مخالفین رپورٹ کی نیت پر حملہ ہوسکے زیادہ سے زیادہ اس کو قصور فہم کی ایک نہایت ہی مہلک مثال کہہ سکتے ہیں، اس لئے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں، ممکن ہے کہ آئندہ وہ اپنی غلطی کو سمجھ جائیں اور پھر اسی شاہراہ پر آجائیں جو اس وقت منزل تک پہونچنے کے لئے سب سے زیادہ قریب کی صراط مستقیم ہے

سائمن کمیشن جس کا وجود دوست دشمن کی تفریق کا بہترین معیار ہے، اکتوبر کے چوتھے ہفتہ میں آخر مار ہی گیا اور انھیں روایات کی تکرار شروع ہوگئی جن کو ایک مستبد حکومت کے مستبد اصول پر قائم ہونے والی مستبد کمیشن کے ساتھ ساتھ زندہ ہوجانا چاہیئے، تلوار و نگی چھاؤں بندوقوں کی حفاظت، مظاہرۂ عسکری کے سایہ میں کام کرنے والا کمیشن ہندوستانیوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے آیا ہے لیکن اُسے خبر نہیں کہ ایک قوم کا فیصلہ خود اسی قوم کے ہات میں ہوتا ہے جس کو تیغ و تفنگ عارضی طور پر کچھ دنوں کے لئے مضمحل تو کرسکتے ہیں لیکن محو نہیں کرسکتے

ممکن ہے ڈاکٹر شفاعت احمد خان، سر سنکران نائر آنریبل میاں محمد شفیع وغیرہ کا وہ اس وقت مسٹر سائمن کے نشہ ہمنشینی میں بہت سی حقیقتوں کو نظر انداز کرجائیں لیکن ایک وقت آئے گا جب انھیں تسلیم کرنا پڑیگا کہ جس کمیشن کو کامیاب بنانے کے لئے فوج و پولیس کو اپنی قوت سے کام لینا پڑے، وہ کبھی ہمارے درد کی دوا نہیں ہوسکتی اس وقت کمیشن کا استقبال

پبلک کی طرف سے حقیقی معنے میں کبھی نہیں ہوا اور نہ غالباً ہو، لیکن ہمارا کام یہیں تک پہونچکر ختم نہیں ہو جاتا کہ ہم اس سے اپنی بیزاری کا اظہار کرکے بیٹھ جائیں بلکہ ہمارا فرض اس سے زیادہ یہ ہونا چاہئیے کہ جس دعوے کو لیکر کمیشن آیا ہے، ہم اُس کو خود اپنے اتحاد عمل سے پورا کرکے دکھادیں اور ثابت کردیں کہ ہمارا کمیشن سے کتنا آپس میں جڑ جانا ہے اور "رفتن بہ پائے مردی ہمسایہ در بہشت"۔ ہمارا مسلک نہیں۔

ہم اس سے قبل ظاہر کرچکے ہیں کہ اور اب پھر اس کا اعادہ ضروری خیال کرتے ہیں کہ انجمنوں کی کثرت کوئی محمود طریق کار نہیں ہے اور مسلمانوں کی ان دو جمعیتوں کو جن کا نام تبلیغ و خلافت ہے یقیناً مٹا دینا چاہئے۔ اول الذکر جماعت کا وجود سیاسیات ہند کے لئے بے انتہا مضرت رساں، اور خود مسلمانوں کے لئے بھی مذہبی نقطۂ نظر سے غیر مفید ہے

اول تو میں اس کے ماننے کے لئے طیار نہیں کہ تبلیغ کانفرنس نے جماعت اسلامی میں کوئی قابل ذکر اضافہ کیا ہے اور اگر اسے تسلیم کر بھی لیں تو اس کی کوئی اہمیت نہیں کیونکہ اس وقت دنیا میں حصول ترقی کا ذریعہ کمیت نہیں بلکہ کیفیت ہے اور اس کا فقدان پہلے ہی کم نہیں ہے رہی خلافت کمیٹی سو بہ حالت موجودہ جبکہ خلافت کا وجود باقی نہیں رہا، اس کی ایک ناکارہ یادگار قائم رکھنا قرین عقل و انصاف نہیں جس طرح دوران قیام خلافت میں اس کمیٹی کا روپیہ نامناسب محل و موقعہ پر استعمال کیا گیا، اسی طرح اب بھی ہو رہا ہے چنانچہ سنا گیا ہے کہ کلکتہ میں نہرو کمیٹی رپورٹ کے خلاف پروپگنڈا کرنے کے لئے خلافت کمیٹی نے کافی مالی امداد دی ہے، جو یقیناً اس کے مقاصد و فرائض سے بالکل علحدہ چیز ہے۔

مسلمانوں کو اگر اپنی کوئی مخصوص انجمن قائم کرنا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلم لیگ کو از سر نو زندہ کیا جائے اور تمام قوتیں اسی کی اصلاح میں نہ صرف ہوں۔

سیاحت یورپ کے بعد شاہ افغانستان نے جس تیزی کے ساتھ ملک کو اسباب ترقی سے آراستہ کرنے کی عملی کوشش شروع کردی ہے، وہ یقیناً حیرتناک ہے سلطنت کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں آثار حیات نہ پیدا ہو گئے ہوں اور ترقی کے لئے اضطراب نہ رونما ہو گیا ہو۔

حال کی اطلاعات سے معلوم ہوا ہے کہ مصارف فوج کے لئے وہاں خزانہ بالکل علحدہ کردیا گیا ہے اور مدراس کے تمام طلبہ کو اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد ایک سال تک مدرسۂ حربیہ میں کام سیکھنا لازم قرار دیدیا گیا ہے۔ فوج کی رنگین وردی بھی منسوخ کردی گئی ہے اور وہی خاکی لباس تجویز کیا گیا ہے جو ساری دنیا میں رائج ہے۔ عہدوں کے گریڈ مقرر کردئے گئے ہیں تاکہ ہر شخص باقاعدہ ترقی حاصل کرسکے۔ لیکن اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اہم، و مفید اصلاح یہ ہوئی ہے کہ فوج میں کوئی وہ شخص بھرتی نہیں ہو سکتا جو خود پیر ہے یا کسی پیر کا مرید۔ اگر کوئی ملازم فوج اس جرم کا مجرم پایا جائیگا تو اس کو سخت سزا دیجائے گی۔

کچھ طلبہ باکو روانہ کئے گئے ہیں تاکہ معدنیات روغن کا کام سیکھیں، اسی طرح کئی ہزار طلبہ یوروپ بھیجے گئے ہیں تاکہ وہاں کے مختلف کارخانوں میں رہکر وہاں کے اصول صنعت و تجارت پر عبور حاصل کریں۔ اندرون ملک کے انتظام کی طرف بھی شاہ امان اللہ خاں کو حد درجہ انہماک ہے۔ انھوں نے حکم دیا ہے کہ ملک کے اندر ہر جگہ تار گھر قایم کئے جائیں تاکہ تمام ملک سے یہ برقی تعلق قایم ہو جائے اور لاسلکی اسٹیشن بھی بنائے جائیں۔ محکمۂ مال کی تنظیم کے لئے باہر سے ایک مشیر طلب کیا گیا ہے تاکہ وہ اس محکمہ کو باضابطہ اصول پر قایم کر دے۔

وزارت تعلیم کو حکم دیا گیا ہے کہ صنعتی اور طبی مدارس ہر جگہ قایم کئے جائیں اور ترکی زبان کے ذریعہ سے تعلیم دیجائے تاکہ یہاں کے طلبہ ترکی کے مدارس جبریہ میں آسانی سے داخل ہو سکیں۔

دربار میں نشستوں کی تعیین بھی منسوخ کر دی بلکہ ہر شخص کو اختیار ہو گا جہاں چاہے بیٹھ جائے، کسی کو کسی پر کوئی تفوق نہ ہوگا۔

امیر امان اللہ خاں کی تخت نشینی سے قبل صرف ایک اخبار سراج الاخبار وہاں سے شائع ہوتا تھا لیکن اسوقت وہاں مختلف صوبوں سے ۱۷ اخبار نکل رہے ہیں جو نہایت آزادی سے رائے زنی کرتے ہیں۔ ان اخباروں کے اکثر اڈیٹر غیر ممالک اور خصوصاً ترکی اور مصر ہی کے تعلیم یافتہ ہیں۔

حال ہی میں ایک خبر یہ بھی آئی ہے کہ امان اللہ خاں خلیفہ بننا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لئے وہ تمام سنّی ممالک اور جماعتوں کے نمایندوں کو طلب کرنے والے ہیں۔ لیکن ہمارے نزدیک ڈیلی ہرلڈ کا صرف ایک سیاسی لطیفہ ہے اور حقیقت سے بالکل دور۔ جن لوگوں نے امان اللہ خاں کی ذہنیت اور ان کی دیمقراطی خصوصیات فطرت کا مطالعہ کیا ہے، وہ سمجھ سکتے ہیں، کہ امان اللہ خاں کا خلیفہ بننے کی خواہش کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے مہاتما گاندھی کا گوشت کھالینا کہ یہ ان کے ایمان کے خلاف ہے اور وہ اُن کے اعتقاد کے۔

علاوہ اس کے اس زمانہ میں جبکہ خلافت و خلیفہ کا مفہوم کوئی باقی نہیں رہا ہے اور نہ مسلمانوں کی جماعت اب اس عہدہ کی اہمیت کو تسلیم کرتی ہے، امان اللہ خاں یا کسی اور کا اس کی خواہش کرنا، اپنے موجودہ اقتدار کو بھی ہاتھ سے کھونا ہے اور شاید امان اللہ خاں اس قدر کم فہم نہیں ہیں کہ وہ اس حقیقت سے ناواقف ہوں۔

سیاسیات یوروپ و مشرق کی فضا میں اب محسوس طور پر یہ تغیر پیدا ہوتا جاتا ہے کہ مشرقی اقوام و ممالک میں بہ نسبت برطانیہ کے فرانس کا اثر زیادہ وسیع ہوتا جارہا ہے، چنانچہ حال کی خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ترک پروفیسروں اور ترک طلبہ کی تعداد کثرت سے فرانس جارہی ہے۔ شام و مصر میں فرانسیسی تہذیب جس قدر مقبول ہوتی جارہی ہے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔ شاہ افغانستان نے بھی اپنے بیٹے کو فوجی تعلیم حاصل کرنے کے لئے پیرس ہی روانہ کیا ہے اور متعدد انجنیر اور سائنس دان

فرانس سے طلب کئے ہیں۔ سیام کے اکثر طلبہ فرانس کی یونیورسٹیوں میں جارہے ہیں اور چین کے طلبہ سب سے زیادہ وہیں جاتے ہیں۔ کیونکہ وہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ اُنکے کسب معاش میں بھی آسانیاں پیدا کی جاتی ہیں۔

ہر چند انگلستان اس سے قبل بھی کسی علم و فن کی تعلیم کے لئے خاص شہرت نہ رکھتا تھا اور انگریزی یونیورسٹی کے کامیاب طلبہ اور مغربی یونیورسٹی کے طلبہ کو کمتر درجہ کے سمجھے جاتے ہیں، لیکن انگلستان کا سیاسی اقتدار اتنا زبردست ہے کہ وہ اس کمی کی تلافی پوری طرح کر رہا تھا اور ایشیاء کی تعلیم و تہذیب پر بھی وہ خاص اثر ڈال رہا تھا۔ لیکن اب یہ تغیر اگر ایک طرف اس امر کی دلیل ہے کہ ایشیا خود اپنی سیاسی اہمیت کو سمجھنے لگا ہے۔ تو دوسری طرف اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فرانس گو برطانیہ کا حلیف ہو، لیکن وہ اس کا فریق بننے کے لئے بھی ہر وقت آمادہ ہے۔

مہاتما گاندھی سے برہم ہو کر ہندوؤں کی ایک جماعت کا ان سے مہاتما کا خطاب چھین لینا تو خیر ایسی اہم بات نہ تھی، کیونکہ ایک شخص نہ مہاتما کسی کے بنانے سے بنتا ہے اور نہ مٹانے سے مٹ سکتا ہے اگر وہ اس قابل ہیں تو اپنی جگہ مہاتما ہی رہیں گے خواہ اُنھیں کوئی اس خطاب سے یاد کرے یا نہ کرے، کیونکہ ان ظاہری و لفظی اعزازات سے بلند تر ایک دنیا اور ہے جہاں صداقت و حقیقت کی جستجو صرف صداقت و حقیقت کے لئے کی جاتی ہے اور جہاں دنیاوی عزت و جاہ حقیر نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔ لیکن مہاتما گاندھی کی ذات سے جو امر قابل ذکر ہے، وہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے آشرم کے اصول میں تبدیلی منظور کر لی ہے اور وہ راہبانہ زندگی جو وہاں کے قیام کی ضروری شرط تھی اس کو ترک کر دینے کی اجازت دیدی گئی ہے۔

اب وہاں شادی شدہ اشخاص بھی رہ سکتے ہیں۔ وہاں رہکر شادی بھی کر سکتے ہیں اور غذا بھی اپنے ذوق کے مطابق جو چاہیں کھا سکتے ہیں۔ حالانکہ اس سے قبل وہاں ایک ایسا عالم تجرد و تجرید تھا کہ مشکل سے اس عہد تمدن کے انسان کی گزر وہاں ہو سکتی تھی۔ مہاتما گاندھی کو یقین دلایا گیا کہ موجودہ حالت آشرم کی ممکن ہے ان کی زندگی تک قایم رہے، لیکن اسکے بعد اس صورت کا قایم رہنا ممکن نہیں ہے، اس لئے انھوں نے ایک کمیشن تحقیق حال کے لئے مقرر کیا اور اس کی سفارش پر یہ تمام آسانیاں پیدا کی گئیں لیکن یہ امید کم ہے کہ خود وہ اپنے لئے بھی ان آسانیوں کو منظور کریں گے۔

سر مالکم ہیلی ہمارے صوبہ کے جدید اور پنجاب کے سابق گورنر ایک خاص ذہنیت کے انسان سمجھے جاتے ہیں جسکا ثبوت انھوں نے اپنے پنجاب کے دوران حکومت میں کافی سے زیادہ فراہم کر دیا تھا۔ خیال تھا کہ انھیں خطوط پر یہاں بھی ان کے خیال و عمل کی رفتار قایم ہوگی، لیکن تجربہ سے معلوم ہوا کہ ہر چند اصولاً تو وہ اپنے مقصد سے منحرف نہیں ہوئے ہیں لیکن عملاً راستہ دوسرا اختیار کیا ہے۔

اگر پنجاب میں سر فضل حسین کے تجربات سر مالکم ہیلی کی سیاسی تدبیر کی شہادت میں پیش کئے جا سکتے ہیں تو اب

یہاں لکھنؤ میں ہندوؤں کی جماعت ہے جن کو جناب سر مالکم ہیلی نے مشورہ دیا ہے کہ وہ امین آباد پارک میں انعقاد مجلس میلاد کے متعلق مسلمانوں کو راضی کریں۔ ممکن ہے کہ بعض مسلمان اس غیر معمولی رواداری کے اظہار پر مسرور ہوں، لیکن جنھوں نے کسی ماہر نیرنجات کی طلسم کاریوں کا مطالعہ کیا ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ جس طرح وہ ایک صندوق سے تریاق نکال کر دکھاتا ہے، اسی طرح وہ پھر اسی تریاق کو زہر بنا کر بھی پیش کر سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ صلح و مفاہمت جو انسانی خودداری کا اخراج وصول کرنے والی ہو، وہ کسی قوم کے لئے باعث فخر نہیں ہو سکتی۔ اور ہندو مسلمان دونوں کو اس سے درس لینا چاہئے کہ ہمارے جائز حقوق پر جنگ کرنے کے بعد کس طرح ایک تیسری قوت کو ناجائز مداخلت کا موقعہ مل جاتا ہے اور نتیجہ سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتا۔ کہ باوجود مصالحت کے بھی عناد بدستور قایم رہتا ہے اور مخالفت کی آگ بجائے کم ہونے کے دربردہ اور مشتعل ہو جاتی ہے۔

اس ماہ کے رسالہ میں مولوی عبدالمالک صاحب آروی کا مضمون اصحاب کہف پر اس لحاظ سے کہ وہ ایک ایراد کا جواب ہے، بہت اچھا ہے لیکن نفس مسئلہ کے متعلق انھوں نے کوئی تفصیلی بحث نہیں کی، حالانکہ اس کا موقع تھا۔ میں چونکہ اجمالاً ایک بار نگار میں اس پر لکھ چکا ہوں اس لئے میں نے کسی تفسیر و تتمہ کی ضرورت نہیں سمجھی۔

جناب ابن السبیل کا مضمون شاآما افسانہ نہیں بلکہ ایک واقعہ ہے اور اسی قسم کے بہت سے دلچسپ واقعات جناب ابن السبیل کے کشکول میں موجود ہیں۔ میرے نزدیک ایک قسم کے واقعات فسانوں سے زیادہ دلچسپ ہوتے ہیں۔

مرزا احسان احمد صاحب کے مضمون پر میں نے ایک تفصیلی رائے تحریر کی ہے اس لئے یہ سلسلۂ ملاحظات اس پر لکھنا بیکار ہے صدائے شکست آئندہ ماہ میں ختم ہو جائیگا۔ اور ناظر دہلوی کا ایک اور مقالہ جو شاہ نصیر الدین گنج معانی رح کی نہایت تفصیلی حالات پر مشتمل ہے آئندہ ماہ میں درج ہوگا۔

حصۂ نظم میں فلسفۂ حسن پر جناب سرور لکھنوی کی نظم بہت خوب ہے، لیکن جن صاحب نے میرے پاس روانہ کیا، انھوں نے یا اصل مصنف نے اس کو پہلے معارف کے پاس بھیجدیا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ نظم دونوں جگہ شایع ہو گئی۔ اگر مجھے اس کی اطلاع مجھے ہو جاتی تو شاید میں اس کی اشاعت کو مناسب نہ سمجھتا۔

اس ماہ میں باب المراسلۃ والمناظرۃ کے ماتحت کوئی مقالہ تحریر نہیں ہوا کیونکہ کوئی مضمون جواب طلب موصول نہیں ہوا باب الاستفسار میں اس مرتبہ صرف تاریخی مقالے نظر آئیں گے۔

پریس کے اسٹاف میں تبدیلی اور بعض ان ناگزیر حوادث کے بنا پر جو لیتھو پریس کی دنیا میں بہت عامۃ الورود ہیں اس مہینہ کا نگار (دوا بیتاً) چار پانچ دن کی تعویق سے نکل رہا ہے ورنہ (اصولاً) یوں تو اس کی تاریخ اشاعت ہر ماہ کی پندرہ ہے۔ اس انتظار سے جن حضرات کو زحمت ہوئی ہو اُن کی خدمت میں یہ معذرت پیش کی جاتی ہے۔

نیاز فتحپوری

اصحاب کہف

ڈاکٹر ٹسڈل یورپ کے ان مایۂ ناز علما میں ہے، جن پر وطن بجا طور پر فخر کر سکتا ہے، چونکہ وہ "امام دینیات" (ڈاکٹر ڈیو ائینٹی) کی سند حاصل کر چکا تھا، اس لئے اس کی کوشش علمی کا زیادہ حصہ مسیحیت کی توثیق، اور اصول اسلام کی تنقیح میں بسر ہوا، اس سلسلہ میں اُس نے متعدد کتابیں لکھیں جنہیں "مذہب ہلال" "اعتراضات محمدی" وغیرہ مشہور ہیں، چونکہ فارسی اور عربی زبانوں کا بھی ماہر تھا اس لئے اس نے فارسی زبان میں "ینا بیع الاسلام" ایک کتاب لکھی، اس کے مغربی دوستوں نے اصرار کیا تو انھیں خیالات کو مغربی انداز میں "ماخذ قرآن" کے نام سے پیش کیا، یہ کتاب انگریزی زبان میں ہے، ڈاکٹر صاحب نے اس میں جو اظہار خیال کیا ہے وہ بعض جگہ قابل ستایش ہے، لیکن چونکہ وہ "رنگ آشنائی" سے بالکل محروم ہیں اس لئے کتاب گویا سراسر اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے معاندانہ جذبہ رکھنے کا پتہ دیتی ہے، انھوں نے اس کتاب کو چھ ابواب پر تقسیم کیا ہے، اور ان میں بالترتیب ثابت کیا ہے کہ قرآن میں قدیم عرب، یہود، صابئی، نصرانی، مجوسی، اور حنفی (ابراہیمؑ حنیف کے پیرو) کے معتقدات اور اعمال ہیں لیکن یہیں تک سخن کا سلسلہ ہوتا تو مضائقہ نہ تھا، کیونکہ قرآن مجید کا تو دعویٰ ہی ہے " ذٰلک الدین القیم اور ان ھذا لفی الصحف الاولیٰ "

یہود، نصرانی اور حنفی کے عقائد اور اصول مذہبی اگر قرآن مجید میں ہیں تو اعتراض ہی نہیں، چونکہ قرآن مجید نے لفظاً ان سب کا استثنا کیا ہے باقی رہے مجوسی اور صابئی، مجوسیوں کا پیشوا زردشت تھا۔ وستا میں جسے زردشت نے الہامی کتاب کے نام سے پیش کیا تھا، تحریف اور تغیر ہوا ہے، چنانچہ پروفیسر میکس مولر کے عالمانہ سلسلہ تصنیفات "مقدس صحف مشرقیہ" کی چوتھی جلد میں جو وستا کا پہلوی نسخہ ہے، اس کا انگریزی ترجمہ ڈارمسٹٹر نے کیا مترجم نے مقدمہ میں ان تمام افکار اور آرا کو جمع کر دیا ہے جو اس کتاب کے متعلق محققین یورپ کی کاوش کا نتیجہ ہیں، بعض محققین کا خیال ہے کہ "وستا" کا یہ پہلوی نسخہ زردشت کی وہ کتاب ہی نہیں جسے اس نے الہامی شکل میں پیش کیا تھا، خیر مجوسیوں کے اکثر موجودہ معتقدات، اور وستا کا یہ پہلوی نسخہ اسلامی دنیا میں الہامی تصور نہیں کیا جا سکتا، لیکن اسلام کا دعویٰ ہے، " لکل قوم ھاد " زردشت کے بعض تعلیم قرآن میں اگر پائے جاتے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں، ڈاکٹر صاحب کی یہ تبویب "اسلام میں مذہب زردشت کے معتقدات و اعمال" عوام میں غلط فہمی پھیلانے کا سبب ہے، کیونکہ اس سے وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ موجودہ مجوسیوں کو اہل اسلام مشرک کہتے ہیں اور پھر بھی جلب منفعت میں ان کے رہین ہیں لیکن دنیا اب قدیم مذہب زردشت اور موجودہ مجوسیت میں، امتیاز اور تفریق کر سکتی ہے، جو ایک مشہور مغربی عالم کی تصنیف "ابتدائی مذہب زردشت" کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے، بہر حال ڈاکٹر موصوف اعلیٰ درجہ کے محقق، اور متعدد السنہ کے ماہر ہیں، تمہید میں انھوں نے لکھا ہے، کہ اس کتاب میں جتنے اقتباسات ہیں وہ سب میری ذاتی کاوش کا نتیجہ ہیں، لہذا ایک طالب العلم سخت حیران ہوتا ہے کہ مغربی علما کا دماغ ہوتا ہے۔ یا دائرۂ معارف کا مخزن، " ماخذ قرآن " میں جتنے حوالے ہیں انہیں دیکھکر اور ڈاکٹر صاحب

کے اس بیان کو تسلیم کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے، کہ وہ مغربی زبانوں میں یونانی، جرمنی، انگریزی اور مشرقی زبانوں میں عبرانی، عربی، فارسی، اور سنسکرت کے بڑے ماہر تھے، چینی زبان کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ "البتہ اس زبان کو میں نے مستعدی سے نہیں حاصل کیا" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ چینی زبان سے بالکل ناآشنا بھی نہ تھے،

اصحاب کہف

اس وقت میں ڈاکٹر صاحب کے ان اعتراضات اور ردوکد کے متعلق لکھنا چاہتا ہوں، جو انھوں نے قرآن مجید کے واقعہ اصحاب کہف کے متعلق کیا ہے، میں اس واقعہ پر ایک تاریخی اور عقلی بحث کرنا چاہتا ہوں، اور بتانا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب نے قرآن مجید پر اس ضمن میں کونسی ناقدانہ روشنی ڈالی ہے اور وہ حقیقت سے کتنی دور ہے، پھر بتاؤنگا کہ تاریخ نے اس واقعہ کا کہاں تک ساتھ دیا ہے، اور قرآن مجید نے کس معقول اسلوب بیان، اور نفیس حسن ادا سے اس واقعہ کی توضیح کی ہے۔

تاریخی ماخذ

پہلے یہ جان لینا چاہئے کہ اصحاب کہف کے متعلق تاریخی ماخذ کیا ہے، آج پھر میں آرہ کے "جین سدھانتہ بھاون" (لائبریری) کے ارباب حل و عقد کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں، جن کی شفقت کی بدولت مجھے مستند اور معتبر کتب کے مطالعہ کا موقعہ ملا، اس سلسلہ میں میں نے "دقیانوس اور اصحاب کہف کے متعلق" "انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا" مطبوعہ کیمبرج یونیورسٹی پریس، جلد ۲۴ (طبع یازدہم) "دی نیو یا پولر انسائیکلو پیڈیا" جلد ۱۳، ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۵ کا گہرا مطالعہ کیا، علامہ ابن خلدون نے بھی ملوک قیاصرہ (کیتم) کے سلسلہ میں اصحاب کہف کا مختصر تذکرہ کیا ہے، علامہ البیرونی نے آثار الباقیہ میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے جس کا حوالہ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں موجود ہے، یہ حوالہ آثار الباقیہ کے انگریزی ترجمہ ڈی ساشو پر مبنی ہے، انسائیکلو پیڈیا سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یورپ کے دلفریب ادیب اور مشہور مورخ گبن نے اپنی کتاب "انحطاط و زوال دولت رومہ" میں نہایت عمدگی سے اس واقعہ کو دہرایا ہے ڈاکٹر ٹسڈل نے اس واقعہ کے تاریخی حالات کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، وہ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا نوٹ سے مستفاد ہے جس میں مذکور ہے، کہ ۵۲۱ء (آنحضرت صلعم سے پچاس ساٹھ سال قبل) ایک شامی عالم جاکوب آف سروگ نے ایکٹا سینکٹورم میں اس کا تذکرہ کیا ہے، دوسری شامی روایت لینڈس کے "حکایات" میں موجود ہے، جارج سیل نے بھی ترجمۂ قرآن مجید میں نوٹ کے اندر گریگوری آف ٹورس کے حوالہ سے، اصحاب کہف کے متعلق رائے زنی کی ہے،

اسلامی ماخذ میں پہلے تو قرآن مجید ہی ہے اور سورۂ کہف میں کسی قدر تفصیل سے یہ واقعہ مذکور ہے، بخاری میں باوجود تلاش مجھے کہیں اصحاب کہف کا تذکرہ نہ ملا بخاری کے اندر کتاب التفسیر میں اصحاب کہف کے سلسلۂ واقعہ میں قرآن مجید کے اندر جو الفاظ آتے ہیں صرف انکی مختصر توضیح ہے، جہاں تک واقعہ کا تعلق ہے، کوئی روایت نہیں، مناقب میں ہو سکتا ہے لیکن وہاں بھی دوسرے غار والوں کا تذکرہ ہے، قرآن مجید کے اصحاب کہف کا نہیں، ابو داؤد میں بھی کوئی ذکر نہیں، تفسیر جلالین میں کوئی روایت ایسی نہیں جس سے تاریخی روشنی پڑے، بقیہ معتبر تفاسیر، اور کتب تاریخ، نہ میرے پاس ہیں اور نہ آرہ میں دستیابی کی امید ہے کہ مزید تحقیقات کا سلسلہ جاری رکھا جاسکے

ڈاکٹر صاحب کے اعتراضات

پس وپیش کے ساتھ یہ واقعہ (اصحاب کہف) جو بیان کیا گیا ہے، اسے سمجھنے کے لئے ہم لوگوں کو یاد رکھنا چاہئے، جیسا کہ مفسرین کا بیان ہے، مکہ کے بعض کفار نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو

چیلنج دیا، کہ آپ اگر مدعی نبوت ہیں تو اصحاب کہف کا واقعہ بتلائے، یہ قصہ ان لوگوں میں مختصر طور سے مشہور تھا، تعداد اصحاب کہف کے متعلق حجت تھی، اور اس موضوع پر بہتیرے آراء بیان کئے جاتے تھے، محمد (صلعم) نے جیساکہ آیات ۲۲ اور ۲۳ سے ظاہر ہے، دوسرے دن جواب دینے کا وعدہ کیا، ان کا مقصد تھا کہ کسی سے اس کے متعلق تفتیش کرینگے، مگر وہ اس حصول اطلاع میں ناکام رہے اس لئے انھوں نے تعداد کا فیصلہ ہی نہیں کیا، لیکن اس وقت سے انکی سعی خلاص زیادہ کامیاب نہیں معلوم ہوتی، نہ تو انھوں نے حدوث واقعہ کے زمانہ کی تعیین کی، نہ مقام کی، پھر بھی جرأت کرکے ایک واقعہ کا فیصلہ کرتے ہیں، یعنی یہ کہ غار میں ۳۰۹ برس تک وہ لوگ پڑے رہے، بدقسمتی سے اس میں بھی انھوں نے غلطی کی، پھر بھی یہ بات ہے کہ اُن کو شک نہ تھا کہ قصہ میں جو واقعہ بیان کیا جاتا ہے، وہ حقیقتاً حادث ہوا، (قرآن مجید کے) اسلوب بیان سے پتہ چلتا ہے، کہ محمدؐ کے پاس کوئی لکھی ہوئی کتاب نہ تھی، اور نہ کوئی معتمد خبر رساں تھا، جو انھیں صحیح واقعات کی خبر دیتا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم کے) قبل ہم لوگ اس افسانہ کے متعلق مختلف روایات پاتے ہیں معلوم ہوتا ہے، قرآن مجید کے بیان کردہ واقعات کے لئے محمد (صلعم) ان زبانی روایات کے مرہون ہیں نہ کہ الہام کے جیساکہ ان کا دعویٰ ہے

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ خامہ فرسائی کی ہے وہ تاریخی حیثیت رکھتی ہے، جو انسائیکلوپیڈیا سے مستعار ہے، اور انھوں نے وہی واقعات لکھے ہیں جن کو عام مورخین نے، اور جس کا تذکرہ انسائیکلوپیڈیا برٹینکا، اور دی نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا" میں بوضاحت موجود ہے، کوئی نئی بات نہیں لکھی، اس لئے میں ڈاکٹر صاحب کے بیان کردہ واقعات کا ترجمہ کرنے کی بجاے، انسائیکلوپیڈیا کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں:—

یہ شامی الاصل روایت جو کم و بیش ایک ہی طریقہ سے مشہور ہے، پہلے پہل گریگوری آف ٹورس کی وساطت سے مغربی ادبیات میں داخل ہوئی، واقعہ یوں ہے کہ شہر آفسس کے سات نوجوان عیسائی ۲۵۰ء میں دقیانوس (DECIUS) کے قتل و غارت سے بھاگ کر ایک غار میں چھپ گئے ان لوگوں کے مقام فرار کا پتہ لگ گیا اور اس کا راستہ بند کردیا گیا، یہ شہدا سو گئے اور تقریباً دو سو برس کے بعد ایک چرواہے کو جبل قوئیلین (Coelian) میں اس غار کا پتہ لگ گیا اور روشنی میں اس نے اصحاب غار کو جگایا ان لوگوں نے اپنے ایک ساتھی (جملیقوس) کو کھانا خریدنے کے لئے روانہ کیا یہ لڑکا دیکھکر متعجب ہوا کہ دروازہ شہر پر صلیب لٹک رہی ہے اور اندر بالا علان حضرت مسیح کا نام لیا جاتا تھا۔ جب اس نے ایک نان بائی کی دوکان پر دقیانوس کے زمانہ کا ایک سکہ دیا تو لوگوں کو شبہہ ہوا اور اُسے اس جرم میں حکام کے نزدیک پکڑ کر لائے، کہ اس نے کوئی مخفی خزانہ دبا لیا ہے اس نے اپنا واقعہ بیان کردیا پھر اس کی تصدیق میں وہ لوگوں کو غار کے نزدیک لاکر اپنے بقیہ چھ رفقا کو دکھا دیا جو ابھی جوان تھے، اور اُن کا چہرہ نور سے چمک رہا تھا جب شہنشاہ تھیاڈوسیس ثانی کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو فوراً وہاں پہونچا، اصحاب کہف نے کہا خدا نے یہ واقعہ اس لئے دکھایا ہے کہ حشر کے متعلق لوگوں کا ایمان راسخ ہو جائے، یہ پیغام سنا کر وہ پھر سو گئے علامہ البیرونی کے قول کے مطابق نویں صدی میں ایک غار کے اندر چند غیر بوسیدہ لاشیں دیکھی گئیں جنہیں لوگوں نے شہر افسس کے خوابیدگان خواب کی طرف منسوب کیا۔

ڈاکٹر صاحب اس واقعہ پر اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے فرماتے ہیں، کہ قرآن مجید کے بیان کردہ واقعہ کی غیر معقولیت کی مزید تشریح کرنا عبث ہے، باوجودیکہ اس حیثیت سے محمد (صلعم) پر زیادہ الزام عاید نہیں ہوتا، جتنا ان جاہل مسیحیوں پر ہے، جن کی وساطت سے اس قدر وسیع طریقہ پر اسکا نشر و ابلاغ ہوا اور بہت شبہ ہے کہ انھوں نے ہی اس کی ایجاد کی ہو بہت ممکن ہے کہ ابتداً اس قصہ کی نوعیت محض تمثیل اور مذہبی افسانہ کی ہو، اور اس کی ایجاد کا مقصد یہ دکھانا ہو کہ کس طرح قلیل عرصہ میں مسیحیت اپنے پیرؤں کی ابتلا اور قتل و غارت کے باوجود عالمگیر ہوگئی، ڈاکٹر صاحب کو یہ بھی دعویٰ ہے کہ محمد (صلعم) کے قبل یہ فسانہ مشرق میں پھیلا ہوا تھا، اور مکہ میں بھی لوگ ان کے زمانہ میں اس پر یقین رکھتے تھے، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا قصور (معاذ اللہ) صرف یہ ہے کہ انھوں نے اسکو وحی الٰہی کی صورت میں پیش کیا، حالانکہ اس کی حیثیت سینٹ جارج اور ڈریگن، رستم اور اس کے سفر ہفتخواں کے حیرت افزا افسانوں سے زیادہ نہیں،

ڈاکٹر صاحب کے کلام پر تنقید

معاندت اسلام کے جوش، اور تنقیح کے ولولہ میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے بیان میں بہت سی باتیں ایسی لکھدیں جو ان کے دامن علم پر بدنما دھبہ ہیں، وہ لکھتے ہیں قرآن مجید کے اسلوب بیان سے پتہ چلتا ہے، کہ واقعہ حیص بیص کیساتھ بیان کیا گیا ہے، حالانکہ ایسا کہنا واقعہ کے خلاف ہے، قرآن مجید نے اس واقعہ کی ابتداہی میں یہ پرزور دعویٰ کیا ہے، "نحن نقص علیك نباهم بالحق" اب اس دعوے پر غور کیجئے، اور جرمنی کے مشہور فلسفی کینٹ کی کتاب "تنقید ادراک خالص" کے آخری اوراق الٹ کر دیکھئے جہاں اس نے انسانی علم، اعتقاد، اور رائے وغیرہ سے عالمانہ بحث کی ہے، کینٹ کے نظریہ میں کوئی شخص، دوسرے کو اپنے افکار کا شریک اور معتقد نہیں بنا سکتا، جب تک وہ خود اس پر یقین نہ رکھتا ہو۔

ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی اعتراض کیا ہے، کہ قرآن مجید میں اصحاب کہف کی تعداد کے متعلق کوئی قول فیصل نہیں، نہ زمانہ حدوث کا پتہ ہے نہ مقام کا، بیشک زمانہ اور مقام کی تعین نہیں، کیا ڈاکٹر صاحب چاہتے ہیں کہ زمانہ اور مقام کی تعین ہوتی تو مجھے اور بھی دل کھول کر زہر افشانی کا موقعہ ملتا، قرآن مجید کا یہ ایک معجزہ ہے کہ اُس نے ایسی باتیں ہی نہیں پیش کیں جن کے متعلق جمہور کا اتفاق نہ ہوسکے۔ تعداد اصحاب کے متعلق قرآن مجید میں یہ مذکور ہے،

سیقولون ثلثة رابعهم کلبهم ویقولون خمسة سادسهم کلبهم
رجماً بالغیب ویقولون سبعة وثامنهم کلبهم قل ربی
اعلم بعدتهم مایعلمهم الا قلیل

ثلثة رابعهم کلبهم نجران کے ایک جاکو بائٹ مسیحی، السعید کی رائے ہے خمسة سادسهم کلبهم نسطوری مسیحیوں کا عقیدہ ہے سبعة وثامنهم کلبهم کو جارج سیل صحیح بتایا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جارج سیل کے نزدیک اصحاب کہف کا قصہ بالکل غلط نہیں، سات کی تعداد کو صحیح تسلیم کرلینا، صاف بتا رہا ہے، کہ تسلیم کرنے والا واقعہ کا منکر نہیں۔

اب باقی رہجاتی ہے یہ بحث کہ قرآن مجید نے تعداد کے متعلق کوئی قول فیصل نہیں بیان کیا، اس کا جواب یہ ہے، کہ قرآن مجید

اگر یہ تعداد بیان بھی کر دیتا، تو اس کا کوئی خاص اثر نہ ہوتا، کیونکہ عرب میں تعداد کے متعلق اس وقت مختلف خیالات تھے، حقیقی تعداد ایک ہی ہو سکتی ہے، اگر بتایا جاتا تو دوسری جماعتیں جن کے عقیدہ میں مختلف تعداد کی روایتیں تھیں، ان پر کوئی اثر نہ ہوتا، یہ ایک معجزہ ہے کہ قرآن مجید نے کہیں ایسا واقعہ بیان نہیں کیا، جو تاریخ کی روشنی اور عقل کے توازن میں ناقابل تسلیم ہو، مشہور روایتیں سات کی تعداد متعین کرتی ہیں، چنانچہ یورپ میں "سات سونے والے" کے نام سے یہ قصہ مشہور ہے، قرآن مجید اگر کلام الٰہی نہ ہوتا تو اس میں اسی مشہور روایت "سبعۃ" کا ساتھ دیا جاتا، اور آج ڈاکٹر ٹسڈل جیسے معاند اسلام جب "برٹش میوزیم" میں شامی زبان کے ایک قلمی نسخہ کے اندر سات کی بجائے آٹھ کی تعداد لکھی ہوئی دیکھتے، تو نہ معلوم کیا طوفان اٹھاتے، ابھی تک ارباب تحقیق کا اجماع نہیں ہوا، انکی تعداد کتنی تھی، قرآن مجید ایسا واقعہ بیان ہی نہیں کرتا، جس کو تسلیم کر لینے میں نظر تحقیق ساتھ نہ دے، تعداد کے متعلق قول فیصل نہ ہونے کا ایک یہ بھی راز ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے بڑے شد و مد سے بیان کیا ہے کہ قرآن مجید نے اصحاب کہف کے غار میں رہنے کے متعلق تین سو نو برس کی تعیین کی ہے، یہ تو میں پیچھے بتاؤنگا کہ آیا "ولبثوا فی کھفھم ثلث مائۃ سنین وازدادوا تسعا" قول الٰہی ہے یا نقل روایت، ابھی یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کے کلام میں یہاں کیسا پر لطف تضاد واقع ہوا ہے اور وہ انکار کی ہٹ دھرمی میں اقرار کی کیسی لذت بخش شکل پیش کر رہے ہیں۔

حضرات! جب آپ اس "تین سو نو" کی مدت کو حقیقت سے گری ہوئی پا رہے ہیں، تو بتائیے حقیقت ہے کیا؟ کیا دہی دقیانوس اور تھیاڈوسیس کا درمیانی زمانہ یعنی ۱۹۶ سال، اگر آپ کے نزدیک "ایک سو چھیانوے" کی تعیین صحیح ہے، تو پھر آپ واقعۂ اصحاب کہف کو مسیحیوں کی ایجاد، تمثیل اور مذہبی فسانہ سے کیوں تعبیر فرما رہے ہیں، اب آپ ہی فرمائیے آپکے کس قول کو صحیح مانا جائے، اس خفا کیش طریقۂ تعبیر کو، یا ایک سو چھیانوے کی تعیین کو اگر غار میں رہنے کی اس مدت کو ایک سو چھیانوے تک محدود رکھتے ہیں، تو پھر حقیقت کو فسانہ کہنا کیسا، اور اگر فسانہ اور ایجاد ہے، تو پھر قرآن مجید کے بیان "ثلثۃ مائۃ سنین وازدادوا تسعا" پر اعتراض کیسا؟ اگر آپ کہیں میرے نزدیک ۱۹۶ کی تعیین بھی غلط ہے، تو پھر آپ کو کیا حق تھا کہ ۳۰۹ کے جزوی بیان کو حقیقت سے دور بتائیں، کیونکہ قرآن مجید نے تو یہ بیان نہیں کیا کہ اصحاب کہف دقیانوس کے ظلم سے غار میں چھپ گئے اور تھیاڈوسیس کے زمانہ میں نکلے، جس کا اعتراف آپ نے بھی کیا ہے۔

اب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ۳۰۹ کی تعیین جو قرآن مجید میں ہے وہ اصحاب کہف کی تعداد کی طرح صرف نقل روایت ہے، قرآن کا قول فیصل نہیں، ہاں بعض روایات ایسی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے، کہ یہ قرآن مجید کا بیان ہے، چنانچہ سنہ شمسی و قمری کی تحقیق میں قاضی القضاۃ علامہ نجم الدین کا ایک قلمی رسالہ میرے پاس ہے جس میں مذکور ہے،

یکے از اہل کتاب نزد امیر المومنین علی مرتضیٰ علیہ السلام آمد گفت کہ شما در کتاب خود می خوانید، ولبثوا فی کھفھم ثلثۃ مائۃ سنین وازدادوا تسعا یعنی درنگ کردند اصحاب کہف در غار خود سہ صد سال و زیاد کردند نہ سال دیگر، ما زیادہ بر سہ صد سال در کتاب خود نیافتہ ایم پس مخالفت میان ہر دو کتاب از چہ راہ ہست حضرت امیر المومنین امیر علیہ السلام فرمود، سہ صد در کتاب شما جز آن

یونانیان است، درکتاب ماہر حساب عرب وسہ صد سال بحساب یونانیان سہ صد و نہ سال بحساب عرب می شود، کتابی متعجب شدو ایمان آورد"

اسی طرح جلالین میں بھی ہے: "فالثلاثمائة الشمسية ثلاثمائة وتسع قمرية" یعنی شمسی مہینہ کے حساب سے تین سو برس اور قمری مہینہ کے اعتبار سے ۳۰۹ برس ہوتا ہے، جس کا حوالہ جارج سیل نے اپنے نوٹ میں دیا ہے۔ لیکن سیاق وسباق قرآن سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قرآن مجید کا قول فیصل نہیں بلکہ دوسروں کا قول نقل کیا گیا ہے، چونکہ اس آیت کے اوپر ہے: "ولا تقولن انی فاعل ذلک غداً" اور اس آیت کے اختتام پر حرف عطف ہے، "ولبثوا فی کھفھم الخ" جس سے صاف ظاہر ہو کہ اس کا تعلق اوپر والی آیت سے ہے اور "ولا تقولن" کا امتناعی فرمان، "ولبثوا فی کھفھم" کو بھی شامل ہے، اس کے علاوہ اس آیت کے بعد والی آیت تو مسئلہ کو بالکل صاف کر دیتی ہے: "قل اللہ اعلم بما لبثوا" نہ معلوم ڈاکٹر صاحب نے جان بوجھکر قرآن کے سر ۳۰۹ کی تعیین مدت کا الزام کیوں لگا دیا۔ اب رہجاتی ہو جلالین، اور قاضی نجم الدین کے روایات کی حقیقت! تو انہیں مان لینے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں، چونکہ قرآن مجید جس زبان میں پیش کیا جا رہا تھا وہ عربی زبان تھی، اس لئے نقل روایت جب عربی میں ہوئی، تو ایسی ہوئی جو صحیح صحیح نقل تھی اگر تین سو کی متداول روایت ہی نقل کر دیجاتی، تو اعتراض ہو سکتا تھا کہ عرب قمری مہینہ کے حساب سے سنہ کا شمار کرتے ہیں اور نصاریٰ شمسی ماہ کے حساب سے، اختلاف ہونا لازمی تھا، اس لئے نقل روایت میں انتہائی صحت کا خیال ہے، کہ "وازدادوا تسعاً" کا اضافہ کیا گیا، چنانچہ علماے ریاضی نے قرآن کی اس نکتہ رسی کو تسلیم کر لیا ہے، کیا مسئلہ ریاضی میں ایک امی شخص کی یہ دقیقہ سنجی اس کے ملہم باللہ ہونیکی دلیل نہیں، یہی ایک واقعہ آپ کی حقانیت کے لئے کافی ہے، اب باقی رہجاتی ہو یہ بحث کہ آیا "تین سو برس" کی تعیین مدت اس وقت تک نصاریٰ کرتے تھے یا نہیں؟ یہ بھی قیاس سے بعید نہیں، چونکہ جارج سیل نے ترجمہ قرآن میں نوٹ کے اندر لکھا ہو کہ سائمن میٹفراسٹس کا قول ہے کہ اصحاب کہف ۳۷۰ برس غار میں رہے، گو اکثر قول ۱۹۶ برس کی مدت کے متعلق ہے، لیکن یہ بات نہیں کہ یہی ایک کلیہ تھا، بلکہ اور مثالیں ایسی بھی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ، تین سو سے بھی زیادہ مدت کے متعلق لوگوں کا خیال تھا، اس لئے آنحضرت کے زمانہ میں نصاریٰ کا قول تین سو کی تعیین مدت کے متعلق عقلی پہلو سے بھی قابل وقوع ہے، اور قرآن مجید نے یہی روایت نقل کی ہے۔

تاریخی اور قرآنی واقعات کا موازنہ

اصحاب کہف کے متعلق تاریخ میں ایسی باتیں شامل ہوگئی ہیں جنہیں خلاف قیاس اور بعض اوقات خلاف عقل کہا جا سکتا ہے، قرآن مجید نے ایسی تمام باتیں نظر انداز کر دیں۔

تاریخ، زمانہ اور مقام کی تعیین کرتی ہے، اور بتاتی ہے کہ یہ واقعہ دقیانوس کے عہد ۲۵۰ء میں ہوا، اور اصحاب کہف کی بیداری کو تھیاڈوسیس ثانی کے عہد کی طرف (یعنی ایک سو چھیانوے سال کے گزرنے کے بعد) منسوب کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ شہر افسس میں یہ واقعہ حادث ہوا، قرآن مجید نے یہ تمام باتیں نظر انداز کر دیں، غار میں انقضاے مدت کے متعلق صرف "فضربنا علیٰ اذانھم فی الکھف سنین عدداً" کہدیا جس میں کمال بلاغت اور انتہائے معقولیت پائی جاتی ہے۔

تاریخ کی مشہور روایت تعداد کو سات تک متعین کرتی ہے، قرآن مجید نے مختلف روایات تعداد کو بیان کرکے "قل ربی اعلم بعدتھم" کہکر فیصلہ کردیا، تاریخ کہتی ہے یہ عیسائی تھے، قرآن مجید کہتا ہے:- "انھم فتیۃ امنوا بربھم وزدنٰھم ھدیٰ" اگر ثابت ہوجائے کہ یہ عیسائی تھے تو یہ آیت اس نظریہ کے بھی مخالف نہیں ہے، ورنہ ایک مسلم قرآنی استناد کی بنا پر انہیں پیروان مسیح نہ کہے تو کوئی مضائقہ نہیں
تاریخ نے بیان کیاہے کہ ان میں سے ایک شخص نان بائی کی دوکان پرگیا، اورجب دقیانوس کے زمانہ کا ایک سکہ پیش کیا، تو لوگوں نے اسے مشتبہ خیال کیا اور اسے پکڑکر حکام کے نزدیک لائے، قرآن مجید نے بھی کھانا خریدنے کے لئے جانے کا واقعہ بیان کیاہے، اور ان کے روپیہ کا بھی تذکرہ کیاہے، لیکن یہ نہیں بتایا کہ اُن کی گرفتاری اس روپیہ کے دینے کے باعث ہوئی، چونکہ یہ روپیہ دقیانوس کے زمانہ کا تھا، سبحان اللہ قرآن مجید نے کیسی معقول روشنی ڈالی ہے، دقیانوس کے سکہ کا واقعہ لاکر تاریخ نے واقعہ میں عجوبگی پیدا کردی ہے قرآن مجید نے اس عجوبگی کو دور کردیا، ہوسکتا ہے، لوگوں نے "سنین عددا" کے قیام غار کے باعث انکی غیرمعمولی ہئیت کذائی سے شبہ کیا ہو، اللہ اللہ کیا بلیغ اسلوب بیان ہے،"فابعثوا احدکم بورقکم ھذہٖ الی المدینۃ فلینظر ایھا ازکیٰ طعاما فلیاتکم برزق منہ ولیتلطف ولا یشعرن بکم احدا انھم ان یظھروا علیکم یرجموکم او یعیدوکم فی ملتھم ولن تفلحوا اذا ابدا"
قرآن مجید سے ظاہر ہوتاہے کہ اصحاب کہف نے اپنے رفیق کو مذہبی اختلاف کے خطرہ سے ڈرایا تھا، اور اس لئے "رجم" کا لفظ استعمال ہوتا ہے — جو مذہبی جرائم کی سزا ہے۔ قرآن نے دقیانوس کے سکہ کا کہیں تذکرہ نہیں کیا، اور نہ اصحاب کہف کے رفیق کی گرفتاری کو سکہ کی عجوبگی سے متعلق کیا

واقعہ پر تحقیقی نظر قرآن مجید کے بیان کردہ واقعہ میں کوئی ایسی بات نہیں جو مسلمات عقل کے منافی ہو، اور جس کے تسلیم کرنے میں وہم پرستی، عجوبہ نوازی، اور ماورا طبیعت عقاید کا الزام ہو، دوتین مقامات ایسے ہیں جو بادی النظر میں مخالف عقل معلوم ہوتے ہیں لیکن معمولی غور وفکر سے یہ مرحلہ بھی طے ہوجاتا ہے۔

(۱) فضربنا علیٰ اٰذانھم فی الکھف سنین عددا۔

(۲) وتری الشمس اذا طلعت تزاور عن کھفھم ذات الیمین۔

(۳) واذا غربت تقرضھم ذات الشمال وھم فی فجوۃ منہ

تیسرا مقام تھا۔ "ولبثوا فی کھفھم ثلث مائۃ سنین وازدادوا تسعا" جسکی توضیح سطور بالا میں ہوچکی، پہلے مقام کے متعلق یہ کہدینا کافی ہے، کہ اس سے اصحاب کہف کا غار میں ایک سال سے زیادہ رہنا ثابت ہے، یہاں بھی کوئی بعید از عقل بات نہیں بہت سی قومیں ایسی ہیں جو غار میں اپنی زندگی بسر کردیتی ہیں، واقعات اور مشاہدات بتاتے ہیں کہ بہت سے زہاد اور مرتاض ایسے پائے گئے ہیں جو مدت العمر عزلت نشین رہے اور دنیا اور اہل دنیا کو جھانک کر بھی نہ دیکھا۔ قرآن مجید نے یہاں یہ بیان نہیں کیا کہ وہ ایک سال سے زیادہ نیند ہی میں پڑے رہے، بلکہ مجرد مدت استقرار کی تعیین کی گئی ہے، کیونکہ اگر قرآن مجید کا یہ مقصود ہوتا کہ وہ اتنی مدت تک نیند ہی میں پڑے رہے تو اس کے بعد جگانے کا لفظ آتا۔ حالانکہ اس کے بعد ہے، "ثم بعثنٰھم لنعلم ای

الحزبین احصی لما لبثوا امدا" لفظ "بعث" صاف بتارہا ہے، کہ وہ استغراق، مراقبہ وغیرہ سے ہوش میں آئے، اور مدت استقرار کے متعلق بحث وتمحیص کرنے لگے، اور اگر مفسرین کے قول کے مطابق "بعث" بیداری کے معنی میں لیا جائے جیسا کہ جلالین میں ہے، "لبعثناهم ای ایقظناهم" تو بھی موجودہ روشنی میں کوئی استحالہ عقلی نہیں، چنانچہ آج بھی زمانہ اس قسم کے واقعات سننے اور سنانے کا عادی ہے، ۱۳ ستمبر ۱۹۲۸ء کے انگریزی اخبار بسومتی میں، بمقام جوہنسبرگ ایک لڑکی کے خواب ہژدہ سالہ کے متعلق، عجیب وغریب واقعات لکھے ہیں، یہ لڑکی جب بیس برس کی تھی تو اس کا عاشق ۱۹۱۰ء کے جنگ میں مارا گیا، اس واقعہ سے اس پر ایسا صدمہ ہوا، کہ وہ اٹھارہ سال تک مدہوشی میں پڑی رہی، کچھ دنوں تک لوگ اسے ٹیوب کے ذریعہ کھانا دیتے رہے، پھر اس سے بھی اس نے انکار کردیا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انسانی ڈھانچہ ہو کر رہ گئی، کچھ دنوں سے اسمیں بیداری کے آثار ظاہر ہونے لگے، اور وہ تدریج یکدم بیدار ہوگئی، اس کے مقابلہ میں "سنین عددا" اور بھی قرین قیاس ہے، "سنین عددا" ایک ایسا ٹکڑا ہے جس سے ایک سال سے زیادہ جتنی مدت کی تعیین عقل روا رکھ سکتی ہے، کر سکتے ہیں، قرآن مجید میں یہ کہیں نہیں کہ اصحاب دوسو، اور تین سو برس تک سوتے رہے، یا دقیانوس کے زمانہ میں سوئے اور تھیاڈوسیس ثانی کے زمانہ میں بیدار ہوئے،

دوسرے مقام سے بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوتی ہے، چنانچہ "دی نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا" میں ہے کہ قرآن میں "سات سونے والوں کا قصہ" احترام کے ساتھ نقل کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آفتاب نے دن میں دو مرتبہ اپنا دائرہ گردش بدل دیا، تاکہ غار میں اس کی روشنی پہونچے" غالباً واقعہ نگار کو اسی آیت سے غلط فہمی پیدا ہوئی، حالانکہ الفاظ قرآن سے یہ معنی نہیں ظاہر ہوتے

جارج سیل نے لکھا ہے کہ غار کا دہانہ جنوب کی طرف کھلا ہوا تھا، اس صورت میں معنی صاف ہے، [illegible] تصور کرلیا جائے تو آفتاب طلوع کے وقت غار کے داہنی ہی طرف اور غروب کے وقت بائیں جانب ہوگا، گردش شمسی کا تغیر کا تو کوئی تذکرہ ہی نہیں واقعہ تو صحیح ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ کس زمانہ سے تعلق رکھتا ہے، مسیحی روایات کے بعض حصوں کو مان لیا جائے، اور آیات بالا کے شان نزول کو مد نظر رکھا جائے جیسا کہ مفسرین بیان کرتے ہیں، تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت مسیح اور عہد نبی صلعم کے درمیانی زمانہ میں حادثہ ہوا، گو قرآن مجید نے لفظاً یہ بھی نہیں بتایا کہ اصحاب کہف پیروان مسیح تھے، بلکہ انھیں صرف "مومن" کہا ہے۔

اسلامی اور مغربی تمام مصنفین نے اس واقعہ کا حدوث دقیانوس (رومی) کے زمانہ میں بتایا ہے، میری تحقیق میں یہ صرف تقلید روایت ہے ہسٹری آف دی ورلڈ جلد ۵ کے مطالعہ سے ایک شیدائے تحقیق اس نتیجہ پر پہونچتا ہے، کہ اس عالمگیر نظریہ کا انکار کردیا جائے، اس واقعہ کو دقیانوس ہی کی طرف منسوب کرنے کی یہ وجہ ہے، کہ تمام مورخین نے بالواسطہ یا بلاواسطہ ایک ہی راوی کی روایت نقل کی ہے گریگوری نے جو مغرب میں اس واقعہ کا سب سے پہلا ناشر ہے، ایک شامی سے سنکر یہ روایت نقل کردی، (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا) حالانکہ اول تو دقیانوس کی سلطنت کے حالات ہی تاریخ میں نا مکمل ہیں، دوسرے، صرف تین برس تک اس کی حکومت رہی، علامہ ابن خلدون نے پانچ برس تک اس کی مدت سلطنت بتائی ہے اور لکھتا ہے کہ اس کے عہد میں نصرانیوں پر بڑا ظلم ہوا، شہر افسس میں اس نے ایک بڑا بت خانہ بنوایا، اصحاب کہف کا واقعہ بھی علامہ موصوف اسی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ابن خلدون نے، دقیانوس کے متعلق اسی

شامی روایت کی بنا پر یہ واقعہ لکھدیا، حالانکہ ہسٹری آف دی ورلڈ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے، کہ اس کے زمانہ میں نصرانیوں پر کوئی ظلم نہیں ہوا ہاں اسی زمانہ کے قریب ۲۸۶ء اور ۳۰۵ء کے درمیان ایک رومی بادشاہ دیاقلیطین ہوا، البتہ اس نے مسیحیوں کا خون کیا، اس کے متعلق تاریخ میں ہے، کہ اُس کے ظالمانہ احکام کا اصدار عیسائیوں کے جان و مال کی بہ نسبت ان کے مذہب اور دین کے خلاف ہوتا تھا۔ اس نظریہ کی مزید تحقیق اس امر سے ہوتی ہے، کہ اس نے رومی سلطنت کو دو حصوں پر تقسیم کردیا تھا اور ایک رومی شخص میکسیمین کو آگسٹس کا خطاب دیکر حکومت رومہ کے مغربی حصہ کا نظم و نسق سپرد کردیا، اور خود مشرقی حصہ پر متصرف رہا چونکہ اصحاب کہف کا واقعہ مشرقی روایت سے لیا گیا ہے، اس سے بہت ممکن ہے، کہ دیاقلیطین کی قہرمانی حکومت مشرقی، اور عداوت مسیحیت کے باعث مشرق ہی میں حادث ہوا ہو، دقیانوس کے دورِ حکومت میں مسیحیوں کے قتل و غارت کا کوئی معمولی واقعہ بھی نہیں، اس کی سلطنت تو بہت قلیل عرصہ تک رہی، وہ بھی گاتھ قوم سے مجادلہ اور مقاتلہ میں صرف ہوئی، یہاں تک کہ وہ اسی قوم کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے مارا گیا اور اس کی لاش کا پتہ نہ لگا، دقیانوس کے متعلق اس واقعہ کی نسبت قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی، تھیاڈوسیس ثانی کے زمانہ میں اصحاب کہف کی بیداری بعد کی ایجاد ہے، یا شامی نصرانیوں کی افسانہ تراشی، واقعہ صحیح ہے لیکن جیسا کہ فادر مرتی کا خیال ہے، اس کے بعض حصے غلط ہیں،

یہ واقعہ عالم مسیحیت میں اس قدر اہمیت رکھتا ہے، کہ دی نیو پاپولر انسائیکلوپیڈیا کی روایت کے مطابق مسیحیوں نے ہر سال ۲۷ جون کو اس واقعہ کی یاد منانا شروع کی، جاج سیل لکھتا ہے کہ فادر مرتی "ہوٹنگر" کو "رد المحمدیت" خطاب کرتا ہے، چونکہ اس نے اصحاب کہف کے واقعہ کو کہانی سے تعبیر کیا۔

فرصت کی قلت اور فکر و شغل کے ہنگامہ سے نجات کہاں کہ ذوق کی رہنمائی [illegible] کی جائے، لیکن راقم نے یہ جو کچھ لکھا، وہ ڈاکٹر سنڈل کی نظرِ عنایت کی بدولت، اور نگار دل کی نمائش [illegible] قلب کا تکملہ کرتے یہ کچھ خامہ فرسائی کی وہ ڈاکٹر موصوف ہی کی ناوک اندازی جفا سے

عبد المالک

مرزا جعفر علیخاں اثر کی تنقید "روح نشاط" پر ایک نظر

اور

اہل لکھنؤ کے موجودہ ارباب سخن کو ایک صائب مشورہ

ملک کے مشہور شاعر جناب مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی نے ——— "نشاط روح" پر ایک مختصر تنقید لکھی ہے جو "مرقع" کے مارچ ۱۹۲۶ء نمبر میں شائع ہوئی ہے، میں نے اس تنقید کو اس لحاظ سے کہ ایک نامور اہل سخن کے قلم سے نکلی ہے، نہایت غور کے ساتھ شروع سے آخر تک پڑھا، مجکو توقع تھی کہ اصول تنقید کے لحاظ سے یہ ایک قابل قدر بحث ہوگی، لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس تنقید کو پڑھنے کے بعد مجکو اس قول کی صداقت کا یقین کامل ہوگیا کہ شعر فہمی شعر گوئی سے زیادہ مشکل فن ہے، ع نہ ہر کہ آئینہ سازد سکندری داند،

حضرت اثر نے بجائے اس کے کہ وہ حضرت اصغر کے کلام کے محاسن و معائب پر نقد و بحث کرتے، زیادہ تر میرے ہی مقدمہ پر خامہ فرسائی فرمائی ہے، یہ کوئی غیر متوقع امر نہ تھا، ہر نقاد کو اس قسم کی بے باک اور آزادانہ جنبش قلم کے بعد ظاہر پرست مخالفین کے غوغائے بے آہنگ کے خیر مقدم کے لئے تیار رہنا چاہیے، مجکو مسرت ہے کہ اصغر کے "نعرۂ مستانہ" نے "بیماران" لکھنؤ کے مرگ نواز سکون میں بالآخر ہیجان پیدا کیا اور خلوت نشینان ماتم، کی طرف سے مخالفت کی صدائیں بلند ہونے لگیں، چنانچہ مرزا صاحب کی یہ صدائے احتجاج اس دلچسپ سلسلہ کی سب سے پہلی قسط ہے،

میرے مقدمہ پر مرزا صاحب کا سب سے پہلا اعتراض یہ ہے کہ میں نے اکثر اشعار کے مطالب کی تشریح میں غلطی کی ہے، میرے مطالب کو نقل کرنے کے بعد مرزا صاحب نے خود اشعار کے معانی بیان فرمانے کی کوشش کی ہے، لیکن بقول ان کے باادب عرض کرونگا "مرزا صاحب شعر کی خوبیاں تو درکنار اس کا مطلب بھی نہیں سمجھے"

حضرت اصغر کا شعر ہے ؎

مقام جہل کو پایا نہ علم و عرفاں نے　　　میں بے خبر ہوں باندازۂ فریب شہود

مرزا صاحب اس شعر کی تشریح یوں فرماتے ہیں،

"شاعر کہتا ہے، کہ جو کچھ علم و عرفاں کے دائرہ سے باہر جہل ہے،

"مقام جہل کو پایا نہ علم و عرفاں نے"

باادب عرض کرونگا کہ یہ مرزا صاحب نے کہا ہے، شاعر نے کبھی نہیں کہا، مرزا صاحب کا دعویٰ ہے کہ "جو معنی عرض کرونگا، الفاظ سے مترشح ہوں گے، محض خیالی نہ ہوں گے"

اب ناظرین غور کریں، کہ یہ مفہوم کہ "جو کچھ علم و عرفان کے دائرہ سے باہر ہے، جہل ہے" اس مصرعہ کے الفاظ سے کیونکر مترشح ہوتا ہے؟ "مقام جہل" اور "علم و عرفان کا اس کو نہ پانا" ان ٹکڑوں سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ جہل کوئی ایسا رفیع مقام ہے، جہاں تک علم و عرفان کی رسائی نہیں ہو سکتی "مقام" کا لفظ خود اس امر کی روشن اور بدیہی دلیل ہے کہ جہل کوئی ایسی چیز ہے، جو علم و عرفان سے بلند تر ہے، چنانچہ اس کی تشریح آگے آتی ہے، ابھی تو مرزا صاحب کا مطلب نقل کر رہا ہوں، اس کے بعد فرماتے ہیں:-

"تحصیل علم و عرفان کا ذریعہ یہی عالم کون و فساد ہے، جو خود فریب شہود ہے، یعنی بے حقیقت و بے ثبات، لہذا ہم جسے علم و عرفان کہتے ہیں، بے خبری ہے، اور بے خبری بھی عجیب قسم کی جو علم و عرفان کے ساتھ ترقی کرتی ہے۔

میں بے خبر ہوں باندازۂ فریب شہود

جسقدر ہم پر فریب شہود کھلتا جاتا ہے، اسی قدر اندازہ ہوتا جاتا ہے کہ ہمارا جہل کتنا شدید ہے، پھر بھی اپنے جہل کی تھاہ نہیں ملتی، کیونکہ علم و عرفان کی مدد سے جہاں ایک حجاب آنکھوں کے آگے سے اٹھا اس کی جگہ ہزار نئے حجاب قائم ہوگئے، مثلاً ایک قطرۂ آب کو لیجئے، جب تک یہ علم نہیں تھا کہ اسمیں ہزاروں جاندار مخلوق آباد ہیں، ہمارا جہل صرف قطرۂ آب تک محدود تھا، مگر اس علم نے ہزاروں نئے راستے جہل کے کھولدئے کیونکہ بجائے ایک قطرۂ آب کے اب اس کی دنیا کی معرفت در پیش ہوئی... ......

حاصل یہ ہوا کہ جب موجودات عالم کے متعلق ہمارے علم و عرفان کی یہ حالت ہو کہ اپنے جہل کی بھی انتہا دریافت نہیں ہوتی تو ہم ذات و صفات باری تعالیٰ کا انحصار کیا کر سکتے ہیں۔"

افسوس ہے، کہ مرزا صاحب نے ثانی مصرعہ کا بھی مطلب بالکل غلط سمجھا، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ جسقدر فریب شہود کا اندازہ ہوتا جاتا ہے، اسی قدر ہمارے جہل کی شدت بھی محسوس ہوتی جاتی ہے، بلکہ اس کا مفہوم جیسا کہ الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے صرف یہ ہے کہ باوجود اسکے کہ مجھے فریب شہود کا اندازہ ہے، یعنی میں جانتا ہوں کہ جو کچھ نگاہوں کے سامنے ہے، محض سراب بے بود ہے، تاہم بے خبر ہوں، یعنی اس فریب میں مبتلا ہوں اور یہی فریب شہود میں مبتلا ہو جانا دراصل وہ مقام جہل ہے، جس کی طرف مصرعۂ اول میں اشارہ کیا گیا ہے، شاعر نے اس کو علم و عرفان سے بلند تر اس لئے کہا ہے کہ یہ حقیقت میں "بساط آرائے شہود" کے منشا کی تعمیل ہے، "بزم شہود فریب سہی، اور میں جانتا ہوں کہ یہ فریب محض ہے لیکن پھر بھی، اس فریب سے بے خبر ہوں، کیونکہ انقیاد و طاعت کا تقاضا ہے، کہ محبوب ازل کے ہر اشارۂ چشم و ابرو پر جبین نیاز جھکی رہے، عالم کائنات کے مشاہد و مظاہر سے چشم پوشی اختیار کرنا دراصل مشیت ایزدی کی خلاف ورزی کرنا ہے، اگر عالم موجودات کو فریب سمجھکر انسان اس سے بالکل بے تعلق ہو جائے، ورا س کی نگینیوں کو نظر انداز کر دے، تو پھر اس کائنات ارضی کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ اگر یہ فریب گاہ رنگ و بو انسان کی چشم تماشا کے لئے نہیں ہے، تو پھر کس کے لئے ہے؟ کیا ملائکہ قدسی اس کی ستم طرازیوں کا ناز اٹھائیں؟ البتہ انسان کو یہ نہ بھولنا چاہئے کہ جو کچھ اس کی نگاہوں کے سامنے ہے، وہ کوئی مستقل چیز نہیں، بلکہ صرف جمال ازل کا پرتو ہے، یہی وجہ ہے، کہ عرفان حقیقت باوجود اس کے کہ ان کو دنیا کی بے ثباتی کا یقین کامل تھا، رزمگاہ حیات میں سرگرم عمل نظر آتے ہیں، اس لئے کہ پیکر آرائے ازل کا یہی منشا ہے، اس بنا پر مقام جہل یعنی فریب شہود کا دلدادہ بنجانا علم و عرفان سے یقیناً ایک بلند تر مقام ہے، کیونکہ علم و عرفان متقاضی ہے، کہ عالم کائنات

کو فریب محض سمجھ کر اس کی رنگینیوں سے آنکھیں بند کر لی جائیں، اور یہ قطعاً بساط آرائے شہود کے منشاء کے خلاف ہے، لیکن مرزا صاحب کو حیرت ہے کہ:—

"فریب شہود کا سدِّ راہ ہونا علم و عرفان سے بلند مقام ہوا یا وہم پرستی ہوئی، جلوہ گاہ حقیقت کے محرمان خاص اور جہل کے، الہ اللہ توبہ! توبہ!"

میرا بھی بے اختیار جی چاہتا ہے کہ اس نکتہ سنجی اور بلاغت شناسی پر توبہ توبہ کروں، لیکن مرزا صاحب نے اپنی معذرت خود کر دی ہے کہ

"شعر کی تمام خوبیوں کا اظہار مجھ ایسے بے بضاعت اور کم فرصت شخص کے لئے ناممکن ہے، علاوہ بریں اس کے سمجھنے کے لئے ایک عارف کی ضرورت ہے، اور یہاں قحط حال ہے،

رات اندھیری سخت منزل راستہ دور و دراز — اے مرے اللہ تھوڑی روشنی میرے لئے"

اس لئے مجھ کو یہ شکایت نہیں کہ انھوں نے اشعار کے مطالب و معانی صحیح نہیں سمجھے، یا ان کی خوبیوں تک انکی نظر پہونچنے سے قاصر رہی، ظاہر ہے، کہ ذوق صحیح کسی کی میراث نہیں، جو نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی رہے، یہ صرف عطیۂ قدرت ہے، جس سے ہر شخص فیضیاب نہیں ہو سکتا، ہر نگاہ برق سر طور کے جلوؤں کی تاب نہیں لا سکتی، ہر دیوانہ مجنوں نہیں بن سکتا، ہر برہنہ جسم کو سرمد کی عریانی نصیب نہیں ہو سکتی، ہر دست طلب منصور کی طرح دار و رسن کی طرف بے باکانہ نہیں بڑھ سکتا، ہر سینہ سوز بلال سے منور نہیں ہو سکتا، برق جمال ہر قلب پر نہیں گر سکتی، گلشن قدس ہر طائر کا نشیمن نہیں بن سکتا،

سرِ غم عشق بوالہوس را نہ دہند — سوز دل پروانہ مگس را نہ دہند
عمرے باید کہ یار آید بکنار — ایں دولت سرمد ہمہ کس را نہ دہند

لیکن ہمکو مرزا صاحب سے اس کی شکایت ضرور ہے، کہ انھوں نے لکھنؤ کے ظلمت کدہ میں بیٹھ کر صحیفۂ معرفت کی ورق گردانی کی کوشش فرمائی ہے، ظاہر ہے کہ ایک نگاہ جو صرف شاہدان لب بام کی عشوہ طرازیوں کی فریب خوردہ ہے، حیات انسانی کے رموز قدس کی ادا شناس کیونکر ہو سکتی ہے؟ ایک ہاتھ جو مدت سے صرف رقیب کی زد و کوب میں مصروف رہا ہو، حریم محبت کے پردہ ہائے لطیف کو کیونکر اٹھا سکتا ہے؟

حریف کاوش مژگان خونریزش نہ زاہد — بدست آور رگ جانے و نشتر را تماشا کن

مرزا صاحب بھی روشنی کے طالب ہیں، افسوس ہے، کہ لکھنؤ کی فضا اس سے محروم ہے، کیا مرزا صاحب اس ظلمت کدے سے باہر قدم نکالنا چاہتے ہیں؟ کیونکہ بغیر اسکے کی نگاہیں روح انسانی کی ان پر کیف حسیات مخفیہ کی ادا شناس نہیں ہو سکتیں، جو در اصل صحیفۂ شاعری کے ابدی نقوش ہیں، معلوم نہیں، کہ لکھنؤ کے "خفتگان لحد" کی صبح حشر کب نمودار ہوگی،

مرزا صاحب نے شعر مذکورۂ بالا کا جو مطلب بیان کیا ہے، وہ حقیقت میں اس پامال مقولہ یعنی "معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد" کی صدائے بازگشت ہے، مرزا صاحب نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، وہ بجائے خود بے شبہ ایک صحیح خیال ہے، لیکن وہ شعر زیر بحث کا مفہوم ہرگز نہیں ہے اس غلط فہمی کی وجہ، صرف یہ ہے کہ انھوں نے مقام ذہن سے یہ مراد لیا کہ "جہل کی تھاہ نہیں ملتی" حالانکہ یہاں اس سے مطلب درجہ اور

مرتبہ کے ہیں، یعنی جہل فریب شہود ایک درجہ ہے جو علم فریب شہود سے بالاتر ہے، کیونکہ جہل میں انقیاد و طاعت کی تجلی نمایاں ہے، اور علم و عرفان میں ایک قسم کی سرکشی کی بو آتی ہے، دونوں میں ایک عاشق از خود رفتہ کے نقطۂ نظر سے جو عظیم الشان فرق ہے، اس کو ہر صاحب ذوق محسوس کر سکتا ہے، مرزا صاحب کو شاید یہ معلوم ہو کہ ارباب نظر کے نزدیک مجذوب کی عظمت ایک سالک سے نسبتہً کم ہے، کیونکہ ایک عالم جذب میں دنیا اور اس کے تعلقات سے بالکل علحدہ ہو جاتا ہے، اور دوسرا دین و دنیا دونوں کو ساتھ لیکر چلتا ہے، کیونکہ اس کے خالق کا یہی حکم ہے، اسلام نے بے شبہ حیات دنیاوی کو لہو و لعب قرار دیا ہے، لیکن اسی کے ساتھ اپنے پیروؤں کو یہ بھی حکم دیتا ہے کہ "لا تنس نصیبک من الدنیا" یعنی دنیا میں جو تمہارا حصہ ہے، اس کو مت بھولو، اس کا مقصد یہ ہوا کہ دنیا کو کوئی مستقل چیز سمجھکر اس کے دام حرص میں مبتلا نہ ہو جاؤ بلکہ جہاں تک ہو سکے جائز حدود میں رہ کر اس کی رنگینیوں سے بہرہ اندوز ہو، اور اپنے فرائض منصبی سے غافل نہ رہو، حضرت اصغر نے دراصل اس شعر میں اسی لطیف حقیقت اسلامی کی طرف اشارہ کیا ہے، جس کو مرزا صاحب سمجھ نہ سکے، دو انسانوں کی فطری استعداد و صلاحیت کا اختلاف دیکھو کہ اصغر نے ایک لطیف حکیمانہ نکتہ بیان کیا، اور توقع کی کہ دنیا اس کی لطافت پر وجد کریگی، لیکن اثر کی جدت طرازیوں نے کھینچ تان کر اس کو ایک عامیانہ خیال بنا دیا اور پھر اس فقیر پر شعر نہ سمجھنے کا الزام بھی ہے۔

مرزا صاحب میری تشریح کو اصغر کے "فلسفیانہ وحدت آشنا" دماغ کے لئے توہین سمجھتے ہیں، لیکن معلوم نہیں جناب اصغر مرزا صاحب کی اس ظالمانہ جدت کو اپنے لئے کہاں تک سرمایۂ فخر و عزت خیال کرتے ہیں!

مرزا صاحب کو حیرت ہے کہ جس کے دماغ سے یہ شعر نکلا ہو:

میں ہوں اور اس سے گرم رو عرصۂ وجود　　میرا ہی کچھ غبار ہے، دنیا کہیں جسے

"اور جو دنیا کے متعلق یہ کہے کہ میرا ہی کچھ غبار ہے، وہ اور فریب شہود کے سامنے سر جھکائے!"

لیکن میں باادب عرض کرونگا، کہ جو شخص اپنی عالی نظری سے عرصۂ وجود کو محض اپنی گرم روی کا غبار سمجھتا ہے اسی کی نکتہ رس نگاہوں کو اس غبار کے ذروں میں انوار ازل کی جھلک بھی نظر آسکتی ہے، وہی اس رمز لطیف سے بھی واقف ہو سکتا ہے کہ دنیا کی لطافتیں اسی کے دل و دماغ کی ضیافت کے لئے ہیں، اور کسی کے لئے نہیں ہیں، البتہ اسکو یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ان سب مشاہد و مظاہر کا حقیقی مبدا اور نورانیت کہیں اور ہے،

سر رشتۂ روشنی بدست دگر است　　پروانہ و شمع انما شاگرد و عم

مرزا صاحب کے استعجاب کی ایک وجہ غالباً یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے فریب شہود سے شاید دنیاوی حرص و طمع مراد لے رکھی ہے اگر ایسا ہے، تو بے شبہ اصغر کے حقیقت شناس دل و دماغ کی توہین ہے، لیکن یہاں اس سے حیات انسانی کی رنگینیوں اور لطافتوں سے مراد ہے، جو فریب اس لئے ہیں کہ وہ کوئی مستقل چیز نہیں، تاہم انسان ہی کے لئے ہیں، اصغر کا سر فریب شہود کے سامنے اس لئے نہیں جھکتا کہ خود اس میں کوئی لذت ہے، بلکہ اس لئے جھکتا ہے کہ تقاضائے قدرت یہی ہے، علم و عرفان کا تقاضا چونکہ اسکے خلاف ہے، اس لئے وہ اس کو جہل سے فروتر سمجھتا ہے،

مرزا صاحب کو فریب شہود کے سامنے سر جھکانے پر حیرت ہے، لیکن خود تحریر فرماتے ہیں،

"یہ تمام رنگینیاں اور لطافتیں صرف انسان کے واسطے ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ ان کے فریب سے ان کے طلسم میں گرفتار نہ ہو جائے ان کو محبوب نہ بنائے، بلکہ یہ سمجھے کہ عہد الست کی یاد دلانے والی نشانیاں ہیں"

ناظرین خود اس کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس سے ہمارے خیال کی کس حد تک تائید ہوتی ہے، اصغر نے یا میں نے کب یہ کہا، کہ انسان دنیا کو مستقل محبوب بنائے، اور "عہد الست" کو بھول جائے، میں نے بھی برابر عرض کیا ہے کہ گو مجھے اس کا احساس ہے، کہ دنیا فریب محض ہے، لیکن چونکہ مصور ازل نے یہ تمام نقش آرائیاں میرے ہی چشم شوق کے لئے کی ہیں، اس لئے مجھے ان سے کیف اندوز ہونا چاہئے لیکن فتور فہم کا کیا علاج ہے؟ مرزا صاحب کو جب یہ تسلیم ہے کہ "تمام رنگینیاں اور لطافتیں صرف انسان کے واسطے ہیں" تو پھر ان کو نظر انداز کرنا کیا مشیت الٰہیہ کی خلاف ورزی نہیں ہے؟

افسوس ہے کہ جناب اثر نے شعر زیر بحث کے بعد کا شعر ملاحظہ نہیں فرمایا ورنہ وہ ہرگز اس افسوسناک غلطی میں مبتلا نہ ہوتے، وہ شعر یہ ہے،

مرا وجود ہی خود انقیاد و طاعت ہے کہ ریشہ ریشہ میں ساری ہے ایک جبین سجود

یہ مسلسل نظم کے اشعار ہیں جو اصغر نے نعت میں لکھی ہے، ایک مسلسل نظم میں ہر شعر کو دوسرے شعر سے ایک خاص معنوی تعلق ہوتا ہے اسلئے کسی شعر کی تشریح کرتے ہوئے اس کے قبل و بعد کے اشعار پر بھی نظر ڈال لینی چاہئے، کیونکہ اس سے اصل مفہوم کے سمجھنے میں بہت زیادہ مدد ملتی ہے، غزل میں چونکہ ہر شعر بجائے خود ایک مستقل خیال ہوتا ہے، اس لئے وہاں گرد و پیش کے دیکھنے کی ضرورت نہیں، لیکن ایک مربوط اور مسلسل نظم میں اشعار کے ربط باہم کا لحاظ نہایت ضروری ہے؛

اب ناظرین دونوں اشعار کو پیش نظر رکھکر غور کریں کہ در اصل جناب اصغر کا کیا مفہوم ہے، اگر مرزا صاحب کا مطلب تسلیم کر لیا جائے، تو دوسرے شعر کا مفہوم بالکل بے کار ہو جاتا ہے، اور نہ اشعار میں باہم کوئی معنوی ربط باقی رہ جاتا ہے بلکہ دونوں شعر اپنی اپنی جگہ پر مستقل خیال بن جاتے ہیں جن کو ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں، حالانکہ ایک مسلسل نظم میں پریشان گوئی کسی طرح جائز نہیں ہو سکتی، لیکن جو مطلب میں نے عرض کیا ہے اگر اس کو ملحوظ خاطر رکھا جائے تو، دونوں اشعار میں ایک خاص ربط پیدا ہو جاتا ہے، اور نظم کی کوئی کڑی ٹوٹنے نہیں پاتی، بلکہ دونوں شعروں کو مجموعی حیثیت سے دیکھتے ہوئے میں باادب یہ عرض کرنیکی جرأت کروں گا، کہ جو کچھ میں نے تشریح کی ہے، اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا مفہوم ممکن ہی نہیں اور اگر ممکن ہے، تو وہ صرف ایک پادر ہوا جدت ہوگی، جیسا کہ مرزا صاحب نے کی ہے،

غور کرو، دوسرے شعر نے میرے مفہوم کو کس قدر وسیع اور روشن کر دیا ہے، انسان کا وجود سرتاپا انقیاد و طاعت ہے، نیاز و بندگی اس کی فطرت میں داخل ہے، اس نے روز ازل بلیٰ کہکر ہمیشہ کے لئے اپنی گردن میں حلقۂ عبودیت ڈال لیا ہے، اس لئے وہ فطرۃً مجبور ہے کہ ساز الست کی ترنم ریزیوں کے سامنے سر عقیدت خم کرتا رہے، ایک بندے کی شان ناز اسی کی متقاضی ہے، کہ وہ اپنی ہستی کو سرتاپا آقا کے اشارہ ہائے چشم و ابرو سے وابستہ کر دے، اسی بنا پر اصغر نے کہا ہے، کہ گو مجھے اس کا اندازہ ہے کہ بزم شہود فریب محض ہے، لیکن پھر بھی اسکی رنگینیوں

اور لطافتوں سے لطف اندوز ہوتا ہوں، کیونکہ میں سرتاپا نیاز و بندگی ہوں، اور بساط آرائے شہود کے اشاروں کے سامنے جھکنے کے لئے مجبور ہوں، اس موقع پر ناظرین ایک مرتبہ اور دونوں شعروں کو ایک ساتھ پڑھیں۔

مقام جہل کو پایا نہ علم و عرفان نے میں بے خبر ہوں یا ندازۂ فریب شہود

کیوں؟ اس لئے کہ

مراد وجود ہی خود انقیاد و طاعت ہے کہ ریشہ ریشہ میں ساری ہو اک جبین سجود

اور انصاف کریں کہ مرزا صاحب نے جو مفہوم بیان کیا ہے، وہ کس حد تک دونوں شعروں کی مجموعی ترکیب سے مترشح ہوتا ہے، دوسرا شعر جس کے مطلب پر مرزا صاحب کو اعتراض ہے، یہ ہے،

ایسا بھی ایک جلوہ تھا اس میں چھپا ہوا اس رُخ پہ دیکھتا ہوں اب اپنی نظر کو میں

اس کی تشریح کرتے ہوئے مرزا صاحب فرماتے ہیں:

پہلے مصرعہ میں لفظ اس کی ضمیر نظر کی طرف نہیں (جیسا غالباً مرزا صاحب کا خیال ہے، اگرچہ انھوں نے اس امر کو مبہم ہی رہنے دیا) بلکہ رخ کی طرف پھرتی ہے، معشوق کے رُخ میں جہاں اور جلوے تھے وہاں ایک ایسا بھی جلوہ تھا جو میری نظر کی نورانی شعاعوں سے مشابہ تھا،

میرا مطلب بھی ناظرین پیش نظر کر لیں، وہ یہ ہے،

"اکثر انسان میں مخصوص صلاحیتیں ہوتی ہیں، جو مخفی اور غیر محسوس رہتی ہیں، لیکن جب کوئی خارجی اثر محرک ہوتا ہے، تو وہ دفعتہً چمک اٹھتی ہیں، جب تک رُخ رنگیں سے نظر فیضیاب نہیں ہوئی تھی، اس وقت اس کی معجز نمائیوں کا احساس نہ تھا"

مرزا صاحب فرماتے ہیں،

عاشق کو رخ پر نور کا جلوہ دیکھنا نصیب ہوا، شوق کی بے تابی اور جلوے کی خیرگی نے خد و خال کو دم بھر کے واسطے نمایاں کر کے آنکھ سے اوجھل کر دیا فقط ایک تار شعاعی چہرۂ معشوق سے عاشق کی نظر تک قایم ہو گیا"۔ ....

افسوس ہے کہ جناب اثر باوجود ادعائے شعر فہمی کے اصلی مفہوم تک نہ پہونچ سکے، بلکہ جو کچھ انھوں نے سمجھا وہ بالکل الثا دماغی ساخت بھی کیا چیز ہوتی ہے، مرزا صاحب نے اپنے مفہوم کی تائید میں پہلے مصرعہ میں لفظ "بھی" اور دوسرے مصرعہ میں لفظ "اب" پر زور دیا ہے، لیکن میں عرض کروں گا کہ الفاظ ..... کی نزاکت آفرینی کی تردید ہوتی ہے؛ "لفظ اب" سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نظر میں کوئی خاص رنگینی پیدا ہو گئی ہے، جو پہلے موجود نہ تھی، یا اگر موجود تھی، تو کم از کم اس کا احساس نہ تھا، اور اب کسی خارجی محرک نے محسوس کرا دیا ہے، اسی لئے شاعر کہتا ہے کہ اب بس اس پر اپنی نظر کو دیکھتا ہوں کہ اس میں کیا کیا جلوے ٹپک رہے ہیں، اور اس کو ایک گونہ حیرت ہے کہ میری نظر میں یہ سحر کاریاں بھی موجود تھیں، جن کا احساس اب مجھے ہوا ہے، یعنی جب رُخ رنگیں سے فیضیاب ہوئی اگر پہلے مصرعہ میں "اس" کی ضمیر جیسا کہ مرزا صاحب کا خیال ہے، رُخ کی طرف راجع ہے، تو شاعر کو رخ ہی کو دیکھنا تھا، وہ رخ پر اپنی نظر کو کیوں دیکھ رہا، اس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ نظر میں

کوئی خاص کیفیت پیدا ہوگئی ہے، جو اب تک غیر محسوس تھی۔ ورنہ پھر نظر کو دیکھنے کے کیا معنی؟ اگر وہ جلوہ رخ کا ہے، جو نمودار ہوا ہے، تو دیکھنے والے کو اسی میں محو ہو جانا چاہئے تھا۔ اپنی نظر کے دیکھنے کا کیا موقع ہے؟ نظر تو پہلے بھی موجود تھی، لیکن اس نے نہیں دیکھا، اب اس میں کیا خاص رنگینی پیدا ہوگئی ہے، کہ شاعر بجائے رخ کے اپنی نظر کو دیکھ رہا ہے، اگر اس کی رنگینی کا اس کو پہلے سے احساس موجود تھا تو لفظ "اب" بالکل بے کار ہو جاتا ہے اس سے قطعی طور پر ظاہر ہوتا ہے، کہ کسی خارجی اثر کے پرتو فیض نے نظر کی کوئی خاص کیفیت بے نقاب کردی ہے، جس کی لذت میں وہ اس وقت محو ہے اور وہ خارجی اثر یقیناً جمال محبوب کا پرتو ہے۔

اگر اس کی ضمیر رُخ کی طرف راجع ہے جیسا کہ مرزا صاحب کا خیال ہے، تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ مخصوص جلوہ کون سا ہے، جسکو مرزا صاحب کے ذوق نظر نے عریاں کر دیا ہے، مرزا صاحب فرماتے ہیں۔ "وہ جلوہ میری نظر کی نورانی شعاعوں سے مشابہ تھا" اگر یہ صحیح ہے، تو یہ خود آپ کی نظر ہی کا جلوہ تھا، جو رخ محبوب پر منعکس ہوا، خود رُخ محبوب کا وہ جلوہ کہاں ہے، جو اب تک چھپا ہوا تھا، اور جس کو آپ کے کیف نظر نے بے نقاب کر دیا؟

علاوہ اس کے اگر مرزا صاحب کا ارشاد صحیح مان لیا جائے، تو اس سے ان پر ضعف عشق کا الزام عائد ہوتا ہے۔ کمال عشق کا تقاضا ہے، کہ محبوب کی ذات کو ہر قسم کے جلووں کا جامع تصور کر کے اس سے اظہار محبت کیا جائے، معشوق سراپا حسن ہے، اس میں ہر قسم کا جلوہ پہلے سے موجود ہے، وہ ہر حیثیت سے کامل ہے، اسکی سحر طرازیوں کا ظہور عاشق کے ذوق نظر کا رہین منت نہیں ہے، بلکہ خود ذوق نظر کی رنگینیاں اس کے فیضان جمال کی محتاج ہیں، اصغر کا دل ہمہ تن نیاز عشق سے لبریز ہے، وہ حریم حسن کے آداب کا محرم خاص ہے، اس کے نزدیک جمال محبوب تمام روحانی فیوض و برکات کا سرچشمہ ہے اس کی فطرت اپنی حقیقی نشوونما کے لئے اسی کے نگاہ کرم کی محتاج ہے، وہ اس گستاخی کا مرتکب نہیں ہو سکتا کہ اس کا ذوق نظر جمال یار کے جلووں کو بے نقاب کرے، یہ ہمت صرف اثر صاحب ایسے عاشق کی ہو سکتی ہے، جن کی نگاہیں ابھی تک لب بام سے آگے نہیں بڑھ سکیں، اور غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس شعر کی تشریح کے وقت لب بام ہی کا سماں اثر صاحب کے پیش نظر تھا، یعنی عاشق کوٹھے کے نیچے کھڑا ہے، دفعتہً معشوق لب بام آکر جلوہ فرماتا ہے، نگاہیں چار ہو جاتی ہیں، اور نظر بازی کا ایک پر کیف سماں بندھ جاتا ہے، اور بس۔ غور کرو کہ اس میں کون سا لطیف پہلو ہے، جس پر ذوق سلیم وجد کرے،

طبیعتوں کی اثر پذیری کا فرق مراتب دیکھو، جمال یار کی شعاعیں اثر اور اصغر دونوں پر جلوہ فگن ہوتی ہیں، لیکن ایک محض لطف نظر اٹھا کر رہ جاتا ہے اور دوسرے کی مخفی استعداد سے فطرت کا آئینہ دفعتہً چمک اٹھتا ہے، اور اس کو حیرت ہوتی ہے، کہ ایک ذرہ ناچیز میں بھی یہ جلوہ طرازیاں پنہاں ہیں۔

ان تصریحات کے بعد اب ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ میں نے جو مطلب عرض کیا تھا وہ کس حد تک خود شعر کے الفاظ سے مترشح ہوتا ہے، اور مرزا صاحب کی جدت طرازی نے مفہوم کی لطافت کو کہاں تک پامال کر دیا ہے،

اس کے علاوہ دو شعار اور ہیں، جن پر مرزا صاحب کا اعتراض ہے، لیکن سمجھ میں نہیں آیا کہ دونوں کے مطالب میں اختلاف کیا ہے، بجز اس کے کہ میں نے جس مفہوم کے متعلق چند فقرو . . . . میں اشارہ کیا تھا، اس کو مرزا صاحب نے متعدد سطروں میں پھیلا کر لکھدیا ہے،

ورنہ غور سے دیکھا جائے، تو بات ایک ہی ہے، جو مختلف الفاظ میں ادا کی گئی ہے، ناظرین خود ملاحظہ کر سکتے ہیں، طوالت کے لحاظ سے ہم دوبارہ ان کو نقل کرنا نہیں چاہتے،

یہ سب تو ضمنی باتیں تھیں، اب میں اپنی اصلی جرم کی جوابدہی کی طرف رجوع کرتا ہوں، جو غالباً خاص طور پر اثر صاحب کی اس پُرغیظ تنقید کا محرک ہوا ہے، میرا حقیقی جرم یہ ہے، کہ میں لکھنؤ کے مذاق شعری کا مخالف ہوں؟ میں نے لکھنؤ کے گزشتہ اور موجودہ شعرا پر اصغر کو ترجیح دی، میں نے گریہ و زاری، فریاد و ماتم، اور یاس و حسرت ایسے مقدس جذبات کی مذمت کی؟ اور سب سے بڑھکر یہ کہ میں نے نشاط روح شائع کرکے اساطین لکھنؤ کے اقتدار و عظمت کی شاہنشاہی کو متزلزل کر دیا؟ لیکن اثر صاحب کو یہ معلوم ہونا چاہئے، کہ شاعری لکھنؤ کی میراث نہیں، جہاں تک روزمرہ اور عام بول چال کا تعلق ہے، حضرات لکھنؤ جس قدر چاہیں، زباندانی پر فخر کریں، لیکن علمی اور ادبی رزمگاہ میں ان کو دوسرے حریفان فن کے لئے اب جگہ خالی کرنی پڑیگی، ——— آپ جزئی غلطیوں اور فروگزاشتوں کو نمایاں کرکے روح نشاط کی اہمیت کو کسی قدر گھٹانا چاہیں، لیکن ارباب نظر کے نزدیک اس کی عظمت مسلم ہے۔ آپ رنج و تعب میں جس قدر چاہیں خاک اڑالیں، لیکن اصغر کے آفتاب کمال کی شعاعیں اس پردۂ کثیف میں سے بھی چھن چھن کر گرتی رہیں گی، اور لذت آشنا قلوب کو منور کرتی رہینگی، اب آپ اپنے زنگ آلودہ آئینۂ سخنوری کو کسی قدر محفوظ رکھنے کی کوشش فرمائیں، لیکن اب اصغر کی مستانہ جنبش قلم اس کو پیام شکست دے چکی ہے، آپ کسی قدر بلند آہنگی کے ساتھ مخالفت کا صور پھونکیں، لیکن اصغر نے جو ترانۂ سرمدی چھیڑ دیا ہے، اس سے فضائے آسمانی ہمیشہ گونجتی رہیگی، دنیائے ادب اسی وقت تک طلسم باطل کے سامنے سر نیاز خم کر سکتی تھی، جب تک جمال حقیقت اس کی نگاہوں سے مخفی تھا، لیکن اب اصغر کے ظہور نے ان تمام پردہ ہائے فریب کو دفعتہً الٹ دیا، اور تشنگان ذوق کو نظر آگیا، کہ اب تک جو کچھ ان کے سامنے تھا اس میں کوئی مستقل کیفیت یا لذت نہ تھی، بلکہ محض تصنع اور تکلف کا ایک طلسم بے ثبات تھا، اس بنا پر معتقدین لکھنؤ کو اگر نشاط روح کی اشاعت نے پریشان و سراسیمہ بنا رکھا ہے، تو کچھ محل تعجب نہیں، ان کو خطرہ ہے، کہ ان کی وہ شان انانیت جو عرصہ تک ہیں ناشناس کے سر پر قائم تھی اب اس کی بربادی کا وقت آگیا ہے، اس لئے فطرت مقتضی ہے کہ وہ مخالفت میں اپنا سارا زور طبع صرف کر دیں، چنانچہ اصغر پر جو طعن و تعریض کی جا رہی ہے، مجھکو اس سے کوئی شکایت نہیں اور نہ اصغر کو اس کی پروا ہونی چاہئے۔ کیونکہ ہم دونوں مجرم ہیں، اصغر کا جرم یہ ہے کہ ان کی شاعری حضرات لکھنؤ کی دماغی سطح سے اس قدر بلند کیوں ہے؟ اور میری خطا یہ ہے کہ میں نے ادبی دنیا کو اس سے روشناس کیوں کرایا، بہر حال اب تو غلطی سرزد ہو چکی، اور مجرموں کو اس کا اعتراف بھی ہے، آئندہ اس کا جو کچھ نتیجہ ہو اس کا ہم کو کوئی اندیشہ نہیں، لیکن اس کا افسوس ضرور ہے کہ مخالفت کے جوش میں اکثر اصحاب کے ہاتھ سے تہذیب و متانت کا سررشتہ چھوٹ گیا ہے، اور بجائے آزادانہ تنقید کے علانیہ گالیاں دیگئی ہیں، چنانچہ عرصہ ہوا کہ "نیرنگ خیال" میں ایک مضمون "ادب آموز" کے نام سے شائع ہوا تھا جس کا عنوان یہ تھا "نشاط روح پر وکیلوں کی مقدمہ طرازی یا پھندیتوں کی پھبندیتی" اس مضمون میں جس قدر رکیک، مبتذل اور بازاری حملے ہو سکتے تھے، وہ سب میر سہیل، اور اصغر کی ذات پر کئے گئے تھے، تنقید میں ذاتیات پر اتر آنا، اور محض ذاتی بغض کی بنا پر محاسن کی پردہ پوشی کرنا میرے نزدیک انتہائی دنائت، کم ظرفی، اور پست خیالی کی دلیل ہے، مضمون کو پڑھنے کے بعد مجھکو ہنسی آئی، کہ نام تو "ادب آموز" رکھا ہے، لیکن خود جناب کی

تہذیب و شائستگی کا یہ حال ہے کہ ایک مہذب اور شریفانہ فقرہ بھی قلم سے نہ نکل سکا، اکثر احباب نے تحریک کی کہ اس کا جواب دیا جائے، لیکن میں اس قسم کی ہرزہ سرائیوں سے اعتنا کرنا اپنے قلم کی توہین سمجھتا ہوں، ان کا جواب صرف بے نیازانہ سکوت ہے، البتہ اثر صاحب جو کچھ لکھا ہے، وہ ایک حد تک متانت و سنجیدگی پر مبنی ہے، اس لئے اس کا جواب دینا ضروری معلوم ہوا،

حقیقت یہ ہے کہ حضرات لکھنؤ نے اب تک تغزل کا صحیح مفہوم نہیں سمجھا، یعنی اس کے عناصر اصلی کیا ہیں، ان کی نوعیت کیا ہے؟ اور غزل میں کس قسم کے جذبات ادا ہونے چاہئیں؟ مجکو اس سے انکار نہیں، کہ درد و غم بھی تغزل کے دائرۂ سخن کے اندر داخل ہے، لیکن افسوس اس کا ہے، کہ حضرات لکھنؤ نے غلطی سے درد و غم اور سوز و گداز کا مفہوم نوحہ خوانی اور گریۂ و زاری سمجھ لیا، حالانکہ در اصل ان چیزوں کو عشق سے کوئی تعلق نہیں، سوز و گداز فی نفسہ ایک لطیف و درد مندانہ کیفیت کا نام ہے جس سے ایک ادا شناس محبت کا قلب معمور ہوتا ہے، اس کے نزدیک عشق مجسم لذت ہے جس کی ہر ادا ہر کیفیت، خواہ وہ خوشی کی ہو یا غم کی، سرمایۂ حیات ہے، وہ اپنے درد دل کا اظہار ضرور کرتا ہے، لیکن وہ روتا نہیں، کبھی کبھی جوش بے تابی میں اس کی آنکھوں سے کچھ در ہائے بے بہا ضرور ڈھلک پڑتے ہیں، لیکن وہ سینہ کوبی نہیں کرتا، کیونکہ اس کے نزدیک خود درد و غم میں ایک ابدی لذت پنہاں ہے، جسمیں وہ ہر وقت محو رہتا ہے، اس لئے اس کو فریاد و ماتم کی فرصت نہیں، چنانچہ اصغر نے اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

بہائے درد و الم درد و غم کی لذت ہے　　وہ ننگ عشق ہے جو آہ ہو اثر کے لئے

لیکن افسوس ہے، کہ لکھنؤ کی بد مذاقی نے درد عشق کو ایک مستقل مادی مرض بنا دیا جس کی تکلیف سے کبھی مریض بستر پر کروٹیں بدلتا ہے کبھی نالۂ نیم شبی سے ہمسایوں کی نیند حرام کر دیتا ہے، کبھی اعضا میں تشنج پیدا ہو جاتا ہے، کبھی رگیں کھینچنے اور ٹوٹنے لگتی ہیں، کبھی چہرہ زرد پڑ جاتا ہے کبھی ہچکیاں آتے آتے دم گھٹنے لگتا ہے، بالآخر نزع کا عالم طاری ہو جاتا ہے، بے وفا معشوق کا اب بھی پتہ نہیں، روح پرواز کر جاتی ہے، جنازہ نکلتا ہے، نوحہ خوانی ہوتی ہے، اور آزار محبت سے نجات مل جاتی ہے، حضرات لکھنؤ کے گداز محبت اور درد عشق کی یہی کل سرگذشت ہے، جسپر ان کو ادعا ہے، کہ وہ تغزل کے رمز شناس ہیں، کیا گریۂ و بکا، آہ و زاری، اعضا شکنی، جنازہ و میت وغیرہ اسی مقدس درد محبت کے آثار و علائم ہیں، جسکی فیضان بخشی کے نسبت حافظ نے بہ نعرۂ مستانہ بلند کیا تھا،

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق　　ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

کیا یہ تمام مصیبتیں، ۔ تمام بے چینیاں، اسی عشق کے جور و ستم کی نشانیاں ہیں جس کو ایک لذت شناس حقیقت نے تمام علتوں کا طبیب قرار دیا تھا،

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما　　اے طبیب جملہ علت ہائے ما،

لیکن، اگر یہ صحیح ہے کہ عشق روح انسانی کے نشو و نما کا حقیقی سرچشمہ ہے، اگر یہ صحیح ہے کہ وہ بجائے خود ذوق و وجد کا ایک مستقل عالم ہے اگر یہ صحیح ہے کہ اس کے فیضان جمال سے ایک مشت خاک تجلیات ربانی کا آئینہ بن جاتی ہے، اگر یہ صحیح ہے کہ وہ روح کی تسکین اور دل کا نور ہے، اگر یہ صحیح ہے، کہ اکسیر محبت کفر کو ایمان بنا سکتی ہے تو یقیناً اس کی شان آہ و بکا گریۂ و زاری ہجر و وصل کے حدود سے کہیں زیادہ ارفع

اور اعلیٰ ہے۔

اس میں شبہ نہیں، کہ سوز و گداز تغزل کا ایک ضروری عنصر ہے، لیکن حضرات لکھنؤ کے نزدیک شعر میں سوز اس وقت تک پیدا ہی نہیں ہو سکتا جب تک اسمیں کچھ نوحہ گری کی شان نہ ہو، اثر صاحب کو کم از کم اسقدر تسلیم ہے کہ سوز و گداز آہ و بکا کا نام نہیں، لیکن پھر فرماتے ہیں،

"مگر اس کی کیا دلیل کہ آہ و بکا میں سوز و گداز پیدا نہیں ہو سکتا، نوحۂ غم ہو یا نغمۂ شادی جو ہو تاثیر میں ڈوبا ہو، جو شعر تاثیر سے خالی ہے، وہ شعر نہیں، اگر حالی الفاظ ناچتے ہیں، تو وہ پریاں نہیں، بلکہ پرچھائیاں ہیں، اگر نالۂ و شیون اثر سے خالی ہے تو ٹوٹے ہوئے دل کی فریاد نہیں بلکہ کرایہ کے نوحہ گر کی آہ و بکا ہے،

اس سے کسکو انکار ہو سکتا ہے، کہ تاثیر شعر کی جان ہے، لیکن یہی ایک وہ شئے ہے جو اساطین لکھنؤ کے ہاں مفقود ہے، چونکہ قلب کیف سے خالی ہے، اس لئے جو کچھ زبان سے نکلتا ہے، اس میں کوئی کشش نہیں ہوتی، لاکھ فریاد و ماتم کرتے ہیں، لیکن بقول اثر صاحب کے صرف کرایہ کے نوحہ گر کی آہ و بکا ہوتی ہے، کسی کا کوئی عزیز دوست مرجائے تو بے شبہ اس کے لئے آہ و بکا زیبا ہے، لیکن عشق جو اول سے آخر تک ہمہ تن ذوق و وجد ہے، اس کے لئے یہ مبتذل ادا کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتی، اس کی شان نیاز عاشق کے قلب میں صرف ایک لطیف پرگداز کیفیت کی جویاں ہے جس سے حضرات لکھنؤ کا کلام ابتک تقریباً ناآشنا ہے، اور یہی وجہ ہے، کہ باوجود لفظی خراش تراش کے، اثر کا پتہ تک نہیں ہوتا غم آمیز اور پُر درد اشعار کو میں بُرا نہیں سمجھتا، لیکن سوال یہ ہے، کہ کیا بغیر فریاد و ماتم، آہ و بکا، جنازۂ و میت تشنج اعضا عالم نزع وغیرہ کے شعر میں سوز و گداز پیدا نہیں ہو سکتا؟ کیا یہی چیزیں درد محبت کا سرمایہ ہیں؟ اثر صاحب کا یہ ارشاد صحیح ہے، کہ اصغر کے کلام میں پرگداز اشعار کی کمی نہیں، چنانچہ بطور نمونہ کے انھوں نے چند اشعار بھی نقل کئے ہیں، جو حسب ذیل ہیں،

ہجوم غم میں ہیں کوئی تیرہ بختوں کا   کہاں ہے آج تو اے آفتاب نیم شبی

اک شورش بے حاصل اک آتش بے پروا   آتشکدۂ دل میں اب کس سامان ہے

جان بلبل کا خزاں میں نہیں پرساں کوئی   اب چمن میں سر راہ شعلۂ عریاں کوئی

خاک پروانے کی برباد نہ کر باد صبا   یہی ممکن ہے کہ کل تک مرا افسانہ بنے

پہلے شعر پر اثر صاحب کا نوٹ ہے کہ "اک نشتر ہے جو روح کو تڑپا تا ہے" لیکن باوجود اس کے شعر میں کہیں سوز ماتم کا اثر تک نہیں ہے، دوسرے شعر کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ "سوز و افسردگی کا ایک مکتوب ہے" لیکن کہیں نالۂ و بکا سے کام لیا گیا ہے؟ تیسرے شعر کے متعلق سوال ہوتا ہے کہ "کون صاحب اس پر بجائے دل بھلانے کے رقص کریں گے" لیکن کہیں جنازۂ و میت کا تذکرہ اس شعر میں آیا ہے؟

آخری شعر اثر صاحب کے نزدیک "عبرت کا ایک مستقل درس ہے" لیکن کہیں نزع وجانکنی یا قبرستان کی وحشت کا سماں نظر آتا ہے، خود مرزا صاحب کی پیش کردہ مثالوں سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے، کہ سوز وگداز دراصل گریہ وبکا، نالہ وماتم، جنازہ ومیت وغیرہ سے بالکل علیحدہ شے ہے اور جس چیز کو حضرات لکھنؤ نے درد وغم سمجھ رکھا ہے، وہ درد وغم نہیں، بلکہ نوحہ گری ہے، جو مرثیہ میں زیادہ کارآمد ہو سکتی ہے، لیکن تغزل کی لطافت اس کی متحمل نہیں ہو سکتی،

اثر صاحب بھی کم از کم اتنا تسلیم کرتے ہیں کہ "جذبۂ حزن طاری کرنے کے لئے لازم نہیں کہ سینہ کوبی وآہ وزاری ہی سے کام لیا جائے" لیکن جو چیز ایک مدت سے جزو فطرت بن گئی ہے اس کا اثر کہاں جا سکتا ہے، اس کے بعد ہی یہ فقرہ قلم سے نکل جاتا ہے۔

"مگر یہ بھی مرض نہیں کہ انھیں اک مست خارج کر دیا جائے"

کیوں؟ جب آپ کو یہ تسلیم ہے، کہ جذبۂ غم کے اظہار کے لئے سینہ کوبی ضروری نہیں، تو پھر ایک غیر ضروری اور بیکار چیز کیوں قائم رکھی جائے؟ یہ منطق میرے سمجھ میں نہیں آئی، لیکن اس سلسلہ میں ایک امر اور دریافت طلب ہے، کہ کیا "جذبۂ حزن طاری کیا جاتا ہے" یا خود ایک فطری کیفیت ہے جو پہلے سے شاعر کے دل کے اندر موجود رہتی ہے، اگر اثر صاحب کو شعر کہنے سے قبل اپنے ویر "جذبۂ حزن" طاری کرنے کی ضرورت ہوتی ہے تو بے شبہ وہ کبھی سینہ کوبی وآہ وزاری کو خارج نہیں کر سکتے، کیونکہ ایک شخص جس کے دل میں درد نہیں، اگر غمگین صورت بنانا چاہئے، تو خوامخواہ اس کو آہ وزاری سے کام لینا پڑے گا، لیکن ایک دردمند ازلی کو اس تصنع وتکلف کی ضرورت نہیں، اسیر تو ہر وقت ایک اضطراب پیہم کی کیفیت طاری رہتی ہے وہ فطرتاً غم آشنا ہے، اس کی ہر ادا درد محبت میں ڈوبی ہوئی ہے، اس لئے اس کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے تیر ونشتر کا کام دیتا ہے،

ایک دوسرے مقام پر اثر صاحب میرے خیال کی ان الفاظ میں تائید فرماتے ہیں،

"سچ ہے، کہ اگر حیات کا نام محض قہقہ اور مرگ کی نشانیاں صرف اعضا کا اینٹھنا، مرنا، پتلیوں کا پھرنا، نبوں کا رٹنا ہے تو ایسی شاعری کو دور سے سلام اگر حیات ومرگ کے اسرار بیان کئے گئے ہیں تو ایسی شاعری قابل قدر ہے، عام اس سے کہ اسے پڑھکر یا سنکر ہمیں خوشی ہوتی ہے یا رنج"

"شاعری خوشی یا خوشی اور غم کا غم نہیں کرتا، بلکہ اس کا فلسفہ بیان کرتا ہے، حقیقت ایک ہے، صورتیں مختلف ہیں، خوشی ہو کہ غم ہو، حیات ہو کہ ممات ہو، شاعر کا کام شاید حقیقت کو بے نقاب کرنا ہے . . . . . ."

ان اقوال کی صداقت سے کسکو انکار ہو سکتا ہے؟ لیکن سوال تو یہی ہے، کہ حضرات لکھنؤ کی شاعری اس معیار پر پوری اترتی ہے؟ کیا ان کے آئینۂ کلام میں اسرار حیات کی جھلک نظر آتی ہے؟ کیا سینہ کوبی وآہ وزاری ہی کا نام فلسفۂ غم ہے؟ کیا لب بام ہی شاہد حقیقت کی جلوہ گاہ ہے۔ کیا رگوں کے اینٹھنے اور پتلیوں کے پھرنے ہی میں اسرار فنا پنہاں ہیں؟ کیا عضا شکنی ہی کو اضطراب محبت کہتے ہیں؟ کیا فلسفۂ سکوت عالم نزع ہی کی خاموشی کا نام ہے؟ کیا درد عشق کی لذت کا یہی تقاضا ہے، کہ گریہ وزاری کیجائے؟ کیا دل جو انوار ربانی کا گہوارۂ رقص ہے، اس کی یہی حقیقت ہے جو حضرت عزیز نے اس شعر میں بیان فرمائی ہے۔

فطرت کو بھی خیال مکافاتِ عشق تھا　　　دل ہام تک فرشتہ نہ آیا عذاب کا

بہرحال ہمارے لائق دوست کو اپنی رونق محفل کے لئے جنازہ و میت، نالہ و ماتم، شور و بکا وغیرہ کی کسی قدر ضرورت ہو لیکن کم از کم میرا یہ خیال راسخ ہے، کہ اس قسم کے مبتذل اور عامیانہ خیالات کو تغزل سے بالکل خارج کر دینا چاہئے. لیکن اثر صاحب کا ذوق سینہ کوبی اسکو کب گوارا کر سکتا ہے، چنانچہ غضب ناک انداز میں ارشاد فرماتے ہیں،

"یہ خیال وبا کی طرح پھیل گیا ہے کہ غزل میں حسرت و یاس، مرگ، میت، جنازہ، نزع اور اس قبیل کے مضامین نظم نہ کرنا چاہئے

اثر صاحب اگر اس خیال کو وبا سمجھکر ڈر رہے ہیں، تو بالکل حق بجانب، کیونکہ اگر یہ خیال عملی صورت اختیار کرے، تو بیچارے لکھنؤ والوں کی کل کائنات شاعری ہی برباد ہو جاتی ہے، بہرحال نتیجہ کچھ بھی ہو، لیکن مذاق شعری کی اصلاح کے لئے ضروری ہے، کہ جہاں تک ہو سکے، اس مبارک خیال کو پھیلانا چاہئے، تاکہ اردو شاعری کو اس وبا سے نجات ملے، جو لکھنؤ کی مہربانی نے ایک مدت سے پھیلا رکھی ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے زیادہ لطیف بات جو اثر صاحب نے کہی ہے وہ یہ ہے،

"مجھے اس پست ہمتی پر سخت افسوس ہے، اس قوم کے افراد اپنی بات اور اپنے ایمان کے واسطے خوشی خوشی کیا جان دیں گے جو موت کا نام سنکر کانپتے ہیں، جو اس قدر عیش و راحت کے حریص ہیں، اور درد و غم کے متنفر کرنے والے جذبات پر عمل پیرا ہونا تو کیسا ان کے ذکر سے گھبراتے ہیں، ......"

ہمارے لائق دوست کا معیار شجاعت قابل داد ہے! کیا گریہ و زاری، فریاد و ماتم بہادروں کا کام ہے؟ ایک شخص جسکی زندگی آہ و بکا میں گزری ہو، کیا اس سے جانبازی کی توقع کیجا سکتی ہے؟ کیا حضرات لکھنؤ جن کی شاعری کا کل حاصل صرف نوحہ و ماتم ہے، سرفروشانہ موت کے لئے مہیا ہو سکتے ہیں؟ اگر وہ موت کا نام سنکر کانپتے نہیں، تو پھر یہ رونا چلانا کس لئے ہے؟ غمگین اور مایوس صورت بنا کر روتے رہنا عالی ہمتی کی دلیل ہے، یا پستی اور بزدلی کی؟ موت کو مصیبت سمجھنا بزدلوں کا شیوہ ہے یا بہادروں کا؟ اثر صاحب کا یہ ارشاد صحیح ہے کہ موت سے ڈرنے والا جانبازی نہیں کر سکتا، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اسی قسم کے مضامین کسی قوم کے جذبات شجاعت کو برانگیختہ کر سکتے ہیں؟ کیا یہی حسرت و یاس، گریہ و بکا کی تعلیم ہم میں تہور و سرفروشی کے انداز پیدا کر سکتی ہے؟ کیا یہی جنازہ و میت نزع و مرگ، آہ و بکا وغیرہ، درد و غم کے متنفر کرنے والے جذبات ہیں؟ کیا انھی چیزوں سے روح میں وہ درد و گداز پیدا ہو سکتا ہے، جو در اصل بقائے حیات کا سرچشمہ ہے؟ کیا یہی آہ و فغاں کا شیوہ پامال ایثار نفس اور بلند نظری کا ثبوت ہے؟ اگر ان مبتذل و رکیک دردناک ادا ؤں سے اجتناب پست ہمتی ہے تو مجکو اپنی اس پست ہمتی پر خوشی ہے، لیکن میں اس فلسفہ کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا، کہ ایک نوحہ گر بھی جانبازی کے جوہر دکھا سکتا ہے، یہ اسی نالہ و زاری کا اثر ہے، کہ لکھنؤ کی غزلیہ شاعری اب تک جوش اور کیف سے خالی ہے، ظاہر ہے کہ ایک دماغ جس کو ایک مدت کے نوحہ پیہم نے افسردہ کر دیا ہو، اس میں پرکیف خیالات کی کیونکر گنجائش ہو سکتی ہے؟ وہ اگر رقص بھی کرنا چاہیگا، تو طبعی ضعف کیوجہ سے دو چار قدم پر لڑکھڑا کر گر پڑے گا، چنانچہ غزل کی غزل پڑھتے جائیے، بجز میت و جنازہ، یاس و غمگینی، سینہ کوبی، گریہ و ماتم کے ایک شعر بھی مشکل سے نہیں مل سکتا، جسکو پڑھکر روح پر کوئی خاص وجدانی کیفیت طاری ہو جائے، حالانکہ در اصل شعریت اسی کا نام ہے

اصغر نے نہایت سچ کہا ہے،

سر ل کیا اک سرِ معنوی گردش میں ہے اصغر یہاں افسوس گنجائش نہیں فریاد و ماتم کی

مرزا صاحب کا یہ ارشاد بالکل صحیح ہے کہ۔

"میدان غزل عرصۂ رزم نہیں، بلکہ جذبات کی مصوری اور حقیقت کی ترجمانی ہے"،

لیکن نالہ و بکا، جنازہ و میت وغیرہ کے عامیانہ جذبات ادا کرکے ہیں اس کو "محفل عزا" بھی بنانا نہیں چاہتا، بے شبہہ غزل میں جذبات کی مصوری ہوتی ہے، لیکن اس قسم کے بے کیف اور سطحی جذبات کی نہیں بلکہ بلند اور لطیف جذبات و احساسات کی، جن سے روح کو لذت حاصل ہو، بے شبہہ حقیقت کی ترجمانی چہرۂ غزل کا اصلی آب و رنگ ہے، لیکن یہ لب و لہجہ گریہ کی قوت سے ماورا ہے، اس سے وہی سوختہ جان عہدہ برآ ہوسکتا ہے، جو اس نکتہ سے واقف ہے،

شرح و بیان غم ہے اک مطلب مقید خاموش ہوں کہ معنی صدہا ہیں خامشی کے

کیا اثر صاحب اس فلسفۂ سکوت کی نزاکت پر غور فرما سکتے ہیں؟

بہر حال اگر حضرات لکھنؤ یہ چاہتے ہیں کہ ان میں اتنی عالی ہمتی پیدا ہو کہ وہ "اپنے ایمان کے لئے خوشی خوشی جان دے سکیں" یا اسرار و معارف کی بزم تجلی سے فیضیاب ہوسکیں، یا انکی جنبش قلم خوابیدہ روحوں اور افسردہ دلوں کو مشتعل اور بیدار کر سکے، تو ان کو حزن و ملال یاس و حسرت، نزع و میت، آہ و بکا وغیرہ ایسے ولولہ شکن خیالات کو قطعاً ترک کر دینا چاہیئے، کیونکہ اس قسم کے جذبات کی اشاعت سے قوم میں افسردگی پھیلتی ہے، اور نشاط روح کا رفتہ رفتہ خاتمہ ہو جاتا ہے، چنانچہ لکھنؤ کی شاعرانہ فضا میں جو ایک عام افسردگی کی کیفیت طاری ہے، وہ اسی گریہ و ماتم کی عادت کہن کا نتیجہ ہے، اس بنا پر اخلاقی حیثیت سے بھی میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس قسم کے تمام جذبات جن سے دل و دماغ میں ہیجان طبیعت میں انقباض، روح میں حرمان و ملال پیدا ہو، تغزل سے قطعاً خارج کر دئے جائیں، میرے نزدیک وہ شاعری نہایت ادنیٰ درجہ کی ہے جو ہمارے بلند اور شریفانہ جذبات کو برانگیختہ نہ کر سکے یا پست کو بلند اور بزدل کو شجاع نہ بنا سکے یہ خیال بالکل غلط ہے، کہ شاعر تمام اخلاقی ذمہ داریوں سے آزاد ہوتا ہے، یا قطع نظر اس سے کہ اس کے نتائج افکار کا عوام کی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے اس کو اختیار ہے کہ جس قسم کے خیالات چاہے ادا کرے میرے نزدیک اس کو سوسائٹی سے گہرا تعلق ہے، وہ قوموں کے اخلاق کو بنا اور بگاڑ سکتا ہے، اس لئے جو شعرا قوم کے سامنے مردہ دلی اور کم ہمتی کے جذبات پیش کرتے ہیں، وہ اگر دار و رسن کے نہیں، تو کم از کم ذوق سلیم کی نفرین کے ضرور مستحق ہیں، لیکن افسوس ہے کہ مرزا صاحب کی عالی حوصلگی اس قسم کی تنقید گوارا نہیں کر سکتی چنانچہ تحریر فرماتے ہیں۔

"آپ یہی مان لیجئے کہ سب نے ہذیان بکا مگر آپ کی دلآزار باتیں ان کے ہذیان سے کم دماغ کو پراگندہ کرنے والی نہیں ہیں"

میں نے مقدمہ میں جو کچھ لکھا تھا اس سے ہرگز اربابِ لکھنؤ کی دلآزاری مقصود نہ تھی اور نہ مجھکو اثر صاحب یا کسی اور بزرگ کی ذات سے کوئی تعلق ہے، میرے پیش نظر صرف کلام ہے، اگر اس کے معائب کی پردہ دری سے کسی کو صدمہ پہنچتا ہے، تو اس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں، اور نہ اس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں، اس ستم ظریفی کو ملاحظہ فرمائیے کہ ایک طرف تو ان حضرات کو اساتذۂ فن ہونے کا

ادعا ہے اور ملک و قوم پر اپنی استادی کا سکہ جمانا چاہتے ہیں، لیکن دوسری طرف کم نظری اور خود بینی کا یہ حال ہے کہ ایک معمولی سی تنقید ناگوار ہوتی ہے، اور دماغ پراگندہ ہوجاتا ہے، کیوں؟ صرف اس لئے کہ کہیں ان کے طلسم باطل کا راز فاش نہ ہوجائے، اور عوام کے قلوب سے ان کا رعب جاتا رہے، اگر آپ بجز ارادتمندانہ تحسین و آفرین کے کوئی مخالف آواز سننا نہیں چاہتے، تو آپ منظر عام پر کلام کو کیوں لاتے ہیں، اور پھر تنقید سے کیوں ڈرتے ہیں؟ ایک مصنف، ایک شاعر، ایک فلسفی، ایک صناع جب اپنے نتائج افکار کو من حیث الفن دنیا کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کرتا ہے، تو اس کو صاحبان فن کی تنقید کیواسطے بھی تیار رہنا چاہئے، اگر وہ اس کو برداشت نہیں کرسکتا، تو اسکے لئے سکوت بہتر ہے، اس انانیت کی کوئی انتہا ہے کہ آپ محض اپنا شوق پورا کرنے کے لئے جو کچھ چاہے کہئے اور سننے والا سرنیاز خم کئے ہوئے دم بخود بیٹھا رہے! اثر صاحب کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس قسم کے جبر و استبداد کا دور ختم ہوچکا، اور اب دنیا پُرشوکت خطابات سے مرعوب نہیں ہوسکتی وہ یہ نہیں دیکھنا چاہتی کہ کس نے کہا، بلکہ یہ دیکھنا چاہتی ہے، کہ کیا کہا، اور کیونکر کہا؟ جو کچھ کہا گیا، اگر اس میں کوئی رنگینی اور لطافت ہے، تو بے شبہ وہ قدر و عظمت کا مستحق ہے، قطع نظر اس سے کہ اس کا مصنف کون ہے محض شخصیت اور عام شہرت کی بنا پر کسی کا کلام ہم سے خراج تحسین وصول نہیں کرسکتا۔

ہر جلوۂ مرا نتوانند فریب داد　　　بر دانہ چراغ سر طور بودہ ایم

طبیعت کی افتاد بھی کیا چیز ہوتی ہے! باوجود ان تمام امور کے اعتراف کے، کہ غزل میں لطیف اور مہذب جذبات کی مصوری اور حقیقت نگاری ہونی چاہئے، اسرار حیات بیان ہونے چاہئیں، اور سوز و گداز کے لئے سینہ کوبی ضروری نہیں پھر بھی مرزا صاحب کو لکھنؤ کی ادائے ماتم اس قدر عزیز ہے کہ اس پر وہ کسی قسم کا حملہ قطعاً پسند نہیں کرتے، چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں،

"جن لوگوں کے دل بجھے ہوئے ہیں، جن کو زمانے نے پیس ڈالا، جن کے آداب و اخلاق، جن کی تعلیم، جن کا پاس وضع جن کے قدیم روایات بادنما کی طرح جدھر ہوا کا رخ ہو پھرنے سے ان کو روکتے ہیں، ان سے آپ یہ توقع رکھتے ہیں، کہ ناچیں تھرکیں، اور آپ کے قہقہوں میں شریک ہوں، ان کو ان کے ماتمکدوں میں رہنے دیجئے اور آہ و زاری و نالۂ بکا کرنے دیجئے، اگر وہ آپ کی بزم عشرت میں شریک ہونا نہیں چاہتے، تو آپ کا کیا نقصان ہے"

اگر اثر صاحب نے بجائے فلسفیانہ استدلالات کے شروع میں صرف انھی فقروں پر اکتفا کیا ہوتا، تو چنداں جواب کی ضرورت نہ ہوتی، کیونکہ جب ایک شخص کو رونے ہی کی تعلیم دی گئی ہے، گریہ و زاری جب اس کی محفل کے آداب ہی میں داخل ہے، آہ و بکا ہی جب اس کے پاس وضع کا تقاضا ہے، جب اس نے یہ طے کرلیا ہے، کہ بجز فریاد و ماتم کے اور کوئی اس کا مقصد حیات نہیں ہے، جب وہ اپنے ماتمکدہ سے سر باہر نکال کر آفاق عالم کی گوناگوں رنگینیوں پر نظر ہی ڈالنا نہیں چاہتا تو پھر بقول اثر صاحب کے اس سے کیف و انبساط کی توقع رکھنا فضول ہے، لیکن سوال یہ ہے، کہ وہ اپنے کو زندہ انسانوں میں کیوں شمار کرتا ہے؟ اس کو پھر ایسی دنیا میں زندگی بسر کرنے کا کیا حق ہے جو قدم قدم پر قدرت کی رنگینیوں اور لطافتوں سے معمور ہے؟ اس کو تو ٹوٹی ہوئی قبر کی آغوش وحشت میں بیٹھ جانا چاہئے، تاکہ عرصہ گاہ کائنات کی چہل پہل دلآویزی اور دلفریبی اس کے مقدس شغل سینہ کوبی میں ایک لمحہ کے لئے بھی حائل نہ ہوسکے، آپ دنیا سے الگ کسی ماتمکدے میں بیٹھکر جسقدر

چاہئے، گریۂ و بکا کیجئے، اس میں میرا کوئی نقصان نہیں ہے، اور نہ اس مبارک ارادے سے میں آپ کو باز رکھنا چاہتا ہوں، لیکن خدا کیلئے اپنے نوحۂ ماتم کو دوسروں کے کانوں تک نہ پہنچائیے، قوم اور ملک کو کیوں افسردہ بناتے ہیں؟ اپنی پاس وضع اور قدیم روایات کی خاطر مذاق شعری کو کیوں پامال کر رہے ہیں؟ اگر زمانہ نے آپ کو پیس ڈالا ہے، اگر آپ کے دل بجھے ہوئے ہیں، اگر آپ کے آداب و اخلاق کی بنا صرف گریۂ و زاری پر قائم ہے، تو آپ کے اظہار مصیبت کے لئے اور بہت سے میدان ہیں، مرثیے کہئے، محفلیں منعقد کیجئے اور دل کھولکر خوب روئیے کسی کو خردہ گیری کا حق نہیں، لیکن تغزل کی بزم لطیف میں بیٹھکر آپ اپنے گھر کی بربادی کا افسانہ کیوں چھیڑتے ہیں؟ وہاں تو نشاط حسن و محبت کی رنگینیاں ہر طرف چھائی ہوئی ہیں، لطیف اور پُرگداز نغموں سے فضا گونج رہی ہے، ذوق و وجد سے تمام منظر سرشار ہے، جمال ازل رقص میں ہے، اور ہر ہر قدم پر بجلیاں گر رہی ہیں، اس لئے اگر آپ کی آنکھیں بجز مصنوعی اشکباری کے نشاط حسن کی رنگینیوں کی تماشائی نہیں ہوسکتیں، اگر آپ کا دل بجز شور ماتم کے ساز محبت کی ترنم ریزیوں سے لطف اندوز ہونیکی صلاحیت نہیں رکھتا، اگر آپ کا دماغ بجز حزن و ملال کے ذوق و وجد کے احساس لطیف سے قطعاً محروم ہے، اگر آپ کا سینہ بجز دست ماتم کی زدوکوب کے برق جمال کی شررباریوں کی تاب نہیں لاسکتا تو بے شبہ ایسے دل و دماغ کو تغزل سے کوئی فطری مناسبت نہیں ہوسکتی، یہی وجہ ہے، کہ لکھنؤ کی غزلیہ شاعری میں بجز تصنع و تکلف کے شعریت اور تاثر کا عنصر کم اور نہایت کم ہے، چونکہ طبیعت ایک مدت سے، نالہ و ماتم کی خوگر ہوچکی تھی، اس لئے تغزل میں بھی فطری طور پر وہی شان نوحہ گری آگئی، اور چونکہ تغزل کا کوئی صحیح نمونہ پیش نظر نہ تھا، اس لئے عام طور پر خیال پیدا ہوگیا کہ تغزل صرف آہ و بکا اور گریۂ و زاری ہی کا نام ہے۔

لیکن ہمکو مسرت ہے کہ مذاق لکھنؤ کے استیلائے تغزل کی نورانی فضا میں جو ظلمت اور تاریکی پھیلا رکھی تھی، اس کو اصغرؔ صاحب کمال نے دفعۃً مٹا دیا، اور کیف و سرور، رقص کا ایک ایسا عالم ہمارے سامنے بے نقاب کر دیا جس سے اردو تغزل ابتک ناآشنا تھا، اصغرؔ فیضی کی طرح بجا طور پر فخر کر سکتا ہے،

بانگ قلمم دریں شب تار | بس معنی خفتہ کرد بیدار
دروازۂ صبح بر رخم باز | کلکم ز شگاف بر تو انداز

میں نے اصغرؔ کی اس قابل فخر خصوصیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

"وہ (یعنی اصغرؔ) اپنے پہلو میں ایک زندہ اور بیدار دل رکھتے ہیں، جو سرتاپا نشاط حیات سے مخمور ہے، اس لئے ان کی زبان سے جو حرف زبان سے نکلتا ہے، کیف و سرور سے لبریز ہوتا ہے"

اس کی تردید میں مرزا صاحب چند "غم انگیز" اشعار انتخاب کرکے جن کو میں نے کہیں اوپر نقل کر دیا ہے، حسب ذیل نوٹ دیتے ہیں،

"اہل نظر اندازہ کریں کہ مرزا صاحب کا یہ قول کہ حضرت اصغرؔ کی زبان سے جو حرف نکلتا ہے، کیف و سرور سے لبریز ہوتا ہے، کہاں تک قابل پذیرائی ہے"

افسوس ہے، کہ مرزا صاحب نے کیف و سرور کا صحیح مفہوم نہیں سمجھا، اور در اصل یہ ان کے سمجھنے کی چیز بھی نہ تھی، گریۂ و بکا کا ایک

خوگر اس لذت سے آشنا نہیں ہوسکتا" اگر مرزا صاحب کے نزدیک کیف و سرور سے مراد ناچنا، تھرکنا، اور قہقہہ لگانا ہے، تو میں انکی اس نکتہ سنجی اور بلاغت شناسی کی داد دیتا ہوں، اس سے میری مراد یہ نہیں ہے کہ اصغر کا کلام جذبات غم سے خالی ہے یا ان کے تمام اشعار مرقع مسرت ہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو کچھ وہ کہتا ہے، خواہ وہ غم کا پہلو ہو یا انبساط کا اسمیں ایک کیف ہوتا ہے ایک سرور ہوتا ہے ایک جوش ہوتا ہے ایک وارفتگی ہوتی ہے ایک اثر ہوتا ہے، تصنع اور منافقت سے پاک ہوتا ہے، کیف ایک عام لفظ ہے، جس کا مفہوم غم اور مسرت دونوں پر حاوی ہے، لیکن مشکل یہ ہے کہ اثر صاحب جن کے نزدیک غم گریۂ و بکا کا نام ہے، کیف غم، سرور غم، انبساط غم کی لطیف ترکیبوں کو سمجھ نہیں سکتے، اور نہ میں ان کو سمجھا سکتا ہوں کیونکہ اسکا احساس صرف وجدان سلیم سے وابستہ ہے،

میرے مذکورہ بالا قول کی تردید میں جو اشعار مرزا صاحب نے نشاط روح سے انتخاب کئے ہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے دو ایک شعر اس موقع پر دوبارہ نقل کر دوں تاکہ ناظرین اندازہ کر سکیں کہ باوجود غم انگیز ہونے کے اہمیں کس حد تک کیف کا عنصر موجود ہے،

ہجوم غم میں نہیں کوئی تیرہ بختوں کا کہاں ہے آج تو اے آفتاب نیم شبی

اسپر مرزا صاحب کا نوٹ ہے کہ "اک نشتر ہے جو روح کو تڑپاتا ہے" لیکن میں مرزا صاحب سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ ایک بے کیف چیز بھی روح کو تڑپا سکتی ہے؟ اور اشعار ملاحظہ ہوں،

اک شورش بے حاصل اک آتش بے پروا آفتکدۂ دل میں اب کفر نہ ایماں ہے

جان بلبل کا خزاں میں نہیں پرساں کوئی اب چمن میں نہ رہا شعلۂ عریاں کوئی

روداد چمن سنتا ہوں اس طرح قفس میں جیسے کبھی آنکھوں سے گلستاں نہیں دیکھا

بے شبہ ان اشعار میں غم کا پہلو زیادہ نمایاں ہے، لیکن کیا اس غم میں کیف موجود نہیں ہے؟ کیا ایک درد آشنا قلب کو ان اشعار سے سرور حاصل نہیں ہوسکتا؟ مرزا صاحب کو حیرت ہوگی، کہ غم کو کیف و سرور سے کیا تعلق؟ کیونکہ ان کی بزم عشق میں تو غم رونے چلانے اور سینہ کوبی کرنے کا نام ہے، اور کیف و سرور ناچنے تھرکنے اور قہقہہ لگانے کو کہتے ہیں، لیکن ارباب ذوق کے نزدیک بزم محبت کی فضا سراپا کیف و سرور سے معمور ہے، اس کا ہر منظر اثر آلود اور مرقع انبساط ہے، ممکن ہے کہ حضرات لکھنؤ کو درد غم مصیبت معلوم ہوتا ہو، اور اسلئے وہ اس سے متکیف نہ ہوسکتے ہوں، لیکن اداشناس محبت کے لئے تو وہی سرمایۂ حیات ہے، اس کے لئے غم ہی پیام سرور ہے وہ درد ہی کو ابدی لذت کا سرچشمہ سمجھتا ہے،

مزہ الم میں ہے کچھ لطف خستگی میں ہے غرضکہ نشو و نما روح کی اسی میں ہے

حقیقت یہ ہے کہ جو اپنے پہلو میں زندہ اور بیدار دل رکھتا ہے، اس کے لئے غم اور مسرت یکساں کیف انگیز ہیں اس کے لئے عشق ماتمکدہ نہیں، بلکہ "خمخانۂ نشاط" ہے، اس کی نگاہ شوق کی پرواز لب بام تک صرف محدود نہیں ہے بلکہ اس حریم قدس کی محرم خاص ہے

جس کی لطافت اور رنگینی کے احساس کے لئے چشم تحیر کی ضرورت ہے'

مرزا صاحب کو غالباً معلوم ہو، کہ شاعر صاحب شعور کو کہتے ہیں، شعور کے معنی احساس کے ہیں، یعنی شاعر در اصل وہی ہے' جس کا احساس قوی اور مشتعل ہو، اس بنا پر کسی کے کلام پر نظر ڈالتے ہوئے ہم کو سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ اس میں شعریت کس حد تک موجود ہے، یعنی وہ خود کہاں تک متاثر ہے' اور دوسروں کے احساس کو کہاں تک مشتعل کر سکتا ہے، میرے نزدیک اسی تاثر کا نام کیف و سرور ہے جو غم اور مسرت دونوں میں موجود ہے' اور اس لحاظ سے اصغر کے متعلق یہ کہنا کہ جو حرف اس کی زبان سے نکلتا ہے کیف و سرور سے لبریز ہوتا ہے' میرے خیال میں بالکل مبالغہ نہیں' اور نشاط روح کے مطالعہ کے بعد ہر صاحب ذوق میرے اس خیال کی تصدیق کریگا' میں نے اس سلسلہ میں آگے چل کر یہ لکھا تھا کہ'

"اردو کا تغزل باوجود گوناگوں اوصاف کے ابتک رقص و مستی کی کیفیت سے ناآشنا تھا . . . موجودہ زمانہ میں یہ فخر صرف حضرت اصغر کو حاصل ہے کہ ان کی سحر طرازیوں نے تغزل کے قدیم قالب بیجاں میں رقص و مستی کی ایک جدید روح پھونکدی اور لوگوں کو نظر آگیا، کہ تغزل الگرقی الو اتع تغزل ہے' تو وہ کس حد تک مضطرب قلوب کو متاثر کر سکتا ہے"

مرزا صاحب کے نزدیک یہ بھی غلط ہے' چنانچہ تحریر فرماتے ہیں'

تمام اساتذۂ سابق وحال کے کلام میں ایسے اشعار بکثرت ملیں گے جو طرب انگیز ہیں یا جن میں جوش وحرارت موجود ہے میر کے متعلق عام خیال ہے' کہ اس کے کلام میں درد ہی درد ہے' ملاحظہ ہو'

لطف گریہ ہو بتان صندل پیشانی کا — حسن کیا صبح کے پھر چہرۂ نورانی کا'

میر کے دین ومذہب کو پوچھتے کیا ہو ان نے تو — قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

گلبرگ کا یہ رنگ ہے مرجاں کا ایسا ڈھنگ ہے — دیکھو نہ جھکے ہے پڑا وہ ہونٹ لعل ناب سا

اور اسی کے ساتھ

لعل خموش اپنے دیکھو ہو آرسی میں — پھر پوچھتے ہو ہنسکر مجھ بے نوا کی خواہش

ہم فقیروں سے کج ادائی کیا — آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

کچھ نہ دیکھا پھر بجز اک شعلۂ پرپیچ وتاب — شمع تک ہمنے تو دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

شب فروغ بزم کا باعث ہوا تھا حسن دوست — شمع کا جلوہ غبار دیدۂ پروانہ تھا

صحت مذاق اور وجدان سلیم کے فقدان کا ماتم کہاں تک کیا جائے! مرزا صاحب نے یہ اشعار رقص ومستی کے ثبوت میں مثالاً پیش کئے ہیں، لیکن افسوس ہے، کہ مرزا صاحب نے رقص ومستی کا بھی مفہوم صحیح سمجھا، مجھے میر یا دیگر اساتذۂ فن کی عظمت سے انکار نہیں ہے لیکن باادب اپنے لائق دوست کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں، کہ صندل پیشانی، دیر نشینی، قشقہ کشی، ترک اسلام وغیرہ کو رقص ومستی سے کوئی تعلق نہیں، رقص ومستی در اصل روح کی بیداری، دماغ کی بلندی، نشۂ محبت کی کیف انگیزی کے مستانہ جوش واثر کا نام ہے جسکے

ساتھ ساتھ الفاظ کے شکوہ وتناسب، فقروں کے دروبست' انداز بیان کی ندرت کی بھی ضرورت ہے' ان سب چیزوں کے مجموعی اثر سے شعر میں جو ایک خاص ولولہ انگیز کیفیت پیدا ہوتی ہے' اسی کا نام جوش وخروش اور رقص ومستی ہے، جس طرح مرزا صاحب نے مثالیں پیش کی ہیں؛ میں بھی اپنے مفہوم کو واضح کرنے کے لئے چاہتا ہوں کہ چند اشعار اس موقع پر نشاط روح سے پیش کردوں' تاکہ ناظرین صحیح طور پر رقص ومستی کی نوعیت کا اندازہ کرسکیں، ملاحظہ ہوں،

انوار کی ریزش ہو' اسرار کی بارش ہو ساغر کو جو ٹکرا دوں اس گنبد مینا سے
وہ عشق کی عظمت سے شاید نہیں واقف ہیں سو حسن کروں پیدا ایک ایک تمنا سے

سرگرم تجلی ہو اے جلوۂ جانانہ اڑ جائے دھواں بنکر کعبہ ہو کہ بتخانہ
یہ دیں وہ دنیا ہے' یہ کعبہ وہ بت خانہ اک اور قدم بڑھکر اے ہمت مردانہ

بیخود و محو تبسم دجاں مست زمین و آسماں حسن نے دست ناز سے چھیڑ دیا ہو ساز عشق
سر شک شوق کا وہ ایک قطرۂ ناچیز اچھالنا تھا کہ اک بحر بے کنار ہوا
سا نا حریم ناز کا پایہ بلند ہے لیجائیگا اچھال کے درد جگر مجھے
کچھ اس انداز سے چھیڑا تھا میں نے نغمۂ رنگیں کہ فرط ذوق سے جھومی ہے شاخ آشیاں سو ل
رخ رنگیں پہ موجیں ہیں تبسم ہائے پنہاں کی شعاعیں کیا پڑیں نگہت نکھر آئی گلستاں کی
سر مستیوں میں شیشۂ مے لیکے ہاتھ میں اتنا اچھال دیں کہ ثریا کہیں جسے

ہنگامۂ مستی یہ فکر فلک پیما ایک ایک ستارے کو آئینہ دکھا آئی
پیدا ہوا منظر اس مست خرامی سے غنچوں کی کھلیں آنکھیں' دامن کی ہوا آئی

پھر ان لبوں پہ موج تبسم ہوئی عیاں سامان جوش رقص تمنا لئے ہوئے
مستی سے ترا جلوہ خود عرض تماشا ہے شگفتہ مزاجوں کا یہ کیف نظر دیکھا

ارباب ذوق ان اشعار کا مرزا صاحب کے پیش کردہ اشعار سے موازنہ کریں، تو ان کو بخوبی اندازہ ہو جائیگا کہ دراصل رقص ومستی اور خوش بیانی کا کیا مفہوم ہے' اور اصغر نے کس حد تک تغزل کو باکیف بنادیا ہے' اور باوجود مرزا صاحب کی ان مثالوں کے میں اب بھی یہ کہنے کے لئے طیار ہوں' کہ رقص وسرور کا جو عالم اصغر کے کلام میں موجود ہے' وہ مجھکو کسی اور اردو غزلگو شاعر کے کلام میں نظر نہیں آیا

اگر مرزا صاحب یہ مستانہ کیفیت کہیں اور دکھا سکتے ہوں، تو مجھکو نہایت مسرت ہوگی۔ حضرات لکھنؤ سے تو اس کی توقع نہیں ہوسکتی کیونکہ بقول مرزا صاحب کے "زمانہ نے ان کو پیس ڈالا ہے" اور ان کے دل بجھے ہوئے ہیں" رہے اور شعرا، تو ممکن ہے کہ تلاش کرنے سے دو چار شعر ایسے نکل آئیں، جن میں کچھ طرب انگیز الفاظ استعمال کئے گئے ہوں، لیکن میرے نزدیک صرف اس کا نام رقص و مستی نہیں، بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ پورا کلام عام طور پر کہاں تک اس نشے سے سرشار ہے،

خوش بیانی اور رقص و مستی کا مفہوم اگر مرزا صاحب سمجھنا چاہتے ہیں، تو ہم اُن کو مشورہ دیں گے کہ دیوان حافظ کا مطالعہ فرمائیں بطور نمونہ کے چند اشعار اس موقع پر پیش کرتا ہوں، ممکن ہے کہ ان کو پڑھ کر مرزا صاحب کسی حد تک تبدیل خیال پر آمادہ ہوجائیں

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم ۔۔۔ فلک را سقف بشگافیم و طرح نو در اندازیم
اگر غم لشکر انگیزد کہ خون عاشقاں ریزد ۔۔۔ من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم

دوش دیدم کہ ملائک در میخانہ زدند ۔۔۔ گل آدم بسرشتند و بہ پیمانہ زدند
ساکنان حرم ستر عفاف ملکوت ۔۔۔ با من راہ نشین بادۂ مستانہ زدند
شکر ایزد کہ میان من و او صلح فتاد ۔۔۔ حوریاں رقص کناں ساغر شکرانہ زدند
آسماں بار امانت نتوانست کشید ۔۔۔ قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

ان اشعار کو پڑھو، معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایک حرف نشۂ حیات میں رقص کر رہا ہے، یہی وہ چیز ہے جو ہمارے غزل گو شعرا اور خصوصاً حضرات لکھنؤ کے یہاں مفقود تھی اور جس کے بغیر تمام لفظی طلسمکاریاں بالکل بے اثر تھیں، چنانچہ اسی بنا پر مذاق جدید کو اردو کے فرسودہ انداز تغزل سے اک گونہ نفرت پیدا ہو چلی تھی، اور ایک عام خیال قائم ہوگیا تھا، کہ تغزل ایک بے کیف اور ولولہ شکن صنف شاعری ہے، جس کا قطعاً خاتمہ کر دینا چاہئے، لیکن اصغر کی مستانہ اور کیف پرور جنبش قلم نے اس غلط فہمی کا ازالہ کر دیا، اور اب لوگوں کو نظر آگیا، کہ افسانۂ محبت باوجود اعادۂ پیہم کے اب بھی اپنے اندر کیف و سرور کی ایک زبردست برقی کشش رکھتا ہے۔ بشرطیکہ قدرت نے ذوق صحیح اور وجدان سلیم عطا کیا ہو،

لیکن مرزا صاحب کو اصغر کی یہ ادائے رقص و مستی کچھ بہت زیادہ پسند نہیں معلوم ہوتی اور نہ وہ اس بات سے خوش ہیں، کہ تغزل میں رقص و مستی سے کام لیا جائے ظاہر ہے، کہ ایک افسردہ اور ماتم زدہ دل ولولہ انگیز اور روح افزا جذبات کا کیونکر خیر مقدم کر سکتا ہے؟ چنانچہ غضبناک لہجہ میں میرے متعلق ارشاد ہوتا ہے،

مرزا صاحب کا خیال ہے، کہ شاعر کو صرف ایسے اشعار کہنا چاہئے جن سے سامع پر انبساط طاری ہو، انقباضی اشعار ٹکسال باہر، گویا شاعری خصوصاً تغزل ہمارے نفس، ہمارے جذبات، ہماری امیدوں ہماری آرزوؤں اور ہماری حسرتوں کا آئینہ نہیں ہے بلکہ ایک سانچہ ہے جسمیں خوشی ڈھلتی ہے"

تعجب ہے کہ مرزا صاحب نے میرے کن فقروں کی بنا پر خیال میرے متعلق قائم فرمایا ہے، میں نے اس میں شبہ نہیں کہ گریہ وزاری، سینہ کوبی اور آہ و بکا کی ضرور مذمت کی ہے اور میں ان چیزوں کو کم نظری اور پست خیالی کی دلیل سمجھتا ہوں، لیکن میں نے کہیں یہ نہیں کہا کہ جذبات غم کی مصوری تغزل کے دائرہ سے خارج ہے، یا شاعر کو درد انگیز اشعار کبھی نہ کہنا چاہیے، البتہ شرط اتنی ضرور ہے، کہ جو جذبہ ادا کیا جائے اسمیں پستی اور ابتذال نہ آنے پائے اور کیف و اثر میں ڈوبا ہوا ہو، میرے نزدیک اصغر کا یہی خاص کمال ہے، جو ابھی مذاق لکھنؤ کو نصیب نہیں۔

اگر مرزا صاحب کے نزدیک "انبساط" کے معنی ہنسنے اور قہقہہ لگانے کے ہیں، تو بے شبہ میں ایسے اشعار کو کبھی پسند نہیں کر سکتا جو صرف قہقہہ انگیز ہوں، لیکن اگر انبساط سے یہ مطلب ہے کہ شعر سنکر روح میں کوئی اضطراب اور بیداری کی کیفیت پیدا ہو، اور میرے نزدیک انبساط اسی کو کہتے ہیں، تو یقیناً میرا یہ خیال ہے کہ شاعر کو صرف اسی قسم کے اشعار کہنا چاہیئے، جن سے روح میں تازگی اور لطافت پیدا ہو، میں پر درد اشعار کو بھی قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں، کیونکہ میرے نزدیک درد و غم بھی ایک پر کیف چیز ہے جس میں ایک مضطرب روح کو خاص انبساط اور لذت محسوس ہوتی ہے، لیکن میں "انقباضی اشعار" کو بہر صورت تغزل کے دائرہ سے خارج سمجھتا ہوں، میرے نزدیک وہ شعر شعر نہیں، جس سے قلب میں تنفر اور انقباض پیدا ہو، یہ سب مادی درد کی علامتیں ہیں، لیکن درد محبت جو ایک لطیف روحانی کیفیت کا نام ہے اس کا کبھی یہ اثر نہیں ہو سکتا، ایک شخص جو حضرات لکھنؤ کی طرح اگر کسی مادی درد میں مبتلا ہے تو بے شبہ اس کی آہ و فغاں سے سامع کے قلب میں ضرور تنفر اور انقباض پیدا ہو گا، لیکن ایک درد مند محبت کا ترانۂ فریاد مرغان چمن کی زمزمہ سنجیوں سے کہیں زیادہ دلفریب اور کیف انگیز ہوتا ہے،

میں بے شبہ تغزل کو صرف خوشی کا سانچہ نہیں بنانا چاہتا، وہ آپکے قلب کی گوناگوں لطیف کیفیتوں کا ضرور آئینہ ہے، لیکن میں کم از کم ایسے خیالات کی مصوری کو جن سے تنفر اور انقباض پیدا ہو کبھی تغزل میں جائز نہیں سمجھ سکتا۔ اب تک ارباب فن کے نزدیک شعر کی مصوری حیرت و استعجاب، درد و غم، کیف و انبساط کے برانگیختہ کرنے والے جذبات تک محدود تھی، لیکن انقباضی کیفیت کا اضافہ ہمارے دوست کی ایجاد ہے، یعنی یہ کلیہ اگر مان لیا جائے، تو اب چرکین کو بھی مرزا صاحب کی صف میں کھڑے ہونے کا حق حاصل ہے، کیونکہ ان کے اشعار سے طبیعت میں کم از کم تنفر اور انقباض کی کیفیت ضرور پیدا ہوتی ہے، اس لئے مرزا صاحب کے قول کے مطابق اس کا کلام شاعری کے "ٹکسال" سے خارج نہیں ہے، لکھنؤ کے حلقۂ ادبی کے مذاق شعری کی لطافت کا اندازہ اسی سے کر سکتے ہو، کہ وہاں نفرت اور انقباض بھی شاعری کے حدود جذبات میں داخل ہیں، یہ اسی تخیل کا اثر ہے کہ جناب عزیز جو مقدسین لکھنؤ کے سرخیل سمجھے جاتے ہیں ان کے قلم سے بھی یہ شعر نکل جاتا ہے،

زہر آب چشم کا کوئی قطرہ گرا تھا کیا　　بستر ترے مریض کا دیکھا تو زرد تھا

اس شعر کو پڑھکر جس رکیک اور مبتذل مفہوم کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے، کیا وہ ننگ تغزل نہیں ہے؟ ممکن ہے کہ اثر صاحب کی عقیدت مند نگاہ کو جناب عزیز کے "زہر آب چشم" کے قطروں میں آب حیات کی جھلک محسوس ہوتی ہو، لیکن ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ لکھنؤ کے چمنستان تغزل پر جو زردی اور افسردگی چھائی ہوئی ہے، وہ اسی اشک زہر آلود کی سمیت کا اثر ہے،

مرزا صاحب کا ارشاد ہے کہ

"شعر کی خوبی یہ ہے کہ جس جذبہ کی تصویر ہو مکمل ہو"

صحیح ہے، لیکن وہ جذبہ کس قسم کا ہونا چاہئے؟ اگر کوئی شخص شعر میں جذبۂ شہوت کا اظہار کرے، تو کیا کوئی صاحب ذوق اس جذبہ کو قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھیگا، مثلاً داغ کا یہ مصرعہ "مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شباب میں" بے شبہہ جذبۂ نفسانی کی شدت کی مکمل تصویر ہے، لیکن کیا اثر صاحب اس قسم کے جذبات کو شاعری کے لئے مناسب خیال کر سکتے ہیں؟ اگر شعر کی صرف اتنی ہی خوبی ہے، کہ جس جذبہ کی تصویر ہو مکمل ہو قطع نظر اس سے کہ وہ جذبہ کسی قدر عامیانہ، بیہودہ، رکیک، پست اور مبتذل ہو، تو پھر ایک فحاش، ایک ہجوگو، ایک بازاری ہوس پرست کو بھی شاعر تسلیم کرنا پڑے گا، اگر شاعری صرف رنگ کی پختگی کا نام ہے، تو پھر جس طرح آپ میر و غالب کو صاحب کمال شعرا میں شمار کرتے ہیں، اسی طرح جرکین اور میر زٹلی کو بھی ارباب فن ماننا پڑے گا، کیونکہ دونوں اپنے اپنے رنگ میں اور مذاق میں پختہ تھے، لیکن میں معیار شاعری کو اس قدر پست نہیں کر سکتا، میرے نزدیک شعر کی خوبی کے لئے بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے یعنی انداز بیان میں ندرت ہو، خیال لطیف اور عام سطح سے بلند تر ہو، ابتذال کی آلائش سے پاک ہو، کیف و اثر میں ڈوبا ہوا ہو، اگر شعر ہمارے قلب کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتا، یا اس کو پڑھکر روح میں تکدر اور تنغص کی کیفیت پیدا ہو، تو وہ میرے نزدیک شعر نہیں، شاعر کا اصلی کمال یہ ہے، کہ اس کی نگاہ کس حد تک نکتہ رس کیف شناس، اور لطافت سنج واقع ہوئی ہے، اگر اس کی جنبش قلم روح انسانی کے حیات مخفیہ کو بیدار نہیں کر سکتی، اگر اس کی نگاہ شوق جمال معنوی کے رموز رنگین کی ادا شناس نہیں ہے، اگر اس کا دست طلب ساز محبت کے پردہ ہائے لطیف کو برانگیختہ نہیں کر سکتا، اگر اس کا قلب سوز و گداز کا آتشکدہ نہیں ہے، اگر اس کا دماغ ذوق وجد کے نشے سے خالی ہے، اگر اس کی روح فیضان اضطراب سے محروم ہے، اگر اس کے ترانہ ہائے سخن ہمارے دل و دماغ کو مشتعل نہیں کر سکتے اگر اس کا تخیل اسرار و معارف کی بزم تجلی تک پہنچنے سے قاصر ہے، اگر اس کی پرواز فکر اس فریب گاہ ہوس سے آگے نہیں بڑھ سکتی، اگر اسکے داغ جگر میں لالہ زار طور کے جلوے نظر نہیں آ سکتے، اگر تراوش افکار تشنگان ذوق کے لئے آب حیات کا کام نہیں دیسکتی، اگر اس کی زبان دردمندان محبت کو نشاط روحانی کے فتح باب کا مژدہ نہیں سنا سکتی، تو بے شبہہ وہ شاعر نہیں بلکہ ایک بوالہوس ہے، جس کا وجود ادب کے لئے، تمدن کے لئے، اخلاق کے لئے، ایک عظیم الشان مصیبت ہے۔

ممکن ہے کہ اثر صاحب کو میرے اس خیال سے اتفاق نہ ہو، کیونکہ یہ معیار اگر تسلیم کر لیا جائے تو حضرات لکھنؤ کو اپنی شان استادی کے قیام میں سخت مصیبت کا سامنا ہوگا، اور خطرہ ہے کہ ایک صاحب بھی اس امتحان میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اس سے میرا یہ مقصود نہیں ہے کہ ان کے دل و دماغ میں صلاحیت نہیں ہے، لیکن افسوس ہے، کہ قدامت پرستی ان کے رگ و پے میں اس قدر سرایت کر گئی ہے کہ قدما نے جو شاہراہ سخن کھولدی تھی، وہ اس سے قطعاً ہٹنا پسند نہیں کرتے، وہی مضامین ہیں، جن کو الٹ پھیر کر کے انھی الفاظ میں ادا کرتے رہتے ہیں اس عادۂ بہیم کا یہ نتیجہ ہوا، کہ طبیعتیں جدت اور لطافت سے خالی ہو گئیں اور ان پر ایک قسم کی افسردگی چھا گئی، جس نے رفتہ رفتہ ان کے انداز خیال میں پستی اور ابتذال پیدا کر دیا، چنانچہ وہ نگاہیں جن کو حسن نامحدود کی اداؤں کا رمز شناس ہونا چاہئے تھا، محض شاہدان

لب بام کی عشوہ طرازیوں کے دام فریب میں پھنسکر رہ گئیں، وہ ہاتھ جس کو جمال حقیقت کے چہرے سے نقاب الٹنا چاہئے تھا، رقیب کی زدوکوب میں مصرف ہوگیا، وہ قلب جس کو اسرار و معارف کی تجلی گاہ ہونا چاہئے تھا، محض جلوہ گاہ ہوس بنکر رہ گیا، وہ آنکھ جسکے ہر قطرۂ آب سے انوار محبت کی بارش ہونی چاہئے تھی، بستر غم پر زہر فشانی کرنے لگی، وہ لب جسے نوائے حیات کی ترنم ریزیوں سے معمور ہونا چاہئے تھا، صرف آہ و بکا کے لئے وقف ہوگیا، وہ دماغ جس کو نشاط امید سے مخمور ہونا چاہئے تھا، یاس وملال کا دشتکدہ بنکر رہ گیا۔ لیکن افسوس ہے، کہ باوجود اس کے کہ دنیا کا مرقع اُلٹ گیا، افق حیات مختلف قسم کی رنگینیوں سے معمور نظر آتا ہے، طبیعتیں آہ و بکا سنتے سنتے گھبرا اٹھی ہیں، حضرات لکھنؤ اسی ماتمکدے میں بیٹھے ہوئے اب تک مصروف ماتم ہیں اور آئندہ بھی اسی روش پامال پر قائم رہنا چاہتے ہیں، کیوں؟ صرف اس لئے کہ پاس وضع کا خیال ہے، لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ، شاعری کو پاس وضع سے کیا تعلق؟ یہ کیا ضرور ہے، کہ آباء واجداد نے صدیوں پہلے جو ایک انداز اختیار کر لیا ہے ہم بھی اسی پر ہو بہو قائم رہیں، اور موجودہ حالات وواقعات سے قطعاً آنکھیں بند کرلیں، کیا شاعری میں ترمیم و تغیر جرم ہے؟ امتداد زمانہ کیوجہ سے تغزل میں جو پستی اور ابتذال آگیا ہے، کیا اس کی اصلاح کوئی گناہ ہے

میں تغزل کا مخالف نہیں، لیکن لکھنؤ کی بدمذاقی سے جو معائب اس میں پیدا ہوگئے ہیں، اُن کی اصلاح نہایت ضروری سمجھتا ہوں نالہ و ماتم کی انتہا ہوچکی، اب ضرورت ہے کہ مذاق شعری میں کچھ لطافت اور بلندی پیدا کیجائے اور عشق و محبت کے ایسے جذبات ادا کئے جائیں، جن سے روح کو خاص لذت حاصل ہو، اور شریفانہ اخلاق کے نشوونما میں مدد ملے، حزن و افسردگی زندگی کا نام نہیں بلکہ راز حیات صرف اسی اضطراب بہیم میں نہاں ہے جس سے ایک عاشق کا قلب معمور رہتا ہے، میں نے نشاط روح کو اسی حیثیت سے ملک کے سامنے پیش کیا ہے، کہ وہ ذوق محبت کی ابدی رنگینیوں کا ایک ایسا شاداب چمن ہے، جس کا ہر منظر ارباب درد کیلئے پیام راحت ہے، اگر فرصت ملی، تو آئندہ ہم تفصیل سے یہ دکھائینگے، کہ اصغر نے موجودہ عام روش سے الگ ہوکر تغزل کی سطح سخن کو اپنی نکتہ سنجیوں سے کس حد تک لطیف بلند اور پرکیف بنا دیا ہے، لیکن ہم موجودہ بزم ادب سے یہ توقع ضرور رکھتے ہیں، کہ وہ اس مجموعۂ کلام کے مطالعہ کے بعد اس ضلالت کی تاریکی سے بچنے کی ضرور کوشش کریگی، جس کی طرف حضرات لکھنؤ ملک کے مذاق شعری کو لیجا رہے ہیں،

مرزا احسان احمد بی اے۔ ایل ایل بی (علیگ)

(**نگار**) یہ مضمون میرے پاس صرف "روح نشاط پر ایک نظر" کے عنوان سے آیا تھا اور اس عنوان کو دیکھ کر (مطالعۂ مضمون سے قبل ہی) میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ نگار میں اس کی اشاعت مناسب ہے نہ ضروری، کیونکہ نشاط روح پر اس سے قبل کافی نقد و تبصرہ ہو چکا ہے اور اب پھر اسی کا اعادہ جبکہ اس سے زیادہ مفید موضوع پر بھی گفتگو ہو سکتی ہے، کم از کم نگار کی روایت ترتیب کے منافی تھا لیکن یہ مضمون اس قدر خوشخط لکھا ہوا تھا کہ نگاہ بے اختیارانہ متوجہ ہوئی اور جب دو تین صفحے پڑھ چکا تو مضمون کی دلچسپی نے دامن پکڑا، یہاں تک اس کو اول سے آخر تک پڑھنا ہی پڑا، اور پڑھنے کے بعد "جواز اشاعت" کا فتویٰ دینے پر مجبور ہوگیا صرف عنوان میرا تجویز کیا ہوا ہے باقی جو کچھ ہے اس کی ذمہ داری فاضل مقالہ نگار پر ہے۔

جناب مرزا احسان احمد صاحب کے اس مضمون کو دو غیر مساوی حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ایک مختصر حصہ جس میں جناب اثر کی تنقید روح نشاط سے اختلاف لیا گیا ہے اور دوسرا وہ طویل حصہ جس میں لکھنؤ کے عام ذوق سخن کو قابل سرزنش ثابت کیا گیا ہے، چونکہ مجھے اس مضمون کے حصۂ اول سے اختلاف ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بھی بہیں ظاہر کر دوں تاکہ اثر صاحب یا ان کے کسی اور ہم خیال کو جواب دینے کی ضرورت ہی نہ ہو، اور آئندہ نگار کے صفحات اس بحث کی بازیگاہ بننے سے محفوظ رہیں۔

مضمون کے اول حصہ میں اصغر کے صرف یہ دو شعر مابہ النزاع ہیں:-

مقام جہل کو پایا نہ علم و عرفاں نے　　میں بے خبر ہوں باندازۂ فریب شہود
ایسا بھی ایک جلوہ تھا اس میں چھپا ہوا　　اس رخ پہ دیکھتا ہوں اب اپنی نظر کو میں

احسان صاحب نے مقدمۂ روح نشاط میں جو مفہوم ان اشعار کا ظاہر کیا ہے اس سے اثر صاحب کو اختلاف تھا جسے انھوں نے اپنے مضمون "روح نشاط پر ایک نظر" میں بیان کیا ہے، اسی اختلاف سے ناراض ہو کر احسان صاحب نے یہ مقالہ سپرد قلم کیا ہے جناب اثر کا اصل مضمون جس کا یہ جواب دیا گیا ہے، میری نگاہ سے گزر چکا ہے، اور میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ مضمون اپنے الفاظ اور اسلوب بیان کے لحاظ سے ایسا نہ تھا کہ اس کے جواب میں احسان صاحب کا لب و لہجہ اتنا خشم آلود اور طرز ادا اس قدر تلخ ہو جاتا۔

جہاں تک ذاتیات کا تعلق ہے اثر صاحب نے صرف یہ جملے ایسے استعمال کئے ہیں جن کو سخت کہا جا سکتا ہے:-

"مرزا احسان احمد صاحب نے بعض اشعار کے معانی بیان کرنے کی کوشش کی ہے، مگر مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ انھیں کامیابی نہیں ہوئی، دیگر شعراء ماضی و حال کے متعلق جس رائے کا اظہار فرمایا ہے اس سے بھی مجھے اختلاف ہے"

"مرزا صاحب کی شرح کس قدر توہین ہے اس فلسفیانہ دماغ کی جس سے ایسا شعر نکلا ہو"

"میں بہ ادب عرض کروں گا کہ مرزا صاحب شعر کی خوبیاں تو درکنار اس کا مطلب بھی نہیں سمجھے"

ان تین ٹکڑوں کے علاوہ کوئی اور فقرہ یا جملہ مجھے ایسا نہیں ملا جس کے ذریعہ سے اثر صاحب نے احسان صاحب کے ذوق سخن یا شعر فہمی پر حملہ کیا ہو، لیکن احسان صاحب نے اس جواب میں جو لب و لہجہ اختیار کیا ہے، اور جو فقرے استعمال کئے ہیں وہ میرے نزدیک زیادہ تلخ و سخت ہیں۔ ان کے اعادہ و تکرار کی ضرورت نہیں۔ مضمون دیکھ کر ہر شخص معلوم کر سکتا ہے۔ یہ ہے میری رائے اس مضمون کے لب و لہجہ پر صرف ان جملوں کے متعلق جو اثر صاحب کے لئے لکھے گئے ہیں، ورنہ عام لکھنوی رنگ تغزل کی نسبت جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اس کو میرے نزدیک اور زیادہ تُند ہونا چاہئے تھا۔

اب رہ گیا اصل مسئلہ جس پر نزاع ہے، سو مجھے افسوس کے ساتھ ظاہر کرنا پڑتا ہے کہ اس باب میں مجھے اثر و احسان دونوں سے اختلاف ہے، اور میرے نزدیک یہ دونوں شعر (جن کے مفہوم کے تعین میں اختلاف ہے) منجملہ ان چند اشعار کے ہیں جن میں اصغر صاحب اپنے مدعا کو صحیح طور پر ظاہر کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے اور صرف خوبصورت الفاظ کی خوبصورت نشست سے فریب کھا کر

اپنی جگہ مطمئن ہوگئے۔

جب کوئی شاعر کسی خاص جذبہ سے مغلوب ہوکر اس کا اظہار کرنا چاہتا ہے تو وہ فرط محویت و انہماک میں بعض وقت اپنے بلند سے بلند خیال کو اس قدر آسان، اسدرجہ عامۃ الورود اور اتنا سریع الانتقال الی الذہن سمجھ لیتا ہے کہ محض اشارات وکنایات ہی کو اس کے اظہار کے لئے کافی جانتا ہے، حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہوتی اور اس کی تعبیرات ناکافی ہوتی ہیں۔

میں یہ نہیں کہتا کہ اصغر صاحب نے ان دونوں شعروں میں کوئی مفہوم نہیں رکھا، یقیناً انھوں نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی ان کو لکھا ہوگا لیکن خیال کی وسعت کے لحاظ سے الفاظ ان کو نہیں ملے اور نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی کچھ سمجھنے لگا اور کوئی کچھ۔ اسی قبیل کے بعض شعر اصغر صاحب کے یہ ہیں، جن کو میں تعبیر ناقص کہونگا۔

گلوں کی جلوہ گری مہر و مہ کی بوالعجبی — تمام شعبدہ ہائے طلسم بے سببی

ابتک تمام فکر و نظر پر محیط ہے — شکل صفات معنی اشیا کہیں جسے

مستی سے ترا جلوہ خود عرض تماشا ہو — آشفتہ مزاجوں کا یہ کیف نظر دیکھا

غزل کی سب سے بڑی خوبی خواہ وہ کسی رنگ کی ہو، یہ ہے کہ اس کا شعر سنتے ہی اک کیفیت طاری ہوجائے اور ذہن سامع اس فکر میں الجھ کر نہ رہجائے کہ کہنے والے کا کیا مطلب ہے، غزل کا شعر وہی ہے جو ایک ہی مفہوم کے لئے لکھا گیا ہو اور ایک ہی معنے اس سے پیدا ہوتے ہوں۔ اور اگر ایسا نہیں ہے بلکہ اک دفتر تاویلات اس سے متعلق ہوسکتا ہے تو بلندی خیال کی وجہ سے آپ سے الہام، وحی، نطق خداوندی جو چاہئے کہدیجئے، لیکن غزل میں اس کو شامل نہیں کرسکتے۔

میں نے انھیں دونوں شعروں کے متعلق جنپر احسان و اثر میں اختلاف ہے، ہر صاحب ذوق سے جو اس زمانہ میں مجھے ملا رائے حاصل کی، لیکن سب نے مجھ سے اتفاق کیا کہ اثر و احسان کی تاویل اپنی اپنی جگہ کتنی ہی بہتر کیوں نہ ہو لیکن کم ازکم اصغر صاحب کے اشعار سے وہ معنی پیدا کرنا "اتہام معنی" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔

میں نے خود اصغر صاحب سے بھی تحریک کی کہ وہ ان کا مطلب تحریر فرمادیں، لیکن انکا کوئی جواب نہ آیا۔ ممکن ہے کہ جواب کے آنے پر مجھے اپنی رائے بدل دینی پڑتی۔

اصغر صاحب کی شاعری اس میں کلام نہیں کہ بالکل وہبی و الہامی ہے اور لطافت احساس، صحت ذوق، بلندی نظر، ندرت خیال، علوئے فکر، رسائی ذہن اور پاکیزگی تخیل کے اعتبار سے وہ اردو تغزل میں بالکل اچھوتی چیز ہے، لیکن احسان صاحب کا یہ دعوی کہ وہ یکسر نقائص ومعایب سے پاک ہے اور وہ ہر قسم کے ضعف ولغزش سے منزہ ہے، غالباً صحیح نہیں۔ کہیں احسان صاحب کی یہ برہمی اس وجہ سے تو نہیں کہ اثر صاحب نے اپنی تنقید کے سلسلہ میں کلام اصغر کی کچھ غلطیاں بھی ظاہر کی تھیں۔ بہر حال اسوقت میرے سامنے جناب اثر کی وہ تنقید موجود نہیں ہے جس میں انھوں نے اپنے اعتراضات پیش کئے ہیں، اور نہ یہ خبر کہ احسان صاحب نے ان کا کوئی جواب بھی دیا ہے یا نہیں، لیکن روح نشاط ضرور میرے سامنے ہے اور صرف چند منٹ کی سرسری نگاہ سے چند

شعر ایسے مل گئے ہیں جن سے جناب احسان کا یہ دعویٰ باطل ہو سکتا ہے۔

رب ارنی کہنے کہنے چیخ اٹھوں تو برق طور ہو

عشق متبسم کہ یہ راز جہاں کے کائنات

مضراب محبت سے اک زخمۂ لاہوتی ہو

بڑا غضب یہ دل شعلہ آرزو نے کیا

پہلے مصرعہ میں ارنی کی یے کا سکون، دوسرے مصرعہ میں تبسم کی ت کا سکون تیسرے میں مضراب و زخمہ کو علیحدہ علیحدہ سمجھکر زخمہ کو نغمہ کی جگہ استعمال کرنا، چوتھے میں دل شعلہ آرزو لکھنا۔ کیا کھلے ہوئے لفظی نقائص نہیں ہیں۔

اب رہگئی تنقید معنوی و تنقید بلاغی، سو اس کا یہ موقع نہیں ورنہ میں بتاتا کہ اس لحاظ سے بھی اصغر کے کلام پر کافی بحث کی جا سکتی ہے۔ اسی شعر کو لے لیجیے جس میں جہل و عرفان کی بحث ہے اور جو احسان صاحب کے نزدیک "لطیف حقیقت اسلامی کی طرف اشارہ" ہے۔

مقام جہل کو پایا نہ علم و عرفاں نے
میں بے خبر ہوں باندازۂ فریب شہود

شاعر پہلے مصرعہ میں جہل کا مرتبہ علم و عرفان سے بلند ظاہر کرتا ہے، حالانکہ دوسرے مصرعہ میں "میں بے خبر ہوں باندازۂ فریب شہود" کہکر یہ بھی ظاہر کر دیا کہ میں اپنے اس "جہل یا بے خبری" کا علم رکھتا ہوں نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے مصرعہ سے پھر علم و عرفان کی منزلت بڑھ گئی اصغر کا ایک شعر ہے۔

عشق ہے اک کیف پنہانی مگر رنجور ہے
حسن بے پروا نہیں ہوتا مگر دستور ہے

دونوں مصرعوں کا عدم توازن نہ صرف بلاغت کا نقصان ہے بلکہ مفہوم کے لحاظ سے بھی ذہن کو مشوش کر دیتا ہے۔ پہلے مصرعہ میں دو فقرے ہیں۔ "ہے اک کیف پنہانی" اور "رنجور ہے" ان دونوں کا فاعل عشق واقع ہوا ہے۔ لیکن دوسرے مصرعہ کے دوسرے فقرہ کا فاعل وہ نہیں ہو سکتا جو پہلے فقرہ کا ہے، یعنی یوں نہیں کہہ سکتے کہ حسن بے پروا نہیں ہوتا، مگر حسن دستور ہے۔ دوسرے مصرعہ کا مطلب شاعر نے یہ رکھا ہے کہ حسن بے پروا نہیں ہوتا مگر اس کی بے پروائی دستور ہے۔ اول بے پروائی سے انکار اور پھر اس کا دستور کی صورت میں اقرار تضاد معنوی کا نقص رکھتا ہے اور اگر اس سے قطع نظر کر لیں تو بھی ژولیدگی بیان ظاہر ہے۔

احسان صاحب اثر پر نہیں بلکہ حقیقتاً ان کی شاعری اور ذوق سخن گوئی پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ "انھوں نے لکھنؤ کے

ظلمت کدہ میں بیٹھکر صحیفۂ معرفت (یعنی روح نشاط) کی ورق گردانی کی کوشش فرمائی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک نگاہ جو صرف شاہدان لب بام کی عشوہ طرازیوں کے فریب خوردہ ہے، حیات انسانی کے رموز قدس کے اداشناس کیونکر ہوسکتی ہے"

مجھے احسان صاحب کے اس اعتراض پر حیرت ہے۔ کیا شاہدان لب بام کی عشوہ طرازیاں، "اس فریب شہود" میں داخل نہیں ہیں جس میں مبتلا ہوجانا صاحب روح نشاط کے نزدیک عین مقتضائے نظرت ہے اور جس کا مرتبہ علم وعرفان سے بلند واقع ہوا ہے۔ اور کیا خود اصغر نے اسی سطح پر آکر شاعری نہیں کی ہے۔ ملاحظہ ہو:-

جلوۂ حسن بتاں اک غیب کی آواز ہے

بتوں کے حسن میں بھی شان ہو خدائی کی ہزار عذر ہیں اک لذت نظر کے لئے

حقیقت ایک ہے صدہا لباس رنگیں میں نظر بھی چاہئے کچھ حسن رہگزر کے لئے

اگر اصغر صاحب "جلوۂ حسن بتاں" میں غیب کی آواز پاتے ہیں، اگر وہ بتوں کے حسن میں شان خدائی دیکھتے ہیں اور اس سے بھی فروتر آکر حسن رہگزر (یعنی راہ سے ہر گزرنے والی حسین عورت) میں بھی ایک ہی جلوہ ان کو نظر آتا ہے، تو کیا اثر صاحب شاہدان لب بام کی عشوہ طرازیوں کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ اصغر صاحب کے صحیفۂ معرفت کا مطالعہ نہیں کرسکتے علی الخصوص اسوقت جبکہ حسن لب بام میں "حسن رہگزار اور غنائے خانۂ ہمسایہ" دونوں کے اجتماع کا امکان ہے۔

اس شعر پر احسان صاحب نے ایک رکیک و بتذل مفہوم کی طرف ذہن کا منتقل ہونا ظاہر کیا ہے

زہراب چشم کا کوئی قطرہ گرا تھا کیا بستر ترے مریض کا دیکھا تو زرد تھا

ایک شعر عزیز کا اور ہے جسپر یہی اعتراض ہوسکتا ہے۔

دل سمجھا تھا کہ خلوت میں وہ تنہا ہونگے
ہمنے پردہ جو اُٹھایا تو قیامت نکلی

لیکن اصغر صاحب کے ہاں بھی اس انداز کے شعر موجود ہیں لکھتے ہیں

کچھ غنیمت ہوگئے یہ پردہ ہائے آب ورنگ
حسن کو یوں کون رہسکتا تھا عریاں دیکھکر

علاوہ اس نقص کے کہ ——— پردہ ہائے آب ورنگ اور عریانی کو متضاد ظاہر کیا ہے جبکہ حقیقتاً دونوں ایک ہیں، دوسرے مصرعہ سے جو رکیک مفہوم پیدا ہوتا ہے وہ محتاج بیان نہیں،

دوسرا شعر ملاحظہ ہو:-

بحر آوازِ انا البحر اگر دے تو بجا　　　　پردۂ قطرۂ ناچیز سے کیوں ہو یہ خروش

"قطرۂ ناچیز" سے اگر انسان مراد ہے تو شاعرانہ نقطۂ نظر سے اس تعبیر کی سخافت ظاہر ہے۔ بہرحال میرا مقصود اس تمام بیان سے صرف یہ ہے کہ اگر احسان صاحب، واقعی اصغر کی حقیقت و اہمیت کو ثابت کرنا چاہتے ہیں تو اس کی تدبیر یہ نہیں ہے کہ ان کے محاسن کے شمار میں معایب و نقائص کو بھی نظر انداز کر دیں، حسن ہر جگہ حسن ہے اور عیب ہر مقام پر عیب، اس کے لئے تخصیص نہ گونڈہ کی ہے نہ لکھنؤ کی۔ اگر اثر صاحب نے احسان صاحب کے خلاف مزاج معنے بتائے تھے تو اس قدر برہمی کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ بہرحال انھوں نے کوئی معنے تو پیدا کئے تھے، مہمل و بے معنی تو ظاہر نہیں کیا تھا اور اگر احسان صاحب کو اپنے ہی سمجھے ہوئے مطلب پر اصرار تھا تو پھر ضمنی مباحث میں اس قسم کے اعتراض دوسروں پر نہ کرنا چاہئے تھے، جو خود اصغر کے کلام پر وارد ہو سکتے ہیں

یہ ہے میری رائے اس مضمون کے حصۂ اول کے متعلق۔ اب رہا حصۂ ثانی جس میں لکھنؤ کی شاعری پر تبصرہ کیا گیا ہے، اس سے مجھے بالکل اتفاق ہے اور اس باب میں احسان صاحب کے حسن تنقید کی داد دینا آسان نہیں۔ انھوں نے جس زورِ قلم، جس حسن انشاء جس قوتِ استدلال سے کام لیکر لکھنؤ کی موجودہ شاعری کی حقیقت کو بے نقاب کیا ہے، اس کو دیکھکر میں یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ۔

"میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے"

اس بحث کے سلسلہ میں جناب اثر کی رائے سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ اور میں کبھی لکھنؤ کی اس متشائم شاعری کو پسند نہیں کر سکتا جس کو بجائے تغزل کے مرثیہ کہنا زیادہ موزوں ہے۔ کاپی یہانتک لکھی جا چکی تھی کہ جناب اصغر کی تحریر میرے عریضہ کے جواب میں موصول ہوئی۔ انھوں نے دونوں نزاعی شعروں کا جو مطلب تحریر فرمایا ہے وہ وہی ہے جو جناب احسان نے لکھا ہے، اس میں شک نہیں کہ خیال بہت بلند و پاکیزہ ہے۔ اور تاویل کے بعد ان شعروں سے یہ مطلب اخذ ہو سکتا ہے۔ مگر شاعر کا اپنے ذوق و وجدان کو اک جنس عام سمجھ کر صرف اشارات کی شاعری کرنا مناسب نہیں جن کے سمجھنے کے لئے تاویل کی ضرورت ہو کیونکہ تاویل تو وہ بلائے بد ہے کہ دیوان چرکین کو بھی مجموعہ ملہمات تصوف ثابت کر سکتی ہے۔ اخیر میں مجھے یہ کہدینا چاہئے کہ میرا مقصود اس تحریر سے جناب اصغر کی شاعری کی تنقیص نہیں ہے، کیونکہ میں ان کے ذوق شعر گوئی کا بڑا معترف ہوں، اور یقیناً میں ان کو عہد حاضر کے شعراء میں ایک خاص مرتبہ کا مالک سمجھتا ہوں، لیکن بعض اشعار پر مجھے ضرور اعتراض ہے اور اگر اس سلسلہ میں اپنے اس خیال کو میں نے ظاہر کر دیا تو اس کا مفہوم وہی لینا چاہئے جو میری مراد ہے اس میں نہ تاویل کی ضرورت ہے اور نہ چنیں چناں کی۔ کیونکہ میری اس تحریر کو دیکھ کر کوئی کچھ سمجھے، لیکن اصغر کی محبوبیتِ شاعرانہ میرے دل میں بدستور قایم ہے اور میں اس کو چند نقائص کیوجہ سے جو لازمۂ سعی بشری ہیں، کبھی محو نہیں کر سکتا جسطرح احسان صاحب کی خوش ذوقی کی دلیل اس سے زیادہ اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ انھوں نے کلام اصغر کو دنیا کے سامنے پیش کیا، اسیطرح جناب اثر کے خلاف انکا سخت لب و لہجہ ایک روشن ثبوت ہے اس امر کا کہ یا تو وہ اصغر کے عاشق ہونے کے لحاظ سے کسی دوسرے کو اظہار محبت کرتے نہیں دیکھ سکتے، یا پھر یہ کہ احساس کی ذکاوت کبھی انھیں قسطاسِ توازن سے "باندازۂ فریب شہود" بے خبر کر دیتی ہے۔ نیاز

شاما

میرزا شاہ مراد عرف شاما کی حیثیت سے قصر شیریں (ایران) کی ایک دلچسپ ہستی تھے یوں تو کُردی، فارسی، ترکی و عربی میں بے تکلف گفتگو کر لینا سرحد ایران و عراق کے قرب وجوار کے لوگوں کے لئے کوئی تعجب کی بات نہیں، کیونکہ یہ چاروں زبانیں وہ اپنے ماں کے گہوارہ ہی میں سیکھ لیتے ہیں مگر استاد شاما ان میں اس حیثیت سے ممتاز تھے کہ (بقول خود) انکے علاوہ اور وہ پانچ سات زبانوں میں کے ماہر تھے اور جس میں انگریزی و ہندی بھی شامل تھی اور اسی لئے ان کا دعویٰ تھا کہ ان کے سلسلۂ نسب میں وہ تمام قومیں شامل ہیں جن کی زبان میں وہ گفتگو کر لیتے ہیں۔ یہ ویسا خالی خولی دعویٰ نہیں تھا جیسے ہمارے ہندوستان کے مسلمان بغیر عربی کا ایک حرف جانے ہوئے صدیقی و فاروقی و عثمانی بن بیٹھے ہیں۔

کُردوں میں وہ شاما کے نام سے عام طور سے مشہور تھے۔ نہ اس لئے کہ ان کی آواز و شکل وجثہ کو کوئی دور کی تشبیہ بھی ہندوستان کے اس پرندے سے دیجا سکتی تھی بلکہ یہ صرف ان کے نام کی ایک مسخ شدہ صورت تھی جس کی ذمہ داری کُردوں کی اس بری عادت پر تھی کہ وہ دال کے حرف کو ہضم کر جاتے ہیں مثلاً وہ بغداد کو بغا۔ احمد کو احمہ محمد کو حمہ کر دیتے ہیں، اور اس لحاظ سے شاہ مراد کا مخفف شاما ہو گیا۔

پہلی بار جب وہ مجھ سے ملے تو انھوں نے خود اپنی تعریف مجھ سے اس طرح کی کہ "آقا من دما قراط ہستم۔ مگر شما نمیدانی دما قراط چہ ہست۔ کسے کہ در پالتیک سررشتہ دارد و من در پالتیک خیلے حرف میزنم" یہ محض زبانی دعویٰ نہ تھا بلکہ میں نے ان کو بارہا دیکھا کہ جب وہ بازار میں اپنے کباب کی دوکان کے آگے سفید چاندتارا بنے ہوئے لال کپڑے کو کمر سے نیچے اور اپنے شلوار سے اوپر باندھے سیخوں سے گرما گرم کباب اتارنے میں مشغول ہوتے اور منہ پھیلائے ہوئے خاطرچی و کاروانچی کی ایک جماعت ان کے پیچھے میز پر بیٹھی ہوتی تو وہ اپنی پالتیک میں اس درجہ محو ہو جاتے کہ ان بے صبروں کو انقلاب کی سوجھنے لگتی اور آخر میں جب مشروطیت و استبدادیت کی نزاع طول پکڑتی تو مقامی چندرمہ کو مجبوراً مداخلت کرنا پڑتی اور استاد شاما کشاں کشاں باب سرائے حکومت میں لائے جاتے۔ جہاں وہ کئی گھنٹے رئیس چندرمہ سے سیاست کے اس مخصوص پہلو پر جسکا تعلق رعایا کی مالیت و معیشت ذاتی سے ہوتا ہے تبادلۂ خیالات کر کے اپنے گھر واپس آتے اور پھر ہاتھ منہ دھو کر اور بچی تلخ اوقاتی کو ایک دو جرعۂ عرق میں غرق کر کے اپنی مشہور چارخانے دار قبا اور بھورے رنگ کی کلاہ کے ساتھ میرے کاشانہ میں جلوہ افروز ہوتے اور آتے ہی دو چار صلواتیں رئیس شرطہ کو سنا کر کہتے "بابا چہ کنم۔ پدر سوختہ ہیچ نگذاشتند برائے ماکہ نان ذرات برائے خودم و برائے بچہ ہا بخرم۔ دتو میدانی کہ من عائلہ دارم۔ یک زن یک مادر زن ہفت تا دختر و پسر آخرچہ

چہ کنم از گرسنگی بہ میرم یا این حرامزادہ رئیس را بہ خنجر بکشم" خنجر ہمیشہ ان کے کمر میں رہتا تھا اور جوش میں خنجر نکال کر کبھی اپنے داہنے اور کبھی اپنے بائیں ہاتھ میں پھراتے۔ اور جب تک میرے جیب کے دو چار قران (سکہ) ان کے حساب میں درج نہ ہو جاتے مشکل سے ان کا جوش ٹھنڈا ہوتا

اسی پالٹیک دانی ہی کا نتیجہ تھا۔ کہ ان کو ترکوں سے اور ان کی سلطنت سے بے انتہا نفرت ہو گئی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ جب رؤف بک نے روسیوں کو نکال کر قصر شیریں پر قبضہ کر لیا۔ تو استاد شاما اپنی دوکان بند کر کے اپنی چار خانہ دار قبا اور بھوری کلاہ کے ساتھ قوماندان کے پاس جا پہونچے بازار میں انھوں نے کہیں یہ سن لیا تھا کہ قوماندان ترکیہ کے ساتھ ایک جرمن کپتان ترکی لیروں (سکہ) کے کئی بکس لیکر آیا ہے۔ اور جو ایرانی اس کو پالٹیک ایران میں سب سے بہتر مشورہ دینگے وہ ان کا منہ لیروں سے بھر دیگا۔ استاد شاما ابھی قوماندان کے پاس پہونچے بھی نہیں تھے کہ ان کو اپنے کسی ساتھی سے معلوم ہوا کہ ہمارے لیرے ان کے سب سے بڑے حریف و دشمن یہودی خواجہ عزرا و خواجہ ہارون پہلے ہی لے اڑے ہیں۔ انھوں نے قبا اور ٹوپی کو اسی جگہ چھوڑ، یہودیوں کے محلے کی طرف اپنا رُخ کر دیا۔ اور راستے میں لوگوں کو مختصراً اپنی مہم کے مقصد سے آگاہ کرتے ہوئے ایک بڑی فوج کے خود قوماندان بنکر یہودیوں کے مکانوں پر تاخت بولدی۔ ترکی لیرے تو ہاتھ نہ لگے مگر مال غنیمت کی صورت میں اس کی کافی تلافی ہو گئی۔ ابھی وہ مال غنیمت کو سڑک پر کھڑے اپنی فوج میں تقسیم کر رہے تھے کہ یہودیوں کی نہیب، و غارت کی شکایت قوماندان ترکیہ کے پاس پہونچی اور ہمارے دوست اسی حالت میں گرفتار ہو کر قوماندان کے سامنے پیش ہوئے، اور ان کو اپنی غلط فہمیوں کا ایسا سخت خمیازہ بھگتنا پڑا کہ جب کبھی وہ اس قصے کو مجھ سے ان الفاظ میں دہراتے کہ این یہودی پرست در فراموش خانہ بہ زن شان رقصیدند۔ چرا خاطر شان عزیز نہ دارند مسلماناں را چار چوب کردند شلاق زدند تف حرامزادہ" تو جس وقت وہ آخری لفظ پر آتے تو میں ان سے ذرا دور کھسک کر بیٹھ جاتا کیونکہ شدت جذب میں وہ میرے وجود کو بالکل اسی ترک کا وجود سمجھ لیتے۔

مگر جس وقت کا میں ذکر کر رہا ہوں اسوقت بیچارے ترک عراق و ایران میں ایک قصۂ پارینہ ہو گئے تھے۔ اور استاد شاما کی اب بڑی خواہش یہ تھی کہ اپنی پالٹیک دانی سے انگلیس کو فائدہ پہونچائیں۔ اس لئے جب مسٹر ی اور انکی پہلی ملاقات ہوئی تو اگرچہ اس کی تقریب یہ نہ تھی کہ وہ اپنا تعارف ان الفاظ میں کرتے جس کا میں ذکر کر چکا ہوں انھوں نے کوئی ایسا موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا کہ اپنی پالٹیک دانی اور دماغ بقراط ہونے کا ثبوت نہ دیا ہو۔ میری۔ ان کی ملاقات کی تقریب یہ تھی کہ ہوائے قصر شیریں نے مجھے بیمار ڈال دیا۔ جب بیماری نے طول کھینچا اور مجھے کوئی طبیب میسر نہ آیا تو میرے ملازم ایرانی ایک حکیم باشی بلا لائے۔ جو ہمارے استاد شاما تھے۔ ان کی تنقیح مرض سے تو میں اتنا نہ گھبرایا مگر جب انھوں نے میرے کمر اور گردن کو داغنے کا ارادہ کیا تو باوجود نقاہت وضعف کے میں ایسا سراسیمہ ہوا کہ یکبارگی اُٹھ بیٹھا۔ اس حالت اضطرار نے طبیعت میں ایک ایسا ہیجان پیدا کیا کہ وہ بجائے خود ازالۂ مرض کا سبب ہو گیا اور محض حضرت شاما کے قدم رنجہ فرمانے کی برکت سے

میں شفایاب ہوگیا۔ میرے صحت پانے کے قصہ نے خود مجکو سارے قصر شیریں کی سوسائٹی میں مشہور کردیا۔ کیونکہ استاد شاما کا یہ کارنامہ کئی بار قہوہ خانوں میں دہرایا گیا حتی کہ معزول گورنر قصر شیریں کو میری زیارت کا ولولہ اُٹھا اور جہاں کہیں بھی میں جاتا۔ استاد شاما میرے پہلو میں ہوتے اور ہر طرف سے انگشت نمائی ہوتی۔ مگر بظاہر انکی پالتیک دانی کا کوئی اثر نگلیس پر نہ ہوا، کیونکہ یہاں بھی ان کے یہودی حریف پہلے سے نمبرے گئے تھے اور جب ان کو معلوم ہوا کہ قنزاقط (کنٹریکٹ) سب یہودیوں کو مل چکے ہیں۔ تو انھوں نے مجھ سے بہت ہی رازدارانہ مشورہ یہودیوں کے قتل عام کے بارے میں کیا۔ عامۂ خلائق کے تمام کاموں میں سب سے بڑا فخر مجھے انہیں مشورہ اور دور اندیشی پر ہے جس نے بہت بڑے حادثہ سے قصر شیریں کو بچا لیا ہر چند اسطرح ہمارے دوست کو کباب پہنچنے ہی پر قناعت کرنا پڑی یا پھر اس عرق پر جو وہ خود اپنے ہاتھوں سے تیار کرتے تھے اور جس کے بیچنے کی نوبت کبھی نہ آتی تھی۔

استاد شاما باوجود عسرت کے نہایت زندہ دل و حاضر جواب تھے۔ سنّی تھے اور ایران کی رسم قدیم کے مطابق یا اپنی حفاظت خود اختیاری کے خیال سے جس کی اب ضرورت باقی نہ تھی) وہ اپنے کمر میں ہمیشہ ایک خنجر لگائے رہتے تھے اور اس کے دستہ میں ایک بڑے دانوں کی تسبیح لٹکی رہا کرتی تھی جسکو وہ اکثر ہاتھ میں لیکر مشغلہ کے طور پر پھیرا کرتے تھے۔ ایک بار تو ان کی حاضر جوابی نے غضب ہی کردیا۔ معزول گورنر کے پاس ہم اور وہ اور کئی ایک ایرانی بیٹھے ہوئے تھے، چائے کا دور چل رہا تھا۔ ان کے ایوان کے آگے میدان میں قلعہ جوآن میر تھا۔ اور اس کے گرداگرد ایک بڑا قبرستان تھا جس میں جوآن میر کے ساتھی مدفون تھے۔ سلطان ناصر الدین شاہ کے زمانے میں کردوں کا سردار جوان میر بادشاہ کے بغداد سے شہر کی قصر شیریں کا خود مختار حاکم بن بیٹھا۔ اور بہت مدت تک شاہ کی فوج کو پریشان رکھا۔ آخر میں شکست کھائی اور اس کے بہت سے ساتھی مارے گئے یہ سب سنی تھے۔ کردستان میں قبر عجیب طرح اونچے میناروں کی شکل میں بنائی جاتی ہے۔ ایک آوارہ کتے نے ایک قبر کے قریب آنکر جیسا کتوں کی عادت ہوتی ہے ٹانگ اٹھاکر پیشاب کرنا شروع کیا۔ شاما نے چاہا کہ کتے کو نکالیں۔ ایک ایرانی بزرگ بولے۔ "عیبے ندارد قبرستان ہست" شاما نے جواب دیا "مگر این سگ ہم شیعہ باشد" نہایت قہقہہ لگا۔ شاما سے میں نے راستہ میں کہا کہ آج تم نے پٹوا دیا تھا، تنک کر بولے "حکومت انگلیش ہست چہ باک دارم"

بہر حال جب میں سال ڈیڑھ سال کے قیام کے بعد قصر شیریں سے آرمینیا و شمالی کردستان کے مشن پر روانہ ہوا تو استاد شاما کی یاد بہت دنوں تک باقی رہی اور جس وقت وہ مجھے الوداع کرنے آئے تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ ان کے بذیر چار خانہ دار قبا نہ تھی۔ میں نے پوچھا کہاں گئی، کہنے لگے "دیروز بہ چند قران فروختم تا از گرسنگی نہ میرم" یہ وہ سین تھا کہ سنگدل سے سنگدل شخص بھی، اُن کی مدد کرتا میں نے علحدہ لیجاکر دس تومان ان کے ہاتھ پر رکھے اور انھیں مشورہ دیا کہ وہ پالتیک پر گفتگو کم کیا کریں، اور اللہ کا نام لیکر اس سے قند اور چائے کی تجارت شروع کریں۔ کیونکہ ایران میں پالتیک اور کباب سے زیادہ اس کی مانگ ہے۔ صاحب مند تھے بلاعذر اُس کو شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔ ہم نے

ایک دوسرے کی پیشانی کا بوسہ لیا اور خدا حافظ کہا۔

معلوم نہیں میں کس بری ساعت میں قصرشیریں سے روانہ ہوا تھا کہ دریائے سیروان کے قریب پہونچنے میں عراق کی عام بغاوت شروع ہوگئی۔ اور مشن کے جو انگریز افسران کردستان و آرمینیا کی استقلالیت اور سلطنت کی تشکیل کے لئے جا رہے تھے ان میں سے دو تو اسی جگہ مارے گئے اور تین کسی نہ کسی طرح بچکر نکل گئے۔ میں اپنی اقامت گاہ پہ بے خبر سو رہا تھا کہ یکایک توپ اور بندوقوں کی گرج سے میری آنکھ کھل گئی۔ باہر آکر دیکھتا ہوں تو فضا پر تاریک دھواں پھیلا ہوا ہے۔ اور دھواں صاف ہونے کے بعد سرائے حکومت پر بجائے یونین جیک کے سُرخ چاند تارے کا جھنڈا نظر آرہا ہے۔ اتنا موقع نہ تھا کہ کسی سے دریافت کرتا کہ کیا معاملہ ہے اور نہ میں اپنے اسباب کو اکٹھا کرسکا میرے بکس میں کوئی سات آٹھ ہزار روپیہ کے انگریزی نوٹ رکھے ہوئے تھے۔ اس کو بچانے کا بھی موقع نہ ملا۔ اتفاق سے تمنچہ اور پر ہی رکھا ہوا تھا وہ فوراً ہاتھ میں آگیا۔ مگر کپڑا، ٹوپی، جوتا پہننے کی نوبت نہ آئی اور جیسے ہی اور امانی کرد میری طرف سنگینیں لگائے ہوئے دور سے نظر آئے۔ میں نے اپنے کرتے پائجامے میں عادلہ خانم جان کے محل کی طرف راہ فرار اختیار کی۔ عادلہ خانم اور ان کے خاندان کے امرا ہمارے معاون تھے اور کردوں کے نزدیک غدار۔ اور اس وقت مقابلہ شیخ محمود بیک (معاون مصطفےٰ کمال) اور عادلہ خانم جان کی پارٹی میں تھا۔

راستے میں مجھے بہت سے یہودی و کرد و بدّو اسی سے بھاگتے ہوئے ملے۔ اور میں انکی سرکردگی میں اور پستول کے ہوائی فیر کرتا ہوا افتاں وخیزاں اپنے دوستوں کی پناہ میں پہنچ ہی گیا۔ اس وقت کا سین مجھکو کبھی نہ بھولیگا۔ محل چاروں طرف سے محصور تھا۔ بوڑھی عادلہ خانم ان کی لڑکیاں اور پوتیاں اور خاندان کی جتنی عورتیں محل میں موجود تھیں وہ بالاخانہ میں اوپر کھڑی ہوئی اپنے ساتھیوں کو اس بے خوفی اور دلیری سے ابھار رہی تھیں کہ اگرچہ میں کبھی بہادری کا مدعی نہ تھا اور نہ میں نے کسی انسان کے اوپر گولی چلائی تھی۔ میں بھی ان محافظین کے زمرے میں کھڑا ہوگیا جو نیچے شاگرد پیشہ میں مورچہ بند تھے اور تمنچہ کے اپنے باقی کارتوس خالی کردئے۔ رات تک برابر ہم نے مدافعت کی مگر جب مایوسی نظر آئی تو بوڑھی عادلہ خانم نے ہم سبھوں کو ایک مشورہ میں بلایا اور یہ طے پایا کہ شیخ محمود سے صلح کرلیجائے اور انگریزوں کا ساتھ بالکل چھوڑ دیا جائے۔ جب انگریزوں کی فوج کبھی واپس آئیگی تو دیکھا جائے گا۔ مخالفین سے فوراً ہی نامہ و پیام شروع ہوا اور آٹھ بجے رات کو لڑائی بند کردی گئی۔ مخالف جماعت کے سردار حمید بیک نے کہلا بھیجا کہ وہ کل صبح عادلہ خانم سے ملاقات کریں گے۔ صبح صلح کی کانفرنس ہوئی۔ حمید بیک خود عادلہ خانم کے پاس آئے قہوہ کا دور چلا۔ اور انھوں نے یہ عہد کیا کہ وہ عادلہ خانم ان کے خاندان اور ان کے ساتھیوں سے کوئی سروکار نہ رکھینگے البتہ وہ کسی انگریز کو پناہ نہ دیں۔ اور اگر اسوقت کوئی موجود ہو تو اس کو حوالہ کردیں۔ اس وقت میں ہی ایک انگریزیت کا مجرم تھا۔ اور میرے حوالہ کئے جانے پر صلح منحصر تھی۔ میں نے خانم سے کہا کہ آپ کچھ نہ گھبرائیں اور میرے خاطر اپنے اور اپنی قبیلہ کو زحمت میں نہ ڈالیں۔ میں موقع پاتے ہی یہاں سے نکل جاؤنگا۔ انھوں نے کہا کہ میں ہرگز نہ جانے دونگی خواہ کچھ ہو۔ مگر میں نے ارادہ

کرلیا تھا کہ رات کو میں چپ چاپ نکل جاؤنگا۔ شام کے وقت میں نے کردی لباس پہنا اور چپکے بغیر کسی اطلاع کے کوہستان اور امان کیطرف چل کھڑا ہوا۔ ارادہ تھا کہ بیارہ کے شیوخ جنکا اوراماں کے کردوں پر بہت ہی روحانی اثر ہے ان کے پاس پہونچکر ان کی امداد سے سنائر اور کرمانشایاں کی طرف سے بغداد واپس ہوجاؤنگا مگر اندھیری رات میں بھٹکتا بھٹکتا کہیں سے کہیں نکل گیا۔ اور صبح کو اوراماں گردوں میں پڑکر پھر واپس پاگیا۔ اور حمید بک کے سامنے پیش ہوا۔ انھوں نے مجھے تا صدور حکم قاضی محبوس کرنے کا حکم دیا۔ اور میری رہائی اس وقت ہوئی جب انگریزوں کے ریلیف فورس نے سلیمانیہ کو دوبارہ فتح کیا۔ میں نے اس واقعہ کا ذکر یوں کیا ہے کہ جسوقت میں ٹرکی سے بغداد کو واپس ہوا تو میرے پاس سوائے ایک اوورکوٹ اور تین مہینے کی تنخواہ کے جو قصر شیرین آتے آتے تک ادھیا گئی تھی دنیا کی کوئی ایسی چیز نہ تھی جسکو میں اپنی کہہ سکتا

بغداد واپس ہوتے ہوتے یکایک مجھے خیال آیا کہ ایران ہوتے ہوئے ہندوستان کو براہ بلوچستان واپس ہوں۔ اور اس واسطے اپنی اس خاص جبلی طبیعت سے مجبور ہوکر کہ میرے دل میں جب کوئی منصوبہ خواہ کیسا بھی خطرناک یا ناممکن کیوں نہ آجائے اسپر بڑا سوچے سمجھے عمل کرنے لگتا ہوں۔ میں فوراً ہی قصر شیریں روانہ ہوگیا جب قصر شیریں پہونچا تو اس وقت مجھے خیال آیا کہ میں نے اپنی مالی حالت کا جائزہ پہلے سے کیوں نہ کرلیا تھا۔ اور ایران سے ہندوستان تو ہزاروں میل دور ہے۔ بہرحال قصر شیریں میں تو آہی گیا ہوں لاؤ اپنے پرانے دوستوں سے ملتا چلوں۔ اور اگر ممکن ہو تو ان سے قرض لیلوں میں سیدھا استاد شاما کی دوکان پر پہنچا مگر قصر شیریں اس مدت میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ ان کی دوکان جسکے آگے ایک پیتل کا گھنٹا لٹکا کرتا تھا اور جس کے ذریعہ سے وہ اپنی دوکان کا اشتہار دیا کرتے تھے اس کی ہئیت بالکل بدلی ہوئی تھی۔ اور اس کی دوکان پر ایک دلاک قابض تھا۔ آس پاس کئی ایک نئے قہوہ خانے بن گئے تھے۔ جہاں بڑا مجمع تھا اور ہر طرف ایسی چہل پہل تھی اور ایسی اجنبی صورتیں نظر آرہی تھیں کہ استاد شاما کا پتہ لگانا مشکل تھا۔ میں ان کے مکان پر گیا وہ بھی دوسروں کے قبضے میں پایا۔ تلاش و جستجو کے بعد ایک بوڑھے ہمسایہ کرد سے معلوم ہوا کہ استاد شاما کئی سال ہوئے کرمانشاہان چلے گئے ہیں اور ان کا قیام وہیں ہے۔

اب میرے پاس اتنا بھی نہ تھا کہ قصر شیریں سے بغداد واپس جاتا سخت پریشان تھا میرزا حسین خاں متوفی جو اس وقت انگریزوں کی طرف سے قصر شیریں میں وکیل تھے ان کے پاس گیا۔ وہاں مجھے معلوم ہوا کہ گمرگ خانہ انگریزی میں ارمنی مدیر جو عراق کی بغاوت کے دوران میں بہت سا روپیہ لیکر فرار ہوگیا ہے اس کی جگہ خالی ہوئی ہے۔ میں وہاں پہونچا انگریز کلکٹر آف کسٹمس سے ملا اور بغداد سے چند روز کے بعد میرا تقرر گمرگ خانہ کے قائم مقام مدیریت پر منظور ہوگیا۔

ایک دن میں بغداد کے مال درآمد کا جائزہ لے رہا تھا۔ کہ قند اور چائے کی متعدد بوریوں پر جو بغداد سے کرمانشاہان بھیجی گئی تھیں۔ مجھے یہ پتہ لکھا ہوا نظر پڑا "مرزا شاہ مراد خاں خیابان لالہ زار۔ کرمانشاہان۔ میں اس نام پر غور کر رہا تھا کہ پیچھے سے میری پیٹھ پر کسی نے بڑی زور سے تھپکی دی۔ مڑکر دیکھتا ہوں تو استاد شاما خود زرق برق لباس میں موجود ہیں۔ جب وہ ہماری پیشانی کو کئی بار چوم چکے تو اپنی سرگزشت ان مختصر الفاظ میں سنائی۔

چوں عربہا در عراق شلوق کردند۔ من خانقین رفتہ بودم کہ قند و چاے بخرم۔ پس گروں ما در قصر شیریں بود کہ ہمہ راہ تجارت بر ایران بستہ شد و قند بہ دو تومان ایک کلہ شد بجان شما جلے فائدہ بردم۔ وحالا من زنگیں ہستم"

اگر استاد شاما چند روز پہلے مجھ سے ملے ہوتے تو میں ضرور ان سے دس تومان دوا لا کر ان سے کچھ مالی امداد کی درخواست کرتا مگر اب مجھکو اس کی حاجت نہ تھی اور نہ میں نے اس دس تومان یا دولانے کی ضرورت سمجھی۔ بعد کو جب میں مادام مسریکو دیچ میگریڈیشن کی زلف میں بند ہکر باد کو بہ روس گیا اور راستے میں کرمانشاہان پڑا تو استاد شاما کا پتہ لگانے کرمانشاہاں کے خیابان میں دوبارہ گیا مگر معلوم ہوا کہ وہ باہر گئے ہوئے ہیں۔

ابن السبیل

فلسفۂ مذہب

(سلسلۂ ماسبق)

قدیم یونانیوں میں سب سے پہلے تناسخ کے عقیدہ پر جس نے کلام کیا ہے وہ فریکیڈیس ہے اور اس کے بعد فیثاغورث جو فریکیڈیس کا شاگرد ہے اور اس عقیدہ کا سب سے بڑا مشہور حامی ہوا ہے۔ غالباً فیثاغورث نے اس خیال کو نہ خود پیدا کیا ہے اور نہ کسی غیر اقوام کے خیالات سے اخذ کیا ہے، بلکہ اس نے ارفیس کے مذہب کی تحریک سے اس کو یونان میں رواج دیا اور اس خیال کو پھیلانے کے لئے ایک جماعت کی تشکیل کی۔ اس کے بعد افلاطون نے اس کی مزید تائید کی۔ اپنی کتاب جمہوریت (The Republic) میں افلاطون نے اس مسئلے کو واضح کرنے کے لیے ایک تمثیلی قصہ بیان کیا ہے کہ ارمینیس (Armenius) کا لڑکا اپنے مرنے کے بارہ دن کے بعد معجزانہ طریقے سے زندہ ہو گیا اور اس نے اس عالم کی کیفیت بیان کی۔ وہ کہتا ہے کہ مرنے کے بعد وہ دوسروں کے ساتھ دار الفقدان میں پہونچا اور اس نے وہاں روحوں کو دیکھا کہ وہ اعراف اور بہشت سے نکل نکل کر واپس جا رہی ہیں، وہ ان کے ساتھ اس جگہ پر پہونچا جہاں یہ روحیں بجائے خود انسان یا حیوان کی صورت اختیار کرتی تھیں۔ وہاں اس نے ارفیس کی روح کو راج ہنس کی صورت میں تبدیل ہوتے ہوئے دیکھا۔ تھمراس (Thamyras) کو بلبل کی شکل میں اور اٹلانٹا (Atalanta) کو پہلوان کی صورت میں۔ اس نے دیکھا کہ انسان جانوروں کی صورت میں منتقل ہو رہے ہیں اور وحشی و پالتو جانور ایک دوسرے کی صورت میں ... اس کے بعد یہ روحیں چشمۂ حیات (Lethe) سے سیراب ہو کر ستاروں کی طرح اپنی پیدائش کی مناسب طریق ہونے کے لیے نکل گئیں۔ افلاطون نے اسی طرح کی اور بھی اوہامی اور فرضی باتیں اس کتاب اور اپنی دوسری کتابوں میں درج کی ہیں۔ افلاطون کے نزدیک ارواح کی ایک مقررہ تعداد موجود ہے اور دنیا میں جو پیدائش کا سلسلہ جاری ہے وہ محض انھیں روحوں کے تناسخ کا نتیجہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افلاطون نے عوام کے اوہام کو حسب عادت زیادہ وقعت دیکر اپنے خیالات کے مطابق بنانے کے لیے تھوڑی بہت ترمیم کر دی ہے۔ مگر ارسطو جو عوام کے اوہام کا دشمن تھا اس کا خیال معاد کی نسبت تناسخ کے بالکل خلاف ہے۔ یونان کے آخر زمانہ کے ادب و فلسفہ میں کہیں کہیں تناسخ کا پتہ چلتا ہے۔ رومیوں میں بعض کی تحریر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال ان میں بھی کہیں کہیں پایا جاتا تھا مثلاً اینس (Ennius) نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اس نے ہومر کو خواب میں دیکھا اور ہومر نے اس سے کہا کہ میری روح پہلے جنم میں مور کے اندر تھی۔ تناسخ کا خیال کہیں کہیں پلاٹینس (Plotinus) اور مشرقیین (Neo-Platonists) کے آخری زمانہ میں بھی پایا جاتا ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے بعض فرقوں میں بھی تناسخ کے خیال کا پتہ چلتا ہے۔ اور مسلمانوں کے بعض فلاسفہ و صوفیہ میں بھی یہ خیالات پائے گئے ہیں۔ اور موجودہ زمانے میں تھیوسوفسٹ

کے مرنے نے اس خیال کو اپنا خاص عقیدہ بنا لیا ہے۔ مگر سوائے تھیوسوفسٹ اور ہنود کے مذہب سے علیحدہ ہو کر کوئی صاحب فراست تناسخ کے مسئلے کو ماننے کے لئے طیار نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک ہندوؤں کے مسئلہ تناسخ کا تعلق ہے وہ اوہام سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا (یعنی انسان اپنے اعمال کی بدولت کبھی نباتات کبھی حیوانات میں جنم لیتا ہے) کیونکہ اس کے معنی یہ ہوئے کہ نظام عالم کے لئے ضرورت ہے کہ انسان لازمی طور سے بدی کرے تاکہ نباتات وجمادات وحیوانات (جن کے بغیر عالم کا وجود ممکن نہیں) پیدا ہوتے رہیں۔ البتہ تھیوسوفسٹ جو انسان کی روح کو دوسرے جنم میں انسان ہی کے اندر منتقل ہونا تسلیم کرتے ہیں اور جمادات وحیوانات ونباتات کو غیر ذی روح جانتے ہیں ان کے خیالات ایک حد تک قابل توجہ ہیں یہ ضرور ہے کہ دنیا میں سوسائٹی کے اندر جو تفاوت پایا جاتا ہے وہ خدا کے انصاف پر انسان کو بادی النظر میں مشتبہ کر دیتا ہے۔ اور یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک کوڑھی یا مادرزاد اندھے کا کیا قصور ہے کہ وہ کوڑھی یا اندھا پیدا کیا گیا۔ یا ایک شخص غریب گھرانے میں کیوں پیدا کیا گیا۔ اور دوسرا راجہ کے یہاں کیوں پیدا ہوا۔ مگر یہ تناسخ کے ماننے سے بھی حل نہیں ہو سکتا انسان نہیں جانتا کہ وہ پہلے کیا تھا اور اس نے کیا کیا تھا جب اس کو اپنے پہلے جنم کی خبر ہی نہیں تو اس کا اس پاداش میں مبتلا ہونا لغو اور بے معنی ہے حقیقت تو یہ ہے کہ اگر انسان کو اپنے پہلے جنم کی کچھ خبر نہیں تو تناسخ کا مسئلہ سرے سے حیات بعد الممات کو ہی ختم کر دیتا ہے اور مرنے کے بعد انسان بالکل اسی طرح گم ہو جاتا ہے جیسا مادئین خیال کرتے ہیں۔ ہم دکھلا چکے ہیں کہ حیات بعد الممات ہی پر مذہبی خیال کی ابتدا ہے اور ہماری ہستی ہماری گزشتہ یا دیر موقوف ہے اگر ہمکو پچھلی یاد کچھ بھی نہیں تو ہماری موجودہ ہستی کو کسی پچھلی ہستی سے ملانا محض بے سود وعبث ہے۔ اس کے علاوہ اگر یہ عقیدہ محض انسان کی تسلی کیلئے ہے تاکہ وہ قناعت پسند ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ انسان کی وہ بڑی مصیبتیں جن پر اس کی ترقی کا دارومدار ہے وہ بیکار ہو جائیں گی۔ اور روح کا اس طرح چکر دیا جانا بے نتیجہ ہو گا۔ بدی دنیا میں ویسی ہی موجود ہے۔ جیسے پہلے تھی۔ اگر ایک نیک شخص مرنے کے بعد راجہ بن کر دوسرے جنم میں پیدا ہوا تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ راجہ اب کی بار اور زیادہ نیک بنکر دوسرے جنم میں مہاتما پیدا ہو گا۔ بہت ممکن ہے بلکہ اغلب ہے کہ وہ پھر برائی کرے اور دوسرے جنم میں پھر ذلت ونکبت میں مبتلا ہو۔ غرضکہ اس چکر نے نظام دنیا کے مکروہات میں کوئی کمی نہیں کی۔ اگر اس چکر کا کوئی آخری نتیجہ ہے تو وہ دنیا کی ایک ہی زندگی کے بعد اسی طرح حاصل ہو سکتا ہے اور اگر اس کی کوئی انتہا نہیں ہے تو انسان کی فطرت جو راحت دائمی کی خواہش مند ہے یہ صورت مشکل سے پسند کریگی۔

ایک اور بڑی فاحش غلطی جو تناسخ ——— کے ماننے والوں کے ساتھ بعض وہ لوگ بھی کرتے ہیں جو صرف حشر روح بلا جسم کے قائل ہیں وہ یہ ہے کہ روح جیسا ان کا خیال ہے بالکل ایک علیحدہ اور خود مختار چیز نہیں ہے روح کی حالت یقیناً ایسی نہیں ہے کہ اس کا تعلق اپنے جسم سے محض لباس کی طرح ہو۔ موجودہ سائیکالوجی کے اصول سے جسم و روح کے لگاؤ کے ساتھ ہی انسان کی ہستی پیدا ہوتی ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ روح ایک جسم (مثلاً جان کی جسم) سے نکل کر دوسرے جنم (بیوی کے جسم) میں چلی جائے تو وہ اپنی موجودہ حالت میں اس کی بیوی کے بجائے اس کی ماں ہو جائیگی اور اس کے ادراک میں فرق نہ ہو گا۔ حالانکہ اگر جسم محض روح کا لباس ہو تو ایسی صورت میں ایک فلاسفر کی روح کتے کے جسم میں داخل ہو کر اس کتے کو بہت بڑا نکتہ رس فلسفی بنا دے

مگر جیسا ہم نے دکھلایا ہے تناسخ کا عقیدہ انسان کے ایام وحشت کے ادنیٰ خیالات سے پیدا ہوا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جو مذاہب تناسخ کو اصولاً مانتے ہیں ان کے ہاں بھی بہشت و دوزخ کا خیال موجود ہے۔ تناسخ کے مسئلے کو ترک کرنے کے بعد دنیا کے تمام مذاہب معاد کی نسبت ان تین خیال پر متفق ہیں

(۱) روز قیامت

(۲) حشر

(۳) سزا و جزا۔ یعنی ایک دن تمام تمام انسان خدا کے سامنے حاضر ہوں گے۔ خدا ان کے درمیان فیصلہ کریگا اور ان کے اعمال کے مطابق ان کو بہشت و دوزخ میں بھیجیگا۔ بہشت وہ جگہ ہے جہاں دنیا کی تمام مسرتیں جن کا ہم تصور کر سکتے ہیں، نیک انسانوں کو عطا ہونگی اور دوزخ وہ جگہ ہے جہاں بدارادرج سخت عذاب سے دوچار ہونگی سب سے زیادہ صراحت قیامت و دوزخ و بہشت کی قرآن کی آیات مکیہ میں ہے تالمود۔ بائبل اور مجوسیوں میں بھی یہی خیالات ہیں اگرچہ فروع میں کچھ فرق ہے اور دوزخ کی سختیوں کو تقریباً ان تمام کتب نے آگ میں جلنے سے مشابہت دی ہے بلکہ قرآن میں اس کثرت کے ساتھ جہنم کی آگ کا ذکر ہے کہ اس کے لئے اور کوئی تاویل کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اور اس کی ہولناکی سے انسان کے بدن میں رعشہ پڑجاتا ہے اور خدا کی نسبت یہ وہم گزرتا ہے کہ وہ ہماری دنیا کے ایک جابر اور بدلہ لینے والے خونخوار کینہ پرور شخص کے مانند ہے۔ جو ہماری کمزوریوں کو اس سختی سے گرفت کریگا گویا کہ ہمارے ان اعمال نے اس کو کسی طرح کا نقصان پہونچایا ہے اور اس کے دل میں ہماری طرف سے ایسا بغض ۵۱ الدیا ہے کہ ابدالاباد تک ہم کو جلا کر خاک سیاہ کرنے پر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوگا۔ جہنم کی ہولناکیوں کا ذکر قرآن میں اگر کوئی اور معنی نہیں رکھتا ہے تو ہم مجبوراً اس بات کا اعتراف کریں گے کہ عقل و فطرت انسانی ایسے بغض رکھنے والے اور ہم کو جلا کر تسکین پانے والے خدا سے ضرور ابا کریگی اور اس حیثیت سے یا تو خدا کی صفات رحم و کرم بے معنی ہوجائیں گے یا پھر خدا کی نسبت یہ تصور لامحالہ ہوگا کہ اس کا یہ قہر اس کے خود ضعف و کمزوری کا نتیجہ ہے اور گویا انسان اس کا ایک مدمقابل دشمن ہے۔ نعوذ باللہ۔

جہاں تک قیامت کا سوال ہے وہاں تک تو عقل اس کو تسلیم کرنے میں کوئی مشکل نہیں پاتی کہ دور انقلابات عالم ایک وقت میں دنیا کو غیر آباد و منجمد بنادیگا جبکہ یہ عظیم الشان پہاڑ ذرے ذرے ہوجائیں گے اور ستارے آفتاب ماہتاب بلکہ تمام نظام عالم درہم برہم یا آپس میں ٹکرا کر پاش پاش ہوجائیگا۔ اس کے بعد پھر ایک نئے آسمان اور نئے زمین کی بنیاد پڑیگی اور اس عالم میں ہم اپنی ہستی کو گم کئے بغیر لا کر کھڑے کئے جائیں گے۔

اس وقت ہمارے پچھلے اعمال تولے جائیں گے۔ اور ہماری کوتاہیاں جو دنیا میں باقی رہ گئی ہیں وہ دارالجزا میں پوری کیجائیں‌گی مگر عقل جس امر سے منحرف ہوتی ہے وہ سزا و جزا کی وہ صورت ہے جو الہام نے بیان کی ہے (اور احادیث کی روایت سے) اور جن کی بنا پر

۵۱ حاشا وکلا میں حدیث پر تمسخر نہیں کرتا۔ صرف اپنے فقہا کی سمجھ پر ہنسی آتی ہے۔ ابوہریرہ کی یہ روایت کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کی طرف نظر اٹھا کر رحمت سے نہ دیکھیگا جو اپنی ازار کو اس قدر لانبا بناتے ہیں کہ گھسٹ کر چلے وغیرہ یہ درحقیقت یہودیوں کے متعلق ایک کنایہ ہے (باقی صفحہ آئندہ)

خدائے تعالیٰ ہمارے پائجامے اور ازار کے لانبے ہونے پر بھی آپے سے باہر ہوجاتا ہے اور محض اس تصور پر ہمکو دوزخ میں جھونکنے کے لئے تیار ہوجاتا ہے' قبل اس کے کہ ہم اس کے جواب میں کچھ اپنی طرف سے کہیں۔ ہم علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب الکلام سے انکی مفصل بحث اس مسئلہ پر یہاں نقل کریں گے

"سزا اور جزا کے متعلق تمام اہل مذاہب کا یہ خیال تھا اور آج بھی ہے کہ انسان جب خدا کے احکام کی تعمیل نہیں کرتا تو خدا اس سے ناراض ہوجاتا ہے۔ اور چونکہ دنیا دار العمل ہے اس لئے یہاں تو انسان کو سزا نہیں ملتی۔ لیکن جب قیامت میں خدا مسند حکومت پر متمکن ہوگا تو تمام معاملات اس کے حضور میں پیش ہوں گے۔ اور خدا حسب مراتب لوگوں کو انکی نافرمانیوں کی سزا دیگا۔ اسیطرح جن لوگوں نے اطاعت اور فرمانبرداری کی ہے۔ ان کو علی قدر مراتب انعام ملیں گے۔

یہ خیال عام طبائع کے بالکل مناسب ہے اور عام لوگوں کو نیکی کی طرف مائل کرنے اور برائی سے روکنے کے لئے اس سے بہتر کوئی طرز نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہ عذاب وثواب کی اصلی حقیقت نہیں ہے بلکہ اصل حقیقت کے عام فہم کرنے کا ایک پیرایہ ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ جس طرح عالم جسمانیات میں اسباب و علل اثر و تاثر کا سلسلہ ہے بشلاً سنکھیا قاتل ہے۔ گلاب محرک نزلہ ہے املتاس مسہل ہے اسی طرح یہی سلسلہ روحانیات میں بھی قایم ہے۔ نیک و بد جس قدر افعال ہیں ان کا نیک و بد اثر روح پر مرتب ہوتا ہے اچھے کاموں سے روح کو انبساط ہوتا ہے برے افعال سے انقباض اور آلودگی اور نجاست کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور یہ وہ نتائج ہیں جو اس سے جدا نہیں ہوسکتے۔ فرض کرو کہ ایک شخص نے کسی کی ایک چیز چرائی۔ اب اگر وہ شخص جس کی وہ چیز تھی معاف بھی کردے تو چوری کرنے سے اس شخص کی عزت پر جو داغ آگیا ہے وہ کسی حالت میں ضائع نہیں ہوسکتا۔ غرض اچھی روح میں جو سعادت کا اثر پیدا ہوتا ہے اور برے کاموں سے جو شقاوت حاصل ہوتی ہے اسی کا نام عذاب وثواب ہے اور یہ خود ان افعال کا لازمی اثر ہے۔ امام غزالی مضنون علی غیر اہلہ میں لکھتے ہیں۔

"امر و نہی کی خلاف ورزی پر جو عذاب ہوگا۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ خدا کو غصہ آئیگا اور وہ انتقام لیگا۔ بلکہ اس کی مثال یہ ہے کہ جو شخص عورت کے پاس نہ جائیگا۔ اس کے اولاد نہ ہوگی۔ طاعت و معصیت کیوجہ سے قیامت میں جو عذاب وثواب ہوگا اس کی بالکل یہی مثال ہے۔ لہذا یہ سوال کرنا کہ گناہ سے عذاب کیوں ہوتا ہے۔ گویا یہ سوال کرنا ہے کہ زہر کھانے سے جاندار کیوں مرجاتا ہے۔"

امام صاحب نے اسی کتاب میں یہ بھی تصریح کردی ہے کہ خدا نے جن باتوں کا حکم دیا ہے یا جن باتوں سے روکا اس کی

جو آنحضرت کے زمانے میں تھے۔ اور دولت کے غرور میں اپنے ازار کو عربوں سے زیادہ لانبی رکھتے تھے۔ یہودیوں کا یہ تفاخر تھا۔ جس کو غالباً ابوہریرہ نے خود دیکھ کر آنحضرت کا ایک قول حسب عادت بیان کردیا۔ یہودیوں کی اس عادت کا ذکر انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ہے۔ میں حدیث کی اکثر روایات کو صحیح جانتا ہوں۔ لیکن صرف تاریخ و سیر و مغازی میں مذہبی اصول میں قرآن کے سوا کسی دوسری کتاب کی سند نہیں لیتا۔ کیونکہ قرآن کے سوا ہر دوسری کتاب میں صحیح و غلط روایت کا احتمال ہے۔ س۔م۔ا

مثال یہ ہے کہ جسطرح ایک طبیب کسی بیمار کو دوا کھانے اور مضر چیزوں سے پرہیز کرنے کا حکم دیتا ہے۔ مریض اگر طبیب کے حکم کے موافق عمل نہیں کرتا تو اس کو ضرر ہوتا ہے۔ یہ ضرر صرف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ مریض نے بد پرہیزی کی۔ لیکن عام طور پر لوگ کہتے ہیں کہ مریض نے چونکہ حکیم کی نافرمانی کی۔ اس لئے ضرر ہوا۔ حالانکہ ضرر کی اصلی علت بد پرہیزی ہے۔ فرض کرو کہ طبیب بد پرہیزی سے منع نہ بھی کرتا تاہم بد پرہیزی کرنے سے ضرر ہوتا۔ اسی طرح خدا گناہوں کے ارتکاب سے منع نہ بھی کرتا۔ تاہم ان گناہوں کے ارتکاب سے روح کو وہی صدمہ و عذاب ہوتا۔

ملاحدہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ خدا کو گنہگار پر عذاب دینے سے کیا حاصل۔ یا سزا یا انتقام وہ شخص لیتا ہے جسکو کسی قسم کا نقصان پہونچا ہو یا پہونچنے کا اندیشہ ہو۔ اور خدا اس سے بری ہے۔ اگر تمام عالم فسق و فجور میں پڑ جائے یا نماز روزہ بجا نہ لائے تو اس سے خدا کا کیا بگڑتا ہے۔ اس صورت میں انتقام لینا بے فائدہ ہے۔ ملاحدہ یہ بھی کہتے ہیں کہ درحقیقت تمام اہل مذاہب نے خدا کا تصور بالکل انسانی حیثیت سے کیا ہے اور چونکہ وہ دیکھتے ہیں کہ دنیا کے بادشاہوں و احکام کی نافرمانی سے سخت طیش و ملال ہوتا ہے اور وہ مجرم کو نہایت سخت سزائیں دیتے ہیں۔ اس لئے اہل مذاہب نے خدا کی نسبت بھی یہی خیال قایم کیا کہ وہ گناہوں سے ناراض ہوتا ہے اور قیامت میں گنہگاروں کو دوزخ میں گوناگوں عذاب دیگا۔ لیکن عذاب و ثواب کی جو حقیقت ہمنے بیان کی ہے اس کو ملحوظ رکھا جائے تو ملاحدہ کا اعتراض خود بخود اٹھ جاتا ہے۔

اسلام نے عذاب و ثواب کے متعلق عام طور پر اگرچہ بیان کا وہی پیرایہ اختیار کیا ہے جو تمام اہل مذاہب کا تھا اور علم طبائع کے لئے وہی طریقہ ناگزیر بھی تھا۔ لیکن اس باب میں اسلام کو جو ترجیح ہے وہ یہ ہے کہ اسلام نے اصل حقیقت بھی صراحتاً اور کنایۃً ظاہر کردی یہ ہی وہ خصوصیت ہے جو ہر موقع پر اسلام کو تمام اور مذاہب سے ممتاز کرتی ہے۔ تمام دیگر مذاہب میں صرف عوام کی تلقین و ہدایت کا لحاظ ہے۔ اصل حقیقت سے یا خود بانیان مذہب بے خبر تھے یا اگر باخبر تھے تو وہ خواص کی تعلیم و تربیت کو اپنا مقصد نہیں قرار دیتے تھے بخلاف اس کے اسلام تمام دنیا کی ہدایت کے لئے آیا جس میں عالم و جاہل احمق و ناداں عارف و عامی۔ زاہد و صوفی۔ ظاہر پرست و کلیم سب داخل تھے۔

عذاب و ثواب اور معاد کی اصل حقیقت کی طرف قرآن مجید میں جا بجا اشارے ہیں۔ بلکہ تصریحات پائی جاتی ہیں۔

"كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ" ہاں اگر تم کو علم یقین ہوتا تو تم دوزخ کو دیکھ لیتے۔ امام غزالی جواہر القرآن میں اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔ "اِنَّ الْجَحِيمَ فِي بَاطِنِكُمْ" یعنی دوزخ خود تمہارے اندر موجود ہے۔

ایک اور مقام پر ہے۔ "وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكَافِرِينَ" (کفار تجھ سے کہتے ہیں کہ عذاب جلدی آیا حالانکہ دوزخ نے کافروں کو ہر طرف سے چھپا لیا ہے)

امام غزالی اس آیت کے متعلق جواہر القرآن میں لکھتے ہیں۔ "وَلَمْ يَقُلْ اِنَّهَا سَتُحِيطُ بَلْ قَالَ هِيَ مُحِيطَةٌ" (خدا نے یہ نہیں کہا کہ دوزخ آئندہ محیط ہو جاویگی۔ بلکہ یہ کہا کہ ابھی اسوقت محیط ہے)

ایک اور جگہ قرآن مجید میں ہے

"اِنَّا اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِیْنَ نَارًا اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا" ہم نے ظالموں کے لئے ایسی آگ مہیا کر رکھی ہے جس کے پردوں نے ظالموں کو گھیر لیا ہے۔ امام غزالی اس کے متعلق کہتے ہیں "وَلَمْ یَقُلْ یُحِیْطُ بِهِمْ" (خدا نے یہ نہیں کہا کہ آئندہ گھیر لیگی)

امام صاحب ان آیتوں کی یہ تفسیر لکھ کر کہتے ہیں۔

"قال لم تفهم المعانی کذلک فلیس لک نصیب من القرآن الا فی قشوره کما لیس فی البهیمة نصیب من البر الا فی قشره"

(تو اگر تم مطالب کو اس طرح نہیں سمجھتے تو تم کو قرآن سے صرف اس کا چھلکا ہاتھ آیا ہے جس طرح بہائم کو گیہوں میں سے صرف بھوسی ہاتھ آئی ہے)

مگر امام غزالی کی ان تاویلات سے قرآن کی وہ آیتیں جن میں دوزخ کا نقشہ ایسی صورت میں کھینچا گیا ہے کہ دوزخیوں کے کپڑے تارکول سے پوتے گئے ہیں اور وہ مشعل کی طرح جل رہے ہوں گے اور جب انکی موٹی کھال جل جاویگی تو اللہ نئی کھال پیدا کر دیگا۔ دوزخ کے اندر وہ شدت عذاب سے چیخیں گے۔ چلائیں گے وہ زنجیروں سے بندھے ہوں گے اور ان پر آتشیں گرز پڑ رہے ہوں گے۔ غرضکہ قرآن کا نقشہ ایسا ہے جو اس قسم کی تاویلات سے محو نہیں ہو سکتا۔ یہ ضرور ہے کہ خود دوزخ۔ برزخ۔ بہشت۔ جہنم۔ فردوس۔ عدن وغیرہ کے الفاظ عجمیوں اور یہودیوں کے اصطلاحی الفاظ ہیں۔ اور قرآن نے بہشت و جہنم میں نہ صرف پارسیوں اور یہودیوں کی بہشت و دوزخ کی تعریف زیادہ فصاحت سے کی ہے بلکہ انھیں کے اصطلاحی الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔ جہنم دراصل فلسطین میں ایک مقام تھا جہاں پچھلے زمانے میں "ملوک" ([illegible]) دیوتا کے سامنے چھوٹے بچے قربان کئے جاتے تھے اور بعد کو یہودیوں کے زمانے میں وہاں مجرمین کی لاشیں پھینک دی جاتی تھیں۔ یہ ایک مرکب لفظ "جے" یا "گے" بمعنی وادی اور "ھنام" اسم معرفہ سے بنا ہے۔ دوزخ و برزخ و فردوس و بہشت تو قطعی عجمی الفاظ ہیں عدن اس زمین کا نام تھا جو دجلہ و فرات کے درمیانی نشیب میں واقع ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب میں بہشت و دوزخ کا تصور اگر پہلے سے موجود تھا تو وہ مجوسیوں، یہودیوں اور نسطوری عیسائیوں کے ذریعے سے آیا تھا۔ اور قرآن نے اس خیال میں کوئی کمی نہیں کی۔ بلکہ اس کو اور ہیبت ناک طریقہ سے ظاہر کیا تاکہ عربوں کے اجڈ اور سخت دل میں خشیت پیدا ہو۔ ایسا ہوا ہے کہ جب تک قوموں کی اصطلاح ان کے پرانے عادات و خیالات کے ذریعہ سے ممکن ہو سکتی تھی یا ان کے وہ خیالات کفر و شرک کو نہیں پہونچتے یا ان سے اخلاق و نظام معاشرت و تمدن میں کوئی خلل واقع نہ ہوتا تھا تو الہام ان کے افکار و عادات سے کوئی تعرض نہیں کرتا۔ مثلاً عرب کے لئے حج و عمرہ بہ یادگار سیدنا ابراہیم یا حبشیوں کی پسپائی کی قومی یادگار جو وہ ہر سال رمی جمار کی صورت میں کرتے تھے، یا اپنی مورث اعلیٰ یا حضرت اسمٰعیل و حضرت ہاجرہ کی بیابان مکہ میں پانی کے تلاش میں سرگردان پھرنا اور چاہ زمزم کا دریافت کرنا جو "سعی صفا و مروہ" کی صورت میں کرتے تھے، یا سور کے گوشت سے پرہیز کرنا، یا عقیقہ وغیرہ الہام نے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا صرف اتنا کیا کہ جہاں کہیں ان قومی عادات میں شرک و کفر کا میل آگیا تھا ان کو نکال دیا اسی طرح یہودیوں میں رسم بخور و قربانی جو کفار کنعان کا پرانا طریقۂ عبادت تھا۔ اس سے کوئی تعرض نہ کیا گیا۔ بلکہ صرف بتوں کے آگے

سے ہٹاکر ان عبادات کو ایک غیر مرئی خدا کی طرف رجوع کردیا مگر واقعہ یہ ہے کہ عرب جاہلیت میں قرآن کے رو سے حیات بعد الممات کا کوئی عقیدہ نہیں ملتا اور اس خیال کی ابتداء عرب میں اسلام ہی سے ہوئی ہے۔ اس لئے الہام نے بہشت و دوزخ کے اصطلاحی الفاظ و تعریف میں ان ہی باتوں پر اکتفا کیا ہے۔ جو عرب یہودیوں یا مجوسیوں سے سن چکے تھے اور بقول علامہ شبلی روحانیت کو جسمانیت کے پیرایہ میں ادا کیا ہے۔ اور یہ طریقہ تمام مذاہب میں مشترک ہے۔ انسان صرف ان چیزوں کا تصور کرسکتا ہے جو اس نے حواس سے محسوس کی ہوں۔ اس لئے جب ان چیزوں کا بیان کرنا ہو جو آئندہ زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور تصور سے بالاتر ہیں تو ضرور ہے کہ ان کو جسمانیات کے پیرائے میں ادا کیا جائے۔ مثلاً موت کے بعد جو راحت و رنج ہوگا۔ اس کو بجز اس کے کہ باغ و انہار اور کژدم و مار سے تعبیر کیا جائے اور کیا طریقہ ہے۔ ابن تیمیہ ٹھیٹ ظاہری ہیں لیکن ان کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ "پھر خدائے پاک نے ہم کو اس آرام و رنج کی خبر دی جس کا قیامت میں وعدہ کیا ہے اور وہ اس طرح کہ طعام، شراب۔ ازدواج وغیرہ کا ذکر کیا تو اگر اس قسم کی خبروں سے ہم دنیا میں واقف نہ ہو چکے ہوتے تو ان موعودہ چیزوں کو کیونکر سمجھ سکتے۔ تاہم ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ چیزیں دنیاوی چیزوں کے مانند نہیں ہیں، یہاں تک کہ حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ دنیا اور آخرت کی چیزوں میں سوائے نام کے کسی چیز میں مشارکت نہیں"

مولانا روم نے اس مضمون کو مختلف موقعوں پر نہایت عمدہ مثالوں سے ادا کیا ہے۔

ہیچ ماہیات اوصاف کمال	کس نداند جز بہ آثار و مثال
طفل ماہیت نداند طمث را	جز کہ گوئی ہست چوں حلوا ترا
طفل را نبود ز وطی زن خبر	جز کہ گوئی ہست آں خوش چوں شکر
کے بود ماہیت ذوق جماع	مثل ماہیات حلوا اے مطاع
لیک نسبت کرد از روے خوشی	با تو آں عاقل کہ تو کودک وشی

مگر سوال یہ ہے کہ یہ مسرت و اذیت روحانی ہو یا جسمانی ہنگامی ہوگی یا دوامی۔ بہشت کے لئے دوامی ماننا تو فطرت انسانی کیلئے قابل قبول ہے مگر دوزخ کے لئے دوامی ماننا خدا کی مصلحت و حکمت کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔ اگر ہم دنیا ہی کی مثالوں سے عالم ارواح کا تصور کریں تو یہ بات نہایت واضح اور بین ہے کہ انسان ابدالآباد تک کرب و تکلیف کا تحمل نہیں ہوسکتا اور نہ اس سے کوئی مفید نتیجہ برآمد ہوسکتا ہے۔ چنانچہ جب انسان پر سختی حد سے زیادہ ہوتی ہے تو موت اس سختی سے نجات دینے کے لئے آموجود ہوتی ہے۔ اگر عالم مابعد الموت ہماری موجودہ زندگی کے سلسلے میں ہے تو اس کے عواقب و نتائج یہ ہونے چاہیئے کہ جو ہستیاں دنیا میں اپنے افعال خبیثہ و مناہیات و منکرات سے آلودہ نہیں۔ ان کے لئے دوزخ ایک قسم کی مصلح ہو جہاں وہ روح کو آلائشوں سے پاک ہوکر بہشت میں داخل ہونے کے قابل بن سکیں۔ یہ صورت دل کو بہت لگتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ مگر قرآن نے دوزخ و بہشت میں "خلدین فیھا" کا ایک ہی جملہ استعمال کیا ہے۔ جس کے معنے ہمیشگی کے ہیں۔ ایسی صورت میں سب سے پہلا سوال تو یہ ہوگا کہ آیا دوزخ کے

مستوجب محض کفار ہی ہیں یا وہ مسلمان بھی ہیں[۱] جن کے اعمال کفار کی طرح ہیں۔ اگر محض لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے اقرار سے کافر و مسلم میں تفریق ہو سکتی ہے تو کیا وہ کروڑہا کروڑ انسان جو امریکہ و چین، یورپ و افریقہ میں بسے ہوئے ہیں اور جن کے مقابل مسلمان دس فیصدی بھی نہیں وہ سب دوزخ کے کندے ہیں۔ ایسی صورت میں تو خدا کا اصل مقصد آفرینش یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا انسان کو اس خوبی و حکمت سے بنانا کہ وہ بہترین مخلوقات بلکہ خلیفۃ الارض کہلائے محض اس لئے ہے کہ وہ سب آگ کے سپرد ہو جائیں پھر جب غیر مسلم کا آخری ٹھکانا صرف دوزخ ہے تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ غیر مسلم کے درمیان نیکی و بدی کی جزا و سزا کہاں پوری کی جائیگی۔ جب کہ وہ سب بلا تفریق دوزخ میں رہیں گے۔ اس لئے دل تو یہ کہتا ہے کہ بہشت دوزخ کی آبادی کے لئے مسلم و غیر مسلم کی تقسیم مناسب نہیں اور نہ قرین انصاف ہے کوئی اور تقسیم ہونی چاہیئے جو محض اعمال پر مبنی ہے۔ اور سب کا آخری ٹھکانا بہشت ہو کسی کو جلد کسی کو بدیر۔

امام جاحظ کا یہ قول قابل غور ہے کہ دوزخ کا عذاب "عذاب مقابلتہ" عذاب معلوم ہوگا۔ یعنی اہل دوزخ کی سختیاں اہل بہشت کو سختیاں معلوم ہونگی اور اہل دوزخ کو اہل بہشت کی حالت قابل رشک ہوگی۔ اس لئے کہ لذت و الم محض ایک تعریف مقابلہ ہے اور اس کا کوئی کلیہ نہیں ایک ہی چیز ایک شخص کے لئے عذاب ہے اور دوسرے کے لئے راحت اس کی مثال یوں ہے لوکہ ـــ دو شخص ایک نہایت ہی پر فضا مقام پر مقیم ہیں۔ جہاں آبشار ہے۔ ہرے بھرے میدان ہیں۔ نغمہ ہے اور ہر قسم کے لذائذ جو حواس خمسہ کو بھلے معلوم ہو سکتے ہیں موجود ہیں مگر ایک شخص دنیا کی آلام سے بے فکر ہے اور دوسرے کو یہ فکر ہے کہ چند روز کے بعد اسکو پھانسی ہو جائیگی یا اس کا دیوالہ نکل جائیگا یا اس قسم کی کوئی اور سخت فکر و پریشانی اُس کو دامنگیر ہے تو پہلے شخص کی راحت یقیناً دوسرے شخص کی راحت نہیں۔ حالانکہ دونوں ایک ہی مناظر سے فائدہ اٹھا رہے ہیں ایک بے غم ہے مگر دوسرا فکر میں ایسا غلطاں و پیچاں کہ اس کو یہ سب مناظر کاٹے کھاتے ہیں۔ تو در اصل کافر کی دوزخ یہ ہے کہ اس میں لطف و مسرت کی صلاحیت ہی باقی نہ رہیگی۔ وہ اپنے اعمال و عقائد کی بھیانک صورتوں کو دیکھ کر پیچ و تاب کھا رہا ہے اور جس طرح ہم کشمیر جنت نشان میں بیٹھ کر صحرائے افریقہ و عرب کے باد سموم میں جھلسنے والے انسانوں یا بحر منجمد کے تودوں میں پناہ لینے والی قوموں پر رحم کھاتے ہیں۔ گو خود وہ لوگ جو انھیں عناصر سے اُٹھے ہیں انکا احساس راحت و تکلیف یقیناً وہ نہیں ہے جو ہمارا ہے۔ یا جس طرح ایک نفیس طبیعت انسان کے حیات اور ایک حلالخور کے حیات میں زمین آسمان کا فرق ہو جاتا ہے کہ ایک شخص کا کام دوسرے کے لئے عذاب ہے اسی طرح بدکار و بداعمال لوگوں کی سزا یہی ہے کہ اُن کے خود اعمال انکی احساسات و ذہنیت کو اس طرح خراب کر دیں گے کہ وہ اپنے اندرونی کرب سے اپنے لئے ایک دوزخ بنا لیں گے۔

ہم آگ کے کیڑے کو آگ میں دیکھ یہ گمان کرتے ہیں کہ اس کو آگ کی وجہ سے تکلیف ہے جیسے ہم محسوس کرتے ہیں مگر اس کو

---

[۱] خوارج کا خیال تھا کہ اعمال سے بھی کافر و مسلم کی تفریق ہوتی ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ کبایر کا مرتکب ویسا ہی کافر ہے۔ جیسا غیر مسلم اور اس کی تائید میں وہ قرآن کی یہ آیت پیش کرتے ہیں۔ من قتل مومنا متعمدا فجزاوہ جہنم خالدین فیھا

کوئی تکلیف نہیں۔

خلاصہ یہ کہ خدا۔ تکوین۔ تقدیر و معاد مذہب کے ایسے مسائل ہیں جو ایک حد تک ناقابل فہم مگر ناگزیر مسلمات ہیں۔ اور معاد کے بارے میں جتنا ہم لکھ چکے ہیں۔ اس سے زیادہ عقل کام نہیں دیتی۔ نہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جس زمین پر دوزخ اور بہشت کا وجود ہوگا اس کا جغرافیہ کیا ہوگا۔ اس کے حدود اربعہ کیا ہوں گے۔ اس کا رقبہ کیا ہوگا۔ دونوں ایک دوسرے سے کس طرح جدا ہونگے کہ بہشتی، اپنے آرام کی جگہ سے دوزخی کی حالت کا موازنہ کر سکیگا۔ تکوین سے لیکر آخر تک جتنے انسان دنیا میں گزرے ہیں انکی جماعت کہاں سمائیگی۔ مگر جہاں تک معاد کا تعلق انسان کے سوشل اور اخلاقی ریفارم سے ہے وہ ایک ضروری حقیقت ہے۔ گو کہ خدا کی طرح ہم اس کی کیفیت سمجھنے سے قاصر ہیں۔ معاد کے بارے میں ہم آخر میں اتنا ہی کہ سکتے ہیں کہ انسانی فطرت اس خیال کی تائید میں ہے اور معاد ایک حقیقت ہے جس کی خبر الہام نے دی ہے اور یہ ویسی ہی ایک حقیقت ہے جیسے خدا کا وجود۔ مگر خدا کی طرح معاد کی کیفیت ہماری سمجھ سے باہر ہے اور جہاں تک ہماری سمجھ میں آسکتا ہے اس کو مثالاً الہام نے سمجھا دیا ہے۔

سید مقبول احمد

صدائے شکست

(افسانہ)

(سلسلۂ ماسبق)

چند روز سے راجکمار کی آمد و رفت ملہار راؤ کے ہاں زیادہ ہو گئی تھی اور بعض دفعہ گھنٹوں رجنا کے ساتھ تنہائی میں بیٹھنے کا موقعہ اسے مل جاتا تھا، لیکن سوائے اس کے کہ لکچر کی طیاری میں جس قدر خاموش مدد کی ضرورت ہو سکتی ہے، وہ تو ضرور دیدیتا تھا، اور اس کے علاوہ نہ وہ کسی اور گفتگو کی جراءت اپنے اندر پاتا تھا، نہ رجنا کی طرف سے اس کی ابتدا ہوتی تھی۔ مسودہ کی ترتیب کتابوں کا اقتباس تحریر و نقل کی خدمت وہ نہایت مسرت کے ساتھ انجام دیتا۔ لیکن جب کبھی ذاتی رائے کا موقعہ آتا، فنی تنقید کی ضرورت ہوتی تو وہ اس خیال سے کہ کہیں میری تعریف تحسین ناشناس بنکر رجنا کو برہم نہ کر دے، ہمیشہ خاموش ہی رہتا۔ حالانکہ رجنا میں اگر کوئی عیب تھا تو صرف یہ کہ وہ ذرا خوشامد پسند تھی، اپنی تعریف سے خوش ہوتی تھی اور اگر کبھی کوئی موقعہ نمود و نمائش کا ملجاتا تو اس کو ہاتھ سے نہ جانے دیتی۔ اس لئے وہ راجکمار کی خاموشی کا مطلب کبھی یہ سمجھتی کہ شاید وہ میرے کمال کا معترف نہیں ہے جس کو وہ اپنی توہین سمجھکر اک نوع کا جذبۂ احتراز اپنے اندر پرورش ہوتے ہوئے محسوس کرتی۔ وہ یہ ضرور جانتی تھی کہ راجکمار کی نگاہ نہایت خاموش پسندیدگی و نیایش ہو کر نکلتی ہے لیکن اس کو وہ کسی اور جذبہ سے متعلق سمجھتی تھی۔ اور یہ اس کو پسند نہ آتا تھا کہ دنیا عورت ہونے کے لحاظ سے اُسے دیکھے، موسیقی ہی اس کی زندگی تھی اور وہی فضا اس کی تمام جذبات کی دنیا تھی، اس لئے اگر اس حیثیت سے ہٹکر کوئی اسے دیکھنا چاہتا تو وہ دل میں ہنستی کہ دنیا کس قدر بیوقوف ہے اور بجائے میری زندگی سے محبت کرنے کے، میری موت سے الفت کرنا چاہتی ہے۔ عورت ہونے کے لحاظ سے وہ اپنے آپ کو مردہ سمجھتی تھی اور اس لئے وہ راجکمار کو بھی مردہ پرست لوگوں میں شمار کرتی تھی۔ بعض وقت اسے حیرت ہوتی کہ جب راجکمار خود موسیقی کا اچھا ماہر ہے تو وہ کیوں اس کی فنی زندگی کو پسند نہیں کرتا وہ کیوں اس کے اظہار کمال پر خاموش ہو جاتا ہے، وہ کیوں حقیقت کا اعتراف نہیں کرتا، وہ کیوں پیغام روح کو نظر انداز کر کے صرف دعوتِ جسم کا شائق ہے۔ وہ بعض وقت گھنٹوں سوچا کرتی کہ اگر راجکمار واقعی وہی ہو جائے جیسا وہ چاہتی ہے تو کیا ہو؟ اس کے بعد وہ زیادہ دیر تک غور نہ کر سکتی تھی کیونکہ یہیں سے اسپر فریب نفس کی حقیقت کھلنے لگتی اور یہ دیکھکر کہ اس کے بعد خیال کی وہی سرحد شروع ہو جاتی ہے جس کی بنا پر وہ راجکمار سے احتراز کرتی ہے تو آگے سوچنا ترک کر دیتی اور گھبراکر پھر اسی نقطہ پر آجاتی، جہاں اُس کو صرف اپنا ہی تفوق نظر آتا تھا۔

یہ سب رجنا کا خیال ہی خیال تھا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ راجکمار سب سے زیادہ اس کے فن ہی کا دلدادہ تھا۔ اور رجنا کے کمال موسیقی ہی نے اس کو گرویدہ بنا رکھا تھا، لیکن چونکہ وہ فطرتاً بہت خاموش تھا اور اظہار پسندیدگی کو نہ صرف فن بلکہ خود

خود پسندیدگی کی توہین سمجھتا تھا، اس لئے خاموش رہتا اور کھلے سے کھلا طریق اظہار جو اختیار کرتا، وہ ایک گھری سانس اور نم آلود نگاہ سے زیادہ نہ ہوتا۔ لیکن یہ کہنا کہ اس کا دل صرف اسی پر قانع تھا، اتنا ہی غلط تھا جتنا اپنی جگہ رجنا کا خیال۔

اس وقت دونوں اپنے آپ کو روحانیت ہی کے پرستار سمجھ رہے تھے۔ اور اپنے خیال کی پرواز کو مادی تعلقات سے بہت بلند جانتے تھے۔ لیکن تھے حقیقتاً دونوں مبتلائے فریب۔

جس وقت راجکمار نے لکچر کے اجزا دیکھے اور رجنا کے خیالات وجذبات کا مطالعہ کیا تو اس کی فتادگی میں خدا جانے کتنا اور اضافہ ہوگیا، لیکن اسی اعتبار سے اس کا سکوت اور بڑھ گیا اور تاثر کی شدت نے اس کی خاموشی کو ایک بیدرد سنگین دلی کی صورت دیدی۔ رجنا کنکھیوں سے دیکھتی جاتی تھی اور دل ہی دل میں راجکمار کی بے حسی پر کڑھ رہی تھی۔ راجکمار نے ایک خاص انداز سے مسودہ کو میز پر رکھا اور کہنی ٹکا کر ہاتھ پر سر کو ڈالدیا اور کچھ سوچنے لگا۔ رجنا نے دیکھا اور طعن آمیز ہنسی کیساتھ بولی

"آج پھر آپ کا اتنا وقت ضائع ہوا۔ آپ کے پسند کی چیز کہاں؟"

راجکمار نے جو اپنے خیالات میں ضرورت سے زیادہ منہمک تھا سنا بھی نہیں اور بدستور خاموش ومتفکر بیٹھا رہا۔ رجنا کو اس سکوت سے اور صدمہ ہوا۔ اس نے اس خاموشی کو اپنی توہین خیال کیا اور آگے بڑھکر میز سے مسودہ لیکر جانے لگی اس نقل وحرکت سے راجکمار کو اس وقت ہوش آیا جب وہ جا چکی تھی، وہ چونک کر اٹھا کہ اسے بلائے، لیکن ایک خوفزدہ غلام کی طرح پھر ہمت ساقط ہوگئی اور دروازہ سے باہر نکل کر سڑک پر ہولیا۔ وہ اب اچھی طرح سمجھنے لگا تھا کہ رجنا اس سے کبیدہ خاطر رہتی ہے لیکن کیوں؟ اس کا وقت اکثر اسی معمہ کے حل کرنے میں بسر ہوتا۔ اپنی کمزوری اور حجاب کو محسوس کرتا تھا، وہ جانتا تھا کہ جو کچھ اس کے دل میں ہے زبان پر نہیں آتا، جو عزت رجنا کی اس کے دل میں ہے، اس کا اظہار اس سے نہیں ہوتا، لیکن اس سے رجنا کیوں ناخوش ہو، کیا وہ میری تعریف کی محتاج ہے، کیا اس کا کمال کسی اعتراف کا پابند ہے، کیا وہ خود اپنے آپ سے واقف نہیں ہے، اور کیا یہ وقوف سارے عالم کی طرف سے بے نیاز بنا دینے کے لئے کافی نہیں ہے۔ وہ دیکھتا تھا کہ اور لوگ جو اس کی صحیح قیمت کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے تھے جب اس کی تعریف کرتے، تو وہ خوش ہوتی، ان پر اپنا التفات صرف کرتی۔ لیکن اس کی خاموشی وحیرت پر جو اعتراف وداد کی انتہائی صورت ہے، وہ کوئی توجہ نہ کرتی۔ اس خیال سے اس کا دل بعض مرتبہ بیٹھنے لگتا اور رجنا کی اس کمزوری فطرت پر اس کو سخت افسوس ہوتا — دن گزرتے گئے اور رجنا کی کشش راجکمار کی طرف سے زیادہ سنگین ہوتی گئی یہاں تک کہ اس کی زندگی کا ہر لمحہ اب رجنا کی پرستش ہی میں صرف ہونے لگا

ان دونوں کی زندگی کے لئے یہ موقعہ خواہ کتنا ہی اہم کیوں نہ ہو، لیکن دنیا کو اس پر توجہ کرنے کی ضرورت نہ ہوتی، اگر کالج کی فضا میں اس سے انقلاب نہ پیدا ہوتا۔ اس سے قبل اکثر ماہرین فن کی راے تھی کہ طہرراؤ کے بعد اگر فن کے لحاظ سے کسی کو داد دیجا سکتی ہے تو پہلا نمبر رجنا کا ہے اور اس کے بعد راجکمار کا، ہر چند بعض ایسے بھی تھے جو راجکمار کو ترجیح دیتے تھے لیکن اب چند دن سے سب کو اس فیصلہ میں تبدیلی کی ضرورت معلوم ہونے لگی اور سخت حیرت کے ساتھ لوگوں نے راجکمار کے

تفوق کو محسوس کرنا شروع کیا۔

اس میں شک نہیں کہ راجکمار کے گانے میں فن کے تمام جزئیات ہمیشہ تکمیل کے ساتھ پائے جاتے تھے، لیکن چونکہ رجنا کے گلے کا نسائی لوچ اس میں نہ تھا اس لئے دلکشی کا جہاں تک تعلق ہوسکتا ہے وہ رجنا کو زیادہ حاصل تھی۔

سب سے پہلا دن جب اس کے خلاف ایک تغیر عام طور پر محسوس کیا گیا وہ تھا جب رجنا نے انتہائی بے رحمی سے راجکمار کو اپنے گھر آنے سے روک دیا اور ایسے الفاظ برہمی کے ساتھ جو شاید کبھی اس نے استعمال نہ کئے ہوں گے، ملنے سے انکار کر دیا۔

شام کا وقت تھا، کالج میں درس ہو رہا تھا لیکن راجکمار آج اپنے حجرہ سے نکل کر باہر نہیں آیا تھا، سارا دن اسے اپنے ٹوٹے ہوئے دل کے سنبھالنے اور آنسوؤں سے دامن تر کر کر کے آتش ناکامی بجھانے میں صرف کیا تھا۔ وہ یونہی فطرتاً غیور تھا چہ جائیکہ وہ کسی سے محبت کرنے لگے کہ اس صورت میں تو دل کا احساس بالکل شاہانہ اور اس کے خودداریاں آلہانہ ہو جاتی ہیں۔

لوگ اپنے اپنے مشغلہ میں مصروف تھے، مختلف درجوں میں درس کا سلسلہ جاری تھا۔ رجنا نے اپنا سرود سنبھالا ہی تھا کہ دفعتہً بورڈنگ کی سمت سے کسی دلدوز آواز نے سب کو متوجہ کر لیا۔ ہر زبان سے "راجکمار، راجکمار" نکل رہا تھا، لیکن رجنا اک ایسے اضمحلال کے ساتھ جس میں برہمی اور نفرت کا عنصر غالب ہوتا ہے، خاموش تھی اور سرود کو درست کر رہی تھی۔ راجکمار کی آواز بڑھ رہی تھی، اس کی موسیقی آہستہ آہستہ پھیلتی جا رہی تھی اور ہر شخص اپنی جگہ بیتاب ہوا جا رہا تھا۔

راجکمار کا گانا لوگوں کے لئے کوئی نئی چیز نہ تھا، روز ہی سننے میں آجاتا تھا، لیکن آج اس کی دلکشی کچھ عجیب قسم کی تھی اور دل بے اختیار کھنچا جا رہا تھا۔ ملہر راؤ اپنے کمرے سے باہر آگئے اور انھوں نے بھی، درمیان کے بڑے ہال میں پہونچکر جہاں اس وقت اور پروفیسروں کے ساتھ رجنا بھی بیٹھی ہوئی تھی، پوچھا "کیا یہ راجکمار ہیں" سوائے رجنا کے سب نے یک زبان ہو کر کہا "ہاں" اور تھوڑی دیر تک سب وہیں خاموشی کے ساتھ سنتے رہے آج اس کی آواز میں ایک خاص کیفیت تھی جو اس سے قبل کبھی نہیں پائی گئی اس کا گانا ہمیشہ نشاط پیدا کیا کرتا تھا۔ لیکن آج اس سے حزن و ملال کی بارش ہو رہی تھی، اور اس کی آواز کا ہر نشیب و فراز، صرف کراہ کی مختلف صورتیں معلوم ہوتا تھا۔ وہ آج رو رہا تھا اور اس کی ماتم زدہ روح موسیقی کے ہر ہر سُر سے آنسو کی طرح بہکر نکل جانا چاہتی تھی،

جب ملہر راؤ کی خواہش پر وہ آیا تو سب نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں نم آلود تھیں اور چہرہ سے وہ سکون ظاہر تھا، جو یاس و غم کی انتہا سے پیدا ہوتا ہے۔ وہ گاتا رہا، دیر تک گاتا رہا اور سوائے رجنا کے جو تھوڑی دیر بعد کسی بہانہ سے اٹھکر چلی گئی تھی سب بے اختیار ہو ہو کر داد دینے پر مجبور ہوگئے، ملہر راؤ نے بار بار اُسے گلے سے لگایا۔ رجنا اس دن ہال نہیں گائی اور نہ اس نے سرود بجایا۔ گھر پر جاکر کوشش کی، لیکن اس نے خود محسوس کیا کہ آج سرود کا کوئی تار ہم آہنگ نہیں ہوتا اور نہ اس کی روح اس کی آواز کا ساتھ دیتی ہے۔

اس واقعہ کے بعد کئی ماہ گزر گئے اور یہ حقیقت اب ہر شخص پر ظاہر ہوگئی کہ راجکمار کی ترقیاں موسیقی میں وہم و قیاس سے

بھی زیادہ بلند نظر آتی ہیں اور رجنا فن کے لحاظ سے روز بروز گرتی جا رہی ہے اور اس کی موسیقی میں بجائے لطافت کے خشونت بڑھتی جا رہی ہے۔

(۴)

کالج کے سالانہ جلسہ کا زمانہ آگیا، جب رجنا کو لکچر دینا تھا اور عملاً سب کے ساتھ اپنے فن کی نمائش کرنا تھی۔ بڑے بڑے نایک جمع ہونے والے تھے۔ ولایت کے بھی بعض بڑے کاملین فن آنے والے تھے اور تمام مشہور اخباروں کے نمایندے بھی شریک ہو رہے تھے۔ لاسلکی کی مدد سے ہندوستان کے ہر بڑے شہر اور لندن و امریکہ تک اس جلسہ کی موسیقی پہونچانے کا اہتمام ہو رہا تھا۔ اور ہر شخص اپنی انتہائی کوشش صرف کر رہا تھا کہ اس جلسہ کی کامیابی کا سہرا اس کے سر رہے۔ ملہر راؤ بھی روزانہ خلوت میں اپنی ان راگنیوں کی مشق کر رہا تھا جن کا علم صرف اسی کو تھا یا تھوڑا بہت رجنا کو لیکن اسکی الجھنیں بڑھتی جا رہی تھیں، کیونکہ راجکمار کے مقابلہ میں گانے کی ہمت اس نہ تھی اور جتنی کوشش ترقی کی وہ کرتی تھی، اسی قدر وہ گرتی جاتی تھی، کیونکہ اس کی ہر کوشش جذبۂ حقارت پر مبنی ہوتی تھی۔ جس کا اثر نہایت مخفی طور پر اس کے موسیقی میں سرایت کر کے اس کی لطافت و تازگی کو برباد کرتا جا رہا تھا۔ راجکمار کو اس کا بھی ہوش نہ تھا کہ وہ کیا ہو گیا ہے اور رجنا کیا ہوتی جا رہی ہے۔

تمام انتظامات مکمل ہو چکے تھے، مہمان آکر اپنی اپنی فرود گاہوں میں مقیم ہو گئے تھے۔ اور سارے شہر میں دوسرے دن صبح جلسہ کے آغاز کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ شام کا وقت تھا، راجکمار اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا خاموش کچھ سوچ رہا تھا کہ اس کا ایک عزیز دوست نسیم آگیا اور اس نے آتے ہی کہا کہ "راجکمار، مجھے کتنی مسرت ہے اس خیال سے کہ کل ساری دنیا کو معلوم ہو جائیگا کہ اس وقت سب سے بڑا ماہر موسیقی کون ہے اور کامیابی و فتحمندی کا ہار تمھارے گلے میں ڈالا جائیگا"۔

راجکمار نے سنکر آہستگی سے گردن اٹھائی اور بولا "نسیم، یہ کیا کہتے ہو، مجھے بھلا کیا آتا ہے، کیوں بناتے ہو؟"

نسیم بنانے کی بات نہیں بلکہ یہ ایک حقیقت ہے جس کا اعتراف خود آج بھرے جلسہ میں تمھارے پرنسپل ملہر راؤ نے کیا۔ پہلے لوگوں کا خیال تھا کہ رجنا بائی سے زیادہ اس کا مستحق کوئی نہیں ہے لیکن اب یہ بات سب پر روشن ہو گئی ہے کہ قدرت نے یہ فخر تمھارے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ لوگ حیران ہیں کہ اس کا سبب تمھاری غیر معمولی ترقی ہے یا رجنا بائی کا انحطاط، بہرحال جو وجہ بھی ہو، پانسہ بالکل پلٹ گیا ہے۔ اور ہر شخص محسوس کرنے لگا ہے کہ رجنا بائی اسی لئے تم سے برہم ہیں"

—— نہیں ایسا نہیں ہو سکتا، وہ نہایت بلند فطرت خاتون ہیں اور ان کی طرف سے ایسا خیال قائم کرنا انکی عظمت و شرافت کی توہین ہے۔ علی الخصوص اس حالت میں جب کہ واقعی وہ مجھ سے کہیں زیادہ دلکش مہارت رکھتی ہیں"۔

—— خیر کل کا دن دور نہیں ہے، سبھی کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ تم سے زیادہ ماہر ہیں یا تم ان سے، لیکن اس قدر ضرور جانتا ہوں کہ رجنا بائی کے لئے یہ دن نہایت سخت آیا ہے اور ان کی غیر معمولی پریشانیاں اب ان کی صبر و ضبط سے باہر ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہیں وہ نتیجہ کے اعلان کے بعد خودکشی نہ کریں"۔

سلیم تو یہ کہکر چلا گیا، لیکن ادہر راجکمار جس عالم میں پہونچگیا، اس کا علم دنیا میں سوائے اس کے اور کسی کو نہ ہوسکتا تھا وہ گھنٹوں سرنگوں بیٹھا ہوا سوچا کیا اور اس کے بعد دیر تک مضطربانہ انداز سے ٹہلتا رہا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ جذبات کی فراوانی نے اس کے حواس سلب کر لئے تھے اور وہ کسی ایسے نتیجہ پر پہونچگیا تھا جو اس کی زندگی میں انقلاب تام پیدا کرنے والا ہے۔

اس نے شام کے قریب بکس کھولکر اپنی ڈائری نکالی اور دیر تک کچھ لکھتا رہا پھر اس کو میز پر رکھکر ایک ایسے عزم کے ساتھ جس میں ایک پہاڑ کا سا ثبات پایا جاتا تھا، وہ اٹھا اور بازار کی طرف جاکر تھوڑی دیر میں واپس آیا اور دروازہ بند کرلیا

(باقی) نیاز

نادرات

عورت کی ایک ٹھنڈی سانس مرد کے تمام دلائل باطل کردینے کیلئے کافی ہے

بہت سی باتیں دیوانوں کے منھ سے بھی کیسی صحیح نکل جاتی ہیں

شجاع زندگی میں ایک مرتبہ مرتا ہے۔ اور بزدل روزانہ کئی مرتبہ مرتا ہے

آنکھوں کے آنسو رنج وملال کی دلیل نہیں

ایک امیر نے اپنے بیٹے کے اتالیق سے کہا کہ "لکھنے سے پہلے اُسے تیرنا سکھاؤ کیونکہ ایسے لوگ تو بہت مل جائیں گے جو اس کے بجائے لکھ سکیں، لیکن اس کے عوض میں تیرنے والا کوئی نہ ملیگا۔

جو شخص تمہیں حیثیت سے زیادہ بلند کرنا چاہے، اس سے احتراز کرو

حُسن انسانی میں تہذیب سے زیادہ حسین کوئی چیز نہیں

نظام حکومت، قوم کی روح کے مطابق ہونا چاہئے

اگر تمہارا سینہ تمہارے راز کے لئے تنگ ہے تو ظاہر ہے کہ دوسرے کا سینہ اس سے زیادہ تنگ ہوگا۔

مبارک ہے وہ شخص جس کی بصارت کا تعلق قلب سے ہے اور افسوس ہے اسپر جس کا قلب بصارت سے وابستہ ہے،

اگر گفتگوئے محبت کرنا ہے تو فرانسیسی زبان میں کرو۔ اگر فلسفہ پر گفتگو کرنا ہے تو عربی زبان اختیار کرو۔ اگر شجاعت کا ذکر ہے تو ترکی زبان استعمال کرو۔

کمتر ایسا ہوتا ہے کہ لبوں پر تبسم ہو اور دل ضبط گریہ سے فارغ۔

عورت کا دل عنبر کی طرح ہے کہ جب تک اس میں جلن پیدا نہیں ہوتی خوشبو نہیں پھیلتی۔

اچھی تعلیم معجز دل کی محتاج نہیں ہوتی۔

پنکھے سے کہر کو دور نہیں کرسکتے۔

جس کی تمام آرزوئیں منقطع ہوجاتی ہیں اس کی آرزو موت ہوتی ہے

مجھ سے بتاؤ کہ تمہارے دوست کون ہیں اور میں بتادونگا کہ تم کیا ہو۔

عورتیں پہاڑ کی طرح ہیں کہ دور ہی سے زیادہ حسین نظر آتی ہیں

مرد ہنستا ہے دل سے اور عورت صرف چہرہ سے

معاشیات ہند پر جغرافیہ کا اثر

یوں تو ہر ملک اور [illegible] کی معاشیات پر اس ملک کی جغرافیہ کا گہرا اثر پڑتا ہے لیکن ہندوستان کی معاشیات پر یہاں کے جغرافیہ کا جتنا اثر پڑتا ہے اتنا کسی اور جگہ شاید ہی ہوتا ہو۔ ہندوستان کے شمال میں کوہ ہمالیہ کا سلسلہ ڈیڑھ ہزار میل تک پھیلا ہوا ہے۔ مغرب میں بحیرۂ عرب ہے۔ مشرق میں خلیج بنگال، اور جنوب میں بحر ہند۔ اس کے علاوہ ملک کے اندر مشرق اور مغرب میں دو زبردست پہاڑی سلسلے ہیں جو مشرقی و مغربی گھاٹ کے نام سے مشہور ہیں۔ اور وسط ہند کا پہاڑی سلسلہ وندھیاچل کہلاتا ہے۔ اس جغرافیائی تخصیص سے ہم سرزمین ہند کو چار حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں پہلا حصہ کوہ ہمالیہ اور اس کا دامن۔ دوسرا شمالی ہند کا میدان۔ تیسرا دکن کی سطح مرتفع اور چوتھا ساحلی میدان۔

ہمالیہ کے فوائد

اب ہم کو دیکھنا ہے کہ یہاں کی پیدائش دولت پر اس کی جغرافیائی خصوصیات کا کیا اثر پڑتا ہے۔ سب سے پہلے کوہ ہمالیہ کو لیجئے اس سے ہندوستان کو بیشمار فوائد پہونچ رہے ہیں اس کے احسانات ہندوستان پر اس قدر ہیں کہ ان کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا چونکہ یہ پہاڑی سلسلہ بعض جگہ بہت بلند ہے اس لئے بحر عرب سے جو شمال مشرقی کی موسمی ہوائیں اٹھ اٹھ کر جاتی ہیں وہ اس پہاڑ کی بلندی کی وجہ سے باہر نہیں جا سکتی اور ٹکرا کر سب کی سب یہیں برس جاتی ہیں۔ تبت کی طرف سے جو گرم اور مہلک ہوائیں چلتی ہیں ان سے ہندوستان صرف اسی پہاڑ کی بدولت محفوظ رہتا ہے ہندوستان کے تمام بڑے بڑے دریا مثلاً گنگا، برہمپتر اور سندھ اسی پہاڑ سے نکلتے ہیں جو تمام شمالی ہند کو سیراب کرتے ہیں اور جن کی بدولت شمالی ہند اس قدر آباد ہے۔ پہلے بڑے بڑے شہر انہی دریاؤں کے کنارے آباد کئے جاتے تھے جن میں آمد و رفت بہ آسانی ہو سکے اور یہ صفت ہندوستان کے دریاؤں میں موجود ہے ان دریاؤں کا ڈھال نہایت مناسب ہے جس کی وجہ سے پانی آہستگی سے بہتا ہے اس لئے ان میں کشتی اور چھوٹے جہاز بلا خطر چلائے جاتے ہیں۔ ریلوے کی ایجاد سے قبل تجارت کا بہت کچھ دارومدار انہی دریاؤں پر تھا گو اس [illegible] کمی واقع ہو گئی ہے پھر بھی ابھی تک ان سے آمد و رفت اور بار برداری کا کام لیا جاتا ہے [illegible] دریاؤں کا ڈھال [illegible] کے قریب یہ بہت [illegible] رہتا ہے جس کی وجہ سے یہ [illegible] ساتھ پتھر کو کاٹ کر مٹی بنا لاتے [illegible] زمین میں [illegible] ہے۔

یہ مٹی زراعت کے لئے بہت [illegible] ہوتی ہے۔ شمالی ہند [illegible] اسی قسم کی مٹی اور پتھر سے بنا ہوا ہے یہ دریا آب پاشی کے [illegible] زراعت [illegible] پہونچتی ہے۔ پنجاب میں دریائے سندھ اور اس کی [illegible] ہے جس سے ملک کی دولت میں بیحد اضافہ ہوا ہے اگر پنجاب [illegible] دریائے سندھ [illegible] تو وہاں بارش بہت کم ہوتی ہے اور اگر یہ دریا بھی نہ ہوتا

تو ذریعہ آبپاشی مسدود ہو جاتا۔ اگرچہ اکثر جگہ کے دریاؤں میں گرمیوں کے موسم میں پانی بہت کم ہو جاتا ہے لیکن اس کے برخلاف ہندوستان کے دریاؤں میں پانی بڑھ جاتا ہے۔ اور بعض اوقات طغیانی آجاتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمالیہ کی چوٹیاں برف سے ڈھکی رہتی ہیں اور جب گرمی میں برف پگھلتی ہے تو سب کی سب بہ کر ان دریاؤں میں آجاتی ہے جس سے پانی کی کوئی انتہا نہیں رہتی ہمالیہ کے آبشاروں اور دریاؤں سے جس قدر کثیر مقدار میں برق پیدا کی جا سکتی ہے اس کے متعلق میں ایک قبل کے مضمون "کیا ہندوستان ایک صناع ملک بن سکتا ہے" میں لکھ چکا ہوں لہذا یہاں اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ ہمالیہ کے بعض پر فضا مقامات مثل شملہ نینی تال اور دارجلنگ بے حد فرحت افزا ہیں۔ جس طرح اٹلی کے خوشنما مناظر وہاں کی ایک بڑی دولت ہیں۔ اسی طرح ہندوستان کے یہ پہاڑی مقامات بھی ملک کی دولت ہیں

صرف یہ نہیں کہ ہمالیہ کے دامن میں اس قدر گھنے اور زبردست جنگل ہیں کہ ان میں ہر قسم کی عمدہ سے عمدہ چوبینہ پیدا ہوتی ہے جن سے اعلیٰ درجے کا فرنیچر تیار ہوتا اور ہو سکتا ہے۔ اس کی لکڑیاں عمارات بنانے میں بے حد کام آتی ہیں۔ ان سے ریل کے ڈبے اور سلیپر بھی تیار کئے جاتے ہیں بلکہ اس کے علاوہ اس کے دامن میں بعض زمینیں ایسی ہیں جنہیں نہایت قیمتی زرعی پیداوار مثل چاء و کافی کی کاشت کی جاتی ہے۔ ان کو ہم ملکی دولت کے اضافہ کا باعث نہیں تو اور کیا کہیں؟ غرض یہ فوائد ہمالیہ ہی کی مہربانیوں کا نتیجہ ہیں اگر ہمالیہ نہ ہوتا تو ہندوستان اس تمام دولت سے جو صرف اس کی وجہ سے حاصل ہو رہی ہے محروم رہتا اور ہمالیہ کی جغرافیہ سے تعلق رکھتا ہے۔

ہمالیہ جہاں قدرتی طور پر ملک کی فصیل کا کام دیتا ہے اور اس کو بیرونی حملوں سے محفوظ رکھتا ہے وہیں اس میں چند درے جو راستے کا کام دیتے ہیں نظر آتے ہیں یعنی ہمالیہ کوئی ایسا سد سکندری نہیں کہ اگر کوئی یہاں آنا یا یہاں سے جانا چاہے تو آ جا ہی نہ سکے۔ اگر ایسا ہوتا یہ نقصان کا باعث ہوتا۔ گو بادی النظر میں ایسا معلوم ہوگا کہ اگر اس میں یہ چند درے بھی نہ ہوتے تو ہندوستان بہت زیادہ محفوظ ہو جاتا اور ہندوستان پر اب تک جو حملے افغانستان کی طرف سے ہوئے وہ بھی نہ ہوتے ہم اس کو مانتے ہیں کہ اگر درے نہ ہوتے تو یہ حملے نہ ہوتے لیکن ملک کی ترقی اور اس کے فروغ کے لئے ضروری ہے کہ اس کے تعلقات دوسرے ممالک سے قائم ہوں اگر کوئی ملک دنیا کے تمام دیگر ممالک سے علیحدہ کر دیا جائے اور اس کو کسی سے کسی قسم کا تعلق نہ ہو تو اس کی ترقی جس قدر محدود ہوگی اس کا ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے۔ وہ اپنی ابتدائی حالت سے آگے قدم نہیں بڑھا سکتا اس لئے اگر ہمالیہ میں درے نہ ہوتے تو اس کا تعلق بڑی حد تک دوسرے ممالک سے منقطع ہو جاتا اور ایسی صورت میں اس کو جو نقصان ہوتا وہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا جو بیرونی حملوں کی وجہ سے ہندوستان کو برداشت کرنا پڑا۔ لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ درے ہندوستان کے حق میں بہت مفید ثابت ہوئے۔ اور یہ ہمالیہ کا بڑا وصف ہے کہ باوجود محافظ ہونے کے اس میں چند راستے بھی ہیں جن سے ہندوستان اور دیگر ممالک سے ربط قائم رہ سکتا ہے۔ اس پہاڑ کا ایک اثر اوپر بیان کیا جا چکا ہے یعنی اس کی وجہ سے شمالی حصہ میں بارش کثرت سے ہوتی ہے متعدد دریا اس سے نکلتے ہیں جس سے اس کی سرسبزی میں اضافہ ہوتا ہے

لہذا پہاڑ کی حفاظت۔ زمین کی زرخیزی۔ دریاؤں کی روانی یہ سب ملکر زمین کو زرخیز کریں گی اس زرخیزی کا اثر یہ ہوگا کہ لوگ کاشتکاری کی طرف راغب ہوں گے اور آبادی زراعت پیشہ ہوگی۔ زراعتی پیشہ کا اثر یہ ہوگا کہ یہاں کے لوگ امن پسند ہوں گے وہ کوئی ایسا خلل گوارہ نہیں کرسکتے جس سے ان کی زمین ان سے علیحدہ ہو۔ پس جنگ وجدال سے وہ بالطبع متنفر ہوں گے۔ ان تینوں باتوں کے یکجا ہونے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہاں دولت زیادہ ہوگی۔ زراعت اور تمول ملکر شمالی ہندوالوں کو امن پسند بنادیں گے کیونکہ بدامنی اور جنگ سے بھاگنے والے طبقہ زراعت پیشہ اور متمول لوگوں ہی کا ہوتا ہے تو معلوم ہوا کہ شمالی ہند کی یہ تمام خصوصیات اس کی جغرافیائی اثرات کی وجہ سے ہوئیں جس سے ملک کی معاشی حالت متاثر ہوئے بغیر نہیں رہی۔

شمالی میدان اب ہندوستان کے دوسرے حصے شمالی ہند کے میدان کو لیجئے۔ یہ جس قدر زرخیز و آباد ہے اتنا ہندوستان کا کوئی دوسرا حصہ نہیں۔ ہندوستان کی کل زرعی پیداوار کا بڑا حصہ یہیں سے وصول ہوتا ہے اسکی وجہ یہ ہے کہ بارش کثرت سے ہوتی ہے جتنے ذرائع آبپاشی یہاں ہیں اتنے کسی دوسرے حصے میں نہیں اس کے علاوہ یہاں کے دریا گاہے گاہے اپنی زرخیز مٹی وہاں کے میدانوں میں پھیلاتے رہتے ہیں۔ اگر ہمالیہ نہ ہوتا تو اس کو یہ فوائد کہاں سے نصیب ہوتے اس لئے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اگر اس کے گرد اس قدر عمدہ جغرافیائی حالات نہ ہوتے تو اس کو یہ سرسبزی وشادابی نصیب نہ ہوتی۔

دکن کی سطح مرتفع یہاں نہ بارش کی کثرت ہے اور نہ وہ سرسبزی وشادابی۔ اس کے دونوں طرف کے مشرقی ومغربی گھاٹ اس کو اپنے حصے سے محروم رکھتے ہیں جب بحر عرب سے شمال مشرقی موسمی ہوائیں اٹھ کر دکن کی طرف آنا چاہتی ہیں تو مغربی گھاٹ ان کو ادہر آنے سے باز رکھتی ہے اور یہ لکہ ہائے ابر دکن آنے کی بے سود کوشش میں ان پہاڑوں سے اپنا سر ٹکرا ٹکرا کر وہیں برس پڑتے ہیں اگر درمیان میں یہ دیوار سنگی حائل نہ ہوتی تو دکن بھی بہت کچھ سرسبز وشاداب ہوتا۔ دکن میں جو دریا بہتے ہیں ان کا دہارا اس قدر تیز ہے کہ اس میں بند باندھنا یا نہریں کاٹنا ایک دقت طلب امر ہے۔ دکن کو جو تھوڑی بارش میسر ہوتی ہے وہ شمال مغربی موسمی ہواؤں کا (جو خلیج بنگال سے اٹھتی ہیں) نتیجہ ہیں وجہ یہ ہے کہ مشرقی گھاٹ بعض بعض جگہ بہت پست ہیں جنکی وجہ سے کچھ ابر کے ٹکرے ادہر بھی چلے آتے ہیں۔ دکن میں بارش کی کمی کا باعث یہی گھاٹ ہیں اور اسی وجہ سے یہاں کی زرخیزی میں بھی کمی واقع ہوگئی ہے۔

ساحلی میدان یہ میدان بعض بعض جگہ تین سو سے چار سو میل تک چوڑے ہیں اور بعض جگہ تنگ ہوکر صرف تیس چالیس میل رہگئے ہیں۔ ان میدانوں میں بارش کی کثرت رہتی ہے (اور یہ مشرقی ومغربی گھاٹوں کا نتیجہ ہے) جس سے یہ بہت کچھ سرسبز وشاداب ہیں۔

موسم اور آب وہوا پیدائش دولت کے لئے معاشی جدوجہد ایک لازمی امر ہے اور معاشی جدوجہد کے لئے عمدہ کارکردگی کا ہونا ضروری لیکن عمدہ کارکردگی قائم رہنے اور کارکردگی بڑھانے کے لئے چند چیزوں کا ہونا لازمی ہے جنمیں

سب سے مقدم آب وہوا اور موسم کا اثر ہے انتہا درجے کی گرم و سرد آب وہوا اور موسموں کا جلد جلد تبدیل ہونا کارکردگی پر مضر اثر ڈالتا ہے جس جگہ شدت کی گرمی پڑتی ہے وہاں سخت جسمانی محنت دیر تک نہیں ہو سکتی اور قدرتاً ایسی جگہ زیادہ محنت کی ضرورت بھی نہیں ہوتی، کیونکہ نباتی پیداوار ایسی جگہ کثرت سے ہوتی ہے ایسے ممالک کی زندگی نہایت سیدھی سادی ہوتی ہے۔ نہ ان کو زیادہ اور گرم کپڑوں کی ضرورت نہ اعلیٰ اور مضبوط مکانات کی حاجت۔ پہننے کو مختصر کپڑا اور رہنے کو معمولی جھونپڑا کافی ہوتا ہے اسی طرح جہاں سردی اور برف باری شدت کی ہوتی ہے وہاں نہ محنت کا کافی موقع ملتا ہے اور نہ زمین سے خاطر خواہ پیداوار ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ مثلاً لیپ لینڈ (Lap land) اور جاپین لینڈ (Zin[illegible]) کہ جہاں وہاں سورج کی شکل تک دکھائی نہیں دیتی اور کثرت برف باری سے سوائے برف کے پیداوار کے کچھ نظر نہیں آتا۔ یہاں کے باشندے ہفتوں اپنے گھروں سے نہیں نکل سکتے ان کی غذا چربی، جانوروں کا گوشت اور مچھلی ہوتی ہے ایسی صورتوں میں بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ان مقامات میں زراعت یا صنعت و حرفت کو ترقی ہو سکے۔

موسم کا جلد جلد تبدیل ہونا بھی کارکردگی کے لئے مضر ہے، ہندوستان میں تین موسم ہوتے ہیں، کبھی بلا کی گرمی کبھی کڑاکے کی سردی اور کبھی موسلا دھار بارش غرض طبیعت کچھ نہ کچھ ناساز ضرور رہتی ہے بارش کے موسم میں عموماً ہیضہ اور سردیوں میں ملیریا اکثر مقامات پر پھیل جاتا ہے آب وہوا کی خرابی سے صحت اچھی نہیں رہتی صحت کی خرابی سے زیادہ محنت نہیں ہو سکتی اور محنت کی کمی سے کارکردگی پر مضر اثر پڑتا ہے۔ اس کے برخلاف منطقہ معتدل میں آب وہوا کی عمدگی اور موسم کی یکرنگی سے یہ تمام خرابیاں جو اوپر بیان ہوئیں پیدا نہیں ہوتیں، کافی محنت کا موقع ملتا ہے اور طبیعت بھی نہیں تھکتی۔ زراعت اور صنعت و حرفت دونوں کی ترقی کے لئے منطقہ معتدل نہایت مناسب ہے

آب وہوا اور موسم کا اثر قریب قریب تمام ضروریات زندگی پر پڑتا ہے اسمیں سب سے اول خوراک ہے جس جگہ کی جیسی آب وہوا ہوگی اسی مناسبت سے وہاں کی پیداوار ہوگی۔ اگر ہم یہ چاہیں کہ کوئی پیداوار جو کسی خاص جگہ کے لئے مخصوص ہو اسی عمدگی سے دوسری جگہ پیدا کر لیں تو یہ ناممکن ہے کیونکہ اس چیز کیساتھ ہم وہاں کی آب وہوا منتقل نہیں کر سکتے۔ مثلاً سیلون اور کشمیر کی چائے ساری دنیا میں مشہور ہے اور ہر متمدن ملک کو اس کی ضرورت۔ اگر جگہ اور آب وہوا کی تخصیص نہ ہوتی، تو ہر ملک اپنے یہاں بطور خود پیدا کر کے دوسروں کا محتاج نہ ہوتا اسیطرح بنگال کا جوٹ ہے کہ سوائے ہندوستان اور ہندوستان میں بھی بنگال یا تھوڑا بہت امریکہ کے کسی دوسری جگہ پیدا نہیں ہوتا اور ضرورت ساری دنیا کو ہے۔ اسیطرح اور دوسری چیزیں بھی ہیں جیسے برما کی، دوآبہ گنگ و جمن کے بھیڑوں کی اون حیدرآباد کے چاول کسی دوسری جگہ اتنے اعلیٰ پیدا نہیں ہوتے۔ غرض یہ کہ پیداوار آب وہوا کے تابع ہے [illegible] خوراک پر پس آب وہوا بذریعہ خوراک کارکردگی اور پیدائش دولت پر بڑا اثر ڈالتی ہے [illegible] آب وہوا کا تعلق وہاں کی جغرافیہ سے ہے تو معلوم ہوا کہ یہاں کی جغرافیائی حالات کا معاشیات ہند پر کیا اثر پڑ رہا ہے

[illegible] حمید

حضرت شیخ محمود چشتی رحمتہ اللہ علیہ

محمود نام، راجن عرف، والد کا نام علم الدین تھا۔ مرزبوم پیران پاک پٹن ہے والدہ چھوٹا سا چھوڑ مری تھیں، دادا کے آغوش میں پلکر جوان ہوئے

اخلاق و عادات بہت پسندیدہ رکھتے تھے، خاموشی اور مختصر گوئی کے بچپن سے خوگر تھے۔ فطرتاً صلح جو اور امن پسند تھے بچوں کی طرح شرارت و فساد آپ کی عادت نہ تھی۔ اخبار الاولیا کا بیان ہے کہ بچپن میں کبھی کبھی کسی سے نہیں لڑے لوگ کہتے تھے کہ یہ بچہ بوڑھوں کا بھی بوڑھا ہے۔

ریاضت و مجاہدہ گویا گھٹی میں پڑا تھا رات دن یہی شغل تھا۔ سب باتوں سے نفرت تھی مگر اس میں دل لگتا تھا۔ لکھنے پڑھنے سے بہت بیزار رہتے تھے۔ کہتے تھے مجھے درود و صلوٰت اور دعا و مناجات میں جو چین ملتا ہے، کسی دوسری چیز میں نہیں ملتا۔ والد یہ باتیں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے، اور فخر کرتے کہ خدا نے ان کو صالح بیٹا دیا۔ انھوں نے آپ کو بالکل آزاد کر دیا تھا اور آپ کے اشغال سے کسی قسم کا تعرض نہیں کرتے تھے لیکن انھوں نے دیکھا کہ یہ تو پیار و محبت میں خراب ہوئے جا رہے ہیں، تعلیم کا زمانہ گزر رہا ہے، اور یہ علم سے بے خبر ہیں۔ حالانکہ سلوک بغیر علم کے نہیں آتا۔ عادات و اطوار کا اچھا ہونا دین سے اخلاص، اعمال و معتقدات میں غلو و احترام، یہ سب باتیں بغیر علم غیر یقینی اور غیر مستحکم ہوتی ہیں۔ اس لئے آپ نے ان کو مختلف طریقوں سے علم کی طرف مائل کرنا چاہا۔ جہالت کے نقائص بتلائے، طالب سلوک کے لئے اس کا سم قاتل ہونا واضح کیا۔ مگر جمال حقیقت کا شیدائی ان باتوں میں نہ آیا، اس نے صاف انکار کر دیا اور قرآن و حدیث، تفسیر، فقہ کی طرف بھی توجہ نہ کی اور صاف صاف کہدیا کہ میں ان جھگڑوں میں نہیں پڑتا میں ان پشتاروں کو لاد کر کیا کروں؟ میری روح کی طمانیت تو صرف انہماک الٰہی میں ہے ؎

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم — از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

آپ کو تحصیل علم پر رد دیتا، حقیقت حال سے ناواقفیت کی دلیل تھی۔ آپ کی فراست و دانائی، آپ کا علم و فضل، اور ہر معاملہ پر آپ کی واقفیت ہر ہر بات سے ظاہر ہوتی تھی، جو بات کہتے تھے نہایت گہری اور عالمانہ، اس کا سب کو اعتراف تھا تاہم حضرت شیخ علم الدین کو اطمینان نہیں ہوتا تھا، ان باتوں کو خود یقین نہیں سمجھتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے نہایت سختی سے توجہ دلائی کہا میں تمھیں بار بار ٹوکتا ہوں مگر تم اپنی باتوں سے باز نہیں آتے، تم راستہ بھول گئے ہو منزل کا پتہ نہیں جانتے، اور اندھوں کی طرح ادھر ادھر ٹٹولتے ہو اور وقت ضائع کر رہے ہو۔ تمھیں سب سے پہلے تحصیل علم ضروری ہے تمھیں اس کے لئے تیار ہونا چاہئے ورنہ تم دوسروں کے لئے مصیبت بن جاؤ گے، اور تمھیں اس صورت میں دولت بھی نہیں مل سکیگی۔

میراث پدر خواہی علم پدر آموز

یہ سنکر آپ نے زبان کھولی، اور اپنی علم و دانش کے وہ جوہر دکھائے کہ والد انگشت بدنداں رہ گئے بولے: منزل سلوک میں ہر شخص کی حالت یکساں نہیں ہوتی۔ کسی کے لئے علم و فضل راہنما ہوتا ہے اور کسی کے لئے اس کی جہالت وشکستگی۔ کوئی عشق مجازی کے پروں پر اڑکر مقام حقیقی کی بام بلند تک پہنچتا ہے اور کوئی خانقاہ کی گوشہ نشینی سے کسی کے زخم دل کے لئے اس کی آہیں رہنما ہوتی ہیں اور کسی کے لئے مرہم کا پھاہا رکھنے والی انگلیاں؛ علم کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا یہ ایک خیال ہے جو حقیقت سے دور ہے۔ پرستاران حق و صدق پر جو احوال طاری ہوتے ہیں۔ دردمندان عشق کے دلوں میں جو ٹیسیں اٹھتی ہیں وہ علم فضل کے حلقوم ہی سے نہیں نکلتیں، وہ صرف علماء و فضلاہی کو نہیں پکارتیں۔ سیکڑوں بندگان خدا ہیں جو علم کے نام سے ایک لفظ بھی نہیں جانتے مگر بڑے بڑے عالم ان کے آگے عقیدت و ارادت کا سر جھکاتے ہیں۔ جب آسمان سے نزول باراں ہوتا ہے۔ تو ہر خشک وتر کو سیراب کرتا ہے یہ کبھی نہیں سنا کہ اہل علم کی زمینیں تو سیراب ہو گئی ہوں، مگر جاہل کسانوں کی کھیتیاں جل گئی ہوں۔

تحصیل علم کا مقصد کیا ہے؟ معرفت الٰہی یا علم کی پرستش؟ اگر معرفت الٰہی ہے تو علم صرف ذریعہ ہے مقصد نہیں۔ لہذا اگر کسی کو یہ مقصد بغیر اس ذریعہ کے حاصل ہو جائے تو اس کے لئے ضرورت نہیں کہ تحصیل علم میں اپنا وقت ضائع کرے کیونکہ وہ جس مقصد کے لئے علم حاصل کرتا، وہ مقصد اسے حاصل ہو چکا ہے۔ لیکن اگر تحصیل علم کا مقصد علم ہی ہے تو میرا آپ کا اصولی اختلاف ہے۔ میں علم کو مقصد نہیں سمجھتا ذریعہ سمجھتا ہوں، اور آپ ذریعہ کو مقصد سمجھتے ہیں۔ پھر آپ جو مجھے پڑھنے کی طرف بلاتے ہیں تو کس لئے؟ جس سے ملنے کے لئے علم کی ضرورت تھی وہ مجھے مل گیا ہے، اور میں نے اس کو علم سے نہیں بلکہ اس کو اس سے پا لیا ہے۔

"وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ" رہی یہ بات کہ مجھے درس و ارشاد کی مسند آرائی کرنی چاہیے، اور اس کے لئے تحصیل علم ناگزیر ہے تو اس کے متعلق عرض ہے کہ میں اپنے تئیں اس منصب کے قابل نہیں پاتا۔ آپ جانتے ہیں کہ انجمن آرائی سے مجھے ابتدا سے نفرت ہے، اور مولویت کی مسند سے مجھے عُجب وریا کی بو آتی ہے۔ شیخ الاسلام حضرت خواجہ نصیر الدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد ہے کہ یک جہل و نادانی فضل دارد بر ہزار کتتے کہ آمیختہ با عُجب وریا باشد" بس میں علم ریائی کی کچھ ایسی زیادہ ضرورت نہیں سمجھتا میرے خدا نے مجھے جس قدر پڑھا دیا ہے سلوک کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ اُس سے زیادہ کی ضرورت نہیں، اور نہ مجھے اس کیلئے تشنگی و بیقراری ہے۔ اصل طاقت عمل اور طلب صادق کی طاقت ہے باقی جو کچھ ہے بیکار ہے ؎

تو نازکی نہ بروپے بہ منزل مقصود   مگر طریق رہش از سر نیاز کنی

والد نے یہ گفتگو سنکر کہا۔ اگر تمہیں یہ یقین ہے کہ اس راہ چل کر منزل تک پہنچ جاؤ گے، اور ہر حال میں پابند شریعت رہوگے، تو میں تم کو تمہارے مسلک اور رجحان طبیعت پر چھوڑے دیتا ہوں، اور اگر تم اس امتحان میں پورے اترے تو تمہیں وہ امانت بھی دیدونگا جس کا تم اپنے تئیں مستحق بنا لوگے۔ آپ نے اس کا مختصر سا جواب دیتے ہوئے داخل طریقت ہونے کی درخواست کی، جسے انھوں نے منظور کر لیا، اور تھوڑے عرصہ میں جب انہیں آپ کی قابلیت کا تجربہ ہو گیا تو خرقۂ خلافت سے بھی

سرفراز کردیا۔ آپ کو مختلف شیوخ سے بیعت و ارشاد کی اجازت تھی۔ شیخ احمد بن ادریس سے طریقۂ شاذلیہ میں شاہ جلالی سے قادریہ میں، شیخ خازن سے سہروردیہ میں، شیخ احمد کھتو، اور عزیز اللہ متوکل سے مغربیہ میں شجرۂ خلافت ملا تھا۔

۲۲ صفر تاریخ وفات ہے سال تحقیق نہیں آداب الطالبین میں ۹۴۰ء لکھا ہے۔ اور گلزار ابرار میں ۹۹۹ھ۔

ناظر دہلوی

آیندہ جنوری سنہ ۲۹ء کا نگار

کم از کم دس جز یعنی ۱۶۰ صفحہ کا ہوگا اور نگار کے اول سال اشاعت (یعنی سنہ ۱۹۲۲ء) کے تمام بہترین مضامین نظم و نثر کا مجموعہ ہوگا۔ نگار کی گزشتہ جلدیں مکمل اب نہیں ملسکتیں اور ملک میں انکی مانگ بہت ہے اس لئے اب سوائے اس کے کوئی تدبیر نہیں کبھی کبھی انتخاب شایع ہوتا رہے سنہ ۲۲ء میں جو حضرات خریدار تھے، ان میں سے اب بہت کم باقی رہگئے ہیں اس لئے سنہ ۲۲ء کا انتخاب تمام موجودہ ناظرین کے لئے بالکل نئی چیز ہوگا۔ اس انتخاب میں جتنے مضامین علمی و ادبی، افسانے یا نظمیں ہونگی وہ سب نہایت بلند معیار کی ہوں گے اور ایسا ہونا چاہئے کیونکہ ایک ہزار صفحات سے ۱۶۰ صفحات کا انتخاب کیا جائیگا

دوسری رعایت

آج کی تاریخ سے لیکر ۳۰ دسمبر تک یہ ہوگی کہ نگار کے ہر سالانہ خریدار کو (بشرطیکہ وہ رعائتی خریدار نہیں ہے) کتاب فراستِ الید (یعنی ہاتھ کی لکیریں دیکھ مستقبل پر حکم لگانا) جو زیر طبع ہے بجائے عہ کے ۸ میں دیجائے گی۔

اس لئے جو حضرات ابھی یا شروع سال (یعنی جنوری سنہ ۲۹ء) سے نگار کے خریدار ہونا چاہتے ہیں یا وہ تمام قدیم خریدار جنکا چندہ اب یا دسمبر میں ختم ہو رہا ہے۔ اور وہ اس کتاب کو حاصل کرنا چاہتے ہیں انکو چاہیئے کہ اس کی اطلاع فوراً دیدیں تاکہ وی پی صہ کا روانہ کیا جائے۔ یا خود ذریعہ منی آرڈر صہ کا منی آرڈر روانہ فرمادیں "منیجر نگار لکھنؤ"

فلسفۂ حسن

حسن کا لفظ سہ حرفی آج ہے موضوع بحث
اس کے ہر ہر جزو کو تنقید سے ہے دیکھنا

علم حیات و وجدانات و جذبات بشر
پورا سرمایہ ہے یہ فن جمالیات کا

کس طرح ہوتا ہے احساس جمالی کا ظہور
کونسی شے ہے جو ہو حسن مجسم بر ملا

کیا سبب اس کا کہ اک شے ایک کرتا ہے پسند
دوسرا کرتا ہے نفرت وہ بھی کیسی ناروا

کون سے ہیں ایک شے کے وہ نمایاں خط و خال
جن سے سمجھی جاتی ہے وہ شے نہایت خوشنما

صوت میں پنہاں ہے آخر کونسی وہ ساحری
جس سے ہو جاتی ہے جذبات [illegible]

اس طرح کے اور جتنے بھی کئے جائیں سوال
ان سبھوں کا ہے جمالیات سے رشتہ جڑا

ایسے استفسار پر رد و قدح اور غور و خوض
فن بالا میں رہا کرتا ہے اپنا مشغلہ

فطرت خاموش کے لاکھوں مناظر بے بدل
سطوت و عظمت پہ جنکے فہم عالم ہے فدا

خوبصورت کوئی بت یا کوئی تصویر جمیل
کوئی عمدہ نظم یا دلکش صدا کا سلسلہ

دیکھتے ہی سنتے ہی ان کے بشر کے قلب میں
خوشگوار احساس کا طوفان ہوتا ہے بپا

دل میں بھر جاتے ہیں جذبات مسرت ناگہاں
سازِ لب سے اٹھتا تحسین کا ایک غلغلہ

یا خموشی اسپہ چھا جاتی ہے ایسے وقت میں
جبکہ ہو جاتا ہے ذہن نارسا بیدست و پا

لفظ تک اظہار کیفیات کے ملتے نہیں
جوش دل لفظوں میں اب ہو نہیں سکتا ادا

شکل، حرکت، رنگ اور نیز اس طرح کے اقسام
دیکھنے یا سننے سے جن کا ہوا نشو و نما

اطلاع انکی دیا کرتے ہیں ہر دم گوش و چشم
جس سے پیدا ہوتی ہے احساس لذت کی نوا

یہ وہی ہے جس کو کہتے ہیں جمالی التذاذ
اس کا باعث حسن ہے ہیں نہیں چون و چرا

یہ وساطت سے حواس آدمی کے روز و شب
عقل و وجدان و تخیل کو ہے کرتا مبتلا

نفس میں پیدا کیا کرتا ہے جذبات نفیس
روح کو پہنچاتا ہے تا حد بام اعتلا

حیات، احساس اور لذات کی دلچسپ بحث
[illegible]

کچھ نوا ہائے شنیدہ کچھ بہار دیدہ سے
[illegible]

خوشگوار احساس کا اٹھتا ہے جب جوش [illegible]
[illegible]

حسن کو سقراط ٹھہراتا ہے مانند مفید
اور فلاطوں کی نظر میں ہے یہ اس کا مرتبہ

جو تصورِ خیر برتر اور الوہیت کے ہیں
حسن ہے ایسے تصور کا مثیل و ہمنوا

حسن سے اشیائے عالم کل کے کل لبریز ہیں
یہ خیالات فلاطوں کا ہے مجمل تذکرہ

حال کے نقاد کہتے ہیں نہیں ایسا نہیں
ہے یہ احساس و حواس آدمی کا شعبدہ

جو کسی شے کے تصور سے ہوا ہو ارتسام
اہل یورپ کرتے ہیں اپنی یہیں سے ابتدا

پھر صفات، اعراض، اشیا دیکھتے ہیں غور سے
تاکہ حاصل ہو جمالی کیفیت کا مدعا

حسن کی تخئیل سے پیدا ہیں وہ وہ لذتیں
مادی اغراض کا جن میں نہیں کچھ شائبہ

سب سے پہلے کانٹ نے اس امر کی تعیین کی
حسن کی لذت نہ ہو وابستہ حرص و ہوا

اس کے احساس و شعور اولیں کے باب میں
ماہرین فن نے لونیت سے کی ہے ابتدا

جتنے گہرے رنگ رجحانات کو ہونگے پسند
سمجھا جائیگا تمدن کا ابھی ہے بچپنا

ہلکے رنگوں کی نفاست جتنی دلکو بھائے گی
اتنا ہی ہوگا تمدن کو عروج و اعتلا

حسن کے قصر بصیرت زا کی جانب راہ دن
ہر تمدن بڑھتا ہے لیکر کمند ارتقا

آبشاروں کی روانی چرخ آسا کوہسار
نیر تاباں کا چھپ چھپ کر نکلنا ڈوبنا

اور اجرام سماوی کے منور قمقمے
آج تک فہم بشر جنکی نہ گنتی گن سکا

ابر کی اودی سنہری نیلی پیلی ساریاں
جن کو پھیلاتی ہے بام چرخ پر بادِ صبا

وہ شفق کا پھولنا، وہ اسکی زریں آب و تاب
تودۂ غبرا ہو جس سے صاف سونے کا ڈلا

قلزم و عماں کی موجوں کا فلک فرسا خروش
دیکھنے سے ان مناظر کے ہے دل ہیبتکدہ

ان کی لامحدودیت مرعوب کرتی ہے ہمیں
سامنے آنکھوں کے رہتی ہے جلالت کی فضا

اس تصور میں اسی حد پر ہے احساس الم
جس سے پہلے ہوتی ہے افسردہ کچھ طبع رسا

بعد اس کے خود ابھرتے ہیں وہ جذبات شریف
جس سے پھر بڑھتا ہے آگے ذوق دلکا حوصلہ

ایک ہی آواز یا صورت ہر اک پر اک طرح
کیوں اثر کرتی نہیں اسکی ہے آخر وجہ کیا

ساخت عصبی ریشوں کی ہر شخص میں یکساں نہیں
اختلافِ عادت و تعلیم ہے اس کے سوا

ذہن کی بالیدگی میں بھی بہت باہم ہے فرق
بیش و کم تفریق کرتی ہے طبایع کو جدا

اک تخیل ہی نہیں اس حسن کی زیر اثر
عقل تک پھیلا ہوا ہے اس اثر کا دائرہ

دلکشی آواز حرکت رنگ خط میں جو بھی ہو
یہ بہ امداد حواس اک فعل ہے ادراک کا

ان میں پیدا کرتے ہیں موزونیت فکر و شعور — جس سے بنجاتا ہے یہ نقشہ عجیب لذت فزا
قوت ذہنی نہیں انسان اور حیوان کی — باہمی تفریق کو کرتی ہے ظاہر یہ ملا
مختلف رنگوں کی اک تصویر کو یا نظم کو — دیکھتا سنتا ہے حیوان بھی مگر کیا فائدہ
اس سے حیواں کو حصول کیف ہوتا ہی نہیں — جس سے آجائے نظر جذبہ کوئی ابھرا ہوا
کس طرح ہوتا ہے ظاہر یہ جمالی التذاذ — نقل اور تخلیق کو ہے اس کا کیا واسطہ
دل میں انسان کے نہیں رہتی ہے خواہش جاگزیں — جو کرے محسوس اسکو جوں کا توں کر دے ادا
بت گری معماری و موسیقی کلفت شکن — شاعری جس میں کہ رہتا ہے در تخئیل وا
نیز نقاشی کہ جو دنیا ہے نقش و رنگ کی — ارتسام ذہنی و طبعی کا ان میں سلسلہ
سب یہ ظاہر ہوتا ہے الفاظ یا اصوات سے — نام صناعی ہوا ایسے ہی اظہارات کا
خارجی صورت میں ہم وجدان یا احساس کو — جب کریں ظاہر تو صناعی نہیں کہلائیگا
منفعل رہتا ہے یا خوابیدہ احساس جمال — عام لوگوں میں مگر صناع میں ہے جاگتا
فعل ہے افراط قوت کا نتیجہ اور یہی — جادۂ تخلیق سے کرتا ہے ظاہر دست و پا
دیکھتی ہے غیر مرئی چیز کو کس غور سے — صوت و رنگ و سنگ میں صناع کی سعیِ رسا
پھر اسے مرئی بناکے سامنے لائی ہے یہ — جس سے دیکھے باغ میں چلتی ہے لذت کی ہوا
یا یہ کہئے کام میں صناعِ سحر انگیز کے — صاف ہے توضیح نصب العین کا نقشہ کھنچا
یہ مدد دے حس انسانی کے اسکے ذہن کو — لیکے آغوشِ اثر میں اور بڑھتا ہے سدا
روح کو دیکر سہارا پھر یہ کرتا ہے بلند — اور جذباتِ شریفانہ کو دیتا ہے جِلا
اس سے وجدانات اعلیٰ پاتے ہیں اوجِ کمال — یہ دماغ و دل کو دیتا ہے تاثر کی غذا
قوتیں انسان کی کل اُسکے ہیں زیر اثر — روح کی گہرائیوں میں بھی ہے یہ پیرا ہوا
عام نظروں سے نظر صناع کی ہوتی ہے تیز — وہ تعقل کرتا ہے جب ایک نصب العین کا
ساتھ ہی اس کے کسی پیرایۂ دلچسپ سے — جوں کا توں کرتا ہے بس اسکا اعادہ بجا
اس بیان میں اس جگہ پیدا یہ ہوتا ہے سوال — کیا ہے صناعی؟ فقط تقلید کی بانگِ درا
جو اعادہ کرتی ہے حسی ظواہر کا تمام — کوئی کیا اس کا بھی ہے مقصود غایت مدعا
کیا نہیں اخلاق سے اس کا تعلق یا کہ ہے — محض صناعی کی خاطر سیکھیں صناعی کو کیا
ان سوالات عجیبہ کی ہے ایسی شاہراہ — ماہرانِ فن جہاں سے ہوتے ہیں باہم جدا

نقل فطرت کی بعینہ یا تشابہ بس یہی
بعض کے نزدیک صناعی کا مقصد ہے بڑا

بعض کہتے ہیں مناسب ہی نہیں صناع کو
نقلِ فطرت میں کرے فطرت کی پوری اقتدا

بلکہ کچھ ہو نقل اور کچھ ہو اضافہ ساتھ ساتھ
وہ اضافہ اپنے افکار اور وجدانات کا

فطرتِ خاموش سے اشیا کو کرے منتخب
ربط دیکر سر فطرت کو کرے اُنسے ادا

ایسی صناعی جو ہو مخصوص خط و خال کی
یا تصور کوئی یا سیرت ہو جس سے رونما

یہ حقیقت سے زیادہ منکشف ہوتی ہے اور
ذہن کو پہناتی ہے پورے تاثر کی قبا

زور میں وجدانی اثر کے آکر اک صناع کو
فکر ہوتی ہے بنا دے فعل کی اس کو سبھا

اس لئے پوری وہ کرتا ہی نہیں فطرت کی نقل
اتنی ہی کرتا ہے جو محسوس وہ خود کر چکا

پھر یہیں سے اور پیدا ہوتا ہے مشکل سوال
جسکو کہہ سکتے ہیں پہلے کے مقابل دوسرا

تابعِ اخلاق صناعی کو ہونا چاہئے
یا نہیں اخلاق سے بالا یا ہے اس کا مرتبہ

بعض اس بارہ میں رسکن کے ہوئے ہیں ہم خیال
کہتے ہیں اخلاق پر صنعت کی قائم ہو بنا

اپنے وجدانات اعلیٰ میں کرے ہم کو شریک
سب سے بڑھکر کارنامہ ہے یہی صناع کا

مقصدِ اعلیٰ ہے صناعی کا بس یہ ایک ہی
اس سے ہو اخلاق کی تعلیم کا نشو و نما

بعض یہ کہتے ہیں کہ صناعی نہ ہو پابند قید
اس کو ہونا چاہئے مطلق جمیل و خوشنما

ہئیت و صورت ہی میں موجود ہوتا ہے جمال
بے تعلق جس سے یہ رہتا ہے وہ ہے مادہ

بعض گذرے ہیں جمالئین میں ایسے بھی فرد
جو جمالیات کی کرتے ہیں اس حد تک ثنا

کہتے ہیں رتبہ جمالیات کا مافوق ہے
اور ہے اخلاق سے بھی اس کا اونچا مرتبہ

الغرض یہ ایسا دلکش روح پرور پھول ہے
جس کی خوبی سامعہ اور باصرہ کی ہے غذا

چشم نظارہ طلب میں اس سے سحر بیخودی
سامعہ میں اس کی لذت کا ہی اک طوفاں بپا

جنت گوش اور فردوسِ نظر ہر ایک میں
جلوہ ہائے حسن کی رہتی ہے نور افشاں ضیا

روز و شب سمع و بصر کے پردۂ فانوس پر
کوندتی رہتی رہے اُسکی برق استعجاب زا

سامعہ اور باصرہ کے ساز میں وہ تار ہیں
جن کی جنبش میں نہفتہ ہے مسرت کی صدا

حسن کی تصویر کے دو رخ ہیں دونوں دلفریب
باصرہ ہے ایک ان میں سامعہ ہے دوسرا

عشوہ ساماں صورتیں ہیں باصرہ سے ہمکنار
مژدہ ہائے روح کا مرکز ہے جوف سامعہ

عشوہ و ناز و کرشمہ کے خدنگِ دل شکار
باصرہ کے گھر میں بنتے ہیں یہ پیکانِ قضا

سامعہ کے باغ میں اٹکھیلیاں کرتی ہوئی — ہر روش پر پھرتی ہے نطق وتکلم کی صبا
دلربا رنگیں تصویریں بصر کے ساتھ ساتھ — سمع کے کاشانہ میں ضوریز نغموں کی ضیا
دونوں کی پہنائیاں لبریز کیف حسن ہیں — بستیاں احساس لذت کی ہیں ہر اک میں جدا!
یہ الگ اشیائے عالم سے نظر آتا نہیں — یہ دکھایا کرتا ہے رہکر انھی میں معجزہ
ریگ کے ذروں میں اجرام سماوی میں یہی — جس جگہ جاؤ ملے گا اس کا قصر آراستہ
کہکشاں کی چادر، پُرنور قرص ماہ ومہر — التہاب برق اور بزم نجوم لامعہ
سنگِ خارا کی ردائیں اور نباتی جامہ وار — کسوتِ حیوان وانساں سب میں ہے یہ رونما
رنگ سبزی ونواریزی اسی کے ہیں محل — مختلف لذت کی تصویریں ہیں جسمیں جابجا
باصرہ افسردہ بنگلوں میں گلوں کے ہے یہی — سامعہ میں لحن کے آئینوں کی یہ ہے جلا
ساز کے پردوں میں خوابیدہ ترنم بھی یہیں — جب زرا مضراب نے چھیڑا اٹھا ہنستا ہوا
یا حجابِ ساز اک محفل ہے ذوق گوش کی — حسن کے نغموں کا رہتا ہے جہانپر جگھٹا
یا یہ پردے اسکے روئے دلربا کی ہیں نقاب — جنکے اُٹھتے ہی شکیب وضبط ہوتے ہیں فنا
دہر کے خمخانۂ لذت کا ساقی ہے یہی — جس نے پیمانوں کو احساسات کے یکسر بھرا
روح بالیدہ ہو جس سے یہ ہے وہ کیفِ نشاط — گلکدے دلکے مہکجاتے ہیں یہ ہے وہ صبا
مادیت پست کردیتی ہے جب ذوقِ طلب — پھونکتا ہے آکے یہ انسان میں روح اعلا
اس سے جذباتِ مہذب جاگ اٹھتے ہیں تمام — گلشنِ تہذیب اس سے پاتا ہے نشو ونما
مادیت سے نکلکر سیر کرنے کے لئے — جادۂ ادراک پر لاتا ہے بنکر رہنما
چشمِ باطن کو دکھا دیتا ہے ایسا جلوہ زار — جس کا ایکا ذوقِ تشنہ سے نہیں پھر چھوٹتا
حسن مطلق کا۔ ایک پرتو ہے جو عالم میں ہے — سایہ پھر سایہ ہے جسکو اصل سے نسبت ہے کیا
یہ مقید حسن مطلق کی دلیل راہ ہے — اس سے ملتا ہے ہمیں روحانیت کا راستہ
وہ کشادہ راہ جس جا شش جہت کل اک قدم — وہ بلندی جس جگہ ہفت آسمان تحت الثریٰ
ہر طرف پھیلی ہوئی ذوقِ طلب کی تیز دھوپ — دور تک کوئی نشان رہ نہ منزل کا پتا
اور اس سے آگے گلزارِ تحیر کی مہک — جس سے بیخود ہو کے رہجاتا ہے ادراک رسا
رنگ وبوئے گیتی کے ہیں سرمایہ دار التذاذ — اس جگہ دونوں کے دونوں بے حقیقت ہیں ذرا
کل نواریزی تصدق لذت آوردہ سکوت — کل تبسم ہیچ وناکارہ شگفتہ وہ فضا

کیف و کم کی اس جگہ میزاں نہیں منت پذیر　　قید و بندش کا وہاں ادنیٰ نہیں کچھ واسطہ
نورِ عالم کل کا کل اس جا پہ اک داغ سپید　　اور وجودِ عالم کا اس جا ایسا جیسے نقشِ پا
مادیت تاب لاسکتی نہیں جس دید کی　　اس طرح کا حُسن مطلق ہر طرف پھیلا ہوا
لامکاں کے کوشکِ تقدیس میں اک عشوہ ریز　　سامنے جسکے ہے اپنی منزلت کا آئینہ
دیکھتا ہے آپ ہی اپنا جمال بیمثال　　غیر فانی اپنی سج دھج کا ہے خود ہی مبتلا
بے جھجک آگے بڑھے جاتے ہو بس ٹھہرو سرور
کیا نہیں معلوم تم کو راستہ ہے کونسا

سید ابوالقاسم سرور لکھنوی

ترانۂ دل

۱

نغمۂ جاں نوازِ ہستی ہوں　　روحِ مضرابِ سازِ ہستی ہوں
میں ہوں کون و مکاں کا آئینہ　　یعنی آگاہِ رازِ ہستی ہوں

۲

گرچہ میں نو نیازِ ہستی ہوں　　وقفِ آغوشِ نازِ ہستی ہوں
کیا کہوں؟ قلزمِ ابد میں ہیں　　ناخدائے جہازِ ہستی ہوں

۳

وجہ ہستی ہوں۔ نازِ ہستی ہوں　　تمغۂ امتیازِ ہستی ہوں
جنکی آنکھیں ہیں انکی نظروں میں　　میں سراپا جوازِ ہستی ہوں

۴

پیکرِ سوز و سازِ ہستی ہوں　　مئے میناگدازِ ہستی ہوں
اے امین! روشناس ہو میرا　　میں ہی لاریب رازِ ہستی ہوں

امین حزیں

اُن سے!

دلِ غمدیدہ کو غم سہنے کی عادت نہ رہی! 　　چشمِ محزوں میں لہو رونے کی ہمت نہ رہی!
مرنے کے دن نہیں، اور جینے کی حسرت نہ رہی 　　رحم کر، رحم! کہ اب ضبط کی طاقت نہ رہی!

دردِ دل بڑھ کے نہ محتاجِ مداوا ہو جائے!
تیرے قربان! ترا عشق نہ رسوا ہو جائے!

کیا غضب ہے کہ غمِ ہجر سنا بھی نہ سکیں 　　سینے کا زخم دکھائیں تو دکھا بھی نہ سکیں!
صبر ہو بھی نہ سکے، رنج اٹھا بھی نہ سکیں 　　آپ جا بھی نہ سکیں، تم کو بلا بھی نہ سکیں!

اشک پروردہ ہیں، غمدیدہ ہیں، مہجور ہیں ہم!
او "پری"! پاس بلالے کہ بہت دور ہیں ہم!

عشق نے ظلم، وہ ڈھائے ہیں کہ جی جانتا ہے 　　یاس نے گل وہ کھلائے ہیں کہ جی جانتا ہے!
درد دکھ، دل نے وہ پائے ہیں کہ جی جانتا ہے 　　ہم نے وہ رنج اٹھائے ہیں کہ جی جانتا ہے!

غمِ دل کون سنے؟ ان کی بلا بھی نہ سنے!
اور نصیبوں کو یہ ضد ہے کہ خدا بھی نہ سنے!

جانتا ہوں کہ تمہیں بھی ہے محبت مجھ سے! 　　گر یہ سچ ہے تو سنو! ایک شکایت مجھ سے!
پہلے تو رکھتی تھیں تم خط و کتابت مجھ سے! 　　کہتی سنتی تھیں، ہم قصۂ الفت مجھ سے!

"پھول" کی طرح مہکتے ہوئے خط آتے تھے!
دیکھ کر جن کو کنول، روح کے کھل جاتے تھے!

اَب، مگر مدتیں گزریں کہ وہ حالت نہ رہی! 　　وہ نوازش، وہ مروت وہ عنایت نہ رہی!
یہ تو کس دل سے کہوں مجھ سے محبت نہ رہی! 　　ہاں مگر اور خیالات سے فرصت نہ رہی!

تم ہو، اب، اور مدارت ہے بیگانوں کی!
کون لیتا ہے خبر عشق کے دیوانوں کی!!

خط تو لکھنے کو ہمیں لکھتی ہو اب بھی اکثر! 　　اجنبیت سے بھرے ہوتے ہیں لیکن یکسر

نام کو بھی نہیں ہوتا ہے محبت کا اثر !　　آخر، اس طرزِ تخاطب سے ہے کیا مد نظر ؟

کیا یہ مطلب ہے کہ میں لائقِ الفت نہ رہا ؟

دل مرا درخورِ غمہائے محبت نہ رہا ؟

دردمندوں پہ یہ ظلم و ستم بیجا نہ کرو !　　میری امیدوں کی فردوس کو برباد نہ کرو !

اسپہ راضی ہوں کہ تا حشر مجھے یاد نہ کرو !　　بن کے "انجان" مگر مائلِ فریاد نہ کرو !

حال یہ ہے کہ دل اب غم سے مٹا جاہتا ہے !

عشق پردہ نشیں، بے پردہ ہوا جاہتا ہے !

پھر نہ کہنا کہ "عبث کر دیا بدنام ہمیں" !　　"پہلے معلوم نہ تھا جور کا انجام ہمیں" !

یا یہ حیلہ کہ "نہیں آپ سے کچھ کام ہمیں" !　　"آپ بھجا نہ کریں عشق کے پیغام ہمیں" !

دیکھ لینا ! یہ بہانے نہیں کام آئیں گے !

تیرے دیوانے ترے عشق میں مرجائیں گے !

قتل کرکے ہمیں چھپتاؤ گی، تم یاد رہے !　　اپنے اس ظلم پہ شرماؤ گی تم یاد رہے !

اب اگر رحم نہ فرماؤ گی تم یاد رہے !　　حشر تک پھر نہ ہمیں پاؤ گی تم یاد رہے !

رفتم از دستِ تو اے غارت ایماں رفتم !!

بہوایم نہ شتابی کہ شتاباں رفتم !!!!

اختر شیرانی

مدیر نگار سے

بارک اللہ اے عزیز اے رہبرِ راہِ سلوک　　راہ سے میری ہٹالئے تونے سب خارِ شکوک

اے تخیل پرور اے نقادِ فن اے نکتہ چیں　　لے خیالی دیوتا پھیلی جبیں، باریک بیں

راس مجھکو آگئیں تیرے سخن کی گرمیاں　　ہوگیا اس آنچ سے اونچا مرے دل کا دھواں

آئینہ مجھکو دکھایا صاف گوئی نے تری　　سیکڑوں شکلوں سے ہاں شکلِ حقیقت دیکھ لی

ہے مگر میرے سوا ہر شخص کیوں شاکی ترا　　تجھکو دشمن کہتے ہیں میرے عزیز و اقربا

تیرہن کر دلمیں چُبھ جاتا ہے تیرا ہر سخن　　خوش نظر آتی نہیں ہے تجھ سی کوئی انجمن

لوگ کہتے ہیں تری باتوں کو دیوانے کی بڑ　　تیری اک اک چیز کو کہتے ہیں سب ہیں فتنہ کی جڑ

سبکو راس آتی نہیں تیرے سخن کی گرمیاں　　پھونک دیتی ہیں ترے الفاظ کی چنگاریاں

شور و غوغا سے ترے ناخوش ہیں سب اہلِ جہاں　　تیری ہر آواز پر اٹھتا ہے شورِ الاماں

میں سمجھتا ہوں مگر تجھ کو حقیقت آشنا　　یعنی چشمِ دہر کو فطرت کا آئینہ نما

ابو تراب ماہر انصاری

بصائر

دیو جانس کو یہ عادت پڑی تھی — کہ پھرتا شہر کی گلیوں میں اکثر
کسی نے ایکدن اس سے یہ پوچھا — کہ اے عاقل حکیم نکتہ پرور
کہیں کیا کوئی تیرا گھر نہیں ہے — کہ ہے آرام جاکر اس میں دم بھر
کہا گھر کی اگر تعریف یہ ہے — کہ لوگ آرام پائیں اسمیں رہ کر
تو پھر میں بھی جہاں آرام پاؤں — اسیکو فرض کر لیجئے مرا گھر

ایک مُسرف سے دیو جانس کلبی نے کہا — کہ مجھے آپ عطا کیجئے من بھر چاندی
سنکے مُسرف نے کہا اس سے کہ اے مرد فقیر — کچھ سمجھ میں نہیں آتی ترے فرمائش کی
ایک پیسہ کا جب اوروں سے تو کرتا ہے سوال — مجھ سے کس واسطے چاندی کی طلب ہے اتنی
بولا اسواسطے کرتا ہوں میں تجھ سے یہ سوال — دیکھتا ہوں کہ تنزل پہ ہے دولت تیری
اور لوگوں سے تو ملتا ہی رہیگا پیسا — تجھ سے لیکن نہ ملے گی کبھی پھر اک کوڑی

جلسہ کیا تھا کوئی فلاطون نے ایک دن — مدعو تھے جسمیں شہر کے سب صاحب کمال
آیا جو بزم میں دیو جانس تو اس طرح — کیچڑ بھری تھی پاؤں میں سر کے بڑھے تھے بال
آتے ہی دونوں پاؤں جو قالین پر ملے — تو فرش کو بنا دیا یکسر خراب حال
رگڑا کیا جو پاؤں اسیطرح دیر تک — تو حاضرین بزم نے اُس سے کیا سوال
کیا کر رہا ہے اے دیو جانس یہ حرکتیں — محفل کا پاس تجھکو نہ تہذیب کا خیال
اس نے دیا جواب کہ تلووں سے پاؤں کے — کرتا ہوں میں غرور فلاطوں کو پائمال
سنکر یہ بات اسکی فلاطوں ہنسا مگر — ہنسنے کے بعد کہنے لگا وہ خجستہ فال
کرتا ہے پائمال یہ بیشک غرور کو — لیکن بڑے غرور سے کرتا ہے پائمال

اک مصور نے کیا پیشہ طبابت کا شروع — خردہ گیری سے زمانہ کی جو عاجز آیا
ایک دن اپنے مطب میں تھا وہ مصروف علاج — دیکھکر اُسکو دیو جانس کلبی نے کہا
آپکی فہم و فراست کے ہوئے ہم قائل — چھوڑ دی آپنے تصویر کشی خوب کیا
کیونکہ تصویر بتاتی ہے مصور کے عیوب — قبر کی خاک چھپاتی ہے طبیبوں کی خطا

عبدالباری آسی

باب الاستفسار

(مولوی شفیع احمد صاحب ۔ سکندرآباد)

(۱) عہد اسلام میں سب سے پہلے لائبریری کا قیام کب ہوا اور رفتہ رفتہ کیا ترقی ہوئی۔

(۲) شجرالدر کے مختصر حال مطلوب ہیں۔

(۳) لفظ سکینہ (بفتح سین) ہے یا سُکینہ (بضم سین) جناب سکینہ کی شادیوں کی تعداد میں اختلاف ہے آپ کے نزدیک صحیح کیا ہے، ممکن ہو تو مختصراً آپ کی دیگر خصوصیت بھی تحریر فرما دیجئے

(**نگار**) میں آپ کے استفسار کے انداز سے خوش ہوا کہ جو بات پوچھنا تھی اُس کو مختصراً لکھدیا اور اس طرح گویا آپ نے اپنے اور میرے دونوں کے وقت کی قدر کی۔

ترتیب وار آپ کے استفسارات کا جواب درج کیا جاتا ہے:۔

عہد اسلام میں سب سے پہلی لائبریری جس کا پتہ تاریخ سے چلتا ہے، خالد بن یزید بن معاویہ کے زمانہ میں قایم ہوئی۔ اس خلیفہ نے اپنی ساری عمر علوم یونانی اور خاصکر علم الکیمیا اور علم العقاقیر کے مطالعہ میں صرف کردی تھی اس نے بہت سی کتابوں کا ترجمہ بھی عربی زبان میں کرایا اور مکتبہ میں محفوظ کردیا۔

جب خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے ابتدائی زمانہ میں وبا پھیلی تو خلیفہ نے حکم دیا کہ کتابیں مکتبہ سے نکال کر لوگوں کو مطالعہ کے لئے دیجائیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خالد کا یہ مکتبہ زیادہ تر پرائیویٹ حیثیت رکھتا تھا۔ اس لئے سب سے پہلا پبلک کتب خانہ جو زیادہ وسیع پیمانہ پر قائم کیا گیا، وہ دارالحکمۃ تھا جو خلیفہ ماموں عباسی کے عہد میں بمقام بغداد قایم ہوا۔ خلیفہ ماموں نے کتاب خانے کو وسیع تر بنانے کے لئے نہایت قیمتی قیمتی قلمی نسخے یونانی کتابوں کے بازنطینی سلطنت میں مول لئے اور ان کے ترجمے عربی زبان میں کرائے۔ دارالحکمۃ میں ہر علم و فن کی کتابیں موجود تھیں اور اس وقت تک کہ فتنۂ تاتار نے ۶۵۶ھ میں اس نایاب ذخیرہ کو منتشر نہ کردیا۔ یہ کتاب خانہ بغداد میں قایم رہا۔

اسی اہمیت کی ایک لائبریری فاطمی خلفائے مصر کے عہد میں بمقام قاہرہ قایم ہوئی تھی ۴۳۵ھ میں وزیر ابوالقاسم علی بن احمد نے ایک مکمل فہرست اس کتاب خانہ کی مرتب کی اور کتابوں کی جلدبندی ازسرنو ہوئی۔ ابوخلف القضاعی اور ابن خلف الوراق دو ماہر فن اس کام کے مہتمم مقرر کئے گئے۔

یہ کتب خانہ آخری فاطمی خلیفہ کے عہد تک قاہرہ میں پایا جاتا تھا جب صلاح الدین ایوبی نے مصر پر حملہ کیا تو فاطمی خلافت

کے ساتھ اس کتاب خانہ کو بھی ختم کر دیا۔ اس لائبریری کی بہت سی کتابیں قاضی الفاضل کے ہاتھ لگیں اور یہ ان کو اپنے قایم کردہ مدرسۂ فاضلیہ کے لئے لے گیا۔ مگر یہاں ان کی حفاظت پوری طرح نہ ہوسکی اور القلقشندی کے زمانہ تک نیست و نابود ہوگئیں اس لائبریری میں ۶۵۰۰ کتابیں صرف علوم محققہ کی تھیں (جیسے ریاضیات فلکیات وغیرہ) یہاں ایک تانبہ کا کرہ افلاطون کا بنایا ہوا بھی پایا جاتا تھا اس پر ایک تحریر کندہ تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ خالد بن یزید نے اسے مول لیا تھا۔

تیسری قابل ذکر لائبریری اموی خلفار قرطبہ کی تھی جو المرالطین کے حملہ کے بعد پانچویں صدی ہجری کی ابتدا میں تباہ ہوگئی۔

چھوٹی چھوٹی لائبریریاں یوں تو بہت سی تھیں، جن میں سے ایک قابل ذکر وہ تھی جسے سلطان مسعود غزنوی نے قایم کیا تھا اور جس کی بہت سی کتابیں بعد کو بخارا چلی گئیں بہت سے ان پرائیویٹ کتب خانوں کا پتہ بھی تاریخ سے پتہ چلتا ہے جو طلبہ و علمار کے مطالعہ کے لئے قایم کی گئی تھیں۔ چنانچہ الصولی کا کتب خانہ اور غرس النعمت الصابی کا جو بغداد میں قایم تھا مخصوص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس سے قبل ابو تمام مولف حماسہ کا بھی ہمدان میں مختلف کتب خانوں سے مستفید ہونا ثابت ہوتا ہے۔ نظام الملک طوسی، سلطان ملک شاہ سلجوقی کے وزیر نے اس طرف خاص توجہ کی اور پبلک کتب خانے قایم کرنے کا ذوق پیدا کیا۔ خود نظام الملک نے جو متعدد مدرسے قایم کئے تھے ان میں اس نے کتب خانے بھی قایم کئے تھے۔

مصر و شام کے ایوبی امرار نے نظام الملک کی تقلید میں مدرسے قایم کئے لیکن کتب خانوں کی طرف اپنی توجہ نہیں کی۔ اس کے بعد صدیوں تک کتب خانوں کے قیام کا پتہ چلتا ہے جو بصورت وقف مسجدوں اور مدرسوں کے ساتھ شامل ہوتے تھے۔

چوتھی صدی ہجری میں کتب خانوں کے لئے علیحدہ عمارات بنانے کا رواج ہوگیا تھا، چنانچہ بہاؤ الدولہ کے وزیر سابور بن اردشیر نے بغداد میں ایک خاص عمارت اس غرض سے طیار کرائی تھی جس کا نام دارالکتب تھا اور جس میں دس ہزار سے زیادہ کتابیں موجود تھیں، اسی طرح مشہور جغرافی المقدسی نے شیراز میں اپنی لائبریری اس عمارت میں جمع کی جس کو عضد الدولہ نے اسی غرض سے تعمیر کرایا تھا۔ اس عمارت میں ایک بڑا ہال تھا۔ اور تین طرف متعدد کمرے خزائن کتب تھے۔ ہال کے چاروں طرف اور کمروں میں الماریاں تھیں جنہیں کتابیں رکھی ہوئی تھیں، لیکن الماری میں کوئی تقسیم خانوں کی نہ تھی۔ قاہرہ میں فاطمی لائبریری کی الماریوں میں خانے بھی بنے تھے اور ہر خانے کا دروازہ الگ تھا جو مقفل کر دیا جاتا تھا۔

کتابیں فنون وار علیحدہ علیحدہ رکھی جاتی تھیں۔ اور بعض کتابوں کی متعدد نقلیں ہوتی تھیں، چنانچہ فاطمی کتب خانے میں خلیل کی کتاب العین کے بیس نسخے، طبری کے تیس نسخے اور ابن درید کے جمہرہ کے ۱۰۰ نسخے موجود تھے۔

فہرست کی ترتیب بھی فنون کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ ہوتی تھی۔ اور فاطمی کتب خانوں میں یہ بھی تھا کہ ہر الماری پر اس کی کتابوں کی فہرست آویزاں رہتی تھی۔ ان کے انتظام کی صورت یہ تھی کہ ایک مہتمم ہوتا تھا جسے صاحب کہتے تھے اور ایک یا ایک سے زیادہ لائبریرین ہوتے تھے جن کا نام خازن تھا۔ متعدد محرر یا نقل کرنے والے بھی ہوتے جو ناسخ کہلاتے تھے۔

اسی طرح خدام جن کا نام فراش تھا۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض نہایت مشہور عالم لائبریرین ہوئے ہیں چنانچہ مشہور مورخ ابن مسکویہ وزیر ابوالفضل کی لائبریری کا اور الشابشتی فاطمی کتب خانہ کا خازن تھا۔

کتابیں مول بھی لی جاتی تھیں اور نقل بھی کرائی جاتی تھیں۔ مقریزی نے ایک لائبریری کا بجٹ جو خلیفۂ الحاکم کے عہد میں قایم ہوئی تھی ۲۵۷ دینار سالانہ لکھا ہے جس میں سب سے بڑا صرف (۹۰ دینار) کاغذ کا تھا اور اس کے بعد خازن کی تنخواہ کا جو ۴۸ دینار تھی۔

کتب خانے ہر شخص کے لئے کھلے رہتے تھے اور کوئی معاوضہ کسی سے نہیں لیا جاتا تھا۔ بعض لائبریریوں میں ان طلبہ و محققین کے مصارف بھی برداشت کئے جاتے تھے جو دیگر ممالک سے تحقیق علم کے شوق میں آتے تھے، جو لوگ کتابیں لائبریری سے باہر لیجاتے تھے۔ انھیں کچھ رقم جمع کرنی پڑتی تھی۔

بعض مصنفین اپنی کتابیں بطور وقف دیتے تھے، چنانچہ ابن خلدون نے اپنی مشہور تالیف کتاب العبر فاس کی لائبریری کو اسی طرح دی تھی۔ یہ کتاب صرف معتبر آدمیوں کو معقول معاوضہ پر دو ماہ کے لئے دیجاتی تھی۔

بعض لائبریریاں صرف مطالعہ کے لئے تھیں جن کی کوئی کتاب باہر نہ جاسکتی تھی۔ چنانچہ قاہرہ میں مدرسۂ محمودیہ کا کتب خانہ جو ۷۹۷ھ میں قایم ہوا تھا اسی قسم کا تھا۔ اس لائبریری کے قایم کرنے والے جمال الدین محمود بن علی نے یہ وصیت کردی تھی کہ کوئی کتاب عمارت سے باہر نہ جانے پائے ابن مسکویہ کے تجارب الامم (جو گب موریل کے سلسلہ میں یورپ نے شائع کی ہے) اسی کتب خانہ کی دولت تھی۔

الغرض تاریخ سے یہ امر ثابت ہے کہ کتب خانے کے قیام میں مسلمانوں کی خدمات اہل مغرب سے بہت زیادہ قدیم ہیں اور یورپ کا موجودہ تاریخی خزانہ، مسلمانوں کے انھیں قدیم کتب خانوں کا سرمایہ ہے

(۲) شجر الدر، مصر کی اُس مشہور ملکہ کا نام ہے جس کا عہد حکومت ہر چند بہت مختصر رہا لیکن سیاسی جد و جہد کے لحاظ سے اس کو خاص اہمیت حاصل ہے، مصر کی تاریخ اسلام میں صرف یہی ایک خاتون تھی جسنے ملکہ کی حیثیت اختیار کرکے خود مختارانہ حکومت کی۔ شجر الدر ملک صالح ایوبی کی کنیز تھی اور جب اس کے بطن سے صالح ایوبی کا ایک لڑکا خلیل نامی پیدا ہوا تو یہ اُم خلیل کی کنیت سے سلطانہ اسی وقت تسلیم کی گئی۔ لیکن حکمران ہونے کا زمانہ ابھی نہ آیا تھا یہ لڑکا ۶ سال کا ہوکر مرگیا۔ اور پھر اسکے کوئی اولاد نہ ہوئی۔

جب ۶۴۷ھ میں لوئی نہم شاہ فرانس کے ساتھ جنگ کے دوران میں صالح ایوبی کا بمقام منصورہ انتقال ہوا تو شجر الدر نے اس واقعہ کو چھپایا اور ایوبی کے بیٹے توران شاہ کو عراق سے طلب کیا جب یہ پہونچ گیا اس وقت شجر الدر نے صالح ایوبی کی وفات کا حال لوگوں پر ظاہر کیا۔ چاہیے یہ تھا کہ توران شاہ شجر الدر کا ممنون ہوتا۔ لیکن اس نے بجائے اعتراف احسان کے اس کے ساتھ بُرا سلوک شروع کیا۔ توران شاہ عراق سے مملوکوں کی ایک جماعت ساتھ لایا تھا اس کا طرز عمل بھی مصری

مملوکوں کے ساتھ اچھا ثابت نہ ہوا اور یہ خود بھی اس وقت کی سیاسیات مصر کو سلجھانے کی اہلیت نہ رکھتا تھا۔ ایک دن اس نے شجر الدر سے اپنے باپ کی تمام دولت کا مطالبہ کیا۔ شجر الدر نے کہا کہ تمام روپیہ جو جمع تھا وہ فرانس کے خلاف جنگ کرنے میں صرف ہو گیا، اور خاموش ہو رہی لیکن جب اس کا حال وہاں کے امراء اور سرداران فوج کو معلوم ہوا تو عام برہمی پھیل گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ توران شاہ ۶۴۸ھ میں قتل ہوا اور شجر الدر کے ہاتھ میں عنانِ حکومت دیدی گئی اور سکوں پر اس کا نام اس طرح منقوش کیا گیا۔

المعتصمة ، الصالحة ، أم خليل
عصمت الدنيا والدين، ملكة المسلمين

اُس نے امیر ایبک کو جو اس کا بڑا معتمد علیہ سردار تھا اتابک (سرعسکر) بنایا۔ چونکہ شام کے امراء، اس انتخاب پر راضی نہ تھے اور انھوں نے دمشق میں ملک الناصر یوسف ثانی کو بادشاہ منتخب کر لیا تھا اس لئے خلیفہ نے مصری امراء کو بھی مجبور کیا کہ وہ مرد حکمران تجویز کریں چنانچہ اتابک عزیز الدین بادشاہ منتخب کیا گیا اور شجر الدر کا نکاح اس کے ساتھ ہو گیا۔ اس لئے شجر الدر کی تنہا حکومت صرف ۸۰ دن رہی۔

چونکہ یہ زمانہ وہ تھا جب باغی مملوکوں یا فرمانروائے حلب نے جنگ کا محاذ قایم کر رکھا تھا اور ایبک کو الصالحیہ میں حدود شام کے قریب ہی رہنا پڑتا تھا اس لئے تمام نظام حکومت شجر الدر ہی کے سپرد تھا اور وہی تمام فرمانروایانہ خدمات کو تنہا انجام دیتی تھی۔ چونکہ یہ قوت حکومت کی بہت شایق تھی اس لئے اس نے اپنے شوہر ایبک کو روکا کہ وہ اپنی پہلی بیوی اور لڑکے سے نہ ملے اور جب بعد کو یہ معلوم ہوا کہ وہ زنگی خاندان میں کسی عراقی شاہزادی سے شادی کرنا چاہتا ہے، تو اس نے سلطان حلب سے شادی کی درخواست کر دی

اب حالت یہ تھی کہ ایبک، شجر الدر کو اور یہ ایبک کو اپنی راہ سے دور کرنا چاہتے تھے اور ہر ایک اسی فکر میں مبتلا تھا۔ شجر الدر نے سخت فریب سے کام لیکر ایبک کو اپنی طرف سے مطمئن کر دیا اور جب وہ قاہرہ اس کے پاس آیا تو اپنے دو مملوکوں کے ذریعہ سے اس کو حمام کے اندر غسل کرتے وقت قتل کرا دیا۔ چونکہ اس کے بعد کوئی اور مملوک سردار اپنی قسمت اس کے ساتھ وابستہ کرنے پر آمادہ نہ ہوا اور لوگ اس کی اس بیرحمی سے پہلے ہی برہم ہو چکے تھے، اس لئے ایبک کی پہلی بیوی نے اس کو اپنے غلاموں سے گرفتار کرا کے قتل کرا دیا۔ اس کا ایک مختصر سا مقبرہ مصر میں اب بھی موجود ہے

(۳) لفظ تو سُکینہ (بضم سین) ہی ہے لیکن بعض لوگ سکینہ (بفتح سین بھی کہتے ہیں۔ یہ حقیقتاً آپ کا شاعرانہ نام تھا جو آپ کی شاعرماں رباب بنت امرء القیس نے رکھا تھا۔ آپ کا اصلی نام (بروایت ابن الکلبی) اُمیمہ یا اُمینہ تھا اور بروایت اغانی آمنہ یا اُمینہ۔

آپ کی تاریخ ولادت صحیح طور سے متعین نہیں ہو سکتی لیکن یہ یقینی ہے کہ آپ واقعۂ کربلا کے وقت بہت کمسن تھیں اور اگر

ابن اثیر کے بیان کو صحیح سمجھا جائے تو یہی تسلیم کرنا پڑیگا کہ آپ کربلا کے زندانیوں میں بھی شامل تھیں، آپ کی شادیوں کی تعداد کے متعلق واقعی بہت اختلاف ہے۔ ابن قتیبہ نے تین فہرستیں دی ہیں۔ اغانی نے چھ فہرستیں درج کی ہیں جو باہم مختلف ہیں اس لئے ایسی صورت میں اُسی اولیں فہرست کو صحیح سمجھنا چاہئے جس پر ابن قتیبہ اور ابن سعد تقریباً متفق ہیں اور جسے ابن خلکان نے بھی نقل کیا ہے۔ یہ فہرست اس طرح ہے:-

پہلے شوہر مصعب بن الزبیر بن العوام تھے (جو ۷۱ھ یا ۷۲ھ میں عبد الملک بن مروان کے خلاف جنگ کے دوران میں مارے گئے) ان سے ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کا نام جناب سکینہ نے اپنے ماں کے نام پر رباب رکھا، اس لڑکی کی شادی بعد کو مصعب کے بھائی سے ہوئی لیکن کمسنی میں انتقال ہو گیا۔ دوسرے شوہر عبد اللہ بن عثمان تھے جو مصعب کے بھتیجے یا بھانجے تھے۔ اس شادی سے ایک صاحبزادے عثمان پیدا ہوئے (ابن سعد نے حکیم اور ربیعہ دو اور بچوں کا بھی نام لکھا ہے) یہ شادی عدم توافق مزاج کی وجہ سے مسرور ثابت نہ ہوئی۔ تیسرے شوہر کا نام ابن سعد نے زید بن عمر بن عثمان بن عفان بتایا ہے۔ لیکن یہ شادی اور زیادہ ناکام رہی اور طلاق ہو گئی۔ طلاق کے بعد الاصبغ بن عبد العزیز بن مروان (جو عمر بن عبد العزیز کے بھائی تھے) کے ساتھ شادی کی لیکن خلوت صحیحہ نہ ہو سکی اس کے بعد ابراہیم بن عبد الرحمن بن عوف سے شادی ہوئی اور تین ماہ تک ساتھ رہا، لیکن کہا جاتا ہے کہ ہشام بن عبد الملک کے حکم سے طلاق دلوا دی گئی۔ لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ ابن حجر اور ابن قتیبہ کی روایت کے مطابق ابراہیم کا انتقال ۹۶ھ میں ہوا جبکہ ان کی عمر ۷۵ سال کی تھی اس لئے ظاہر ہے کہ شادی اس سے قبل ہوئی ہوگی اور ہشام کی خلافت شروع ہوتی ہے ۱۰۵ھ سے

ابن قتیبہ نے اس کے بعد عمر بن حاکم بن حزام سے شادی ہونا بیان کیا ہے لیکن بغیر کسی سند کے جناب سکینہ بہت خوش ذوق اور سلیقہ مند خاتون تھیں، خودداری، رکھ رکھاؤ اور بلند نظری آپ کی خصوصیات فطرت تھیں اور اسی کے ساتھ آپ بے انتہا خوش طبع بھی تھیں اور شعر و موسیقی کے ساتھ خاص لگاؤ تھا۔ اغانی میں متعدد واقعات درج ہیں جن سے آپ کے اس مخصوص ذوق کا پتہ چلتا ہے۔ حسب بیان اغانی آپ کو اپنے حسن و جمال اور شرافت نسبی پر بھی بڑا ناز تھا۔ آپ کے بال بہت حسین تھے، اور خصوصیت کے ساتھ آپ جوڑا نہایت خوشنما باندھتی تھیں جس کی ممانعت بعد کو عمر بن عبد العزیز نے کر دی تھی۔

آپ کی ساری عمر حرمین ہی میں بسر ہوئی اور ۱۱۷ھ میں آپ نے انتقال کیا۔

اقتباسات علمیہ

فن طیران و بجلی فن طیران کے منجملہ دیگر مشکلات کے ایک بڑی مشکل یہ بھی ہے کہ حالت پرواز میں اُس کہربائی قوت سے کیونکر محفوظ رہ سکتے ہیں جو فضا میں خود ہوائی جہاز سے پیدا ہوجاتی ہے۔

اگر کوئی ہوائی جہاز دو ایسے بادلوں کے درمیان سے گزرتا ہے جن میں پہلے سے کافی کہربائیت موجود ہوتی ہے تو اکثر و بیشتر جہاز کی رفتار اس کہربائیت میں تحریک پیدا کرکے شعلۂ برق پیدا کردیتی ہے اسی طرح اگر وہ کسی حامل کہربا بادل کے نیچے سے گزرتا ہے تو بھی اس کا اندیشہ ہوتا ہے جس سے جہاز و جہاز راں دونوں کی تباہی یقینی ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ اس وقت تک اس خطرہ کے دفاع کی کوئی تدبیر کسی کے ذہن میں نہیں آئی لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی یقینی ہے کہ یورپ کا جانباز انسان باوجود اس خطرہ کے علم کے نہایت آزادی اور بیباکی کے ساتھ فضا اور اس کی بجلی کو چیرتا پھاڑتا نکل جاتا ہے اور اس خطرہ کا امکان اسکی ہمت کو اور زیادہ قوی بنا دیتا ہے۔ یہ ہیں اس قوم کے کارنامے جسکے اندر سوائے معائب کے یہاں کے منحرف نگاہ والوں کو اور کچھ نظر نہیں آتا اور جس کے مقابلہ میں ہندوستان کا بڑے سے بڑا مسلمان مصلح استقامت فی الارض کے لئے سب سے بڑا ثبوت جو پیش کرتا ہے وہ اس سے زیادہ نہیں ہوتا کہ اُس کو صرف گالیاں دینے اور دوسروں کو بُرا کہنے میں خاص ملکہ حاصل ہے۔

مقلوب گفتگو آپ نے حرف مقلوب، ظرف مقلوب اور کتابت میں صنعت مقلوب کا ذکر سنا ہوگا، لیکن مقلوب گفتگو کی طرف آپ کا خیال منتقل نہ ہوا ہوگا۔ مغرب میں جہاں ہر طرح کی اہم گفتگو کے لئے ٹیلیفون کا استعمال برابر ہوتا رہتا ہے، وہاں ایک بڑی زحمت یہ بھی ہے کہ اگر کوئی راز کی بات کرنا ہو تو اس کا علم ٹیلیفون کے تعلق سے اور دوسروں کو بھی ہوجاتا ہے۔ چنانچہ اب اس دشواری کو دور کرنے کے لئے ایک خاص آلہ ایسا ایجاد ہوا ہے جو ٹیلیفون کو مقلوب کرکے پہونچایا کرے گا اور اس طرح دوسرے لوگوں کو یہ ساری آواز اک مہمل و بے معنی چیز نظر آئے گی، لیکن جس شخص سے گفتگو کی جائے گی اس کے پاس دوسرا آلہ ہوگا جو اس مقلوب گفتگو کو پھر اصلی حالت میں منقلب کرکے پیش کریگا۔ گویا اس طرح خطاب کرنے والے اور خطاب کئے جانے والے دونوں معمولی طور سے گفتگو کریں گے اور سنیں گے لیکن درمیان کے لوگ اس کو بالکل نہ سمجھ سکیں گے۔

ابوّت کی علمی تحقیق ولایت میں بسا اوقات دیوانی مقدمات کے سلسلہ میں تحقیق ولدیت کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہوجاتا ہے اور یہ ثابت کرنا دشوار ہوجاتا ہے کہ فلاں شخص اپنے باپ ہی کا بیٹا ہے یا نہیں۔ جرمنی کے ڈاکٹروں نے اس کی تحقیق کے لئے ایک نیا علمی طریقہ ایجاد کیا ہے جو خون کے جانچ سے متعلق ہے۔ تفتیش و جستجو سے معلوم ہوا ہے کہ باپ کے

خون کا قوام بیٹے کے خون کے ذرات پر ایک خاص قسم کا اثر پیدا کرتا ہے اور اس کو دیکھکر معلوم ہو سکتا ہے کہ فلاں شخص فلاں شخص کا باپ نہیں ہے ہر چند یہ پورے یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں، فلاں کا باپ ضرور ہے۔

۱۹۲۲ء میں جرمنی کے اندر ۲۰۰ لڑکوں پر اس عمل کا تجربہ کیا گیا، اور صرف ایک لڑکا ایسا ملا جسکے متعلق یقینی طور پر نہیں کہا جا سکا کہ فلاں اس کا باپ نہیں ہے۔

پروشیا کی ایک عدالت العالیہ نے اس امتحان پر اعتماد کرنے سے انکار کر دیا تو برلن کی طبی سوسائٹی نے سخت احتجاج کیا اور عدالت کے فیصلہ کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا۔ جرمنی اور اسٹریا کی بہت سی ماتحت عدالتوں نے اس طریق کو صحیح تسلیم کر کے قانونی ثبوت میں شامل کرنا شروع کر دیا ہے اور غالباً وہ زمانہ دور نہیں جب ساری دنیا کی عدالتیں اس ایجاد سے فائدہ اٹھانے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔

لاسلکی سے نشان انگشت آدمی کے شناخت کے لئے انگلی کا نشان، پاؤں کا نشان، ناک کا نشان خاص چیز ہے اور مجرموں کی شناخت و گرفتاری میں ان نشانات سے بہت کام لیا جاتا ہے۔ اب لاسلکی نے اس کو بھی اپنے حیز عمل میں لے لیا ہے اور لندن کی پولیس نے ایک نیا طریقہ ایسا ایجاد کیا ہے جس کے ذریعہ سے ایک شخص کا نشان انگشت لاسلکی کے ذریعہ سے دنیا کے ہر گوشہ میں فوراً پہونچایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں وہاں ایک مشتبہ شخص گرفتار ہوا اور خیال پیدا ہوا کہ غالباً امریکہ میں یہ شخص مطلوب ہے۔ چنانچہ اس کا نشان انگشت فوراً امریکہ بھیجا گیا اور وہاں سے اسیوقت جواب آگیا کہ فلاں جرم میں اس شخص کی گرفتاری مطلوب ہے

مافوق البنفسجی شعاع کی کھڑکیاں چونکہ اب یہ امر محقق ہو چکا ہے کہ آفتاب کی ہفت رنگ شعاعوں میں سے وہ شعاع جو مافوق البنفسجی (ultra violet) کہلاتی ہے (یعنی جو بنفشئی رنگ کی شعاع کے بعد کی ہے) صحت کے لئے بہت مفید ہے اس لئے یوروپ میں اب ایسی کھڑکیوں کا رواج ہو چلا ہے، جنسے یہ مفید شعاع از خود بغیر کسی آلہ کے گھر میں پہونچتی رہتی ہے۔

اس کی تدبیر نہایت آسان ہے اور وہ یہ کہ کھڑکی کا ڈھانچہ کسی ہلکی لکڑی کا طیار کیا جائے اور معمولی تار کا جال اسمیں کس دیا جائے (جیسے ٹینس کھیلنے کے بیٹ میں تانت کا جال کسا ہوا ہوتا ہے) اس جال پر (Cellophane) بچھا دی جائے اور کھڑکی کا دوسرا ڈھانچہ جو بالکل پہلے ڈھانچہ کی طرح تاروں سے کسا ہوا ہو گا اسپر رکھ کر پیچ سے مضبوط کر دیا جائے

چونکہ یہ ترکیب بہت سہل ہے اور دوا بھی نہایت ارزاں ملتی ہے۔ اس لئے اگر ہندوستان کے مکانات میں بھی خوابگاہ اور نشستگاہ کے کمروں میں اس قسم کی کھڑکیاں استعمال کی جائیں تو یہاں کی قدامت پرستی کو زیادہ صدمہ پہونچنے کا اندیشہ نہیں ہے۔

استعمالی ملبوس اور صحت

ایک ہی کپڑے کو عرصہ تک بغیر دہوئے ہوئے پہننے سے صحت کو جس قدر نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے اس کا اندازہ ایک ڈاکٹر کے بیان سے ہوسکتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ صرف ایکدن کے استعمال سے جراثیم کا اوسط فی مربع انچہ ۴ لاکھ تک پہونچ جاتا ہے۔ اور اگر قمیص چھہ دن تک بغیر دہوئے ہوئے پہن لیجائے تو جراثیم کی تعداد فی مربع انچ ایک کروڑ تک پہونچ جاتی ہے۔ لیکن اگر اسی کو صابون سے دہو لیا جائے تو تعداد گھٹ کر ایک ہزار رہ جاتی ہے قمیص یا کسی اور ملبوس کے نیچے بنیان کا استعمال اسی لئے اب یورپ سے مفقود ہو گیا ہے کہ جسم سے ملے رہنے کیوجہ سے اس میں جراثیم بہت پیدا ہو جاتے ہیں

استعمالی کپڑے کو روز صابون سے دہو کر دہوپ میں خشک کر لینا صحت انسانی کے لئے بہت مفید ہے۔

ایک نیا ہوائی جہاز

فرانس کے کسی نوجوان انجینیر نے ایک نئی قسم کا ہوائی جہاز طیار کیا ہے جمیں نہ بازو ہیں نہ محرک (Propeller) اس میں کچھ ایسے پھنکے اس نے لگائے ہیں کہ ان کی حرکت سے ایک قوی تموج ہوا میں پیدا ہوتا ہے اور جہاز دفعتہً سطح زمین سے ملند ہو جاتا ہے۔ موجد نے اس جہاز کا ایک نمونہ پیش کرکے اس کو اڑایا تو ہلکی سی بھنبھناہٹ اس سے پیدا ہوئی۔ موجد کا خیال ہے کہ یہ جہاز فی گھنٹہ ۶۰ میل سے ۱۰۰ میل تک پرواز کر سکتا ہے۔

قدرت سے انسانی جنگ

ڈیلی میل کا نامہ نگار جنیوا لکھتا ہے کہ فرانس اور سوئٹزرلینڈ کی سرحد پر ایک خطرناک طوفان گرج اور بجلی کا نمودار ہونے پر ایک نئی قسم کے نہایت قوی پھٹنے والے بان دو گھنٹہ تک استعمال کئے گئے تاکہ بادل نہ بننے پاویں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طوفان نکل گیا اور زراعت کو کوئی نقصان نہ ہوا، لیکن قریب کے دوسرے ضلع میں جہاں یہ بان یا ہوائیاں استعمال نہیں کی گئی تھیں وہاں کاشت کو بہت نقصان پہونچا۔

سینما اور لاسلکی

ریڈیو کے مظاہر ترقی میں سب سے زیادہ دلچسپ منظر تصاویر متحرک کا منتقل کرنا ہے۔ یعنی جس طرح آواز معمولی تصویر، نشان انگشت وغیرہ ریڈیو کے ذریعہ سے دور دراز مقامات تک منتقل کئے جا سکتے ہیں۔ اسیطرح اب سینما کی تصاویر متحرکہ کو بھی منتقل کیا جا سکتا ہے جس سرعت کے ساتھ فلم کی تصاویر سامنے آتی ہیں، اس تیزی کے ساتھ ان کو ایڈیو کا آلہ فضا کی قدرتی کہربائیت سے کام لیکر دوسری جگہ پہونچا دیتا ہے اس ایجاد نے گویا اس بات کو ممکن کر دیا ہے کہ ہر وہ شخص جسکے پاس ریڈیو کا آلہ ہو اپنے گھر میں نہایت آسانی سے سینما دیکھ سکتا ہے۔ الغرض ریڈیو کی ترقیاں برابر جاری ہیں اور اس کی قبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یورپ کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں یہ عام نہ ہو رہا ہو اس وقت سویڈن میں سب سے زیادہ اس کا استعمال ہو رہا ہے۔ یعنی وہاں ہر فی ہزار آدمی تقریباً ۴۰ سٹ ریڈیو کے استعمال کئے جاتے ہیں اُسکے بعد انگلستان، آسٹریا اور جرمنی کا نمبر ہے۔ بلجیم میں اندھوں کے لئے ریڈیو کے رسایل بھی شایع ہوتے ہیں جن کی مدد سے وہ بغیر دیکھے ہوئے اپنا سٹ ریڈیو کا درست کرکے کام لے سکتے ہیں۔

مطبوعات موصولہ

طبقات الامم

یہ کتاب ترجمہ ہے قاضی ابوالقاسم صاعد بن احمد اندلسی کی مشہور تصنیف طبقات الامم کا جسے قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی نے کیا ہے اور دار المصنفین اعظم گڈھ سے شائع ہوا ہے۔

ابوالقاسم صاعد پانچویں صدی ہجری میں اندلس کا مشہور عالم شخص تھا جو تمام نقلی و عقلی علوم پر کامل عبور رکھتا تھا۔ طبقات الامم [illegible] نصف [illegible] سے بحث کی ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس مختصر تصنیف میں بہت کچھ قابل قدر معلومات اس نے فراہم کر دیئے ہیں۔

ترجمہ نہایت صاف و شگفتہ ہے اور جناب اختر جوناگڈھی کے ذوق علم کا پورا ثبوت دیتا ہے۔ طباعت بہت صاف و روشن ہے قیمت عہ ملنے کا پتہ دار المصنفین اعظم گڈھ۔

قسطنطنیہ میں ترکوں کی واپسی

امریکہ کے مشہور مصنف الکزنڈر پاول نے ایک کتاب [illegible] لکھی ہے اس میں ایک باب [illegible] موضوع پر بھی ہے کہ "ترک کیونکر واپس آئے"

جناب محمد عبد الغنی قریشی نے [illegible] ایک [illegible] نام سے [illegible] ترجمہ صاف و [illegible] ہے [illegible] طباعت بھی پاکیزہ و [illegible] کتابت [illegible] پنجاب [illegible] [illegible]

اولی الالباب سے خطاب

یہ ایک رسالہ ہے جسے جناب سید [illegible] صاحب ایم اے ال ال بی [illegible] آباد نے مذہبیات کی موجودہ سقیم حالت سے متاثر ہو کر لکھا ہے اور خصوصیت کے ساتھ اس مسئلہ پر بحث کی ہے کہ [illegible] موجودہ ترتیب قرآنی فہم و تلاوت کے لئے موزوں ہے یا نہیں اور اگر نہیں ہے تو [illegible] کیا تبادل [illegible] اس کے ساتھ اس مسئلہ سے بھی بحث کی ہے کہ اصل مقصد تلاوت قرآن سے الفاظ کی تکرار ہے یا اس کے معنی پر غور کرنا

یہ رسالہ [illegible] [illegible] تحت لکھا گیا ہے [illegible] [illegible] [illegible]

اب علماء قدیم کے اعتقاد میں ہے [illegible] حکومت کے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ہے کہ ہر زمانے کے لحاظ سے مذہب کے فروع میں تبدیلی ہوتی ضروری ہے۔ [illegible] قرآن پاک کا [illegible] [illegible] تو ہم یہ نہیں کہ ہمیشہ یہی حالت [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ترتیب تعلیم و تفہیم کے لئے موزوں ہو سکتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اسے [illegible] کہ [illegible] قرآن کی موجودہ [illegible] [illegible] ترتیب سے قرآن پاک نازل [illegible] [illegible] ایک [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] دوبارہ اس میں [illegible] [illegible] [illegible]

یقیناً کلام مجید مع اپنے الفاظ کے الہام ربانی ہے یعنی اس کا مفہوم اور الفاظ سب منزل من اللہ ہے۔ لیکن اس کے نزول کا جو مقصود ہے وہ کبھی پورا نہیں ہو سکتا اگر اس کو بے سمجھے پڑھا جائے۔ پھر اس کے سمجھنے کے دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو پڑھنے والا خود عربی زبان کا ماہر ہو یا ترجموں سے مدد لے۔ چونکہ اول صورت بہت کم پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے لامحالہ دوسری صورت پر عمل کرنا ہوگا قابل مصنف نے انھیں دو مسئلوں سے اس رسالہ میں بحث کی ہے اور پورے خلوص کے ساتھ۔ یہ رسالہ غالباً بلاقیمت رفاہ عام سوسائٹی دریاباد الہ آباد سے مل سکتا ہے۔

سیرۃ النبی جلد ثالث پر تنقیدی نظر

یہ رسالہ تقریباً پانچ جز کا ہے جو ڈاکٹر محمد عمر صاحب نے سیرت النبی کی جلد ثالث کو دیکھ کر تحریر فرمایا ہے ڈاکٹر صاحب موصوف جیسا کہ احمدی جماعت کے تمام افراد کی خصوصیت ہے مذہبی تحقیق، مناظرہ کا خاص سلیقہ رکھتے ہیں

سیرت النبی کی تیسری جلد میں سب سے زیادہ اہم دو مسئلے ہیں معجزہ اور معراج اور اگر کوئی شخص انھیں کی بابت کوئی ایسی تحقیق چھوڑ جائے جو اسلام کے فطری مذہب ہونے کے لحاظ سے شایان ہے تو یہ کہونگا کہ اس نے بڑا کام کیا لیکن چونکہ طبائع انسانی مختلف ہیں، دماغی راہیں علحدہ علحدہ ہوتی ہیں اور ایک ہی امر ایک کے نزدیک ناقابل یقین اور دوسرے کے نزدیک بالکل ممکن الوقوع ہوتا ہے اس لئے یہ تو ناممکن ہے کہ کسی مختلف فیہ مسئلہ کو اس طرح طے کر دیا جائے۔ اس میں کسی کو چون و چرا کی گنجائش باقی نہ رہے۔ لیکن اگر کسی مصنف یا عالم نے کسی مسئلہ کو کسی ایک ہی جماعت کے مقررہ اصول کے لحاظ سے ثابت کر دیا، تو بھی یہ بات معمولی نہیں ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ جناب ڈاکٹر محمد عمر صاحب نے سیرۃ النبی پر تنقید کرتے ہوئے اس خیال کو پیش نظر رکھا ہے کیونکہ ان کا رسالہ دیکھنے کے بعد ایک شخص یہ سمجھنے پر مجبور ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی "احمدیت" کو ضرورت سے زیادہ نمایاں کیا ہے اور اس لئے رسالہ نے بجائے بے لاگ تنقید کے "احمدی تبلیغ" کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اسی کے ساتھ کہیں کہیں اپنی طبعی ظرافت سے کام لیکر وہ سنجیدگی کے حدود سے متجاوز ہو گئے ہیں۔ صرف یہ ہے ناقص پہلو اس کتاب کا جس کو نظر انداز کر دینے کے بعد ہم بہت سی تنقیدی خصوصیات بھی اس میں پاتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے بعض اعتراضات اس قدر اہم ہیں کہ مشکل سے انکا جواب دیا جا سکتا ہے

بتنہا نہ صرف سیرت النبی جلد ثالث بلکہ اس وقت تک جتنی جلدیں اس کی شائع ہو چکی ہیں ان سب میں یہ نقص موجود ہے کہ جہاں "منقول و معقول" کا تصادم ہو جاتا ہے وہاں اس قدر غیر محتاطانہ زبان اور ایسا ہلکا اسلوب بیان اختیار کیا جاتا ہے کہ پڑھنے والا یہ نہیں سمجھ سکتا کہ قائل کا اصل مقصود کیا ہے۔ خود مولانا شبلی نے جلد اول میں ان روایات کو جن میں ولادت نبوی کے وقت قیصر و کسریٰ کے کنگرہ ہلجانے اور حرم میں بتوں کے منہ کے بل گر جانے کا ذکر ہے، رب و انشا کے طوفان میں گم کر دیا تاکہ لوگوں کو یہ نہ معلوم ہو سکے کہ ان کی رائے ان کی صحت یا عدم صحت کے متعلق کیا ہے

ہمارے یہاں کے علماء کی یہ کمزوری بہت قدیم ہے چنانچہ متقدمین میں رازی اور غزالی اور متاخرین میں مولانا شاہ ولی اللہ کی تصنیفات میں جا بجا یہ کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ رازی کی استدلالات عقلی مشہور ہیں غزالی کی اجتہادات مذہبی کسی سے مخفی نہیں

اسیطرح شاہ ولی اللہ کی روشن خیالیاں بھی سب کو معلوم ہیں لیکن باوجود اس کے کہ وہ پوری آزادی کے ساتھ اظہار رائے کرتے ہوئے پس و پیش کرتے ہیں اور صرف اس لئے کہ ان کا شمار طبقۂ علماء [illegible] سے علحدہ نہ ہو جائے۔ مولانا شبلی بے انتہا روشن خیال انسان تھے اور اسیطرح میں مولانا سید سلیمان ندوی کو بھی سمجھتا ہوں لیکن اس کا کیا علاج کہ جو ان کے دل میں ہے وہ خوف سے زبان تک نہیں آتا۔ اور ایسے مسائل میں [illegible] بیان ایسا اختیار کرتے ہیں جو انھیں طبقۂ علماء سے بھی نہ نکالے اور معقولات پسند جماعت سے بھی داد حاصل کرلے۔ میں اس کو زیادہ سے زیادہ ادب و انشاء کا معجزہ کہہ سکتا ہوں لیکن خدمت مذہب کے نام سے تعبیر نہیں کر سکتا۔ جس میں حد درجہ اخلاقی جرأت کی ضرورت ہے

علاوہ اس کے یوں بھی اس زمانہ میں جبکہ مولویوں کا گروہ کافی بدنام ہو چکا ہے اس میں شامل رہنے کی کوشش کوئی معقول بات نہیں ہے۔ اگر ایک شخص علم و فضیلت کا حامل ہے تو خواہ وہ کسی لباس و وضع میں ہو قابل احترام ہے لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو پھر کسی مخصوص جماعت یا گروہ کے ساتھ منسلک ہونے سے عالم و فاضل نہیں بن سکتا۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے سیرت نبوی جلد ثالث کا مطالعہ معلوم ہوتا ہے نہایت گہری نگاہ سے کیا ہے اور ان غلطیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جو ہر چند نہایت معمولی ہیں لیکن ان کا باقی رہ جانا دارالمصنفین کی روایات کے لئے کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ میں ان اعتراضات کی تفصیل یہاں نہیں دے سکتا جو اس رسالہ میں پیش کئے گئے ہیں، جو صاحب دیکھنا چاہیں اس کو خود ملاحظہ فرمائیں۔ لیکن عمومی طور پر صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اعتراضات ایسے نہیں ہیں جن پر سیرۃ نبوی کے دوسرے اڈیشن میں توجہ نہ کیا جائے

معراج کے واقعات کو ڈاکٹر صاحب نے عالم خواب سے متعلق کیا ہے، یہاں تک تو خیر کوئی حرج نہیں کیونکہ بعض اکابر صحابہ نے بھی معراج کو روحانی یا فی الرویا تسلیم کیا ہے، لیکن ان واقعات کی تعبیر علم الرؤیا کے لحاظ سے ذرا گری ہوئی بات ہے۔ کیونکہ یہ علم ہنوز وہ سنجیدگی اختیار نہیں کرسکا ہے جس کا ذکر کسی اہم و باشان گفتگو کے سلسلہ میں کیا جاسکے۔

یہ رسالہ ۸ر میں ڈاکٹر صاحب موصوف سے بجنور اسپتال کے پتہ سے مل سکتا ہے۔

فخر کائنات | رسول اللہ کے مختصر حالات ہیں جنھیں جناب مولوی مسعود الرحمن خاں صاحب ندوی نے عورتوں اور بچوں کے مطالعہ کے لئے مرتب کرکے اس نام سے شائع کیا ہے [illegible] اس میں معجزات وغیرہ کا ذکر نہیں کیا لیکن اسی کے ساتھ افسوس یہ ہے کہ [illegible] صرف ایک صفحہ کافی سمجھا گیا۔ حالانکہ سب سے زیادہ ضروری اور اہم و باشان امر جس کی طرف توجہ کرنا چاہیئے تعلیمات [illegible] ہی ہیں جن سے آپ کا اسوہ سمجھ میں آئے اور لوگوں کو صحیح اخلاق و انسانیت کا علم حاصل ہو سکے

یہ رسالہ تین جزو کا صاف لکھا چھپا ہوا رسالہ ہے: چار آنے میں اسلامیہ دارالاشاعت دہلی سے مل سکتا ہے۔

اسلامی مساوات | جناب محمد حفیظ اللہ صاحب [illegible] نے اس رسالہ میں تاریخ اسلامی اور خصوصاً عہد سعادت کی

تاریخ سے متعدد واقعات درج کرکے بتایا ہے کہ اسلام نے مساوات کا درس کتنا زبردست دیا اور اس پر کس قدر اہتمام کے ساتھ عمل کیا، موضوع کی اہمیت و وسعت کے لحاظ سے یہ مجموعہ غنیمت ہے اور قابل مطالعہ کتابت طباعت بہت اچھی ہے اور مسلم بک ڈپو پھلواری شریف سے ۸ر میں مل سکتی ہے۔

وکلا اور اقصہ یہ فارسی کا ڈرامہ ہے جسے مرزا جعفر خواجہ داغی نے میرزا فتح علی خواجہ داغی کے ترکی ڈراما سے انیسویں صدی کے آخیر میں ترجمہ کیا تھا۔ اب اس کو علیحدہ رسالہ کی صورت میں محمد مسلم صاحب ایم اے پروفیسر سنٹ کولمباز کالج ہزاری باغ نے معہ ایک مختصر مقدمہ کے شائع کیا ہے۔

بہت عرصہ ہوا جب صرف اس ڈرامہ کا ترجمہ معہ ... ایڈورڈ امول کے انگریزی میں شائع کیا تھا، اسی کے ساتھ اصل ڈرامہ بھی نقل کردیا تھا اور تمام مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی دیدی تھی ... نے اس کتاب کو دیکھا ہے۔ ہر چند راجہ ... نے ترجمہ میں کہیں کہیں غلطیاں کی ہیں لیکن بہ حیثیت مجموعی اس کا یہ کارنامہ ضرور قابل داد ہے۔

ان ڈراموں کی فارسی زبان نہایت شیریں اور لطیف ہے اور جن کو فارسی زبان کے مطالعہ کا شوق ہے انھیں ضرور اس کو پڑھنا چاہئے یہ ڈراما پروفیسر صاحب موصوف سے ۱۲ر میں مل سکتا ہے۔

محبت روسی حکیم ٹالسٹائی کے ایک نہایت ہی عجیب افسانہ کا اردو ترجمہ ہے جسے مولوی عبد الرزاق صاحب ملیح آبادی نے کیا ہے ٹالسٹائی کے فسانوں کے متعلق لکھنا تحصیل حاصل ہے کیونکہ اول تو روسی افسانہ نگاری یوں ہی بے مثل ہے، چہ جائیکہ ٹالسٹائی کی فسانہ نگاری۔

ترجمہ نہایت پاکیزہ کیا گیا ہے پانچ آنے قیمت مقرر ہے اور ہند بک ایجنسی کلکتہ سے مل سکتا ہے۔

بلتازار اناتول فرانس کے ایک مشہور افسانہ کا اردو ترجمہ ... مولوی عبد الرزاق صاحب ملیح آبادی، اناتول فرانس کے نام سے کون ایسا شخص ہے جو واقف نہ ہو اور اس کی افسانہ نگاری کا اعتراف نہ کرتا ہو۔ ترجمہ کی زبان بہت صاف ہے اس کی قیمت ۳ر ہے اور ہند بک ایجنسی سے مل سکتا ہے۔

ابن سراج یعنی ابو عبد اللہ آخری شاہ غرناطہ کے پوتے کی داستان عشق و محبت جسے بدر الدین احمد صاحب نے شیتو بریان کی تصنیف سے ترجمہ کیا ہے۔

شیتو بریان، انقلاب فرانس کے عہد کے ان فاضلوں میں سے تھا جنھوں نے نظام حکومت کے ساتھ ساتھ علم و ادب میں بھی انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی۔ افسانہ پڑھنے کے قابل ہے، اس کی قیمت ۸ر ہے ... پتہ ... ایجنسی کلکتہ۔

جواہر کلیات نظیر انتخاب ہے کلام نظیر کا جسے حیدر آباد کے تین اصحاب سید شمس الدین احمد صاحب، سید ... صاحب اور سید غلام مصطفی صاحب نے مشترک پسندیدگی کے ساتھ کیا ہے۔ اس مجموعہ میں صرف انھیں نظموں کا انتخاب ہے جن میں نظیر نے درس اخلاق دیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ابھی تک اس کی ضرورت باقی ہے کہ نظیر

نے تشائم کلام کو ہندوستان کے بچوں کے سامنے پیش کیا ہے۔ آخیر میں مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی دیدی ہے کتاب ۲۰۰ صفحات کی چھوٹی تقطیع پر شائع کی گئی ہے اور بہت صاف ستھرے طریقہ سے۔ مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد سے دستیاب ہوسکتی ہے قیمت درج نہیں ہے

مادر ہند

مس کیتھرائن میو کی مشہور بدنام زمانہ کتاب مدر انڈیا کے ایک حصہ کا ترجمہ ہے جسے جناب خالد نے کیا ہے مدر انڈیا جیسی کتاب ہے اس کے متعلق لکھنا بیکار ہے اور اس میں شک نہیں کہ ترجمہ نہایت اچھا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ آیا اس کا ترجمہ ہونا بھی چاہئے تھا یا نہیں۔ مطبع یوسفی فرنگی محل لکھنؤ سے یہ کتاب مل سکتی ہے۔

ابن یمین

یعنی فارسی کے مشہور شاعر ابن یمین کے حالات کے حالات زندگی اور اس کے کلام پر تبصرہ جسے مولوی عبدالسلام ندوی نے مرتب کیا ہے اور صوفی پرنٹنگ کمپنی نے پنڈی بہاؤالدین سے شائع کیا ہے۔ کتاب ۲۱۸ صفحات کو محیط ہے۔

یہ کتاب ایرانی مصنف رشید یاسمی کی ایک تصنیف کا ترجمہ ہے اور چونکہ ابن یمین کے حالات سے اردو داں پبلک بہت کم واقف ہے اس لئے اس کو یقیناً نہایت کارآمد خدمت سمجھا جائیگا۔

روح تنقید حصہ دوم

ابوالحسنات مولوی سید غلام محی الدین قادری زور ایم اے کی ان مقالات تنقیدی کی دوسری جلد ہے جو مختلف رسائل میں شائع ہوکر مقبول ہوچکے ہیں۔

جناب زور حیدرآباد کے ان چند نوجوانوں میں سے ہیں جن سے خدمت زبان کے بہت توقعات وابستہ ہیں اور جنھوں نے بہت تھوڑے زمانہ میں اپنی کاوش و محنت سے ملک کی نگاہ کو اپنی طرف متوجہ کرلیا ہے۔ جناب زور فطرت کی طرف سے نقاد دماغ لیکر آئے ہیں اور نہایت ہی دلنشیں طریقہ سے اپنے موضوع کا تجزیہ کرکے فرض تنقید کو ادا کرتے ہیں اس کا پہلا حصہ شایع ہوکر مقبول ہوچکا ہے اور دوسرے حصہ میں ان کے گیارہ تنقیدی مقالات یکجا کرکے شائع کرائے گئے ہیں جن کی فہرست یہ ہے:۔

ادبیات اردو۔ ٹامس گرے۔ میر کی مثنویاں۔ میر تقی میر۔ طبقات ناصری۔ غالب کی ذہنیت۔ حالی۔ میر انیس۔ میر حسن اوعلی ابمی۔ ہورس اسمتھ۔ کیفی حیدرآبادی

یہ مجموعہ ۲۴۰ صفحات کا ہے اور مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن سے ایک روپیہ میں مل سکتا ہے۔

لطیفیات

یعنی لودھیانہ کے ایک نوجوان جناب لطیفی بی اے کے منظومات اور مضامین کا مجموعہ جو ۸۶ صفحات پر شائع ہوا ہے اور شیخ غلام حسین لاہور سے ۱۲ میں مل سکتا ہے۔

اس رسالہ میں مختصر سا مقدمہ جناب یفیر لودھیانوی کا بھی شامل ہے جس میں انھوں نے جناب لطیفی کے شاعرانہ ذوق کی بہت تعریف کی ہے

میں نے بھی اس مجموعہ کو جا بجا دیکھا اور اکثر مقامات پر مجھے جناب لطیفی کی ذہانت اور پاکیزگی خیال کا اعتراف کرنا پڑا لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ اس مجموعہ کی اشاعت میں بہت عجلت کی گئی۔

جناب کیفی ابھی بالکل نو عمر ہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ آئندہ مشق کے بعد وہ اور کتنی ترقی کریں گے اس لئے ضرورت تھی کہ کم از کم دس سال تو اور انتظار کیا جاتا اور سیہ سن وقوف تک ہو پہنچنے کے بعد جو نظمیں خود ان کی نگاہ میں قابل اشاعت قرار پاتیں انکو شائع کیا جاتا۔ اگر جناب کیفی کی مشق جاری رہی تو ان کا موجودہ رنگ یقیناً بدل کر رہیگا اور ان کا وجود ہ غیر معمولی جوش و خروش ایک معتدل صورت اختیار کر جا ئیگا، تو کم از کم [illegible] ہوں کیونکہ ممکن ہے اُس شراب کی رسا "ہونے سے پہلے ہی، میں چلا دیتا۔ لیکن ساقی کا اس قدر فیاض ہو جانا مجھے مناسب نہیں معلوم ہوتا

تصویر افکار جناب سید رضی الدین حسن کیفی حیدر آباد کے نہایت مشہور شاعر تھے جن کی غزلوں کا مجموعہ اس نام سے شائع ہوا ہے کیفی داغ کے شاگرد تھے اور خود ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ استاد کے رنگ کو انھوں نے نباہنے کی بہت کوشش کی۔ یہ مجموعہ [illegible] صفحات پر [illegible] بزم ادب کی سعی سے شائع ہوا ہے اور کتب خانہ بزم ادب عقب مسجد چوک حیدر آباد سے ۸ر میں مل سکتا ہے۔

پہاڑی مقاموں کی ملکہ شملہ اس نام سے ایک رسالہ ان۔ ڈبلو ریلوے نے شائع کیا ہے جس میں شملہ کی مختصر تاریخ، ریلوے قائم ہونے کی مشکلات [illegible] وہاں کے دلچسپ و فرح بخش مناظر کا حال معہ چند تصاویر کے درج ہے۔

یہ رسالہ محکمہ ریلوے کا تجارتی پروپگنڈا ہے اور اسی لئے اس قدر اچھے طریقہ سے اُسے پیش کیا ہے کہ ہر شخص کی توجہ مایل کر سکے نہایت نفیس آرٹ پیپر پر شائع کیا گیا ہے اور غالباً ایجنٹ کے دفتر سے مفت مل سکتا ہے۔

حقیقۃ التناسخ یہ رسالہ جو [illegible] صفحات پر مشتمل ہے مولوی محمد عبدالوہاب ابن محمد لعلی ناظمی مدراسی نے شائع کیا ہے اور تناسخ کی حقیقت و اصلیت سے اس میں بحث کی ہے

تناسخ کا مسئلہ نہایت قدیم مسئلہ ہے اور جس طرح مصری کلدانی، یونانی اور مصری لٹریچر سے اس عقیدہ کا قدیم الایام میں [illegible] ہونا پایا جاتا ہے، اسیطرح ہندوؤں کے مذہبی لٹریچر سے بھی اس کا پتہ چلتا ہے۔ یہ خیال کرنا کہ تناسخ کا عقیدہ صرف [illegible] اور اس سے قبل کہیں نہیں پایا جاتا [illegible] درست نہیں ہے مسلمانوں میں صوفیائے کرام کی [illegible] بڑی حد تک اسی کے قائل تھے۔

مولوی [illegible] موصوف نے [illegible] اور احادیث [illegible] ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عذاب و ثواب اور دوزخ و جنت کی حقیقت سمجھنے کے [illegible] تناسخ [illegible] ہے۔

میں نے [illegible] ہوئے اس خیال کو ظاہر کیا تھا کہ "حشر اجساد تسلیم کرنے سے [illegible] کیونکہ نظام عالم پر غور کرنے کے بعد ایک انسان مجبور ہو جاتا ہے، وہ خالق و مخلوق کے تعلق [illegible] کو تسلیم کرے

[illegible] مولوی صاحب موصوف نے تناسخ کے ثبوت میں پیش کی ہیں، وہ

مفید یقین ہیں اور واقعی ان سے وہ اپنے دعوے کو ثابت کر سکتے ہیں اور اس لئے میری رائے میں زیادہ مناسب یہ تھا کہ پہلے صرف معقولات کے ذریعہ سے اس مسئلہ کو سمجھنا چاہئے تھا اور پھر اکابر اسلام کے صرف ان اقوال کو نقل کر دینا چاہئے تھا جن سے اس کی تائید ہوتی۔

مولوی صاحب موصوف نے سلسلۂ گفتگو میں جنت و دوزخ، عذاب و ثواب، حشر و نشر، معاد و دنیا وغیرہ پر بھی عالمانہ بحث کی ہے، جو ناگزیر تھی۔ چونکہ اس زمانہ میں عقلی اصول پر مذہب کی جستجو زیادہ پیدا ہو گئی ہے اس لئے اس رسالہ کا وجود میں آنا بالکل برمحل ہے اور ان حضرات کے لئے جو اس نوع کے مباحث سے دلچسپی لیتے ہیں اس میں کافی سامان مطالعہ موجود ہے قیمت دو روپیہ ہے اور پتہ مکان آرائش بلدہ باغ مسلم جنگ، ملک پیٹ حیدرآباد دکن سے مل سکتا ہے

کلیات حسرت موہانی اس سے قبل کلام حسرت دس مختلف اقساط میں علیحدہ علیحدہ شائع ہو چکا ہے لیکن اب ان سب کو یکجا کر کے کلیات کی صورت دیدی گئی ہے۔ حسرت کے رنگ تغزل سے متعارف کرانا بیکار ہے، کیونکہ ملک کا ہر صاحب ذوق بلا استثنا اس حقیقت کو تسلیم کر چکا ہے کہ اس دور میں حسرت سے بہتر غزل گو شاعر کوئی نہیں ہوا۔ ان کا وہ صحیح عاشقانہ انداز گفتگو، وہ بلند جذبات کی ترجمانی، وہ کیفیت محبت میں ڈوبا ہوا طرز ادا اور وہ ہلکی ہلکی پیاری ترکیبیں فارسی کی۔ یہ سب مل کر ایک ایسا معیاری رنگ تغزل پیش کرتی ہیں کہ اس کی نظیر مشکل سے دوسری جگہ مل سکتی ہے۔

میری رائے میں ہر اس شخص کو جسے کچھ بھی ذوق سخن ہے اس کلیات کا اپنے پاس رکھنا ضروری ہے۔ قیمت [illegible] روپیہ میں مینیجر اردوئے معلیٰ کانپور سے مل سکتا ہے۔

متروکات سخن یہ بھی مولانا حسرت موہانی کا رسالہ ہے جو ان کے پیش نظر معرکۃ الآرا تصنیف نکات سخن کا ایک باب ہے اس میں انھوں نے متروکات قدیم، متروکات معروف، متروکات جائز [illegible] کی ہے اور متعدد مثالوں سے انھیں سمجھایا ہے فن شعر میں یہ رسالہ خاص اہمیت رکھتا ہے [illegible] مینیجر اردوئے معلیٰ کانپور سے مل سکتا ہے۔

انتخاب سخن اس رسالہ میں دیوان جرأت، دیوان حسرت (استاد جرأت) اور جرأت کے چند قابل قدر شاگردوں کے کلام کا انتخاب ہے۔ مولانا حسرت اس سے قبل بہت سے گمنام اساتذہ کا نایاب کلام [illegible] شائع کر چکے ہیں اور اس طرح زبان کی بہت بڑی خدمت انجام دے چکے ہیں اسی سلسلہ کا یہ رسالہ بھی ہے جو [illegible] مینیجر اردوئے معلیٰ کانپور سے مل سکتا ہے۔

انشائے جدید جناب محمد علی خاں صاحب اثر رامپوری نے یہ رسالہ الحدید فارسی کی تعلیم کے لئے لکھا ہے اور اس میں مختلف فصول قائم کر کے بتایا ہے کہ ایران میں آج کل کس طرح خط کتابت ہوتی ہے [illegible] ہمارے عدالتی کاغذات کی زبان کیا ہے۔ میں نے کتاب کو جستہ جستہ دیکھا اور بہت مفید پایا۔ یہ کتاب [illegible] نصاب میں داخل بھی ہو گئی ہے۔ اس کتاب میں ہندوستان کے فارسی کا بھی نمونہ ہر جگہ دیا گیا ہے [illegible] ضرورت نہ تھی [illegible] طوالت

پیدا کردی ہے۔ کتاب کی قیمت عہ مقرر کی گئی ہے۔ اور جناب مولف سے خسرو باغ روڈ رام پور کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

ارباب نثر اردو ایک صحیفۂ تنقیدی ہے جسے جناب سید محمد صاحب قادری ایم اے حیدر آبادی نے مرتب کیا ہے۔ اس میں فورٹ ولیم کالج کے اردو نثر نویسوں کا تذکرہ ہے اور تنقید کی گئی ہے کہ ان کی تصانیف کا کیا مرتبہ تھا اور وہ کس حد تک "امہات کتب اردو" کہلائے جانے کی مستحق ہیں۔

اس میں میر امن دہلوی، حیدر بخش حیدری، میر شیر علی افسوس، مرزا علی لطف، مرزا جان طپش، خلیل علی خاں اشک، میر عبداللہ مسکین وغیرہ تقریباً بیس ایسے مصنفین و شعراء کے حالات و تصنیفات پر تنقید کی گئی ہے جن کا تعلق فورٹ ولیم کالج سے کسی نہ کسی طرح پایا جاتا تھا۔

جناب قادری کے یہ تنقیدی مقالات اردو زبان کی نہایت [illegible] ان قدر خدمات میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں کیونکہ اس نوع کی تصانیف وہ بنیادی و استعماری خدمات ہیں جن کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اس تصنیف کے بعض مقالے نگار میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ کتاب مجلد شائع ہوئی ہے اور دو روپیہ میں مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدر آباد دکن سے مل سکتی ہے

پارسی علوم اور اسلام جناب محمد اسلم صاحب ایم اے نے یہ تبصرہ [illegible] ہزاری باغ نے [illegible] رسالہ میں [illegible] سے ثابت کیا ہے کہ فارسی اور تمدن اسلامی نے کیا کیا احسانات کئے یقیناً یہ [illegible] رسالہ [illegible] سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا لیکن انھیں چند صفحات میں فاضل مصنف نے پوری طرح ثابت کر دیا ہے کہ فارسی پر عربی کے احسانات ایسے نہیں ہیں۔ جنھیں فراموش کیا جا سکے۔

کتاب کی قیمت ۱۲ ہے اور مصنف سے مل سکتی ہے

محاسن ورزش پروفیسر شیخ فضل حق صاحب کوئٹہ بلوچستان کے ایک نہایت قوی الاعضا شخص ہیں اور انھوں نے یہ کتاب تحریر فرمائی ہے جس میں اپنے تجربات و حالات کے ساتھ ساتھ ورزش کے منافع سے بحث کی ہے اور طریق ورزش بتایا ہے۔ پروفیسر صاحب موصوف کے کارنامے جو کتاب میں درج ہیں نہایت دلچسپ ہیں اور ان کے غیر معمولی قوت جسمانی کے شاہد ہیں، کتاب میں جا بجا تصاویر بھی ہیں۔ اس کی قیمت عہ ہے اور صاحب موصوف سے کوئٹہ کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۱۰۴
جلد ۱۴ - شمارہ ۶





صفحہ ۵۸ کا اعلان ضرور پڑھئے

فہرست مضامین دسمبر ۱۹۲۸ء

عنوان	مصنف	صفحہ
ملاحظات		۲
خواجہ سید محمد شیرازی متخلص بہ عرفی	عبدالمالک آروی	۹
جمال الدین افغانی کا ایک خطبہ	مظفر حسین شمیم کلکتہ	۴۴
سوشیلا	اعظم کریوی	۴۹
فلسفۂ مذہب	سید مقبول احمد بی اے	۵۹
صدائے شکست (فسانہ)		۶۸
شرط (فسانہ)		۷۵
حصۂ نظم:-		
التجائے سکوں (نظم)	ارشد علی پوری	۸۰
سوگوار (نظم)	روش صدیقی	۸۲
کیوں دیکھے (نظم)	سلمائے گجرات	۸۳
چاند بچے سے (نظم)	امین حزیں	۸۴
غزلیات:-		
"	اختر شیرانی	۸۵
"	افسر میرٹھی	"
"	طالب باغپتی	"
"	طاہر رامپوری	۸۶
"	مہر رامپوری	"
باب المراسلۃ والمناظرۃ		۸۷
باب الاستفسار		۸۸-۹۶



نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمارہ ۶	دسمبر ۱۹۲۸ء	جلد ۱۴

ملاحظات

اس وقت ہندوستان کی تمام سیاسیات کا مرکز دو چیزیں ہیں۔ ایک نہرو کمیٹی رپورٹ اور دوسرے سائمن کمیشن۔ اگر آج نہرو کمیٹی رپورٹ پر ہندوستان کی تمام جماعتیں متفق ہوتیں، یا سائمن کمیشن سے انقطاع کرنے میں کسی کو اختلاف نہ ہوتا، تو راستہ کھلا ہوا تھا اور بہت دنوں کے الجھے ہوئے مسائل سلجھ گئے ہوتے، لیکن چونکہ نہ رپورٹ پر سب کو اتفاق ہے اور نہ سائمن کمیشن سے منقطعہ اختلاف اس لئے وہ تصادم جو قدرتی طور پر ایسی صورت میں ہونا چاہئے، ہو رہا ہے۔ اور چونکہ یہ اختلاف زیادہ تر مسلمانوں کی طرف سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اس لئے اس تصادم کا سنگین و شدید ہونا اور نتائج کے لحاظ سے زیادہ مکروہ صورتوں کا پیدا ہو جانا مستبعد نہیں ہے۔ بہرحال اب جبکہ یہ اختلاف اس حد سے گزر گیا ہے کہ اپنے آپ فنا ہو جائے، ہر شخص کا فرض ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اس کو زیادہ نہ بڑھنے دے اور اس سبب کو دریافت کرے جس نے یوں دفعتہً فضا کو مکدر کر دیا ہے۔

اس وقت مسلمانوں کے بعض ایسے مسلّم اور سربرآوردہ قایدین کا اختلاف کر بیٹھنا جن کی طرف کبھی اس کا گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ تفریق و انشقاق کا باعث ہوں گے، بلاوجہ نہیں ہو سکتا اور جب ہم اس امر کو دریافت کرنے کے لئے زیادہ غور و تعمق سے کام لیتے ہیں تو ہم کو ماننا پڑتا ہے کہ پس پردہ ضرور کوئی چیز انھیں ڈراونی نظر آتی ہے اور جبکہ یہ حجاب اٹھنے والا ہے تو وہ اس اندیشہ سے کہ مبادا یہ چیز واقعی اُن پر حملہ کر بیٹھے، اس پردہ کے اٹھائے جانے ہی سے اختلاف کرنے لگے ہیں۔

وہ ڈراؤنی چیز کیا ہے؟ وہ اندیشہ کیا ہے؟ — مجھے ڈر ہے کہ اس کا اظہار، مسلمانوں کے قصور ہمت کا اظہار نہ ہو، لیکن بہرحال کہنا ہے کہ وہ اندیشہ ہے مسلمانوں کا ہندوؤں کی طرف سے، ڈر ہے اقلیت کا اکثریت کی جانب سے یا زیادہ پرجوش الفاظ میں یوں سمجھئے کہ وہ خوف ہے اسلام کا کفر سے ہرچند تاریخ اسلام میں یہ پہلا ہی واقعہ ہوگا کہ وہ غلبۂ کفر سے خائف ہوا ہو، لیکن ایسا ہونا چاہئے کیونکہ جب ایک قوم ترقی کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے تو پہاڑ بھی اسے خردل نظر آتا ہے اور جب اس میں انحطاط ہوجاتا ہے تو رائی کو بھی وہ پہاڑ سمجھنے لگتی ہے۔ مسلمانوں کی قوم عرصہ سے انحطاط میں ہے اس لئے اگر اس کے دل میں ہندوؤں کی طرف سے اندیشہ پیدا ہوا تو حیرت نہ کرنا چاہئے، علی الخصوص ایسی حالت میں کہ روز کے تجربات بجائے اس اندیشہ کو رفع کرنے کے اس کو اور زیادہ تقویت پہونچا رہے ہوں۔

جس وقت ہندو مسلمانوں کے اتفاق کا مسئلہ کہیں چھڑ جاتا ہے تو اظہار حیرت اس طرح ضرور کیا جاتا ہے کہ اس سے قبل تو یہ نفاق نہ تھا، سب آپس میں مل جلکر رہتے تھے، شادی وغم میں شریک ہوتے تھے نہ کوئی مذہبی نزاع پیدا ہوتی تھی نہ معاشری قضیہ۔ لیکن اب ایسا کیوں ہوگیا؟ ادنیٰ تامل کے ساتھ معلوم ہوسکتا ہے کہ اس سے قبل ہندو مسلمانوں کی حالت ایسی تھی جیسے کسی قفس کے اندر دو قسم کے طائر جن کو محدود غذا ملتی ہو اور صیاد کے رحم وکرم سے دونوں مایوس ہوں اور دونوں ناواقف کہ آرزو کیونکر پیدا ہوتی ہے اور مدعا کے لئے تگ ودو کس چیز کا نام ہے۔ لیکن جب اس کے بعد آہستہ آہستہ انھوں نے اپنے پروبال کی قوت سے کام لیکر تیلیاں ڈھیلی کریں تو صیاد نے بجائے تنگ قفس کے ایک بڑے میدان کو جال سے گھیر کر وسیع زنداں طیار کردیا اور اجازت دیدی کہ اس کے اندر جہاں جاہو جاؤ اور اپنے لئے آرام وآسائش کی جگہ تلاش کرلو۔ چونکہ مسابقت میں ہمیشہ تصادم ہوتا ہے اس لئے دونوں میں نزاع ہوئی ہر ایک نے اپنی آسانی کو مقدم سمجھکر دوسرے کو تکلیف پہونچائی اور رفتہ رفتہ دونوں ایک دوسرے کے مستقل دشمن ہوگئے

جب تک ہندو مسلمان دونوں جانوروں کی طرح ایک لاٹھی سے ہانکے جارہے تھے، کان دبائے ہوئے چلے جاتے تھے، لیکن رسی کا ڈھیلا ہونا تھا کہ ایک دوسرے پر حملہ کرنے لگے اور یہ بھول گئے کہ ابھی رسی قصاب ہی کے ہاتھ میں ہے، اور اس کا ٹوٹنا اسی صورت سے ناممکن ہے کہ دونوں متفقہ کوشش سے کام لیں۔ اگر میونسپلٹی، ڈسٹرکٹ بورڈ، اسمبلی اور کونسل میں ہندو مسلمانوں کو ممبر ہوکر کام کرنے کا موقع ملا تھا تو چاہئے تھا کہ بجائے ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے اتفاق سے کام لیتے اور یہی سمجھتے کہ دونوں اب بھی ہم قفس ہیں، لیکن انھوں نے زیادہ بے صبری سے کام لیا اور قبل از وقت اپنی آرزوؤں کو بہت وسیع کرلیا۔ میں نے جہاں تک تحقیق کی ہے، ہر جگہ مسلمانوں کو اس بات کا شاکی پایا ہے کہ ہندو اہلکار، ہندو افسر، ہندو ممبر ہر جگہ عصبیت سے کام لیتے ہیں اور مسلمانوں کے حقوق پامال کرنے میں مطلق تامل نہیں کرتے۔ پھر چونکہ وہ اپنے اثر دولت سے، اپنے اثر علم سے، اپنے اثر اکثریت سے زیادہ تعداد میں ذمہ دار جگہوں کو پُر کئے ہوئے ہیں، اس لئے مسلمانوں کو زیادہ تکلیف پہونچ رہی ہے۔ پھر یہ شکایت کسی خاص جگہ اور خاص حلقہ میں نہیں، بلکہ مدارس، کالج، یونیورسٹیاں، دفاتر، عدالتیں ہر جگہ عصبیت کی یہ لہر دوڑ گئی ہے، اور ہندوؤں کا انداز کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ مسلمانوں سے کوئی انتقام لے رہے ہیں، اور جا وبیجا ان کو ایذائیں

ہو بچاکر خوش ہوتے ہیں۔

بہر حال اس میں شک نہیں کہ سیاسیات کی ظاہری سطح کے نیچے یہ بے چینیاں ضرور پنہاں ہیں اور بالکل نہیں تو بڑی حد تک یہ بے چینیاں جائز بھی ہیں۔ اس لئے جب کبھی کسی ملکی مسئلہ میں ہندو مسلم اتحاد کا سوال آجاتا ہے اور ہندوؤں کو ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو بھی شریک کریں، تو مسلمانوں کی بدگمانیاں نہیں بلکہ وہ تلخ تجربے جن سے ان کو دوچار ہونا پڑتا ہے، سامنے آجاتے ہیں اور ان کو ہندوؤں کے ساتھ ملکر کام کرتے ہوئے بہت پس و پیش ہوتا ہے اور وہ ڈرتے ہیں کہ اگر ہندو جماعت کا ساتھ دینے سے برطانیہ کا اثر کمزور ہوگیا تو مسلمانوں کو پامال کرنے کے لئے اور زیادہ مواقع ان کے ہاتھ آجائیں گے اور پھر اس کا کوئی علاج نہ ہوسکیگا۔ ڈاکٹر شفاعت احمد خان نے جو کچھ اپنے مموریںڈم میں لکھا ہے وہ بھی اسی ناخوشگوار تجربہ کے ماتحت لکھا ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ بڑی حد تک انھوں نے صحیح لکھا ہے۔ یقیناً الہ آباد یونیورسٹی کی وہی حالت ہے جو انھوں نے لکھی ہے اور عدالتوں میں بھی وہی ہوتا ہے جو ظاہر کیا گیا ہے۔ الغرض یہ ہے موجودہ صورت حال ہندو مسلمانوں کے تعلق کی جسنے نہرو کمیٹی رپورٹ اور سائمن کمیشن کے باب میں باہم اختلاف پیدا کردیا ہے۔ ممکن ہے کوئی شخص بر بنائے مصلحت غلط بیانی سے کام لیکر یہ کہدے کہ اختلاف کرنے والوں کی تعداد بہت کم ہے لیکن حقیقت یہ نہیں ہے، اس وقت جبکہ میں یہ مقالہ لکھ رہا ہوں لکھنؤ میں سائمن کمیشن کا داخلہ ہورہا ہے، اور اس سے بیزاری ظاہر کرنے کے لئے پروسشن نکل رہا ہے، دوکانیں بند نظر آتی ہیں، لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان تمام باتوں میں مسلمانوں نے کوئی حصہ نہیں لیا، ان کی دوکانیں بھی کھلی ہیں، وہ پروسشن میں بھی شریک نہیں ہیں اور جہاں دوچار مسلمان جمع ہوجاتے ہیں تو ان کو یہی کہتے سنا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو اس سے کیا مطلب۔ ابھی ابھی مجھے خبر ملتی ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو کو اسٹیشن پر زدو کوب کی گئی۔ اور ایک خاص کیفیت مجھ پر طاری ہوتی ہے۔ اور بے اختیار یہ جی چاہتا ہے کہ کاش مسلمان بھی اس جوش سے حصہ لیتے اور وہ بھی اپنے آپ کو ہندوؤں کے ساتھ انھیں خطرات میں مبتلا کرتے، لیکن ایسا نہیں ہوسکتا، کیونکہ بدگمانی اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ ہندو جس قومی کام میں حصہ لیتے ہیں، مسلمان یہی سمجھتے ہیں کہ اس میں بھی کوئی خاص غرض ان کی شامل ہوگی اور اس سے احتراز کرتے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ جس طرح ہندوؤں کے خواص بے تعصبی سے پاک ہیں اسی طرح مسلمانوں کے خواص بھی پورے جوش سے ان کے شریک ہوتے ہیں۔ لیکن ضرورت تو عوام کی تربیت و اصلاح اور ان کے تالیف و استمالت کی ہے اور ان کے ناگوار تجربے کسی طرح یہ سمجھنے کی اجازت ہی نہیں دیتے کہ ہندو کبھی ان کے ساتھ رواداری سے پیش آسکتے ہیں۔

پھر جب صورتِ حال یہ ہے تو دونوں جماعتوں کے لیڈروں کا فرض کیا ہونا چاہیئے؟ میرے نزدیک اس وقت سب سے زیادہ ضروری یہی امر قابل غور ہے اور اسی کے فیصلہ پر ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ منحصر ہے۔

اب میں چند باتیں مسلمانوں سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ اگر ان کے خطرات واقعی صحیح ہیں اور ان کو یقین ہے کہ ہندو ان کے دوست نہیں ہوسکتے تو پھر مجھکو یہ بتائیں کہ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہندوؤں سے کٹنے کے بعد وہ حکومت ہی سے ملیں گے اور اسی کی اعانت چاہیں گے تنہا وہ کچھ نہیں کرسکتے۔ پھر میں یہ پوچھونگا کہ اُن کے پاس کونسی وجہ ہے اس امر کے باور کرنے کی ہے کہ

حکومت ان کا ساتھ دیگی اور ہندوؤں کے مقابلہ میں ان کے ساتھ رعایت کریگی۔ کیا صرف اس خیال کی بناء پر کہ اگر مسلمان ہندوؤں سے علیحدہ رہے تو ان کی حکومت ملک میں قایم رہیگی اگر وجہ صرف اس قدر ہے تو اس سے زیادہ ذلیل خیال کوئی نہیں ہو سکتا کیونکہ جب زندگی غلامی ہی میں بسر کرنا ٹھہر گئی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مسلمان انگریزوں کی غلامی تو قبول کرنے کے لئے طیار ہو جائیں اور ہندوؤں کی محکومی منظور نہ کریں۔ اور اگر تھوڑی دیر کے لئے اسے مان بھی لیا جائے کہ ہندوؤں سے علیحدہ ہو جانے کے صلہ میں مسلمانوں کو بعض دفاتر میں کچھ نوکریاں زیادہ مل جائیں گی، چند عہدے ان کے لئے مخصوص ہو جائیں گے۔ تو بھی آخر کب تک؟ کیا مسلمان سمجھتے ہیں کہ حکومت کا موجودہ نظام عرصہ تک قایم رہیگا، اور وہ چند ذلیل رعایتیں، جو انسانیت کی قربانی کے بعد انھوں نے حاصل کی ہیں، ہمیشہ حاصل رہیں گی۔ اچھا اس کو بھی جانے دیجئے اس وقت جو سب سے زیادہ شکایت اس امر کی کیجاتی ہے کہ ہندوؤں کی وجہ سے مسلمانوں کو دفاتر میں کہیں جگہ نہیں ملتی تو میں پوچھتا ہوں کہ ان کی ۸ کرور آبادی میں کتنے نفوس ملازمت کے اہل ہیں اور ان میں کتنے محروم ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اس کی تعداد چند لاکھ ہوگی، پھر کیا یہ حیرت کی بات نہیں کہ مسلمان اس سے تو برہم ہیں کہ ان کے ساتھ دفاتر میں رعایت نہیں کی جاتی لیکن یہ ہمت نہیں ہوتی کہ ملازمت کا خیال ہی دل سے نکال دیں، اور موجودہ حکومت سے عدم تعاون کر کے عدالتوں کی مصیبتوں سے بھی آزاد ہو جائیں۔ مگر میں جانتا ہوں کہ یہ تدبیر بھی ناقابل عمل ہے اور ان کو کسی نہ کسی طرح بُری بھلی طرح ہندوؤں کے ہی ساتھ رہنا، انھیں کے ساتھ زندگی بسر کرنا ہے اور اگر وہ رواداری کے لئے طیار نہیں تو انھیں سے لڑ بھڑ کر اپنے لئے دنیا میں جگہ نکالنا ہے۔ پھر جب صورتِ حال یہ ہے تو اسکی یہ تدبیر نہیں ہے کہ ملکی ترقی کے خیال ہی کو ترک کر دیا جائے بلکہ تدبیر صرف یہ ہے کہ ہر موقعہ و محل پر ان سے زیادہ اپنے آپ کو مستعد ظاہر کیا جائے اور ان کو اپنی اہمیت ثابت کر کے یقین دلایا جائے کہ بغیر ہمارے وہ کچھ نہیں کر سکتے، (جو یقیناً ایک واقعہ ہے)

اسی کے ساتھ مجھے ہندوؤں سے بھی کچھ کہنا ہے اور وہ یہ کہ گو مسلمان تعداد میں کم سہی، علم و دولت میں ناقابل توجہ سہی، لیکن اُن کی ہستی، ان کی خواہشات اور اُن کے حقوق کو پامال کر کے ہندوؤں کی جماعت اگر خالص اپنی حکومت ہندوستان میں قائم کرنا چاہتی ہے تو صرف یہ خیال خام ہے۔ اول تو خود آٹھ کرور کی جماعت کوئی معمولی بات نہیں ہے اور اگر معمولی ہو تو بھی ان کی بین الاقوامی اہمیت ایسی زبردست چیز ہے جس کو کسی وقت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا یہ ممکن ہے کہ اس وقت جبکہ حکومت غیروں کے ہاتھ میں ہے، ہندو، نہیں ستائیں، لیکن جب یہ حکومت اہل ملک کے ہاتھ میں ہوگی تو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جو نسبت ۳۲ اور آٹھ میں ہے اسی نسبت سے حکومت بھی تقسیم ہوگی اور اگر ۳۲ آدمی آٹھ آدمیوں کو تکلیفیں پہونچا پہونچا کر بالکل مجبور کر دیں گے تو ظاہر ہے کہ جان سے ہاتھ دھو کر دشمنی کرنے والا ایک بھی بہت ہوتا ہے چہ جائیکہ آٹھ۔ کیونکہ اُس وقت سوال ۳۲ اور آٹھ کا نہیں ہوگا بلکہ مٹانے یا مٹ جانے کا ہوگا۔ اور شاید ہندو کسی طرح اس پر راضی نہیں ہو سکتے کہ وہ اپنی آبادی میں سے کم از کم آٹھ کرور آدمی ہلاک کر کے یہاں اپنی حکومت قایم کریں۔ اس لئے اُن کو یہ حقیقت ہر وقت پیش نظر رکھنا چاہئے کہ وہ مسلمان سے علیحدہ ہو کر نہ ملک کو آزاد کرا سکتے ہیں اور نہ چین سے بیٹھ ہی سکتے ہیں۔ اگر اس وقت مقامی جماعتی حکومت کے سلسلہ میں وہ آزار پہونچا لیتے ہیں

تو اس کے یہ معنے نہیں کہ آزادی ملک کے بعد بھی وہ اس میں کامیاب ہوسکیں گے۔ پھر جب حقیقت یہ ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس رواداری سے کام نہ لیں جو ایک قوی کو ضعیف کے مقابلہ میں ہمیشہ برتنی چاہیے، اور اپنی اکثریت کے غرور سے اقلیت کو پامال نہ کریں۔

ہندو مسلمانوں کے درمیان جو تفریق کی یہ زبردست خلیج حائل ہے، اس کا بڑا سبب مذہبی تنگ نظری ہے جس میں زیادہ غلطی ہندوؤں کی ہے۔ کیونکہ ان کے طرز عمل نے اور ان کی چھوت چھات نے ہر مسلمان کو یقین دلا دیا ہے کہ وہ ان سے نفرت کرتے ہیں مسلمانوں کے ساتھ کھانا پینا یا ان کی چھوئی ہوئی چیز کو استعمال کرنا تو درکنار، وہ یہ بھی گوارا نہیں کرتے کہ اس جگہ بیٹھکر کوئی چیز کھائیں پیئیں جہاں کوئی مسلمان موجود ہے چنانچہ اسٹیشنوں پر بھی "ہندو چا،" اور "مسلمان پانی" کی آواز ہر وقت اسی تفریق کا اعلان کرتی رہتی ہے اور کسی رہبر و قاید کو اس طرف توجہ نہیں ہوتی کہ اس دلخراش اعلان کا سد باب کرے۔ اگر آج ہندو اس عصبیت کو ترک کرکے مسلمانوں کے ساتھ گھل ملکر رہیں اور کھانے پینے سے احتراز چھوڑ دیں تو کل مسلمان بھی ترک گاؤکشی کے لئے آمادہ ہوسکتے ہیں، جو سب سے زیادہ اہم نزاعی مسئلہ ہے۔

آریہ جماعت کی طرف سے شاید یہ جواب پیش ہوسکتا ہے کہ وہ مذہبی مسئلہ میں زیادہ آزاد ہیں کیونکہ عام ہندوؤں کی طرح نہ وہ اپنے مذہب کو اپنی ہی جماعت کے لئے محدود سمجھتے ہیں اور نہ آریہ ہوجانے والوں کے ساتھ کھانے پینے میں انھیں تکلف ہوتا ہے، لیکن انکا ایسا کہنا بالکل حقیقت کے خلاف ہوگا، کیونکہ فی الاصل نہ وہ کسی کو ہندو بنا سکتے ہیں اور نہ صحیح معنے میں کسی غیر مذہب والے کو اپنی برادری میں شامل کرکے اپنا جیسا پاک و پوتر سمجھ سکتے ہیں ان کے تمام اعلانات اور دعاوی ایک ایسا مکر و فریب ہے جس سے اب ہر شخص واقف ہوچکا ہے اور اس کا افسوں کارگر نہیں ہوسکتا۔ آریہ سماجی جماعت حقیقتاً ایک پولٹیکل جماعت ہے اور وہ بھی اس درجہ تنگ نظر، محدود خیال اور تاریک ذہنیت کی کہ اگر کوئی چاہے تو کہہ سکتا ہے کہ ہندوستان کے موجودہ سیاسی اضطراب کا سبب یہی جماعت ہے اور اسی نے تعصب کی وہ لہر ملک میں دوڑا دی ہے جو اس سے قبل نہیں پائی جاتی تھی، مسلمانوں کے اکابر دین پر حملہ کرنے کی ابتدا، اسی جماعت نے کی اور اس طرح گویا سب سے پہلی خلیج اختلاف ان دونوں قوموں کے درمیان اسی کی وجہ سے حایل ہوئی۔ پھر چونکہ یہ جماعت روز بروز بڑھتی جارہی ہے، اس لئے بظاہر کوئی توقع اس کی نظر نہیں آتی کہ آریہ جماعت کی موجودہ ذہنیت میں کوئی انقلاب پیدا ہوگا۔

جسوقت تک ایک ملک کی مختلف مذہبی جماعتیں، مذہب سے علحدہ ہوکر یعنی مذہب کو بالکل ذاتی و انفرادی چیز سمجھ کر سیاسیات میں حصہ نہ لیں، اس وقت تک کبھی اتحاد عمل نہیں ہوسکتا اور نہ کوئی متحدہ محاذ قایم ہوسکتا ہے اور یہ یقیناً بہت مشکل ہے۔ نہ مسلمانوں میں ایسے وسیع الخیال لوگ موجود ہیں اور نہ ہندوؤں میں اور میرے نزدیک تاریخ مذہب کی تمام خونین داستانوں میں اس سے زیادہ دردناک داستان اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ پھر چونکہ سارا ہندوستان نہ کسی ایک مذہب کا پابند ہوسکتا ہے اور نہ سب ترک مذہب کرکے لا مذہبیت کا مسلک اختیار کرسکتے ہیں۔ اس لئے مجھے کم اُمید ہے کہ نزاع کفر و اسلام سوائے شاعری کے کوئی اور کام کی بات ہم لوگوں کو کرنے دے۔

میں دیکھتا ہوں کہ مشاعرہ کی بدعت طبقۂ شعراء سے گزر کر اسکولوں، کالجوں ہوسٹلوں اور یونیورسٹیوں میں بھی ہو چکی ہے اور شاید ہی کوئی سالانہ تقریب ایسی ہوتی ہو، جس میں بزم مشاعرہ کا انعقاد ضروری نہ خیال کیا جاتا ہو، میں نے جہاں تک غور کیا، یہ نتیجہ ہے اس ادنیٰ قسم کی ذہنیت کا، جو موجودہ نصاب تعلیم اور اصول تربیت کے ماتحت اس وقت ہندوستان کی بڑی سی بڑی درس گاہ میں پائی جاتی ہے۔ اگر کسی سالانہ احتفال کے موقعہ پر کسی سنجیدہ ومفید مشغلہ میں مصروف ہونا ممکن نہیں اور صرف سطحی تفریح مقصود ہے، تو میرے نزدیک مشاعرہ سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ "رقص وسرود" کا جلسہ منعقد کیا جائے یعنی شعر گوئی شعر فہمی پہلے وہ سامان پیدا کیا جائے جو شعر کہنے اور سننے کا اہل بناتا ہے۔

اس مرتبہ جب الہ آباد یونیورسٹی کے بعض طلبہ نے آکر کانووکیشن کے موقعہ پر مشاعرہ میں شرکت کی دعوت مجھے دی تو میں نے ان سے دریافت کیا کہ وہ کیوں نہیں کوئی اس سے زیادہ مفید صورت سالانہ اجتماع کی قرار دیتے، انھوں جواب دیا کہ "مشاعرہ سے انکا مقصود اردو زبان کی ترقی اور ہندو طلبہ میں اس کا ذوق پیدا کرنا ہے"۔ مجھے ان کے اس طفلانہ جواب پر بے اختیار ہنسی آگئی اور میں نے یہی مناسب سمجھا کہ ان کے جواب کے دوسرے فقرہ کی سیاسی اہمیت کو زائل نہ کرنے کے لئے خاموش ہی رہوں تو بہتر ہے۔ لیکن میں یہ کہنے سے بہرحال باز نہ رہسکا کہ "جب آپ خود ہندی بھاشا کے سیکھنے کا کوئی اقدام نہیں کرتے تو آپ کو کیا حق حاصل ہے کہ ہندو طلبہ سے یہ توقع رکھیں کہ وہ آپ کی زبان کی طرف متوجہ ہوں گے"۔

مجھے افسوس معلوم ہوتا ہے کہ غریب طلبہ مختلف مقامات پر خود جاجاکر شعراء کو دعوت دیتے ہیں، ان کے مصارف سفر برداشت کرتے ہیں اور نتیجہ اس کا سوائے اس کے کچھ نہیں ہوتا کہ جب یہ کرایہ لے لیکر جانے والے شعراء وہاں سے واپس آتے ہیں، تو ان کی برائیاں ہی بیان کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ غریب بسم اللہ کے گنبد میں زندگی بسر کرنے والے نوجوان کیا سمجھ سکتے ہیں کہ ہندوستان کا شاعر کس قدر عجیب وغریب چیز ہے اور اس کے اخلاق نفسیات کے کتنے ناحل کردہ مسایل اپنے اندر پنہاں رکھتے ہیں۔

یہاں لکھنؤ کے شیعہ کالج میں بھی ایک مشاعرہ منعقد ہوا، جس کا دعوت نامہ فارسی زبان میں تھا، یہ دیکھکر مجھے مسلم یونیورسٹی کا وہ بے تکاپن یاد آیا۔ جب شاید جوبلی کے موقعہ پر مشاعرہ کا اعلان انگریزی زبان میں کیا گیا تھا، سچ ہے "من چہ نقش ام فلان را درم بسیار نقش ست"

اس ماہ کے مضامین میں پہلا مضمون عرفی کے تذکرہ اور اس کی شاعری کی تنقید سے متعلق ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے عزیز دوست مولوی عبدالمالک صاحب نے اس مقالہ کے ذریعہ سے اپنی "عرفی پرستی" کا کافی ثبوت فراہم کیا ہے، لیکن چونکہ ہر پرستار کے لئے عصبیت اور ہر عصبیت کے ساتھ تنقید صحیح کا فقدان ناگزیر ہے، اس لئے یہ نقص اس مضمون کے ہر ہر حصہ سے ظاہر ہے۔ جہاں تک عرفی کے حالات کا تعلق ہے مجھے اس سے زیادہ بحث نہیں یہاں تک کہ میں آسانی سے اس کی

اس کشف و کرامت کا بھی قایل ہو جاؤنگا جس سے مدد لیکر (حسب اعتقاد عبدالمالک صاحب) اُس نے اپنی جوانمرگی اور بعد مرگ نجف تک پہونچنے کی پیشین گوئی کی تھی (حالانکہ یہ سب اتفاق سے زیادہ نہ تھا) لیکن غزلگوئی میں اس کو حافظ، فیضی یا جامی سے بڑھا ہوا سمجھنا باوجود کوشش کے بھی مجھ سے ممکن نہیں۔ تماشہ یہ ہے کہ جناب عبدالمالک صاحب نے مقابلہ کرتے ہوئے جو مثالیں پیش کی ہیں وہ بجائے ثبوت فراہم کرنے کے خود ان کے دعوے کی تردید کر رہی ہیں۔

میں عرفی کی نزاکت خیال، حلاوت سخن، عذوبت بیان، رنگینی ادا کا قائل ہوں۔ لیکن صرف قصیدہ کے میدان میں بلکہ اس خاص صنف سخن میں تو اس کو یقیناً "لاشریک لہ" سمجھتا ہوں، لیکن اس میدان سے ہٹ کر عرفی کوئی چیز نظر نہیں آتا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنا تمام سرمایۂ خیال قصیدہ گوئی میں صرف کر دیا اور کسی اور صنف سخن کے لئے چھوڑا ہی نہیں یہی وجہ ہے کہ آج نہ عرفی کی غزلگوئی کا ذکر کہیں ہوتا ہے اور نہ مثنوی گویوں میں اس کا شمار۔ اگر عبدالمالک صاحب صرف اس کے قصیدہ گوئی سے بحث کرکے اس کے محاسن کو پیش کرتے تو یقیناً یہ خدمت زیادہ مستحسن ہوتی۔ بہرحال فاضل مقالہ نگار کی محنت کسی طرح نظر انداز نہیں ہو سکتی اور اگر اس سے یہ امر ثابت نہیں ہو سکا کہ عرفی بہترین غزلگو تھا تو کم از کم یہ بات تو ظاہر ہو ہی گئی کہ باوجود پرستارانہ سعی و کوشش اور والہانہ تاویل و تائید کے بھی اس کا رنگ تغزل، فارسی کے بہتر غزلگو شعراء کے رنگ کو نہیں پہونچتا۔

جمال الدین افغانی کا خطبہ، موجودہ عہد کے مسلمان علماء کے لئے حقیقتاً ایک تازیانہ ہے۔ اگر ان کی نفس پرستیاں اور خود غرضیاں غور کرنے کی اجازت دیں۔ سوشیلا کا افسانہ ہمارے عزیز دوست ڈاکٹر اعظم کریوی کے جنبش قلم کا نتیجہ ہے اور اس میں ہر وہ مقامی رنگ موجود ہے جس کو وہ اپنے تمام فسانوں میں تمکین کے ساتھ بھرنے کے عادی ہیں۔ دوسرا افسانہ صدائے شکست اس مہینہ میں ختم ہو جاتا ہے۔ تیسرا افسانہ شرط چیکوف کا ترجمہ ہے نظموں میں سلمائے گجرات کی نظم چونکہ یکسر تعریض ہے حسن کی عشق پر اس لئے اسکو پرکیف ہونا چاہیے۔ جناب روش صدیقی نے سوگوار کی نظم میں پوری قوت تخییل سے کام لیا ہے۔

غزلوں میں جناب اختر شیرانی کی غزل اس قدر پرکیفیت ہے کہ اس سے زیادہ پردہ دری کسی کے افسانۂ حیات کی ناممکن ہے انسان کو صرف شعروں کا انتخاب ہی رسوا نہیں کرتا، بلکہ بعض اوقات شعرگوئی بھی یہی مبارک خدمت انجام دیتی ہے۔ ہمارے فاضل دوست افسر میرٹھی کی غزل اُن کے پیغام (message) کی آئینہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انکا ہر شعر جس خاص ادبی کیف کے ساتھ اصلاحی رنگ کو لئے ہوئے نکلتا ہے، اس کے کہنے اور سمجھنے کے لئے ذہنیت بھی مخصوص ہونی چاہیے ابھی تو نہیں لیکن ایک زمانہ آئے گا جب افسر کی حقیقی شاعرانہ منزلت لوگوں پر ظاہر ہو گی۔ جناب طالب، و طاہر و نہر کی بھی غزلیں خوب ہیں،

نیاز فتحپوری

خواجہ سیّد محمّد شیرازی متخلص بہ عُرفی

گاہے مئے شبانہ دگہ بادۂ صبوح
بنگر وظیفۂ سحر و دردِ شام ما
(جامی)

ناظرین کرام! شرب دوم کے کیف، اور بادۂ صبوح کے خمار میں، ایک دل ناشکیبا کی شرر افشانیوں کو ہدیۃً پیش کرنے سے قبل، اپنے فیاض اور محسن کرمفرما، جناب نیاز مدظلہ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے اپنی فکر نگارش کی روح ایک ناآشنائے ادب، دل میں پھونک کر یہ شرف بخشا، کہ اس کے افکار کا سلسلہ، ہر ماہ نگار کے صفحات میں شایع ہوا کرے۔ عرفی کے متعلق میں نے انگریزی میں ایک مطول مضمون لکھا تھا، اور اُسے "ینگ مسلم" میں شایع کرنے کے لئے جناب خواجہ حسن نظامی صاحب کو روانہ کیا، اُنھوں نے اپنے گرامی نامہ کے ساتھ اس مضمون کو واپس کر دیا (کیونکہ یہ اخبار بند ہو گیا تھا) اور مجھے لکھا کہ اردو میں لکھوں تو موصوف "منادی" میں شایع کریں گے، جناب مولانا نیاز اجل قدرہٗ نے اپنی غیر معمولی ہمت افزائی کے مطابق مجھ سے انگریزی مضمون طلب کیا اور پھر مجھ سے ارشاد فرمایا کہ میں اس کا اردو ترجمہ کر دوں، لہٰذا آج کی صحبت میں، عرفی شیرازی کے انھیں خیالات اور افکار کو اردو میں مزید شرح و بسط کے ساتھ پیش کرنا چاہتا ہوں، عرفی کی شاعری چونکہ میرے خاص ذوق کی چیز ہے اور اس میں بہت کشش پاتا ہوں، اس لئے ناظرین نگار کو بھی اس بادۂ نشاط میں شرکت کی دعوت دیتا ہوں۔

خمیر مایۂ آسائشست لائے شراب
بگو کہ صاف کشان جرعۂ زتہ گیرند

"عبد المالک آروی"

مقدمہ عرفی کی خصوصیات شاعری کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ فارسی شاعری کے ارتقائی مراحل کو پیش نظر رکھ لیا جائے۔ عرفی میرے نزدیک فارس کا سب سے بڑا شاعر ہے، لیکن عرفی کی اس عظمت کا اعتراف کرنے کے باوجود میں متقدمین کے ذوق سلیم اور وجدان جمیل کا بھی معترف ہوں۔ سعدی اور نظامی، انوری اور خاقانی، حافظ اور جامی کو بھی شعراء فارسی کے صف اولین میں جگہ دیتا ہوں، لیکن یہ فطرت کا فیضان ہے کہ وہ تمام امتیازات جو تمام متقدمین میں پائے جاتے تھے اُن

سب کا حال عرفی کو بنا دیا اور اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر شعرا متقدمین اپنی جگہ باغ کے مختلف رنگ و بو رکھنے والے پھول تھے۔ تو عرفی ایک گلدستہ تھا جسمیں تمام پھولوں کی شیرازہ بندی کی گئی تھی اور وہ اپنی جگہ ایک نوبہار تھا۔ اک طوفان رنگ و بو تھا ایک ایسا دلکش مجموعہ تھا محاسن افکار کا کہ مشکل سے ایک نگاہ نکتہ رس اس کی حد کشش سے نکلنے کی جرائت کر سکتی ہو انگلستان کا ایک مایۂ ناز ادیب، ریورنٹ اسٹا پفورڈ اپنی کتاب "انگریزی شعرا میں آلہیات" میں لکھتا ہے:

"کاؤپر کے زمانہ سے انگلستان کے شعرا میں الہیات کے متعلق فکر و احساس کی تدریجی ترقی ہوتی گئی، یہاں تک کہ ٹینیسن، اور براؤننگ کا دور آیا، انکی شاعری میں دینی افکار کا ہجوم اور مسائل الہیات کی فراوانی درجۂ کمال پر پہونچ گئی۔ لیکن یہ قابل لحاظ ہے کہ شعرا کے افکار دینیات، مذہبی فرقوں کے عقاید سے مختلف ہوتے ہیں، یعنی مذہبی عقاید کی طرح کسی قانون یا شریعت کی شکل میں مدون نہیں ہوتے۔ بلکہ یہ خود شعرا کی فطری روحانی ترقی کی پیداوار ہوتے ہیں، یہ افکار بالکل انفرادی ہوتے ہیں، اور انکی ترقی کا انحصار زیادہ تر خود شعرا کی مخصوص ذہنیت پر ہوتا ہے اس لئے یقینی طور پر اگر الہیات کا وجود کہیں پایا جاتا ہے تو وہ صرف شعرا کی جماعت کے تھا کیونکہ شاعری میں غیر شعوری طور سے صحیح فکر و احساس کے اظہار کا موقع بہت وسعت کے ساتھ مل جاتا ہے اور اسی لئے کاؤپر کی شاعری کا مذہبی تخیل بہت بلند ہے۔ اور شیلی کے اندر جب تصور صحیح کی آگ روشن ہوتی ہے تو اس کی وہی ملحدانہ زندگی شاعری کے اندر خالص غیر ملحدانہ ہوکر نظر آنے لگتی ہے۔

"انگریزی شاعری کے اندر مذہبی عناصر، کاؤپر کے زمانہ میں مضبوط ہوگئے، انگریزی شعرا میں خالص مذہبی افکار، ڈون، ہربرٹ واگھن وغیرہ کے زمانہ تک تھے، اس کے بعد "تنقیدی مسلک" عالم وجود میں آیا، اور اس کے وجود کے ساتھ ڈون، ہربرٹ اور واگھن کے خالص مذہبی رنگ کی شاعری بھی مٹ گئی"

فارسی شاعری کی تاریخ پر نظر غائر ڈالی جائے، تو وہاں بھی اسی قسم کی تقسیم پائی جاتی ہے، دور وسطیٰ کے مشہور شعرا کو دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے تمام اصناف سخن میں مہارت نہیں حاصل کی، جس نے مثنوی کو لیا، وہ غزل میں ادائے دلفریب نہ پیدا کر سکا، جس نے قصائد سے دلچسپی لی اس کا اسلوب بیان غزل میں ویسی دقیقہ سنجیوں، اور فلسفیانہ طبع آزمائیوں سے خالی تھا، جس سے غزل کا لطف جاتا رہا، اسی طرح جن ارباب ذوق نے غزل میں دستگاہ حاصل کی، وہ قصاید اور مثنوی میں نفاست نہ پیدا کر سکے، میرے سامنے سنائی اور رومی، اور سعدی، خاقانی اور انوری، حافظ اور صائب کی مثالیں موجود ہیں، سلاطین کی سرپرستی، اور درباری تعلقات کے اثر سے قدما میں مثنوی اور قصاید نے زیادہ ترقی کی، چنانچہ سب سے پہلے دقیقی نے شاہنامہ کی ابتدا کی، جو فارسی میں یونان کے مشہور مثنوی گو، ہومر کی معروف کتاب الیاڈ اور اڈیسی کا جواب ہے، اس کے بعد محمود غزنوی کے حکم سے فردوسی نے لکھنا شروع کیا، فردوسی نے ابھی اس کا تکملہ نہیں کیا تھا، کہ اچانک موت آگئی، اس نے اپنے عالم یاس ہی میں اپنے استاد اسدی طوسی سے اپنی اس حسرت کا ذکر کیا۔ بوڑھے استاد نے شاگرد کو تسکین دی اور اس کی تکمیل کے لئے آمادگی ظاہر کی۔
تاریخ فرشتہ میں یہ واقعہ بہ صراحت مذکور ہے، اس کے بعد نظامی اور سنائی کو لیجئے، نظامی نے اپنی شاعری میں نیم صوفیانہ

رنگ پیدا کیا، اور کچھ اخلاقی پہلا حصہ تو حکیم سنائی اور رومی کے خیالات سے ملتا جلتا ہے، اور دوسرا حصہ سعدی کے طرز میں ہے
"خاندان غزنویہ" کو علمی سرپرستی کے اعتبار سے اکثر سلاطین اسلام کے گھرانوں پر امتیاز ہے، اور یہ قابل فخر امر ہے، کہ اس گھرانہ میں خواجہ حسن میمندی جیسے باکمال، ابوریحان البیرونی جیسے ہمہ دان۔ نظامی جیسے اخلاقی شاعر، اور سنائی جیسے صوفی منش سخن آفرین منصۂ شہود پر آئے، چنانچہ معزالدولہ بہرام شاہ بن مسعود بن ابراہیم غزنوی کی عہد تاریخ شیخ نظامی گنجوی اور حکیم سنائی کے ذکر سے خالی نہیں ہوسکتی نظامی نے اپنی مشہور مثنوی مخزن الاسرار، سلطان بہرام بن مسعود ہی کے نام سے کی اور حکیم سنائی نے اپنی مشہور کتاب حدیقہ کو ۵۲۵ھ میں اسی بادشاہ کے نام سے نظم کیا خاقانی اور انوری نے قصائد میں جو کمال پیدا کیا ظاہر ہے لیکن غزلگوئی میں وہ کمال نہ پیدا کرسکے، کیونکہ یہاں علمی اور عقلی کاوشوں کی بجائے زیادہ تر جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرنا ہوتی ہے، چنانچہ اہل نظر جانتے ہیں کہ خسرو، حافظ، جامی، عرفی اور حزین وغیرہ کے مقابلہ میں، خاقانی نے تغزل کے اندر وہ پایہ حاصل نہیں کیا مولانا جامی، خسرو دہلوی کی شاعری پر اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے فرماتے ہیں "تتبع خاقانی می کند ہر چند در قصیدہ بہ او نہ رسیدہ اما غزل را از دمے گزرانیدہ"

دیوان شمس تبریز مطبوعہ کیمبرج کے مقدمہ میں ڈاکٹر نکلسن نے مولانا روم کے سلسلہ میں جستہ جستہ مشہور شعرائے فارس کے کلام پر تبصرہ کیا ہے، سعدی کے متعلق فرماتے ہیں کہ انکی شاعری میں علمی اخلاق، زہد و اتقا، اور نیم صوفیانہ رنگ ہے، دیوان شمس تبریز مطبوعۂ طہران کے مقدمہ میں مولف لکھتا ہے۔ سعدی کی غزلیات حسن ادا، اور نفاست بیان کے لحاظ سے بہت عمدہ ہیں، لیکن خیالات میں زیادہ تر مجازی رنگ ہے، راز و نیاز کی فراوانی ہے، سعدی میں حقیقت کا اظہار، اور طریقۂ تصوف کی وضاحت نہیں ہے جنسے مولانا روم کی شاعری مالا مال ہے، ڈاکٹر نکلسن ایک جگہ لکھتے ہیں مولانا روم کی شاعری حافظ شیرازی کے رنگ و بو سے معرا ہے، حافظ کی شاعری میں سنجیدگی بھی ہے اور طرب انگیزی بھی کفر و الحاد کی بھی شوریدہ سری ہے۔ اور زہد و اتقا کی بھی پندگری، ان کا ترنم جذبات سے مالا مال ہے، لیکن عموماً وہ ایک ہی نغمہ کو بار بار دہرایا کرتے ہیں، ان کے کلام میں شوخی نہیں ان کی تمثیل عموماً عبث اور ان کی ترجمانی عموماً غفلت شعارانہ ہوا کرتی ہے،

مولانا روم فارس کے دردِ سوز رکھتے، ڈاکٹر نکلسن نے اُن کی غزلگوئی پر بھی مدحیہ خامہ فرسائی کی ہے، لیکن یہ حقیقت ہے، کہ مثنوی میں مولانا کا جو پایہ ہے وہ غزل میں نہیں، غزل میں بھی وہ صوفیانہ افکار کی پابندیوں سے آزاد نہیں معلوم ہوتے، ہاں بعض غزلیں ایسی ہیں، جو خسرو، حافظ اور جامی سے ملتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، لیکن اکثر غزلیں ایسی بھی ہیں جو ایک شورش تصوف سے زیادہ مرتبہ نہیں رکھتیں۔ مولانا روم کا خاص پیغام جو مثنوی اور غزل دونوں میں پایا جاتا ہے یہ ہے :-

بصورت بشرم ہاں وہاں غلط نہ کنی　　　کہ روح سخت لطیف است و عشق سخت غیور

چہ جائے صورت اگر خوبنما شود صد تو　　　شعاع آئینہ جاں عالم آورد بہ ظہور

(دیوان شمس تبریز مرتبہ ڈاکٹر نکلسن)

سعدی کی مثال جناب آزاد نے میر تقی میر سے دی ہے، حالانکہ میر صاحب نے زمانہ کے ایسے کلفت آمیز تجربے کئے تھے کہ انکا دل سوز و گداز کا ایک آتشکدہ بن کر رہگیا تھا۔ سعدی کے کلام سے نسبت ہوگی، تو سودا کو، جنہیں نواب کی سرپرستی حاصل تھی، اور جن کی زندگی میر تقی کی طرح مصائب و آلام کا جولانگاہ نہ تھی،

ہاں عرفی ایک ایسا باکمال شاعر گزرا ہے، جسمیں متقدمین کے تمام کمالات پائے جاتے ہیں، اگرچہ وہ غزلیات میں دونوں کے جداگانہ اسلوب بیان کا حامل تھا، تو مثنوی میں بھی وہ جامی اور نظامی وغیرہ سے کم درجہ نہیں رکھتا، قصاید میں جہاں تک نزاکت تخئیل علوئے نظر اور شیرین مقالی کا تعلق ہے، وہ، نوری اور خاقانی سے پیچھے نہیں رہا، ہاں اُن کی طرح اس کے قصائد ہیں، ہئیت اور نجوم، فلسفہ اور حکمت کے اشارات نہیں ہیں، رباعیات میں باباطاہر عریاں، سعید بن ابی الخیر، اور خیام کی طرح اس نے بھی تفوق حاصل کیا، اس کے تمام اصناف سخن پر انشاء اللہ اس مضمون کے دوسرے حصہ میں، مشرح طریقہ سے بحث ہوگی، انگلستانی شعرا میں برنس اپنے جوش اور گرمی کلام کے اعتبار سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے، عرفی بھی اس حیثیت سے برنس کا ممثل ہے، میں اپنے اس مضمون کو دوحصوں پر تقسیم کرنا چاہتا ہوں پہلے حصے میں عرفی کی زندگی اور اس کے متعلقہ واقعات ہوں گے آیندہ حصہ میں اس کے کلام کا نمونہ پیش کیا جائیگا۔ متقدمین سے اس کا موازنہ ہوگا، اور پھر اس پر محاکمہ کرونگا۔

ماخذ اس سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے، کہ ان معلومات کا ماخذ کیا ہے، تاکہ اہل ذوق عرفی کے واقعات کو سند و اعتبار کی نظر سے دیکھیں نہ کہ صرف فسانہ کی حیثیت سے، خاص اس مقصد کے لئے کمترین نے پٹنہ میں جاکر اورنٹیل لائبریری میں فارسی کے قلمی نسخوں سے یہ معلومات حاصل کئے، چنانچہ اس ضمن میں نفحات الانس جامی مآثر رحیمی مصنفہ عبدالباقی نہاوندی، صحف ابراہیم مصنفہ عزیز الملک علی ابراہیم خان بہادر متخلص بہ خلیل ریاض الشعرا مصنفہ علی قلی خاں داغستانی متخلص بہ والہ، مجمع النفائس سراج الدین علیخاں آرزو، مخزن الغرائب مصنفہ احمد علی ہاشمی سندیلہ۔ طبقات اکبری مصنفہ نظام الدین احمد محمد مقیم الھروی، منتخب التواریخ مولفہ عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی کی ورق گردانی کیگئی، تاریخ فرشتہ میرے ذاتی کتبخانہ المعینیہ میں تھی، عرفی کی لائف کے متعلق براؤن نے لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد سوم میں عالمانہ اور محققانہ بحث کی ہے، اس سے بھی مستفیض ہوا، ڈاکٹر نکلسن کے مقدمہ دیوان شمس تبریز مطبوعہ کیمبرج سے بھی استفادہ کیا

نام و نسب دیوان عرفی کے موجودہ مطبوعہ نسخوں میں، عرفی کا نام جمال الدین لکھا جاتا ہے، حالانکہ یہ واقعہ نہیں، تمام تذکرہ نویسوں نے عرفی کا نام سید خواجہ محمد بتایا ہے اور یہی صحیح ہے، چنانچہ صاحب مآثر رحیمی لکھتے ہیں کہ عرفی کا نام تھا، خواجہ سید محمد بن زین الدین علی علوی بن جمال الدین مشہور بہ "چادر باف" براؤن نے لٹریری ہسٹری آف پرشیا میں عرفی کے والد کا نام بدرالدین لکھا ہے لیکن مفصلہ بالا تذکروں میں، کسی سے اس قول کی تائید نہیں ہوتی صاحب صحف ابراہیم نے عرفی کا نام جلال الدین لکھا ہے لیکن مآثر رحیمی کا بیان مستند اور معتبر ہے۔

ولادت صاحب مآثر رحیمی کے قول کے مطابق ۹۶۳ھ (۶۲ - ۱۵۶۱ء) میں بمقام شیراز پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم پائی،

زمانہ کے رسم ورواج کے مطابق، شعر وسخن کی طرف مائل ہوئے، اور وہ عروج حاصل کیا کہ کم کسی کو نصیب ہوتا ہے

تخلص عرفی کی وجہ

صاحب مآثر رحیمی نے لکھاہے، کہ ان کے والد دارالافاضل شیراز میں داروغہ کے عہدہ پر فائز تھے، سید محمد نے عرفی اور شرعی معاملات کی مناسبت سے، عرفی تخلص اختیار کیا،

عرفی کی بلند خیالی

تمام تذکرہ نویس متفقہ طور پر لکھتے ہیں، کہ عرفی کمال شاعری میں دعوائے یگانگی رکھتے تھے، اسے لوگ اُن کے عجب وغرور پر محمول کرنے لگے، چنانچہ براؤن نے تفصیل سے اس واقعہ پر روشنی ڈالی ہے اور عرفی پر مکابرہ کا الزام لگایا ہے، صاحب طبقات اکبری بھی لکھتے ہیں "امااز بس عجب ونخوت کہ پیدا کردہ بود، از دلہا افتادہ" لہٰذا ضرورت ہے کہ اس امر پر کسی قدر مشرح گفتگو کی جائے، دیکھنا یہ ہے کہ اس الزام کی اصل کیا ہے، صاحب مآثر رحیمی اور براؤن نے عرفی کے کلام کا نمونہ پیش کیا ہے جسمیں شاعر نے خاقانی، انوری اور ابوالفرج پر اپنی ترجیح کا دعویٰ کیا ہے۔ سعدی پر بھی ایک نظر عنایت کی ہے چنانچہ رحیمی لکھتے ہیں اور یہی براؤن کے دعوے کی بنیاد ہے:۔

انصاف بدہ بوالفرج وانوری امروز — بہرچہ غنیمت نہ شمر دند عدم را
بسم اللہ از اعجاز سخن دہشان تا ز — تا من قلم اندازم و گیرند رقم را
اول رہ این نظم خود ایشاں نہ سپردند — پس باز نمودیم بہم منزل ہم را
باللہ کہ این لاف وگزاف آیت صدق است — حاسد بود آن کو شمرد کذب قسم را
اقبال سکندر بہ جہانگیری نظمم — برداشت بہ یکدست قلم را و علم را
نوبت بہ من افتادہ بگوئید کہ دوراں — آرایشے از تو مکند مسند جسم را

مولانا عرفی دوسری غزل میں خاقانی کے متعلق یوں لکھتے ہیں:۔

زبس کہ لعل فشاندم بہ نزد اہل قیاس — یکے ست نسبت شیرازی و بدخشانی
کنونکہ یافت چون من سرمہ سائے در شیراز — خرد بہ دیدہ کشد سرمۂ صفاہانی
ببین کہ تافت ابریشمش چہ خامی یافت — ز تاب طلس من شعر باف شروانی
زمانہ بین کہ مرا جلوہ داد تا از رشک — بہ داغہا پس از مرگ سوخت خاقانی

براؤن نے مولانا کی غزل کے اس مطلع سے بھی اس نظریہ پر استدلال کیا ہے،

نازش سعدی بہ مشت خاک شیراز از چہ بود — گر نمی دانست باشد مولد وماوائے من

اس کے بعد براؤن لکھتا ہے کہ اہل فارس اپنے ملک کے ہیرو، اور سرزمین ایران کے اعاظم کی ایسی توہین برداشت نہیں کر سکتے تھے، صاحب مآثر رحیمی اس واقعہ کے متعلق لکھتے ہیں "مستعدان این زماں بعض از غایہ رشک وبرخے بہ جہت صغر سن وخامی کہ در طبیعتش بود، این سخن را مکابرہ دانستہ قبول این معنی از وی نمی کردند" یہ ہے مغرب اور مشرق کے ذوق استنباط کا امتیاز

انصاف پسند طبیعتیں جانتی ہیں کہ اس قسم کی شورش، عجب و غرور کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ شوخی طبیعت کا جسے مصطلحات شاعری میں تعلی سے تعبیر کرتے ہیں، میر تقی کا واقعہ اس دعوی کی تائید کرتا ہے میر صاحب سے کسی نے پوچھا دہلی میں کتنے شاعر ہیں میر صاحب نے جواب دیا ایک فقیر، دوسرے مرزا رفیع سودا، اور کچھ تامل کے بعد فرمایا نصف خواجہ میر درد، سایل نے پوچھا "اور میر سوز" میر صاحب نے جواب دیا، میر سوز بھی شاعر ہیں۔ اس نے کہا وہ بادشاہ کے استاد ہیں۔ میر صاحب نے جواب دیا اچھا یہی ہے تو پاؤ شاعر وہ بھی، مومن خاں کو سعدی کی گلستاں میں، سوائے گفت، گفتند، اور کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ اسیطرح فارسی شعرا کو دیکھئے خواجہ حافظ فرماتے ہیں:-

دگر باور نمی داری رو از صورتگر چین پرس — کہ مانی نسخہ می خواہد ز نوک کلک مشکینم

اسی طرح ایک دوسری غزل کے مقطع میں کہتے ہیں۔

بر آسمان چہ عجب گر ز گفتۂ حافظ
سماع زہرہ بہ رقص آورد مسیحا را

افضل الدین خاقانی ایک شعر میں کہتے ہیں کہ میں دنیا میں حکیم سنائی کا بدل پیدا ہوا ہوں، اس لئے میرے والد نے میرا نام ابو بدیل رکھا:-

بدل من آمدم اندر جہاں سنائی را — بدیں دلیل پدر نام من بدیل نہاد

حالانکہ ذوق شعر رکھنے والے جانتے ہیں کہ سنائی کا بدل خاقانی نہیں، بلکہ مولانا روم ہیں،

یہ تو صرف وہ مثالیں ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ شعرا نے اپنے اعجاز سخن کا دعوی کیا، یا خود کو متقدمین کے برابر تصور کیا، عرفی کی مثال صحیح صحیح، حضرت امیر خسرو دہلوی کے واقعہ میں ملتی ہے، جو کسی قدر تفصیل سے تاریخ فرشتہ میں موجود ہے، جناب خسرو متقدمین پر منہ کی آیا کرتے تھے، حضرت محبوب الہی انہیں اس سے منع فرماتے، لیکن شاعر کی شوخ طبیعت کہیں وعظ و نصیحت کی پابندیاں قبول کرتی ہے، خسرو نے خمسہ نظامی کا جواب کہا، تو بادہ مسرت کی سرشاری میں یہ بے محابا جرأت کر بیٹھے،

کوکبۂ خسرویم شد بلند — غلغلہ در گور نظامی فگند

اس لئے براؤن کی تمام سعی رہین ناکامی معلوم ہوتی ہے، اگر عرفی کے دامن پر مکابرہ کا داغ موجود ہے تو متقدمین کی شاعری بھی اس سے پاک نہیں ہے۔

ہندوستان میں ورود

ہندوستان کو یہ فخر ہے، کہ اس کی سرزمین پر دنیا کی مشہور اور بڑی بڑی ہستیاں تمنا لیکر آئیں، اور بامراد گئیں، صرف ایک طبقۂ شعرا کو لے لیا جائے تو ایک سلسلہ نظر آتا ہے، جو کسی صدی میں نہیں ٹوٹتا، سعدی نے تو ہندستان کا ایسا گہرا مطالعہ کیا تھا کہ بوستاں میں "بتے دیدم از عاج در سومنات" ہی لکھ ڈالا، سلطان بلبن کے زمانہ میں، اس کے لڑکے سلطان محمد خاں شہید نے دو مرتبہ سعدی کو ہندوستان میں مدعو کیا، لیکن دونو مرتبہ شیخ نے

پیری اور ناتوانی کا عذر کیا، اپنا کلام بھیجدیا اور خسرو دہلوی کی جو سلطان محمد خان شہید کے معزز رکن مجلس تھے، خسرو فارسی کے باکمال شاعر، یہیں پیدا ہوئے، اور یہیں پیوند خاک بھی ہوگئے۔ عرفی، صائب، شیخ علی حزیں، یکے بعد دیگرے ہند میں آتے گئے، صائب کو تو ایران کی کشش لے گئی، لیکن عرفی اور حزیں نے اسی خاک میں مل جانا پسند کیا، براؤن نے "لٹریری ہسٹری آف پرشیا" کی تیسری جلد میں ایک غلطی یہ کی ہے، کہ جہاں صائب اور عرفی کا ضمنی تذکرہ کیا ہے، وہاں یہ لکھدیا، کہ یہ تارک وطن ہوکر آباد ہونے کے لئے ہندوستان میں نہیں آئے تھے۔ بلکہ صرف جلب منفعت کی غرض سے آئے اور جب مقصد حاصل ہوگیا وطن کی طرف معاودت کی، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ عرفی نے ہندوستان ہی میں وفات پائی اور ایران لوٹ کر نہیں گئے۔ "نگار" بابت اگست ۱۹۲۸ء میں جناب ابوالمنعم صاحب "قایم چاندپوری" کے سلسلہ میں ضمناً یہ لکھتے ہیں کہ سلطنت بہمنیہ نے اپنی علم دوستی کے اظہار میں، جامی اور حافظ کو ایران سے مدعو کیا تھا" سلطنت بہمنیہ کی علم نوازی میں کلام نہیں، اور دعوت میں بھی شک نہیں، لیکن ابوالمنعم صاحب سے ایک غلطی یہ ہوئی ہے، کہ انھوں نے حافظ اور جامی کی دعوت تشریف آوری کو سلطنت کی طرف منسوب کردیا، حالانکہ واقعہ اس کے خلاف ہے، تاریخ نے اسے مفصلہ ذیل شکل میں پیش کیا ہے، ہرچند کہ اس واقعہ کی شرح و بسط میرے موضوع بحث سے خارج ہے، لیکن چونکہ مجھے یہاں یہ دکھانا منظور ہے کہ بڑے بڑے شعرا ہندوستان میں خود آئے، جو نہ آسکے اُنھوں نے تمنا کی، ملک کے ارباب ذوق نے انہیں دعوتیں دیں، سلاطین نے انہیں نوازا، اس لئے یہ تفصیل لذت آفرینی سے خالی بھی نہ ہوگی۔

اس میں شبہہ نہیں کہ حافظ اور جامی کو دعوت سلطنت بہمنیہ کے عہد میں دی گئی، اور خود سلطنت کے افراد نے دی، لیکن یہ دعوت محض انفرادی تھی، سلطنت کو دخل نہ تھا، چنانچہ تاریخ فرشتہ کے تیسرے مقالہ میں، حضرت حافظ اور جامی کا واقعہ موجود ہے

خواجہ حافظ کا سفر ہند جب سلطان محمود شاہ بہمنی کی سخاوت، ہنرپروری، اور قدرشناسی کی شہرت ہوئی، تو خواجہ حافظ شیرازی بھی سفر دکن کے لئے راغب ہوئے، لیکن چند موانع کے باعث، اس ارادہ کو جامۂ عمل نہ پہنا سکتے تھے، جب یہ خبر میر فیض اللہ انجو کو پہونچی، تو انھوں نے کسی قدر زاد راہ خواجہ کے لئے شیراز میں روانہ کیا اور آنے کی دعوت دی، خواجہ حافظ میر فیض اللہ کی توجہ اور مہربانی سے اور بھی سفر ہندوستان کے خواہاں ہوئے، میر فیض اللہ نے جو کچھ بھیجا تھا، اس میں سے کچھ تو اپنی بہن کے لڑکوں کو دیا، کچھ بیواؤں پر صرف کیا، کچھ قرض ادا کیا، اور بقیہ سے سامان سفر درست کرکے شیراز سے نکلے، لیکن جب مقام لار میں پہونچے تو جو کچھ تھا اپنے ایک غارتگر آشنا کو دیکر تہیدست ہوگئے۔ خواجہ زین العابدین ہمدانی، اور خواجہ محمد گازرونی نے جو بڑے تاجر تھے، اور سفر ہندستان کا ارادہ رکھتے تھے۔ خواجہ کے سفر کے خرچ کا عہد کیا، اور ہرموز میں لائے، لیکن بعض امور میں کوتاہی کی، اس لئے خواجہ حافظ کو رنج پہونچا۔ پھر بھی محمود شاہی کشتی میں سوار ہوئے لیکن سوء اتفاق سے باد مخالف بہنے لگی اور دریا میں شورش ہوئی خواجہ حافظ کو یکبارگی اس سفر سے نفرت ہوگئی

اور انھوں نے دوستوں سے کہا ہرمزمیں چند احباب سے مل کر نہیں آیا ہوں، اس لئے بہتر ہے کہ اُن سے رخصت ہولوں، اس بہا سے کشتی سے اتر گئے، اور اپنے ایک دوست کی معرفت ایک غزل لکھکر میر فیض اللہ انجو کو روانہ کی، جس کا مطلع ہے،

دمی بغم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد ۔۔۔ بمی بفروش دلق ما، کزین بہتر نمی ارزد

اس شعر کی غزل ہے جو دیوان میں موجود ہے، میر فیض اللہ نے جب یہ خبر سنی، تو سلطان محمود بہمنی سے اس کا تذکرہ کیا، سلط نے فرمایا "چوں خواجہ بقصد دریافت مجلس ما قدم در راہ نہادہ بود برما واجب وفرض است کہ اورا از فیض خود محروم نہ سازیم" چنا ملا محمد قاسم مشہدی کو ہزار تنکہ دیا، کہ ہندوستان کی عمدہ عمدہ چیزیں خرید کر خواجہ کو شیراز میں جاکر دے آئیں،

مولانا جامی کو ہندوستان آنے کی دعوت

مولانا جامی کی دعوت تشریف آوری کے متعلق تاریخ فرشتہ نے روشنی نہیں ڈالی ہے، ہاں خوا عمادالدین محمود کے کمالات کے سلسلہ میں مولانا جامی کا بھی ایک مختصر تذکرہ ہے، خواجہ موصو احمد شاہ بہمنی کے عہد میں معروف ترین تاریخی شخصیت رکھتے تھے، ان سے مولانا کے گہرے تعلق تھے، اور سلسلہ رسل ورسائل بھی تھا، تاریخ فرشتہ میں ہے، "مولانا جامی قدس سرہٗ مکاتیب اورامی فرستاد، و اظہار نیاز می کرد، وحضرت مخدوم نیز بر نظر عقیدہ و اخلاص او داشتہ، مفاوضات مرسول می داشت، کہ در منشات او موجود است"

مولانا جامی نے ایک قصیدہ خواجہ عمادالدین محمود کے نام سے مخصوص کیا ہے، جس کا مطلع ہے،

مرحبا اے قاصد ملک معانی مرحبا ۔۔۔ الصلا کز جان ودل نزل تو کردم الصلا

ایک دوسرے قطعہ میں مولانا فرماتے ہیں۔

جامی اشعار تو جنسے ست بس نغز و لطیف ۔۔۔ بود وش از حسن بود لطف معانی نازش

ہمرہ قافلۂ ہند رواں کن کہ رسد ۔۔۔ شرف عز و قبول از ملک التجارش

"ملک التجار" بہمنی خاندان کا سب سے بڑا شاہی خطاب تھا، جو خواجہ عمادالدین محمود کو دیا گیا تھا؛

مولانا کو دعوت تشریف آوری دی گئی تھی، اس کا حال خود ان کے ایک قصیدہ سے معلوم ہوتا ہے۔ جس کا حوالہ تاریخ فرشتہ نے دیا ہے، اس کے چند اشعار لکھے جاتے ہیں، جنہیں مولانا نے دعوت کا شکریہ ادا کیا ہے اور سفر معذرت کی ہے۔

بعد تبلیغ سلام از بندہ جامی عرضہ کن ۔۔۔ گر مجال گفتگو باشد دران حضرت ترا

کاززوئے من بدیدارت بسے کامل تر است ۔۔۔ زار زوئے عاشق مفلس بوصل کیمیا

تشنہ را در بادیہ روزے کہ باشد از سموم ۔۔۔ گرم جون اخگر زمین سوزندہ چون آتش ہوا

میل دل دانی چسان باشد بسوئے آب زلال ۔۔۔ شوق من افزون بود سوئے تو اے بحر عطا

اس کے بعد احمد آباد بیدر کا استعارۃً تذکرہ کرتے ہیں،

نیست در شہر ترا، از بہر منع زائراں ۔۔۔ شہر "بے در" راچساں در بست بردیم قضا

از گران جانی نیارم سوی تا اما ورنہ ہست جذب شوق از پیش روی دو دفع اضداد از قفا

کلیات جامی کا ایک پرانا مطبوعہ نسخہ میرے پاس ہے، کسی بزرگ نے پنسل سے اس قصیدہ کے حاشیہ پر لکھدیا ہے "محمود شاہ بہمنی دکن" جس سے معلوم ہوتا ہے، کہ مولانا جامی نے محمود شاہ بہمنی کی مدح میں یہ قصیدہ کہا تھا، حالانکہ یہ خواجہ عماد الدین محمود کی ستائش میں ہے، دوسری تاریخی غلطیاں اس میں یہ ہیں کہ سلطان محمود شاہ بہمنی کے عہد میں، تو مولانا پیدا بھی نہیں ہوئے تھے اور نہ اس وقت شہر احمد آباد بیدر کا دار السلطنت تھا، جس کا حوالہ مولانا نے قصیدہ میں دیا ہے، بلکہ اس وقت حسن آباد گلبرگہ کا پایۂ تخت تھا، احمد شاہ بہمنی کے زمانہ میں مولانا کو دعوت دی گئی تھی جس کا زمانہ ۸۲۵ھ سے ۸۳۹ھ کے درمیاں میں ہے گویا مولانا جامی کے شباب کا زمانہ تھا، لیکن انھوں نے وطن سے قدم نکالنا پسند نہیں کیا

عرفی کا قیام ہند

عرفی جب ہندوستان میں آئے جلال الدین اکبر کا زمانہ تھا، کسی تذکرہ نویس نے قطعاً یہ نہیں لکھا، کہ کب ہندوستان میں داخل ہوئے اور کتنے دنوں اس کی فضا میں زندگی بسر کی لیکن مجمع النفائس جلد ثانی میں تقی اوحدی کا یہ قول مسطور ہے " در شانزدہ سالگی از صفاہان کہ مولد من ہست متوجہ شیراز شدم کہ وطن اصلی آبا و اجداد من است، بہ خدمت و صحبت مولانا عرفی رسیدم "پنج سال" پیش از انکہ او متوجہ ہند شود، اکثر در ملازمت و سفرائے دیگر کہ مجمع بودند میرسیدم، و اشعار بابا فغانی کہ در آن ایام طرح می شد، تتبع می نمودم در آن وقت سن وے، تخمیناً سی سالہ "بود" اسی کے ساتھ مآثر رحیمی کا بیان ہے " در سن سی و شش سالگی درلا ہور جہان فانی را وداع نمود" ان دونوں روایات کو تطبیق دینے سے نتیجہ نکلتا ہے، کہ عرفی ۳۵ سال کی عمر میں ہندوستان آئے اور صرف ایک برس یہاں زندہ رہے۔

چونکہ تقی اوحدی کہتے ہیں کہ میں مولانا عرفی کی صحبت میں ان کے سفر ہند سے پانچ سال قبل، باریاب تھا، اور وہ اسوقت تین سال کے تھے، اسلئے چونکہ عرفی کی وفات چھتیس سال کی عمر میں متعین کیجاتی ہے، تو نتیجہ یہی نکلتا ہے، کہ وہ ہندوستان میں صرف ایک سال رہے اور پھر سپرد خاک ہوگئے،

عرفی کا ورود، اور فیضی کی میزبانی

بدایونی نے منتخب التواریخ میں لکھا ہے کہ عرفی جب ایران سے فتحپور میں آئے، تو سب سے پہلے ملک الشعراء شیخ فیضی سے آشنا ہوئے اور اس سفر میں مقام ٹک تک جو کچھ عرفی کے مصارف تھے، وہ شیخ نے برداشت کئے لیکن اس کے بعد دونوں میں کشیدگی ہوگئی - براؤن نے اس کا الزام بھی عرفی ہی کے سر رکھا ہے، حالانکہ بدایونی نے فیضی کی یہ قدیم عادت بتائی ہے کہ اس کی محبت اور ارتباط میں استقلال نہ تھا، چنانچہ لکھتے ہیں "آخر بنا بر وضع قدیم شیخ کہ با ہر کس ہفتہ دوست بود، درمیانہ شکر رنجہا افتاد"

عرفی اور حکیم ابو الفتح گیلانی

بدایونی لکھا ہے، اس کے بعد عرفی نے حکیم ابو الفتح گیلانی سے ملاقات کی، صاحب مآثر رحیمی، لکھتے ہیں، کہ حکیم صاحب کی مدح میں عرفی نے ایک قصیدہ کہا، انھوں نے عرفی کو عبدالرحیم خانخانان سے ملایا، جو اس وقت شعراء، علما، اور صناعان عالم کا مرجع تھے، چنانچہ مآثر رحیمی اسی عالی مرتبہ سپہ سالار کے

حالات کے متعلق لکھی گئی، عرفی کے کلام نے یہاں بڑی شہرت حاصل کی چنانچہ رسمی قلندر نے عبدالرحیم خانخاناں کی تعریف میں جو قصیدہ کہا ہی، اس میں ہے،

زمین مدح تو آن نغمہ سنج شیرازی رسید صیت کلامش بہ روم از خاور

بطرز تازۂ مدح تو آشنا گردید چو روئے خوب کہ یابد زماشطہ زیور

خانخاناں کی وساطت سے دربار اکبری میں گزر ہوا، اور ایسی خصوصیت پیدا کی کہ صاحب ریاض الشعرا، کی روایت کے مطابق ارباب ہوا نے، شاہزادہ سلیم کے عشق کا اتہام لگایا۔ اور آخر کار صحیح روایات کے مطابق اسی درباری بغض وعناد نے، عرفی کو برنس کی طرح عین شباب میں زندگی کی کلفت سے نجات دلادی،

لطیفہ شوخی اور ظرافت شاعری کی جان ہے، عرفی کو بھی یہ فیضان فطری حاصل تھا، چنانچہ براؤن اور بدایونی نے ایک واقعہ نقل کیا ہے جس سے عرفی کی ظرافت، جودت ذہن اور رسائی فکر کا پتہ چلتا ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ عرفی شیخ فیضی کی ملاقات کو گئے، شیخ موصوف اس زمانہ میں قرآن مجید کی تفسیر لکھ رہے تھے، عرفی نے دیکھا کتے کے بچے، قرآن مجید کے اوراق پامال کر رہے ہیں، عرفی نے شیخ فیضی سے سوال کیا، " نام صاحبزادگان چیست" شیخ نے جل کر جواب دیا عرفی" (یعنی مشہور ہیں) عرفی نے کہا " مبارک باشد" شیخ فیضی کے والد کا نام بھی مبارک تھا، اچھی خاصی ہجو ہوگئی، بدایونی نے قرآن مجید کی پامالی کا واقعہ نہیں لکھا ہے، لیکن یہ لطیفہ نقل کیا ہے، صاحب مخزن الغرائب نے قرآن مجید کے اوراق کی پامالی کا واقعہ بیان کیا ہے، اور یہ قیاس سے باہر بھی نہیں کیونکہ شیخ کہتے تھے، کہ کتا وفاداری میں انسان سے بہتر ہے۔

عرفی کا کشف والہام بعض ارباب نظر اس " سرخی" کو غالباً میرے بے اختیار جذبۂ تحسین، اور فرط آمیز طریق مدح کا نتیجہ تصور کریں لیکن یہ ایک حقیقت ہے، اور واقعات تاریخی اس کے مؤید ہیں،

" وحی اور الہام" انبیائے کرام ہی سے مختص نہیں، بلکہ دوسرے افراد انسانی کو بھی وحی اور الہام ہوا کرتا ہے، ہاں فرق صرف یہی ہے کہ جس وحی کا تعلق، قوم اور جماعت کی اصلاح، ان کے تزکیۂ نفس اور تصفیۂ قلب سے ہے، وہ "وحی نبوت" ہے اور یہ صرف انبیا علیہم السلام ہی پر آیا کرتی ہے، لیکن جس کا تعلق افراد کے ذاتی حالات، اور بعض اوقات ایک محدود دائرہ تک محیط رہتا ہے تو اسی "وحی عمومی" کہتے ہیں، اور اسی معنی میں قرآن مجید کے اندر سورۂ نحل میں ہے " واوحی ربک الی النحل " جانوروں پر بھی وحی آتی ہے، دوسری جگہ سورۂ قصص میں ہے، " واوحینا الی ام موسی ان ارضعیہ" یقیناً شہد کی مکھی، اور موسیٰ کی والدہ نبی نہ تھیں، پھر بھی اللہ نے اُن کے متعلق " وحی" کا لفظ استعمال کیا ہے، "کشف" کے متعلق سورۂ یوسف کی ایک آیت سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے، " انی لاجد ریح یوسف" بلاشک یہ حضرت یعقوب کے کشف باطن کا نتیجہ تھا۔ وحی کا نہیں، کیونکہ انھوں نے یہ دعویٰ نہیں کیا، کہ مجھے وحی آئی اور اس کی وساطت سے مجھے معلوم ہوا، اسے کشف سے تعبیر کرنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کا اظہار حضرت یعقوب نے اپنے گھر ہی والوں سے کیا تھا، یا کم از کم ان لوگوں سے کیا تھا، جو آپ کی نبوت کے

قایل تھے، لیکن وہ اس امر کو وفور محبت کا نتیجہ تصور کرتے تھے اس لئے " انک لفی ضلال قدیم " کہدیا ورنہ اگر حضرت یعقوب اسے وحی بنوت کی شکل میں پیش کرتے، تو ان لوگوں کو انکار کی گنجائش نہ تھی۔

احادیث میں بھی موجود ہے، کہ آنحضرت نے فرمایا۔ " لم یبق عن النبوۃ الا المبشرات " صحابہ نے دریافت فرمایا، حضرت مبشرات کیا ہیں آپ نے فرمایا " رویاء الصالحۃ " سچے خواب، خواب بھی وحی اور الہام کے اقسام میں سے ہے، " کشف وکرامات " کے متعلق ڈاکٹر نکلسن نے تصوفیائے اسلام " میں ایک باب ہی سپرد قلم کیا ہے دیوان شمس تبریز کے مقدمہ میں ڈاکٹر صاحب نفحات الانس کے حوالہ سے لکھاہے، کہ جب ارباب جور وکید نے شمس تبریز کو قتل کے ارادہ سے دروازہ پر بلایا تو انھوں نے مولانا روم سے کہا " میری قضا آگئی " صوفیائے کرام کے کشف کے متعلق بیشک جہل ووہم کے شیدائیوں نے افراط پیدا کر رکھی ہے، لیکن اصل سے انکار نہیں ہوسکتا، موجودہ دور کی روشن خیال طبیعتیں، میری اس خامہ فرسائی کو قدامت پسندی اور عجوبہ پرستی سمجھیں گی، لیکن جب اُن کے سامنے محققین یورپ اور موجودہ دور کے علما کے خیالات پیش کئے جائیں گے، تو غالباً وہ کشف وکرامات کے متعلق، ایک درمیانی مسلک اختیار کریں، چنانچہ ڈاکٹر ابراکرمبی نے قوائے عقلیہ میں جہاں فلسفہ خواب کی توضیح کی ہے، وہاں اس کے غیر مادی اسرار اور اس کے غیر مدرک اسباب حدوث کا اعتراف بھی کیا ہے، اسی طرح موجودہ دور کی تصنیف میں " معلومات خواب " کے نام سے اس موضوع کی قابل قدر کتاب ہے، جسمیں ایک انگریز اہل قلم نے خواب کے متعلق نکتہ سنجیاں پیش کی ہیں،

بہرحال عرفی کی زندگی کے تین واقعات ایسے ہیں، جو اس کی روحانیت پر دلالت کرتی ہیں۔ وقت مرگ کی رباعی، جوانا مرگی کی پیشین گوئی، اور نجف اشرف میں پہونچنے کا دعوی۔

رباعی بوقت مرگ صاحب مآثر رحیمی نے لکھاہے، کہ جب عرفی بستر مرگ پر تھے تو یہ رباعی کہی،

عرفی دم نزع است وہماں مستی تو — آخر بچہ بار بار بربستی تو
فرداست کہ دوست نقد فردوس بکف — جویائے متاع است وتہیدستی تو

اس سے عرفی کے علاقۂ الہی کا راز بہت کچھ سمجھ میں آجاتاہے۔

عہد شباب میں کشتہ ہونیکی پیشین گوئی تذکرہ نویسوں نے اسپر روشنی نہیں ڈالی لیکن ان کے واقعات کا مطالعہ کرنے سے انکی غزل کے ایک شعر کو پیشین گوئی اور کشف باطنی کا جامہ پہنایا جاسکتاہے کہتے ہیں

منکہ بہ نیز ارنہ خواہم شدن از موسفید — جائے آن است کہ در عہد شبابم بکشند

نجف اشرف جانیکی آرزو اور اُسکا قدرتی ساماں تمام تذکرے متفق ہیں کہ مرنے کے بعد عرفی کی بوسیدہ ہڈیوں کو لوگوں نے نجف اشرف میں دفن کیا، اس کی روئداد دو طریقہ سے بیان کی جاتی ہے، صاحب مآثر رحیمی نے جو بیان کیاہے وہی صحف ابراہیم اور دوسرے تذکروں میں ہے، صرف علی قلی داغستانی نے اختلاف کیاہے

مولانا عرفی نے حضرت علی مرتضیٰ کی مدح میں ترجمۃ الشوق نامی ایک قصیدہ کہا تھا، اس میں ایک شعر ہے،

اگر بہ ہند بہ خاکم کنی وگر بہ تتار — بہ کاوش مژہ از گور تا نجف بردم

صحف ابراہیم میں "بہ خاکم" کی جگہ "ہلاکم" ہے بہرصورت، اگر ہلاکم ہے، تو دو پیشین گوئیاں ہیں، اور اگر "بہ خاکم" کو مانا جائے جب بھی عرفی کے کمال باطن کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، چونکہ واقعات نے بتادیا کہ کس طرح عرفی کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔

ریاض الشعرا میں ہے کہ ایک فقیر نے ایک دوسری قبر کے دہوکے میں، جو عرفی کے پہلو میں تھی، قبر کھود کر عرفی کی ہڈیاں لیں اور نجف اشرف میں دفن دیا، لیکن یہ روایت نامعتبر ہے،

صاحب مآثر رحیمی نے کسی قدر تفصیل سے اسپر روشنی ڈالی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ میر صابر اصفہانی، جو غیاث بیگ طہرانی مخاطب بہ اعتماد الدولہ، وزیر ہند کی خدمت میں تھے، وزیر موصوف سے اجازت حاصل کرکے عرفی کی لاش لاہور سے نکال کر، خراسان کی راہ سے مشہد میں لے گئے، اور اس حصول سعادت کے دوماہ بعد، نجف اشرف میں پہونچایا، اور وفات کے تیس سال کے بعد، عرفی کے ریزہ ہائے استخوان کو حصار نجف کے باہر، جو جگہ حصار، اور مقام صاحب الامر کے درمیان میں واقع ہے، اور جس کو "بحیرہ" کہتے ہیں، دفن کردیا، ملا رونقی ہمدانی نے اس کی تاریخ کہی

چو عمر او بسر آمد ز گردش گرداں — شکست بر صف دلہائے پر شغف آمد
بگوش چرخ رسانید حرف جانفرسائے — کہ عمرم از تو چو بن در معرض تلف آمد
بہ کاوش مژہ از گور تا نجف بردم — فگند تیر دعائے و بر ہدف آمد
رقم زد از پے تاریخ رونقی کلکم — بہ کاوش مژہ از ہند تا نجف آمد

زہر اور وفات صاحب صحف ابراہیم نے لکھا ہے کہ لوگوں نے زہر دیا، طبقات اکبری کے عنوان بیان سے پتہ چلتا ہے کہ فطری موت سے نہیں مرے، چنانچہ اس میں ہے " از دلہا افتادہ بہ پیری نہ رسید" صاحب مجمع النفایس نے وفات کا سبب مرض اسہال بتایا ہے، صاحب مآثر رحیمی نے اس کے متعلق کچھ نہیں لکھا، صرف کہدیا " در لاہور جہان فانی را وداع نمود" لیکن صحیح یہی ہے کہ ارباب حسد نے زہر دیدیا جو اس عہد کی شخصی سلطنتوں میں کسی بارسوخ ہستی کو فنا کی گھاٹ اتارنے کا عام حربہ تھا۔

عرفی کو اہل دربار کے نفاق، اور اُن کے حسد کا علم تھا، چنانچہ جب وہ بستر علالت پر تھے، تو یہ حضرات ظاہر دارانہ اخلاق اور غیر حقیقی جذبۂ حزن وملال کا اظہار کرتے، بھلا عرفی سا نفسیاتی شاعر اور نکتہ شناس انسان ان منافقانہ اسلوب بیان کو کب خاطر میں لاتا، وہ ان کی ہمدردی کو سنکر پیچ وتاب کھاتا، ان کے اظہار حزن وملال پر غیظ میں آتا، انہیں تاثرات کو مفصلہ ذیل اشعار میں پیش کرتا ہے، جنہیں براؤن نے لٹریری ہسٹری آف پرشیا" میں نقل کیا ہے

تن او فتادہ درین حال و دوستان فصیح — بدور باش و بستر ستادہ چون منبر

یکے بہ ریش کشد دست و کج کند گردن | کہ روزگار وفا با کہ کرد جان پدر
بہ جاہ و مال فرومایہ دل نہ باید بست | کجاست دولت جمشید و نام اسکندر
یکے بہ نرمی آواز و گفتگوئے حزیں | کند شروع و کشد آستیں بدیدۂ تر
کہ جان من ہمہ را ایں رہ ست باید رفت | تمام راہ روانیم در دہر راکب بر
یکے بہ چرب زبانی سخن طراز شود | کہ اے وفات تو تاریخ انقلاب خبر
فراہم آرے دپریشاں مدار دل زنہار | کہ نظم و نثر تو من جمع می کنم یکسر
پس از نوشتن و تصحیح می کنم انشاء | بہ مدعائے تو دیباچہ چو درج گہر
چنانچہ ہستی فہرست دانش و فرہنگ | چنانچہ ہستی مجموعۂ صفات ہنر
بہ نظم و نثر در آویزم و غم ریزم | اگرچہ حصر کمال تو نیست حد بشر
خدائے عز و جل صحستم دہر بینی | کہ ایں منافقگاں را چہ آدرم بر سر

علامہ شبلی مرحوم نے شعر العجم میں "انقلاب خبر" سے تاریخ وفات نکالی ہے، براؤن نے اس پر تنقید کی ہے، وہ لکھتا ہے کہ حروف تہجی کے اعتبار سے "انقلاب خبر" کے عدد ۹۸۶ نکلتے ہیں، حالانکہ عرفی کی وفات ۹۹۹ھ میں ہوئی، اس لئے انقلاب خبر کا استعمال اس معنی میں نہیں ہوا ہے، بلکہ عام معنی میں استعمال ہوا ہے۔

تاریخ وفات صاحب مآثر رحیمی نے تقی اوحدی اصفہانی کا قطعہ نقل کیا ہے، جس سے تاریخ فوت نکلتی ہے،

عرفی شہ مند سخن پردازی | روحش چون نمودہ لامکاں پروازی
"ہادی کلام" گشتہ تاریخش شد | ہادی کلام عرفی شیرازی

ایک صاحب نے استاد البشر سے تاریخ وفات نکالی ہے،

کلام کی مقدار عرفی نے تمام اصناف سخن، غزل، مثنوی، رباعی، قصیدہ پر طبع آزمائی کی ہے، چنانچہ خسرو کی طرح خمسہ نظامی" کا جواب کہنا شروع کیا تھا کہ قضا آگئی، تین ہی مثنویاں کہی تھیں، چنانچہ صاحب ریاض الشعرا لکھتے ہیں" در جواب خمسہ نظامی سرگرم گفتن بود، کہ عمرش اماں نداد، سہ کتاب را جواب گفت، باقی ناگفتہ ماند" صاحب مآثر رحیمی نے لکھا ہے کہ عرفی نے اوایل شاعری میں ایک دیوان مرتب کیا تھا جس میں چھبیس قصیدے تھے، دو سو ستر غزل، اور سات سو بیت قطعہ و رباعی کے تھے چنانچہ یہ رباعی اس دیوان کی تاریخ ترتیب میں کہی تھی،

این طرفہ نکات سحر و اعجازی تو | چو گشت مکمل بہ رقم پردازی
مجموعہ طراز قدس تاریخش یافت | اول دیوان عرفی شیرازی

اس ترتیب سے قبل، چھ ہزار بیت تلف ہو گئے تھے، چنانچہ صاحب مآثر رحیمی نے اس کے متعلق چند اشعار پیش کئے ہیں، جو دیوان

عرفی کے نسخہ مطبوعہ لکھنؤ میں بھی موجود ہے،

عمر در شعر بسر کردہ و در باختہ ام — عمر در باختہ را باز دگر باختہ ام
العطش می زند از تشنہ لبی ہر مویم — کہ قدحہائے پر از خون جگر باختہ ام
گفتہ گر شد ز کفم، شکر کہ ناگفتہ بجاست — از دو صد گنج یکے مشت گہر باختہ ام
صد مصیبت کدہ در سخنم مدغم بود — گریہ و نالہ بسے شام و سحر باختہ ام

صاحب صحف ابراہیم لکھتے ہیں "چند مثنوی ناتمام از وے یادگار ماندہ، از جملہ آنہا مثنوی شیریں خسرو" از نوادر افکار اوست

کلام پر تذکرہ نویسوں کی رائے عرفی کے کلام پر ایک جامع تبصرہ علی ابراہیم خان خلیل نے صحف ابراہیم میں کیا ہے، لکھتے ہیں

"بلند مقامی بر وسلم است، و نازک خیالی از وجیم، گفتارش مغز فطرت را، نمکستان ملاحت ساختہ، و اشعارش کام ہوش را در شہد و شکر انداختہ چہ در قصیدہ، و چہ غزل، مخترع اسالیب جدید، و موجد نکات بے بدل است"

صاحب مآثر رحیمی لکھتے ہیں:۔

اشعارش در میان فرق انام شہرت تمام یافتہ، اہل عراق و فارس، و خراسان و ترکستان، ہندوستان، و اقصی بلاد عالم بہ تازہ گوئی و شعریت، و نادرہ و قادر سخنی او قائل گشتند، و اشعار او را برامثال، و اقران او ترجیح نہادند، و کوس یکتائی و بے مثلی در زمان خود۔۔۔ ۔

زد، از غایت علو فطرت و نہایت بلندی طبیعت، ہیچ کس را شاعر نمی دانست،

بدایونی منتخب التواریخ میں لکھتے ہیں:۔

او (عرفی) و حسین ستائی عجب طالعے دارد، کہ ہیچ کوچہ و بازارے نیست، کہ کتب فروشان دیوان این دو کس را، در سرراہ گرفتہ نایستند، و عراقیان و ہندوستانیان بنا بر تبرک می خرند بہ خلاف شیخ فیضی کہ چند زرہائے جاگیر صرف کتاب و مذہب تصانیف خود ساختہ ہیچکس بآن مستفید نمی شود، قبول خاطر و لطف سخن خداداد است

سراج الدین علی خان آرزو مجمع النفائس جلد دوم میں فرماتے ہیں:۔

الغرض قصیدہ، و غزل در اعلی او طرز خاص دارد، و مثنوی او آن قدرہا نیست لہذا حکیم حاذق، (پسر حکیم ہمام و حکیم ابوالفتح گیلانی کے بھتیجہ تھے) درسکے از مثنویات گفتہ

عرفی مادر غزل استاد بود — خانہ خراب وہ آباد بود
مثنویش طرز فصاحت نداشت — کان نمک بود ملاحت نداشت

نظام الدین محمد مقیم الہروی نے طبقات اکبری میں لکھا ہے:۔

ملا عرفی شیرازی جوانے بود صاحب فطرت، و فہم عالی داشت و اقسام شعر نیکو گفتے،

لیکن ان تذکروں کے خلاف براؤن، صاحب "مجمع الفصحا" کا قول رقم کرتا ہے،

"اُنکی شاعری کا اسلوب اس دور کے ارباب کے نزدیک قابل ستایش نہیں"

نفسیاتی شاعری

شعر کہہ لینا چنداں مشکل نہیں، لیکن کمال شاعری اور خصوصیت سخن آفرینی پر قدرت حاصل کرنا، عام کتابی سطح سے بہت بلند چیز ہے، ایک باکمال شاعر کے لئے ضروری ہے کہ اسے حقایق اشیا، کا علم ہو، اجرام فلکی کی معرفت ہو، تاریخ و ادب پر تبحر ہو، اور فلسفہ و حکمت میں مہارت حاصل ہو، ڈاکٹر نکلسن مقدمہ دیوان شمس تبریز میں مولانا روم کے کمالات علمیہ کا فلاطینوس سے موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہے، کہ "جو فکر و عقیدہ یہ یونانی فلسفی، اجمالی حیثیت سے پیش کرتا ہے، وہی مولانا روم تمثیل اور شاعرانہ خیالات میں ظاہر کرتے ہیں"، اس کے بعد تعجب کے ساتھ لکھتا ہے کہ "گو مولانا روم کے تحصیل فلسفۂ یونانی کے متعلق، تاریخی شہادتین موجود نہیں، لیکن اُن کی مثنوی کے مطالعہ سے، اُن کی فلسفیانہ نکتہ سنجیون، کی غایت محدود نہیں کی جاسکتی" لہذا ایک بڑا شاعر بڑی حد تک نوامیس فطرت کا حامل ہوا کرتا ہے، خصوصاً نفس نفی کا علم بھی شاعری کا ایک جز ولاینفک ہے، چنانچہ سطور ذیل میں اسی نقطۂ نظر سے عرفی کی شاعری پر ایک مختصر بحث کرنا چاہتا ہوں،

اس وقت نفسیات کے صرف ایک شعبۂ جذبات و احساسات کو لونگا، اور بتاؤنگا کہ عرفی نے اس ضمن میں کیسے لطیف ارشادات پیش کئے ہیں۔

ایم سی ڈاوگل "نفسیات اجتماع" کے پانچوین باب میں، جذبات اساسی کے متعلق ڈیکارٹ کا نظریہ نقل کرتا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ ڈیکارٹ خود جذبات اساسی تسلیم کرتا تھا، جنہیں غم و مسرت بھی شامل ہیں۔ پروفیسر ربو کا یہی نظریہ ہے، مولانا عبدالماجد صاحب اجل قدرہٗ نے "فلسفہ جذبات" میں مسرت و غم کو بھی جذبات، اساسی میں شامل کیا ہے، لیکن موجودہ محقق ایم سی ڈاوگل اس نظریہ سے انکار کرتا ہے، اور وہ غم و مسرت کو کیفیات سے تعبیر کرتا ہے، خاقانی کا ایک شعر ہے، ؎

نیست خوش نفسی بے گرانی کامروز   نافہ بے ترب درتتارنیابی

منطق تو ایک سرے سے اس "اختلاط خوش نفسی اور گرانی" کو خلاف حقیقت بتا دیگا۔ یہی نہیں بلکہ قدیم نفسیات کی کتابیں بھی اس نظریہ کے منافی ہیں، مگر نفسیات اجتماع (سوشل سائیکالوجی) کا مصنف خاقانی کے اس نظریہ کی تائید کرتا ہے اور اختلاط غم و مسرت پر ایک محققانہ بحث کرکے بتاتا ہے، کہ یہ قابل وقوع ہے،

شعراتے جن جذبات و کیفیات کو شاعرانہ پیرایہ میں ظاہر کیا ہے، وہ مسرت و غم کے وظائف۔ وصل و ہجر کے امتیازات، عشق و محبت کے کرشمے، جوش رقابت، سب و شتم، استکراہ و استحقار، خوف و غضب، امید و یاس کا مدوجزر ہیں، ان تمام اوراد، و وظائف کے مطابق کسی کی شاعری پر تبصرہ کرنا اور ان کا نفسیاتی اصول سے موازنہ غالباً بہترین طریق تنقید ہے اور میں کوشش کروں گا کہ بڑی حد تک اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر عرفی کے کمالات شعری سے بحث کروں۔

عرفی ہمین فسردگی گشت ماہتاب   امشب کہ در بغل نہادیم شیشہ را

نفس کا خاصہ ہے، کہ جس رنگ میں وہ ہوتا ہے، وہی رنگ خارج میں بھی اسے نظر آتا ہے، اگر نفس میں احساس لذت ہے،

تو دنیا بھی بزم جمشید معلوم ہوتی ہے، ورنہ عرفی کی طرح "شیشۂ مے" جب بغل میں نہیں رہتا تو گشت ماہتاب (چاندنی) میں بھی فسردگی نظر آتی ہے، پھر یہ اسلوب بیان کہ بجائے اپنی افسردگی کے اظہار کے چاندنی کو افسردہ کہا اور تاثراپنی ہی افسردگی کا پیدا کر دیا جس حد تک شاعرانہ قدرت کو ظاہر کرتا ہے وہ بھی کسی سے مخفی نہیں۔

آنجا کہ بخت بد بہ تقاضا غلو کند کارے کہ یاس ہم نہ کند آرزو کند

التفاتے نیست با امید مطلوب مرا مرحمت با یاس باشد خوئے محبوب مرا

پائے بر یاس فشردم غم امید گذشت کہ گماں داشت کہ این درد دوائے دارد

ڈاؤگل "نفسیات اجتماع" میں لکھتا ہے کہ جب حصول خواہشات ناممکن معلوم ہوتا ہے، تو انسان اپنی تمام سنجیدہ تدابیر، عاقلانہ وسائل اور فکری اجتہاد کھو بیٹھتا ہے اور ایک وحشی کی طرح چشم بصیرت بند کر کے حصول مرام کے لئے مستعد سعی ہو جاتا ہے۔ عرفی نے نفس کی اسی خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ خواہشات پیدا ہوتی ہیں، لیکن چونکہ بخت بد ہے اس لئے حصول مقصد معلوم، اس حصول مقصد کی سعی ناکام میں نفس شاعرہ کے اندر جو المناک کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں وہ جذبۂ یاس کی شوریدہ سری سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں "کارے کہ یاس ہم نہ کند آرزو کند" کا یہی مفہوم ہے۔

"حصول مطلوب" کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، تو انسان کاوشیں کیا کرتا ہے، اس کاوش میں خوف ناکامی اور رجائے مرام دونوں پائے جاتے ہیں، لیکن یاس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے، کہ انسان کے ہیجان عمل میں سکون ہو جایا کرتا ہے۔ عرفی نے اسی کو مرحمت با یاس باشد کی صورت میں پیش کیا ہے۔

انگلستان کے مشہور فلسفی، ہیوم کا خیال ہے، کہ جب حصول مقتضا، حد امکان سے باہر ہو جاتا ہے، تو خواہش کا جذبہ مٹ جاتا ہے لیکن ڈاؤگل اس پر تنقید کرتا ہے، اور کہتا ہے، کہ اس وقت خواہش مٹتی نہیں ہے، بلکہ نفس سعی بیجا پر تل جاتا ہے، اور اسوقت قلب انسانی میں ناکامی اور نا امیدی کے باوجود خواہش کا جوش اور مطلوب کی یاد باقی رہتی ہے، لیکن اس کا ظہور افسوس اور حسرت کی شکل میں ہوا کرتا ہے۔ عرفی کا نظریہ "پائے بر یاس فشردم غم امید گذشت" ہیوم کے مطابق ہے۔

صوفیانہ شاعری

تصوف مشرقی شاعری کی جان ہے، میں یہ نہیں کہتا، کہ ایسے شعرا آداب تصوف، اور قوانین طریقت کے متبع تھے، مجھے تو صرف انکی قلبی کیفیات سے بحث ہے، فرط رقت و فور درد تصوف کا سنگ بنیاد ہیں اور مشرق کی صوفیانہ شاعری میں بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں جنہیں ضمناً حب الٰہی، فنا و بقا، وحدت وجود، عالم شہود، مراقبہ و مکاشفہ تجلی و معرفت وغیرہ کا بھی ذکر ہو جاتا ہے۔

میرے پاس اس وقت انگریزی زبان میں اسلامی تصوف کی مایۂ ناز کتاب "مسٹکس آف اسلام" موجود ہے اور اُسے گویا گلشن راز مصنفۂ محمود شبستانی، کشف المحجوب ہجویری' اور مثنوی مولانا روم کے صوفیانہ افکار و عقاید کا خلاصہ کہہ سکتے ہیں' اس وقت میں نفس تصوف پر گفتگو کرنے نہیں بیٹھا ہوں اس لئے صرف عرفی کی شاعری کا صوفیانہ فکر و احساس کے نقطۂ نظر سے مختصر موازنہ کروں گا'

عرفی کی ایک رباعی اوپر لکھی جا چکی ہے، جس کا ایک مصرعہ ہے ؎ عرفی عالم چوں عالم وحدت نیست ـ مفصلہ ذیل اشعار سے اس کے کیف باطن، اور شہود و عرفان کا پتہ چلتا ہے'

بہ دیر آز حرم صوفی کہ می بیتے کشود اینجا	از انجا آنکہ میجوی بہ بیخواراں نمود اینجا
بہ جاں ننگے کہ انجا در ول سلامیان بینی	مغاں را نیز بود اما صفائے می زدود اینجا
محبت شمع بزم قدس و ما پروانۂ بیروں	چہ حالست ایں نمی دانم چراغ آنجا و دود اینجا
بیاد آورد مرۂ رندان بہ بے باکی دمے درکش	کہ مستی نمی داند بجز فریاد عود اینجا
بہر سوی روم بوئے چراغ کشتہ می آید	مگر وقتے مزار کشتگان عشق بود اینجا
نوائے نغمہ منصور عرفی نغز می بینی	دلے تن زن کہ خاموشند ارباب شہود اینجا

خیالات آسانی سے سمجھ میں آ جاتے ہیں، البتہ اگر آخری شعر گہری نظر سے دیکھا جائے، تو معلوم ہوگا تاریخی اور صوفیانہ موشگافیوں کا حامل ہے، مشرقی شاعری میں مجنوں، فرہاد، منصور وغیرہ کا نام کثرت سے آتا ہے ایک مصری ادیب نے تو مجنوں کے وجود ہی سے انکار کر دیا، میرے روحانی استاد جناب نیاز صاحب مدظلہ نے "نوائے منصور" کو صرف شاعرانہ تخیل سمجھا، اور تاریخی شہادتوں سے ثابت کیا کہ منصور، واقعتہً عارف باللہ نہ تھا بلکہ ترجمان الحاد' اور رہبر زندقہ تھا، وہ مضمون میری نظر سے نہیں گذرا سُنی سُنائی بات ہے، لیکن میری تحقیق میں "نوائے نغمہ منصور" پھر بھی نظر احترام کا مستحق ہے، علامہ ابن خلکان نے "وفیۃ الاعیان" میں منصور کی سرگذشت لکھی ہے، گو اس میں مورخ موصوف نے منصور کی بے دینی کا بھی تذکرہ کیا ہے، لیکن اس قدر صاف نہیں، اس کی زندگی کتنی ہی مشکوک کیوں نہ ہو لیکن اسے زندیق و ملحد نہیں کہہ سکتے، خصوصاً فارسی شاعری میں اس کی روحانی حکومت اس کے خیالات کی حقیقت کو بہت کچھ روشناس کر دیتی ہے، چونکہ بہت سے شعرا جنھوں نے شاعرانہ لطافت سنجیوں اور صوفیانہ ندرت آفرینیوں میں اس کا نام لیا ہے' اس کے زمانہ کے قریب تھے، سرمد کے واقعات زندگی منصور کی حقیقت کو اور بھی واضح کر دیتے ہیں، سرمد شہید نے بھی منصور کے محو تجلی و عارف ہونے کا اعتراف کیا ہے ـ عرفی کے صوفیانہ افکار کو مفصلہ ذیل عنوان کے ماتحت رکھ سکتے ہیں'

طعن زندانہ

کافر ترست زاہد از برہمن ولیکن + او را بت است در سر در آستین ندارد ـ کسی کے آستین میں بت ہونا، واقعتہً اس قدر کفر نہیں جس قدر دماغ میں اس کا جاگزین ہونا اس لئے زاہد کا کفر برہمن سے زیادہ سنگین ہے

دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

دین اگر این ست کین جمع پریشان را بود | برہمن اہل دل شاید کہ طنازی کند

شیخ یا رہبر کامل

صوفیائے اسلام کے پہلے باب میں ڈاکٹر نکلسن نے علامہ ہجویری کے حوالہ سے "شیخ و مرید" کے اوپر ایک مفصل بحث کی ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں، کہ جو شخص طریقت میں کسی شیخ کی رہنمائی نہیں حاصل کرتا وہ گویا شیطان کی رہنمائی میں آجاتا ہے اور ایسے شخص کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک درخت ہے، جو باغبان کے نہ ہونے کے باعث یا تو سرے سے بار آور ہی نہیں ہوتا، یا اس میں خراب پھل لگتا ہے، عرفی کہتے ہیں ؎

	تانیابی رہبرے کامل بقدم در رہ منہ	کز در دیر مغان تا کعبہ یکگام ست و بس
جستجوئے حق:۔	چو گرد و شوق وصل افزوں چہ جا طعن اگر مجنوں	بہ بوئے ہودج لیلی فتد دنبال محملہا
شکوۂ تجلی:۔	گرسنت دسوختم از انتظار بانزدید	درین دیار مگر رسم بازدیدن نیست
التہاب شوق وصل:۔	گر کام دل زگریہ میسر شود ز دوست	صد سال می تواں بہ تمنا گریستن
عالم شہود:۔	ما یۂ دیریم عرفی، عشوۂ در کعبہ نیز	مدتے بار بچہا از پردہ می انگیختم

موازنۂ عرفی و متقدمین

اثر آفرینی کے لحاظ سے کلام عرفی کی سحر طرازی بعض اوقات وجد انگیز ہوا کرتی ہے، اور اس کی نازک خیالی، جذبات کو آشفتہ بنا دیتی ہے، بایں ہمہ، میرا یہ دعویٰ نہیں کہ عرفی کے یہ اثرات ملہمانہ ہیں کیونکہ میری تحقیق میں اس کے اکثر حالات، خسرو، حافظ، جامی وغیرہ سے مل جاتے ہیں۔ لیکن یہ بھی نہیں کہا جا سکتا، کہ کلام کا یہ تمثل اور بیان کی یہ ہم آہنگی، سرقہ ہے، بلکہ زیادہ سے زیادہ اسے غیر شعوری استفادہ، کہہ سکتے ہیں، جو تمام شعرائے متقدمین کے کلام میں موجود ہے،

سرقہ اور توارد کی کسی قدر مفصل بحث "غالب بے نقاب کے حجابات" (نگار بابت اکتوبر ۱۹۲۸ء) میں ہو چکی ہے، جس میں ثابت کیا گیا ہے، کہ سرقہ اور توارد اعتباری مصطلحات ہیں، اور شعرا کے حالات زندگی، ان کے معیار علم ان کی شاعرانہ اثر آفرینی، اور معاصرین کی اثر پذیری کی مطابقت سے ان پر حکم لگایا جا سکتا ہے۔ ایک گمنام اور غیر معروف شخص کی شاعری، اگر متقدمین سے اثر پذیر معلوم ہو گی تو اسے سرقہ کہہ سکتے ہیں، لیکن اردو شعرا میں، میر سودا، سوز اور فارسی شعرا میں، حافظ، خسرو، جامی اور صائب، سرقہ کے الزام سے پاک ہیں، اسی طرح عرفی کی جبین نیاز بھی، متقدمین کی بارگاہ شاعری میں سربسجود نہیں بلکہ عرفی کی شاعری کی ایک اور خصوصیت یہ ہے، کہ وہ زیادہ تر خود دارانہ پہلو رکھتی ہے اور اس میں نیاز کے بدلے ناز اور عجز و انکسار کے عوض دعوائے تفوق پایا جاتا ہے۔

شعرائے متقدمین سے عرفی کے کلام کا موازنہ کرنے میں، بہت سے اشعار ایسے ملیں گے جو متوارد ہیں، صرف وزن، ردیف، اور قافیہ کی حیثیت سے نہیں، بلکہ غدوبت الفاظ، اور نزاکت تخئیل کی حیثیت سے بھی، اس لئے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے، کہ آج کی صحبت میں فارسی اور اردو کے مسلمہ استادوں کے متوارد کلام کی ایک مختصر فہرست دیجائے، اور اس کے بعد عرفی کے کلام

کا متقدمین سے موازنہ ہو۔

سودا کے تذکرہ میں جناب آزاد نے مرزا کا ایک لطیفہ لکھا ہے، میں اس وقت اس لطیفہ کے متعلق لکھنا نہیں چاہتا، بلکہ واقعہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں، خواجہ میر درد کے یہاں مشاعرہ ہوا تھا، حزیں کا یہ مصرعہ طرح تھا ؎

می گرفتیم بہ جاناں سرِ راہے گاہے

میر سوز، جرات، سودا سبھی نے اسپر طبع آزمائی کی اس کے بعد ذوق مرحوم نے بھی اس رنگ میں اپنا کلام پیش کیا لیکن اسا تذہ اردو کی خیال آفرینیاں، بعض جگہ حزیں کی نازک خیالی سے کچھ اس طرح ملتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، کہ اگر سوز، سودا، اور ذوق کے حالات زندگی، اور اپنے دور میں ان کے شرف استادی کا واقعہ موجود نہ ہوتا، تو ان تمام اکابر شعرائے اردو پر سرقہ کا الزام لگایا جاتا، ملاحظہ ہو میر سوز فرماتے ہیں ؎

نہیں نکلے ہی مرے دل کی اُبا ہے گاہے　　اے فلک بہر خدا رخصت آہے گاہے

لیکن حزیں اسے یوں کہہ چکا تھا ؎

این قدر ہست کہ در سختی تاب تب عشق　　دردمی داد بہ دل رخصت آہے گاہے

مرزا سودا نے تو، میر صاحب کے کلام "نہیں نکلے ہے" پر ایسی پھبتی اڑائی، کہ بچارے میر سوز شرما گئے، اور خود اپنا مطلع پڑھا ؎

چہ عجب گر نگش داشت سر الفت ما　　برق راہست نوازش بہ گیا ہے گاہے

نگاہ کا برق سے تشابہ، اور اپنی ہستی کو کاہ سے تعبیر کرنے میں، سودا، حزیں کے دوش بدوش ہیں، ذوق نے بھی اس رنگ میں ایک غزل کہی، ؎

اس طرف بھی تمہیں لازم ہے نگاہے گاہے　　دمبدم لحظہ بہ لحظہ نہیں گاہے گاہے

کلام کی صفائی اور بیان کی بے تکلفی قابل داد ہے، لیکن حزیں اسی خیال کو یوں ظاہر کر چکا تھا ؎

گنہم گرچہ عظیم است بخشائے بہ عشق　　شاد گرداں دل زارم بہ نگاہے گاہے

دونوں کے یہاں بناء خیال ایک ہی ہے، اسی طرح دوسرے موقعہ پر سودا نے ایک غزل پڑھی جس میں یہ شعر بھی تھا ؎

آلودہ قطراتِ عرق دیکھ جبیں کو　　اختر پڑے جھانکے ہیں فلک سے زمیں کو

خان آرزو نے فوراً ٹوک دیا کہ یہ قدسی کا کلام ہے ؎

آلودہ قطراتِ عرق دیدہ جبین را　　اختر ز فلک می نگرد روئے زمین را

میر تقی مرحوم کا ایک شعر ہے ؎

چمن میں گل نے جو کل دعویٰ جمال کیا　　جمالِ یار نے منہ اس کا خوب لال کیا

سودا نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ؎

رابری کا تری گل نے جب خیال کیا صبانے مار تھپیڑا منہ اس کا لال کیا

اگر اکابر شعرا پر سرقہ کا الزام لگایا جا سکتا ہے، تو خود، میر و مرزا جیسے باکمال حضرات کے کلام میں سرقہ موجود ہے، کیونکہ جامی نے ان سے قبل یوں کہا تھا ؎

گر کند غنچہ با تو دعوی لطف بر دہانش زند نسیم صبا

لیکن ارباب نظر کہہ سکتے ہیں کہ عرفی اور متقدمین کے توارد کلام پر اس سے استدلال فائدہ بخش نہیں، چونکہ فارسی اشعار کو اردو کا جامہ پہنا دینا بھی ایک صنعت ہے، جسے بلاغت نے مستحسن کیا ہے، اور ترجمہ بلاغت شاعری کی ایک مستقل صنعت ہے، چنانچہ ناصر خسرو نے فارسی میں کہا تھا ؎

کردم بے ملامت مرد ہر خویش را ازفعل بد ولیک ملامت نداشت سود
دار دز مانہ تنگ لی من ز دانشش حوزم دلاکہ دانشش اندر میاں نبود

رشید وطواط نے عربی میں اسی کو یوں کہا ہے ؎

عزلت زمانی مدة فی فعالہ ولکن زمانی لیس یرعہ العزل
یضیق صدار دھر بعصا بفضلہ فطوبی بصدر لیس فی ضمہ فضل

لیکن رہنمائی جستجو، ذوق کاوش اور امتیاز کلام کی دیدہ ریزی سے پتہ چلتا ہے، کہ صرف یہی نہیں، کہ شعرا نے دوسری زبان کے خیال کو اپنی زبان میں پیش کیا ہو، بلکہ بہت سی مثالیں ملیں گی کہ خود فارسی شعرا کے یہاں ایسے متوارد کلام موجود ہیں جو ان سے قبل کسی دوسرے استاد کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں، چنانچہ ملاحظہ ہو، صائب کا نہایت پر سوز شعر ہے، ؎

یادگار جگر سوختۂ مجنون است لالہ چندکہ از دامن صحرا برخواست

صائب کے استاد فن ہونے میں کسے شک ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ اس نے جامی کے یہاں سے یہ خیال چرا لیا، ؎

بسکہ رفتند شہیدان غمت سوئے عدم لالہ ہا غرقہ بہ خوں می دمد آں صحرا را

لیکن جب صائب پر خواہ مخواہ سرقہ کا الزام لگایا ہی جائے، تو پھر وہی اعتراض جامی کے سر بھی ہے، کیونکہ ان کے قبل حافظ شیرازی، یوں کہہ چکا تھا ؎

حسرت لب شیرین ہنوز می بینم کہ لالہ می دمد از خاک تربت فرہاد

بلاغت و معانی میں ارسال المثلین ایک صنعت ہے، جسکا ماحصل یہ ہے کہ، شاعر کسی شعر میں اپنے دعوی پر دو، دو مثالیں لائے، مندرجہ ذیل شعر میں خواجہ سلمان ساوجی نے اسی صنعت کو ادا کیا ہے، ؎

نصیحت ہمہ عالم چوں باد در قفس است بگوش مردم نادان چو آب در غربال

جوانا مرگ، شہید عہد شباب، عرفی شیرازی فرماتے ہیں ؎

مثالے گویمت عالی صفت بردار ازاں نقشے	جمال کعبہ نتواں کرد طے ناکردہ منزلہا

مولانا جامی ان سے قبل اس خیال کو یوں ظاہر کر چکے تھے:

بے طلب نتواں وصالت یافت آرے کے رسد	دولت کعبہ بجز رنج بیاباں بردہ را

حافظ اپنی ایک غزل میں فرماتے ہیں:

بہ باختم دل دیوانہ وندانستم	کہ آدمی بچۂ شیوۂ پری داند

سعدی نے ان سے قبل گلستان کے ایک قطعہ میں یوں کہا ہے:

من آدمی بہ چنیں شکل وخوی وقد وروش	ندیدہ ام مگر ایں شیوہ از پری آموخت

عرفی، کیفیت یاس کی کرمفرمائیوں کا شکریہ، ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں:

پاے ہرپاس فشردم غم امید گذشت	کہ گماں داشت کہ ایں درد دوائے دارد

جامی اس کے قبل یوں کہہ چکے تھے:

ناشدم فارغ بہ استغنائے عشق از ہر مراد	برمراد خویش یا بم گردش ایام را

بادی النظر میں، دونوں اشعار کے اندر مختلف سورشیں معلوم ہوتی ہیں لیکن تجزیۂ عناصر سے پتہ چل جاتا ہے، کہ دونوں کا ماحصل ایک ہے، یعنی حصول مراد سے علیحدگی، اور جمعیت خاطر کی دستیابی، اسی کو غالب فرماتے ہیں:

رنج نومیدی جاوید گوارا رہیو	خوش ہوں گر نالہ زبونی کش تاثیر نہیں

خسرو دہلوی نے ایک غزل کہی، خاشاک را، فتراک را، پاک را، اس کے بعد حضرت مولانا جامی نے بھی اس ردیف قافیہ میں ایک غزل کہی اور دونوں میں بعض جگہ ایسا توارد ہوا، کہ مولانا جامی کے کمالات کا دفتر ہمارے پاس نہ ہوتا، تو ہم جامی کے ان خیالات کو خسرو کا مرہون منت کہدیتے۔ ملاحظہ ہو:

خسرو	جامی
صد ہزاراں آفریں جاں آفریں پاک را	جان پاک است آں نہ تن زیر پیراہن ترا
کافرید از آب وگل سروے چو تو چالاک را	صد ہزاراں آفریں جان آفریں پاک را

خسرو کا پہلا مصرعہ، اور جامی کا دوسرا مصرعہ لفظ بہ لفظ ایک ہیں:

تہسوارا عیب فتراک است خون چوں منے	کمتریں صید توام پیش سگان خود فگن
گاہ بستن عذر باخواہی زمن فتراک را	گرنیم لایق کہ آلائی بہ من فتراک را

بنائے خیال ایک ہے، یعنی اپنی پستی کا احساس، اور اظہار عجز، خسرو کو اپنی پستی کا یقین ہے اور اس لئے وہ شاہد شہسوار سے درخواست کرتے ہیں، کہ لطف وکرم کرکے مجھے فتراک میں باندھ لو، لیکن اپنے عالی رتبہ فتراک سے میری طرف سے عذر خواہی

کرلینا، کیونکہ اس میں مجھ ذلیل کا خون لگ جانا اس کے لئے عیب ہے، جامی کا انداز شرطیہ ہے، انہیں خوف ہے کہ شاید میرا معشوق مجھے شکار کرکے اپنے فتراک میں نہ باندھے، اس لئے وہ پہلے سے پیش بندی فرمارہے ہیں، کہ اگر میں ایسا لایق متصور نہ ہوں، تو مجھے کم ازکم اپنے کتوں کے سامنے ڈالدینا، خسرو نے انکسار کے ساتھ اپنی خودداری کو قایم رکھا جامی نے اُمید کامرانی میں اپنے کمال انسانیت اور شرف نفس کی پروانہ کی لیکن دونوں کلام کی یکرنگی سے انکار نہیں ہوسکتا۔

خسرو

گر بہ کویت خاک گردم نیست غم الاغم آنست

کز سر کویت نہ خواہد باد بردن این خاک را

جامی

خاک شد بر رہگذارت جامی و ہرگز نیافت

آن شرف کز سایۂ سرو تو باشد خاک را

دونوں کے یہاں خاک ہوجانے کے بعد شاہد ناز کے دیدار اور وصل کی تمنا ہے، خسرو نے اس کا تجربہ ابھی کیا ہے، اس لئے وہ ناکامی سے خائف ہیں جامی اس منزل سے گذر چکے ہیں، اس لئے وہ نامرادی کا اظہار فرمارہے ہیں، لیکن وفور شوق اور آشفتگی تمنا میں دونوں برابر ہیں

اس تمہید سے یہی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے، کہ توارد استادان سخن کے کلام میں پایا جاتا ہے اور یہ کہ سرقہ اور توارد کا انتساب شعرا کے پایۂ شاعری کے لحاظ سے ہوسکتا ہے، بعض ارباب نظر کا یہ دعویٰ ہے، کہ متوارد کلام کے لئے مشہور ہونا ضروری ہے، مجھے اس سے انکار ہے، اور میں اس نظریہ پر بھی "غالب بے نقاب کے حجابات" میں روشنی ڈال چکا ہوں، اس ابتدائی عرصہ کے طے ہوجانے کے بعد اب میں متقدمین سے عرفی کے کلام کا موازنہ کرتا ہوں متقدمین میں سے صرف چند شعرا کو لونگا، جنکے بیان کی حلاوت، سخن کی گرمی اور جذبات کا کیف مسلم ہے، اس سلسلہ میں خسرو، حافظ، جامی، خاقانی، فیضی میرے پیش نظر ہیں اور ان کے دواوین کی ورق گردانی، امتیاز کلام، اور انتخاب غزلیات میں نہایت دیدہ ریزانہماک، اور جگر سوز محنت سے کام لیا گیا ہے، موازنہ میں کوشش کی گئی ہے، جہاں تک ممکن ہو، ایک ہی ردیف، قافیہ اور وزن کی غزلیں ہدیۂ ناظرین ہوں تاکہ زور طبیعت اور پرواز فکر کا صحیح اندازہ ہوسکے،

عرفی

جان رفت و سوز داغ تو دل ناتواں ہنوز

شد خاک دیدۂ مژہ ام خونفشاں ہنوز

خسرو

تن پیر گشت و آرزوئے دل جواں ہنوز

دل خوں شد و حدیث بتاں بر زباں ہنوز

عرفی کی پرواز ماورا طبیعت کی طرف لیجا رہی ہے، جہاں نکل جانے کے بعد، دل ناتواں کا سوز، مشاہدہ اور تجربہ سے بالاتر ہے، اسی طرح خاک دیدہ مژہ کی خونفشانی" بھی تعجب انگیزی سے خالی نہیں، ہاں ایک زندہ عاشق کا یہ دل سوز لحن ترنم، جذبات کی بیقراری، اور تمنا کی آشفتگی کا بہت بڑا راز پیش کر رہا ہے۔ خسرو نے ان فلسفیانہ گہرائیوں میں پڑنا نہ چاہا وہ اپنے جذبۂ معاشقہ کے استقلال کو بہت عمدہ اسلوب سے بیان فرمارہے ہیں، ضعیفی میں آرزوئے دل کا جوان رہنا، اور جگر کے خون ہونے کے بعد بھی حدیث بتاں" کا ذوق تعشق کی قابل احترام شوریدگیاں ہیں۔

عرفی	خسرو
خالکم بہ باد رفت سراسیمہ ہر طرف	عمرم بہ آخر آمد و روزم بہ شب رسید
می جوید از دلم غم عشقت نشان ہنوز	ستی و بت پرستی من ہمچنان ہنوز

عرفی عموماً فلسفیانہ کرشمہ زائیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں، یہاں بھی وہ نظری معاملات، اور تجزئی حقایق کے قید و بند سے آزاد ہیں، خسرو بلاکشی کے باوجود، مرتے دم تک میدان عشق کے ثابت قدم رہرو ہیں، یہاں بھی عرفی ایک فلسفی کی صورت میں، اور خسرو ایک سائنس دان کی شکل میں نظر آتے ہیں،

ز تیرہ کاری تو بخوں می طپید دل	عالم تمام پر ز شہید ان فتنہ گشت
افگندہ غمزۂ تو بہ بار گراں ہنوز	ترک عرا خدنگ بلا در کماں ہنوز

عرفی نے جل کر مشوق سے بالمشافہ خطاب کیا ہے، پہلے مصرعہ سے معلوم ہوتا ہے، ناک بھوں چڑھا کر بول رہے ہیں اسلئے جفاہائے ناز کو "تیرہ کاری" سے تعبیر کرتے ہیں، ہم بھی اپنی زبان میں اس کیفیت کو "غضب ہے" "اندھیر ہے" سے ظاہر کرتے ہیں، خسرو نے "خدنگ بلا در کماں" کہکے اس تیرہ کاری کی تفسیر کردی ہے، بنائے خیال دونوں میں ایک ہے یعنی ادائے بیدا دپر اضافہ، اور جور و بیرحمی کی مزادلت،

تابوت من رواں شد و ہر متاع او،	ہر دم کرشمہائے دے افزوں و آنگہے
جاں گریہ ناک ماند از آن آستاں ہنوز	خسرو ز بند او، بہ امید اماں ہنوز

دونوں خیالات ایک دوسرے کی ضد ہیں، عرفی دفن ہونے جارہے ہیں، لیکن آستان معشوق دیکھکر ان کی جان گریہ ناک ہے، یا پھر یہ بھی معنی ہوسکتے ہیں، کہ آستاں سے تابوت تو روانہ ہوگیا، لیکن روح نے آستان یار کو اپنا مستقر بنالیا، عرفی مرکر بھی در جاناں سے علیحدہ ہونا نہیں چاہتے، خسرو کے یہاں تمنائے خلاص ہے اور وہ بند محبت سے آزاد ہونا چاہتے ہیں، -

صد مہر می نہم بہ لب گفتگوئے دل	چندیں کہ دل جفائے ترا شکر می کند
تا گرد غم بہ شکوہ نہ خنید ز روئے دل	شرمندہ ہم نمی شوی آخر ز روئے دل

دونوں خیالات متضاد ہیں، عرفی کو اخفائے غم کی فکر، اور شکیبائی کا خیال ہے اور اس لئے وہ لب گفتگو پر صد مہر لگا رہے ہیں، خسرو گلہ جفا کو تشکر میں پیش کرتے کرتے، اکتا گئے، انکا دامن صبر چاک ہوگیا ہے، اور اس لئے وہ کھلے منہ شاہد ناز کو برا بھلا کہہ رہے ہیں، "شرمندہ ہم نمی شوی" اسی جذبۂ گلہ پردازی کا نتیجہ ہے۔

دامن بہ سلسبیل نیالاید آنکہ او	در خوں دلم خورم نہ کنم جز دعائے تو
در چشمہ سار درد کند شست و شوئے دل	زیرا کہ من بہ سوئے تو ام نے بسوئے دل

خسرو کا شعر معنی کے لحاظ سے عرفی کے شعر "صد مہر می نہم بہ لب گفتگوئے دل" الخ سے مل جاتا ہے، لیکن روئے دل کی مناسبت سے

یہ شعر اس کے مقابلہ میں نہیں لکھا گیا۔ ان دونوں اشعار میں بنائے خیال ایک ہی ہے، عرفی نے "چشمہ سار درد" کی کارفرمائیوں کو تسلیم کیا ہے، اور خسرو نے خود معشوق کو، حاصل ایک ہے، یعنی غیر از محبوب، سے بے التفاتی اور فنائے محبت ہونے کا اعتراف،

با صد غم آشناست دلم، دست از و بدار	خسرو حدیث درد تو بارے کجا کند
ترسم عمی عناں تو گیرد، ببوئے دل	زیرا کہ نیست در تن افسردہ بوئے دل

عرفی کو اپنے "بوئے دل" کی گہرائیوں اور اس کی ساحرانہ عمل سازیوں کا دعویٰ ہے، خسرو کو تن کی افسردگی، اور ناتوانی کے باعث "بوئے دل" کا پتہ بھی نہیں ملتا، اور اس لئے وہ حدیث درد کی تکرار سے اظہار عجز کر رہے ہیں،

تا چند عمر در غم و اندیشہ بگذرد،	عمرے بہ گرد کوئے تو گشتم چون بیدلاں
برداشتیم دست غم از روئے دل	نے دل بہ دستم آمد ونے آرزوئے دل

کثرت غم، اور افراط درد سے انسان کو سکون ہو جایا کرتا ہے، یہ ایک کلیہ نفسی ہے، ہائے غالب مرحوم ؎ "درد کی دوا پائی، درد لا دوا پایا" اور پھر مصرعہ ؎ درد کا حد سے گذرنا ہے، دوا ہو جانا، عرفی نے نفس کی اسی خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے "روئے دل" سے "دست غم" کے ہٹا لینے کے یہی معنی ہیں، خسرو نے اپنی ناکام کوشش کا حسرت اندور گلہ کیا ہے اور وہ اپنے دل کی گم گشتگی اور حرماں نصیبی کا افسوس کر رہے ہیں۔

شود آں شکار فردا، کہ براہ وعدۂ تو	تو زنالہ من از من سزد ار جدا نشستی
زغم بہشت و دوزخ ز دو جہاں جدا نشستہ	کہ ز دست خویش من ہم ز خودم جدا نشستہ

بیخودی اور از خود رفتگی کے متعلق دونوں کلام میں ہمخیالی ہے، خسرو نے اس میں کچھ زیادہ مرتبہ حاصل کر لیا ہے۔

روم از جہان و شادم کہ براہ تا قیامت	دل مبتلائے عاشق بہ کجا گریزد از تو
ز خیال غمزۂ تو چشم بہ بلا نشستہ	بہ حوالی دو چشمت، بہ چشم بلا نشستہ
ز دعا چہ کار جوعے، کہ میان تنگدستاں	غرضے ورائے امکان، چہ خیال فاسداست ایں
بہ ہزار نامرادی اثر دعا نشستہ	ہوس جمال سلطاں، بدل گدا نشستہ

کوشش جب ناکام ہو جاتی ہے، تو انسان دوا کی بجائے دعا کی وساطت سے طلب مراد کرتا ہے، جب اثر پذیری دعا کا ساتھ نہ دے تو پھر حصول مراد معلوم، عرفی نے اپنی مراد کو اسی شکل میں پیش کیا ہے، خسرو بھی اپنی غرض کو ورائے امکان بتا رہے ہیں اور اس لئے انھوں نے اُسے "ہوس گدا" سے تعبیر کیا، اس معنی میں دونوں کلام کے اندر یکرنگی ہے،

تو و بزم عیش عرفی من و کوچہ کہ ہر سو	ہمہ شب صبا و بویت من سوختہ چہ گویم
سر خونچکاں فتادہ دل بینوا نشستہ	کہ چہاست در دل من ز دم صبا نشستہ

عرفی کے افراط کیف، اور اس ہولناک ماحول کے اندر، جرأت کوچہ گردی قابل داد ہے، جناب خسرو اپنی سوختہ جانی کا

اظہار کرتے ہیں، ساتھ ہی انہیں اقرار ہے کہ صبا کے تھپیڑے، ان کے مشام جان کو بوئے یار کی، روح افزائیوں سے آشفتہ بنایا کئے،

عرفی و حافظ خواجہ حافظ کی بہت سی غزلیں ایسی ملیں گی، جن کے اوزان، ردیف اور قوافی، عرفی کے یہاں بھی ہیں اسلئے عرفی کے بہت سے اشعار معنی کے لحاظ سے بھی خواجہ حافظ سے مل جاتے ہیں، خواجہ حافظ کی شاعری کا ایک بڑا حصہ خمریات سے متعلق ہے، چنانچہ جب وہ قلم اٹھاتے ہیں، تو اس مضمون کو بھی اشارۃً یا کنایۃً ضرور ادا کر جاتے ہیں، سفر ہندوستان کا خیال ترک کرکے میر فیض اللہ انجو کو اپنا کلام روانہ کرتے ہیں، یہ کوئی ایسا موقعہ نہ تھا، بلکہ صرف اظہار واقعہ کرنا چاہتے تھے، اور یہی اس غزل کا مقصود بھی ہے، لیکن یہاں بھی اضطراراً لکھ جاتے ہیں، ~ بمے بفروش دلق ماکزاں بہتر نمی ارزد

عرفی	حافظ
امید عیش کجا و دل خراب کجا	صلاح کار کجا و من خراب کجا
ہوائے باغ کجا طائر کباب کجا	ببین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا
بذوق کلبۂ رندان کجاست خلوت شیخ	دلم ز صومعہ بگرفت و خرقۂ سالوس
حریم کعبۂ خلوت کجا شراب کجا	کجاست دیر مغان و شراب ناب کجا
بلند ہمتی ذرہ داغ می کندم	ز روئے دوست دل دشمناں چہ دریابد
وگرنہ ذرہ کجا مہر آفتاب کجا	چراغ مردہ کجا، شمع آفتاب کجا
بلائے دیدہ و دل راز پے شتابا تم	ببین بہ سیب زنخداں کہ چاہ در راہ ست
کسے نہ گویدم اے خانہ مان خراب کجا	کجا ہمی روی اے دل بدین شتاب کجا
نوائے عشق ابد می سرود عرفی دوش	چہ نسبت است بہ رندی صلاح و تقوی را
کجاست مطرب و آہنگ ایں رباب کجا	سماع وعظ کجا، نغمۂ رباب کجا
داغ دائم کرد یاس و طالب کامم ہنوز	ساقیا یک جرعہ دہ زان آب آتشگوں کہ من
دوزخے در ہر بن مو دارم و خامم ہنوز	در میاں پختگان عشق او خامم ہنوز
آہم آتش گشت و خاکم شد بخاکستر بدل	روز اول رفت دینم در سر زلفین تو
اندرین رہ کس نمی داند سر انجامم ہنوز	تا چہ خواہد شد درین سودا سر انجامم ہنوز
تربتم ویراں تر از کاشانہ شد از بخت بد	پرتو روئے ترا در خلوتم دید آفتاب
می نشیند چغد غم بر گوشۂ بامم ہنوز،	می دود، چوں سایہ ہر دم بر لب بامم ہنوز
صد ہزاراں شب ز آہ آتشینم تیرہ روز	اے کہ گفتی جان بدہ تا باشدت آرام دل
بخت بد بیں در شکنج ظلمت شامم ہنوز	جان بہ غمہا یش سپردم نیست آرامم ہنوز

عرفی

دوش در صومعہ آمد صنم بادہ فروش
جام مے در کف و زنار حمائل بر دوش
من صنم گوے و مریدان ہمہ در ہا یا ہاے
من قدح نوش و مغان نغمہ زن نوشانوش
توبہ از بادہ و بربستن چشم از رخ من
ترک زنار و برافگندن زنار بدوش

. . . .

. . . .

بہ بانگ چنگ بگوئیم آن حکایتہا
کہ از نہفتن او دیگ سینہ می زد جوش
خرقہ شگافان شوق، بے دف و بے نے در سماع
حلہ فشانان شید، تابع قانون و دف
باز بہ میدان ما فوج بلا بستہ صف
پائے فلک در میان بسم اماں بر طرف
عرفی اگر رہروی دوری منزل مبین
رو کہ مدد می کند ہمت شاہ نجف

حافظ

سحر ز ہاتف غیبم رسید مژدہ بہ گوش
کہ دور شاہ شجاع است می دلیر بنوش
شراب خانگی از ترس محتسب تا کے
بروئے یار بنوشیم و بانگ نوشانوش
ز کوئے میکدہ دوشش بہ دوش می بردند
امام شہر کہ سجادہ می کشید بہ دوش
صوفی ز کنج صومعہ در پائے خم نشست
تا دید محتسب کہ سبو می کشد بدوش
جز دل سوختہ را صوفی افسردہ دلیست
در خم طرۂ ما بار فشاندے از جوش
من بہ خیال زاہدی گوشہ نشین و طرفہ آنکہ
مغبچۂ ز ہر طرف می زندم، بہ چنگ و دف
من بہ کدام دل خوشی می خورم و طرب کنم
کز پس و پیش خاطرم لشکر غم کشیدہ صف
حافظ اگر قدم زنی در رہ خاندان عشق
بدرقہ رہت شود، ہمت شاہ نجف

مفصلہ ذیل غزلیں، عرفی اور حافظ دونوں کے یہاں، ایک ہی ردیف اور قافیہ میں پائی جاتی ہیں، لیکن دو مقامات کے سوا اپنی خاص خاص راہیں. اختیار کی ہیں، اس لئے معنی میں وہ یکرنگی اور خیال میں ہمنوائی نہیں پائی جاتی؛

عرفی:
نظر بہ حال دل آں پر غرور نکشاید
کہ سیر دیدہ نہ بیند متاع یغما را

حافظ:
غرور حسن اجازت مگر ندادے گل
کہ پرسشے نہ کنی عندلیب شیدا را

دونوں کے یہاں شکوہ ہے، عرفی نے بے التفاتی کی وجہ "سیری دیدہ" بتائی ہے، مگر بڑی شوخی سے، اپنے دل کو اپنے شاہد کا متاع یغما کہہ ڈالا حافظ صاحب کے یہاں غرور حسن ہے اور وہ معشوق کو گل سے مخاطب کرکے اپنے درد کا حال، عندلیب کی شورش میں پیش کر رہے ہیں؛

عرفی:
چو یوسفم گذرد، در بہشت بر صف حور،
نشان دہم بہ تو ہر گام صد زلیخا را

حافظ:
چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی
بہ یاد آر حریفان بادہ پیما را

دونوں خیالات ایک دوسرے کی ضد ہیں، عرفی وصل کے اس زینہ پر ہیں، جہاں عاشق کے بجائے معشوق اور دلفروش کے بجائے دلربا بنے بیٹھے ہیں، بھلا ہر گام "بر صد زلیخا" کا جو نظارہ دلفریب کرے، اس کا کیا کہنا، بیچارے غریب حافظ، اس کے برعکس ہجر و فراق کی مصیبتیں جھیل رہے ہیں، اور ایک عجز یہ شوق کیساتھ شاہد بیباک سے رقیب کی محفل مے آشامی میں اپنی یاد آوری کی درخواست کرتے ہیں:۔

اگر اجازت عرفی اشارہ فرماید	در آسماں چہ عجب گر ز گفتۂ حافظ
تہی کنم گہر گنج رمز ایمارا	سماع زہرہ بہ رقص آورد مسیحا را

مقطع میں دونوں نے تعلی کا اظہار کیا ہے، عرفی "گنج رمز ایما" کی گہر ریزی کا دعوی کرتے ہیں، حافظ صاحب آسمان پر پہونچ گئے ہیں، اور سماع زہرہ' اور رقص مسیح میں اپنے کلام کی اثر آفرینی کا مطالعہ کرتے ہیں۔

بہ این جمال چو آئی بروں بہ معجز عشق	جز این قدر نتوان گفت در جمال تو عیب
ز کام خلق برم لذت تماشا را	کہ خال مہر و وفا نیست روئے زیبا را

دونوں نے جمال کی تعریف کی ہے، عرفی اس جمال سے بہرہ اندوز ہونے کے متمنی ہیں، حافظ کو بے وفائی کا گلہ ہے،

عرفی و جامی

مولانا جامی ایک متقی عالم تھے، اس لئے ان کی شاعری میں، عارفانہ اور صوفیانہ خیالات بہت ہیں، پھر بھی انکی غزلیات کو دیکھو، تو تشبیب کی تزئین سے نگارخانۂ چیں ہیں، بعض غزلیں حافظ شیرازی کے طرز میں ہیں اور ان میں وہی مے شبانہ، بادۂ صبوح، شاہد طناز، فروغ خلوت، اور دیر بتکدہ کی کرشمہ آرائیاں ہیں، چونکہ حافظ کا کلام عرفی کے زیر مطالعہ رہا ہے، اس لئے وہ گویا ایران کے "حافظ ثانی" بھی ہیں، عرفی اور جامی کی طبیعتیں اسی معنی میں بعض جگہ یکساں واقع ہوئی ہیں

عرفی	جامی
چو خول آلودہ فردا خیزم دبرگرد او گردم	تجلی الراح من کاس تصفی الروح فاقبلہا
شہیدان محبت راز حسرت خوں شود دلہا	کہ می بخشد صفائے مے فروغ خلوت دلہا

معنی کے لحاظ سے دونوں خیالات میں اختلاف ہے، عرفی کے یہاں پرواز تخیل ہے اور جامی کے یہاں کسب عرفاں کا طریقہ، عرفی نے حریفان محبت کے جذبۂ نارسا، اور جوش رقابت کا تذکرہ کیا ہے، یا ان میں اپنے دفور عشق سے حسرت ہمدردی پیدا کرنا چاہتے ہیں، جامی فرماتے ہیں، بس ایک ہی قدح مے نے، ذوق انبساط میں اشتعال کر دیا، اور روح میں صفائی پیدا کر دی' اور صفائی مے کی یہ خصوصیت بھی ہے، کہ اس کی بدولت "فروغ خلوت" یا دوسرے الفاظ میں معرفت الہی اور شہود حاصل ہو جائے عرفی کا ایک شعر اسی معنی میں ہے

بدیر آ از حرم صوفی کہ مے بزم کشود اینجا از آنجا آنکہ می جوئی بہ مے خواران نمو اینجا

حافظ کا ایک شعر قریب قریب عرفی سے ملتا ہے، فرماتے ہیں ؎

بوئے نافہ کاخر صبا زاں طرہ بکشاید ز تاب جعد مشکینش چہ خوں افتاد در دلہا

عرفی | حافظ

مشائے گو بیت عالی صفت بردار از آن نقشے
جمال کعبہ نتوان دیدنے نا کردہ منزلہا

بجان شوساکن کعبہ بیابان چند پیمائی
چو نبود قرب روحانی چہ سود از قطع منزلہا

عرفی کہتے ہیں "جمال کعبہ" کی دیدار کے لئے منازل کی بلاکشی اور خارہائے دشت کی چبھن ناگزیر ہیں، جامی کہتے ہیں پہلے نفس میں ایسی پاکیزگی پیدا کرو، کہ روح کو خود ادراک ہو جائے کہ کعبہ ہی میں تم سکونت پذیر ہو، کیونکہ جب قرب روحانی نہیں ہے، تو پھر بادیہ پیمائی عبث ہے،

خدا ایں خانقاہ کہنہ صوفی را بہ رندان دہ
کہ ایوانے بسازند و بیارایند محفلہا

تو سلطان فلک قدری چہ باشی باگدا طبعاں
تو خورشید جہاں تابی چہ کردی شمع محفلہا

یہاں پر عرفی خیام کی پیروی کر رہے ہیں، لوگ شعرا کے ہر خیال کو کھینچ کر تصوف کی طرف لیجاتے ہیں، لیکن اہل تحقیق ایسے کلام کی حقیقت سے ناآشنا نہیں، اس جگہ عرفی کی بیباکانہ جرأت ہے، لیکن اس خیال کو تصوف کی طرف لیجانا، اس سے بھی بڑھی ہوئی ایک ناروا جسارت ہوگی، عرفی نے بعض اشعار میں ایسی ہی بے حیا باشوخیاں کی ہیں جو شاعری میں، گو مذموم نہیں، لیکن ارباب ذوق کے لئے تکلیف دہ ہوا کرتی ہیں، چنانچہ عرفی ایک شعر میں فرماتے ہیں ؎

شوق موسیٰ چہ کہ آن مہ چو برآید بربام
مشعل طور کمند افگن بام ست اینجا

الفاظ کی تاویل ہوسکتی ہے، "مے" کو "مے محبت"، دیر کو "عالم شہود" اور پرستش اصنام کو وحدت فی الکثرت سے تعبیر کرسکتے ہیں لیکن جب مشعل طور، ہی کو کمند افگن کہا جائے، اور شوق موسیٰ کی بیکرانی کو ٹھکرا کر کسی کے جلوۂ بام پر (نعوذ باللہ) خدا کو بھی نثار کیا جائے تو نہیں کہا جاسکتا اس شوخی طبیعت کی کوئی غایت بھی ہے، ایسا کلام میرے نزدیک ذوق میں انبساط نہیں پیدا کرسکتا، ہوسکتا ہے دوسرے ارباب نظر اسے بھی تصوف کی طرف لیجائیں، لیکن میرے خیال میں ایسا تصوف بھی گمراہ کن ہے، بہر صورت مفصلہ بالا اشعار میں عرفی کے یہاں شوخی ہے اور جامی کے یہاں عالم شہود،

اگر با میر محمل رمزے از دیر مغاں گویم
جرس بکشاید و ناقوس بربندد بہ محملہا

مرا نظارۂ محمل ز سلمیٰ باز می دارد
چہ باشد برق استغنا زند آتش بہ محملہا

عرصہ سے یہ ہوتا چلا آیا ہے کہ حج کے زمانہ میں مصر سے محمل آیا کرتا ہے، چنانچہ آج بھی یہ رواج ہے مصری حجاج کی بڑی جماعت اسی محمل کے ساتھ فریضۂ حج کے لئے آتی ہے حکومت کی طرف سے اس محمل کیساتھ ایک افسر متعین ہوتا ہے، عرفی نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے، اور فرماتے ہیں کہ اگر "میر محمل" سے "رمز دیر" کہوں، تو وہ جرس کے بدلے محمل میں ناقوس باندھ لے، لطافت بیان اور پاکیزگی خیال میں شعر بہت بلند ہوگیا ہے جامی فرماتے ہیں۔

نظارۂ محمل میں ایسی محویت ہو جاتی ہے کہ محمل نشین کا وصل میسر نہیں آتا، کیا اچھا ہوتا، اگر "برق استغنا" محمل ہی کو جلا بھنا کر خاک کر دے

تاکہ سلمیٰ کی مواصلت میں کوئی حجاب اور تصادم نہ پیدا ہو، جامی کا خیال بھی نہایت بلند ہے، اور انھوں نے "متاع الحیوٰۃ الدنیا واللہ عندہٗ حسن المآب" کی طرف اشارہ کیا ہے،

جامی		عرفی	
طرف باغ ولب جوئے ولب جام است اینجا		کوئے عشق است وہمہ دانہ و دام است اینجا	
ساقیا خیز کہ پرہیز حرام است اینجا		جلوۂ مردم آزاد حرام است اینجا	

عرفی کے یہاں دعوت عشق اختصاصی حیثیت رکھتی ہے، جامی نے دعوت نشاط کو عام کر دیا ہے، اور وہ اس دعوت کی شرکت سے پرہیز کرنے کو حرام بتا رہے ہیں،

جامی	عرفی
لب نہادی بہ لب جام وندانم من مست	ہر کہ بگذشت دریں کوئے بہ بند افتاد است
کہ لب لعل تو یا بادہ کدام است اینجا	طائر بے قفس و دام کدام است اینجا

دونوں کے یہاں دو خیالات ہیں، عرفی نے معشوق کے سراپا کو جلوہ گاہ محویت بنا دیا ہے، جامی نے معشوق کے لب لعل کو کچھ اس باریک بینی سے پیش کیا ہے، کہ بے اختیار زبان سے تحسین نکلتی ہے، فرماتے ہیں کہ جب میرا معشوق جام سے اپنا لب لگا دیتا ہے، تو مجھے یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ بادہ کون ہے، اور لب کون، یہی وجہ ہے کہ لب کو لب میگوں کہا جاتا ہے، دوسرے شعر میں جامی نے زلف یار کا تذکرہ کیا ہے جو عرفی کے الفاظ، اور معنی سے ملتا ہوا ہے ؎

بستۂ حلقۂ زلف تو نہ تنہا دل ماست ہر کجا مرغ دلے بستۂ دام است اینجا

جامی	عرفی
پیش ارباب خرد شرح مکن مشکل عشق	در حرم ذکر بت دیر نشین خاص تو است
نکتۂ خاص مگو مجلس عام است اینجا	للہ الحمد کہ این زمزمہ عام است اینجا

عرفی کہتے ہیں حرم کے اندر بت دیر نشین کا ذکر مجھی سے مخصوص ہے، لیکن یہاں تو یہ نغمہ عام بنا ہوا ہے، جامی بھی اپنے کو مشکل عشق کا خاص شارح جانتے ہیں، لیکن وہ ارباب خرد کی مجلس عامیانہ میں اس نکتۂ خاص کی شرح کرنے کے لئے تیار نہیں، عشق کے ارباب خاص ہونے میں عرفی اور جامی کے خیالات یکساں ہیں، لیکن عرفی اوروں میں بھی یہ جلوہ دیکھتے ہیں، جامی کے یہاں ایسی وسعت نہیں،

جامی	عرفی
شیخ در صومعہ گر مست شد از ذوق سماع	بر در از عشق مچین معرکہ اے شیخ حرم
من و میخانہ کہ ایں حال مدام است اینجا	طفل را شیوۂ بازیچہ حرام است اینجا

دونوں حضرات نے شیخ کو نیچا دکھانے کی کوشش کی ہے، جامی نے تو اتنا ہی کیا ہے، کہ بیچارے شیخ کے ذوق سماع اور حالت مستی کو بہ نظر استحسان دیکھا ہے، عرفی نے ایک سرے سے حضرت شیخ کو میدان عشق کا طفل مکتب تصور کر لیا،

عرفی وخاقانی | خاقانی کے دیوان غزلیات پر جب ایک مبصر کی نگاہ پڑتی ہے، تو وہ حیران رہجاتا ہے، کہ ایسا قادر الکلام شخص

غزلیات کے میدان میں کس قدر محتاج اثر آفرینی ہے، خاقانی کو "سحبان العجم" کہا گیا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ قصیدہ کے اندر خیال کی ندرت، بیان کی روانی، نکات کی شرح، اور نوامیس فطرت کی ترجمانی میں وہ تمام شعرائے عجم سے بڑھا ہوا ہے، لیکن غزل میں وہ اپنے زمام خیال پر متصرف نہیں رہتا، یہاں بھی وہی سرزوری کرنا چاہتا ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ غزلیات اثر سے خالی ہوکر رہگئیں صاحب صحف ابراہیم لکھتے ہیں:—

"شیخ فیضی کہ نادرہ زمن، واز اساتذۂ این فن است، اعتقاد تمام بہ کلام او ندارد، وبعضی ممیزان بجہت لغات واصطلاحات غیر متعارفہ سخنانش را می پسندند"

موازنہ کلام خاقانی و عرفی میں ایک انکشاف

میرے پاس کلیات خاقانی کی دوسری جلد کا مطبوعہ نسخہ ہے، اثنائے موازنہ میں مجھے یہ دیکھکر سخت پریشانی ہوئی، کہ ردیف صاد سے لیکر لام تک، عرفی کی تمام غزلیات جو اس کے دیوان میں ہیں، خاقانی کے دیوان میں بھی پائی جاتی ہیں، صرف مقطع میں عرفی کی بجائے خاقانی ہے، جس ناپاک ہاتھ نے یہ سفیہانہ غلط کلام کیا ہے، وہ تو بجائے خود ہے، مطابع کے ارباب تصحیح اور بھی زیادہ قابل الزام ہیں، جنھوں نے اس طرف توجہ نہ کی، ہندوستان کے مطابع، فارسی کتب کی طباعت اور ان کے نشر و شیوع میں مستعد تو بہت ہیں، کیونکہ اس مستعدی میں، خدمت علم و ادب کی بجائے، زیادہ تر تجارتی مفاد ملحوظ رہا کرتا ہے، لیکن انھیں صحت کی پروا نہیں ہوتی مغرب کی مجالس طبع و نشر، اس معنی میں قابل صد آفرین ہیں، جن کی سعی جمیلہ کی بدولت صحیح نسخے ہمارے ہاتھوں تک پہونچتے ہیں کیمبرج یونیورسٹی کا چھپا ہوا دیوان شمس تبریز جو میرے پاس ہے وہ ہندوستان کے لئے قابل تقلید ہے، ایک تو ڈاکٹر نکلسن نے برٹش میوزیم اور وائنا کی لائبریری میں جو قلمی نسخے موجود ہیں، ان سے مقابلہ کرکے نسخہ کی ترتیب دی ہے، دوسری خوبی یہ ہو کہ طباعت نہایت عمدہ ہے اور کاغذ غایت درجہ دلفریب، فارسی کی کتابیں ہندوستانی مطابع میں جو چھپتی ہیں، وہ اغلاط سے لبریز، اخلاط سے ملوث، طباعت اور کاغذ بھی خراب، کیا ادبائے وطن اور ارباب نثروت اس طرف توجہ کریں گے؟

خاقانی کے دیوان میں جو ایسی غزلیات پائی جاتی ہیں، وہ خاقانی کا نتیجۂ فکر نہیں، بلکہ وہ عرفی کا کلام ہیں جو سرسری نظر میں معلوم ہو جاتا ہے، اس واقعہ سے اور بھی اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے کہ پٹنہ کی، اورینٹل لائبریری میں، عرفی کے دو قلمی دیوان ہیں (فہرست کتب قلمی فارسی ۱۵۹ و ۱۶۰) ان میں بھی یہ غزلیں موجود ہیں، اور دیوان خاقانی کے قلمی نسخہ میں نہیں پائی جاتیں،

عرفی	خاقانی
ہرگز گلہ از دوست بہ محرم نہ فروشم	در دے کہ مرا ہست بہ مرہم نہ فروشم
گر مشتری ام دوست شود ہم نہ فروشم	در عاقبتش صرف وہی ہم نہ فروشم

عرفی کے یہاں گلہ دوست سے پرہیز کرنے کا عہد موثق ہے، خاقانی لذت درد کو رہین مرہم بنانا نہیں چاہتے، بلکہ درد دوامی کے طالب ہیں،

از شورش غم با در و دیوار بہ جسر فم — گر محرم غم گشتہ دل زندہ بدر دسے

وقت آنکہ بہ آسودہ دلاں غم نہ فروشم — کیں راز بدل مژدۂ خرم نہ فروشم

دونوں کے یہاں ایک خیال ہے، عرفی کا جذبہ کچھ زیادہ بڑھا ہوا ہے، غالب نے اسی خیال کو اردو میں ظاہر کیا تھا ؎

عشق سے زیست کا مزہ پایا — درد کی دوا پائی، درد لادوا پایا

فرق صرف یہی ہے کہ خاقانی اور عرفی لذت درد کو "مژدۂ خرم" اور "آسودہ دلی" کے بدل بیچنا نہیں چاہتے یہ کیوں؟ اس لئے کہ ظاہری خوشی سے کیفیت غم کی لذت آفرینی بڑھی ہوئی ہے، غالب نے "درد کے لا دوا ہونے پر مزۂ زیست" کا راز پیش کیا ہے،

ہرگز نہ کشایم در دوکان غم دل — چون نائے شدم، نیست شدن مایۂ ہست

وآنگہ کہ دوکان بارکشایم کم نہ فروشم — این نیست بہ ہستی ابد کم، نہ شود،

عرفی کے خیال میں، بہ ظاہر کوئی پرواز نہیں، البتہ خاقانی بہت بڑھ گیا ہے، لیکن وہی قصیدہ کی سی حالت ہے، کہ ایک مضمون مسلسل چلا آتا ہے، حالانکہ غزلیات میں ہر شعر کو ایسا ہونا چاہئے کہ سیاق و سباق کی منت کشی سے مستغنی ہو خاقانی اس غزل میں اوپر سے نائے کی کم سخنی اور گم شدہ زبان ہونیکا تذکرہ کرتے آئے ہیں اور اپنی نیستی کو ہستی ابد سے کم قیمت پر فروخت کرنا نہیں چاہتے، اسکے اوپر ایک نہایت بلند مضمون باندھا ہے،

آری من از نائے زباں گم شدہ اسرار — الا از رہ چشم بہ محرم نہ فروشم

اپنی زبان کا بانسری سے موازنہ کیا ہے قاعدہ ہے کہ بانسری کو منہ کی طرف سے پھونکا جاتا ہے، اور سامنے چند سوراخ ہوتے ہیں اور انہیں سے آواز نکلتی ہے، خاقانی نے اس سوراخ کو چشم سے تعبیر کیا ہے، اور فرماتے ہیں جس طرح بانسری زبان سے نہیں بولتی اسی طرح میری زبان بھی گم شدۂ اسرار ہے، لیکن جس طرح بانسری اپنے ذوق تکلم اور لطف ترنم کو چشم کی راہ سے پیش کرتی ہے، ویسا مجھ سے ممکن نہیں، اسی نے نوازی کی کرشمہ آرائیوں سے اپنے ایک قصیدہ کی ابتدا کرتے ہیں ؎

تخت از من زباں بستہ کہ طفل ابجد آموزی — چوں نایش کم زباں باید نہ چوں گئی بھرزہ باندانش

عرفی — خاقانی

زان اہل نفاقم نہ پسندند کہ ہرگز — این یک شبہ خلوت کہ بہر ہفتہ مرا ہست

قول خلط و فعل مسلم نہ فروشم — حقا کہ بہ شش روز مسلم نہ فروشم

عرفی نے ان ارباب نفاق کا تذکرہ کیا ہے، جو اس کے کلام کو پسند نہیں کرتے، اور اس ناپسندیدگی کی وجہ یہ بتاتے ہیں، کہ میرا قول خلط سے پاک ہے، خاقانی اپنے ایک دن کی خلوت شبانہ کو چھ روز کی انبساط افزائیوں کے بدل بیچنا نہیں چاہتے،

عرفی دل آباد بہ ہیچو نہ خرد عشق — گفتی نہ کنی خدمت سلطاں نہ کنم نے

من ہم دل ویراں بدو عالم نفروشم — یک لحظہ فراغت بدو عالم نہ فروشم

عرفی کا خیال نہایت بلند ہے، فرماتے ہیں، عشق، دل آباد کو، کوڑیوں کے مول نہیں لیتا، یا یہ کہ دل آباد اور درد عشق دو مخالف چیزیں ہیں، جو ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتیں، بس میں بھی اپنی ویرانی دل پر ایسا سرشار ہوں، کہ مجھے بھی دو عالم سے استغنا ہے، خاقانی نے اپنے واقعۂ زندگی کی طرف اشارہ کیا ہے، آخر میں انھوں نے خاقان کبیر منوچہر شرداں شاہ کی خدمت ترک کردی تھی، یہ اسی زمانہ کا کلام ہے چنانچہ صاحب صحف ابراہیم لکھتے ہیں،

شوق فقر و فاقہ بر خاقانی استیلا یافتہ.... . . . . . . بعد ازاں حکیم از ملازمت اہل دنیا گرفت ومکرر بہ زیارت کعبۂ شریف و اماکن متبرکہ سعادت حاصل کرد،

عرفی و فیضی صاحب منتخب التواریخ نے عرفی اور فیضی کے کلام پر جو رائے لکھی ہے، وہ گزشتہ سطور میں لکھی جاچکی ہے، براؤن نے بھی ایک ترکی ادیب کے چند اشعار موازنہ میں لکھے ہیں، جن سے عرفی اور فیضی کے کلام پر ایک جامع روشنی پڑتی ہے،

فیضی ایلہ عرفی ہمعنا ندر ــــ سر حلۂ آخر الزماندر

فیضیدہ بلاغت طراوت ــــ عرفی دہ عذوبت و حلاوت

فیضیدہ مواعظ آتشیندر ــــ عرفیدہ قصیدہ ار متیندر

اما آر انورسہ ادلویت ــــ فیضیدہ قالور بنہ تفضیلت

(ترجمہ) "فیضی اور عرفی دونوں، دوش بدوش گامزنی کرتے ہیں، اور یہ آخری زمانہ کے رہنما ہیں، فیضی کے کلام میں فصاحت اور تازگی ہے، عرفی کے کلام میں شیرینی اور روانی ہے، فیضی کے سخن میں گرمی ہے، عرفی کا کلام حسن لطافت سے آراستہ ہے لیکن فضیلت فیضی کو ہے"

مضمون ارادہ سے زیادہ طویل ہوگیا ہے، ورنہ عرفی اور فیضی کا ایک بسیط موازنہ کرتا، براؤن نے "لٹریری ہسٹری آف پرشیا" میں چونکہ جابجا عرفی کی ذات اور کلام دونوں پر ناقدانہ روشنی ڈالی ہے، اس لئے انھوں نے کوشش کرکے ایسے ایسے اقوال جمع کردئے ہیں جو عرفی کے یا تو سرے سے مخالف ہیں، یا اس کی وقعت کو کم کرکے دوسروں کو اس کے مقابلہ میں افضل ٹھہراتے ہیں صاحب مجمع الفصحا کا قول براؤن کے حوالہ سے شروع میں لکھا جاچکا ہے، ترکی ادیب نے جو کچھ لکھا ہے مجھے ایک حد تک اس سے موافقت ہے، لیکن میں فضیلت فیضی کو نہیں تسلیم کرتا۔

مثنوی موازنہ میں غزلیات عرفی کی ایک بڑی فہرست دیجا چکی، اب مثنوی، رباعیات اور قصاید پر رائے زنی کی ضرورت ہے، حکیم حاذق نے تو ایک سرے سے لکھدیا ہے ؎

مثنویش طرز فصاحت نداشت ــــ کان نمک بود ملاحت نداشت

لیکن یہ واقعہ نہیں، عرفی جس میدان میں ترا، اپنی قادر الکلامی کا سکہ بٹھادیا، اس کے دیوان میں بطرز مثنوی، حضرت بایزید بسطامی کے متعلق ایک حکایت ہے، جس سے اس کے زور بیان، اور کمال مرقع آرائی کا پتہ چلتا ہے، پروفیسر و ہنفیلڈ نے

اپنے انگریزی ترجمہ "ملخص مثنوی مولانا روم" میں بھی یہ حکایت لکھی ہے، جس سے واضح ہوتا ہے، کہ یہ حکایت مثنوی مولانا روم میں بھی پائی جاتی ہے، ڈاکٹر نکلسن نے صوفیائے اسلام میں "اولیاء اللہ اور معجزات" کے باب میں لکھا ہے کہ وحدت وجود میں اولیاء اللہ کی ہستی مٹ جاتی ہے، وہ اپنے میں نہیں رہتے اور وہ لوگ جو ان کے عالم شہود میں مداخلت کرتے ہیں وہ گویا قدرت الٰہیہ سے برسر معرکہ ہوتے ہیں کیونکہ اس عالم میں اولیاء اللہ کی زبان، اور ہاتھ انکا اپنا نہیں ہوتا، بلکہ ان میں ید قدرت کی کارفرمائیاں ہوتی ہیں، اس کے بعد مثال میں دہنفیلڈ کا ترجمہ مثنوی نقل کیا ہے، جو گویا عرفی کی حکایت کا خلاصہ ہے،

انجمن آرائے درون بایزید ۔۔۔ محفلے آراست بہ جمعے مرید
محفل آرائش صحن فلک ۔۔۔ فرش حریمش ز جناح ملک
نور فشانند تر از جام جسم ۔۔۔ گرد شبتانے و شمعے بہم
دود چراغش چہ کند در دماغ ۔۔۔ انجمن کش آن بود شبچراغ

مجلس بایزید کا یہ مرقع تھا، توصیف محفل کے بعد اب حضرت بایزید کے ذوق سماع، اور اسرار کلام کی تفصیل لکھتے ہیں ؎

چہرہ برافروختہ از شرم عشق ۔۔۔ مست سماع از نفس گرم عشق
کردہ بہ مستی زلبش ہرزہ جوش ۔۔۔ ہرزہ نگویم کہ نیم ز اہل ہوش
راز درون پردہ کشائی گرفت ۔۔۔ نور نفس اوج گرائی گرفت

حضرت بایزید کیف و مستی میں یہ فرماتے ہیں ؎

جلوہ گر از جامۂ ہستی نہم ۔۔۔ معنی ہشیاری و مستی نہم
وز حرم و دیر منم جلوہ گر ۔۔۔ کافر و دیندار مرا سجدہ بر
رشتۂ ہر دام ز من پیچ پیچ ۔۔۔ ہرچہ بجز ہستی من ہیچ ہیچ

اس کے بعد ہوش میں آئے اور مریدوں کو تلقین کرتے ہیں، کہ پھر میں ایسے کلمات کفر کہوں تو مجھے سزا دینا ؎

چون دلش از نشاۂ توحید رست ۔۔۔ رشتۂ آمیزش وحدت گسست
جملگی آن میوہ کہ افشاندہ بود ۔۔۔ باز بیفشاند بر آں باغ جود
از اثر لذت آن لب مکید ۔۔۔ نے غلطم، لب ز ندامت گزید
گفت کہ ایں دعوئ قدوسی است ۔۔۔ وز لب ما نغمۂ ناقوسی است
گر دگر این نغمہ سراید لبم ۔۔۔ گر بہ چنین ہرزہ بر آید لبم
تیغ بر آرید و ہلاکم کنید ۔۔۔ گنج نہاں خانۂ خاکم کنید

اس واقعہ کے بعد دوسری مرتبہ پھر، حضرت بایزید عالم شہود میں وہی کلمات بولنے لگے، مریدوں نے تعمیل ارشاد کی، لیکن نتیجہ

یہ ہوا، کہ جس نے شیخ پر تلوار ماری، وہ خود ہی خون میں نہا گیا اور رہرو عدم ہوا ؎

چوں مئی توحید دگر نوش کرد ۔۔۔ میز دو اندازہ فراموش کرد
ہر ذرهٔ دوشینه در آمد به جوش ۔۔۔ نیک بران ہر ذرہ فدا عقل و ہوش
مستعان تیغ برافراشتند ۔۔۔ تخم عدم خیزی خود کاشتند
ہر کہ بہ عضویش سبک تیغ راند ۔۔۔ تا فتہ زد، تیغ بخونش فشاند
گریہ کنان زخم بہ ہر بسملے ۔۔۔ فرصت لیلے زدہ ہر محلے

اس کے بعد حضرت کے ہوش میں آنے کا واقعہ ہے، اور اس خونریزی کا مشاہدہ کرکے تعجب سے تفتیش فرماتے ہیں ؎

گفت چہ باد از رہ این روضہ خاست ۔۔۔ کز ورق گل چمن کربلاست
صورت آن حال برنگے کہ بود ۔۔۔ خواند بر آن بلبل معنی سرود

اب نتیجہ نکالتے ہیں ؎

گفت چو با شعلہ ستیزہ مگس ۔۔۔ سوختن وے بنود جرم کس
ہر کہ بہ معشوق کشد تیغ کیں ۔۔۔ مرگ بروں تاز وش میم ویں

عرفی خود فرماتے ہیں، ؎

عرفی از آن زمزمہ لب راسوز ۔۔۔ بان تبرا دو، نفس لب بدوز
راز فرو خور کہ دلت ریش باد ۔۔۔ حوصلہ معرفت بیش باد

رباعیات

عرفی نے رباعیات میں بھی خاص ادائے دلفریب پیدا کی، جو کسی طرح باباطاہر عریاں، اور خیام کی جودت طبع اور فراغ خاطر سے کم درجہ نہیں،

خیام کی لذت طرب، شرب دوام، اور ذوق مستی مشہور ہیں لیکن عرفی بھی کسی طرح اسمیں پیچھے نہیں رہا ملاحظہ ہو ؎

عرفی شب عید و بادہ عیش افزاست ۔۔۔ می نوش و طرب کن کہ ہمیں دم روز است
این توبہ پسے شکست وانہ ما برمید ۔۔۔ منوش کہ تو بہ مرغ دست آموز است

روزے کہ قضا بہ مزرعہ قسمت کشت ۔۔۔ خاکم ز حرم ببرد رر دیر سرشت
میخواست کہ در جواب ابنائے کنشت ۔۔۔ گویم لبیک چوں بگوید کو خشت
عرفی سر صفہ مغاں مسند ماست ۔۔۔ تعظیم گہ دیر مغان معبد ماست
ہر گام بہ تیغے سر تسلیم نہم ۔۔۔ سرتا سر کوئے دوست مشہد ماست

ذیل کی رباعیات میں عرفی نے عرفان الٰہی، حیات جاوید اور عشق و محبت کا راز پیش کیا ہے ؂

باسال و مہ و دقیقہ و ساعت نیست ۔ با روز و شبم روشنی و ظلمت نیست
با صحت و رنجم آفت و راحت نیست ۔ عرفی عالم، چوں عالم وحدت نیست

اے آنکہ برت سفال و یاقوت یکیست ۔ اعجاز مسیح و سحر ہاروت یکے ست
گر معرفت روح مجرد داری ۔ زیب تن و آرائش تابوت یکے ست

عشق آمدہ گوید کہ رسولم نامست ۔ وز حسن بہ آسمان صد پیغام است
گوید کہ دل و دین فرو شید بدرد ۔ دین سہل ترین حیلہ احکام است

قصاید قصاید عرفی کی شہرت اور مقبولیت کی ایک واضح مثال یہ ہے، کہ ہندوستان میں صرف عرفی ہی کے قصاید دیوان سے جدا طبع ہوتے ہیں، خاقانی اور انوری کو بھی یہ خصوصیت نہیں، میرا یہ دعویٰ نہیں کہ عرفی قصیدہ گوئی میں اُنسے بڑھا ہوا ہے، بلکہ مقبولیت عامہ کا اظہار مقصود ہے، مضمون بہت بڑھ گیا ہے، اس لئے قصاید کے اقتباسات نہیں دئے جاسکے،

کلیات خاقانی کی پہلی جلد کا ایک قلمی نسخہ میرے پاس ہے، جسمیں خاقانی کے تمام قصاید موجود ہیں۔ انشاء اللہ نگار کی آئندہ کسی اشاعت میں خاقانی کی زندگی اور اس کے کلام پر ایک مطول تبصرہ ہوگا اور ضمناً اسی میں عرفی کے قصاید کا اقتباس دیکر، خاقانی، انوری، اور عرفی کے خصوصیات قصیدہ گوئی پر ایک ناقدانہ روشنی ڈالی جائیگی،

عبد المالک آروی

جمال الدین افغانی کا ایک خطبہ

میں نہایت خوش ہوں کہ اس موقعہ پر اس قدر ہندی نژاد نوجوان جمع ہیں جو فضل و کمال سے آراستہ اور تحصیل علم کے لئے کوشاں ہیں! مجھے اس امر پر بھی خوش ہونا چاہئے کہ یہ نونہال اس ہندوستان کے فرزند ہیں جو مہد انسانیت اور گہوارۂ آدمیت ہے یہ وہی ہندوستان ہے جہاں سے انسانیت نکل کر سارے عالم میں منتشر ہوئی!

یہ نوجوان اسی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں جہاں پہلی مرتبہ دائرہ معدل النہار معین ہوا' اور پہلی دفعہ معدل النہار سے منطق البروج بنایا گیا، یہ دو دائرے اُس وقت تک نہیں بن سکتے جب تک کہ ہندسہ میں کمال نہ ہو، پس ظاہر ہوا کہ علم حساب اور ہندسہ ہندیوں کی ایجاد ہے' یہ نوجوان اس سرزمین کی اولاد ہیں جس نے تمام عالم کو قوانین اور ادب کا سبق پڑھایا اگر کوئی شخص غور سے رومن کوڈ (قوانین ملت روما) کا مطالعہ کرے جو تمام فرنگی قوانین کا سرچشمہ ہے تو اسے صاف معلوم ہوگا کہ وہ چاروں دید شاستروں سے ماخوذ ہیں! ادب و شعر میں یونانی ہندیوں کے خوشہ چین ہیں، چنانچہ فیثاغورث جس نے یونان میں علوم و معارف کی نشر و اشاعت کی وہ اہل ہند کا ادنیٰ شاگرد تھا' یہ خاک ہندوہی خاک ہے یہ ہوا وہی ہوا ہے' اور یہ نوجوان اسی خاک آب اور ہوا کا نتیجہ ہیں' اس لئے میں بہت خوش ہوں کہ یہ لوگ خواب دراز کے بعد چونکے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اپنی میراث پر قبضہ کرلیں اور اپنے لگائے ہوئے درخت کے میووں سے پھر اپنا دامن بھرلیں۔

اب میں چاہتا ہوں کہ علم و تعلیم کے متعلق کچھ عرض کروں لیکن مشکل یہ ہے کہ علم کی کوئی حد معین نہیں ہے، علم و حکمت کا سمندر بے پایاں ہے اور ہمارے افکار متناہی ہیں لہذا یہ غیر ممکن ہے کہ ایک متناہی شے غیر متناہی کا احاطہ کرے، دوسرے یہ کہ علم کے بیان میں ہزاروں فصحا بلغا اور حکما اپنی فصاحت، بلاغت اور حکمت کے جوہر دکھا چکے ہیں پھر مجھ ایسے تہی مایہ کیلئے اس موضوع پر لب کشائی کرنا دشوار ہے، باوجود اس کے طبیعت قبول نہیں کرتی کہ اس کی فضیلت کو بیان نہ کروں اگر کوئی غور کرے، تو معلوم ہو جائیگا کہ دنیا کا بادشاہ علم ہے، بغیر علم کے نہ بادشاہی پہلے تھی نہ اب ہے اور نہ کبھی رہیگی، کلدانی فاتح خصوصاً سیمرامس جس کا حدود تاتار سے ہند تک پھریرا اڑتا تھا، وہ کلدانی فاتح نہ تھا بلکہ دانش و علم تھے، وہ مصری جنہوں نے اپنے ملک کو بہت بڑی وسعت دی ان ہی میں سے ایک بادشاہ رامسیس ثانی مسوپوٹیمیا (بین النہرین) تک پہونچ گیا اور دوسری روایت کے بموجب ہندوستان تک اپنا پھریرا اڑا دیا سچ تو یہ ہے کہ یہ مصری نہ تھے بلکہ علم تھا، فنیقی باشندے جنھوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی کشتیوں سے جزائر برطانیہ، بلاد ہسپانیہ نگاہیں اور یونان کو اپنے مستعمرات میں داخل کرلیا حقیقتاً وہ فنیقی نہ تھے بلکہ علم تھا جس نے اپنے یہ قدرت کو اس قدر قوت بخش دی تھی، سکندر یونان سے ہندوستان میں نہیں آیا اور نہ ہندوستانیوں پر غلبہ کیا بلکہ وہ علم تھا جس نے یونان سے آکر ہندوستان پر قبضہ کرلیا

یہ فرنگی جنہوں نے اس زمانہ میں چاروں طرف دست درازی شروع کردی ہے انگریز جو افغانستان تک پہونچے ہوئے ہیں، فرنگ (فرانس) ٹیونس پر اپنا قبضہ جمائے ہوئے ہے۔ یہ تطاول یہ دست درازی اور ملک گیری نہ انگریز کر رہے ہیں نہ فرانسیسی بلکہ ہر طرف علم وشوکت وعظمت ظاہر ہے۔ اور جہل ہے کہ علم کے سامنے اظہار عجز اور اعتراف عبودیت کرتے ہوئے سرنگوں خاک مذلت پر پڑا ہوا ہے پس حقیقتاً بادشاہی خانۂ علم سے کبھی باہر نہیں گئی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ بادشاہ ہمیشہ اپنا پایۂ تخت بدلتا رہا ہے۔ کبھی یہ مشرق سے مغرب گیا اور کبھی مغرب سے مشرق آیا اگر اس سے گزر کر ہم دنیا کے غنا وثروت پر نظر کریں تو معلوم ہوگا کہ غنا وثروت تجارت، صناعت وزراعت کے نتائج ہیں۔ اور زراعت، علم فلاحت و نباتات، ہندسے کے بغیر ناممکن ہے صناعت کمسٹری اور فزنگ، جر انتقال، ہندسہ وحساب کے بغیر کوئی حقیقت نہیں رکھتی اور تجارت کا سارا دارومدار صناعت وزراعت پر ہے، پس معلوم ہوا کہ تمام ثروت وغنا علم کا نتیجہ ہے!! اور علم کے سوا کوئی غنا نہیں، بالجملہ تمام عالم انسانی، عالم صناعی ہے یعنی دنیا، دنیائے علم ہے اگر عالم انسانی سے علم نکال لیا جائے تو کوئی انسان باقی نہیں رہیگا، علم انسان کو ہزار دس ہزار انسانوں کی قوت بخشتا ہے، جتنا زیادہ علم ہوگا اتنا ہی زیادہ انسان اپنے آپ کو فائدہ پہونچا سکتا ہے حکومت کو اپنی رعایا سے بقدر علم نفع پہونچ سکتا ہے۔

ہر حکومت کا فرض ہے کہ اپنے نفع کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے علوم ومعارف کی تاسیس ونشر کی کوشش کرے، فرض کرو کسی شخص کا باغیچہ ہو تو وہ ازروئے قانون فلاحت، زمین کو ٹھیک بنائیگا درختوں اور نباتات کی اصلاح کی کوشش کرے گا؟ اسی طرح حکام کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنی منفعت کی خاطر علوم کو پھیلانے کی سعی کریں جس طرح باغیچہ کا مالک اپنی ملک کی طرف توجہ نہیں کریگا تو اس کی ذات کو نقصان پہونچے گا اسی طرح اگر بادشاہ اپنی رعایا کی تعلیم کی طرف سے غفلت کرے گا تو حکومت کو ضرور اس سے ضرر پہونچے گا، جو بادشاہ جاہلوں پر حکومت کرتا ہے، اس بادشاہ سے کیا فائدہ ہے؟ اور ایسی حکومت کا نام حکومت کس طرح رکھا جا سکتا ہے؟

تعلیم، تعلم اور مراتب علوم

جب شرف علم تھوڑا سا معلوم ہو چکا تو اب میں چاہتا ہوں کہ تعلیم، تعلم، اور مراتب علوم کے متعلق چند کلمے عرض کروں، یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ہر علم کے لئے خاص موضوع ہے اور اس موضوع کے مطابق عوارض و لوازم کے سوا اس علم میں کسی غیر متعلقہ چیز سے بحث نہیں کی جا سکتی مثلاً علم فزیک عالم خارجی کے خواص اجسام سے بحث کرتا ہے، اور ان دوسرے امور سے جو عالم انسانی میں لازم ہیں معترض نہیں ہوتا، علم کیمیا یعنی کمسٹری میں خواص اجسام کی تحلیل وترکیب کی حیثیت ونوعیت پر بحث ہوتی ہے، علم نباتات "بوٹانی" صرف نباتات کو اپنا موضوع بحث قرار دیتا ہے، بعینہ دوسرے تمام علوم کی یہی کیفیت ہے، ان علوم میں سے کوئی بھی اپنے موضوع سے خارج مباحث پر بحث نہیں کرتا۔ یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ اگر علم کو ایک شخص تصور کر لیا جائے تو یہ جتنے علوم ہیں وہ سب اُسکے اعضا قرار پائے اور جس طرح یہ ممکن نہیں کہ ایک عضو جسم کے دوسرے اعضا سے الگ ہو کر اپنا وجود قایم رکھ سکے بعینہ تمام

علوم میں سے اگر کوئی علم بالکل الگ کر دیا جائے تو وہ باقی نہیں رہ سکتا، چونکہ ان میں سے ہر ایک حساب و ہندسہ کی طرح ایک دوسرے سے مربوط ہے، اس لئے ایک علم بغیر دوسرے علوم کی استمداد کے نہیں سمجھا جا سکتا ہے یہی سبب ہے کہ اگر ایک علم کو دوسرے علوم سے بالکل علیحدہ کر دیا جائے تو اس میں بالکل ترقی نہیں ہو سکتی اور نہ وہ پائیدار ہو سکتا ہے! پس ایک ایسا علم ہونا چاہیئے جسے تمام علوم کی روح کہا جا سکے ؛ وہ علم جسے تمام علوم کی جان کہا جا سکتا ہے فلسفہ یعنی حکمت ہے کیونکہ اس کا موضوع عام ہے، فلسفہ انسانی لوازم سے انسان کو خبردار کرتا اور دوسرے علوم کی حاجتوں سے آگاہ کرتا ہے، اگر کسی قوم میں فلسفہ نہ ہو اور اس قوم کا ہر فرد ان تمام علوم سے آگاہ نہ ہو جن کے موضوع خاص ہوں تو یہ ممکن نہیں کہ صرف ایک صدی ہی تک ان میں وہ علوم باقی رہ جائیں اور ناممکن ہے کہ وہ اُمت روحِ فلسفہ کے بغیر ان علوم سے نتائج نکال سکے، دولتِ عثمانی اور خدیو مصر کی حکومت نے ساٹھ برس سے علوم جدیدہ کی تعلیم کے لئے مدارس کھول رکھے ہیں، لیکن ابھی تک انہیں ان علوم سے کوئی فائدہ نہیں ہو چکا ہے اس کا سبب یہ ہے کہ ان مدارس میں فلسفہ نہیں ہوتا ہے دوسرے علوم جو اعضا کی مانند ہیں بغیر روحِ فلسفہ کے وہ کسی قسم کا پھل دینے کی اہلیت نہیں رکھتے اگر ان مدارس میں فلسفہ بھی ہوتا تو اس ساٹھ برس کے طویل زمانہ میں یہ لوگ بلاد فرنگ سے مستغنی ہو جاتے اور علم سے اپنے ممالک میں اصلاح کی کوشش کرتے ہر سال اپنی اولاد کو ممالک فرنگ میں بھیجنے کی حاجت نہ رہتی اور اپنے مدرسوں کے لئے فرنگی استاد کی ضرورت نہ پڑتی، میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اگر ایک امت میں روحِ فلسفہ موجود ہے اور ان میں وہ علوم جن کا موضوع خاص ہے موجود نہیں ہیں تو صرف وہی روحِ فلسفی ان تمام علوم کو حاصل کرنے کے لئے آمادہ کرے گی۔

صدر اول کے مسلمان صدر اول کے مسلمانوں میں کوئی علم نہ تھا لیکن ذہانت اسلامی کی وجہ سے ان میں ایک روحِ فلسفہ پیدا ہو گئی تھی، صرف اس روحِ فلسفہ کے واسطے سے انھوں نے تمام امورِ عالم اور لوازمِ انسانی سے بحث کرنی شروع کر دی یہی سبب تھا کہ اُنھوں نے منصور (عباسی خلیفہ) کے زمانے میں ایسے تمام علوم کو جن کا موضوع بحث خاص تھا، سریانی، یونانی اور پارسی سے عربی میں ترجمہ کر کے تھوڑے دنوں میں سیکھ لیا؟ فلسفہ ہی وہ علم ہے جو بتلاتا ہے کہ انسان کو انسان سے کیا سلوک کرنا چاہیئے؟ شرفِ انسانیت کیا ہے؟ طریق ہائے لائقہ کون کون سے ہیں؟ ہر وہ اُمت جو قعرِ پستی میں گر پڑی، اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ سب سے پہلے انکی روحِ فلسفی میں نقص پیدا ہوا، اس کے بعد وہی نقص انکی تمام معاشرت اور ادب و علوم میں سرایت کر گیا!

جب مراتبِ علوم اور شرفِ فلسفہ اس قدر معلوم ہو چکا تو اب میں چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کی تعلیم و تعلّم کے بارے میں کچھ عرض کروں! اس عہد میں مسلمانوں کو اپنی تعلیم سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا مثلاً وہ علم نحو کی تحصیل کرتے ہیں، علم نحو کا مقصد یہ ہے کہ کوئی شخص لغت عربی پر حاوی ہو جائے اور اس سے اُسے لکھنا پڑھنا اور بولنا آ جائے لیکن اس زمانہ میں مسلمانوں کی یہ کیفیت ہے کہ وہ سالہا سال اسی مقصد پر بے فائدہ صرف کر دیتے ہیں اور اتنی مدت صائع کرنے کے بعد بھی وہ عربی لکھنے پڑھنے اور بولنے پر قادر نہیں ہوتے علم معانی و بیان جسے ادبیات کہتے ہیں وہ علم ہے کہ اس سے انسان منشی، خطیب اور شاعر بنتا ہے، لیکن اس عہد میں یہ دیکھا

جاتاہے کہ اس کے حاصل کرنے کے بعد لوگ معمولی صحیح گفتگو کرنے کے بھی لایق نہیں ہوتے، علم منطق وہ علم ہے جسے ہر شخص کو حاصل کرنا چاہئے، اس سے حق و باطل میں تمیز اور کھوٹے کھرے کا فرق معلوم ہوتا ہے لیکن افسوس کہ مسلمانوں کے منطقیوں کے دماغ خرافات و واہیات خیالات کا گنجینہ بنے ہوئے ہیں اُن کے خیالات اور بازاریوں کے افکار میں کوئی فرق نہیں ہوتا

علم حکمت وہ علم ہے کہ موجودات خارجیہ کے احوال سے بحث کرتا اور اُن کے عدل و اسباب لوازم و ملزومات سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر مزہ یہ ہے کہ ہمارے علماء شمس البازغہ سے اس علم کی ابتدائی باتیں پڑھ کر اپنے آپ کو حکیم سمجھ لیتے ہیں، اور باوجود حکیم ہونے کے خود اپنی شناخت بھی نہیں کر سکتے۔ اس پر کبھی غور نہیں کرتے کہ ہم کون ہیں کیا ہیں؟ ہمیں کیا کرنا چاہئے، ہمارا کیا فرض ہے، عجیب مزہ یہ ہے کہ اپنے سامنے لمپ رکھ کر رات بھر شمس البازغہ رٹتے رہتے ہیں، لیکن اس نکتہ پر غور نہیں کرتے کہ اگر لمپ کے شیشے کو نکال لیں تو اس سے دھواں کیوں نکلنے لگتا ہے۔ اور اگر پھر لگا دیں تو دھواں کیوں نہیں نکلتا؟ ایسے حکیم پر تین حرف اور ایسی حکمت پر لعنت!!!

حکیم وہ ہے کہ تمام حوادث و اجزائے عالم اس کے ذہن کو حرکت دیں نہ کہ وہ جو اندھوں کی طرح ایک ڈگر پکڑ لیتا ہے، اور یہ نہیں جانتا کہ اس کی انتہا کہاں اور منزل مقصود کدھر ہے۔ مسلمانوں کا علم فقہ تمام حقوق منزلیہ بدلیہ اور دولیہ پر حاوی ہے، پس ایسا شخص جو اس علم کا عالم ہو وہ اس لایق ہے کہ ملک کا صدر اعظم یا حکومت کا سفیر ہو مگر جب مسلمانوں کے فقہاء پر نظر پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے گھر کے انتظام سے ہی عاری ہیں لیکن اپنی بیوقوفی کو سرمایۂ افتخار سمجھتے ہیں! علم اصول کے معنے فلسفۂ شریعت ہیں جو شخص اس علم پر قادر ہو اُسے واضع قوانین اور مدنیت کا علمبردار ہونا چاہئے، مگر مسلمانوں میں اس علم کے جو پڑھنے والے ہیں وہ فوائد قوانین، قواعد مدنیت اور اصلاح عالم سے بے خبر ہیں، اس زمانہ میں ہمارے علماء کی یہ کیفیت ہے گویا وہ ایک بہت باریک فتیلہ ہیں کہ سر پر شعلہ تو ہے، لیکن وہ اس قدر چھوٹا ہے کہ نہ اپنے ارد گرد روشنی پہونچا سکتا ہے اور نہ دوسرے اس سے اُجالا پا سکتے ہیں۔

عالم، اگر حقیقی عالم ہے تو وہ ایک نور ہے — اگر عالم صحیح معنوں میں عالم ہے تو اُسے چاہئے کہ ایک عالم پر روشنی ڈالے اگر اتنا نہ ہو سکے تو کم از کم اپنے شہر، گاؤں، یا کچھ نہیں تو اپنے گھر ہی کو اس روشنی سے منور کر دے۔ مگر اس شخص پر عالم کا کیسے اطلاق ہو سکتا ہے جو اپنے گھر تک کو علم کی روشنی سے منور نہیں کر سکتا؟ اس پر طرہ یہ ہے کہ ہمارے علماء نے اس زمانے میں علم کو دو اقسام پر منقسم کر دیا ہے، ایک کو مسلمانوں کا علم کہتے ہیں اور دوسرے کو علم فرنگ کہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ بعض نہایت کار آمد اور مفید علوم کی تحصیل سے منع کرتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ علم کو کسی خاص طائفہ سے نسبت نہیں ہو سکتی جو چیز پہچانی جاتی ہے وہ علم ہی کے صدقے سے پہچانی جاتی ہے جو طایفہ ترقی کرتا ہے وہ علم ہی کی بدولت ترقی کرتا ہے علم سے انسانوں کو نسبت ہونی چاہئے نہ یہ کہ علم کو انسان سے نسبت دیجائے؟

کتنے تعجب کی بات ہے کہ وہ علوم جو ارسطو سے منسوب نہیں انہیں تو مسلمان نہایت رغبت سے پڑھتے ہیں گویا ارسطو بھی

کوئی مسلمان تھا، لیکن اگر گلیلیو، نیوٹن اور کپلر سے نسبت دی جائے تو کفر کے فتوے لگنے لگیں گے، حقیقت یہ ہے کہ جس جگہ براہین اور دلائل موجود ہوں وہیں حق بھی موجود رہتا ہے وہ لوگ جو ان علوم و معارف سے منع کرتے ہیں، جہالت کی وجہ سے بزعم خویش یہ سمجھتے ہیں کہ ہم مذہب اسلام کی بہت بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں، حالانکہ علوم و معارف اور مذہب اسلام کی بنیادوں میں کوئی بھی نہیں ہے، حجۃ الاسلام امام غزالی اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "منقذ من الضلال" میں کہتے ہیں کہ وہ شخص جو یہ کہتا ہے، کہ ادلہ ہندسیہ براہین فلسفیہ اور قواعد طبیعیہ اسلام کے خلاف ہیں، وہ شخص اسلام کا جاہل دوست ہے، اور ایسے دوست سے زندیق اور دشمنان اسلام اچھے ہیں، چونکہ ادلہ ہندسیہ، براہین فلسفیہ اور قواعد طبیعیہ بدیہیات میں سے ہیں اگر کوئی انسان یہ کہدے کہ دنیا منافی بدیہیات ہے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ وہ خود اپنے دین کا لطلان کرتا ہے، انسان کی پہلی تربیت دینی تربیت ہوتی ہے لہذا اس وقت تک مسلمانوں کی اصلاح نہیں ہوسکتی جب تک ہمارے مذہبی پیشوا خود اپنی اصلاح نہ کرلیں، حقیقت پر جب نظر جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم میں جو تباہی پیدا ہوئی ہے پہلے یہ تباہی ہمارے علماء و روساء دین میں پیدا ہوئی، اور اس کے بعد تمام امت میں سرایت کرگئی۔"

(مترجم) مظفر حسین شمیم کلکتہ

اس رسالہ کے ساتھ

آپ کو ایک مطبوعہ کارڈ ملیگا براہ کرم اس کو غور سے پڑھکر، اس رعایتی اعلان کو پڑھئے جو کسی دوسری جگہ شایع ہوا ہے اور اس کارڈ کی خانہ پری کرکے ۲۰- دسمبر تک ڈاک میں ڈالدیجئے۔

سال میں صرف ایکبار اس طرح آپ سے توسیع اشاعت کی درخواست کیجاتی ہی اسلئے امید ہے کہ آپ عدم توجہ سے کام نہ لیں گے۔

"مینیجر نگار"

سوشیلا

ٹھاکر رامپال سنگھ پہلے ایک غریب کسان تھے اسی حالت میں انھوں نے اپنے اکلوتے لڑکے چھترپال سنگھ کو جس طرح بھی ہوسکا اردو مڈل پاس کرایا۔ اس زمانہ میں مڈل پاس کی قدر آجکل کے ایم۔اے پاس سے زیادہ کی جاتی تھی شروع میں چھترپال سنگھ کچہری میں نقل نویس ہوے اور پھر ترقی کرتے کرتے ڈپٹی مجسٹریٹ بن گئے۔ ٹھاکر رامپال سنگھ کے دن پھرے لچھمی دیوی نے ان کو مالا مال کردیا۔ "تروا" کے علاوہ جگدیش پور۔ کھوٹلا۔ سید سراوان۔ مہنگاؤں وغیرہ کئی گاؤں میں ان کی زمینداری ہوگئی۔ پہلے جب کبھی رامپال سنگھ کے یہاں سال بھر میں دو چار من اناج پیدا ہوجاتا تھا تو پھولے نہ سماتے تھے لیکن اب ہزاروں من اناج بکھاریوں میں ہر وقت موجود رہتا تھا پھر بھی ان کی ہوس پوری نہ ہوتی تھی رات دن اسی سوچ بچار میں پڑے رہتے کہ زمینداری بڑھے تمام دنیا کی دولت ان کے گھر میں آجائے۔ وہ ایک پھٹی پرانی گدی پر ڈیوڑھی میں بیٹھے سوچا کرتے کہ فلاں شخص پر اتنا سود ہوگیا ہے اور اب اگلے مہینہ اتنا ہوجائے گا۔ فلاں کو کھیتی میں نقصان ہورہا ہے اس کو ضرور روپیوں کی ضرورت ہوگی پانچ روپے سیکڑے سے کم سود نہ لونگا۔ میکی بڑھیا جلدی مرے تو اسکی جائداد میں خریدلوں" اسی مایا جال میں ان کی ساری زندگی تباہ ہوگئی اور ایک دن باحسرت وارمان پرلوک سدھارے۔ ان کے مرنے کے تھوڑے عرصہ کے بعد ڈپٹی چھترپال سنگھ نے پنشن لے لی۔

(۲)

جب ڈپٹی چھترپال سنگھ پنشن لیکر اٹاوہ سے اپنے گاؤں "ترو" میں پہونچے تو ایک دھوم مچ گئی۔ ٹھاکر رامپال سنگھ کے زمانہ میں تو ایک بوڑھی گائے دروازہ پر بندھی رہتی تھی لیکن اب اس کے بجائے عمدہ بھینسیں گائے آگئیں اچھی نسل کا گھوڑا بندھ گیا مکان کی مرمت ہونے لگی۔ دروازہ پر ہر وقت جمگھٹا رہنے لگا۔ ڈپٹی صاحب نئے خیال کے ہوتے ہوے بھی بڑے ملنسار اور نیک تھے غرور تو ان میں نام کو نہ تھا کوئی چھوٹا ہو یا بڑا سب سے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ باتیں کرتے گاؤں والے ایسے ہی لوگوں کو پسند کرتے ہیں دولت سے زیادہ وہ عزت پر جان دیتے ہیں۔ ڈپٹی صاحب کے نیک برتاؤ اور بیوہار نے سب کو اپنا بندہ بے دام بنالیا۔ اگر ڈپٹی صاحب سے کوئی ناخوش تھا تو وہ حلقہ کا کانسٹبل اور گاؤں کا پٹواری۔ ان کی وجہ سے یہ لوگ غریب کسانوں پر دھونس نہ جما سکتے تھے۔

ڈپٹی صاحب کی اکلوتی لڑکی "سوشیلا" کو پڑھانے کیلئے ایک ماسٹر کی ضرورت تھی۔ اٹاوہ میں تو وہ گرلس اسکول میں تعلیم پاتی رہی لیکن جب وہ گاؤں میں آئی تو اسکی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ سوشیلا بڑی ہنس مکھ اور قبول صورت تھی۔ اگر اس کو حسن کی دیوی کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ ابھی وہ صرف بارہ سال کی تھی۔ لیکن اسی عمر میں اس نے اپنی علمیت۔ ذہانت اور قابلیت کا سکہ سب کے دلوں پر جمار کھا تھا۔ ایکدن صبح کے وقت جب ڈپٹی صاحب گھر سے باہر جانے لگے تو سوشیلا نے کہا "پتاجی! میرے پڑھنے کا بڑا نقصان ہورہا ہے کوئی ماسٹر جلدی تلاش کردیجئے۔

"اچھا بیٹی! اچھا – آج ہی لو" یہ کہتے ہوئے ڈپٹی صاحب باہر آئے یہاں پہلے ہی سے یاران طریقت جمع تھے" ڈپٹی صاحب نے کہا "بھائیو! مجھے اپنی لڑکی کے لئے ایک ایسے ماسٹر کی ضرورت ہے جو ہندی اردو اور کچھ انگریزی پڑھا سکے کیا تروا میں انتظام ہو سکتا ہے؟"

ٹھاکر ہرنام سنگھ بول اٹھے "یہ کون بڑی بات ہے – ایسا ماسٹر تو گھر ہی میں موجود ہے میرا لڑکا 'راجن' انٹرنس پاس ہے آج میں اس سے کہدوں گا وہ بڑی خوشی سے سوشیلا کو پڑھا دے گا"

میاں زبیری نے فرمایا – "واللہ 'راجن' سے بڑھکر لائق فائق ماسٹر تو مل ہی نہیں سکتا ٹھاکر صاحب اپنے اس لخت جگر پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے"

چودھری گھسیٹے رام جو ہتیلی پر کھانے کی تمبا کو انگوٹھے سے مل رہے تھے اور اب پھانکنے کو تیار ہی تھے "چنوٹی" کو بٹوے سے نکالتے ہوئے بولے "واہ! واہ! راجن کی کیا بات ہے – ابھن (ابھی) کچھ دن بھا (ہوا) تروا' ماں (میں) کلکٹر صاحب آئے رہیاں (تھے) راجن اُوسے (اس سے) تنکو (ذرا) نہ ڈرا اور انگریزی ماں (میں) اَس (اسطرح) فرفر بات کہس (کیا) کہ صاحب کا لٹو بنا (بنا) دِس (دیا) واہ! واہ! کیا بات ہے – اتنی جون مور (اسوقت میری) عمر تین پچیسی (پچھتر) کے لگ بھگ بھئی مُدا (لیکن) ہوری نجر سے اَس بھاگوان (ہونہار) لڑکا نہیں گجرا (گذرا) ہے"

پروہت جی گنگا جل دینے آئے تھے انھوں نے دیکھا کہ میں ہی پیچھے رہا جاتا ہوں جھٹ بول اٹھے "پرماتما راجن کو سدا بنائے راکھیں کلجگ میں ایسے دیو سروپ اور بھاگوان پتر بہت کم جنم لیت (لیتے) ہیں"

ٹھاکر ہرنام سنگھ اپنے لڑکے کی تعریف سُن سُن کر پھوٹ کی طرح سے کھلے جا رہے تھے – ڈپٹی صاحب نے اُن سے کہا "اگر راجن میری لڑکی کو پڑھانے کے لئے تیار ہو جائے تو آپ کی بڑی کرپا ہو گی میں اس کو دس روپئے ماہوار جیب خرچ دوں گا"

ٹھاکر صاحب نے انکسار سے کام لیتے ہوئے کہا – "نہیں نہیں روپیوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے لڑکا خراب ہو جائے گا ہمیں تو آپ کی مہربانی چاہیئے"

ڈپٹی صاحب "اچھا تو آپ ذرا اُسے بلائیے تو سہی میں بھی اس سے بات چیت کر لوں – راجن جیسے آپ کا لڑکا ویسے ہی میرا اگر میں اُسے کچھ جیب خرچ دونگا تو آپ مجھے روک نہیں سکتے"

"اچھا تو میں راجن کو ابھی بلائے لاتا ہوں" یہ کہتے ہوئے ٹھاکر صاحب خوش خوش اپنے گھر کی طرف چلے –

(۳)

ٹھاکر ہرنام سنگھ 'تروا' میں معمولی کاشتکار تھے اِن کے یہاں ایک ہل کی کھیتی ہوتی تھی – ان کا اکلوتا لڑکا راجندر سنگھ جس کو پیار میں سب لوگ "راجن" کہتے تھے سولہ یا سترہ سال کا خوشجمال جوان تھا – انٹرنس تک اس نے تعلیم حاصل کی تھی ٹھاکر صاحب اور زیادہ نہ پڑھا سکے انھوں نے راجن سے صاف کہدیا کہ "میں کالج کا خرچ نہیں برداشت کر سکتا" آجکل وہ گھر ہی پر رہتا تھا نوکری سے اس کو ایک قسم کی نفرت تھی ٹھاکر صاحب جب اسے نوکری کے لئے مجبور کرتے تو وہ کچھ جواب نہ دیتا – راجن کا دل کاشتکاری میں بہت لگتا غریب کسانوں کی سیوا میں

اس کو روحانی مسرت حاصل ہوتی گانوں میں کسی کے پاؤں میں کانٹا بھی چبھتا تو اسکو سخت رنج ہوتا۔ انھیں خصوصیات نے اس کو تمام گاوں میں ہر دلعزیز بنا رکھا تھا۔ بڑے بوڑھے جہاں گپ شپ اڑاتے وہاں بھی اور جہاں چھوٹے بچے گلی ڈنڈا کھیلتے وہاں بھی راجن کے حسن اخلاق اور اسکی ہمدردی کا ذکر کرتے گاوں کی پنچایت میں سب لوگ اس کا فیصلہ بخوشی منظور کر لیتے۔ لیکن ٹھاکر صاحب "راجن" کی "بھگتی" سے زیادہ خوش نہ تھے وہ اس کو کسی اچھی ملازمت میں دیکھنا چاہتے تھے تاکہ وہ روپیہ کمائے اور جائداد خریدی جائے جب ڈپٹی صاحب پنشن لیکر گھر آئے تو ٹھاکر صاحب نے سوچا کہ اگر کوشش کی جائے تو وہ راجن کو اپنا مختار عام ضرور بنا لیں گے۔ اسی خیال سے ٹھاکر صاحب نے ڈپٹی صاحب کے یہاں اپنی آمد و رفت بڑھا دی اور بہت جلد ڈپٹی صاحب کے دل میں اپنی جگہ پیدا کر لی۔ آج ڈپٹی صاحب نے راجن کو طلب کیا تو ان کی خوشی کی کچھ انتہا نہ رہی گھر پہونچتے ہی راجن کی ماں سے پوچھا "اجی سنتی ہو راجن کہاں ہے اس کو ڈپٹی صاحب نے بلایا ہے"۔

ٹھکرائن آنگن میں گیہوں پھٹک رہی تھیں بولیں "کھلیان میں ہوگا۔ کون کام ہے؟"

ٹھاکر صاحب نے جھنجھلا کر کہا "راجن کی یہی باتیں تو اچھی نہیں معلوم ہوتیں ہزار دفعہ سمجھا چکا کہ وہ کھیت کھلیان نہ جایا کرے میں خود سب کام کر لوں گا نوکری نہیں تلاش کرتا کہ دلدّر دور ہو" یہی کہتے ہوے ٹھاکر صاحب گھر سے نکلے اور کھلیان کی طرف چلے

چیت کا مہینہ تھا۔ موسم بہار کی خوشگوار ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ کھلیانوں میں سونے کے ڈھیر لگے تھے کسانوں کی چاندی تھی گاؤں کی بہو بیٹیوں کے زیور بننے شروع ہوگئے تھے۔ ابھی ٹھاکر صاحب گھر سے دو چار قدم ہی آگے بڑھے ہونگے کہ انھوں نے راجن کو کھلیان سے واپس آتے دیکھا۔ اسوقت راجن موٹے سوت کی ایک دہوتی اور کھدر کی مرزئی پہنے ہوے تھا جب وہ ٹھاکر صاحب کے قریب آگیا تو انھوں نے کہا "جلدی گھر چل کر کپڑا بدل لے ڈپٹی صاحب نے تجھے بلایا ہے" یہی کہتے ہوے وہ راجن کے ساتھ گھر میں داخل ہوے اور ٹھکرائن سے بولے "بھلا دیکھو تو سہی راجن نے اپنی کیسی صورت بنا رکھی ہے کیا اس کو دیکھکر کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ انٹرنس پاس ہے اچھا جلدی اٹھکر اس کے کپڑے تو نکال دو"

راجن نے کہا "دادا میں اور کپڑے پہن کر کیا کروں گا"

ٹھاکر صاحب "تو ان باتوں کو کیا سمجھے ڈپٹی صاحب کے یہاں ان کپڑوں میں جانے سے بڑی ہیٹی ہوگی"

راجن خاموش ہوگیا اور ٹھاکر صاحب نے زبردستی دوسرے دھلے کپڑے منگوا کر راجن کو پہنائے

ٹھکرائن بولیں "تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ ڈپٹی صاحب نے کیوں بلایا ہے"

ٹھاکر صاحب نے سب حال کہہ سنایا اور کہا "اگر ڈپٹی صاحب راجن سے راضی ہوگئے تو وہ اسکو اپنا مختار عام ضرور بنا لیں گے

راجن نے کہا "دادا میں نوکری نہ کروں گا"

ٹھاکر صاحب "چپ بھی رہ۔ نوکری نہ کرے گا تو کیا گھاس کھودے گا۔ راجن کی ماں سنتی ہو۔ یہ کیسی بیوقوفی کی باتیں کر رہا ہے آجکل کہیں بغیر نوکری کے بھی کام چلتا ہے۔ رامپال سنگھ کے گھر میں بھونی بھانگ بھی نہ تھی حیثیت میں ہم دونوں برابر تھے۔ لیکن

چھتر پال سنگھ کے نوکر ہوتے ہی وہ مالدار ہوگئے۔ڈپٹی صاحب بڑے نیک آدمی ہیں وہ راجن کو اپنا مختار عام ضرور بنالیں گے۔

ٹھکرائن "رام کرے یہ جگہ میرے راجن کو مل جائے تو ہمارے بھی دن پھر جائیں"

جب راجن ٹھاکر صاحب کے ساتھ ڈپٹی صاحب کے یہاں پہونچا تو انھوں نے اسکو بڑے پیار کے ساتھ اپنے پاس بٹھایا اور سوشیلا کو بلا کر کہا بیٹی دیکھو یہ تیرے ماسٹر صاحب آئے ہیں ان کو پرنام کر"

سوشیلا نے اپنے نئے ماسٹر کو ایک غلط انداز نظر سے دیکھا اور بڑے ادب سے دونوں ہاتھ جوڑ کر راجن کو پرنام کیا

راجن چپ چاپ سر جھکائے بیٹھے ہی رہ گئے ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا

(۴)

سوشیلا کو پڑھاتے ہوے راجن کو کئی مہینے گزر گئے۔سوشیلا کی جھجک جاتی رہی وہ راجن سے بڑی بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرنے لگی لیکن اس کے برخلاف راجن کی متانت روز بروز بڑھنے لگی جب وہ سوشیلا کے پاس رہتا تو اسکو یہی محسوس ہوتا کہ وہ قید خانہ میں ہے مگر سوشیلا کو راجن کی موجودگی میں دلی مسرت حاصل ہوتی ایک دن سوشیلا نے سوچا کہ آخر ماسٹر صاحب مجھسے کیوں کھنچے رہتے ہیں اتنے دن ہوگئے لیکن انھوں نے سبق پڑھانے کے سوا کبھی مجھسے اتنا بھی نہ پوچھا کہ تمہیں آموختہ یاد ہے کہ نہیں سبق پڑھانے کے بعد تو وہ پھر ایک منٹ بھی میرے پاس نہیں رُکتے اچھا آج جب وہ آئیں گے تو میں خود کہوں گی ماسٹر صاحب میرا آموختہ سُن لیجئے اور پھر میں جان بوجھ کر غلط جواب دوں گی' دیکھوں وہ کیا کہتے ہیں۔

سوشیلا اپنے کمرہ میں تنہا بیٹھی ہوئی ہے اسی طرح کی باتیں اپنے دل سے کر رہی تھی کہ راجن کمرہ میں داخل ہوے ان کو دیکھکر سوشیلا نے کتاب کی ورق گردانی کرنی شروع کی۔جب راجن سوشیلا کو سبق پڑھا کر جانے لگے تو سوشیلا نے کہا" ماسٹر صاحب آج میرا آموختہ سُن لیجئے"

راجن نے کتاب ہاتھ میں لے لی۔سوشیلا کو آموختہ بالکل یاد نہ تھا۔راجن نے کہا"سوشیلا! تم کو آموختہ یاد نہیں ہے بڑے افسوس کی بات ہے اگر آئندہ پھر کبھی تم اپنا آموختہ یاد نہ کروگی تو میں ڈپٹی صاحب سے شکایت کر دوں گا"

راجن سوشیلا کو بہت ذہین سمجھتے تھے ان کو اطمینان تھا کہ وہ اپنا سبق دل لگا کر یاد کرتی ہے سوشیلا کو انھوں نے کبھی نہ ڈانٹا تھا لیکن راجن کی اس سادگی اور عنایت سے سوشیلا خوش نہ تھی اس کی دلی منشا تھی کہ راجن اس کو ڈانٹیں اس سے جواب طلب کریں آج راجن نے اس کو جو ذرا ملامت کی تو اس کا دل خوش ہوگیا یہی تو اس کا مقصد تھا اس نے دبی زبان سے کہا۔" ماسٹر صاحب آپ کا جو جی چاہے سزا دے لیں لیکن ہاتھ جوڑتی ہوں پتا جی سے کچھ نہ کہئے گا کیا کروں یاد تو بہت کرتی ہوں لیکن بھول جاتی ہوں آپ کوئی ایسی ترکیب بتادیں کہ میں آموختہ نہ بھولوں"

راجن نے سوشیلا کو حیرت کی نظر سے دیکھا اور بولے" اچھا اب میں تم کو تھوڑا سبق دیا کروں گا"

سوشیلا نے جلدی سے کہا" نہیں نہیں ماسٹر صاحب ایسا نہ کیجئے گا آپ جتنا سبق روز دیتے ہیں اتنا ہی دیجئے گا میں اب خوب

یاد کر لیا کروں گی"

اس کے کئی دن کے بعد راجن نے سوشیلا سے پھر آموختہ سنا اس مرتبہ بھی وہ امتحان میں فیل ہو گئی۔ اس مرتبہ راجن نے ناراض ہو کر کہا۔ سوشیلا آخر تم کو کیا ہو گیا ہے تم اپنا سبق کیوں یاد نہیں کرتیں کیا تم میری بدنامی کرانا چاہتی ہو اگر تمہارا یہی منشا ہے تو صاف صاف بتا دو میں ایسی حالت میں تم کو نہیں پڑھا سکتا کوئی دوسرا ماسٹر تم کو تلاش کرنا ہو گا"

سوشیلا کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے اس کے گلابی رخساروں پر بہنے لگے۔ راجن کا دل بیتاب ہو گیا انھوں نے کہا۔ سوشیلا! تم بڑی کم سمجھ ہو، روتی کیوں ہو میں نے تمھارے بھلے ہی کے لئے کہا ہے"

کچھ سوچ کر سوشیلا ہنس پڑی۔ پانی برسنے کے بعد سورج نکل آیا اس نے آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "ماسٹر صاحب! اس دفعہ معاف کر دیجئے آئندہ پھر کبھی اپنا آموختہ نہ بھولوں گی"

راجن ابھی سوشیلا کے پاس بیٹھے ہی تھے کہ ڈپٹی صاحب وہاں آ گئے اور راجن سے پوچھنے لگے "کہئے ماسٹر صاحب سوشیلا دل لگا کر پڑھتی ہے یا نہیں کچھ رو رعایت نہ کیجئے گا سچ سچ بتا دیجئے گا"

راجن بڑی مشکل میں پھنسے وہ سوچنے لگے "ابھی ابھی سوشیلا سے سبق سن چکا ہوں لیکن اس کو بالکل یاد نہ تھا کیا یہی بات ڈپٹی صاحب سے کہہ دوں لیکن ایسا کہنے سے تو سوشیلا کی بڑی دلشکنی ہو گی۔ تو کیا میں اس کی دلشکنی کے خیال سے جھوٹ بولوں یہ گناہ تو مجھ سے کبھی نہیں ہوا" ماسٹر صاحب اسی اودھیڑ بن میں پھنسے تھے کہ ڈپٹی صاحب نے سوشیلا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میری سوشیلا! بہت ذہین ہے وہ اپنا سبق ضرور یاد کر لیتی ہو گی۔ کیوں ماسٹر صاحب ٹھیک ہے نا؟"

راجن کی زبان سے بے اختیار نکل گیا "جی ہاں۔ آپ کا خیال درست ہے" اتنا کہتے ہی راجن کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا جب سے انھوں نے ہوش سنبھالا تھا یہ پہلا موقع تھا کہ وہ جھوٹ بولے وہ سوچنے لگے "اگر کہیں ڈپٹی صاحب اسوقت سوشیلا کا آموختہ سننے کیلئے تیار ہو گئے تو پھر کیا ہو گا میں نے تو سوچا تھا کہ سچی بات کہہ دوں گا پھر میری زبان کیوں میرے قابو سے باہر ہو گئی۔ تو کیا اب میں کہہ دوں کہ میں نے جو بات پہلے کہی تھی وہ جھوٹی ہے سوشیلا کو سبق یاد نہیں ہے اس میں میرا کوئی قصور نہیں میں تو بڑی محنت سے پڑھاتا ہوں" راجن یہ سوچ ہی رہے تھے کہ سوشیلا نے ڈپٹی صاحب کی طرف اپنی کتاب بڑھاتے ہوئے کہا۔ پتا جی! ذرا آج آپ بھی تو میرا آموختہ سنیئے دیکھئے میں اپنا سبق کتنا دل لگا کر یاد کرتی ہوں"

راجن کے ہوش و حواس گم ہو گئے کہ یہ کیا ہوا؟ سوشیلا کو آموختہ بالکل یاد نہیں ہے پھر وہ سنانے کیلئے کیوں تیار ہو گئی — آج بڑی بدنامی ہو گی سوشیلا نے تو مجھے کہیں کا نہ رکھا" راجن نے سوشیلا کی طرف دیکھا اسکی آنکھیں اشارہ کر رہی تھیں — "اب بتاؤ"

سوشیلا نے اپنا آموختہ بڑی خوبی کے ساتھ سنا دیا وہ ایک جگہ بھی نہ بھولی۔ ڈپٹی صاحب خوش ہو کر کہیں باہر ٹہلنے چلے گئے۔ راجن چنتا ساگر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ "اتنی جلدی سوشیلا کو اپنا آموختہ کیسے یاد ہو گیا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر مجھے غلط جواب دیتی ہے ایسا وہ کیوں کرتی ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا خیر کوئی بھی وجہ ہو آج تو اس نے میری لاج رکھ لی"

سوشیلا نے مسکرا کر کہا "کہئے ماسٹر صاحب اب تو آپ مجھ سے خوش ہوگئے اب تو کبھی ناراض نہ ہوں گے"

راجن نے جلدی جلدی جواب دیا "میں تو تم سے کبھی ناراض نہیں ہوا"

"تو آپ مجھسے بہت خوش ہیں"

"ہاں بہت خوش ہوں"

"سچ"

راجن نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اسوقت ان کی عجیب حالت ہورہی تھی وہ یکبارگی اپنی کرسی سے اُٹھے اور کمرہ سے نکل کر اپنے گھر پہونچے اور ڈپٹی صاحب کے پاس ایک خط لکھکر بھیجدیا کہ "کل سے میں سوشیلا کو نہ پڑھاسکوں گا" ڈپٹی صاحب نے ان کو بہت مجبور کیا لیکن وہ نہ مانے۔ جواب میں صرف اتنا ہی کہتے رہے "پڑھانے میں میری طبیعت نہیں لگتی" ٹھاکر صاحب کو سخت رنج تھا کہ اب راجن ڈپٹی صاحب کا مختار عام نہ بن سکے گا۔ ایک دن انھوں نے راجن کو بلا کر بہت سخت سُست کہا اور غصہ میں یہانتک کہدیا کہ اگر وہ کل صبح سے سوشیلا کو پڑھانے نہ جائیگا تو میں اسکا منھ نہ دیکھوں گا۔ راجن جواب دینا نہیں جانتا تھا وہ خاموش رہا رات کو جب سب لوگ گہری نیند میں تھے تو وہ چپکے سے اوٹھا اور گھر سے نکل کر تاریکی میں غائب ہوگیا

(۵)

دو چار سال گزر گئے لیکن "راجن" گھر واپس نہ آیا ٹھاکر صاحب اپنے کئے پر پچھتاتے تھے ٹھکرائن کا روتے روتے بُرا حال تھا راجن کے جانے کے ایک سال بعد سوشیلا کی شادی کنور پرتاب سنگھ "راج پور والے" سے ہوئی تھی لیکن گون بھی نہ ہونے پایا تھا سوشیلا کنور صاحب سے ملنے نہ پائی تھی کہ اس کا سہاگ اجڑ گیا کنور صاحب یکایک قلب کی حرکت بند ہو جانے سے سرگباش ہوگئے اور سوشیلا بیوہ ہوگئی۔ ڈپٹی صاحب نئے خیال کے آدمی تھے بارہا اُن کے دل میں خیال آیا کہ سوشیلا کی دوسری شادی کردوں لیکن لوک لاج سے مجبور تھے ہمت نہ پڑتی تھی۔ ادھر سوشیلا ناامیدی یم ویاس کے تاریک سمندر میں غوطے کھاتی ہوئی باغ کی اس بیل کی طرح جسکی جڑ کٹ چکی ہو اپنے دن بسر کر رہی تھی۔ عمر کے لحاظ سے سوشیلا ایک کھلتی ہوئی کلی تھی مگر حالات کے لحاظ سے مصیبت کی سخت دھوپ سے مرجھایا ہوا پھول۔ آنکھوں میں نشۂ شباب سے سُرخ ڈورے ضرور تھے مگر ماتھے پر سیندور کا ٹیکہ اور مانگ میں سہاگ کی لکیر کی جگہ سفید دھاری تھی جو ہندو عورتوں کی بیوگی کا خاص نشان ہے۔ رنگین کپڑے اور سہاگنوں کے زیور وہ نہیں پہنتی تھی اکادشی کا برت رکھتی اور رات کو پھل کھاتی اناج کے نام سے کوئی چیز نہیں کھاسکتی تھی۔ اس کے چہرہ کی بشاشت جاتی رہی دن رات چپ چاپ اپنے کمرہ میں پڑی رہتی روز روز کے رنج وغم سے وہ بیمار پڑگئی اس کا جسم اندر ہی اندر گھلنے لگا ویدوں۔ حکیموں۔ اور ڈاکٹروں کا بہت علاج کرایا گیا لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا بلکہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" اب ڈپٹی صاحب کی آنکھیں کھلیں انھوں نے اپنے دل میں مصمم ارادہ کرلیا کہ اگر پرماتما نے سوشیلا کو تندرست کردیا تو اس کی دوسری شادی ضرور کردیں گے "بہت ہوگا میری برادری مجھے چھوڑدیگی اونھ! اس کی کوئی پرواہ نہیں میری سوشیلا تو آرام سے زندگی بسر کریگی" لیکن سوشیلا کی طبیعت سنبھلتی ہی نہ تھی کہ ڈپٹی صاحب اپنے خیالات کو

عملی جامہ پہنائیں"

ایک دن سر شام ہی سے سوشیلا کی طبیعت بہت خراب ہوگئی۔ ڈاکٹروں اور حکیموں نے بھی جواب دیدیا۔ ڈپٹی صاحب سوشیلا کے قریب ہی سر جھکائے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ سوشیلا کی ماں کھڑی دل ہی دل میں دیوی سے پرارتھنا کر رہی تھی کہ اگر سوشیلا اچھی ہو جائے تو ننگے پاؤں تمھارے دربار میں پہونچکر سونے کا چھتر چڑھاؤنگی" ٹھیک اسی وقت ایک داسی اندر آئی اور اس نے ڈپٹی صاحب سے آہستہ سے کہا "راجن بھیا آئے ہیں"

ڈپٹی صاحب نے چونک کر کہا۔ "ایں راجن؟ کہاں ہیں بلاؤ بلاؤ"

سوشیلا آنکھیں بند کئے ہوئے پڑی تھی "راجن"! یہ نام سنتے ہی محبت اور جوش کا دریا اس کے دل میں لہریں مارنے لگا یہ لہریں بڑی لطیف تھیں ان سے رگوں میں شروع سے اخیر تک پریم رس دوڑ گیا اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور سوچنے لگی کیا سچ مچ راجن آگئے۔ وہی راجن جو مجھسے روٹھ کر چلے گئے تھے وہی راجن جن کے کارن میں بیمار پڑ گئی جن کی وجہ سے میری زندگی تباہ ہوگئی لیکن جن کو مجھ سے نفرت ہے جنھوں نے میری قدر نہ کی جو صرف میری وجہ سے اپنا گھر بار چھوڑ گئے تھے وہی راجن آج آئے ہیں اب وہ کس لئے آئے ہیں کیا مجھے اور جلانا چاہتے ہیں کیا ابھی ان کا کلیجہ ٹھنڈا نہیں ہوا

راجن کمرہ میں داخل ہوئے سوشیلا کی حالت دیکھکر ان کا دل کانپ اٹھا۔ ڈپٹی صاحب نے پوچھا "راجن کب آئے؟ اتنے دنوں تک کہاں رہے؟"

راجن بہت دبلے ہوگئے تھے لیکن ان کے چہرہ پر ایک نورانی جلال تھا انھوں نے جواب دیا "تیرتھ یاترا کرنے چلا گیا تھا اجودھیا جی سے آج ہی یہاں آیا ہوں ماتا جی سے سوشیلا کی بیماری کا حال سنا تو اس کو دیکھنے کے لئے دوڑا ہوا یہاں چلا آیا"

سوشیلا نے اپنے دل میں سوچا "اوہو کیسی باتیں بنا رہے ہیں۔ یہ میری وجہ سے چلے آئے۔ اگر ان کو میرا خیال ہوتا تو یہاں سے جاتے ہی کیوں۔ اب تو یہ بھگت جی بن گئے ہیں پھر بھی جھوٹ بولتے ہوئے شرم نہیں آتی"

ڈپٹی صاحب نے سوشیلا کے خیالات کا سلسلہ یہ کہکر منقطع کر دیا۔ "بیٹی! تیرے ماسٹر صاحب تجھے دیکھنے آئے ہیں"

بادلوں کو دیکھکر مور کا دل خوش نہ ہو غیر ممکن' سوانتی کی بوند دیکھکر متوالا پپیہا آپے میں رہے' محال۔ سوشیلا کے ضبط نے جواب دیدیا۔ کمزور ہاتھوں کو جوڑ کر اس نے راجن کو پرنام کیا اور آہستہ سے کہا "ماسٹر صاحب! آپ نے میری بڑی جلدی خبر لی اچھے تو رہے" اس کی آواز بھرائی اس سے زیادہ اور کچھ نہ کہہ سکی

جسقدر درد و غم کا اظہار اس مختصر طعنہ آمیز جملہ سے ہوتا تھا وہ راجن سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ ان کے دل پر گویا ایک سنسناتا ہوا تیر آکر لگا۔ پریم کی وہ چنگاری جو ان کے دل میں مدت سے پوشیدہ تھی اور جسے انھوں نے تیرتھ یاترا سے بجھانا چاہا تھا۔ سوشیلا کے الفاظ سے یکبارگی بھڑک اٹھی ٹھیک اسی طرح جس طرح راکھ میں دبی ہوئی آگ ذرا ساکریدنے سے بھڑک اٹھتی ہے ان کی ہچکی نے جواب دیدیا اور وہ سر تھام کر زمین پر بیٹھ گئے"

ڈپٹی صاحب نے گھبرا کر پوچھا۔ راجن! کیسی طبیعت ہے؟
اس عرصہ میں راجن نے اپنی طبیعت کو کچھ سنبھال لیا تھا کھڑے ہو کر بولے "جی کچھ نہیں یوں ہی سر میں ذرا سا چکر آگیا تھا"
منورما کی ماں نے کہا "بیچارے بہت کمزور ہیں سوشیلا کی حالت ان سے دیکھی نہیں گئی۔ میری بچی سے ان کو دلی محبت ہے"
راجن اسوقت کچھ کھوے ہوئے تھے لیکن سوشیلا کے لب پر مسکراہٹ تھی بیمار ہو کر اس نے راجن کو جیت لیا اس کے پریم نے راجن کی بھگتی کو نیچا دکھا دیا۔ آج راجن کو شکست اور اسکو فتح حاصل ہوئی

(۶)

اس دن سے راجن ہر وقت سوشیلا کے پاس رہنے لگے سوشیلا کی طبیعت اب روبہ صحت تھی۔ ڈپٹی صاحب کو اطمینان ہو گیا کہ اب میری سوشیلا بچ جائے گی۔" ٹھاکر ہرنام سنگھ خوش ہوے کہ اب ڈپٹی صاحب راجن کو اپنا مختار عام ضرور بنا لیں گے۔ حکیموں کے پاس دوڑنا دوا لا کر سوشیلا کو پلانا اور اسکی تیمارداری کرنے کے سوا راجن کو اور کوئی کام نہ تھا اسکو اپنے کھانے پینے کی بھی سدھ بدھ نہ رہ گئی
پھاگن کا شروع مہینہ تھا۔ موسم بسنت کی جذبات میں ہلچل پیدا کرنے والی ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ زمین عبیر و گلال سے سرخ ہونے لگی کسی قدر گرمی پڑنی شروع ہو گئی تھی کھیتوں میں سنہری بالیاں فرط مسرت سے جھوم رہی تھیں صاف شفاف دن تھا دوپہر کے سناٹے میں سوشیلا اپنے کمرہ میں تنہا تکیہ کے سہارے بیٹھی ہوئی اپنے طوطے کو آٹا کھلا رہی تھی ڈپٹی صاحب باہر بیٹھک میں تھے اور سوشیلا کی ماں اپنی کہارن سے اسکی لڑکا لڑکا ہونے کا حال ایک دوسرے کمرے میں سن رہی تھی۔ پڑوس میں کسی کا نیا مکان بن رہا تھا مزدوروں کی لڑکیاں چھت پیٹنے میں پھگوا گاتی جاتی تھیں۔

ہوری آج چلے چاہے کال چلے۔ مورا شیام سندر موسے آن ملے۔
ہوری آج چلے چاہے کال ——

ٹھیک اسی وقت راجن ہاتھ میں دوا کی شیشی لئے ہوے سوشیلا کے کمرہ میں آئے اور اس سے کہنے لگے "لاؤ میں تمھارے طوطے کو آٹا کھلا دوں تم ذرا دوا پی لو"
سوشیلا "اب میں اچھی ہوں دوا کی کوئی ضرورت نہیں میں نہ پیونگی"
راجن "نہیں نہیں۔ تم کو دوا پینا پڑے گی تم ابھی بہت کمزور ہو"
سوشیلا "اور اگر میں دوا نہ پیوں تو ——"
راجن "تو میں زبردستی پلاؤں گا"
سوشیلا کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔ دوا کا گلاس ہاتھ میں لیکر اس نے مسکرا کر کہا "اچھا میں دوا پی لونگی پہلے آپ میری ایک بات کا جواب دیجئے بہت دن سے پوچھنا چاہتی تھی لیکن ہمت نہ پڑتی تھی"

راجن نے کہا - وہ کون بات ہے سوشیلا - !

سوشیلا - اب تو مجھے چھوڑ کر کہیں بھاگ نہ جائیے گا - سچ کہتی ہوں اگر پھر کبھی آپ نے مجھے تیاگ دیا تو میں زندہ نہ بچوں گی -"
یہ کہتے کہتے سوشیلا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے - راجن کو اس بات کا بڑا غرور تھا کہ کوئی ان کے دل پر قابو نہیں پاسکتا لیکن آج سوشیلا کے ان پریم کے آنسوؤں میں راجن کی کشتیٔ دل بہ نکلی ضبط کا لنگر ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا وہ جرأت کرکے ایک قدم آگے بڑھے اور سوشیلا کے کندھوں پر کانپتے ہوے اپنے دونوں ہاتھ رکھدیئے - راجن کے چھونے سے سوشیلا کی پیشانی پسینہ سے تربتر ہوگئی اس کے رخسارے بیر بہوٹی کی طرح سرخ ہوگئے - راجن نے کہنا شروع کیا - سوشیلا ! سوشیلا ! میں ہارا اور تم جیت گئیں - جتنا میں نے تم سے دور رہنے کی کوشش کی اتنا ہی اور تم سے قریب ہوگیا - پریاگ راج - کاشی دوارکا اور ہری دوار کی یاترا کی لیکن تمھاری یاد نے میرا کہیں بھی پیچھا نہ چھوڑا - میں نے پہلے ہی سے تمھاری محبت کا اندازہ کرلیا تھا لیکن میں غریب اور تم امیر تھیں میں نے سمجھا کہ میرا اور تمھارا ملاپ نہیں ہوسکتا لیکن اب معلوم ہوگیا کہ میں غلطی پر تھا مذہب عشق میں نہ کوئی چھوٹا ہے نہ بڑا میں نے سوچ رکھا تھا کہ اپنی ساری زندگی پوجا پاٹ میں گزار دوں گا لیکن اب مجھ پر یہ عقدہ کھل گیا کہ "دل بدست آور کہ حج اکبر است" اگر اب مجھے تمھارے لئے نرک میں بھی جانا پڑے تو میں بخوشی منظور کرلوں گا - اگر میں تم ایسی پاک سوشیل دیوی کو بھی نہ منا سکا تو پھر دنیا میں کسی دیوی کو خوش نہیں رکھ سکتا - میری کوئی پوجا سپھل نہیں ہوسکتی - میرے دل کے مندر میں تمھاری ہی مورتی براجمان ہے اب میں اس کی پوجا کروں گا اسی میں میری نجات ہوجاے گی

سوشیلا نے اپنے خوشی کے جذبات کو دباتے ہوے کہا "لیکن کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ میں ودھوا ہوں"

راجن "ہاں میں اس سے بخوبی واقف ہوں لیکن میرے خیال میں تو ایک طرح سے تمھارا بیاہ ہی نہیں ہوا کیونکہ نہ تو گون ہوا اور نہ تم سسرال ہی گئیں پھر بھی اگر یہ تسلیم کرلیا جاے کہ تمھارا بیاہ ہوگیا ہے تو بھی اب تمھارا بیاہ ہوسکتا ہے کیونکہ شاستر کے رو سے بال ودھوا بیاہ جائز ہے"

سوشیلا "جائز ہونے سے کیا ہوتا ہے جب کوئی اس پر عمل بھی کرے"

راجن "میں عمل کرکے دکھادوں گا - ہاے بھارت کی نہ معلوم کتنی جوان دیویاں اس بیوگی کی آگ میں جل رہی ہیں لیکن کوئی انکا پرسان حال نہیں تعلیم یافتہ لوگوں میں تو اب کچھ کچھ اسکی طرف خیال کیا جانے لگا ہے لیکن گاؤں میں تو ایسا سوچنا بھی مہا پاپ سمجھا جاتا ہے خیر اب تم یہ بتاؤ کہ اس معاملہ میں تم میری مدد کرسکتی ہو یا نہیں ؟

سوشیلا نے مسکرا کر کہا - ہاں "بھگت جی" ضرور بھلا آپ کا کہنا نہ مانوں کہیں ایسا ہوسکتا ہے - لیکن ہمارے ماتا پتا ودھوا بیاہ کی کیوں اجازت دیں گے"

راجن "اجازت کیوں نہ دیں گے میں انھیں ہر طرح سے قائل کرکے مجبور کروں گا"

سوشیلا - اور اگر انھوں نے اجازت نہ دی"

راجن - تو اسی کوشش میں میں اپنی جان دیدوں گا ---"

"نہیں تم کو جان دینے کی کوئی ضرورت نہیں تمہارا بیاہ ضرور ہوگا" یہی کہتے ہوئے ڈپٹی صاحب کمرہ میں داخل ہوئے وہ بڑی دیر سے باہر کھڑے ہوئے سن رہے تھے جب خاموش نہ رہ سکے تو اندر چلے آئے۔

سوشیلا۔ اور راجن ان کے قدموں پر گر پڑے۔ دونوں کے پاک آنسوؤں نے ڈپٹی صاحب کے چرنوں کو دھو دیا۔

ڈپٹی صاحب نے کسی کی مخالفت کا کچھ خیال نہ کیا اور راجن کے ساتھ سوشیلا کا بیاہ کر دیا کچھ عرصہ تک تو برادری اینٹھی رہی لیکن ڈپٹی صاحب کے روپیوں نے اس کو آہستہ آہستہ ٹھیک کر لیا۔ اسی طرح سے جن لوگوں نے فضول شور مچایا اُن کا بھی منھ روپیوں سے بند کر دیا گیا۔ ڈپٹی صاحب نے دو معصوم دلوں کو ملا دیا اسی میں اُن کی نجات ہوگئی۔ ٹھاکر ہرنام سنگھ کی تو دلی مراد بر آئی اور راجن ڈپٹی صاحب کا مختار عام ہو ہی گیا۔

(اعظم کریوی)

یکم دسمبر سے ۳۱ دسمبر سنہ ۱۹۲۸ء تک

نگار کے جدید و قدیم خریداروں کیلئے خاص رعایت

(۱) جنوری سنہ ۱۹۲۸ء کا رسالہ ۱۶۰ صفحات کا ہوگا لیکن اس کی کوئی زائد قیمت نہ لیجائے گی۔

(۲) ظریف شاعروں کا تذکرہ قیمتی للعہ، کتاب فراست الید قیمتی عہ، جذبات بھاشا قیمتی ۱۲، شہاب کی سرگزشت قیمتی عہ، سب نصف قیمت پر دی جائیں گی۔

یعنی

اگر نگار کے سالانہ چندہ (پانچ روپیہ) کیساتھ آپ نے ۳ ہے اور شامل کر کے ۸ ہے کا منی آرڈر ۳۰ دسمبر سنہ ۱۹۲۸ء تک بھیجدیا تو آپ کو یہ سب کتابیں ذریعہ رجسٹرڈی بھیجدی جائیں گی۔

اگر آپ تمام کتابیں نہیں لینا چاہتے، تو جو کتاب درکار ہو اس کی رعائتی قیمت سالانہ چندہ کیساتھ بھیجئے

جو حضرات یہ چاہتے ہیں کہ سال آئندہ کے چندہ کے ساتھ کتابوں کی رعائتی قیمت بھی ذریعہ وی پی وصول کر لی جائے وہ اطلاع دیں فلاں کتاب مطلوب ہے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ جنوری سنہ ۱۹۲۹ء کے نگار کیساتھ حسب قاعدہ ڈاکخانہ کوئی کتاب روانہ نہیں ہو سکتی اس لئے مطلوبہ کتابیں بعد وصولی رقم رجسٹرڈ بھیجی جائیں گی

جو حضرات سکوت اختیار کریں گے ان کو جنوری کا رسالہ صہ ہی میں حسب معمول وی پی کیا جائیگا "منیجر"

فلسفۂ مذہب

مذہب اور تقدیر تقدیر لفظ قدر سے نکلا ہے جس کے معنی اندازے کے ہیں۔ پس تقدیر کے معنی اندازہ ٹھہرانے کے ہوئے جیسا قرآن شریف کی اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے" انا کل شئی خلقناہ بقدر" (ہم نے تمام چیزوں کو ایک اندازہ سے پیدا کیا) مذہبی اصطلاح میں تقدیر سے یہ مراد ہے کہ خدا کی مشیت کا اقتضا ہے یا اس کے علم و خبر کے صفات کے لئے ضروری ہے کہ جو کچھ دنیا میں ہونے والا ہے اس کو اُسنے ازل میں پہلے ہی مقرر کر دیا ہو اور اس لئے انسان جو کچھ کرتا ہے یا اس کو جو کچھ راحتیں یا مصیبتیں پہنچتی ہیں وہ اس کے لئے پہلے ہی مقرر ہو چکی ہیں، مطلب یہ ہوا کہ اس کا کوئی فعل خود اسکے اختیار سے نہیں ہے، تو جب انسان فاعل خود مختار نہیں ہوا تو وہ سزا و جزا کا مستوجب بھی نہیں ہو سکتا۔ لہذا مسئلہ تقدیر سے یا تو خدا کی بعض ضروری صفات سے انکار کرنا پڑے گا یا انسان کے فعل کی ذمہ داری اسپر عاید کرنی پڑیگی اور دونوں صورتیں مذہب کے لئے مشکل ہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا میں جتنے مذاہب ہیں وہ اس مسئلے کیوجہ سے دو مخالف گروہ میں منقسم ہو گئے جنہیں ایک انسان کو مجبور سمجھتا ہے اور دوسرا با اختیار مثلاً یہودیوں میں صدوقی اور فریسی، مسلمانوں میں جبریہ اور قدریہ، عیسائیوں میں اگسٹن پلاگین (Augustin Palagean) کا اسکول اور کالونسٹک آرمین (Colvinistic Arminum) کا اسکول بودھ دھنودنے اس مشکل کو "کرم" کی تھیوری سے حل کرنے کی کوشش کی۔ مجوسیوں نے صبر و شکر کے دو خدا بنائے حتیٰ کہ مذہب سے باہر بھی فلاسفہ کے دو اسکول ہیں ایک تقدیر کا ماننے والا یعنی ڈیٹرمنسٹ (Determinist) دوسرا انسان کو فاعل با اختیار جاننے والا یعنی لبرٹرین (Libertrian) قدیم فلاسفہ یونان میں بھی ان انکار نے مشکلات پیدا کیں۔ سفاقلس (Sphocles) نے انسان کو تقدیر و قسمت کے رشتہ گراں سے بندھا ہوا پایا۔ اسٹویک فلاسفی نے تقدیر کو ایک ناگزیر مشیت قرار دی اور اس کے برخلاف (Epecurian) اپی کیورین نے انسان کے اعمال میں خدا کی مداخلت سے انکار کر دیا۔ سب تو سب مادیت و الحاد کو بھی اس مشکل مسئلہ سے سابقہ پڑا ہے۔ اور اسکے آگے علم نفسیات و موالید ثلاثہ کے روسے انسان کے عادات و قوائے ادراک پر توارث اور ماحول و زمانہ کے اثر کو ماننے کے باوجود پھر بھی اس کو اپنے کاموں کا ذمہ دار بنانا ایسے معارضات ہیں جو ابھی حل نہیں ہو سکے۔

قبل اسکے کہ ہم انسانی فطرت اور مذہب کے روسے اس مسئلے پر بحث کریں یہ ضرور ہے کہ ہم سب سے پہلے خیر و شر کی حقیقت پر ایک اجمالی نظر ڈالیں اور اس ضمن میں اس منبع شر یعنی اس معروف و مشہور ہستی سے جو شیطان الرجیم کے نام سے موسوم ہے اس کی ذات سے بھی کچھ تعارف پیدا کرنے کی کوشش کریں، جسکو سامی اور آرین مذاہب نے حسب مراتب انکار اس تواتر کے ساتھ یاد کیا ہے کہ اس کے وجود خارجی یا باطنی سے انکار کرنا گو فلسفہ مذہب سے ممکن ہو مگر تاریخ مذہب سے ممکن نہیں،

افعال انسانی کی تین قسمیں ہیں اور تین کا ماخذ تین فطری قوتیں ہیں جو قدرت نے ہر فرد و بشر کو عطا کی ہیں یعنی غصہ۔ خواہش اور ادراک یا دوسرے لفظوں میں دفع مضرۃ جلب منفعت و تعقل۔ بادی النظر میں یہ تین قوتیں جداگانہ قوتیں معلوم ہوتی ہیں مگر درحقیقت

وہ سب ایک اصل یعنی حفظ نفس کی تین شاخیں ہیں۔ یہ فطری جذبات جو انسان میں پائے جاتے ہیں وہ بذات خود نہ خیر ہیں نہ شر ہیں۔ خیر و شر نام ہے ان کے بیجا یا بجا استعمال کا۔ پس خیر و شر دراصل ایک تعریف "بالاضداد" یا تعریف بالمقابل ہے۔ تو جہاں تک ان فطری جذبات کی خلقت کا تعلق ہے انکا خالق یقینی وہی ہے جو انسان و تمام کائنات کا خالق ہے مگر ان جذبات کو جا و بیجا استعمال کرنا انسان کا کام ہے اور اس لئے خیر و شر کا خالق درحقیقت انسان کا اپنا فعل ہے:۔ ما اصابک من حسنۃ فمن اللّٰہ وما اصابک من سیئۃ فمن نفسک "تعجب ہے کہ ایسی صریحی اور صاف بات کو مجوس کے فلسفے نے نہ سمجھا اور اس نے بجائے ان جذبات کے جن سے خیر و شر پیدا ہوئے ہیں خود خیر و شر بالذات سمجھ کر ایک کا خالق یزدان اور دوسرے کا اہرمن بنایا حالانکہ ظاہر ہے کہ مثلاً آگ اچھی چیز بھی ہے اور بری چیز بھی، اگر آگ ایک بیوہ عجوزہ کے جھونپڑے پھونکنے یا عبادتگاہ کے جلانے کے لئے استعمال کریں تو وہ شر ہے اور اگر اس سے ہم کھانا پکائیں یا کمرہ گرم کریں تو وہ مفید و خیر ہے۔ تو اگر آگ بجائے خود اچھی چیز اور بری چیز ایک ہی وقت میں ہوتی تو اس کی خدائی میں یزدان اور اہرمن دونوں شامل ہوتے اور یہ ناممکن ہے تو دراصل تمام چیزیں خدا کی پیدا کی ہوئی ہیں اور وہ اپنی ذات سے اچھی یا بری نہیں ہیں۔ ان کا بیجا یا بجا استعمال ان کو اچھا یا برا بناتا ہے۔ پس جس شیطان کو آریائی دماغ نے پیدا کیا تھا وہ یہیں تحلیل ہو جاتا ہے لیکن جس شیطان کو سامی دماغ نے پیدا کیا ہے اس کا وجود اب بھی باقی رہجاتا ہے اور اس کے وجود ہی سے تقدیر کا فیصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ شیطان خود خدا نے ابن آدم کو بہکانے کے لئے پیدا اور مسلط کیا ہے۔ اور جو برائیاں ہم سے ظہور میں آتی ہیں ان کا ذمہ دار وہی سمجھا جاتا ہے یہ شیطان کیا ہے اور خود شیطان کس زبان کا لفظ ہے۔ اگر ہم اس کا پتہ لگائیں کہ شیطان کی لعنت کہاں سے شروع ہوئی تو غالباً ذہن سے اُن خیالات کا پتہ بھی لگ سکے گا جو شیاطین کے متعلق مذہب اسلام اور یہود و نصاریٰ میں پائے جاتے ہیں قرآن شریف میں شیطان کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے مثلاً سانپ کے معنی میں طلعھا کانہ رؤس الشیاطین بمعنی پیاس و عطش واذ نادیٰ ربہ انی مسنی الشیطان بنصب وعذاب۔ کالذی استھوتہ الشیاطین فی الارض حضرت سلیمان کے تابع یا ان کے زمانے کی ایک قوم جو ساحل بحر شام پر رہتی تھی ——— یہ لوگ نہایت ماہر جہازران اور غواص تھے۔ اور اپنے مقام کی مناسبت سے بائبل میں صیادین یا صیدانی کہلاتے تھے۔ کیا عجب ہے کہ شیاطین اسی لفظ کی بگڑی ہوئی صورت ہو۔ "ومن الشیاطین من یغوصون لہ ویعملون عملاً دون ذلک" والشیاطین کل بناء وغواص" گمراہ کرنے والے انسان" وکذلک جعلنا لکل نبی عدوا شیاطین الانس والجن یوحی بعضھم الی بعض زخرف القول غرورا" خواہش یا نفس امارہ" واما ینزغنک من الشیطان نزغ فاستعذ باللہ انہ سمیع علیم" مصیبت "ھل انبئکم علیٰ من تنزل الشیاطین" نجومی و رمال "انا زینا السماء الدنیا بزینۃ الکواکب وحفظا من کل شیطان مارد۔ لایسمعون الی الملاء الاعلیٰ ویقذفون من کل جانب دحورا" بمعنی آسیب و خلل دماغی "الذین یاکلون الربوٰا لا یقولون الا کما یقوم الذی یتخبطہ الشیطان من المس" بعض اہل علم کا قول ہے کہ بابل کا ایک دیوتا جو تو ردو الجناح کی شکل کا مکانوں اور مندروں کے باہر اس نیت سے نصب کیا جاتا تھا کہ لوگوں کو بری ارواح سے محفوظ رکھے اور اس کا نام شیدلی یا شیطم تھا۔ اسی لفظ سے عبرانیوں نے شیطان بنا لیا ہے، بابل کی اسیری میں ایک زمانہ تک عبرانیوں نے خود اس کی پرستش کی تھی۔ شیطم کے مقابلہ میں کردیم تھے جن کی تمثالی صورت بازو دار عقاب کی ہوتی تھی اور حضریات بابل میں یہ شبیہ اکثر شجر ممنوعہ (شجر زندگی) کے دونوں طرف کھڑی یا سجدہ کرتی ہوئی پائی گئی ہے۔ اور یہودیوں میں کردیم ملائکہ اور شیطم مخالف ملائکہ یعنی شیطان کے معنی

میں استعمال کیا گیا بہرحال کچھ بھی ہو[1] ہم خود اپنے اندر ایک شیطان یا نفس امارہ کا وجود ضرور پاتے ہیں، جو اکثر ہمارے جذبات کو بے اعتدالی پر برانگیختہ کیا کرتا ہے۔ پس وہ کون چیز ہے جو ایک شقی کے دل میں جذبۂ جلب منفعت کی وہ بدترین صورت پیدا کرتا ہے جو ایک معصوم بچے کا زیور چھین کر اس کو قتل کر دینے پر آمادہ کرتا ہے۔ کون اس عمل کا محرک ہے۔ شیطان ہو یا انسان کوئی ہو جس نے شیطان یا انسان کو پیدا کیا ہے۔ ضرور ہے کہ وہی اس کے اس ارادی قوت کا بھی خالق ہے یہی نہیں بلکہ وہ جانتا تھا کہ فلاں شخص ایسا کریگا۔ اور وہ چاہتا تو اسکو ایسا بناتا کہ وہ ایسا نہ کر سکتا۔ اور یہیں پر آکر ہم مسئلہ تقدیر سے دوچار ہو جاتے ہیں۔

ایک مذہبی شخص کے علاوہ ایک فلسفی کو بھی مجبور ہونا پڑتا ہے کہ ایک طرف انسان کے مختار ہونے اور دوسری طرف کائنات میں اس کی مجبور رہونے کی اپنے اپنے نظریہ کے مطابق توضیح یا تاویل کرے۔ یہ مسئلہ درحقیقت فلسفہ مابعد الطبیعات کا ایک بہت ہی اہم مسئلہ ہے اور اس کی ابتدا ان دو متضاد خیالوں کو موافقت کرنے کی کوشش سے شروع ہوتی ہے جو ایک طرف انسان کو اس کی قوت ادراک کے رو سے فاعل با اختیار جانتا ہے اور دوسری طرف کائنات کے پیچھے ایک عقل اول اور تنظیم الٰہی کا قائل ہے مگر تاریخی حیثیت سے اس مسئلہ کی تشکیل مذہب ہی نے دی ہے اور اس کے بعد حکما نے اپنے مفروضہ قوانین فطرت کو انسانی اعمال سے مطابق نہ پاکر اس پر دلائل و مباحث کو قائم کیا ہے چنانچہ سائیکالوجی یا علم نفسیات نے جب انسان کے قوائے ادراک کی تحلیل کی تو اس کے ضمن میں انسان کی قوت ارادی اور اختیار کی تشریح بھی ضروری سمجھی مگر عام طور سے جبر و اختیار کی بحث اخلاق کا ایک شعبہ سمجھا جاتا ہے، اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ انسان کی قوت ارادی اور دنیا میں اس کے دوسرے افعال کی تعلقات پر بحث کرنا ایک ایسا فلسفیانہ تخیل ہے جس سے انسان کو معمولی طور سے روزمرہ کام نہیں پڑتا اور یہ بھی واقعہ ہے کہ عام طور سے انسان کا ادراک اخلاقی اس کو بلا حجت اپنے کاموں کا ذمہ دار بنا دیتا ہے۔ اور وہ مشکل جو تقدیر پیدا کرتی ہے اس کے خیال میں فوراً نہیں گزرتی بلکہ اخلاق کی بہترین تصانیف خواہ گزشتہ ہوں یا موجودہ وہ اپنے مقصد و مطلب کو بغیر اس مسئلے میں دخل دیتے ہوئے پورا کر رہی ہیں اور غالباً یہ مسئلہ کبھی نہ پیدا ہوتا اگر فلسفہ مابعد الطبیعات مذہب میں دخل نہ دیتا۔ اور خدا کے علم و خبر کی نوعیت پر قیل و قال نہ کیا جاتا۔ اور شاید یہ مسئلہ اس قدر قابل اعتنا نہ سمجھا جاتا اگر سائیکالوجی کے مبادیات انسانی ادراک میں دخل نہ دیتے جس سے وقتاً فوقتاً اخلاق کے مفروضہ اصول متصادم ہو جاتے ہیں۔ بہرحال کچھ ہی ہو موجودہ طبائع کا رجحان یہی ہے کہ مابعد الطبیعات و نفسیات کی تحقیقات کو لازماً و بدا ہتاً اخلاقی ادراک کے ماتحت کرنا چاہئے۔

حکما و فلاسفۂ یونان میں اختیار انسانی کے مسئلے نے کوئی خاص بات پیدا نہیں کی جو قابل وقعت ہو ان کی تعلیم کی بنیاد

---

[1] قرآن شریف میں شیطان کے ہم معنی ابلیس کا لفظ بھی آیا ہے۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ لفظ عربی ہے یا قرآن کا ہے شیطان کے ہم معنی لفظ یونانی زبان میں (Diabolus) ہے جس سے انگریزی لفظ (Devil) نکلا ہے۔ ممکن ہے کہ عربوں نے شام میں رومیوں کی زبان سے ڈیابلوس کو سنا ہو اور اس کو معرب کر کے ابلیس بنا لیا ہو، اور قرآن کے نازل ہونے کے وقت یہ لفظ عربوں کی خاص اصطلاح میں شامل ہو گیا ہو۔ اور الہام نے اسی معرب الفاظ کو عربوں کے سمجھنے کے لئے استعمال کیا ہو واللہ اعلم بالصواب

اس عام اعتقاد پر مبنی تھی کہ انتظام عالم کے لئے ایک وجود خارجی کی ضرورت ہے اور گو کہ اس طریق عمل کے متعلق اختلاف آرا ہوں یہاں تک کہ خود نظام عالم کے اندر ایک قوت غیر محسوس طریقے سے سرایت کئے ہوئے کے اعتقاد کا بھی پتہ چلتا ہے۔ انسان کو فاعل با اختیار سمجھنے کی بھی پوری کوشش نہیں کی گئی۔ اور انسانی اختیار کا مسئلہ جیسا موجودہ صورت میں پیدا ہوا ہے اس پر سقراط۔ ارسطو یا افلاطون نے کوئی توجہ نہیں کی۔ یہ صحیح ہے کہ سقراط نے انسان کے ان اعمال کی جن کی محرک خود اس کی عقل و بصیرت ہوتی ہے بہ نسبت ان افعال کی جو بلا قصد و ارادہ سرزد ہوتے ہیں ایک خاص اہمیت دی ہے، اور اس کے نزدیک اعمال و اخلاق اچھے ہوں یا برے انسان کے علم پر مبنی ہیں کہ اس کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ جان بوجھ کر غلطی کرے۔ یعنی بدی نتیجہ ہے، لاعلمی و جہالت کا اور ایسی صورت میں سقراط بھی ایک حد تک تقدیر کی طرف آجاتا ہے۔ سقراط کے بعد ارسطو کے انکار نے اس مسئلے پر کہ انسان کی لاعلمی و جہالت کہاں تک اس کو اپنے افعال کی ذمہ داری سے سبکدوش کر دیتی ہے ایک حد تک انسان کے علم و اختیار کو تسلیم کیا ہے۔ مگر اس کے تمام دلائل کا صرف اتنا ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ کونسی صورتیں ہیں جب انسان کو اپنے کام کا ذمہ دار بنایا جا سکتا ہے۔ اور یہ مسئلہ کہ انسان اپنے اختیاری فعل میں جس کا ذمہ دار انسان خیال کیا جاتا ہے، کہاں تک واقعی ذمہ دار ہے۔ اس پر ارسطو خاموش ہے اور یہ صورت کہ انسان کے اپنے عمل کا نظام فطرت یا تقدیر سے کہاں تک تعلق ہے۔ بغیر کسی مفید مطلب حل کے چھوڑ دیا گیا ہے۔ ارسطو صرف اس قدر بتا دینا کافی سمجھتا ہے کہ انسان کی اختیاری قوت کی مجبوری اس کے ان خصوصیتوں میں سے ہے جو اس کے علم خصائل پر مبنی ہیں ہر چند کہ آخر کار انسان کے عمل کی ذمہ داری ان افعال پر ہے۔ جو اس کے ارادہ اور اختیار کا نتیجہ ہیں ارسطو نہ تو اس خیال کی پوری تائید کرتا ہے کہ انسان کا عمل خود اس کے اختیاری قوت کا نتیجہ ہے اور نہ اس خیال کی کہ وہ لازمی طور سے وہی عمل کرتا ہے جو پہلے سے اس کے لئے تقدیر ہو چکے ہیں افلاطون نے بھی اس مسئلے میں بہت کچھ رد و کد نہیں کی ہے۔ گو کہ اس کی کتاب جمہوریت کے دسویں باب کے بعض جملوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ارواح انسانی کی سزا و جزا کو قوت اختیار کے سبب سے ذمہ دار ٹھہراتا ہے لیکن سقراط کی طرح اس کا یہ بھی قول ہے کہ انسانی اختیار اس کے علم و جہالت پر منحصر ہے مگر وہ صورت کہ انسان کے اختیار اور عقل اول کے مقدرات کے تعلقات سے ایک نتیجہ خیز بات پیدا کی جائے۔ وہ بغیر حل کئے ہوئے چھوڑ دی گئی ہے۔ البتہ ایپی کیورین (Epicurean) اور اسٹوئک (Stoics) فلاسفی نے اس مسئلہ کی وہ شکل پیدا کی ہے جو اس وقت ہمارے سامنے زیر غور ہے۔

اسٹوئک کا اعتقاد کہ انسان بوجہ اختیار اپنے کاموں کا ذمہ دار ہے اور پھر یہ کہ ایک واجب الوجود ہستی کی طرف سے تمام کاموں کا انصرام پہلے ہی ہو جاتا ہے یا ایپی کیورس کا انسانی اختیار کو ہی سب کچھ سمجھ لینا اور دوسری صورت کو محض حوادثات و اتفاقات عالم جاننا اور عالم کو محض ایک ضروری ماثرات میں شمار کرنا مسئلہ جبر و اختیار کو کافی طور سے حل نہیں کر سکا مگر بعد کے فلاسفہ نے جو دلائل مقدرات اور انسانی ذمہ داری کے مطابق کرنے میں دئیے ہیں وہ ایک حد تک موجودہ مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہیں۔

مسیحیت کا رواج جب بحیثیت ایک تاریخی مذہب کے یونان و روما میں ہوا اور اس کا صاف و سادہ عقیدۂ تکوین یونانیوں کے وحدت الوجود کے منظومات کے مدمقابل آیا تو اختیار انسانی کے پرانے خیالات میں ایک تازہ روح پڑ گئی بایں ہمہ دو متضاد خیالات

یعنی ایک طرف کائنات کی ابتدا اور حقیقت کے متعلق ایک بہت امید افزا عقیدہ اور دوسری طرف اخلاق انسانی کی مذمومیت کا مایوس کن انجام جیسا کہ عقیدۂ نجات سے ظاہر ہوتا ہے اس نے انسان کی ذمہ داریوں وخود مختاریوں کو خالق کی خلاقیت ومشیت و مقدرات کے متضاد خیالات کے ساتھ ہمنوا ہونے میں اور بھی مشکلات ڈالدیں، چنانچہ اشراقیت (Neo Platonism) نے یا تو اُن میں سے ایک صورت سے قطعی انکار کرکے دوسری صورت اختیار کرلی ہے۔ یا دونوں کی بے نتیجہ تاویل ہے۔ مسیحی فلاسفہ کا وہ طبقہ جو اسکندریہ کے اسکول سے موسوم ہے اسیر اس فلسفہ کا اس قدر اثر معلوم ہوتا ہے کہ وہ عالم اسباب ومحسوسات کے وجود سے منکر تھے جس کی وجہ سے مسئلہ اختیار کو پوری تشکیل نہیں ہوئی۔ سینٹ اگسٹیس پہلا مسیحی ہے جس نے مذہب اور اخلاق کے رو سے اس مسئلہ کو سلجھانے کی کوشش کی ہے گوکہ وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اس کے مقالات میں دونوں خیالات عجیب متضاد حیثیت سے پیش کئے گئے ہیں، ایک طرف تو اس نے نہایت صراحت کے ساتھ ان کے اختیار وذمہ داری پر زور دیا ہے۔ اس کا قول ہے کہ انسان کا اختیار اس کے علم سے پہلے ہے، اور جو اس کے قوی ادراک جسمانی پر موقوف ہے، اس کا یہ بھی مقولہ ہے کہ انسان کا انوار الٰہی سے مستفید ہونا (یعنی روحانی استعداد عقل کی خلاقی پر موقوف نہ ہونا) مشروط ہے اس کے ان اعتقادی اعمال سے جو خود بخود اس میں پیدا ہوتے ہیں اور اس لئے خدا کے علم ازلی کے وجود کو تسلیم کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان مجبور محض ہے اور جو کچھ وہ کرتا ہے تقدیر ہی کراتی ہے، خدا کے غیر متناہی علم سے اعمال انسانی کا مقدر ہونا ضرور ہے مگر اس کی کوئی تعین اور تشریح نہیں ہے، لیکن جب اگسٹین اختیار وارادے کو انسانی فطرت کے عام تقاضائے نجات اور خدا کے رحم وکرم کے عقیدہ کے مقابل پاتا ہے، تو آزادی انسان پر اس کے بہت سے مفروضہ دلائل خود بخود شکست ہوجاتے ہیں۔ اس مشکل سے بچنے کے لئے اس نے یہ فرض کیا ہے کہ قوت ارادی ایک قوت ہے جو آدم کو عطا کی گئی تھی۔ لیکن آدم نے جب باغ عدن میں اس قوت کا غلط استعمال کیا تو بہشت کے ساتھ یہ قوت بھی ان کی اولاد سے چھین لی گئی اور انسان کے لئے اب سوائے بدی کرنے کے کوئی چارہ نہیں ہے۔ اور چونکہ بدی انسان کے اجتہاد وعلم سے ہوتی ہے ضرور اس کی سزا بھی دیجائیگی نتیجہ یہ ہوا کہ خدا کا فضل کبھی بھی انسان پر شامل حال نہ ہوئے گا۔ اور یہیں سے اگسٹین کے مقدرات کا عقیدہ پیدا ہوجاتا ہے یعنی مذہبی حیثیت سے ہر انسان کے لئے تقدیر ہوچکا ہے کہ وہ بدی کرے یا جبر خدا اپنا فضل کرے اور اس کو خاص طور نیکی کی ہدایت کرنے گویا خدا کے علم وخبر نے اختیار انسانی کو کالعدم کردیا۔

مسیحیت از منۂ وسطیٰ اس مسئلے میں اگسٹس وارسطو کی دستنگر رہی۔ گو کہ بعض اہل فکر نے اور بھی مختلف صورتیں اس مسئلے کی پیدا کی ہیں مثلاً طامس اکنہاس (Thomas Aquinas) نے افلاطون کے دلائل پر زیادہ زور دیا ہے اور انسان کی قوت اختیاری کو اس کے عقل پر منحصر کیا ہے۔ یعنی اخلاق علم کا نتیجہ ہے۔ طامس کے نزدیک انسان کی آزادی بشرطیکہ وہ واقعی آزاد کہلانے کے قابل ہو ایک ایسی قوت اختیاری ہے جسکو عقل نے پہلے ہی سے قابل اختیار ہونے کے لئے منتخب کرلیا ہے۔ اور فہم وادراک خود اس انتخاب کے گوناگوں صورتوں کو ارادۂ انسانی کے لئے پیش کرتا ہے۔ گوکہ اکثر حالتوں میں مقدرات الٰہی اس کے تشریح کردہ اختیار انسانی سے موافق ہوجاتے ہیں۔ مگر عام طور سے نتیجہ وہی نکلتا ہے۔ کہ وہ آزادی جس سے انسان

کوئی عمل کرتا ہے وہ خود خدا کی مقدرات میں سے ہے۔ یعنی انسان کے لئے تقدیر ہوا ہے کہ وہ اپنے عمل میں آزاد ہو۔ گویا علم الٰہی کا اعمال انسانی سے باخبر ہونا ضروری ہے۔ ڈنس اسکاٹس (Duns Scotus) تقدیر کا شدت سے مخالف ہے۔ بقول اس کے عقل انسانی کو ہمیشہ انسانی ارادوں کے ماتحت ہونا چاہئے اور انسان کو خود اپنی تقدیر بنانے کا پورا اختیار ہے۔ اور اخلاق کسی عقلی اصول یا علم کا نتیجہ نہیں ہیں اور نہ وہ خدا کے ارادے سے بلا کسی سبب کے پیدا ہوئے ہیں۔

حال کے فلاسفۂ یوروپ ڈیکارٹی (Decartes) ہابس (Hobbs) اسپائنوزا (Spinoza) لیبز (Leibniz) سے کانٹ (Kant) تک اس مسئلے کو خود اپنے موضوعات مابعد الطبیعت کے رو سے زیر بحث لانے میں یہ تو ممکن نہیں کہ ان کے اقوال کو یہاں بالاستعاب پیش نظر رکھ کر ایک نتیجہ پیدا کیا جائے کیونکہ وہ اس قدر دقیق و نازک ہیں کہ ان کو سمجھنا معمولی عقل کے انسان کا کام نہیں ہے، تاہم ایک مختصر سی اجمالی نظر ڈالنا ضروری ہے۔ ہابس کا رجحان مادیت کی طرف ہے، اور مادیت کے لئے قوانین فطرت کا ماننا ضروری ہے مگر قوانین فطرت بھی مقدرات پر مبنی ہیں بہر حال اگر مقدرات الٰہی نہ ہو۔ مقدرات مادیت ہی سہی تو بقول ہابس کے تخیلات قوت ارادی چند حرکات دماغی کے نتائج ہیں۔ قوت ارادی ایک قسم کا جذبۂ انسانی مثل خوف و اشتہا کے ہے اور اس کا سبب خود ہمارا ماحول ہے ڈیکارٹی نے ایک ایسے اختیار انسانی کی تائید کی ہے جو تقدیر و تدبیر دونوں کی موافقت کرتا ہے یعنی وہ غلط طریقہ اختیار کرنے کی ممکنات کو ایک خاص کیفیت دماغی سے منسوب کرتا ہے اور دماغ کا خاصہ ہے کہ وہ ہمیشہ ایسی مفروضات کے انکار کرنے پر تیار رہتا ہے جو یقینیات میں داخل نہیں اور باوجود اس کے کہ دماغ کے سامنے ایسی صورتیں پیش ہوتی ہیں کہ اس کی حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اس کا تسلیم کرنا انسانی اختیار پر منحصر ہے جو اپنی قوت ارادی کو ثابت کرنے کے لئے ان اشکال کی شہادت یا اقرار سے انکار کر سکتا ہے۔

اسپائنوزا مقدرات کا اس حد تک قائل ہے کہ ارادۂ انسانی کا وجود افکار انسانی سے ہے۔ عالم ادراک اور عالم اسباب وہ سب ایک ہی جوہر کے صفات ہیں جو آزاد اس لئے کہے جا سکتے ہیں کہ وہ خود اپنی تقدیر ہیں۔ اخلاقی دنیا میں اختیار انسانی کے یہ معنی ہیں کہ جذبات انسانی عقل کے تابع ہیں۔ لیبز (Leibnitz) اخلاق کی اختیاری صورت کا قائل ہے اور اسکے ساتھ وہ اس کو بھی تسلیم کرتا ہے کہ مدرکات اخلاقی خود محرک عمل ہیں اور وہ بجز اپنے ہی طبیعت کے مقرر کردہ قوانین کے کسی اصول کے پابند نہیں مگر چونکہ لیبز کا یہ بھی قول ہے کہ انسانی تدابیر خدا کے مقرر شدہ اصول کے مطابق کام کرتی ہیں اسلئے آخر میں ایک حد تک تقدیر کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ لاک کا نظریہ ان مسائل میں دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس کا قول ہے کہ آزادی کا تعلق انسان سے ہے نہ کہ انسان کسی قوت ارادی سے۔ اگر ہم کوئی ارادہ کریں تو اس حد تک ہم اپنے ارادے میں آزاد ہیں یعنی ہمارے اعمال ہمارے ارادوں کا مظہر ہیں۔ لیبنز کا اعتراض کہ اس تاویل سے اس سوال کا جواب نہ ہوا کہ آیا وہ عمل جو ارادے سے ظاہر ہوتا ہے وہ اس حد تک آزاد ہے کہ عقل نے پہلے سے اس کو مقرر نہیں کیا تھا۔ لاک کا یہ جواب ہے کہ ارادہ موقوف ہے انسان کی فطری خواہش دفع مضرت پر ہیوم (Hume) کا عقیدہ اس کے اس نظریہ کا کہ عالم اسباب محض تاثرات میں سے ہے ــــ

اس کا منطقی نتیجہ ہے۔ اگر ہمارا تعلق عالم کون و مکان سے محض ایک وہمی و خیالی ہے تو آزادی عمل اور تقدیر انسانی کی موافقت و مخالفت بھی ایک وہم ہے۔ برخلاف اس کے اگر ہمارا عالم اسباب سے وابستہ ہونے کا اعتقاد محض ایک رسم دیرینہ ہے تو وہی رسمی خیالات اس قول کی تائید کریں گے کہ انسان کے روزمرہ کے اعمال و افکار ایک ایسی قوت کا نتیجہ ہیں جو انتظام عالم کے پیچھے ہے یعنی یہ کہ انسانی اعمال خود اس کی عادت اور طبیعت سے پیدا نہیں ہوئے۔

کانٹ کا عقیدہ آزادی عمل کے بارے میں ان سب سے نرالا ہے یعنی یہ کہ عالم محسوسات و عالم ادراک کے ایک دوسرے سے ممیز ہونے کے سبب انسان کی فطری قوت ارادی کو کوئی آزادی حاصل نہیں بلکہ وہ محض جذبات و شعور و خواہشات جو ہماری تجارب و محسوسات کا خاصہ ہیں ان سے ماخوذ ہیں۔ با ایں ہمہ کانٹ نے عالم موجودات کے ساتھ جو کہ چند اصول و مشاہدات پر موقوف ہیں۔ ایک عالم ادراک کو فرض کیا ہے جس کے اندر انسان کو لا متناہی قوت ارادی حاصل ہے جو اخلاقی احکام کو بلا چون و چرا بجالانے کیلئے آزاد ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ وہ عقلاً اس ضرورت کو تسلیم کرتا ہے کہ اس طبیعت کے اعلیٰ قانون آزاد ہیں۔

بے محل نہ ہوگا اگر اس سلسلہ میں مہاتما بدھ کے خیالات جو رائس ڈیوڈس نے اپنی کتاب میں نقل کئے ہیں یہاں پیش کئے جائیں "مذہب کی تمام شاخوں کا متفق علیہ عقیدہ ہے کہ غم کی پیدائش اور تشخص کی پیدائش بالکل ایک ہے۔ غم حقیقت میں نتیجہ اس کوشش کا ہے جو کوئی فرد اپنے تئیں باقی موجودات سے جداگانہ قائم رکھنے کے لئے کرتا ہے۔ حالانکہ ترکیب و تحلیل کے عام قانون سے انسان و فرشتے کوئی مستثنیٰ نہیں۔ قوتوں کا وہ مجمع جو کسی موجود کو ترکیب دیتا ہے جلدی یا دیر میں منتشر ہو جائیگا اور اس انتشار میں توقف ڈالنے کی کوشش وہ چیز ہے جس سے تمام قسم کے غم اور ہر طرح کی تکالیف پیدا ہوتی ہیں، جوں ہی کوئی فرد باقی موجودات سے جدا ہوتا ہے، مرض و زوال اور موت اس پر عمل کرنے لگتے ہیں۔ غرض جہاں تشخص ہے وہاں ضرور حد ہوگی۔ اور جہاں حد ہے وہاں جہالت ہوگی اور جہاں جہالت ہے وہاں غلطی ہوگی۔ اور جہاں غلطی ہے وہاں غم ہوگا۔ جونہی کوئی ہستی موجود ہونے لگتی ہے بیرونی دنیا اس پر اس کے چھ حواس کے راستہ سے اثر کرنے لگتی ہے اور اس سے حواس کو تحریک ہوتی ہے اور اس تحریک سے محبت یا نفرت کے خیالات موجزن ہوتے ہیں۔ اور آرزوؤں کو برلانے کی خواہش پیدا ہوتی ہے مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس ہستی کے لئے آرزوؤں کا پورا کرنا ناممکن ہوتا ہے یعنی جسکو چاہتی ہے اس سے نہیں مل سکتی اور جس سے نفرت ہے اس سے بچ نہیں سکتی۔ اور بغیر قطع و برید اور بالآخر موت سے گریز نہیں کر سکتی اور یہ سب کچھ لازمی نتیجہ اس کوشش کا ہے جو اپنی جداگانہ ہستی اور اپنے تشخص کو برقرار رکھنے کے لئے کی جاتی ہے۔"

بقول پروفیسر محمود علی (جن کی کتاب سے اوپر کا اقتباس نقل کیا گیا ہے) اس تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ سب تکلیفیں اور تمام برائیاں وجود خارجی کے سبب سے ہیں اور ان سے نجات جب ہی ہو سکتی ہے کہ وجود کی خواہش کو دور کیا جائے اور اس توحید کی نسبت پروفیسر ڈیوڈز لکھتے ہیں کہ ان تمام کوششوں میں جو اس موضوع کے لئے کی گئی ہیں اگر یہ سب سے زیادہ مکمل نہیں تو سب سے زیادہ چسپاں ضرور ہے۔ اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ الہام نے اس مشکل کو کیوں کر حل کیا ہے۔ سو قرآن میں ایسی بہت آیتیں ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہدایت و ضلالت دونوں خدا کی طرف سے ہیں۔ آدمی کے اختیار کی بات نہیں۔ جیسے انک لا تھدی من احببت ولکن اللہ یھدی من یشاء (تم جس کو چاہو ہدایت

نہیں دیکھتے بلکہ اللہ جسکو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے) "یضل من یشاء ویھدی من یشاء" (جس کو چاہتا گمراہ کرتا اور جس کو چاہتا ہدایت دیتا ہے) "فمن یھدی من اضل اللہ" (تو جسکو خدا گمراہ کرے اس کو کون راہ راست پر لا سکتا ہے) "ختم اللہ علی قلوبھم وعلی سمعھم وعلی ابصارھم غشاوۃ" (ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اللہ نے مہر لگادی ہے اور انکی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے" اولئک الذین لعنھم اللہ فاصمھم واعمی ابصارھم" (یہی لوگ ہیں جن پر خدا نے لعنت کی اور ان کو بہرا اور ان کی آنکھوں کو اندھا کر دیا) اس طرح ایسی بھی آیتیں ہیں جنسے آدمی کا با اختیار رہنا بھی پایا جاتا ہے مثلاً "ان تکفروا انتم ومن فی الارض جمیعًا فان اللہ لغنی حمید" (اگر تم اور جتنے لوگ روئے زمین پر ہیں وہ سب کے سب مل کر بھی خدا کی ناشکری کرو تو خدا کو پرواہ نہیں کیونکہ وہ بے نیاز و سزاوار حمد ہے)" ونفس وما سوٰھا فالھمھا فجورھا وتقوٰھا" (انسان کی اور اس کے ذات کی قسم جس نے اس کو ایسا درست بنایا پھر اس کی بدکاری اور پرہیزگاری دونوں باتیں اس کو سمجھا دیں) "انا ھدینٰہ السبیل اما شاکرا واما کفورا" (ہم نے اس کو راستہ دکھایا پھر یا تو وہ شکر گزار ہیں یا ناشکر) "فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر" (بس جو چاہے مانے جو چاہے نہ مانے) "بل الانسان علی نفسہ بصیرۃ ولو القی معاذیرہ" (بلکہ خود انسان اپنے مقابلے میں حجت ہے گو وہ بہانے پیش کیا کرے۔

دونوں قسم کی آیتوں کو مطابق کرنے سے تقدیر کے متعلق اسلام کا عقیدہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان میں وہ تمام قوائے ادراک موجود ہیں جو اس کو فاعل با اختیار بنانے کے لئے کافی ہیں۔ اس سے جو برائیاں سرزد ہوتی ہیں وہ یا تو ان برائیوں کو برائیاں نہیں جانتا اور یا جانکر اپنے جذبۂ خود غرضی سے مغلوب ہوکر اس پر عمل کرتا ہے۔ اور یا اسکی طبیعت ہی اس قسم کی بنائی گئی ہے کہ وہ خواہ مخواہ برائی کرے جیسے عادی مجرم۔ آخری صورت علم نفسیات وعلم حیوانات کے روسے نسلی اور توارثی اثرات کے ماتحت آکر آئین کو بھی تقدیر کے چکر میں ڈالدیتی ہے۔ بعض بچے پیدائشی کند ذہن وغبی ہوتے ہیں۔ جنپر تعلیم کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ جرائم پیشہ قوموں کی اولاد نسلی اور ماحولی اثرات سے پیدائشی مجرم ہوتے ہیں۔ بعض بچے پیدائشی ذہین ہوتے ہیں اور بعض اصحاب کی جو متقی و پرہیزگار ہوتے ہیں انکی اولاد پیدائشی نیک ہوتی ہے۔ لیکن اگر بچے کو اپنی فطرت پر چھوڑ دیا جائے تو یہ یقینی امر ہے کہ بعد کو اس کے ماحول ونسلی اثرات یا پیدائشی صفات عمل و تدبیر سے زائل ہوجائیں۔ اس لئے پہلی صورت خدا کے تقدیر کی ہے اور دوسری صورت انسانی تدبیر کی۔ اور دونوں لازم وملزوم ہیں۔ اور اپنی جگہ دونوں آیتیں الہام کی صحیح ہیں۔ مگر سزا و جزا کی منصفی کا مسئلہ پھر بھی حل نہیں ہوتا۔ یہ ضرور ہے کہ دنیا کا قاضی یا مجسٹریٹ ایک عادی نقب زن کی "تقدیر" کی صفائی قبول نہیں کر سکتا مگر کیا یہ کلیہ آسمانی قضا پر بھی صادق آتا ہے۔ اگر ہے تو وہ انصاف نہیں۔

یہ مشکل دراصل آسمانی سزا و جزا کو دنیاوی سزا و جزا پر متماثل ومحمول کرنے سے پیش آتی ہے ورنہ اگر غور سے دیکھا جائے تو مذہب کا یہی ایک "مسئلہ تقدیر" آسمانی سزا و جزا کی نوعیت کو بالکل بدل دیتا ہے اور معاد کے عنوان میں جو ہم نے آخر میں علامہ شبلی اور الغزالی کے قول سے سزا و جزا آسمانی کی کیفیت دکھلائی ہے وہی درحقیقت آخرت کی سزا و جزا ہے۔ اور یہ صورت صرف تقدیر کے مسئلہ سے قوی ہوجاتی ہے۔ لہذا سزا و جزا کے مسئلے کو فطرت اسلام کے مطابق سمجھنے کے لئے ضرور ہے کہ تقدیر کے مسئلے پر غور کیا جائے

امداس واسطے اس عنوان کی ضرورت پڑی ورنہ عملی مذہب کے لئے یہ مسئلہ نہ ایسا ضروری تھا اور نہ اسپر گفتگو کرنا کوئی مفید مطلب پیدا کر سکتا تھا۔ خلاصہ یہ ہے کہ انسان فعل سے اپنے لئے آپ دوزخ پیدا کرتا ہے جسکے لئے ایک معمولی سی مثال ہے لوگو کہ متانت مضمون میں ایسی گندگی کی مثال سے طبیعت مکدر ہوتی ہے۔ زنا ایک برا فعل ہے انسان نادانی یا اپنے جذبہ سے مغلوب ہوکر یہ فعل بد کرتا ہے۔ یہ مت کہو کہ اگر خدا چاہتا تو اس کو اس برائی سے بچا سکتا یہ ایسے اسرار ہیں جنپر کلام کو طول نہ دینا چاہئے ہم کو صرف یہ دیکھنا ہے کہ خواہ یہ فعل انسان کا اختیاری ہو یا مجبوری۔ اس کا نتیجہ سزا کی صورت میں ملتا ہے۔ وہ یہ ہو کہ اکثر اوقات اس کو بہت ہی ہولناک بیماریاں لگ جاتی ہیں۔ پس اس کو سزا کس نے دی۔ خود اس کے فعل نے۔ اسیطرح اور برے افعال کو لو مثلاً شراب۔ جوا ــ بعض برائیوں کا اثر اگر بہت جلد پیدا نہیں ہوتا (مثلاً چوری غبن وغیرہ) تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری زندگی نامکمل ہے لیکن ہماری روح اس فعل سے ضرور خراب ہو گئی جسکا ہم کو علم نہ ہو۔ مگر دوسری زندگی میں ضرور اسکے نتائج معلوم ہوں گے اور حیات بعد الممات زندگی کا ایک سلسلہ ہے۔ اور بہشت دوزخ درحقیقت ہمارے نیک و بد اعمال کے نتائج ہیں وہ خدائی انتقام کی جگہ ہرگز نہیں۔ یہ ہے اسلامی سزا و جزا کا خیال۔ اور اب تو دنیاوی سزا و جزا نے بھی انتقام کی صورت کو ملحوظ رکھنا چھوڑ دیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اگر ہم خدا کو منتقم تصور کریں تو تقدیر کے متعلق جتنی آیتیں قرآن میں ہیں سب بے معنی ہو جاتی ہیں لیکن اگر خدا کو دانا و بینا و رحیم و کریم جانیں تو تقدیر اور تدبیر کی دونوں آیتیں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں

سید مقبول احمد

صدائے شکست

(افسانہ)

(بسلسلۂ ماسبق)

صبح کا وقت ہے۔ ایک وسیع بارہ دری کے صحن میں بہت بڑا شامیانہ قایم کرکے ایک طرف تخت بچھائے گئے ہیں، جن کے چاروں طرف کرسیوں پر ارباب فن امتحان مقابلہ کے لئے بیٹھے ہوئے ہیں تختوں کے سامنے ججوں کی کرسیاں ہیں، جن کے داہنے جانب اخباروں کے نمایندے ہیں اور بائیں طرف لاسلکی ریڈیو کے آلات رکھے ہوئے ہیں۔ شامیانے کے نیچے کی تمام کرسیاں تماشائیوں سے پر ہوگئی ہیں، کیونکہ جلسہ کا آخری دن ہے اور آج ہی فیصلہ ہونا ہے کہ تمغہ و اعزاز کا مستحق کون ہے۔ لمبر راؤ نے خود عملی حصہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لئے گویا اب فیصلہ صرف راجکمار اور رجنا بائی کے درمیان ہونا تھا۔ یہ دن انھیں دونوں کے امتحان و مقابلہ کیلئے مخصوص تھا اور ہر شخص اپنی جگہ بیتاب تھا کہ کسی طرح جلد یہ منظر سامنے آئے اور نتیجہ ظاہر ہو۔

رجنا بائی اپنی تمام اُن سادگیوں کے ساتھ جن میں ساری دنیا کی رعنائیاں سمٹ کر آجاتی تھیں ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی اور چونکہ وہ خود بھی ایک حد تک خائف تھی کہ مبادا راجکمار بازی لیجائے، اس لئے وہ کوشش کر رہی تھی کہ موسیقی کے علاوہ اپنی نسائیت سے بھی کام لے اور اپنے شباب کی ان خوش ادائیوں کو بھی صرف کرے، جن کا استعمال اس وقت تک اس نے ایک آخری حربہ کی صورت میں محفوظ رکھ چھوڑا تھا۔ اس کے وہ لانبے، سیاہ چمکدار بال جو نعمی پرور سرزمین بنگال کا بہترین ہدیہ عورت کیلئے سمجھا جاتا ہے، صنعت آرائش کی ہر نازک تکمیل کے ساتھ آراستہ کئے گئے تھے اور اس کا وہ خوبصورت جوڑا جو صحیح معنے میں "گرہ شب" کا مفہوم پیش کرتا تھا۔ جوہی کے نازک پھولوں کے ہار میں لپٹا ہوا ایسا نظر آتا تھا جیسے آبنوس میں ہاتھی دانت کے پھول بنا کر جڑ دیئے ہوں۔

اس کے سانولے رنگ میں یوں تو ہمیشہ جوانی کا خون ایک ہلکا سا سرخ غازہ بنا رہتا تھا، لیکن اس وقت جوش مسابقت کے جذبہ نے ایک عجیب قسم کی دلآویز چمک بھی پیدا کر دی تھی اور اس کی پیشانی کی وہی سرخ بیندی جو پہلے بالکل نمایاں رہتی تھی اب چہرہ کی سرخی میں گھلی ملی نظر آتی تھی۔ اس کی ساری نہایت سادہ لیکن قیمتی ریشم کی تھی جس کے کناروں پر ہلکی سی زردیں بیل اس کے ملیح رنگ پر خاص قسم کی چھوٹ پیدا کر رہی تھی، اس کے ہات کہنیوں تک عریاں تھے جنسے انتہائی تناسب ٹپکا پڑتا تھا وہ سارے مجمع کو اس وقت بے نیازانہ نگاہ سے نہیں دیکھ رہی تھی بلکہ اس میں التجا تھی، دعوت رحم تھی، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی کسی کمزوری کی تلافی اس ادا سے کرنا چاہتی ہے۔ دوسری طرف راجکمار بھی بیٹھا ہوا تھا، لیکن بے انتہا مسرور و شادکام اس کے چہرہ سے کوئی ہلکا سا ہلکا خوف بھی نتیجہ کے متعلق ظاہر نہ ہوتا تھا۔

جلسہ کے صدر آگئے، ججوں کی جماعت آگئی اور ٹھیک ۸ بجے مقررہ پروگرام کے مطابق رجنا بائی سرود لئے ہوئے کرسی سے

اٹھی اور چوکیوں کے فرش پر جاکر اپنے اُس مخصوص انداز سے بیٹھ گئی، جو اس کو خود موسیقی کی تصویر بنا دیتا تھا۔

مقابلہ صرف ٹوڑی کے خیال میں تھا اور سرود نوازی میں ایک ایک گھنٹہ رجنا بائی اور راجکمار کو دیا گیا تھا جس میں سے نصف گانے کے لئے اور نصف صرف سرود بجانے کے لئے مقرر تھا۔ رجنا نے پہلے سرود شروع کیا اور ایسے ہلکے و نرم انداز سے کہ ایک ایک بول کی شیرینی الگ الگ نمایاں ہو رہی تھی، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کہیں دور کوئی رقص کر رہا ہے اور کبھی کبھی جب اس کا پاؤں ذرا قوت سے زمیں پر پڑ جاتا ہے تو گھنگھرو کی آواز یہاں بھی پہونچ جاتی ہے۔ اس کے بعد اس نے آہستہ آہستہ اپنی اونگلیوں کی رفتار کو تیز کرنا شروع کیا۔ اور ایسی خوبصورت گت شروع کی جس میں موسیقی سے زیادہ کیفیات رقصیہ کو نمایاں کیا گیا تھا اور زخمہ کی ہر ضرب جو کبھی مسلسل اور کبھی تھوڑے تھوڑے وقفوں کے ساتھ تاروں میں جنبش پیدا کر دی تھی ایک ایسا سماں، ایک ایسی لطیف کیفیت پیدا کر رہی تھی جو اس دنیا کی فضاسے باہر کی چیز معلوم ہوتی تھی اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ موسیقی، قطرہ قطرہ ہو کر تاروں پر ٹپک رہی ہے اور اس کا سلسلہ سننے والوں کے ریشہ ریشہ میں اک موج اضطراب پیدا کر رہا ہے۔ لیکن جب اس کے بعد اُسنے اپنی پوری قدرت کا اظہار کیا اور اس کے پچھلے ہاتھ کی لانبی نازک اونگلیاں پوری تیزی کے ساتھ دوڑنے لگیں تو پھر اس نے خیال انسانی کو مسحور کرنا شروع کیا اور آدھ گھنٹے کے اندر اس نے سننے والوں کی قوت تحسین و اعتراف کو بھی مجروح کر کے رکھدیا۔

سرود سے فارغ ہونے کے بعد اس نے گانا شروع کیا اور چونکہ وہ اپنے کمال کا رنگ قائم کر چکی تھی، اس لئے حقیقت یہ ہے کہ کسی کو تنقید کا یارا ہی باقی نہیں رہا اور ہر شخص اپنی جگہ پہلے ہی یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ جس کی اونگلیاں ایسے نادر نقوش موسیقی پیدا کر سکتی ہیں، اس کی آواز پر تنقید کرنا بیکار ہے۔ آدھ گھنٹہ کے اندر وہ جتنی کیفیات اپنی آواز کے نشیب و فراز اور اس کے تنوع سے پیدا کر سکتی تھی، وہ سب اُسنے جلدی جلدی اس طرح سمیٹ کر پیش کر دیں کہ ہر شخص مبہوت ہو کر رہگیا اور وقت کے اختتام پر وہ مجمع کی سامعہ شکن تالیوں کی آوازیں اٹھکر اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئی۔

اس کے بعد ہر شخص کی نگاہ راجکمار کی طرف اٹھی اور وہ ایک ایسے انداز کے ساتھ جسمیں خدا جانے کتنا اطمینان و سکون شامل تھا، اُٹھکر سامنے آیا اور بغیر کسی انتظار کے اس نے گانا شروع کیا۔ مجمع کا ہر فرد جو کچھ بھی اس سے واقف تھا سمجھ رہا تھا کہ ہر چند رجنا نے کوئی دقیقہ کوشش کا اٹھا نہیں رکھا، لیکن وہ دلآویزی، و دلسوزی جو راجکمار کی آواز کا مخصوص حصہ ہے۔ یقیناً رجنا سے اسے بڑھا دیگی۔ لیکن جس وقت اس نے پہلی آواز نکالی، تو مجمع کا ہر شخص دوسرے کو دیکھنے لگا اور غور سے دیکھنے لگا کہ راجکمار ہی ہے یا کوئی اور شخص۔ اس کی آواز نہایت بھیانک تھی اور بے سُری، اس کا گلا اس قدر بیٹھا ہوا تھا کہ اس سے بمشکل کوئی بول صاف نکلتا تھا اور کوئی سُر اپنے مخرج سے صحیح ادا نہ ہوتا تھا وہ برابر گاتا رہا، نہایت خوش خوش گاتا رہا اور جس قدر زیادہ وہ اپنی بدآوازی اور بے تالے پن سے بھد بجا سکتا تھا، اس نے بھونچائی اور اپنا وقت ختم کر کے وہاں سے اٹھ گیا۔ راجکمار سیدھا اپنے گھر گیا، لیکن وہاں پہونچکر اُسے معلوم ہوا کہ کسی نے قفل توڑکر اس کا سارا اسباب چرا لیا اور ایک

کاغذ کا پرچہ تک نہیں چھوڑا، وہ اپنی بے سروسامانی کی اس تکمیل سے غمگین نہیں ہوا اور تھوڑی دیر تک مکان کے ہر حصہ پر آخری نگاہ ڈالتا ہوا چلا گیا۔

جلسۂ موسیقی میں راجکمار کی ناکامی اور اس کے دفعتہً غائب ہوجانے کے بعد چند دن تک اس کے حلقۂ احباب، میوزک کالج اور شہر کے خاص خاص انجمنوں میں بہت چرچا رہا اور کسی کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ اس انقلاب کا سبب کیا تھا۔ بعض کہتے تھے کہ کسی دشمن نے اس کو کچھ کھلا دیا جس سے اس کی آواز بیٹھ گئی، لیکن پھر یہ بات سمجھ میں نہ آتی تھی کہ اگر گلا بیٹھ ہی گیا تھا تو وہ تال سُر کو کیوں بھول گیا۔ ملہر راؤ خود بہت حیران تھا۔ اور رجنا بائی جو اس واقعہ سے بہت خوش تھی، سمجھتی تھی کہ یہ سزا ہے اس غرور کی جو فطرت کی طرف سے تجویز کی گئی ہے۔

ہر چند اسے انعام ملا، تمغہ دیا گیا۔ اس کی تصاویر مختلف اخباروں میں شائع ہوئی۔ ہدایا و تحایف کا ڈھیر لگ گیا اور جس امتیاز کے لئے وہ بیقرار تھی اسے حاصل ہوگیا، لیکن وہ خود بھی اُس کو سمجھتی تھی کہ اس قدر آسانی کے ساتھ حاصل ہوجانے والا اعزاز حقیقتاً کوئی اعزاز نہیں ہے۔ اور ملہر راؤ کو تو اس قدر افسوس تھا کہ اُس نے انعام دئے جانے کی تجویز کو ملتوی ہی دینے کی تحریک پیش کردی تھی۔ لیکن رجنا بائی کی خوش قسمتی سے منظور نہیں ہوئی۔

اس واقعہ کو ایک زمانہ گزر گیا۔ اور گردش زمین نے جو دنیا کے بڑے سے بڑے واقعہ کے نشانات بھی بغیر محو کئے ہوئے نہیں چھوڑتی، اس واقعہ کو بھی لوگوں کے خیال سے مٹا دیا اور راجکمار کا نام بھی لوگوں کے ذہن سے قریب قریب اُتر گیا۔

رجنا بائی اَب میوزک کالج میں ایک پروفیسر کی حیثیت سے کام کرتی تھی اور چونکہ اب اس کا کوئی مقابل موجود نہ تھا اس لئے مسلمہ طور پر بہترین ماہر فن سمجھی جاتی تھی۔ ایک اتوار وہ حسب معمول گزری میں پرانے کتبے، قدیم تصاویر اور قلمی کتابوں کی جستجو کر رہی تھی کہ اس کو چند انگریزی کی کتابیں ایسی ملیں جن پر راجکمار کے دستخط ثبت تھے، اس نے جلدی سے ان کتابوں کو اٹھایا اور دیکھنے لگی، لیکن اس کے حیرت کی انتہا نہ رہی، جب اس نے ہر کتاب میں سیکڑوں جگہ اپنا نام لکھا ہوا دیکھا، کہیں اس طور سے جیسے کسی نے خاص ذہن میں اس کے نام کی مشق کی ہے اور کہیں اس طرح کہ لکھنے والے کا خاص مقصد و ارادہ اور مخصوص جذبہ ظاہر ہوتا تھا۔

شیکسپیر کے مجموعۂ نظم میں جہاں اس کا یہ مصرعہ تحریر تھا کہ:-

"I am slain by a fair cruel maid"

وہیں آخری لفظ کے بعد بریکٹ میں (رجنا بائی) کا نام درج تھا۔ اسی طرح اور بہت سی عاشقانہ نظموں کے ساتھ راجکمار نے رجنا کا نام انتہائی ذوق و شوق کے ساتھ لکھا تھا۔ اس نے ان کتابوں کو علیحدہ کرکے رکھدیا اور دیر تک کھڑی سوچتی رہی، محویت کے عالم میں تمام گزشتہ واقعات پر غور کرنے لگی۔ اور ایسا محسوس کرنے لگی گویا راجکمار دور سے کھڑا ہوا باچشم نم آلود اس کی بیکسی

دسنگدل ہونے پر ملامت کر رہا ہے۔ رجنا کی نگاہوں سے پردہ سا اٹھتا جارہا تھا اور جس قدر وہ زیادہ غور کرتی جاتی تھی اسیقدر اس کا تاثر بڑھتا جاتا تھا۔

اس نے دوکاندار سے دریافت کیا کہ یہ کتابیں کہاں سے ملیں، لیکن وہ کوئی صحیح حال نہ بتا سکا، کیونکہ اس کے یہاں پرانی کتابوں کا ڈھیر تھا اور مختلف ذرائع سے اس کو حاصل ہوتی تھیں۔ رجنا نے دریافت کیا کہ کیا ان کتابوں کے ساتھ اور کتابیں بھی موجود ہیں، اس نے کچھ سوچکر کہا کہ ہاں ہیں اور اندر سے کچھ جلدیں لاکر اور سامنے ڈالدیں۔ رجنا نے بغیر دیکھے ان سب کو لے لیا اور گھر جاکر خلوت میں سب کی ورق گردانی شروع کی۔

یہ دیکھ کر کہ کوئی کتاب ایسی نہ تھی جسمیں راجکمار نے اپنے نقوش محبت نہ چھوڑے ہوں، وہ سخت حیران و متاثر تھی کہ دفعتہً اس کی نگاہ ایک بوسیدہ سی بیاض پر پڑی، اس کو اٹھایا تو معلوم ہوا کہ راجکمار کی ڈائری تھی۔

یوں تو اس ڈائری میں گزشتہ دس سال کے تاثرات اس کے درج تھے۔ لیکن سب سے زیادہ طویل حصہ اس زمانہ کے لئے وقف تھا جو میوزک کالج میں بسر ہوا تھا، اس حصہ کا کوئی صفحہ، کوئی سطر ایسی نہ تھی جو رجنا کے ذکر سے خالی ہو۔ اس ڈائری کا آخری اندراج وہ تھا جسے سلیم کی گفتگو کے بعد اس نے تحریر کیا تھا اس نے لکھا تھا:۔

"سلیم کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ رجنا بائی خائف ہیں کہ کہیں مقابلہ میں اُن کو شکست نہ حاصل ہو، اور بے قوف سلیم اس توقع پر مسرور ہے کہ میں رجنا بائی کے اس اندیشہ کو پورا ہونے دونگا۔ خیر رجنا بائی کو تو ضرورت نہ تھی کہ وہ میری خاموش محبت کے جذبات کا اندازہ کرنے کی زحمت گوارا کریں، لیکن کیا ساری دنیا بیوقوف ہوگئی ہے۔ وہ اگر میری خاموشی کی تاویل میرے خلاف کرتی ہیں تو یہ ان کی محبوبیت ہے جسپر میرا جان دیدینا بھی، میرے جذبۂ ایثار و قربانی کی تسکین نہیں ہو سکتا۔ لیکن اور لوگ کیوں نہیں سمجھتے، کیا دنیا اُسی حقیقت کا اعتراف کرتی ہے جسے حقیقت کہکر پیش کیا جائے کیا سکوت و خاموشی صداقت کے لئے ایسا گہرا پردہ ہے جس کو عقل انسانی کبھی نہیں اُٹھا سکتی۔

میں اور رجنا بائی کے مقابلہ پر آؤں! جو دل محبت سے معمور ہو، جس دل کا ریشہ ریشہ الفت سے بھرا ہوا ہو اسمیں تاب مقاومت کہاں! رجنا بائی اگر مجھے اپنا حریف سمجھتی ہیں، تو اس سے زیادہ میری بدبختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ انہوں نے اعتراف کو انحراف اور پرستش کو پندار خیال کیا۔ اگر مجھے پہلے سے اس کا علم ہوتا تو شاید میں کوشش کر سکتا کہ یہ خیال ان کے دل سے نکل جائے لیکن ایسے تنگ وقت میں کیا کر سکتا ہوں۔ سوائے اس کے کہ کانفرنس میں شریک نہ ہوں۔ لیکن یہ صورت مناسب نہیں کیونکہ اس طرح رجنا بائی کو وہ خوشی نہیں ہو سکتی جو حریف کو شکست دینے کی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے۔ اچھا تو پھر مجھے قصداً خراب گانا چاہئے، تال و سر سے ہٹکر خلاف اصول تان لیکر گانا چاہئے۔ مگر میں اس وقت یہ ارادہ تو کر رہا ہوں۔ ممکن ہے کہ کل وقت پر کوئی جذبہ اور میرے اندر پیدا ہو اور میں اسپر عمل نہ کر سکوں اس لئے ضرورت ہے کہ اپنی آواز ہی کو ہمیشہ کے لئے تباہ کر دوں، اپنے گلے کو بیکار کر دوں تاکہ

نہ اب اور نہ کبھی رجنا بائی کے مقابل آنے کی جراءت کر سکوں۔

اس کے لئے تھوڑا سا سیندور اور سرمہ غالباً کافی ہوگا۔ سرمہ تو ہے لیکن سیندور بازار سے لانا ہوگا۔ بہرحال فیصلہ ہو چکا کل اسی خراب آواز کے ساتھ جلسہ میں شریک ہونگا۔ اور رجنا بائی کے سامنے اپنے آپ کو حقیر و ذلیل کر کے اپنی شہرت و عزت کی قربانی کر کے گھر چلا جاؤنگا"

رجنا بائی نے ڈائری کی یہ عبارت پڑھنے کو تو پڑھ لی لیکن اس کے بعد جو حالت اس کی ہوئی اس کا بیان مشکل ہے۔ وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی، اس کا جسم کانپنے لگا، اس کا دل اس طرح دھڑکنے لگا گویا وہ اپنی آخری ضربات صرف کر رہا ہے، اس کے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور اس کا دماغ بالکل سُن ہو کر رہ گیا۔ وہ اپنے جذبات کو نہ سمیٹ سکتی تھی نہ بڑھنے دے سکتی تھی، اس کی حالت بالکل اس کشتی کی سی تھی جو طوفان میں بالکل گھر گئی ہو اور سیلاب کے رحم پر چھوڑ دی گئی ہو۔ اگر اس وقت اس کو کوئی دیکھتا تو اس کے دیوانہ ہونے کا یقین کر لیتا، وہ کبھی اٹھتی تھی اور کبھی بیٹھتی تھی، کبھی ٹہلنے لگتی تھی اور کبھی خاموش کھڑی ہو جاتی تھی، نہ بات ملنے سے اُسے تسکین ہوتی تھی۔ نہ سر پکڑ کر رہ جانے سے، وہ انگاروں پر لوٹ رہی تھی، سوئیوں کے بستر پر تڑپ رہی تھی اور اس کی روح کی جراحتوں کا یہ عالم تھا جیسے کسی ریشمی کپڑے کو کانٹوں میں الجھا کر کھینچ لیا جائے، وہ ایسا محسوس کر رہی تھی کہ اس نے قتل سے زیادہ سنگین جرم کیا ہے اور جب تک اُس کی سزا نہ مل جائے گی اس ضمیر کو سکون نہیں میسر آسکتا۔ اس نے سرود کو جو میز پر رکھا تھا اٹھا کر پٹک دیا، اس کے تار توڑ ڈالے، جو تمغہ اسے ملا تھا اُس نے الماری سے نکال کر اُس کو پھینک دیا، جب اس کیفیت کے فرو ہونے کے بعد اس کو کچھ سکون ہوا تو اس نے رونا شروع کیا اور اس بچہ کی طرح جس کو سوتیلی ماں گھر سے باہر نکال کر دروازہ بند کر دے، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، اور جب وقت پہلا سیل اشک بہا چکی تو وہ بالکل مبہوت و حیران تھی اور ایسی بے معنی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی گویا زمین و آسمان میں سناٹا ہے، کائنات انسان ہے اور یہ بزم عالم یکسر ویران۔ اس کی حالت اُس شمع صباحی کی سی تھی جسے اہل محفل ایک کونہ میں جلتا ہوا چھوڑ گئے ہوں تاکہ وہ گھل گھل کر صبح تک ختم ہو جائے۔

راجکمار کی ایک ایک ادا جس میں پہلے اس کو سوائے عزور و عناد کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا، اب یکسر شعلۂ عشق ہو کر اس کے سامنے آ رہی تھی اور وہ بیتاب تھی کہ ہزار جانیں بھی ہوں تو ایک ایک کر کے وہ سب کو ان پر نثار کر دے۔ لیکن جب دیکھتی تھی کہ نہ راجکمار موجود ہے اور نہ اس کی وہ ادائیں تو پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے پر مجبور ہوتی اور جس قدر ضبط سے کام لیتی، اتنا ہی درد کرب اس کا بڑھتا۔ الغرض کامل دو دن تک اُس نے اسی بیقراری میں بسر کئے اور جب کسی طرح اُس کو چین نہ ملا تو وہ بھی بغیر کسی اطلاع کے اسی طرح غائب ہو گئی جس طرح دو سال قبل راجکمار لاپتہ ہو گیا تھا۔

گزشتہ واقعہ کو بھی ایک سال کا زمانہ گزر گیا اور رجنا بائی کی تمام جستجوئیں بیکار ثابت ہوئیں اس کا پہلے خیال تھا کہ راجکمار اپنے گانوں میں ملیگا، لیکن وہاں پہونچکر اسے معلوم ہوا کہ دو سال قبل صرف ایک دن کے لئے وہ یہاں آیا تھا لیکن

نہ کسی سے بات کی اور نہ یہ بتایا کہ کیوں واپس آگیا ہے اور پھر دوسرے دن غائب ہوگیا، اس کے والدین نے بھی بہت کوشش کی مختلف مقامات میں جہاں اس کے جانے کا امکان تھا آدمی بھیجے گئے، لیکن کہیں اس کا نشان نہ ملا - چونکہ راجکمار اپنے والدین کا اکلوتا لڑکا تھا اس لئے رجنیا بائی ان کی داستانِ درد کو سنکر اور بے تاب ہوگئے اور اس کی ضمیر پر ایک اور یہ بار بھی ہوگیا کہ اس نے صرف راجکمار ہی کی زندگی تباہ نہیں کی بلکہ خاندان کے خاندان کو برباد کردیا ہے وہ اپنے آپ کو اب اس قدر ذلیل سمجھنے لگی تھی کہ راستہ سے گزرنے والا کتا بھی اس کو خوش قسمت معلوم ہوتا تھا اور وہ رشک کرتی تھی کہ کیوں نہیں جیونٹی ہوئی کہ بغیر کسی گناہ کا بوجھ لئے ہوئے پامال ہوجاتی۔

وہ راجکمار کے گانوں سے نکل کر ہندوستان کے کس کس گوشہ میں پھری، کہاں کہاں راجکمار کی جستجو کی اور اپنے گناہ کے کفارہ میں کن کن صعوبتوں کی برداشت کیا، اس کا بیان مشکل ہے لیکن غالباً اس قدر اظہار ضروری ہے کہ ایک سال کے اندر اس نے ایک دن کے لئے بھی آرام نہیں کیا اور شہروں کی گلیوں میں، چٹیل میدانوں میں، جنگلوں کی جھاڑیوں میں، پہاڑوں کے غاروں میں، ساحل کے جھونپڑوں میں ہر جگہ وہ راجکمار کو پکارتی پھری، لیکن اس دیوانی کی فریاد سننے والا کہیں نہ ملا اور اس نے صحیح معنے میں وہ سوگ اپنے اوپر طاری کرلیا جس کا ذکر کہیں کہیں قدیم فسانوں میں نظر آجاتا ہے۔

متھرا کی تیرتھ کا میلا اپنی پورے شباب پر ہے، ہزاروں آدمی ہندوستان کے ہر ہر گوشہ سے کھنچکر اس شیام رنگ جیروا ہے کی طفلانہ جولانگاہوں کی زیارت کے لئے جمع ہورہے ہیں جو ظلم و استبداد کے خلاف اپنے بے نظیر قربانیوں اور جسارتوں کے نقوش پر تاریخ ہند کے صفحات میں مہر دوام ثبت کرگیا ہے -

ہزاروں فقیر، سادھو، پنڈت، جوتشی، اپنی اپنی کٹی میں آسن جائے، دھونی رمائے بیٹھے ہوئے ہیں، ساحل پر اپنے گناہوں کو دھونے کے لئے بیشمار مرد وعورت آجارہے ہیں، صبح کا وقت ہے مندر میں گھنٹہ اور ناقوس کی پرشوکت آواز فضا میں گونج رہی ہے سیکڑوں جاتری سر بسجود کرشن جی کی مورتی کے سامنے پڑے ہوئے گڑگڑا رہے ہیں، اور کسی کو دوسرے کی خبر نہیں کہ کس حال میں ہے - یہیں ایک کونہ میں ایک بھکارن بھی ہے جس کے جسم کا ملبوس تار تار ہے، جس کے پانوں زخمی ہیں اور بال الجھے ہوئے جس کا جسم سوائے ہڈیوں کے ڈھانچہ کے اور کچھ نہیں ہے، - یہ آنچل پھیلائے ہوئے زار قطار رو رہی ہے اور اپنی داستانِ درد کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے کرشن جی مہاراج کو سنا رہی ہے - کبھی روتے روتے جب ہچکیاں بندھ جاتی ہیں تو خاموش ہوجاتی ہے اور پھر جب کچھ ہوش آتا ہے تو وہی افسانہ دہرانے لگتی ہے -

اس کی آواز میں ایک درد ہے، اس کی آواز ایک فریاد ہے، اس کا ایک ایک لفظ تیر و نشتر ہے، اور بیکسی و بیچارگی کا وہ انتہائی منظر جو ایک قزاق کی شمشیر بکف ہاتھ کو بھی تھوڑی دیر کے لئے شل کردیتا ہے، اس کے سراپا سے ٹپک رہا ہے وہ اپنا تار تار دامن اپنے ٹھٹھرے ہوئے ہاتھوں پر پھیلائے ہوئے کرشن کی مورت کی طرف گریہ آلود آنکھیں جمائے ہوئے

اپنا دکھ کہہ رہی ہے کہ۔

"اے دکھیاری کے ساتھی، اے غریبوں کے سہارے میرے سر کے اوپر سے بھی پاپ کا یہ بوجھ اتار لو اپنی گوالنوں کا صدقہ، پاربتی جی کا تصدق میری روح کو بھی اس دہکتی ہوئی آگ سے بحال لو، کلیجہ پھٹا جاتا ہے لیکن پھٹ نہیں چکتا، دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا ہے، لیکن پاش پاش نہیں ہو چکتا جنگلوں میں تنہا راتیں میں نے گزاریں لیکن کسی درندے نے مجھے نہ پوچھا، صحرا کی جھاڑیوں میں پڑی رہی لیکن کسی سانپ نے مجھے آکر نہ ڈسا۔ پہاڑوں میں پھرا کی لیکن کہیں مجھے ٹھوکر نہ لگی کہ منہ کے بل گر کر مر جاتی۔ مجھ سے اب دنیا اور دنیا کی ایک ایک چیز بیزار ہے، میں خود اپنے آپ سے بیزار ہوں۔ میری روح خود مجھ سے نفرت کرتی ہے، لیکن کسی طرح یہ جسم کی لعنت، یہ زندگی کی تہمت مجھ سے الگ نہیں ہوتی۔ مجھے یقین ہے کہ اب اس دنیا میں مجھے اس سے ملنے کی امید نہیں جس سے ملنے کے بعد بھی میں زندہ رہنا نہیں چاہتی۔ میں نے یہ زندگی اس وقت تک صرف اسلئے گوارا کی کہ شاید وہ دیوتا مل جاتا جس کے سامنے اس کو قربان کر دینے کی تمنا ہے، لیکن اب نہ انتظار کی تاب ہے نہ جستجو کی سکت اس لئے میں اب تمہارے استھان پر آئی ہوں، اس امید پر نہیں کہ تم میری سن لوگے کیونکہ میں تو اس قدر پاپی ہوں کہ تمہارے چرنوں کو چھونے تک کی ہمت نہیں کر سکتی، بلکہ صرف یہ کہنے کہ اب ایک پاپ کی تکلیف دور کرنے کی تدبیر سوائے اسکے اور کچھ نہیں کہ دوسرا پاپ کروں اور وہ بھی تمہارے سامنے۔ تمہارے استھان کے نیچے تاکہ پرمیشر کے آگے بھی مجھے رحم کی التجا کرنے کی ہمت نہ ہو اور میری روح ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایسی ہی تڑپتی رہے۔"

یہ کہنے کے بعد اس نے اپنے آنسو پونچھے چہرہ پر سکون کی علامت پیدا ہوئی اور چڑھی ہوئی تیوریوں کے ساتھ نکل کر سیدھی دریا کی طرف گئی اور سب سے اونچے کنارے پر جا کر پانی میں کود پڑی۔

قریب ہی کی کٹی سے ایک نوجوان سادھو جو اشنان کرنے نکلا تھا اس نے اس کو کودتے ہوئے دیکھا اور ہجوم کو چیر کر اس کے بچانے کے لئے خود بھی کود پڑا۔ اب تماشائیوں کی بھیڑ لگ گئی تھی اور ہر شخص منتظر تھا کہ دیکھئے گنگا مائی ان دونوں میں سے کس کی قربانی قبول کرتی ہیں کہ کامل دس منٹ کے بعد وہ سادھو نکلا اس حال میں کہ ایک بیہوش عورت اسکی آغوش میں تھی اور وہ خود بھی تقریباً بیہوش تھا اتفاق سے اسوقت ایک ملاح کشتی لئے ہوئے جا رہا تھا وہ یہ منظر دیکھ کر پانی میں کودا اور سہارا دیکر اپنی کشتی پر لے آیا۔ تیرتھ کے مقامات پر ایسے واقعات غیر معمولی نہیں کہ ہر شخص اس طرف متوجہ ہو جاتا، اس واقعہ کا نتیجہ دیکھکر ہر شخص اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گیا اور کسی کو بھی یہ خبر نہ ہوئی کہ بچانیوالا کون تھا اور کس کو بچایا گیا۔ تیرتھ کا زمانہ ختم ہو گیا، جاتری اپنے اپنے گھر واپس چلے گئے لیکن اس غیر آباد مقام میں اس سادھو کی کٹی اب بھی آباد ہے اور رات کے سناٹے میں جب بھجن کی آواز یہاں سے نکل کر پھیلتی ہے تو گانوں کے بچے اپنی ماں کی لوریاں سننا چھوڑ دیتے ہیں، اور اسی آواز کو سنتے سنتے سو جاتے ہیں۔ راجکمار اور رجنا بائی اپنی اس زندگی سے خوش ہیں، لیکن یہ فیصلہ شاید اب بھی نہیں ہو سکا کہ ان دونوں میں بہتر آواز کس کی ہے، راجکمار کی شکست صدا کی یا رجنا بائی کے صدائے شکست کی۔

نیاز

شرط

(افسانہ)

روسی ادیب چیکوف جس مرتبہ کا افسانہ نگار تھا وہ کسی سے مخفی نہیں - اردو میں بھی متعدد افسانے آچکے ہیں، لیکن انگریزی سے، میں نے یہ افسانہ عربی سے لیا ہے - چیکوف کے انداز تحریر کا تتبع آسان نہیں - علی الخصوص اُسوقت جبکہ ترجمہ بھی اصل زبان سے نہ لیا گیا ہو - تاہم اس سے تھوڑا بہت یہ اندازہ ضرور ہو جائیگا کہ چیکوف کے افسانوں میں وہ کیا بات ہے جو یورپ کے دوسرے افسانہ نگاروں میں نہیں پائی جاتی - (نیاز)

موسم خریف کی ایک تاریک رات میں، ایک صرّاف اپنے کمرے میں بیتابانہ ادھر اُدھر ٹہل رہا ہے اور پندرہ سال قبل کی ایک رات کے واقعات اس کے سامنے ہیں جب اس نے بعض اپنے معزز دوستوں کی دعوت کی تھی اور دوران گفتگو میں بحث یہ چھڑ گئی تھی کہ قتل کی سزا قصاص مناسب ہے یا نہیں -

بعض نے اس طریق سزا کو مذہب و اخلاق دونوں کے منافی ظاہر کیا اور یہ رائے دی کہ قصاص سے بہتر حبس دوام ہے - یہ سنکر اس صراف نے کہا کہ "میں اس رائے کے موافق نہیں، ہرچند نہ مجھے حکم موت کے اثرات کا تجربہ ہے نہ حبس دوام کی تلخی کا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ قصاص مذہب و اخلاق کے مراعات سے زیادہ قریب ہے بہ نسبت حبس دوام کے - کیونکہ قصاص سے مراد ہے رشتۂ حیات کو دفعتہً قطع کر دینا اور حبس دوام قتل تدریجی ہے - پھر ہر شخص فیصلہ کر سکتا ہے کہ چند سکنڈ کے اندر موت کا آجانا بہتر ہے یا برسوں میں تھوڑا تھوڑا کر کے اس کو دعوت دینا"

ایک نے کہا "میرے نزدیک دونوں نامناسب ہیں، کیونکہ دونوں کی غرض ایک ہے یعنی وہی شعلۂ حیات کا بجھا دینا اور حکومت کوئی بھی ہو، بہرحال خدا تو ہے نہیں - اس لئے اس کو کسی ایسی چیز کے لینے کا کیا حق حاصل ہے جسے پھر وہ واپس نہیں کر سکتی"

انھیں مہمانوں میں سے ایک وکیل بھی تھا جس کی عمر ۲۴ سال کی تھی اس سے دریافت کیا گیا تو اسنے جواب دیا کہ "یقیناً دونوں سزائیں تہذیب و شائستگی کے منافی ہیں، لیکن اگر میرے سامنے یہ دونوں صورتیں پیش کی جائیں تو میں دوسری صورت کو اختیار کروں کیونکہ زندگی بہرحال زندگی ہے، خواہ وہ کسی حال میں بسر ہو اور انقطاع حیات سے بدرجہا بہتر"

چونکہ صرّاف ابھی نوجوان تھا اور فطرتاً اس کو جلد غصہ آجاتا تھا اس لئے جب گفتگو بڑھی تو اس نے میز پہ زور سے ہات مار کر وکیل سے کہا کہ "یہ بالکل لغو ہے اور کبھی نہیں مان سکتا - میں تمکو ۲۰ لاکھ روپیہ دینے کی شرط کرتا ہوں اگر تم صرف پانچ ہی سال تک قید کی حالت پر صبر کر سکو"

وکیل نے جواب دیا "اگر تم واقعی سنجیدگی سے کہتے ہو اور اس میں مذاق شامل نہیں ہے تو میں پانچ کیا پندرہ سال تک قید میں رہنے کا وعدہ کرتا ہوں"

صرّاف نے حیرت سے کہا "پندرہ سال! اچھا تو اس پر میرا تمہارا اتفاق ہے اور آپ سب لوگ اس عہد وپیمان کے گواہ رہیں"

وکیل نے کہا "میں پھر اس عہد کی توثیق کرتا ہوں، تم ۲ لاکھ روپیہ کو خطرہ میں ڈالو اور میں اپنی جان کو"

ہنسی مذاق میں یہ معاہدہ ہونے کو تو ہوگیا لیکن لوگوں نے وکیل کو سمجھایا کہ "دو لاکھ روپیہ کی کوئی حقیقت نہیں ہے - یہ سمجھ لو کہ اختیاری قید اضطراری قید سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے - اور تم پندرہ کیا دس سال بھی اس مصیبت کو برداشت نہیں کرسکتے"

یہ تھا وہ واقعہ جو پندرہ سال قبل صرّاف کی دوکان میں ہوچکا تھا اور اب اس کو یاد کرکے وہ بیتابانہ اپنے کمرہ میں ٹہل رہا تھا اور جی ہی جی میں کہہ رہا تھا:-

"میں نے کیوں یہ شرط کی، اس سے کیا فائدہ تھا، غریب وکیل نے اپنی عمر کے ۱۵ سال برباد کئے اور مجھے دو لاکھ روپیہ ضائع کرنے پڑیں گے - کیا اس سے واقعی یہ فیصلہ ہو جائے گا کہ قصاص اور قید میں کون سی عقوبت مناسب ہے ہرگز نہیں - میں نے اس وقت صرف عارضی جوش میں آکر یہ شرط کرلی اور اُس نے روپیہ کے لالچ سے"

اس کے بعد صرّاف کو وہ تمام باتیں یاد آئیں، جو اس رات کے بعد ہوئی تھیں - اس شرط کے بعد یہ انتظام کیا گیا تھا کہ وکیل صراف ہی کے مکان کے ایک حجرہ میں مقید کیا جاے اور وہ پندرہ سال کے دوران میں نہ کسی سے بات کرسکے - نہ کسی کی آواز سن سکے اور نہ کسی انسان کو دیکھ سکے، خط وکتابت کی بھی ممانعت تھی - البتہ اس کو یہ اجازت ضرور دیدی گئی تھی کہ کوئی ساز موسیقی کا اپنے ساتھ رکھ سکے اور کتابوں کا مطالعہ کرسکے، اسی کے ساتھ اس کو شراب پینے اور تماکو استعمال کرنے کی بھی اجازت تھی اور وہ ضروری اشیاء کے متعلق پرزہ لکھ کر ایک چھوٹی کھڑکی کی راہ سے باہر پھینک سکتا تھا - ۱۴ نومبر ۱۸۷۰ء کی آدھی رات سے میعاد قید شروع ہوئی اور ۱۴ نومبر ۱۸۸۵ء کی آدھی رات کو ختم ہوگی - اگر اس درمیان میں اسنے کسی شرط کی خلاف ورزی کی یا ایک منٹ قبل اپنے حجرہ سے نکلا تو وہ روپیہ پانے کا مستحق نہ ہوگا -

---

اُن تحریروں سے جنھیں وکیل حجرہ کی کھڑکی سے وقتاً فوقتاً باہر پھینکا کرتا تھا، یہ معلوم ہوتا رہتا تھا کہ اس کی زندگی کس طرح گزر رہی ہے، چنانچہ پہلا سال اسنے بغیر کسی اضطرار و پریشانی کے بسر کردیا - رات دن پیانو کی آواز اس کے حجرہ سے آتی رہتی تھی - اس نے شراب اور تماکو بھی طلب نہیں کی - اس نے اپنی ڈائری میں اس سال کے متعلق یہ یادداشت لکھی تھی کہ "مسکر چیزوں کا استعمال خواہشات میں ہیجان پیدا کرتا ہے - جو قیدیوں کا سخت دشمن ہے - تماکو کا دھواں چونکہ کمرہ کی ہوا کو مضر کردیتا ہے اس لئے اسکا استعمال بھی مناسب نہیں" پہلے سال جو کتابیں وقت کاٹنے کے لئے اُسنے طلب کیں وہ صرف قصص و حکایات کی تھیں -

دوسرے سال پیانو کی آواز موقوف ہوگئی اور اخلاق کی کتابیں اس نے طلب کیں، پانچویں سال پھر پیانو بجانا شروع کیا اور شراب بھی طلب کی۔ جن لوگوں نے اس سال اُسے دیکھا ان کا بیان ہے کہ کھانے پینے میں وہ اپنا وقت بہت کم صرف کرتا تھا اور سوتا بھی کم تھا۔ اپنے آپ کو گالیاں دیا کرتا اور ہر وقت غیظ و غضب کی سی کیفیت اس پر طاری رہتی۔ کتابوں کا مطالعہ بھی ترک کردیا، رات رات بھر میز پر بیٹھا لکھا کرتا اور صبح کو چاک کرکے پھینک دیتا۔

چھٹے سال کا نصف حصہ گزرنے کے بعد پھر اس کی حالت میں تغیر پیدا ہوا اور اس نے فلسفہ، تاریخ اور مختلف زبانیں سیکھنے کی طرف توجہ کی اور اس قدر انہماک کے ساتھ کہ چار سال کے اندر اس نے ۶۰۰ کتابوں کا مطالعہ کیا۔

چنانچہ ایک دن اس نے کھڑکی سے ایک خط لکھکر باہر پھینکا جس میں صراف سے اس طرح خطاب کیا گیا تھا:۔

"میں یہ تحریرات زبانوں میں لکھتا ہوں، مہربانی فرماکر ان زبانوں کے جاننے والوں کو دکھاکر معلوم کیجیے کہ میں نے صحیح لکھا ہے یا نہیں۔ اور اگر صحیح ہو تو ایک بندوق کا فیر کردیجیے، تاکہ مجھے معلوم ہوجاے کہ میری محنت بیکار نہیں گئی۔ ہر زمانہ و ملک کے غیر معمولی ذہانت رکھنے والے فضلا نے مختلف زبانوں میں اپنے خیالات کو ظاہر کیا لیکن اُن سب کے سینوں میں عبقریت کی وہی ایک آگ مشتعل تھی۔ کاش آپ کو معلوم ہوسکتا کہ ان زبانوں کے سیکھنے اور مختلف زبانوں کے علما کے خیالات معلوم کرلنے کے بعد میں کسقدر حریص علم ہوگیا ہوں"

دس سال کے بعد یہ اپنی میز کے سامنے ایک بُت کی طرح بیٹھا رہتا تھا اور صرف عہد جدید (انجیل) کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ صراف کو تعجب تھا کہ وہ شخص جس نے چار سال میں ۶۰۰ کتابوں کا مطالعہ کرکے اتنا بڑا ذخیرہ مختلف زبانوں کی کتابوں کا اپنے دماغ میں فراہم کرلیا ہے وہ اب انجیل ایسی مختصر اور آسان کتاب کے مطالعہ میں منہمک ہے۔

قید کے آخری دو سالوں میں اس کی یہ حالت تھی کہ بغیر تفریق و امتیاز کے جو کتاب اس کے ہاتھ لگجاتی تھی اسکو دیکھنے لگتا تھا۔

جب قید کی میعاد ختم ہونے کے قریب آئی تو صرّاف نے اپنے جی میں کہا "کل بارہ بجے میعاد ختم ہوجاے گی اور مجھکو حسب وعدہ ۲۰ لاکھ روپیہ دینے پڑیں گے جسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ میں بالکل مفلس ہوجاؤں گا اور میرے پاس ایک پیسہ بھی نہ رہے گا۔

پندرہ سال قبل صراف بہت دولتمند تھا لیکن اس زمانہ میں اس کو تجارت وغیرہ میں بہت نقصان اٹھانا پڑا تھا اور اس کی مالی حالت بہت سقیم ہوگئی تھی۔

وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں پر رکھے ہوے سوچ رہا تھا "شرط بھی کیسی ملعون چیز ہے، اور دیکھو تو یہ مردود وکیل مرا بھی تو نہیں کہ میں اس عذاب سے چھوٹ جاتا، لیکن وہ کیوں مرنے لگا، وہ تو ۲۰ لاکھ روپیہ مجھ سے لیگا، شادی کریگا، عیش و نشاط کی زندگی بسر کریگا۔ اور میں؟ کوڑی کوڑی کو محتاج ہوکر بھیک مانگوں گا اور در در کی ٹھوکریں کھاؤں گا۔ نہیں، ہرگز نہیں، ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔ یہ میری برداشت سے باہر ہے، اور رہائی کی تدبیر سواے اس کے کچھ نہیں کہ اس کو مرجانا چاہئیے۔ بیشک اس کی موت ضروری ہے"

رات کے تین بج چکے تھے اور صرّاف نے اسی کرب و اضطرار کے عالم میں اتنی رات جاگ کر کاٹ دی تھی۔ گھر میں ہر طرف سناٹا

تھا اور ہر شخص گہری نیند میں مصروف تھا۔ اس نے اس دروازہ کی کنجی لی جو پندرہ سال قبل بند کیا گیا تھا عبا پہنی اور کمرہ سے باہر آیا۔ سردی شدید تھی اور تاریکی نہایت گہری، وہ دیوار کو اندھوں کی طرح ٹٹولتا ہوا باغ میں پہونچا اور وہاں سے اس حجرہ تک گیا جہاں وکیل مقید تھا۔ اس نے پہرہ دار کو آواز دی لیکن وہ بھی غافل سو رہا تھا۔ دروازہ پر پہونچکر اس نے دیاسلائی روشن کی اور دیکھا کہ قفل اسی طرح بند ہے۔ اس نے کھڑکی سے جھانکا تو دیکھا کہ وکیل میز کے پاس کرسی پر بیٹھا ہوا ہے، پشت دریچہ کی جانب ہے، سر کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے ہیں اور کتابیں چاروں طرف منتشر پڑی ہیں۔

اس نے پانچ منٹ تک انتظار کیا لیکن اس کے جسم میں کوئی حرکت نہیں ہوئی، کیونکہ اتنی طویل مدت تک قید میں رہنے سے اس کو ایک بت کی طرح ساکت بیٹھنے کی عادت ہوگئی تھی۔ صراف نے دریچہ کے شیشہ کو انگلی سے کھٹ کھٹایا، لیکن کوئی جواب نہیں ملا اور نہ وکیل کے جسم میں کوئی حرکت پیدا ہوئی۔ صراف دروازہ پر گیا اور قفل میں کنجی ڈالکر اس کو گھمایا اور اس کھٹکے سے بھی وہ نہ چونکا۔ یہ اندر داخل ہوا اور اسنے دیکھا کہ وکیل بہت دُبلا ہوگیا ہے اور سوائے استخوان و پوست کے کچھ اس کے جسم میں نہیں رہ گیا ہے، چہرہ زرد ہے، گال بیٹھے ہوئے ہیں ہات سوکھ گئے ہیں، پیٹھ میں خم آگیا ہے، سر کے بال سپید ہیں، ڈاڑھی کے بال بڑھکر الجھ گئے ہیں، سامنے ایک تحریر نہایت باریک خط میں لکھی ہوئی رکھی ہے۔ صراف نے اپنے جی میں کہا کہ یہ نہایت گہری نیند سو رہا ہے، اور شاید وہ اُس وقت اُنھیں ۲۰ لاکھ روپیوں کا خواب دیکھکر خوش ہو رہا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس کا ہلاک کرنا میرے لئے بہت آسان ہے لیکن پہلے مجھے یہ دیکھ لینا چاہئے کہ اس نے اس تحریر میں کیا لکھا ہے؟

اس نے کاغذ اُٹھایا اور دیکھا تو اس میں لکھا تھا:-

کل بارہ بجے میری قید کی میعاد ختم ہو جائے گی اور میں پھر آزاد ہو کر اپنے ابنائے جنس سے مل سکوں گا، لیکن قبل اس کے کہ حجرہ کو چھوڑ دوں اور آفتاب کی روشنی کو دیکھوں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اے اہلِ دنیا چند کلمات تم سے کہدوں۔ اس لئے میں اپنے صاف و پاک ضمیر کے ساتھ اس خدا کے سامنے جو میری صداقت کا شاہد ہے ظاہر کرتا ہوں کہ میں زندگی، آزادی، صحت اور ہر اُس چیز کو جس کو اس دنیا کی برکات میں شمار کیا جاتا ہے، ایک سرے سے نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ میں نے کامل پندرہ سال تک حیاتِ دنیاوی کا مطالعہ کیا اس حال میں کہ اس عرصہ تک نہ میں نے زمین کو دیکھا اور نہ اس پر کسی چلنے پھرنے والے انسان کو۔ لیکن تمھاری کتابوں سے میں نے ہر وہ علم حاصل کر لیا جو آنکھ، کان اور دیگر حواس کی مدد سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسرارِ طبیعت مجھ پر منکشف ہوگئے، علوم و فنون کے پوشیدہ نکات مجھ پر روشن ہوگئے اور تمام وہ راز بے نقاب ہو گئے جو کسی بڑے سے بڑے فیلسوف و حکیم کو معلوم ہو سکتے ہیں۔ کتابوں کے ذریعہ سے میں کائنات کی بلندیوں اور گہرائیوں تک پہونچا یہانتک کہ اس وقت میں اس آسمان کے نیچے سب سے بڑا دانا انسان کہلایا جا سکتا ہوں۔

اس لئے میں تم کو بتاتا ہوں کہ جن چیزوں کو تم زندگی کے برکات کہتے ہو وہ میرے نزدیک ہیچ ہیں، ان کا وجود صرف ایک سایہ ہے مٹجانے والا، ایک رنگ ہے اڑ جانے والا، وہ مکھی سے زیادہ حقیر اور سراب سے زیادہ پُرفریب ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم جاہ و مال، دولت و ثروت، حسن و جمال پر فخر کرتے ہو حالانکہ یہ سب وہم باطل سے زیادہ نہیں۔ تم گمراہی میں مبتلا ہو، تم ایسے جنون میں مبتلا ہو جس سے زیادہ کوئی جنون نہیں ہو سکتا، تم گمراہی کو ہدایت پر، کذب کو صداقت پر، حرام کو حلال پر ترجیح دیتے ہو اور کھرا

چھوڑ کر کھوٹا لینا چاہتے ہو۔ چنانچہ میں اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ صحیح ہے، اُن ۲۰ لاکھ روپیہ کے لینے سے انکار کرتا ہوں اور اس لئے کہ میں اُن کا حسب معاہدہ مستحق بھی نہ رہوں وقت مقررہ سے پانچ منٹ قبل اپنی قید سے نکل جاؤں گا"

صراف نے اس تحریر کو پڑھکر میز پر رکھدیا اور ایک خاص کیفیت لئے ہوئے واپس آیا، وہ اپنی دنارت و ذلت، کا احساس کرکے اپنے اوپر نفرین کررہا تھا اور بستر پر کروٹیں لے رہا تھا، لیکن نیند کسی طرح نہ آتی تھی۔

دوسرے دن دوپہر کو پہرہ دار آیا اور کہا کہ جو شخص حجرہ میں قید تھا دریچہ سے کود کر باغ میں آیا اور وہاں سے باہر چلا گیا۔ صراف اپنے خادموں کو لیکر وہاں پہونچا اور سب کو اس امر کا شاہد کرکے کہ وکیل وقت مقررہ سے قبل بھاگ گیا ہے، اس تحریر کو جو آپ بھی رکھی ہوئی تھی چپکے سے اسکو اُسنے بکس میں محفوظ کردیا

چند باتوں کا خیال رکھئے

(۱) مینیجر نگار کے نام خط و کتابت میں نمبر خریداری لکھنا ضروری ہے۔ اگر آپ کسی تحریر میں نمبر خریداری نہیں لکھتے تو اسکے معنی یہ ہیں کہ آپ اسکا جواب نہیں چاہتے۔

(۲) رسالہ ہر خریدار کے نام نہایت احتیاط سے دو دو مرتبہ فہرست سے ملا کر روانہ کیا جاتا ہے اور ہمارا خاص آدمی اپنے سامنے ڈاکخانہ میں مہریں لگواتا ہے اسلئے اگر رسالہ نہ پہونچے تو اسکو ہماری غلطی نہ سمجھئے بلکہ ڈاک کی بدنظمی پر محمول کیجئے اور پہلے اسی سے باز پرس کیجئے۔

(۳) رسالہ پہونچنے کا انتظار ۱۵ تک کیا کیجئے کیونکہ اصل تاریخ اشاعت یہی ہے۔ ۲۰ تک اگر رسالہ نہ پہونچے تو فوراً ہمکو اطلاع دیجئے اس کے بعد کی اطلاع ملنے پر رسالہ قیمتاً ملسکیگا۔ اگر موجود ہوا، ورنہ نہیں۔

(۴) حیدرآباد دکن کے علاقوں سے جتنی پرچہ کی گمشدگی کی اطلاع آتی ہے۔ کہیں سے نہیں۔ جسکا سبب وہیں کے لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ اسی لئے وہاں کے بعض حضرات ۸عہ زائد ادا کرکے اپنا رسالہ ذریعہ رجسٹری طلب کرتے ہیں۔

(۵) لائبریریوں، اسکولوں، ریڈنگ روم اور اسی طرح کے دوسری پبلک جماعتوں کے نام جو پرچہ جاتا ہے۔ اس کے گم ہونیکا سبب یہ ہوتا ہے کہ ڈاکیہ میز پر ڈاک ڈالکر چلدیتا ہے اور لوگ بدنظمی کے ساتھ ادھر اُدھر منتشر کردیتے ہیں اور بعض مرتبہ گھر لیجاتے ہیں اور واپس نہیں کرتے۔

(۶) اسکول کے طلبا کو چاہیے کہ اپنا رسالہ بجائے اسکول کے کسی اور محفوظ پتہ سے طلب کریں۔ اسکولوں میں ڈاک کا انتظام کبھی درست نہیں رہسکتا۔

"مینیجر نگار لکھنؤ"

التجائے سکون



ردائے خواب میں خاموش سوتی ہے دُنیا'
مئے سکوت سے مدہوش سوتی ہے دُنیا'
مثالِ رندِ سیہ کوش سوتی ہے دُنیا!
میں تیری یاد میں رہتا ہوں رات بھر بیدار'
تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لئے

فضا میں پھیلتی جاتی ہیں چاندنی راتیں
سرود عیش سُناتی ہین چاندنی راتیں
سرور و کیف بہاتی ہیں چاندنی راتیں!
مگر خوشی کو ترستی ہے میری جانِ نزار!
تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لئے!!

سحر کے وقت، کہ ہوتا ہے رحمتوں کا نزول
جہان والوں کی محفل پہ عشرتوں کا نزول
فضا سے لطف و مسرت کی نکہتوں کا نزول!
مگر میں رہتا ہوں ناآشناء صبر و قرار
تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لئے!

ہزار کیف بداماں ہو لالہ زار شفق'
نظر فریب ہو دامانِ زر نگار شفق'
مری نظر میں مگر ہیچ ہے بہار شفق'
کہ ہے حیات مری اب بھی تیرگی بکنار!
تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لئے!!

ستارے شام کے جس وقت جھلملاتے ہیں،
فلک پہ اپنی ضیاؤں کے در لٹاتے ہیں!
تو میرے دیدۂ تر اشکِ غم بہاتے ہیں،
اور اُن کی نذر میں کرتا ہوں موتیوں کا ہار
تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لئے!!

ترے بغیر تماشائے گلستاں بے کیف،
ترے بغیر، ہر اک حسن گلفشاں بے کیف،
ترے بغیر ہے رنگینیٔ جہاں بے کیف!
ترے بغیر ہیں بے کیف میرے لیل و نہار!!
تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لئے!

رہین آتشِ فرقت دل و جگر کب تک؟
رہے گی دور، مری جنتِ نظر! کب تک؟
غمِ فراق سہوں تو سہی! مگر کب تک،
نہ ہوگی جانِ حزیں آشنائے صبر و قرار
تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لئے!

ترے شباب میں رنگینیٔ بہار رہے!
فروغِ حسن سے تو سحر در کنار رہے!
تو خلد زارِ محبت میں جلوہ بار رہے
تو میری روح پہ کر آکے بارشِ انوار!
تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لئے!!

سپہرِ عشق کا ٹوٹا ہوا ستارا ہوں!
تمہارے وعدۂ صبر آزما کا مارا ہوں!
مگر قسم ہے تمہاری کہ میں تمہارا ہوں!
ہے میری خاک میں جب تک کہ زندگی کا شرار!
تو میرے دل کو عطا کر سکوں خدا کے لئے!!

اختر شیرانی

سوگوار

زبورِ عشق کے نغمے ——— ہیں ناگوار اگر!
خرابِ شوق کے بوسے ——— ہیں ناگوار اگر!
شہیدِ ذوق کے سجدے ——— ہیں ناگوار اگر!
تو کیا ضرور کہ یوں بے حجاب ہو جاؤ، ہمیں نہ یاد آؤ

اگر ——— نیاز و عقیدت سے تمکو نفرت ہے!
اگر ——— خدا کی بشارت سے تمکو نفرت ہے!
اگر ——— کسی کی محبت سے تمکو نفرت ہے!
نہ الفتِ گل و بلبل کے زمزمے گاؤ، ہمیں نہ یاد آؤ

ہم اعتکاف میں بیٹھیں تو ——— سامنے ہو تم
چھپا کے منھ کو جو روئیں تو ——— سامنے ہو تم
تمام رات بھی جاگیں تو ——— سامنے ہو تم
نہ یوں فریبِ محبت کے خواب دکھلاؤ، ہمیں نہ یاد آؤ

مچل پڑے گا کوئی بیقرار ——— رہنے دو
نہ مر مٹے کوئی امیدوار ——— رہنے دو
"اسیرِ غم" کو یوہیں سوگوار ——— رہنے دو
تباہ کردہ جذبات کو نہ تڑپاؤ۔ ہمیں نہ یاد آؤ

ربابِ ذوق سے خاموشیوں کو مت چھینو!
نمازِ شوق سے معصومیوں کو مت چھینو!
کسی غریب کی خودداریوں کو مت چھینو!
مقیدِ قفسِ بے کسی نہ کر جاؤ، ہمیں نہ یاد آؤ

"کنارِ نہر" کی شادابیاں ہیں ——— سوگ نشیں
"شبِ قمر" کی ضیا باریاں ہیں ——— سوگ نشیں
حریمِ راز کی تنہائیاں ہیں ——— سوگ نشیں
نشاطِ عشق کی رنگینیاں نہ برساؤ، ہمیں نہ یاد آؤ

روش صدیقی

کیوں دیکھے ؟

کسی کی عرض ہوس آشکار کیوں دیکھے ؟ — غریب بھول کے کوئی "نگار" کیوں دیکھے ؟

دوبارہ دیکھنے کی ہے ہوس نگاہوں کو — کوئی یہ سرخیٔ افسانہ کار کیوں دیکھے ؟

ہمیں ستاروں نے دیکھا، یونہی سہی لیکن — کوئی نگاہِ ہوس آشکار کیوں دیکھے ؟

ہمارا آئینہ کیوں، ہم سے ہمکنار نہ ہو؟ — خدانہ کردہ، تمہیں ہمکنار کیوں دیکھے ؟

ہیں پردہ دارِ سراپردہ ہائے عفت ہم! — شفق بھی ہمکو سرِ جوئبار کیوں دیکھے ؟

چلو، وہ چاندنے تو دیکھا یا نہیں دیکھا ؟ — کسی کا دیدۂ گستاخ وار کیوں دیکھے ؟

کبھی نہ جائیں گے اب سے چمن میں بھولکے بھی — نگاہِ گل ہمیں آئینہ وار کیوں دیکھے ؟

روپہلی چاندنی اور اسکی اسقدر جرات ؟ — وہ ہم کو سوتے ہوئے بار بار کیوں دیکھے ؟

حیا سے دیکھتے ہی پانی پانی ہوجائیں — ہمیں گھٹا بھی سرِ آبشار کیوں دیکھے ؟

عروس برق ہے مجبس، پر نہیں منظور — وہ غرقِ مستیٔ ابرِ بہار کیوں دیکھے ؟

قسم ہے آج سے گر بام پر چڑھیں سورج — ہمارے گیسوئے مشکیں بہار کیوں دیکھے ؟

نہیں کہ غیر ہے لیکن ہمارے جلووں کو — نگاہِ گل بھی تہ شاخسار کیوں دیکھے ؟

بری نظر سے جو دیکھے تو آنکھیں ہی پھوٹیں؟ — بھلا کوئی ہمیں مشتاق وار کیوں دیکھے ؟

یہ جرم کم ہے کہ "اک بار" ہم کو دیکھ لیا! — کوئی "شریر" ہمیں "بار بار" کیوں دیکھے ؟

لٹاؤ یوں نہ کہیں بے سبب نگاہوں کو!
قلم کو صبر سکھاؤ! ادب نگاہوں کو!

"سلمائے گجرات"

چاند سے

حوا کی گود میں بھی یہی تیرا حال تھا　میں تھا یہاں وہاں تیرے ہاتھوں کا جال تھا
جب سے ہی تجھکو میرے پکڑنے کا شوق ہے　یعنی بلند تیرا ازل سے ہی ذوق ہے
لیکن کسی کے وہم و گماں میں نہ تھا کہ تو　کر کے رہیگا پوری کسی دن یہ آرزو!
کہتا تھا میں اسے ہوسِ نارسا تری　سمجھا تھا بے ضرر سی اسے اک ادا تیری
معصوم سی ادا ہی مگر تیر بن گئی　ننھی ہی سی کمند فلک گیر بن گئی
آئینہ اب ہوا تری وسعت کا دسترس　لاریب کائنات پہ چلتا ہے تیرا بس
ہاں! کائنات بھر میں تو ہی برگزیدہ ہے!　تو ہی چراغِ خانہ تو ہی نورِ دیدہ ہے!
ذوقِ نظر سے تیرے کسی کو امان نہیں!　جس کا خطا ہو تیر تری وہ کماں نہیں!

دلکے کہ در تو اسے گل تیرہ! نہادہ اند
ماچیستم! جن و ملک راندادہ اند!!

امین حزیں

غزل

ہزار ڈھونڈو وہ جہاں جہاں نہیں ملتا　جو مل بھی جائے تو اپنا نشاں نہیں ملتا
ہے سرگزشتِ جنوں اک فسانۂ بے ربط　کہیں سے سلسلۂ داستاں نہیں ملتا
محیط فکر و نظر پر ہے یوں تجلیٔ دوست　کہ اب مجھے بھی خود اپنا نشاں نہیں ملتا
جنوں کے صدقے کہ اب راز راز ہی نہ رہا　گیا یہ غم کہ کوئی راز داں نہیں ملتا
سراغِ جادۂ راہِ سلوک اے زاہد　بغیر بیعتِ پیرِ مغاں نہیں ملتا
اندھیری رات ہے اے برق تو ہی شمع دکھا　بھٹک رہا ہوں مجھے آشیاں نہیں ملتا
تڑپ رہے ہیں جبینِ نیاز میں سجدے　تلاش جسکی ہے وہ آستاں نہیں ملتا

مذاقِ ناصیہ سائی یہ رائگاں ہے رضیؔ
جبین ملے تو کوئی آستاں نہیں ملتا

رضی بدایونی

غزلیات

اختر شیرانی

بھلا کیونکر نہ ہوں راتوں کو نیندیں بیقرار اسکی　　کبھی لہرا چکی ہو جس پہ زلفِ مشکبار اس کی
اُمیدِ وصل پر، دل کو فریب صبر کیا دیجے؟　　ادا وحشی صفت اس کی، نظر بیگانہ وار اسکی!
جفائے ناز کی میں نے شکایت ہائے کیوں کی تھی　　مجھے جینے نہیں دیتی نگاہِ شرمسار اس کی!
محبت تھی، مگر یہ بیقراری تو نہ تھی پہلے!　　الہی! آج کیوں یاد آتی ہے بے اختیار اسکی
کوئی کیونکر بھلا دے، ہائے ایسے کی محبت کو　　وفائیں، دلنواز اُس کی! جفائیں خوشگوار اُسکی
ہمیں عرضِ تمنا کی جسارت ہو تو کیونکر ہو؟　　ادائیں فتنہ ریز اسکی! نگاہیں، حشر بار اُسکی
بُرا ہو اس تغافل کا کہ تنگ آکر یہ کہتا ہوں　　مجھے کیوں ہوگئی الفت، مرے پروردگار اسکی؟؟
مئے الفت کے متانوں کو میخانے سے کیا مطلب؟　　ادا روحِ نشاط اُسکی، نظر، جانِ بہار اُسکی!
یہاں کیا دیکھتے ہو، ناصحو! گھر میں خدا کیا ہے　　مرے دل کے کسی پردے میں ڈھونڈھو یادگار اسکی
تغافل کا گلہ کس کو نہیں، کس کس کو سمجھاؤں　　نگاہیں منتظر اُسکی! امیدیں، بیقرار اُسکی!
مجھے تو عشق پیچاں! ایسے بل کھانے نہ آتے تھے　　بتا کیا تجھ پہ لہرائی ہے زلفِ مشکبار اُسکی؟
انہیں کوچوں میں کل اخترؔ کو رسوا ہوتے دیکھا تھا　　وہ آنکھیں اشکبار اُسکی! وہ باتیں دلفگار اُسکی!

افسر میرٹھی

دل قابو سے نکلے گا تو کیا جانے کیا کیا ہو گا　　گھر گھر نام دھرے جائیں گے ہر گھر میں چرچا ہو گا
دل پر اپنا بس چلتا تو وحشت کاہے کو ہوتی　　اور کسی سے کیا مطلب ہے تو خود کیا کہتا ہو گا
سچ تو یہ ہے اس دنیا میں حرکت ہی سے برکت ہے　　جس نے کچھ ڈھونڈا ہو گا تو اس نے کچھ پایا ہو گا
کون بھلا روتا پھرتا ہے آدھی آدھی راتوں کو　　اس یا دل کے پردے میں بھی کوئی دل والا ہو گا
چاند کی گردش تو اے افسرؔ ایک وضعِ قدیم ہے　　سرگشتہ یوں لاکھوں ہوں گے ہم سا کوئی کیا ہو گا

طالب باغپتی

قلبِ عاشق ہی نہیں لذتِ آزار پسند　　انکی بیمار نگاہیں بھی ہیں بیمار پسند
خود ہی منظور تھا منصور کو رسوا ہونا　　ورنہ تحریکِ تجلی تو نہیں دار پسند

کچھ اُنھیں دل سے ستانا مجھے منظور نہیں	فطرتِ حسن ازل ہی سے ہو آزار پسند
ڈبڈبا آتے ہیں آنسو دمِ رخصت اکثر	خیر سے انکی نظر بھی ہوئی اظہار پسند
کوئی اُمید تو ہو وعدۂ باطل ہی سہی	مجھکو اقرار کی خواہش تمہیں انکار پسند
اس کشاکش میں کبھی خونِ تمنا ہو گا	ضبط تعلیم محبت، انہیں اظہار پسند
شوقِ افتادہ ازل ہی سے ملا ہی طالب	فطرتِ قلب نہیں آج سے افکار پسند

طاہر رامپوری

پھر ابھارا چاہتی ہے خواہشِ راحت مجھے	ہو چکا ہے بارہا اندازۂ قسمت مجھے
دیکھتا ہوں جس کو محوِ ناز برداریِ عشق	یاد آجاتا ہے اک ہنگامۂ فرصت مجھے
دل کے آئینہ میں یوں تو ہیں بہت رنگینیاں	دیکھتا ہوں تو نظر آتی ہے اک صورت مجھے
چلدیا دنیا سے یہ کہکر کوئی ناکامِ عشق	ہو سکے تو یاد کر لینا دمِ زینت مجھے
ہو چلا تھا قلبِ مضطر مائلِ صبر و قرار	آگیا پھر یاد وہ غارت گرِ راحت مجھے
مٹ نہیں سکتا کسی صورت سے قسمت کا لکھا	اے جبینِ شوق پھر سجدہ کی کیا حاجت مجھے
انتظارِ وعدہ دیدار وقتِ جاں کنی	اے فریبِ کامیابی اب کہاں مہلت مجھے
کیا بتاؤں آپ کو طاہر نشانِ زندگی	موت کا پیغام دیتی ہے مری غفلت مجھے

مہر رامپوری

کس لئے پوچھتے ہو حال پریشاں میرا	اب نہیں زخمِ جگر قابلِ درماں میرا
فتنہ اندار نگاہوں نے کیا ہے یہ سلوک	آپ دیکھیں تو سہی چاک گریباں میرا
چارہ فرمائی کی تکلیف نہ ہو گی تم کو	دردِ دل آپ ہی ہو جائیگا درماں میرا
گو کہ معلوم ہے انجام وہاں جانے کا	لیچلا ہے مجھے پھر شوقِ فراواں میرا
ہے یہی سلسلہ اخفائے محبت کا اگر	مجھکو برباد کرے گا غمِ پنہاں میرا
خوف اے مہر زمانہ کے حوادث کا نہیں	جانتا ہوں کہ ہے اللہ نگہباں میرا

باب المراسلۃ والمناظرۃ

(جناب قاضی ولی محمد صاحب۔ سکریٹری کونسل بھوپال)

مکرمی تسلیم

خدا ان کاتبوں کو صحیح کتابت کی توفیق دے جنھوں نے آپ کے مضمون "شجر الدر" میں کئی غلطیاں کر دی ہیں، مثلاً صفحہ ۸۴ سطر ۶ میں بجائے المستعصمیۃ الصالحیۃ کی المقتصمہ الصالحہ اور صفحہ ۸۴ سطر ۱۰ میں بجائے اتابک عزالدین کے عزیز الدین لکھ مارا

اسی صفحہ میں ایک اور غلطی ہوگئی ہے یعنی "معز" کسی عراقی امیر سے نہیں بلکہ ایک کردی امیر بدر الدین لولو کی لڑکی سے عقد کرنا چاہتا تھا۔ ملکہ شجر الدر کا مقبرہ قاہرہ میں متصل مقبرہ سیدہ نفیسہ موجود ہے۔

الصالحیہ نام ہی دو آبادیوں کا ایک جو شہر دمشق کا ربض ہے جیسے بھوپال کا احمد آباد اور دوسرا ایک چھوٹا شہر شمال زقازیق میں الصالح کا آباد کردہ ہے جہاں "معز" زیادہ تر ایام گزاری کیا کرتا تھا۔

چونکہ میں شجر الدر کی قبر اور نیز ہر دو الصالحیہ کی زیارت و سیر سے بہرہ اندوز ہو چکا ہوں اور ابھی اسی ہفتہ منشی قدیر احمد صاحب بھوپالی کی سخت فرمائش پر ایک طولانی مضمون شجر الدر پر لکھ چکا ہوں اس لئے غالباً میری یہ چند سطور بے محل نہ ہونگی۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج مع الخیر ہوگا۔

(نگار) میں ممنون ہوں آپ کے اس انتباہ کا اور شکر گزار ہوں کہ آپ نے بنظر اصلاح میرے مضمون کو دیکھ کر غلطیوں سے آگاہ فرمانے کی زحمت اختیار کی

یقیناً "المستعصمیۃ الصالحیۃ" کو "المستعصمہ الصالحہ" لکھنا اور بجائے عزالدین کے عزیز الدین درج کرنا کاتب کی غلطی تھی لیکن یہ فقرہ کہ معز کسی عراقی امیر کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا تھا، یقیناً کاتب کی فروگزاشت نہیں ہو سکتی بلکہ میری غلطی ہے اگر واقعی حقیقت اس کے خلاف ثابت ہو جائے

میں نے لکھا ہے کہ وہ زنگی خاندان کی عراقی شاہزادی سے شادی کرنا چاہتا تھا اور کوئی نام درج نہیں کیا آپ نے اس امیر کا نام جس کی وہ لڑکی تھی "بدر الدین لولو" تحریر فرمایا ہے جو بالکل درست ہے۔ اس لئے اب اختلاف صرف اس بات میں ہے کہ آپ اسے کردی کہتے ہیں اور میں زنگی بتاتا ہوں اور اس کا ثبوت خود آپ ہی کی تحقیق سے ملتا ہے کیونکہ لولو ہمیشہ زنگیوں ہی کا نام یا لقب ہوا کرتا تھا۔ اگر آپ خطط مقریزی اور ابو الفدا کو ملاحظہ فرمائیں گے تو اس کی صحت ہو جائیگی۔ (نیاز)

باب الاستفسار

(جناب عقیل احمد صاحب جعفری۔ بارہ بنکی)

عرصہ سے ایک پریشانی میں مبتلا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ جناب سے رجوع کروں شاید اس درد کا مداوا ہو سکے۔ وہ شک یا وہم یا اعتراض یہ ہے کہ نماز کیا ہے، اس کی غایت کیا ہے، فلسفہ کیا ہے، ایک مجبور انہماک ہستی پر نظر ڈالئے اور بتائے کہ وہ مقررہ ارکان نماز سے بشمول وضو اور وہ بھی پانچ وقت روزانہ معہ فرائض و سنن و نوافل کیونکر عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ عصر کا وقت تنگ ہے، اور عدالت میں حاکم کے سامنے قریب قریب از دست رفتہ مقدمہ پیش ——— ہنگام ظہر ہے اور ملوں میں مزدوروں کی کاروباری مصروفیت۔ ایک منزل طے کر کے مزدور کو نماز کے لئے آنا ہے اور مزدوری کے وضع ہونیکا کھٹکا ہے۔

دفتر سے خستگی و ماندگی کیساتھ واپسی ہوئی ہے شیروانی گلے کی اور پاتا بہ پیر کا بار ہے۔ تمام دن کی دماغی محنت کے بعد سیر و تفریح کو نکلے ہیں یا کسی لائبریری میں یا کسی کلب میں افتاں و خیزاں پہنچے ہیں ہجوم میں بمشکل اخبار ہاتھ لگ سکا ہے ابھی صرف اڈیٹوریل ہی شروع کر کے کچھ ہی سطریں پڑھی ہیں، یا اسی قسم کی دوسری تفریح میں مشغول ہوئے ہی ہیں کہ مغرب کی اذان ہو گئی۔ لیجئے قصہ ختم ہوا۔

ایک مولوی صاحب اس اعتراض کی تشفی محض اس نکتہ کے فرما دینے کو کافی سمجھتے ہیں کہ دنیا کے کاروبار میں شب و روز کی مشغولیت کا اقرار اور خدا کی عبادت کے لئے تھوڑا سا وقت بھی دینے سے انکار، اور اس انکار پر اصرار! نہایت کفر انگیز ہے۔ صورت حال کی اس کشمکش و ناگواری میں اگر صرف قہار و جبار اور مطلق العنان بادشاہ کی صفات سے متصف دوزخ کی دہکتی ہوئی آگ میں پھینک دینے والے خدا کے حکم سے مجبور ہو کر جیسے تیسے اگر ارکان نماز ادا بھی کئے جائیں تو یکسوئی و اطمینان خاطر کہاں؟ اور اگر اطمینان حاصل نہ ہو تو پھر نماز سے کیا فائدہ۔

میں دیکھتا ہوں کہ لوگ نماز پڑھتے ہیں اور دوران نماز میں بھی کوئی روحانی اثر ان پر طاری نہیں ہوتا بلکہ نماز پڑھ کے تو یہ لوگ اور شیر ہو جاتے ہیں۔ نماز پڑھتے رہتے ہیں اور گناہ کرتے رہتے ہیں حتیٰ کہ عشاء کا وقت آجاتا ہے اور یہ اپنے تمام دن کے گناہوں کا جائزہ لئے بغیر آخری نماز بھی پڑھ لیتے ہیں یہ خیال کر کے کہ یہ جادو ابھی ان سب گناہوں کا کفارہ کئے دیتا ہے۔ دوسرے دن صبح اٹھتے ہی جرائم کی بھاگ دوڑ میں پھر وہی رست و خیز شروع کر دیتے ہیں۔ پھر سوال یہ ہے کہ قول و فعل میں یہ اختلاف کیوں ہے۔

اچھا اب آئیے تھوڑی دیر کے لئے ان جملہ امور سے قطع نظر کر لیں اور سر تسلیم خم کر دیں کہ خدا کا حکم ہی یہی ہے اور خدا کا حکم بہر حال ادا کرنا ہے۔ تو جناب الدین یسر کے کیا معنی ہیں؟ اس حکم کی سختی کا تو دوسرے لفظوں میں یہ مطلب ہوا کہ دنیا

ترک کردی جائے، جبکہ تمام دن خدا ہی کی ایک عنایت "پیٹ" کی خدمت میں مصروف رہنے کے بعد بھی وہ شام کو کوئی تفریح نہیں نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اُسے مغرب کی نماز پڑھنا ہے اور میرے عقیدہ کے بموجب استغراق و انہاک کیساتھ پڑھنا ہے۔ اور جب دنیا ہی ترک کرنا ٹھہری تو پھر صاف صاف گوشہ نشینی، عزلت گزینی اور علایق دنیا سے علٰحدگی ہی والی پالیسی یعنی "تپسیا" پر جی کھول کے کیوں نہ عمل کیا جائے۔ لیکن اس صورت میں اسلام کا دعوائے "لارھبانیۃ فی الاسلام" بے معنی ہو جائیگا

بعض اوقات میرا جی چاہتا ہے کہ کاش! کوئی شخص اٹھے اور قرآن کریم کی آیت شریف "اقیموا الصلوٰۃ" کو راہِ عمل بناکے اعلان کردے کہ ہاں نماز پڑھو یعنی اپنا اور خدا کا رشتہ استوار کرو بلاتخصیص وقت و بغیر تعین رکعت۔ سکون و اطمینان کیساتھ خواہ وہ دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں سے کوئی بھی وقت ہو۔

میں ایک دفعہ پھر یہ عرض کرتا ہوں کہ اس کے جواب میں خدا اور انسان کے درمیان میں اُن عاشقانہ و معشوقانہ شاعرانہ اور صوفیانہ خیالات کے دریا کی روانی نہیں دیکھنا چاہتا ہوں جو ایک عرصہ سے ہمارے دواوین کے کوزہ میں بھری ہوئی ہے۔ بلکہ میں تو ان طبائع کی تسکین کا سامان جناب سے فراہم کرنا چاہتا ہوں جو خدا کو معشوق سمجھ کے نماز کو راز و نیاز نہیں، بلکہ خدا کو خدا سمجھتے ہوئے نماز کو عبادت یا اظہار اطاعت کا ایک ذریعہ خیال کرتے ہیں۔ خدا۔ اگر فطرت ہے اور قرآن صحیفۂ فطرت تو نماز بھی کیوں نہیں ایک اصول فطرۃ کے موافق کبھی ہمارے لئے مفید ثابت ہوئی

(نگار) ہر چند آپ کی یہ تحریر بظاہر مذہب و ارکان مذہب کا استخفاف معلوم ہوتی ہے، لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ یکسر خلوص و صداقت ہے اور آپ کی روح بے چین ہے اس نفسِ مطمئنہ کے حصول کے لئے جس کی جستجو ہر انسان کا فطری حق ہے۔ اگر مذہبی درد یا بالفاظ دیگر انسانی اخوت کا احساس آپ کے دل میں نہ ہوتا، تو آپ کو اپنے ان خدشات قلب پر مضطرب ہونے کی بھی ضرورت نہ ہوتی۔ اس لئے یہ تو یقین ہے کہ ابھی تک آپ سچے کافر ہونے کا فخر تو حاصل نہیں کر سکے البتہ ممکن ہے کہ یہ احساس صرف "ناچار مسلمان شو" کی حد تک جاکر ختم ہو جاتا ہو۔

بہرحال جواب دینے کے لئے مجھے آپ کی تحریر کا پہلے خلاصہ کر لینا چاہئے اور اس کے بعد دیکھنا چاہئے کہ آپ کا اعتراض کیا ہے اور اس کا کیا جواب ہو سکتا ہے۔

آپ کے شکوک غالباً نمبروار یہ ہیں:۔

(۱) وقتوں کی تعیین کے ساتھ نماز کا اُس کے پورے شرائط کے ساتھ ادا ہونا ضروریات زندگی اور داعیات حیات کی وجہ سے ناممکن ہے اس لئے کیوں ایسی عبادت کا حکم دیا گیا۔

(۲) جب نماز سے بھی اصلاح اعمال نہیں ہوتی تو اس کے کرنے سے کیا فائدہ؟

(۳) عبادت کے لئے اس قدر سخت وعید کہ بجائے اک کیفیت عبودیت پیدا کرنے کے ایک جابر و قاہر خدا کا حکم مان کر

طوعاً وکرہاً اس کو ادا کرنا پڑے کیا مفید ہوسکتا ہے۔

(۴) اگر تمام عبادت کو ان کے تمام شرائط کے ساتھ ادا کیا جائے تو اس کے معنے ترک دنیا کے ہیں حالانکہ اسلام ترک دنیا کا بھی مخالف ہے

میں نے جہاں تک آپ کی تحریر سے آپ کی کیفیت وحالت کا اندازہ کیا ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے خود اسلام کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ آپ صرف اس لئے مسلمان ہیں کہ آپ کے اسلاف مسلمان تھے، اور مسلمان بھی شاید سخت قسم کے جن کے تقشف نے آپ کی فطرتِ جستجو پسند میں بغاوت کی سی کیفیت پیدا کردی۔ اگر آپ خالق ومخلوق کے تعلق، یا قانون قدرت اور اس سے پیدا ہونے والے اضطراری نتائج پر غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوجائیگا کہ خدا کے مختلف نام رکھنا یا اس کے ساتھ مختلف صفات متعلق کرنا، صرف ایک فلسفیانہ یا مصلحانہ تعبیر ہے۔ اپنی بیچارگی وبیکسی کی اور اسی کے ساتھ اپنے ارتقاء واعلاء کی۔ خدا کو قہار وجبار کہنا حقیقتاً صرف اُس قہر وجبر کو ظاہر کرتا ہے جو خود ہم اپنے اوپر روا رکھتے ہیں اور خدا کو رحیم وکریم کہنا گویا یہ بتانا ہے کہ اپنے اوپر رحم وکرم کرنا بھی ہمارے ہی اختیار میں ہے۔

قدرت اس سے بالکل بے نیاز ہے کہ میں گدا ہوں اور آپ بادشاہ، ہمت سنگھ قزاق دولتمند ہے اور رمضان علی شاہ محتاج ومفلس، اس کے یہاں نہ ملک کی تفریق ہے نہ قوم کی، نہ نسل ورنگ کا امتیاز ہے، نہ جہل وعلم کا۔ اس کے نزدیک ایک چیونٹی کا پامال ہوجانا اور ایک ملک کے ملک کا دفعتہً تباہ ہوجانا دونوں برابر ہیں۔ نہ وہاں ہمدردی ہے نہ عناد، نہ لطف وکرم ہے نہ قہر وغضب، اس کی لغت میں سعادت وشقاوت، اوج وحضیض، ہبوط وصعود، انحطاط وارتقاء، نشیب وفراز، حیات وموت، سیاہ وسپید، رات دن، ہاں نہیں، سب مہمل وبے معنی الفاظ ہیں، وہ ایک ایسا گنبد ہے جو رونے اور ہنسنے سے تو غیر متاثر رہتا ہے، لیکن صدائے بازگشت پیدا کردینے کا جہاں تک تعلق ہے وہ خندہ بھی ہے اور گریہ بھی، اس لئے آپ مہربانی فرما کر خدا سے تو بحث کیجئے نہیں کہ اس کو نہ ہماری عبادت سے فایدہ ہے نہ بغاوت سے نقصان۔ نہ اس کو دوزخ میں ڈالنا ہے نہ جنت مہیا کرنا۔ جہاں تک اصلاح وتہذیب کا تعلق ہے، ہمارا خدا خود ہمارے اندر ہے اور وہی قہار وجبار ہے اور وہی رحیم وکریم، وہی ہمارے لئے جہنم بناتا ہے۔ وہی فردوس پیدا کرتا ہے۔

البتہ آپ یہ غور کرسکتے ہیں کہ اگر مذہب اسلام واقعی سچا مذہب ہے تو اس کے واضع نے کیوں عبادت کی یہ قیود عائد کیں اور اُن سے کیا فائدہ ہے۔

آپ غالباً اس سے انکار نہیں کرسکتے کہ انسان نام صرف اس کی ذات کا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد اس کے تمام ابنائے جنس ہیں، اس لئے گو ایک شخص پیدا ہوتا ہے تنہا، مگر وہ ہوتا ہے اُس تمدن کی ایک کڑی جس میں سب سلسلہ بہ سلسلہ باہمدگر وابستہ ہیں۔ آپ اگر دنیا میں آئے ہیں تو آپ کا فرض صرف یہ نہیں ہے کہ دس بجے دن سے شام تک دفتر میں کام کرکے مطمئن ہوجائیں اور اسی کو فرض انسانیت سمجھیں، آپ کے ہر قول، ہر ہر قدم ہر ہر جنبش اعضاء میں تمام نوع انسانی کے حقوق شامل ہیں اور اس طرح گویا آخر تک آپ سے یہ وقت مطالبہ کرتی رہتی ہے کہ جو بات کہو اس فرض کا احساس کرکے کہو، جو قدم -

اُٹھاؤ اس عام تعلق انسانی کو سمجھکر اٹھاؤ۔ اور ایک مذہب کی تمام عبادات کا مقصود بھی صرف یہی ہے کہ ہمارا یہ احساس باقی رہے اور ہمارے دل سے اس کی کھٹک نہ مٹنے پائے۔

ظاہر ہے کہ تمام انسان ایک سا دماغ لیکر نہیں آتے، بعض بلید ہوتے ہیں، بعض ذکی، بعض زیادہ ذی حس ہوتے ہیں بعض کم، کسی میں تاثر کا مادہ کم ہوتا ہے کسی میں زیادہ اس لئے ابتداء آفرینش سے دستور یہی رہا ہے کہ اگر کسی خاندان میں کوئی فرد زیادہ ذی ہوش ہوتا ہے تو اس کو اپنا سردار تسلیم کر لیتے ہیں اور اسی کے کہنے پر عمل کرنا فرض جانتے ہیں، اسی طرح خاندان سے آگے بڑھکر قبیلہ لیجئے، جماعت لیجئے، شہر، ملک اور ساری دنیا کو لیجئے، ہر جگہ اور ہر صورت میں نظام تمدن کی یہی شکل نظر آئے گی اور افراد کا جماعت کی صورت اختیار کر لینے کے لئے یہ ضروری ہوگا کہ وہ کسی خاص نظام کے ماتحت کام کریں۔ کسی ایک مصلح یا رہنما کے ہاتھ میں اپنے معاملات سونپ دیں اور بغیر چون و چرا اس کی ہدایات پر عمل کرتے رہیں۔ اگر یہ نہ ہو بلکہ ہر شخص اپنی رائے کے مطابق راستہ اختیار کرے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ زنجیر ٹوٹ جائیگی، لوگ مختلف راہوں پر ہو لیں گے اور امیال و عواطف، خیالات و جذبات، خواہشات و داعیات کے اختلاف سے، ایک کو دوسرے کیساتھ ہمدردی نہ رہیگی اور آخر میں وہی حالت ہو جائے گی جسکو کلام مجید میں "ہباءً منثورا" (غبار پریشاں) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ شریعت اسلام میں تمام عبادات (جنکو ہمارے مولویوں نے خدا جانے کس اصول کی بنا پر حق اللہ اور حق العباد میں تقسیم کرکے سب سے پہلی بنیاد اختلاف کی اسی جگہ ڈالدی) کا مقصود یہی ہے کہ لوگوں میں اس احساس کی پرورش ہوتی رہے اور ایک کو دوسرے کے سمجھنے کا موقع ملتا رہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ محض کھڑا ہونا بیٹھنا اور پھر اُٹھ جانا کوئی معنی نہیں رکھتا، لیکن چونکہ اس اسلوب کا ایک اصطلاحی نام نماز یا صلوٰۃ رکھکر گویا سب کو مجبور کر دیا کہ وہ روزانہ خاص اوقات میں اپنے افعال سے اپنے اعضاء کی جنبش سے اپنے اقوال سے یکرنگی، یک جہتی، مرکزیت، اشتراک اور اجتماعیت کی مشق کرتے رہیں، اس لئے مجھے یا آپ کو اب کوئی اعتراض کا حق باقی ہی نہیں رہتا۔ اور اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک استاد تمام لڑکوں کو ایک ساتھ کھڑا کرکے وقت واحد میں ایک ہی لفظ سب کی زبان سے کہلوائے، کہ یوں تو ہر لڑکا اپنی اپنی جگہ کہہ سکتا ہے کہ کیا بیٹھ کر علیحدہ علیحدہ ہم یاد نہ کر سکتے تھے، لیکن استاد سمجھتا ہے کہ اس طرح یاد کرنے کا دماغ پر کیا اثر ہوتا ہے اور کس استحکام کے ساتھ ایسا یاد کیا ہوا سبق دماغ میں مرتسم ہو جاتا ہے۔

اگر آپ یہ کہیں کہ مرکزیت و اجتماع پیدا کرنے کے لئے نماز ہی کی کیا ضرورت تھی کوئی اور صورت پیدا کی ہوتی، تو اس کا جواب نہایت آسان ہے۔ کسی اور صورت کے پیدا کرنے کے بعد اس کی کیا ذمہ داری ہو سکتی تھی کہ آپ اس پر بھی یہی اعتراض نہ کریں گے۔ وہ تو جو صورت بھی ہوتی متعین و مخصوص ہوتی اور ہر تعیین و تخصیص پر اسی طرح اعتراض وارد ہو سکتا تھا۔

یہاں ایک سوال اور پیدا ہو سکتا ہے کہ اس اجتماع پیدا کرنے کے لئے خدا کی یاد کو کیوں ضروری قرار دیا، یہ حکم کیوں نہ دیا گیا کہ وقت متعین پر ایک جگہ جمع ہو کر تبادلۂ خیالات کریں۔ ایک دوسرے کے حالات دریافت کریں۔ اظہار ہمدردی اور اعانت و استعانت کے لئے انجمنیں بنائیں، جیسا کہ تمام مہذب ممالک کا دستور ہے لیکن یہ سوال وہی کرے گا جس کو انسان کی نفسیات (سائکالوجی) سے آگاہی نہیں ہے۔ انسان فطرتاً جستجو پسند واقع ہوا ہے اور وہ اس وقت تک کسی بات کو نہیں مانتا جب تک اُسکی

سمجھ میں نہ آجائے یا یہ کہ اس کی سمجھ سے باہر نہ ہو۔ اگر اصول اجتماع صرف فہم انسانی قرار دیا جاتا تو نتیجہ یہ ہوتا کہ اختلاف آرا کبھی بند نہ ہوتا اور قیامت تک ان میں کوئی غرض مشترک پیدا نہ ہو سکتی، اس لئے اس کی بنیاد شروع ہی سے وہ رکھی گئی جو فہم انسانی سے بالاہے اور جہاں پہونچکر سب کو خاموش ہوجانا پڑتا ہے یعنی خدا، ــــــ اگر انسان کے لئے کوئی چیز ماورا سرحد ادراک ہو سکتی ہے تو وہ ایک قوت بالا و برتر کے ماننے پر مجبور ہے اور یہی وہ چیز ہے، یہی وہ سکوت جہل و نا فہمی ہے، یہی وہ بیچارگی عقل و دانش ہے، جس سے شارع نے فایدہ اُٹھاکر اس کو ہمارا منتہائے نظر، ہمارا ہدف خیال، ہمارا نقطۂ اجتماع واشتراک بنا دیا کہ اس میں نہ کبھی کسی کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ اور نہ شیرازۂ اجتماع منتشر۔

اس لئے آپ عبادت کی اہمیت کو تو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ اس سے زیادہ قوی رشتہ افراد انسانی کو ایک دوسرے سے وابستہ کرنے کے لئے کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ لباس کی یک رنگی، زبان کی ہم آہنگی، قومیت کی ہم خیالی، اپنی اپنی جگہ یقیناً مفید ذرایع اجتماع پیدا کرنے کے ہیں، لیکن مذہب جس حبل متین سے متعلق ہے وہ ان سب سے بہت بلند، بہت استوار اور بہت وسیع ہے۔

پھر چونکہ نہ صرف نماز بلکہ تمام عبادات کا مقصود واحد یہ کیفیت پیدا کرنا ہے، اس لئے اگر کوئی شخص نماز پڑھتا ہے اس حال میں کہ کوئی کیفیت اس کی اس میں پیدا نہیں ہوتی تو یقیناً وہ نماز نہیں ہے اور اس اصول سے انحراف کرنا ہے جو کہ معیار ہر ہر نماز کو پورا اترنا چاہئے۔ لیکن اس سے آپ اصل نماز کی خوبی سے تو انکار نہیں کر سکتے۔ اگر آپ اپنے دنیاوی مشاغل، معاشی افکار، زندگی کی مجبوریوں کی وجہ سے پابندی نہیں کر سکتے تو نہ کیجئے لیکن یہ تو نہ کہئے کہ نماز سے فایدہ ہی کیا ہے۔ اگر آپ اس کو تمام شرائط کے ساتھ ادا کر سکتے تو معلوم ہوتا کہ اس سے کوئی فائدہ مترتب ہوتا ہے یا نہیں۔

آپ اس وقت کے نماز پڑھنے والوں کو دیکھ کر اس کے حسن و قبح پر حکم نہ لگائیے، بلکہ اصول کو دیکھئے اور پھر فیصلہ کیجئے کہ ان کو نماز نے خراب کیا ہے۔ یا نماز ان کی وجہ سے بدنام ہوگئی ہے۔ اس لئے میری ذاتی رائے کا جہاں تک تعلق ہے میں بغیر ایک عشر دقیقہ کا تامل کئے ہوئے کہ سکتا ہوں کہ نماز کی صحت کی اولین شرط جماعت ہے۔ اگر کوئی شخص جماعت کی نماز کا پابند نہیں ہے یعنی اگر وہ اسپر قادر ہونے کے باوجود اس کی پابندی نہیں کر سکتا، تو پھر تنہا نماز پڑھنے سے کوئی فائدہ مترتب نہیں ہو سکتا اور ایسی صورت میں یہی بہتر ہے کہ بجائے نماز کی کوئی اور صورت تربیت نفس و تزکیۂ اخلاق کی پیدا کرے تاکہ اخیر میں کم از کم نماز پر تو بے معنی و بے نتیجہ ہونے کا الزام نہ عاید ہو۔

میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں کہ اگر کبھی آپ نماز پڑھنے کے لئے آمادہ ہوں تو جماعت کے ساتھ ادا کیجیے اور چند دن کے بعد خود غور کیجئے کہ آپ کے خیالات میں کچھ انقلاب پیدا ہوا یا نہیں۔ اور اگر آپ اپنے مشاغل کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتے تو مناسب یہی ہے کہ خاموشی کیساتھ کسی وقت تنہا بیٹھکر صرف کائنات کا مطالعہ کیجئے اور اسی میں تفکر و تدبر سے کام لیجئے تاکہ اگر آپ اجتماعیت پیدا نہیں کر سکتے تو انفرادیت ہی آپ میں تکمیل کے ساتھ پیدا ہوجائے۔

(جناب سلطان احمد خاں صاحب۔ انٹر کالج مسلم یونیورسٹی علیگڈھ)

(۱) سامری کون تھا اور اُس کی مفصل سوانح عمری کیا ہیں۔ سحر سامری کی کیا حقیقت ہے۔ اور جادو کی کوئی حقیقت ہے یا نہیں اور اس زمانہ میں بھی اس کا وجود کہیں پایا جاتا ہے؟

(نگار) آپ نے جناب سامری کے حالات دریافت کئے ہیں۔ اور اس کی ساحری کی حقیقت دریافت کی ہے، حالانکہ نہ یہ کسی شخص کا نام تھا اور نہ وہ کوئی ساحر تھا۔ کلام مجید میں ایک ہی سورت (طٰہٰ) میں تین جگہ لفظ سامری استعمال ہوا ہے۔ اول دو جگہ یہ لفظ الؔ کے ساتھ آیا ہے (یعنی السامری) اور تیسری جگہ صرف سامری بغیر الؔ کے۔ چونکہ عربی زبان میں الؔ معرفہ یا کسی کے نام کے ساتھ نہیں استعمال ہو سکتا اس لئے یہ امر ظاہر ہے کہ وہ کسی شخص خاص کا نام نہ تھا، تیسری جگہ اس کو معرفہ کی صورت سے بغیر الؔ کے اس لئے استعمال کیا کہ اول تو اس میں یائے نسبت ہونے کی وجہ سے بغیر الؔ کے بھی وہ معرفہ کے معنے دیتا ہے اور دوسرے اس لئے کہ پہلے دو جگہ اس لفظ کا تعارف اس کی اصلی حالت میں ہو چکا تھا اور اب اس تعریف و تخصیص کی وجہ سے اس نے گویا علَم کی صورت اختیار کر لی تھی۔ بہرحال سامری کسی شخص کا نام نہ تھا بلکہ اس سے ایک شخص اہل سامرہ کا مراد تھا۔ سامرہ ایک نہایت قدیم قوم تھی جو بابل اور ایران کی حکومت میں یہودیوں کے دوش بدوش پائی جاتی تھی۔ عہد موسیٰ میں گو یہ بظاہر شریعت موسوی کے پابند نظر آتے تھے لیکن حقیقتاً ۔کسی پیغمبر کے قایل نہ تھے اور جب موقع ملتا تھا فساد پھیلایا کرتے تھے،

جب تک موسیٰ اپنی قوم میں رہے اہل سامرہ کو کوئی موقع گمراہ کرنے کا نہیں ملا، لیکن جب وہ پہاڑ پر چلے گئے تو اہل سامرہ میں سے کسی ایک نے جس کے لئے السامری کا لفظ استعمال ہوا ہے، موسیٰ کی قوم کو بہکا کر ایک بچھڑا طیار کر دیا اور یہ لوگ اس کی پرستش کرنے لگے جب حضرت موسیٰ الواح لیکر پہاڑ سے واپس آئے اور یہ رنگ دیکھا تو بہت برہم ہوئے۔ بچھڑا بنانے کا سبب یا تو یہ تھا کہ اہل سامرہ کے آبا و اجداد خود "بارلعام" بادشاہ کے زمانہ میں بچھڑے کی پرستش کرتے تھے۔ یا یہ کہ اس وقت مصر میں خود ایک بت نیوس نامی بچھڑے کی صورت کا تھا۔ سیل نے اعتراض کیا ہے کہ اُس وقت اس قوم کا نام سامرہ تھا ہی نہیں، اس لئے سامری کو اہل سامرہ سے کہنا صحیح نہیں۔ لیکن یہ اعتراض بالکل لغو ہے کیونکہ جس وقت کلام مجید نازل ہوا ہے اُس سے بہت قبل اس جماعت کا نام سامرہ ہو گیا تھا اور اس لئے کلام مجید میں جن الفاظ سے یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ اسی وقت کے تھے نہ کہ عہد موسوی کے۔

کلام مجید میں اس واقعہ کا ذکر حقیقتاً دو باتوں کی تغلیط کے لئے کیا گیا، ایک تو یہ کہ توریت میں ہارون ہی پر بچھڑا بنانے کا الزام عائد کیا گیا تھا اس کو دفع کیا گیا کہ بچھڑا بنانے والا ایک شخص اہل سامرہ کا تھا۔ ہارون نہ تھے اور دوسرے یہ کہ بچھڑے میں کوئی نمایش ساحری نہ تھی جیسی کہ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ حقیقتاً بولنے لگا تھا۔ بلکہ اس سے صرف ایک آواز پیدا ہوتی تھی جو بچھڑے کی آواز سے ملتی جلتی تھی۔ کلام مجید میں اس کے لئے لفظ خوار آیا ہے جو گائے وغیرہ کی آواز کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ بعض مترجمین نے اس کا ترجمہ کھوکھلی آواز کیا ہے، جو میرے نزدیک درست نہیں ہے، کیونکہ عربی میں عام طور پر "خار البقر" بمعنی صاح البقر

استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن کلام مجید سے یہ امر کہیں واضح نہیں ہوتا کہ واقعی بچھڑے میں جان پڑ گئی تھی اور وہ اصلی بچھڑے کی طرح بولنے لگا تھا۔ کلام مجید کے الفاظ یہ ہیں:۔

"فاخرج لھم عجلا جسدا لہ خوار" یعنی اس نے ایک بچھڑا اس ترکیب سے بنایا تھا کہ اس کے جسم سے آواز پیدا ہوتی تھی، چنانچہ بعض اکابر مفسرین نے تو لکھا ہے کہ یہ بچھڑا اندر سے کھوکھلا اس ترکیب سے بنایا گیا تھا کہ جب ہوا اس کے اندر سے ہو کر گزرتی تھی تو ایک آواز پیدا ہوتی تھی۔ بچھڑے کے متعلق عام طور پر ایک روایت مشہور ہے کہ سامری نے جبریل کو گھوڑے پر سوار جاتے ہوئے دیکھ کر اس کے پاؤں تلے کی مٹی لے لی اور بچھڑے میں ڈال دی جس سے اس میں جان پڑ گئی اور وہ بولنے لگا اور اس روایت کی بنیاد خود کلام مجید کو بتایا جاتا ہے کیونکہ جب حضرت موسیٰ نے سامری سے پوچھا کہ "فما خطبک یا سامری!" یہ امر مکروہ تجھ سے کیا ہوا؟ تو اس نے جواب دیا کہ:۔

"بصرت بما لم یبصروا بہ فقبضت قبضۃ من اثر الرسول فنبذتھا وکذالک سولت لی نفسی"

عام طور پر اس کا مفہوم یہ بتایا جاتا ہے کہ "میں نے وہ دیکھا جو اور لوگ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اور میں نے فرشتہ کے نشان قدم سے ایک چٹکی مٹی کی لیکر بچھڑے میں ڈال دی اور اس طرح میرے نفس نے مجھے دھوکا دیا" اب یہاں لوگوں میں اختلاف ہے کہ آیا رسول سے مراد خود حضرت موسیٰ ہیں یا جبریل لیکن حقیقتاً نہ اس نے موسیٰ کے نشان قدم سے مٹی اٹھائی نہ جبریل کے گھوڑے کے نشان پا سے یہ تبرک حاصل کیا۔ بلکہ اس آیت کا مطلب ہی کچھ اور ہے۔ سامری کا مقصود صرف یہ کہنا تھا کہ میرا نقطۂ نظر اور لوگوں کے نقطۂ نظر سے بالکل جدا تھا اور میں نے صرف برائے نام آپ کی پیروی کی تھی جس کو چھوڑ بیٹھا اور اس طرح نفس نے مجھے دھوکا دیا۔ اثر الرسول سے سنت رسول یا سنتِ موسیٰ مراد ہے اس لئے "قبضت قبضۃ من اثر الرسول" کے معنے یہ ہوئے کہ میں نے سنت رسول میں سے صرف تھوڑا سا حصہ اختیار کیا تھا (یعنی پورے طور پر ایمان نہ لایا تھا) اور بعد کو جب آپ پہاڑ پر چلے گئے تو اس کو بھی ترک کر دیا (فنبذتھا) اور یہ میرے نفس کا دھوکا تھا۔

بہر حال کلام مجید سے نہ سحر سامری ثابت ہوتا ہے اور نہ سامری کسی خاص شخص کا نام اس لئے آپ کے سوال کے ایک حصہ کا جواب تو ہو گیا۔ اب رہا دوسرا حصہ کہ ساحری کی حقیقت کیا ہے اور اس وقت اس کا وجود پایا جاتا ہے یا نہیں، یہ ذرا تفصیل طلب امر ہے اور فرصت مفقود۔ تاہم کوشش کروں گا کہ ایک حد تک آپ کو اس مسئلہ میں بھی مطمئن کر دوں۔

مسئلہ سحر پر تین طرح بحث کی ضرورت ہے، تاریخ، مذہب اور علم۔ یعنی تاریخ کے روایات اس باب میں کیا ہیں۔ مذہب کیا کہتا ہے

سلہ۔ بعض مترجمین نے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ "اے سامری تیرا کیا مقصد تھا" لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ عربی زبان کا محاورہ ہے کہ جب کسی سے کوئی امر مکروہ سرزد ہو جاتا ہے یا کوئی نامعقول حرکت کر کے مصیبت اپنے سر مول لے لیتا ہے تو کہتے ہیں "ما خطبک" مولانا محمد علی (قادیانی) نے بھی غلط ترجمہ کیا ہے۔ (نیاز)

اور علم وحکمت کے نزدیک اس کی حقیقت کیا ہوسکتی ہے۔ جہاں تک تحقیق تاریخی کا تعلق ہے، جادو کا عقیدہ بہت زیادہ قدیم نہیں معلوم ہوتا بلکہ اس کا وجود یقیناً علم طب کی ترقی کے بعد ہوا ہے یا یہ کہ علم طب کی حیرت انگیز کارناموں کو دیکھ کر سحر وساحری کا خیال پیدا ہوا کیونکہ سحر اقوام قدیم کے نزدیک بھی اس علم کا نام تھا جس کے ذریعہ سے عجیب وغریب باتیں ظاہر ہوسکیں اور علم طب کے کرشمے بھی چونکہ عوام کے نزدیک ایسے ہی محیر العقول تھے اس لئے وہ اس کو بھی سحر وساحری ہی سمجھنے لگے۔ پھر جب علم نجوم کی بنیاد پڑی تو اس میں بھی اس عقیدہ کو درخور حاصل ہوگیا چنانچہ آج بھی اسی واہمہ کی بنا پر تسخیر سیارگان وغیرہ کے عمل کئے جاتے ہیں۔

جادو کے عقیدہ کی بنیاد سب سے پہلے کب اور کہاں پڑی؟ اس کا جواب مشکل ہے، لیکن چونکہ عہد تاریخ کی ابتدا بابل اور مصر سے ہوتی ہے اس لئے ظاہر ہے کہ ہماری تحقیق کا دائرہ ان دونوں کے زمانہ سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ چنانچہ میٹشاپورٹا نے لکھا ہے کہ کلدانیوں میں دو قسم کا سحر رائج تھا: ایک معدنی قوتوں کا جسے صحیح معنے میں علم الکیمیا کہنا چاہئے اور دوسرا وہ جس کی رو سے دیوتاؤں کے سامنے قربانیاں چڑھائی جاتی تھیں اور توقع یہ کی جاتی تھی کہ اس طرح وہ خوش ہو کر مصیبتوں کو دور کردیں گے اور مریضوں کو صحتیاب۔ اس آخری قسم کے جادو کی بنیاد غالباً سب سے پہلے مصر میں پڑی جہاں جادوگروں اور کاہنوں کی جماعتوں کا بڑا اثر قائم تھا۔ اور مصر سے یہ عقیدہ تمام مشرق میں پھیل گیا، چنانچہ بابل میں گرفتار ہو کر آنے والے یہودیوں کا بھی یہی عقیدہ نظر آتا ہے اور بعد کو جب انجیل مرتب ہوئی تو حضرت عیسیٰ کو بھی جھاڑ پھونک کرنے والے ہی کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ فیثاغورث بھی کالدیا اور مصر سے اسی قسم کا جادو سیکھ کر آیا تھا جس کی تعلیم اس نے افلاطون کے شاگردوں کو دی۔ پرفری کا بیان ہے کہ فیثاغورث کے شاگرد جھاڑ پھونک سے مریضوں کو اچھا کر دیتے تھے۔ نقش وتعویذ وغیرہ کا بھی قدیم مصر میں بہت رواج تھا، چنانچہ آپ یہ معلوم کر کے تعجب کریں گے کہ بہت سے تعویذ ونقوش جو اب بھی پائے جاتے ہیں یہ اب سے ہزاروں سال قبل مصر میں رائج تھے۔ اور چاندی کی تختی پر کندہ کرا کے گلے میں لٹکا دئے جاتے تھے۔ بہر نوع سحر ساحری کا چرچا سب سے پہلے مصر وکالدیا میں ہوا اور وہاں سے مختلف ملکوں میں پھیلا۔ اگر یہ عقیدہ اسی حد تک پہونچ کر رک جاتا تو چنداں مضایقہ نہ تھا، لیکن بعد کو اس کی وجہ سے جو جو مظالم نوع انسانی پر ہوئے اُن کی داستان سخت دردناک ہے۔ یورپ کی تاریخ ان سے رنگین ہے۔ ۱۴۸۴ء میں پاپائے روم کے حکم سے ایک قانون ہی جادوگروں کی سزا کے لئے منضبط کیا گیا اور ہزاروں بے گناہ نفوس (جن میں غریب حاملہ عورتیں اور ننھے ننھے بچوں کی مائیں بھی شامل تھیں) صلیب پر چڑھا دئے گئے۔ اس کے بعد الگزنڈر ششم نے ۱۴۹۴ء میں، لیو دہم نے ۱۵۲۱ء میں اور ڈرین ششم نے ۱۵۲۲ء اس قانون کو اور زیادہ سخت کردیا۔ شہر میں جب کوئی واقعہ غیر معمولی ہو جاتا تو اس کو جادو ہی کا نتیجہ سمجھا جاتا اور محض شبہ پر لوگ گرفتار کر لئے جاتے۔ ڈریپر کی مشہور تصنیف (Conflict between Science & religion) ملاحظہ کیجئے اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اس عقیدہ نے صدیوں تک یورپ کے امن کو کس قدر خطرہ میں ڈال دیا تھا جب کسی مرد یا عورت پر جادوگر ہونے کا شبہ کیا جاتا تو وہ گرفتار کر کے سامنے لایا جاتا اور اگر انکار کرتا تو اقبال جرم کے لئے گرم لوہے سے داغا جاتا، مشکیں کس کر تہ خانے میں ڈال دیا جاتا، اور وہاں کی سردی، بھوک اور تاریکی کے عذاب سے گھبرا کر وہ اقرار کر لیتا جس کے بعد

اُس کو صلیب دیدیجاتی یا زندہ جلا دیا جاتا۔ پھر یہ آفت ایک ہی مقام پر محدود نہ تھی بلکہ سارا یورپ اسی جنون میں مبتلا تھا، صرف جرمنی کے ایک چھوٹے سے مقام لنڈم میں چار سال کے اندر آبادی کا پانچواں حصہ اسی جرم میں جلا دیا گیا، جنیوا میں تین مہینے کے اندر پانسو انسان نذر آتش کئے گئے اور کومو میں ایک ہزار آدمیوں کی قربانی چڑھائی گئی۔ اسی طرح انگلستان میں ملکہ الزبتھ اور جیمس اول کے عہد میں جو کچھ ہوا وہ بھی تاریخ سے ظاہر ہے کہ گاؤں گاؤں یہ آفت برپا تھی اور بستیوں کی بستیاں اسی طرح غیر آباد ہوگئیں، لانگ پارلیمنٹ کے زمانہ میں اور زیادہ ستم توڑے گئے۔ ڈاکٹر اسپرنگ کا بیان ہے کہ صرف عورتوں کی تعداد جو مذہب عیسوی کی بدولت جادو کے جرم میں زندہ آگ میں ڈالدی گئیں، نو سے لاکھ تک پہونچتی ہے۔

یہ فخر صرف مذہب اسلام کو ہے کہ اُس نے دنیا سے تمام اوہام باطلہ کے ساتھ جادو کے عقیدہ کو بھی دنیا سے مٹایا۔ بعض احادیث ایسی پائی جاتی ہیں جنسے جادو کے برحق ہونے کا ثبوت ہوتا ہے، مثلاً قصۂ ہاروت و ماروت، لیکن ایسی تمام حدیثیں ناقابل اعتبار ہیں اور صحت سے یکسر دور۔ خود کلام مجید میں لفظ سحر بہت جگہ استعمال ہوا ہے لیکن کہیں اس کا مفہوم جادو کا نہیں ہے۔ کلام پاک میں یہ لفظ، دھوکا، مکر و فریب اور پرستش غیر اللہ کے ظاہر کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ چنانچہ عربی زبان میں لفظ سحر، فساد کا مترادف ہے۔ اس موقع پر غالباً اس سے زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں۔ ورنہ میں کلام مجید کی ہر اس آیت کو لیکر جہاں لفظ سحر استعمال ہوا ہے میں اپنے اس دعوے کو ثابت کر دیتا۔

لیکن یہ کہنا کہ خود انسان کے اندر کوئی ایسی قوت نہیں ہے جس کے ذریعہ سے وہ اس قسم کے محیر العقول کارنامے دکھا سکے یقیناً غلط ہے۔ علم نیرنجات، اشراقیت، مقناطیسیت، مسمریزم وغیرہ سب انسانی دماغ کے کرشمے ہیں اور اگر جادو نام ہر اس چیز کا ہے جو لوگوں کی سمجھ میں نہ آئے تو پھر یہ کیا، آج کل کے تمام آلات و ایجادات سب سحر میں داخل ہیں اور جن کی حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ حال ہی میں ساحر ہوڈینی کے حالات آپ نے پڑھے ہوں گے کہ کس قدر عجیب و غریب باتیں اس سے ظہور میں آتی تھیں اگر ان کو بھی جادو سمجھ لیا جائے تو یقیناً جادو برحق ہے۔ لیکن میں نے اپنے خیالات اس جادو کے متعلق ظاہر کئے ہیں، جو زمانۂ قدیم سے شرک کی صورت میں چلا آ رہا ہے اور جس کا تعلق ارواح خبیثہ یا کسی اور قوت غیر اللہ سے بتایا جاتا ہے۔

نیاز

نگارستان

کی جلدیں بہت کم رہگئی ہیں جن صاحب نے ابتک اسکا مطالعہ نہیں کیا وہ لے لیں ورنہ پھر خدا معلوم کب اسکا دوسرا اڈیشن شائع ہو۔ قیمت علاوہ محصول دو روپیے۔

"منیجر نگار لکھنؤ"

پرتاب
ردھنی

مولانا شرر مرحوم

جنید بغدادی
سکینہ بنت حسین
ملکہ زنوبیہ
قرۃ العین
محذرات
جویاے حق
نعمت چین
فاتح مفتوح
بابک خرمی
انقلاب [illegible]
ایام عرب
قیس ولبنی
یوسف ونجمہ
[illegible]
مینا بازار
مقدس نازنین
[illegible]
فلپانا
شوقین ملکہ
منصور موہنا
حسن انجلینا
ملک العزیز ورجنا
فردوس بریں
حسن کا ڈاکو
دربار حرام پور
غیب دان دلہن
بدر النساء کی مصیبت

سیفۂ [illegible]
نیکی کا پھل

شوق قدوائی مرحوم

ترانۂ شوق
قاسم وزہرہ
نیرنگ جمال

میر ولی اللہ بی اے

بندگی
کاس الکرام
لسان الغیب جلد اول
" دوم
" سوم
" چہارم
گلگدان فصاحت
بادۂ ناب

[illegible] بی اے

[illegible] کا کلبہ
نیلی چھتری
بہرام کی گرفتاری

مولانا نیاز فتحپوری

گہوارۂ تمدن
نگارستان
صحابیات
تاریخ الدولتین

سید سجاد حیدر بی اے

جلال الدین خوارزم شاہ
خیالستان
[illegible]

حکایات واقتباسات

دلچسپ تاریخی ناول

سراب [illegible]
بالشوک شہزادی
شہید وفا
ممتاز بیگم
شعلۂ رنگین
محاصرۂ پیرس
شیخ چلی
بہادر ترک
بہرام کی واپسی
انقلاب فرانس
حسن بنارس
[illegible]
[illegible]
جنگ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
عروس مصر
سیلاب خون
کرشمہ
وفادار دلہن
طوفان زمین

سیاحت زمین
سیاحت
نازنین مراکش
سمندر کی سیر
اسرار بالشویزم
روح لیلی
امین ملک
حجاج بن یوسف
یوسف پاشا
انقلاب عثمان
نیلی چھتری
بہرام کی آزادی
[illegible]
[illegible]
[illegible]

ادبی کتابیں

[illegible]
بزم خیال
مشاطۂ سخن
[illegible]
مکاتیب [illegible]
[illegible]

مراثی

مراثی دبیر
مراثی انیس
مراثی [illegible]

مراثی مونس
مراثی دلگیر

تذکرۃ الشعرا

تذکرۂ حسینی
گلشن
سراپا سخن
سوانح نظیر اکبر آبادی

دواوین فارسی

دیوان شمس تبریز
کلیات عراقی
دیوان حافظ
دیوان نعمت خان عالی
کلیات انوری
دیوان بیدل
کلیات سعدی
دیوان [illegible]
کلیات [illegible]
کلیات غالب
کلیات صائب
کلیات [illegible]
[illegible]
دیوان [illegible]
دیوان غنی کشمیری
دیوان ناصر علی
دیوان [illegible]
کلیات [illegible]
کلیات ظفر

کلیات مومن
دیوان ناسخ
کلیات میر
کلیات سودا
کلیات انشا
کلیات نظیر اکبر آبادی
گلزار داغ
دیوان رند
دیوان ذوق
کلیات [illegible]
مراۃ الغیب
صحیفۂ عشق
فریاد داغ
دیوان آتش
دیوان شہیدی

عجائب وغرائب

[illegible]
[illegible]
مجمع [illegible]
طلسم فرنگ
کارخانۂ عالم
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
طلسمی فانوس

نگار [illegible]
نظیر آباد

تصانیف مولانا نیاز فتحپوری

صحابیات

جس میں عہد سعادت کے ۵۰ خواتین کے مستند حالات درج ہیں۔ اس کا مقدمہ مولانا کی خاص زبان و انشا میں ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

قیمت فی جلد [illegible]

نگارستان

مولانا نیاز کے معجزات ادب و انشا کا انتخاب جس میں بعض وہ فسانے و مضامین بھی درج ہیں جو لٹریچر میں غیر فانی درجہ رکھتے ہیں۔

قیمت فی جلد عار

شاعر کا انجام

مولانا نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا ایک فسانہ جس کی ایک ایک لفظ قوت خیال اور زور قلم کا بے مثل نمونہ ہے۔

قیمت فی جلد ۱۰؍

شہاب کی سرگزشت

اردو میں پہلا فسانہ ہے جس میں نفسیاتی تحلیل کے لحاظ سے سیرت نگاری کی گئی ہے۔ یہ امر مسلم ہو چکا ہے کہ اردو میں اس سے بہتر تخئیل اور بلند انشا کا فسانہ کوئی شائع نہیں ہوا۔

قیمت فی جلد عہ

جذبات بھاشا

ہندی شاعری میں جو لوچ اور کیفیت ہے اس کا علم انھیں کو ہو سکتا ہے جنھوں نے اس زبان کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کتاب کو دیکھئے اور جذبات و خیال کی پاکیزگی کی داد دیجئے۔

قیمت فی جلد ۱۲؍

تاریخ الدولتین

جرجی زیدان مصری مشہور مورخ اسلام کی تاریخ تمدن اسلامی کے ایک حصہ کا ترجمہ جس میں عہد بنی امیہ و بنی عباس کی سیاسی تاریخ پر بے مثل تبصرہ کیا گیا ہے۔

قیمت فی جلد عہ

علم فراست الید

یعنی ہاتھ کی لکیروں کو دیکھ کر ایک شخص کی سیرت اور اس کے ماضی و مستقبل کے حالات معلوم کرنے کا علم۔ اس فن پر ایک سلسلہ مضامین نگار میں شائع ہوا تھا۔ اب سے خوبصورت کتابی صورت میں مرتب کیا جا رہا ہے اور آخر دسمبر [illegible] تک شائع ہو جائیگا۔ اس کتاب میں [illegible] اس قدر آسان [illegible] ہیں کہ ہر شخص مطالعہ کرنے کے بعد بہت معمولی مشق سے ہاتھ دیکھ کر صحیح احکام صادر کر سکتا ہے۔ قیمت فی جلد عہ

ظریف شاعروں کا تذکرہ
یا
تذکرۂ خندۂ گل

اردو فارسی کے جتنے ظریف شاعر گزر چکے ہیں یا اب موجود ہیں ان سب کے حالات مع ان کے لطائف و ظرائف اور منتخب کلام کے یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ یہ کتاب بھی چھپ رہی ہے جو حضرات ابھی سے درخواست بھیج کر اپنا نام درج کرا لیں گے ان سے کم رعایتی قیمت لی جائیگی۔ اشاعت سے قبل اسکی قیمت کا اندازہ للعہ کیا گیا ہے۔

خاک پروانہ

مشہور فسانہ نگار منشی پریم چند کے افسانوں کا مجموعہ جن کی شہرت و قبول کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہندی زبان میں بھی اسکے ترجمے ہوئے ہیں۔

قیمت علاوہ محصول عہ

منیجر "نگار" [illegible] نظیر آباد، لکھنؤ